

آئینہ نگارش
اہلِ تسلیم کی ایک جماعت

زیرِ نظر
استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد ۱۰

ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی مؤید اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی
حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضائستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ



پیشکش: حوزہ عالیہ جامعہ المنظر لاہور
جلد حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب _____ تفسیر نمونہ
جلد _____ ۱۰
زیر نظر _____ آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم _____ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی
ناشر _____ مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰، انگٹکارام بلڈنگ
شاہراہ قائد اعظم، لاہور
مطبع _____ معراج دین پرنٹرز، لاہور
تاریخ اشاعت _____ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
ہدیہ _____

ملنے کا پتہ ۱

قرآن سنٹر

۲۲، الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: ۶۱۲۲۲۲۳-۶۳۱۳۳۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَرْضِ نَاشِر

قارئین محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔
الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔ کلام حکیم اور عبد حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے
ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور
آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہو آفاق تفسیر۔ تفسیر نمونہ۔ کو فارسی سے اردو زبان
میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر جس ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ،
کی غیر معمولی مساعی، مالی معاذین کی فراخ دلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے
قلیل عرصے میں کم بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ تائیس جلدوں میں
شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکر اللہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایا تکمیل تک پہنچایا بلکہ
اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی الشقوی اعلیٰ اللہ مقامہ کی سات جلدوں پر
مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کرا سنے ہوئے
تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیام قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور"
از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل ایک جلدی قرآن پاک عبد حاضر کے مقبول اردو تراجم کے ساتھ زیر طباعت ہیں۔ اس
سلسلے میں روشن فکر اور جدید عالم دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع
ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری امت مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے
لہذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

بیس روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم مجریز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ بیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ کتل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت چکانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۱۰ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ۱۸ اور جلد ۱۹ میں سے صفحہ ۲۵ تا ۲۹۰ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورہ سبأ، سورہ فاطر، سورہ یٰسین، صافات اور سورہ صٰ کے تفسیر پر محیط ہے۔

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے لیے اپنی قیمتی آراء سے لوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیر مومنین الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہار تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ حصول ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اٰهءاء

”مرکز مطالعات اسلامی و نجات نسل جوان“

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش

تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔

حوزہ علیہ۔ نم



یہ تفسیر

حسب ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے داؤد الہامی
- حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے اسد اللہ ایبانی
- حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے عبد الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے حسین شجاعی
- حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے محسن قرآتی
- حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

- | | | | |
|-------|---|----|----------------------|
| تالیف | مشہور و منفرط طبری | ۱ | تفسیر مجمع البیان |
| تالیف | عظیم و فقید عالم شیخ طوسی | ۲ | تفسیر تمییز |
| تالیف | علامہ طباطبائی | ۳ | تفسیر المیزان |
| تالیف | علامہ حسین کاشانی | ۴ | تفسیر صافی |
| تالیف | عبد علی بن محمد عریزی | ۵ | تفسیر نور الثقلین |
| تالیف | سید ہاشم بحرانی | ۶ | تفسیر ربان |
| تالیف | علامہ شہاب الدین محمود آلوسی | ۷ | تفسیر روح المعانی |
| تالیف | محمد رشید رضا (تقریرات) و علامہ شیخ محمد ربیع | ۸ | تفسیر المنار |
| تالیف | سید قطب | ۹ | تفسیر فی ظلال القرآن |
| تالیف | محمد بن احمد انصاری قرطبی | ۱۰ | تفسیر قرطبی |
| تالیف | ابو الحسن علی بن متویر و احمدی نیشاپوری | ۱۱ | اسباب النزول |
| تالیف | احمد مصطفیٰ مراغی | ۱۲ | تفسیر مراغی |

اس تفسیر میں مد نظر اہداف

پوری دنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کون سے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمہ علم سے محروم نہیں ہوتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکار علما میں موجود دشمنوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققین اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گہری کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغاز اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابل قدر کوششیں کی ہیں اور زحمات اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (مشکر اللہ سبحانہ)۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

گزارش

تفسیر نمونہ (فارسی)، ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ الشہ مقامہ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوند کریم مولانا مرحوم کو جوار مصطفویٰ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور عقائد کے باعث اور بعض اوقات منافقین و منافقین کے دوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہو گا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے نفاذ اور آراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیش نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہذا میں نے ان تمام فضلا کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہتھیار اور ساتھی تھے اور میں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ شکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شائبہ حال ہوتی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی ۱۸ جلدیں جو اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی انیسویں جلد ہے) بار بار پھیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیق الہی کا میں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱- بار بار یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

۲- اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلا وطنی کے مقام پر، حتیٰ کہ بستری بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اس طرح سے کام کرنا چاہیے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳- بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

بعد ازاں تعداد ۷۴ تک جا پہنچی۔ (مترجم)

شاہن شاہ ایران معدوم کے دور میں مولف کو جلا وطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یا دو دشستیں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ (یہ تجزیہ قارئین محترم کی جانب سے بھی آتی ہے)۔

خداوند!

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کار ساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں۔

خداوند!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنان اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امت اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجے میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگائیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بار الہا!

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں اور بچاؤ مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں۔

اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علیہ قم۔ ایران

تفسیر نمونہ جلد ۱۰

فہرست

سورہ سبأ

۶۹	۲- حقیقی شکر گزار بہت کم ہیں	۲۸	آیت ۲۱
۷۲	آیت ۱۵ تا ۱۷	۲۸	وہی ہر چیز کا مالک اور ہر چیز کا عالم ہے
۷۲	ایک درخشاں تمدن جو کفرانِ نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا۔	۲۲	آیت ۳ تا ۵
۷۹	آیت ۱۸، ۱۹	۲۴	پروردگار کی قسم قیامت آگے رہے گی
۷۹	ہم نے انہیں اس طرح منتشر کیا کہ وہ دوسروں کے لیے ضرب المثل بن گئے۔	۳۹	آیت ۶ تا ۹
۸۰	چند نکات	۴۰	علماء تیری دعوت کو حق سمجھتے ہیں
۸۲	۱- قوم سبأ کا عجیب و غریب ماجرا	۴۵	چند قابل توجہ نکات
۸۲	۲- قرآن کا ایک تاریخی معجزہ	۴۷	آیت ۱۰، ۱۱
۸۵	۳- ایک مختصر سے واقعہ میں عبرت کے اہم نکات۔	۴۷	داؤد پر خدا کے عظیم انعامات
۸۶	آیت ۲۰، ۲۱	۴۸	آیت ۱۲ تا ۱۴
۸۸	کوئی شخص شیطان و مسوسوں کی پیروی پر مجبور نہیں ہے	۴۸	سیلمان کا جاہ و جلال اور ان کی
۸۸	آیت ۲۲ تا ۲۷	۴۹	عبرت انگیز موت۔
۹۱	مجھے بتاؤ کہ کیوں؟	۶۲	چند نکات
۹۲	نکتہ	۶۲	۱- سیلمان کی عبرت انگیز زندگی کا منظر
۱۰۱	دلوں کو تسخیر کرنے کا طریقہ	۶۲	۲- سیلمان کی موت ایک مدت تک کیوں پوشیدہ رہی؟
۱۰۱		۶۳	۳- قرآن اور موجودہ فورات میں سیلمان کی تصویر۔

۱۰۴	آیت ۲۸ تا ۳۰	۱۰۴	تم تمام جہانوں کے لیے مبعوث کیے گئے ہو
۱۰۴	آیت ۳۱ تا ۳۳	۱۰۹	آیت ۳۱ تا ۳۳
۱۱۵	آیت ۳۴ تا ۳۸	۱۱۵	آیت ۳۴ تا ۳۸
۱۱۶	مال و اولاد قرب خدا کی دلیل نہیں ہیں	۱۱۶	آیت ۳۹ تا ۴۲
۱۲۲	قدروں کا تعین	۱۲۲	معبودوں کی عبادت کرنے والوں سے بیزاری
۱۲۵	چند نکات	۱۲۶	چند نکات
۱۲۵	۱- انفاق زیادتی کا باعث ہے نہ کہ کمی کا	۱۳۰	۲- اموال کا خدائی بیمہ
۱۲۳	۲- "انفاق" کے مفہوم کی وسعت	۱۳۳	آیت ۲۳ تا ۲۵
۱۳۳	کس دلیل کے ساتھ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں۔	۱۳۶	آیت ۲۶ -
۱۳۶	انقلابِ فکری ہر اصل انقلاب کی بنیاد ہے	۱۳۶	انقلابِ فکری ہر اصل انقلاب کی بنیاد ہے
۱۳۶	چند نکات	۱۳۵	چند نکات
۱۳۶	۱- تمام انقلابات کی جڑ بنیاد	۱۳۵	۲- غور و فکر کے سلسلے میں روایاتِ اسلامی
۱۳۶	۲- غور و فکر کرنا عظیم ترین عبادت ہے	۱۳۸	(الف) غور و فکر کرنا عظیم ترین عبادت ہے
۱۳۶	(ب) ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک رات کی عبادت سے بہتر ہے۔	۱۳۹	چند نکات
۱۳۹	۱- تمام عزت "خدا کے لیے ہے	۱۳۹	۲- "کلام طیب" اور "عمل صالح" میں فرق
۱۳۹	۲- "کلام طیب" اور "عمل صالح" میں فرق		

سورہ فاطر

۱۶۵	سورہ فاطر کے مضامین
۱۶۶	اس سورہ کی فضیلت
۱۶۸	آیت ۱ تا ۳
۱۶۹	بند دروازوں کا کھولنے والا وہی ہے
۱۷۳	چند توجہ طلب امور
۱۷۶	نکتہ
۱۷۶	ملائکہ قرآن مجید میں
۱۸۱	آیت ۳ تا ۷
۱۸۲	دُنیا اور شیطان تمہیں فریب نہ دے
۱۸۸	آیت ۸ تا ۱۰
۱۸۹	پاک اور صالح گفتار و کردار خدا کی طرف لے جاتے ہیں۔
۱۹۷	چند نکات
۱۹۷	۱- تمام عزت "خدا کے لیے ہے
۱۹۸	۲- "کلام طیب" اور "عمل صالح" میں فرق

۳۸۲	گذشتہ آیات پر ایک نظر
۳۸۳	آیت ۵۰ تا ۶۱
۳۸۴	جہنمی دوست کی تلاش
۳۸۴	چند نکات
۳۸۴	۱۔ جنتیوں کا دوزخیوں کے ساتھ ربط
۳۸۴	۲۔ یہ آیات کس شخص کے بارے میں
۳۸۴	نازل ہوئیں۔
۳۸۸	۳۔ اس قسم کی نعمت کے لیے کوشش کرنا
۳۹۰	آیت ۶۲ تا ۷۰
۳۹۱	اہل دوزخ کے لیے کچھ جانکاه عذاب
۳۹۶	آیت ۷۱ تا ۷۴
۳۹۶	گذشتہ گمراہ اقوام
۳۹۹	آیت ۷۵ تا ۸۲
۵۰۰	نوح کی داستان کا ایک گوشہ
۵۰۳	ایک حکمت
۵۰۳	کیا روئے زمین کے تمام لوگ نوح کی اولاد ہیں؟
۵۰۵	آیت ۸۳ تا ۹۴
۵۰۶	ابراہیم کی بت شکنی کا زبردست منظر
۵۱۲	چند اہم نکات
۵۱۶	آیت ۹۵ تا ۱۰۰
۵۱۶	مشرکین کے منصوبے ناک میں مل گئے
۵۲۰	چند اہم نکات
۵۲۰	۱۔ ہر چیز کا خالق وہی ہے

۳۵۱	آیت ۶ تا ۱۰
۳۵۱	شیاطین کے نفوذ سے آسمان کی حفاظت
۳۵۵	توضیح و تکمیل
۳۵۷	آیت ۱۱ تا ۱۵
۳۵۷	وہ ہر گز حق کو قبول نہیں کریں گے
۳۵۹	چند اہم نکات
۳۵۹	۱۔ "یتسخرون" کا مفہوم
۳۵۹	۲۔ اس آیت کی ایک شانِ نزول
۳۶۰	آیت ۱۶ تا ۲۳
۳۶۱	کیا ہم اور ہمارے آباء پھر زندہ ہو جائیں گے؟
۳۶۵	آیت ۲۴ تا ۳۲
۳۶۶	دوزخ میں گمراہ پیشواؤں اور پیروکاروں کی گفتگو۔
۳۶۹	چند اہم نکات
۳۶۹	۱۔ ولایتِ علیؑ کے بارے میں بھی سوال ہو گا
۳۷۰	۲۔ گمراہ پیشوا اور پیروکار
۳۷۲	آیت ۳۳ تا ۴۰
۳۷۳	گمراہ پیشواؤں اور ان کے پیروکاروں کا انجام
۳۷۵	۱۔ حکمت
۳۷۵	۲۔ مخلصین کا اجر و ثواب
۳۷۷	آیت ۴۱ تا ۴۹
۳۷۸	بہشت کی نعمتوں کا ایک گوشہ
۳۸۲	حکمت

۳۱۷	چند نکات
۳۱۷	۱۔ سب زرخست ہی کیوں؟
۳۱۸	۲۔ آتشِ زہ اور آتشِ گیر میں فرق
۳۱۹	آیت ۸۱ تا ۸۳
۳۱۹	وہ ہر چیز کا مالک و حاکم ہے
۳۲۲	چند نکات
۳۲۳	۱۔ معاد کا اعتقاد ایک فطری امر ہے
۳۲۳	۲۔ ایمان بالقیامت کا اثر انسانی زندگی پر۔
۳۲۵	۳۔ معاد کے عقلی دلائل
۳۲۳	۴۔ قرآن اور مسئلہ معاد
۳۲۵	۵۔ معاد جسمانی
۳۲۷	۶۔ بہشت و دوزخ
سورہ صافات	
۳۳۱	سورہ صافات کے مطالب
۳۳۱	۱۔ پہلا حصہ
۳۳۱	۲۔ دوسرا حصہ
۳۳۱	۳۔ تیسرا حصہ
۳۳۱	۴۔ چوتھا حصہ
۳۳۱	۵۔ پانچواں حصہ
۳۳۲	سورہ صافات کی تلاوت کی فضیلت
۳۳۳	آیت ۸۰ تا ۸۰
۳۳۳	وہ فرشتے جو انجامِ امور کیلئے آمادہ رہتے ہیں

۳۶۷	آیت ۲۸ تا ۵۳
۳۶۸	قیامت کی چیخ
۳۷۴	آیت ۵۴ تا ۵۸
۳۷۵	اہل بہشت مادی و روحانی نعمتوں سے سرشار ہوں گے۔
۳۷۹	سلام کہ جو اہل بہشت پر نچھاور ہوں گے
۳۸۰	آیت ۵۹ تا ۶۲
۳۸۰	شیطان کی پریشانی کیوں کرتے ہو
۳۸۷	آیت ۶۳ تا ۶۸
۳۸۸	جب زبان چپ ہوگی اعضاء گواہی دیں گے۔
۳۹۵	آیت ۶۹، ۷۰
۳۹۵	رسول شاعر نہیں بلکہ وہ زندوں کو ڈرانے والا ہے۔
۳۹۸	دلوں کی موت اور زندگی
۴۰۲	آیت ۷۱ تا ۷۶
۴۰۳	چوہاویں کے عظیم فائدے
۴۰۳	چند قابل توجہ نکات
۴۰۸	ایک اہم حکمت
۴۰۹	آیت ۷۷ تا ۷۹
۴۰۹	شانِ نزول
۴۱۰	خلقتِ اول معاد پر ایک دلیل قاطع ہے
۴۱۳	آیت ۸۰
۴۱۳	توانائیوں کی بازگشت

۲۔ ابراہیم کی ہجرت سے

- ۵۲۰ آیت ۱۰ تا ۱۱
- ۵۲۲ ابراہیم قرآن گاہ میں
- ۵۲۳ چند اہم نکات
- ۵۲۹ ۱۔ فریح اللہ کون تھا؟
- ۵۲۹ ۲۔ کیا ابراہیم فرزند کے ذبح کرنے پر مامور تھے؟
- ۵۳۰ ۳۔ حضرت ابراہیم کا خواب کس طرح محبت ہو سکتا ہے؟
- ۵۳۲ ۴۔ شیطانی دوسو سے ابراہیم کی عظیم روح پر اثر نہ کر سکے۔
- ۵۳۲ ۵۔ منیٰ میں تکبیرات کا فلسفہ
- ۵۳۳ ۶۔ حج ایک اہم انسان ساز عبادت ہے
- ۵۳۶ آیت ۱۱۱ تا ۱۱۳
- ۵۳۷ ابراہیم خدا کا مومن بندہ
- ۵۳۹ آیت ۱۱۴ تا ۱۲۲
- ۵۴۰ موسیٰ و ہارون پر خدائی نعمتیں
- ۵۴۳ آیت ۱۲۳ تا ۱۳۲
- ۵۴۳ یغریبہ الیاس مشرکین کے مقابلے میں چند اہم نکات
- ۵۴۷ ۱۔ الیاس کون تھا؟
- ۵۴۸ ۲۔ الیاسین کون تھا؟
- ۵۵۰ بیت ۱۳۳ تا ۱۳۸
- ۵۵۰ قوم کی تباہ سرزمین تمہارے سامنے ہے

آیت ۱۳۹ تا ۱۳۸
یونس امتحان کی بھٹی میں

- ۵۵۲
- ۵۵۴ چند اہم نکات
- ۵۶۱ ۱۔ حضرت یونس کی زندگی کی مختصر تاریخ
- ۵۶۱ ۲۔ یونس مچھلی کے پیٹ میں کیسے زندہ رہے۔
- ۵۶۲ ۳۔ چھوٹی سی داستان میں بہت سے سبق
- ۵۶۳ ۴۔ ایک سوال کا جواب
- ۵۶۳ ۵۔ اسلام میں قرعہ اندازی کی مشروعیت
- ۵۶۶ آیت ۱۳۹ تا ۱۴۰
- ۵۶۷ قبح تمہتیں
- ۵۶۷ آیت ۱۶۱ تا ۱۷۰
- ۵۷۲ جھوٹے دعوے
- ۵۷۵ آیت ۱۷۱ تا ۱۷۷
- ۵۸۰ اللہ کا گردہ کامیاب ہے
- ۵۸۱ ایک اہم سوال
- ۵۸۲ ہمارا جواب
- ۵۸۲ آیت ۱۷۸ تا ۱۸۲
- ۵۸۶ ان کا اعتقاد نہ کر
- ۵۸۶ ہر کام کے آخر میں سوچنے کی بات
- ۵۸۹
- ۵۹۲
- ۵۹۳

سورہ ص

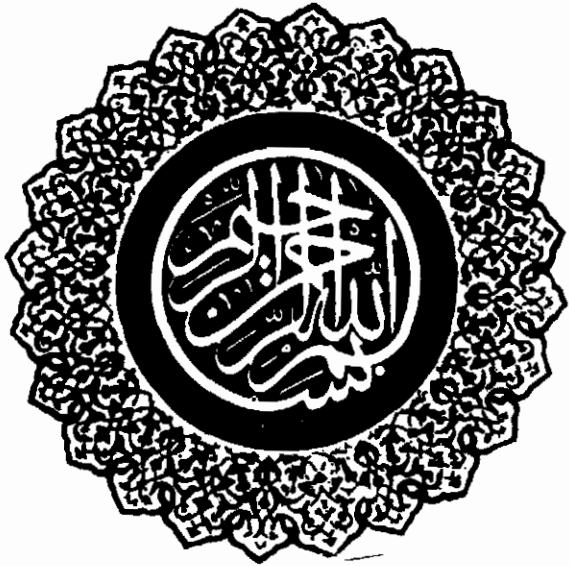
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت
آیت ۳ تا ۳

تمہاری نجات کا وقت گزر چکا ہے

- ۵۹۵ آیت ۷ تا ۷
- ۵۹۹ بہت سے خداؤں کی بجائے ایک خدا
- ۶۰۱ آئین نوسے ڈرنا
- ۶۰۳ آیت ۸ تا ۱۱
- ۶۰۶ یہ چھوٹا سا شکست خوردہ لشکر
- ۶۰۶ آیت ۱۲ تا ۱۶
- ۶۱۰ صرف ایک آسمانی صحیفہ کافی ہے
- ۶۱۰ آیت ۱۷ تا ۲۰
- ۶۱۶ واؤد کی زندگی سے سبق حاصل کریں
- ۶۱۶ حضرت کی اہم صفات
- ۶۱۸ آیت ۲۱ تا ۲۵
- ۶۲۱ حضرت داؤد کی ایک آزمائش
- ۶۲۲ چند اہم نکات
- ۶۲۵ ۱۔ داؤد کو پیش آمدہ واقعہ کی حقیقت
- ۶۲۵ ۲۔ موجودہ تورات کی خرافاتی داستانیں
- ۶۲۸ اب ہم سوال کرتے ہیں
- ۶۳۱ مفسرین کی توجیحات
- ۶۳۳ آیت ۲۶ تا ۲۹
- ۶۳۳ عدل کر دو اور ہوائے نفس سے بچو
- ۶۳۸ چند اہم نکات
- ۶۳۸ ۱۔ تقویٰ اور فحور ایک دوسرے کی ضد
- ۶۳۹ ۲۔ یہ آیات کس کے بارے میں ہیں؟
- ۶۴۰ آیت ۳۰ تا ۳۳

سلیمان اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں

- ۶۴۰ آیت ۳۴ تا ۴۰
- ۶۴۶ سلیمان کا سخت امتحان اور وسیع حکومت
- ۶۴۷ دو سوال اور ان کے جواب
- ۶۴۷ ۱۔ کیا سلیمان کے اس تقاضے سے نخل کی پونہیں آتی؟
- ۶۴۸ ۲۔ کیا امام مہدی کی حکومت وسیع تر نہ ہوگی؟
- ۶۵۲ چند اہم نکات
- ۶۵۲ ۱۔ داستان سلیمان سے حاصل ہونے والا درس
- ۶۵۲ ۲۔ سلیمان قرآن اور تورات میں
- ۶۵۴ آیت ۴۱ تا ۴۴
- ۶۵۴ حضرت ایوب کی حیران کن زندگی اور ان کا صبر۔
- ۶۵۹ چند اہم نکات
- ۶۵۹ ۱۔ ایوب کی داستان کے اہم درس
- ۶۶۱ ۲۔ ایوب قرآن اور تورات میں
- ۶۶۲ ۳۔ عظیم پیغمبروں کی آداب کہہ کر توصیف
- ۶۶۴ آیت ۴۵ تا ۴۸
- ۶۶۴ چھ اور عظیم پیغمبر
- ۶۶۹ آیت ۴۹ تا ۵۴
- ۶۶۹ پرہیزگاروں کے لیے وعدہ
- ۶۷۳ آیت ۵۵ تا ۶۱
- ۶۷۳ سرکشوں کی سزا
- ۶۷۸ آیت ۶۲ تا ۶۴



		۲۰	
۶۹۳	چند اہم نکات	۶۷۸	اصحابِ دوزخ کی دشمنی
۶۹۳	۱۔ شیطان کے وجود کا فلسفہ	۶۷۹	ایک نکتہ
۶۹۵	۲۔ آتشِ غرور سب کچھ جلا دیتی ہے	۶۸۱	آیت ۶۵ تا ۷۰
۶۹۷	آیت ۸۲ تا ۸۸	۶۸۱	میں ایک نذیر ہوں
۶۹۷	ابلیس کے بارے میں آخری بات	۶۸۶	آیت ۷۱ تا ۸۳
۶۹۹	مشکلف کون ہے؟	۶۸۷	تکبر کیا اور رائدہ درگاہ ہو گیا

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ

تفسیر نمونہ جلد ۱۰

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

۱۔ سورہ سباء ۲۔ سورہ فاطر ۳۔ سورہ یسین
۴۔ سورہ صافات ۵۔ سورہ ص

سورہ سباء: مکی سورت ہے اور اس کی ۵۴ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۲

سورہ فاطر: مکی سورت ہے اور اس کی ۴۵ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۲

سورہ یسین: مکی سورت ہے اور اس کی ۸۳ آیات ہیں۔

پارہ ۲۲ — آتا ۲۱ پارہ ۲۳ — ۲۲ تا ۸۳

سورہ صافات: مکی سورت ہے اور اس کی ۱۸۲ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۳

سورہ ص: مکی سورت ہے اور اس کی ۸۸ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۳

سورہ سبأ

سورہ سبأ مکہ میں
نازل ہوئی

اور
اس کی ۴۵ آیات ہیں



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورہ سب کے مطالب و مضامین

یہ سورہ جو قوم "سب" کی سرگزشت کی مناسبت سے "سب" کے نام سے موسوم ہوئی ہے۔ "مکی" سورتوں میں سے ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ مکی سورتوں کے مطالب و مضامین عام طور پر معارفِ اسلامی اور اصول ہائے اعتقادی خصوصاً "مبدأ" و "معاد" اور "نبوت" ہوتے ہیں۔

اور اس سورہ کی زیادہ تر بحث بھی انہی امور کے گرد گھومتی ہے، کیونکہ مکہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی عقائد کے لحاظ سے تعبیر کی جا رہی تھی اور فروع پر عمل کرنے اور حکومتِ اسلامی کے قیام اور تمام اسلامی پروگراموں کو عملی شکل دینے کے لیے انہیں آمادہ اور تیار کیا جا رہا تھا۔

کلی طور پر یہ کہنا چاہیے کہ اس سورہ میں پانچ مطالب کو مد نظر رکھا گیا ہے،

۱۔ "مسئلہ توحید" اور عالمِ ہستی میں خدا کی چند نشانیوں اور اس کی پاک صفات، "مجلد ان کے" توحید" اور "الوہیت"۔

۲۔ "مسئلہ معاد" جو اس سورہ میں دوسرے مسائل کی نسبت زیادہ بیان ہوا ہے۔ اس پر مختلف طریقوں سے طرح طرح کی بحثیں عنوان کی گئی ہیں۔

۳۔ "گزشتہ انبیاء" اور خصوصاً پیغمبرِ اسلام کی نبوت کا مسئلہ" اور اس کے بارے میں دشمنوں کی بہانہ سازوں کا جواب اور گزشتہ انبیاء کے کچھ معجزات کا بیان۔

۴۔ حضرت سلیمان اور قوم سب کی زندگی کے ایک گوشہ کے بیان کے ضمن میں خدا کی عظیم نعمتوں کے ایک بھتہ اور شکر گزاروں اور کفرانِ نعمت کرنے والوں کے انجام کا ذکر۔

۵۔ "غور و فکر کی دعوت" ایمان و عمل صالح کی ترغیب اور ان عوامل کی نوع بشر کی سعادت و نیک بختی میں تاثیر اور مجموعی طور پر حق کی جستجو کرنے والوں کی تربیت کے لیے ایک جامع پروگرام۔

اس سورہ کی فضیلت

اسلامی روایات میں اس سورہ کی اہمیت اور اس کی تلاوت کے سلسلے میں عمدہ اور جاذبِ نظر قسم کی تعبیریں نظر آتی ہیں۔

مجلد ان کے پیغمبرِ اسلام سے ایک حدیث میں اس طرح منقول ہوا ہے کہ:

من قرأ سورة سبالم یبق نبی ولا رسول الا کان له یوم القیامة رفیقاً ومصاحباً۔
جو شخص سورہ سب کو پڑھے گا، قیامت میں تمام انبیاء و مرسلین اس کے رفیق و ہم نشین ہوں گے اور سب کے سب اس سے مصافحہ کریں گے۔

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ:

من قرأ الحمدین جمعاً، سباً و فاطر، فی لیلة لم یزل لیلۃ فی حفظ اللہ تعالیٰ و کلائہ، فان قرأہما فی نہارہ لم یصبہ فی نہارہ مکر وہ و اعطی من خیر الدنیا و خیر الآخرة ما لم یخطر علی قلبہ و لم یبلغ صناہ۔

جو شخص ان دو سورتوں کو کہ جن کی الحمد کے ساتھ ابتدا ہوتی ہے (سورہ سب اور فاطر) کو کسی رات میں پڑھے گا تو وہ ساری رات خدا کی حفاظت و نگرانی میں رہے گا اور اگر ان دونوں کو دن میں پڑھے گا تو (اس دن) کوئی مکر وہ اور ناپسندیدہ بات اسے پیش نہیں آئے گی، اور اسے اس قدر خیر و دنیا و آخرت عطا کیا جائے گا کہ اس کے دل میں کبھی اس کا گمان بھی نہ گزرا ہوگا اور نہ اس نے اس کے بارے میں کبھی سوچا ہوگا اور نہ آرزو کی ہوگی۔

جیسا کہ ہم نے ہر سورہ کے آغاز میں اس بات کی یاد دہانی کرائی ہے کہ مسئلہ طور پر یہ عظیم ثواب ان لوگوں کو نہیں ملے گا کہ جو صرف ان کو زبان سے پڑھنے ہی کو کافی سمجھیں گے، بلکہ یہ پڑھنا غور و فکر کرنے کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہونا چاہیے کہ جو انسان کو عمل کرنے پر آمادہ و تیار کرے۔

مثلاً جو شخص اس سورہ کو پڑھتا ہے وہ اس نکتہ سے باخبر ہو جاتا ہے کہ خدا کی بے حساب نعمتوں کا کفران کرنے کے نتیجے میں، قوم سب کی زندگی ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ وہ سب کے لیے عبرت بن گئے اور ان کا انجام دنیا والوں کے لیے ایک ضربِ التنبہ بن گیا، اس قسم کے انسان نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ایسا شکر کہ جو عملی پہلو لیے ہوئے ہو، مشغول ہو جاتے ہیں، اور خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے اس کی حفظ و امان میں رہیں گے۔

اس سلسلے میں ہم سورہ نور کی ابتدا میں زیادہ تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

- ① اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهٗ
اَلْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝
- ② یَعْلَمُ مَا یَلِیْجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا
یَنْزِلُ مِنَ السَّمٰوٰءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ۚ وَهُوَ
الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ ۝

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

- ① حمد و ستائش اس خدا کے لیے مخصوص ہے کہ جو ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور آخرت میں بھی وہی حمد کے لائق ہے اور وہ حکیم اور ہر چیز سے باخبر ہے۔
- ② جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے وہ اُسے بھی جانتا، اور جو کچھ اس سے باہر نکلتا ہے (اس کا علم بھی رکھتا ہے)، اور (اسی طرح) جو کچھ آسمانوں سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ اس میں اوپر جاتا ہے (سب نے باخبر ہے) اور وہ ہر بیان اور بختنے والا ہے۔

تفسیر

وہی ہر چیز کا مالک اور ہر چیز کا عالم ہے
قرآن مجید کی پانچ سورتیں پروردگار کی حمد سے شروع ہوتی ہیں، جن میں سے تین سورتوں میں

خدا کی حمد و تعریف آسمان و زمین اور دوسرے موجودات کی خلقت کی بنا پر ہے (سورہ سبأ، سورہ فاطر اور سورہ انعام) اور ایک سورہ (سورہ کہف) میں یہ حمد و ثنا پیغمبر کے قلب پاک پر متاثران کی نزول کی بنا پر ہے۔

جبکہ سورہ حمد میں ایک جامع تعبیر ہے کہ جو ان تمام امور کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے: (الحمد لله رب العالمین)

ہر حال سورہ سبأ کے ابتدا میں خدا کی حمد و ثنا کے ساتھ گفتگو دنیا و آخرت میں اس کی مالکیت حاکمیت کی بنا پر ہے، فرماتا ہے:

”حمد مخصوص ہے اس خدا کے لیے کہ جو آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کا مالک ہے“ (الحمد لله الذی له ما فی السموات وما فی الارض)۔

اور آخرت میں بھی حمد اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے (وله الحمد فی الآخرة)۔

اسی طرح سے دونوں جانوں کی حاکمیت و مالکیت اسی کے لیے ہے۔ ہر نعمت، ہر مہربانی ہر فائدہ و برکت اور ہر موزوں و عجیب و غریب خلقت اسی کی ذات پاک کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اسی بنا پر ”حمد“ کہ جس کی حقیقت ”اچھے اور اختیاری کاموں“ پر تعریف و ستائش ہے، سب کی سب اسی کی طرف لوٹتی ہیں۔

اور اگر مخلوقات میں بھی کوئی لائق حمد و ستائش ہے تو وہ بھی اسی کے وجود کا پرتو اور اس کے افعال و صفات کی ایک شعاع ہے۔

اس بنا پر اس دنیا میں جو بھی کسی چیز کی حمد و ستائش کرتا ہے تو یہ حمد و ستائش آخر کار اسی کی پاک ذات کی طرف لوٹ جاتی ہے اور بقول شاعر:

یہ جہاں خرم از آنم کہ جہاں خرم از اوست
عاشقم بر ہمد عالم کہ ہمد عالم از اوست

”نہیں اس جہان سے اس وجہ سے خوش ہوں کیونکہ یہ جہان اسی کی وجہ سے خوش ہے“
”نہیں سارے عالم پر اس وجہ سے عاشق ہوں کیونکہ سارا عالم اس کی طرف سے ہے“
آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: ”وہ حکیم اور خیر ہے“ (وهو الحکیم الخبیر)۔

اس کی حکمت بالغہ کی بنیاد پر ہی یہ عجیب و غریب نظام جہان پر حکومت کر رہا ہے اور اس کے علم و آگاہی کی بنیاد پر ہی ہر چیز اپنی جگہ پر برقرار ہے اور ہر موجود کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ اس کے اختیار میں ہے۔

اس بارے میں کہ خدا کی آخرت کے بارے میں حمد سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس پر

بہت بھٹ کی ہے۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اگرچہ دارِ آخرت دارِ تکلیف نہیں ہے، لیکن خدا کے بندے وہاں پر اس کی عاشقانہ انداز میں حمد و ستائش کریں گے اور اس کی حمد و ستائش سے لذت حاصل کریں گے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ہستی تو اس کے فضل و کرم کی وجہ سے اس کی حمد کریں گے اور دو ذخی اس کے عدل و انصاف کی وجہ سے۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے، کہ وہ انسان کہ جو اس دنیا میں نہیں وہ اپنے قلب و فکر پر پڑے ہوئے حجابوں کی وجہ سے غالباً اس کی خالص حمد و ثنا نہیں کرتے لیکن قیامت میں تمام حجاب ہٹ جائیں گے اور: "المملک یومئذ للہ" کے مصداق تمام عالم ہستی پر خدا کی مالکیت سب پر واضح و آشکار ہو جائے گی، اور سب کے سب کامل خلوص نیت کے ساتھ اس کی حمد و ثنا میں مشغول ہو جائیں گے۔ علاوہ ازیں اس جہان میں تو یہ بات ممکن ہے کہ انسان غافل ہو جائیں اور کچھ موجودات کو ذاتِ خدا سے مستقل خیال کر لیں اور ان کی تعریف و توصیف کرنے لگیں، لیکن وہاں تو سب کا اس کی پاک ذات کے ساتھ تعلق اس طرح سے واضح و آشکار ہو جائے گا جس طرح اس دنیا میں سورج کی شعاعوں کا سورج کے ساتھ رابطہ واضح و آشکار ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر قرآن مجید میں بھی بار بار آیا ہے کہ جنتی وہاں خدا کی حمد کریں گے: "واخرد عواہم ان الحمد للہ رب العالمین" (یونس، آیہ ۱۰) جنتیوں کی آخری بات یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ حمد و تعریف اس خدا کے لیے ہے کہ جو عالمین کا پروردگار ہے۔

دوسری جگہ ہم یہ پڑھتے ہیں کہ جس وقت نو مین بہشت جاو دانی میں وارد ہوں گے تو وہ یہ کہیں گے: "حمد و شکر ہے اس خدا کے لیے کہ جس نے ہم سے غم و اندوہ کو طرف کیا۔" (رواقوالوا الحمد للہ الذی اذہب عنا الحزن) (فاطر: ۳۴)

یہ حمد و ثنا صرف انسانوں اور فرشتوں کی زبان سے ہی نہیں، بلکہ عالم ہستی کے تمام ذرات سے بھی اس کی حمد و تسبیح کا زمرہ باہوش کان میں پہنچ رہا ہے، کوئی موجود بھی ایسا نہیں ہے کہ جو اس کی حمد و تسبیح نہ کرتا ہو۔

بعد والی آیت، گزشتہ آیت میں خدا کی "حکیم" و "خبیر" کے ساتھ توصیف کی مناسبت سے پروردگار کے بے پایاں علم کے ایک گوشہ کی تشریح کر رہی ہے اور اس طرح کہتی ہے: "جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اس سے باہر نکلتا ہے وہ اس سے بھی آگاہ ہے" (یعلموما

یلج فی الارض وما یخرج منها)۔

ہاں! وہ جانتا ہے بارش کے تمام قطرات اور سیلاب کی موجوں کو جو زمین کی گہرائیوں میں داخل ہوتی ہیں اور نفوذ پذیر طبقہ تک پہنچتی ہیں اور وہاں مجتمع ہو جاتی ہیں، اور انہوں کے لیے ذخیرہ بن جاتی ہیں۔

وہ باخبر ہے گیہ اور سبزہ زاروں کے دانوں سے کہ جو ہوا یا حشرات الارض کی مدد سے وسیع و عریض زمین میں بکھرتے ہیں اور زمین کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور ایک دن سرسبز درخت یا پھل بھرے گیہ اور سبزے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

وہ باخبر ہے درختوں کی جڑوں سے، کہ جس وقت وہ پانی اور غذا کی تلاش میں زمین کی گہرائیوں میں چلتی ہیں۔

برقی لمروں سے، مختلف گیہوں اور ہوا کے ذرات سے، کہ جو زمین کے اندر نفوذ کرتے ہیں، ان جانداروں سے کہ جو زمین کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور اسے زندگی بخنتے ہیں، نیز حشرات، دفتینوں اور مردہ چیزوں کے بدنوں سے، خواہ وہ انسان ہوں یا غیر انسان، کہ جو اس زمین میں دفن ہیں ہاں! وہ ان سب سے باخبر ہے۔

اسی طرح ان گیاہوں اور سبزیوں سے کہ جو زمین سے نکلتے ہیں، ان انسانوں سے کہ جو اس سے اٹھے (پیدا ہوئے) ہیں، ان چشموں سے جو اس سے ابلتے ہیں، ان گیہوں سے جو اس سے اٹھتی ہیں، ان آتش فشاں پہاڑوں سے کہ جو اس سے بھڑکتے ہیں اور ان حشرات سے کہ جو زمین کے اندر چلنے پھرنے اور اس سے سر باہر نکالتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ان تمام موجودات سے، کہ جو زمین کی گہرائیوں سے باہر نکلتے ہیں، خواہ ہم ان میں سے کسی کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، وہ ان تمام پر مطلع اور سب آگاہ ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ ان تمام چیزوں سے کہ جو آسمان سے نازل ہوتی ہیں یا آسمان کی طرف اوپر جاتی ہیں، باخبر ہے" (وما یینزل من السماء وما یصیر فیہا)۔

بارش کے قطرے سے، سورج کی حیات بخش شعاعوں سے، وحی اور آسمانی شریعتوں کی طاقتور موجوں سے، ان فرشتوں سے جو تبلیغ رسالت یا دوسرے کاموں کی انجام دہی کے لیے زمین پر نازل ہوتے ہیں، ان کبریائی شعاعوں سے کہ جو فضا کے باہر سے زمین پر نازل ہوتی ہیں، ان شہابوں اور فضا میں گھومنے والے سگیزوں سے کہ جو زمین کی طرف (آتے ہوئے فضا میں) جذب ہو جاتے ہیں وہ ان سب آگاہ ہے۔

نیز بندوں کے اعمال سے کہ جو آسمان کی طرف مروج کرتے ہیں، ان فرشتوں سے کہ جو اپنی رسالت کی ادائیگی کے بعد آسمانوں کی طرف لوٹتے ہیں، ان شیاطین سے کہ جو (استراق بع) باتیں چرانے کے لیے آسمانوں کی طرف جاتے ہیں، اونچے اونچے درختوں کی شاخوں سے جو آسمان کی طرف سر اٹھانے بڑھ چلی جا

رہی ہیں، اُن بخارات سے کہ جو سمندروں سے اٹھتے ہیں اور آسمان کی بلندی پر جا کر بادل بناتے ہیں، اُس آہ و فریاد سے کہ جو کسی مظلوم کے دل سے اٹھتی ہے اور آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے، ہاں! وہ ان تمام چیزوں سے آگاہ ہے۔

کیا اس کے سوا اور بھی کوئی ان امور سے آگاہ ہے؟ کیا نوع بشر کے تمام دانشمند اور علماء کا علم ان معلومات کے کسی ایک گوشہ پر احاطہ رکھتا ہے؟

آخر میں مزید کہتا ہے: "وہ رحیم ہے اور غفور، مہربان اور بخشنے والا" (وہو الرحیم الغفور)۔

اس مقام پر خدا کی ان دو صفات کے ساتھ توصیف، یا تو اس بنا پر ہے کہ ان امور میں سے کہ جو آسمان کی طرف ادا پر چڑھتے ہیں، وہ بندوں کے اعمال اور ان کی ارواح ہیں، تو وہی ان کے اوپر اپنی رحمت مغفرت کا سایہ ڈالنے والا ہے۔

یا اس بنا پر ہے کہ آسمانی برکات و مواہب کا نزول اس کی رحمت کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ اعمال صالح کہ جو بندوں کی طرف سے "والعمل الصالح یرفعہ" کے مطابق ادا پر جاتے ہیں، اس کی مغفرت کو پالیتے ہیں۔

یاد رہے کہ وہ لوگ کہ جو ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں، تو رحمت ان کے شامل حال ہوتی ہے اور وہ لوگ کہ جو قصور دار اور گنہگار ہیں، اگر حد سے نہ بڑھ جائیں تو مغفرت ان کے شامل حال ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ادا پر دالی آیت اپنے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے ایک وسیع و باریع معنی رکھتی ہے اور اس کو ایک ہی جہت میں محدود نہیں کرنا چاہیے۔

۳ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۗ قُلْ بَلَىٰ وَ

رَبِّي لَأَتِيَتْكُمْ ۗ عَلَيْهِمُ الْغَيْبُ ۗ لَا يَعْرِزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ

فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرُ

إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝

۴ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ

مَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝

۵ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيٰتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ

مِّن رَّجْزٍ أَلِيمٍ ۝

ترجمہ

۳ کافروں نے کہا: قیامت ہرگز ہمارے پاس نہیں آئے گی، تم کہہ دو، ہاں!

مجھے اپنے پروردگار کی قسم وہ ضرور ضرور تمہارے پاس آئے گی، وہ خدا کہ جو

غیب سے آگاہ ہے، آسمانوں اور زمین میں نہ تو ایک ذرہ کے وزن کے برابر

کوئی چیز اس سے مخفی رہے گی، نہ اس سے کچھ چھوٹی نہ اس سے زیادہ بڑی، مگر

یہ کہ وہ کتاب مبین میں ثبت ہے۔

۴ اس سے اصل مقصد یہ ہے، تاکہ وہ اُن لوگوں کو کہ جو ایمان لائے اور انہوں

نے نیک عمل انجام دیئے، جزا و ثواب دے، ان کے لیے بخشش اور باعزت

روزی ہے۔

۵ وہ لوگ کہ جو ہماری آیات (کی تکذیب) کی گوشش میں لگے ہوئے ہیں، اور انہوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ ہماری قدرت کے احاطہ سے باہر نکل جائیں گے، ان کے لیے بُرا اور دردناک عذاب ہوگا۔

تفسیر

پروردگار کی قسم قیامت آگے رہے گی

گزشتہ آیات اس حالت کے باوجود، کہ وہ توحید اور خدا کی صفات کا بیان کرتی تھیں، وہ مسئلہ معاد کے لیے بھی زمین کو ہموار کر رہی تھیں، کیونکہ — جیسا کہ ہم دیکھیں گے — معاد کی بحث کی مشکلات خدا کے لیے بے پایاں علم کے طریق کے سوا حل نہیں ہوتیں۔

اس لیے زیر بحث آیت میں پہلے کتا ہے: "کافروں نے کہا: یہ جھوٹ ہے کہ کوئی قیامت ہمیں پیش آنے والی ہے، ہرگز قیامت ہمارے پاس نہیں آئے گی" (وقال الذین کفرو الا تاتینا الساعة)۔ نہ صرف ہمارے، بلکہ انسانوں میں سے کسی کے لیے بھی قیامت نہیں ہے!

وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ آزادی کے ساتھ جو کام ان کا دل چاہے کرتے رہیں اور اس امید پر کہ حساب و کتاب اور عدل و انصاف تو کچھ ہوگا ہی نہیں، لہذا جو کام بھی ان سے ہو سکے کر لیں۔

لیکن چونکہ قیامت کے دلائل واضح در روشن ہیں لہذا قرآن ایک قاطع اور دو ٹوک جملہ کے ساتھ یہاں نتیجہ کی صورت میں پیغمبر سے کتا ہے کہ: "کہہ دو کہ ہاں! میرے پروردگار کی قسم کہ قیامت تم سب کے پاس ضرور آئے گی" (قل بلی وری لتاتینکوا)۔

لفظ "رب" پر انحصار اس سبب سے ہے کیونکہ قیامت ربوبیت کے افعال میں سے ایک فعل اور ایک شان ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا انسان کا مالک و مربی تو ہو، اور انہیں ارتقائی منازل میں آگے بھی بڑھائے لیکن انہیں بیخ میں ادھورا چھوڑ دے، اور ان کے مرتے ہی تمام چیزیں ختم ہو جائیں اور اس کی زندگی بے مقصد اور اس کی پیدائش بیہودہ اور فضول ہو کر رہ جائے۔

سورہ تغابن کی آیت ۲ میں بھی اسی صفت کا سہارا لیا ہے، چنانچہ فرماتا ہے: "رَعَوْا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اَنْ لَّنْ یُعْشَوْا قُلُوبُ بَلٰی وَرَبِّیْ لَیُبْعَثُنَّ شَعْرًا لَّیْتَبَوْنَ بِمَا عَمِلُوْا"۔ (کافروں نے یہ گمان کر لیا ہے، کہ وہ ہرگز زندہ کر کے) اٹھائے نہیں جائیں گے، تم کہہ دو: ہاں! میرے پروردگار کی قسم تم سب کے سب قیامت میں ضرور بالضرور (زندہ کر کے) اٹھائے جاؤ گے، پھر تم سب اپنے اعمال اور ان

کے نت نچ سے آگاہ ہو گے۔

چونکہ معاد کی مخالفت کرنے والوں کے اعتراضات میں سے ایک یہ تھا کہ جب انسان کا بدن مٹی ہو جائے گا اور اس کے اجزائے بدن اطراف زمین میں بکھر جائیں گے، تو کون انہیں پہچان سکے گا اور کون انہیں اکٹھا کر سکے گا، اور نئی زندگی کیلئے پلٹائے گا؟ دوسری طرف کون ایسا ہے کہ جو بندوں کے تمام پینہاں و آشکار اور اندرونی و بیرونی اعمال کو محفوظ رکھ سکے اور ہر موقع ان کا حساب کر سکے؟ لہذا اس آیت کے آخر میں مزید کتا ہے کہ: "وہ تمام پوشیدہ امور سے باخبر ہے، اور نہ تو تمام آسمانوں میں اور نہ ہی زمین میں، ایک ذرہ کی مقدار کے برابر بھی، اس کے بے پایاں علم کے سامنے چھپا ہوا نہیں رہے گا" (عالم الغیب لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السماوات ولا فی الارض)۔

"اور نہ تو کوئی چیز ذرہ سے چھوٹی، اور نہ ہی اُس سے بڑی ایسی ہے، کہ جو سب کی سب کتاب مبین میں ثبت و ضبط نہ ہو" (ولا اصغر من ذلک ولا اکبر الا فی کتاب مبین)۔ اس طرح سے نہ تو انسان کے بدن کے ذروں کا زمین میں بکھر جانا اور نہ ہی ان کا دوسرے موجودات میں مل جانا یہاں تک کہ ان اجزاء کا تمام انسانوں کے بدن میں غذائی مادوں کی صورت میں داخل ہو جانا بھی، ان کو واپس اپنے اپنے بدن میں لوٹانے کے لیے کسی قسم کی کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گا۔

ان کے اعمال بھی اس جہان میں باقی رہتے ہیں چاہے وہ اپنی شکل کو کتنی ہی بدل لے، وہ ان تمام سے ابھی طرح آگاہ ہے۔

اس تعبیر کی تفسیر سورہ "ق" کی آیت ۳، ۴ میں بھی آئی ہے ارشاد ہوتا ہے کہ: (اذا امتنا و کنا تراباً ذلک رجیع بعید قد علمنا ما تنقص الارض منہم و عندنا کتاب حفیظ) "کیا ہم مرجاتیں گے اور (خاک میں مل کر) خاک ہو جائیں گے، تو کیا ہم دوبارہ پلٹ کر آئیں گے؟ یہ بات تو بہت بعید (ناممکن) ہے لیکن انہیں جان لینا چاہیے کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ زمین ان کے اجزاء کو کس طرح سے کم کر رہی ہے اور اپنے اندر ملائی جا رہی ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے کہ جس میں یہ تمام امور محفوظ ہیں"۔

اس بارے میں کہ "کتاب مبین" سے کیا مراد ہے، بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے: کہ اس سے مراد وہی "لوح محفوظ" ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "لوح محفوظ" کیا ہے؟

۱ "عزب" "عزب" کے مادہ سے اصل میں چر آگاہ حاصل کرنے کے لیے گھر والوں سے دور ہونے کے معنی میں ہے، اس کے بعد ہر قسم کے غائب ہونے اور پینہاں ہونے کے معنی میں اطلاق ہوا اور اسی مناسبت سے ان مردوں یا عورتوں کو جو اپنی بیوی یا شوہر سے دور رہ گئے ہوں "عزب" یا "عزبہ" کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، کہ "لوح محفوظ" کی نزدیک ترین تفسیر جو بیان کی جاسکتی ہے وہی "پروردگار کے علم سے پایاں" کی لوح ہے۔ ہاں! اس لوح میں ہر چیز ثبت و ضبط ہے اور اس میں کسی قسم کے تغیر اور درگونی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

دستِ دہریہ عالمِ حسی بھی اسی لوح محفوظ کا انعکاس ہے۔ کیونکہ ہمارے وجود کے تمام ذرات بھی، اور ہمارے تمام اقوال و اعمال بھی اس میں محفوظ رہتے ہیں، چاہے ظاہری طور پر صورت کتنی ہی بدل جائے، لیکن وہ ختم ہرگز نہیں ہوتے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد دو آیات میں قیامت کے قیام کا مقصد بیان کرتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں منکرین کے لیے سولحہ جہان کے بعد اس قسم کے ایک عالم کے ضروری اور لازمی ہونے کی دلیل کو بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے: "اس سے مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل انجام دیئے ہیں، انہیں جزا دے" (یعجزی الذین آمنوا و عملوا الصالحات)۔ ہاں! ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے (اولئک لہم مغفرة و رزق کریم)۔

اگر مومنین کو ان کے نیک عمل کی جزا نہ ملے، تو کیا اصل عدالت کہ جو خلقت کا انتہائی بنیادی اصول ہے معطل نہیں ہو جائے گی؟ کیا پروردگار کی عدالت بغیر کسی مفہوم کے برقرار رہ سکتی ہے؟ جبکہ ہم اس جہان میں بہت سے ایسے افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہرگز اپنے نیک اعمال کی جزا اس دنیا میں نہیں پاتے، اس بنا پر کوئی ایسا جہان ضرور ہونا چاہیے، تاکہ یہ اصل دہاں پر حقیقت بن سکے۔

"مغفرت" کو "رزق کریم" پر مقدم رکھنا ممکن ہے اس وجہ سے ہر تاکہ مومنوں کو زیادہ تر پریشانی ان لغزشوں کی وجہ سے ہوتی ہے جن کے ہونے کا انہیں احتمال ہوتا ہے، لہذا سب سے پہلے ان کی بخشش کو بیان کر کے، انہیں ولی سکون بخشا ہے، علاوہ ازیں جب تک وہ خدا کی مغفرت کے پانی کے ساتھ ہر قسم کے گناہ کی گندگی سے پاک صاف نہ ہو جائیں اس وقت تک وہ "رزق کریم" اور "مقام کریم" کے لائق نہیں ہوں گے۔

"رزق کریم" ہر قدر و قیمت رکھنے والی روزی کے معنی میں ہے، اور اس کے مفہوم کی وسعت اس حد تک ہے، کہ اس میں تمام مواہب و انعامات خداوندی شامل ہیں، یہاں تک کہ وہ نعمتیں بھی کہ جنہیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی شخص کے وہم و گمان میں کبھی آئیں، دوسرے لفظوں میں بہشت اپنی تمام مادی و معنوی نعمتوں کے ساتھ اس لفظ میں جمع ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے "کریم" کی دو چیزوں میں خوب سے بغیر دوسرے عنوان سے تفسیر کی ہے۔ لیکن نظریہ آتا ہے کہ اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

❖ ❖ ❖

چونکہ عدالت کا دوسرا حصہ گنہگاروں اور مجرموں کو سزا دینے سے متعلق ہے اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "وہ لوگ کہ جو ہماری آیات کی تکذیب اور ان کے ابطال و انکار کی کوشش میں لگے ہوتے تھے، اور یہ تصور کرتے تھے کہ وہ ہماری قدرت کے احاطہ سے باہر نکل سکتے ہیں تو ان کے لیے بدترین اور دردناک ترین عذاب ہوگا" (والذین سعوا فی آیاتنا معاجزین اولئک لہم عذاب من رجز الیم)۔

دہاں گفتگو "رزق کریم" کے بارے میں تھی، اور یہاں "رجز الیم" کے بارے میں ہے۔

"رجز" (بروزن کذب) اصل میں "اضطراب" اور "اعتدال کو برقرار رکھنے کی طاقت نہ ہونے کے" معنی میں ہے، لہذا جس وقت اونٹ بیمار و ناتواں ہو جاتا ہے، اور وہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ چلتے ہوئے پھوٹے پھوٹے قدم اٹھائے، تاکہ کچھ نہ کچھ اپنے اعتدال کو برقرار رکھ سکے تو عرب اس حالت کو "رجز" کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہر قسم کے گناہ اور پلیدگی پر اطلاق ہونے لگا۔

لفظ "رجز" (بروزن مرض) کا اطلاق مخصوص جنگی اشعار پر بھی اسی بنا پر ہوتا ہے کہ اس کے مقطع مختصر اور ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔

ہر حال یہاں "رجز" سے مراد بدترین قسم کا عذاب ہے، جس کی لفظ "الیم" کے ذکر کے ساتھ بھی تاکید ہوتی ہے، اور وہ دردناک جسمانی و روحانی عذابوں کی تمام اقسام کو شامل ہے۔

بعض نے اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کی ہے، کہ یہاں فترت آن نے ہشتیوں کی نعمتوں کو بیان کرتے ہوئے لفظ "من" کو بیان نہیں کیا، تاکہ یہ بات ان کی وسعت کی دلیل ہو لیکن یہ لفظ "من" عذاب کے بارے میں آیا ہے تاکہ نسبتی محدودیت اور رحمت کے بیان کی نشانی ہو۔

"سعوا" "سعی" کے مادہ سے ہر قسم کی سعی و کوشش کے معنی میں آیا ہے اور

یہاں پر آیات حق کی تکذیب و انکار، اور لوگوں کو پروردگار کے دین و آئین کی طرف بھگاؤ سے روکنے کی کوشش کرنا مراد ہے۔

”معاجزین“ معاجزہ کے مادہ سے عاجز کرنے کے معنی میں ہے، اور اس قسم کے مواقع پر ایسے لوگوں پر اطلاق ہوتا ہے کہ جو کسی کے ہاتھ سے اس طرح فرار کر جائیں کہ وہ ان پر تسلط حاصل نہ کر سکے، یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے، کہ مجربین کی یہ توصیف اس سوچ کی بنا پر ہے کہ جو ان کے عمل سے نمایاں تھی، ان کے اعمال ایسے لوگوں سے مشابہ تھے کہ جو یہ تصور کرتے تھے کہ وہ جس قسم کا جرم کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور پھر وہ خدا کی قدرت کے احاطہ سے فرار کر جائیں گے۔

④ وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ

هُوَ الْحَقُّ وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ○

⑤ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُوكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يَتَّبِعُكُمْ إِذَا مَرَّكُمْ

كُلِّ مَمَرٍ ۖ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ○

⑥ أَفْتَرَىٰ عَلَىٰ اللَّهِ كَذِبًا أَمْ بِهِ جِنَّةٌ ۗ بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ

بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالصَّلٰلِ الْبَعِيدِ ○

⑦ أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِنَ السَّمَاءِ

وَالْأَرْضِ ۗ إِنَّ نَسْأَنخِصُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نُسْقِطُ عَلَيْهِمُ

كِسْفًا مِنَ السَّمَاءِ ۗ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ

عَبْدٍ مُّصِيبٍ ○

ترجمہ

④ اور وہ لوگ کہ جو علم رکھتے ہیں، وہ تو اس چیز کو، کہ جو تیرے پروردگار کی

طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے، حق سمجھتے ہیں اور۔ یہ کہ۔ وہ عزیز و حمید خدا کے

راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

⑤ اور کافروں نے یہ کہا کہ: کیا ہم تمہیں ایسا آدمی دکھائیں کہ جو اس بات کی خبر

دیتا ہے کہ جس وقت تم (مر جاؤ گے اور مٹی ہو جاؤ گے اور) بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ

گے (تو دوبارہ) نئے سرے سے پیدا کیے جاؤ گے۔

۸ کیا اُس نے خدا پر جھوٹ بہان باندھا ہے؟ یا اُسے کسی قسم کا جنون ہے؟ (ایسا نہیں ہے) بلکہ وہ لوگ کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ عذاب اور بہت بڑی گمراہی میں ہیں (اور ان کی گمراہی کی نشانی یہی ان کا شدید انکار ہے)۔

۹ کیا انہوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین سے متعلق چیزوں پر نظر نہیں کی؟ (تاکہ وہ ہر چیز پر خدا کی قدرت سے واقف ہوں) اگر ہم چاہیں تو انہیں زمین کے ایک زلزلہ کے ساتھ زمین میں دھنسا دیں، یا آسمان سے (پتھر کا) کوئی ٹکڑا ان پر گرا دیتے، اس میں ہر توبہ کرنے والے بندے کے لیے (خدا کی قدرت کی) واضح نشانی موجود ہے۔

تفسیر

علمائے تبری دعوت کو حق سمجھتے ہیں

گزشتہ آیات میں ایسے جاہل دل کے اندھوں کے بارے میں گفتگو تھی، کہ جو ان تمام دلائل کے باوجود قطعی طور پر معاد کا انکار کرتے تھے، اور آیات الہی کو جھٹلانے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوتے تھے۔

اسی مناسبت سے زیر بحث آیات میں ان علما اور صاحبان فکر و نظر کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، کہ جو آیات الہی کی تصدیق اور دوسروں کو انہیں قبول کرنے کا شوق دلاتے ہیں، فرماتا ہے، "وہ لوگ کہ جو علم رکھتے ہیں، وہ تو اس کو، کہ جو تیرے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے حق سمجھتے ہیں اور عزیز و حمید پروردگار کے راستہ کی طرف ہدایت کرنے والا جانتے ہیں" (ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک هو الحق و یهدی الی صراط العزیز الحمید)۔

بعض مفسرین نے "الذین اوتوا العلم" کی اس آیت میں علماء اہل کتاب کے اس گروہ

کے ساتھ تفسیر کی ہے کہ جو قرآن مجید کی حقانیت کے آثار کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کی بارگاہ میں تسلیم ختم کر دیتے ہیں اور اس کے حق ہونے کا اعتراف کر لیتے ہیں۔

اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اس آیت کے مصداق میں سے ایک مصداق اہل کتاب بھی ہوں لیکن صرف انہیں کے لیے محدود کر دینے پر کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ "یری" کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے (وہ دیکھتے ہیں) کہ جو فعل مضارع ہے اور، "الذین اوتوا العلم" کے مفہوم کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ہر عصر و زمانہ اور ہر مکان کے تمام علما اور صاحبان فکر و نظر، اس میں شامل ہیں۔

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تفسیر علی بن ابراہیم میں یہ تعبیر امیر المؤمنین علی سے تفسیر ہوتی ہے تو حقیقت میں یہ اس کے اتم و اکمل مصداق کا بیان ہے۔

ہاں! جو بھی غیر متعصب عالم، اس کتاب کے مطالب و مضامین میں غور و فکر کرے گا، تو وہ اس کے پُر مغز معارف، پختہ احکام، حکیمانہ نصیحتوں اور ہلا دینے والے مواعظ سے لے کر اس کے عبرت انگیز تاریخی واقعات اور اعجاز آمیز علمی مباحث تک (دیکھ کر) یہ جان لے گا کہ یہ سب کے سب ان آیات کی حقانیت پر گواہ ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مغربی اور مشرقی علما اور دانشمندان کی طرف سے اسلام اور قرآن کے بارے میں مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں کہ جن میں اسلام کی عظمت اور اوپر والی آیت کی صداقت پر بہت ہی بیخ و واضح اور روشن اعتراضات نظر آتے ہیں۔

"هو الحق" کی تعبیر ایک جامع تعبیر ہے کہ جو قرآن کے تمام مطالب و مشمولات و مضامین پر منطبق ہوتی ہے، چونکہ "حق" واقعیت عینی اور اس کے وجود خارجی کا نام ہے، یعنی قرآن کے مطالب عالم ہستی اور جہان انسانیت کی آفرینش کے قوانین اور واقعیتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اور چونکہ یہ ایسا ہے لہذا راہ خدا کی طرف ہدایت کرتا ہے، ایسا خدا کو جو "عزیز" بھی ہے اور "حمید" بھی، یعنی توانائی اور شکست ناپذیر ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی تعریف و ستائش کے لائق ہے، نوع بشر کے صاحبان اقتدار کی طرح نہیں کہ وہ جس وقت اقتدار اور طاقت کے تخت پر بیٹھتے ہیں تو وہ دھونس، زبردستی، تجاؤز، ستم گری اور خود خواہی اور خود غرضی کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس تعبیر کی نظیر سورہ ابراہیم آیرا میں بھی بیان ہوئی ہے جہاں پر وہ کہتا ہے:

"كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ" "وہ کتاب ہے کہ جو ہم نے تم پر اس لیے نازل کی ہے تاکہ لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے (گمراہی کی) تاریکیوں سے (علم و ایمان کی) روشنی کی طرف خدائے

عزیز و حمید کے راستہ پر نکال لے جاؤ۔

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ جو ہستی صاحبِ قدرت بھی ہے اور لائقِ حمد و ستائش بھی، عالمِ آگاہ بھی ہے اور رحیم و مہربان بھی، صرف اس کا راستہ مطمئن ترین راستہ اور مستقیم ترین طریقہ ہے اور جو لوگ اس کے راستہ پر پلٹتے ہیں تو وہ خود کو سرچشمہ قدرت اور ہر قسم کے اوصافِ حمیدہ سے قریب اور نزدیک کر لیتے ہیں۔

بعد والی آیت میں دوبارہ قیامت اور معاد کے مسئلہ کی طرف پلٹتا ہے اور گزشتہ بحثوں کی ایک دوسری شکل میں تحلیل کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کافروں نے کہا، کیا ہم تمہیں ایسا آدمی دکھائیں کہ جو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ جس وقت تم سب کے سب مٹی ہو جاؤ گے اور تمہارے بدن کے ذرات ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے اور ہرزہ کسی گوشہ میں ٹھکانا بنا لے گا (یا شاید کسی حیوان یا کسی دوسرے انسان کے بدن کا جزو ہو جائے گا) تو تم دوبارہ ایک نئی خلقت و آفرینش میں پلٹ آؤ گے" (وقال الذین کفروا هل نذلکم علیٰ رجل ینبئکم اذا مررتمو کل ممزق انکم لفی خلق جدید)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ معاد پر ان کے انکار کے اصرار کی دو باتیں تھیں، پہلی بات یہ تھی کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ معاد کہ جسے پیغمبر اسلام بیان کر رہے ہیں (معاد جسمانی) ایک ایسا مطلب ہے کہ جس کو آسانی کے ساتھ روکیا جاسکتا ہے اور جس کے بارے میں وہ عامۃ الناس کو بظن کر سکتے ہیں اور آسانی کے ساتھ اس کی نفی کر سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ معاد کا اعتقاد یا احتمال طور پر اسے قبول کر لینا بہر حال انسان میں مسئولیت اور ذمہ داری پیدا کرتا ہے اور اسے حق کی سوچ اور جستجو کے لیے آمادہ کرتا ہے اور یہ ایک ایسا مطلب تھا کہ جو کفر کے سرخونوں کے لیے سخت خطرناک شمار ہوتا تھا، لہذا انہیں اس بات پر اصرار تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے معاد کی فکر اور اعمال کے بدلے میں جزایا سزا کا خیال لوگوں کے دماغ سے باہر نکال دیں۔

وہ کہتے تھے کہ کیا یہ بات ممکن ہے کہ یہ بوسیدہ ہڈیاں، یہ بھری ہوئی مٹی کہ جس کے ذرات کو تیز ہواؤں کے جھکڑ ہر طرف لے جاتے ہیں، ایک دن جمع ہو کر اسے زندگی کا لباس پہنا دیں گے؟ اور یا یہ کہ وہ پیغمبر کو "رجل" کے ساتھ تعبیر کرتے تھے، وہ بھی نکرہ کی صورت میں، تو یہ تحقیر کی بنا پر تھا۔

لیکن انہوں نے اس حقیقت کو بھلا دیا تھا کہ ہم ابتدا میں بھی تو پراگندہ اجزاء ہی تھے، ہمارے

بدن میں موجود پانی کا ہر قطرہ کسی سمندر یا چشمہ کے کسی گوشہ میں تھا اور ہمارے جسم کے آبی اور معدنی مادہ کا ہرزہ زمین کے کسی کونے میں پڑا ہوا تھا، تو جس طرح ابتدا میں خدا نے انہیں جمع کیا تھا، اسی طرح آخر میں بھی وہ اس امر پر قدرت رکھتا ہے۔

تعب کی بات تو یہ ہے کہ وہ اسی بات کو اس کے کہنے والے کی دروغ گوئی یا جنون کی دلیل قرار دیتے تھے اور وہ یہ کہتے تھے: "کیا اس نے خدا پر بھوٹ بہتان بانڈھا ہے، یا اسے کسی قسم کا جنون ہے" (افترای علی اللہ کذباً ام بہ جنۃ)۔

ورنہ ایک بچے اور عقلمند انسان کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ اس قسم کی بات کرے؟ لیکن قرآن قطعی اور دو ٹوک طریقہ سے انہیں اس طرح جواب دیتا ہے: "یہ بات نہیں ہے نہ تو وہ دیوانہ ہے اور نہ ہی بھوٹا، بلکہ وہ لوگ کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ عذاب اور انتہائی گمراہی میں ہیں" (بیل الذین لایؤمنون بالآخرۃ فی العذاب والضلال البعید)۔ اس سے زیادہ واضح اور آشکار گمراہی اور کیا ہوگی، کہ انسان معاد کا منکر ہو جائے، وہ معاد کہ جس کا نمونہ ہر سال اپنی آنکھوں کے سامنے، عالم طبیعت میں اور مردہ زمینوں کے زندہ ہونے میں، دیکھتے ہیں۔

وہ معاد کہ اگر وہ نہ ہو تو اس جہان کی زندگی بغیر کسی مفہوم اور مطلب کے ہے۔

اور بالآخر وہ معاد کہ جس کا انکار کرنا، پروردگار کی قدرت، عدل و حکمت کے انکار کرنے کے برابر ہے۔

لیکن وہ یہ کیوں کہتا ہے کہ وہ اسی وقت عذاب و گمراہی میں ہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں بہت سی مشکلیں اور حادثات پیش آتے ہیں کہ جنہیں انسان آخرت پر ایمان کے بغیر برداشت نہیں کر سکتا۔

واقعاً اگر زندگی دنیا کی عمر کے انہیں چند دنوں میں محدود ہوتی تو موت کا تصور ہی ہر شخص کے لیے ایک وحشتناک عذاب بن جاتا، اسی وجہ سے منکرین معاد ہمیشہ ایک قسم کی جانکاہ پریشانی اور دردناک عذاب کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں، جبکہ معاد پر ایمان رکھنے والے موت کو عالم بقا کے لیے ایک دریچہ اور قفس دنیا کے ٹوٹنے اور اس قید خانے سے آزاد ہونے کا ایک وسیلہ اور ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ہاں! معاد پر ایمان انسان کو آرام و سکون بخشتا ہے، مشکلات کو قابل برداشت بناتا ہے اور ایثار و فداکاری اور جاننازی کو انسان کے لیے آسان بنا دیتا ہے۔

اصولی طور پر وہ لوگ کہ جو معاد و قیامت کو دروغ گوئی یا جنون کی دلیل شمار کرتے تھے، وہ اپنے

کفر و جہالت کی وجہ سے تاریک بینی کے عذاب اور دردِ دراز کی گمراہی میں گرفتار تھے۔
اگرچہ بعض مفسرین نے اس عذاب کو عذابِ آخرت کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن آیت کا ظاہر
اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ابھی اسی وقت اسی جہان میں عذاب و گمراہی میں مبتلا ہیں۔

اس کے بعد معاد کے بارے میں ایک اور دلیل۔ ایسی دلیل کہ جو ہٹ دھرم غافلوں کو بھینچنے والی ہے۔
پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے کہ: "کیا انہوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان زمین سے متعلق چیزوں پر نظر نہیں کیا؟" (افلہم یروا الی ما بین یدینہم وما خلفہم من السماء والارض)۔

یہ با عظمت آسمان، ان تمام عجائبات کے ساتھ، ان تمام ثابت و سیار ستاروں کے ساتھ، اور ان نظاموں کے ساتھ کہ جو اس پر حاکم ہیں، اسی طرح یہ زمین، اپنی تمام عجیب و غریب اور انواع و اقسام کے زندہ موجودات و برکات اور اس کے مواہب کے ساتھ، آفریدگار کی قدرت کی واضح ترین بولتی ہوئی دلیل ہیں۔

وہ ہستی کہ جو ان تمام امور پر قدرت رکھتی ہے، کیا وہ انسان کو موت کے بعد دوبارہ عالم حیات کی طرف لوٹانے سے عاجز ہے؟!

یہ وہی "برہانِ قدرت" ہے کہ جس کے ساتھ قرآن کی دوسری آیات میں منکرینِ معاد کے مقابلہ میں استدلال ہوا ہے، منجملہ اُن کے سورہ یٰسین کے آخر آیت ۸۲ میں اور سورہ اسراء آیت ۹۹ اور سورہ ق کی آیت ۶، ۷ میں بھی استدلال ہوا ہے۔

ضمنی طور پر یہ جملہ، ان متعصب دل کے اندھوں کی تہدید کے لیے، کہ جو اس بات پر مصر ہیں کہ تمام حقائق سے آنکھیں بند کر لیں، ایک مقدمہ اور تمہید ہے، لہذا اس کے بعد فرماتا ہے کہ: "اگر ہم چاہیں تو زمین کو یہ حکم دے دیں کہ وہ ان کے جسم کو نکل لے" ایک ایسا زلزلہ آتے کہ جس سے زمین پھٹ جاتے اور وہ اس میں دفن ہو جائیں۔ (ان نشأتکسف بھم الارض)۔

"اور اگر ہم چاہیں تو یہ حکم دے دیں کہ آسمانی پتھروں کے ٹکڑے ان پر برسنے لگیں" اور خود انہیں بھی اور ان کے گھر بار اور ان کی زندگی کو بھی درہم برہم کر دیں! (اونسقط علیہم کسفا من السماء)۔

ہاں! اس بات میں خدا کی قدرت اور ہر چیز پر اس کی توانائی کی واضح اور روشن نشانی موجود ہے لیکن زیرِ نشانی "ہر اُس بندے کے لیے ہے کہ جو خدا کی طرف رجوع کرے اور اس میں غور و فکر کرے" (ان فی ذالک لآیۃ لکل عبد منیب)۔

ہر شخص نے اپنی زندگی میں زلزلوں، زمین کے پھٹنے اور اُس میں (لوگوں کے) دھنس جانے کو دیکھا

یا سنا ہوگا، علاوہ ازیں فضا سے آسمانی پتھروں (شہابوں) کے گرنے یا بجلیوں کے گرنے یا آتش فشاںوں کے نتیجے میں پہاڑوں کو ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے دیکھا یا سنا ہے، ہر ممکنہ انسان یہ جانتا ہے کہ ان امور کا واقع ہونا ہر لمحہ اور ہر جگہ ممکن ہے، اگر زمین آرام و سکون میں ہے اور آسمان ہمارے لیے امن و امان بنا ہوا ہے تو یہ کسی دوسری ہستی کی قدرت و فرمان کی وجہ سے ہے۔ ہم جو ہر طرف سے اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، معاد کے سلسلے میں اس کی توانائی و قدرت کا کس طرح انکار کر سکتے ہیں! یا اس کی حکومت کی حدود سے کیسے فرار کر سکتے ہیں۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ باوجود اس کے کہ آسمان سر کے اوپر اور زمین پاؤں کے نیچے ہے، اوپر والی آیت میں "ما بین یدینہم" (جو ان کے آگے ہے) "وما خلفہم" (اور جو ان کے پیچھے ہے) سے تعبیر ہوئی ہے اور قرآن میں صرف یہی ایک ایسا موقع ہے کہ جس میں یہ تعبیر نظر آتی ہے، یہ تعبیر ممکن ہے کہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ آسمان کا منظر سورج، چاند اور ستاروں کے طلوع و غروب کے وقت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت اس لمحہ زیادہ واضح ہوتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ انسان جب افق کی طرف رخ کیے کھڑا ہوتا ہے تو یہ منظر اس کے سامنے ہوتا ہے اور زمین کو جو اہمیت میں اس کے بعد قرار پاتی ہے اس کے پیچھے کھلتے گی۔

علاوہ ازیں اگر یہ مغرور غافل اپنے آپ کو اتنی بھی اجازت نہیں دیتے کہ اپنے سر کے اوپر دیکھ لیں تو کم از کم اپنے سامنے ہی جو کچھ افق کے قریب دکھائی دیتا ہے اسے کیوں نہیں دیکھتے۔

۲۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کرۂ ارض کے اندر پگھلنے اور جلانے والے مادے موجود ہیں، کہ جو ہر وقت جوش میں ہوتے ہیں اور درحقیقت تمام انسانوں کی زندگی بالقوہ آتش فشاںوں کے ایک مجموعہ پر برقرار ہے، بس! اللہ کا ایک چھوٹا سا فرمان ہی کافی ہے کہ ان آتش فشاںوں میں سے کوئی سا ایک آتش فشاں پھٹ پڑے اور ایک عظیم علاقے کو لرزا کے رکھ دے اور پتھر، گچھلا ہوا مواد اور جلانے والے مادے وہاں پھینک دے۔

اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر رات اور دن میں لاکھوں چھوٹے بڑے سرگرداں پتھر زمین کی فضا میں گھوم رہے ہیں اور اسی میں جذب ہو جاتے ہیں، اگر وہ زمین کے گرداگرد پھیلی ہوئی فضا کے قشر سے دھمکتے، کہ جو ان کے ہجر کر جل جانے کا سبب بنتی۔ تو زمین پر رہنے والوں پر ہمیشہ آسمان کی طرف سے پتھروں کی بارش ہوتی رہتی، اب بھی ان کی طاقت اور شدت اس قدر ہے کہ وہ بعض اوقات ان رکاوٹوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے زمین پر آگرتے ہیں، اور یہ خدا کی طرف سے ایک تلبیہ ہے۔

اس بنا پر اگر ہم سارے کے سارے انسان خطرے کے ان دونوں منابع کے درمیان خدا کے حکم سے انتہائی آرام و سکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں تو کیا یہی بات اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم اس کی عظیم قدرت کو معلوم کر کے اس کے آستانہ پر سر نیاز جھکائیں؟!

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آخری آیت کے آخر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان چیزوں میں خدا کی عظمت و قدرت کی واضح و روشن آیت اور نشانی موجود ہے، لیکن یہ نشانی ہر اس بندے کے لیے ہے کہ جو اس کی طرف رجوع کرے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ وہ باغی اور سرکش لوگ کہ جنہوں نے عبودیت کا طوق اپنی گردن سے نکال دیا ہے اور اسی طرح سے وہ غافل بندے کہ جو اپنے غلط اور گناہ آلود راستے پر مسلسل طور پر چلے جا رہے ہیں اور اپنے کاموں سے توبہ کر کے خدا کی طرف رجوع نہیں کرتے، ان واضح و روشن آیات سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔

کیونکہ صرف آفتاب کا موجود رہنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ (دیکھنے کے لیے) دیکھنے والی آنکھ اور آنکھوں کے سامنے سے پردوں کا ہٹانا بھی ضروری ہے۔

① وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِمَّا فُضِّلَ بِهِ يُجِبَالُ أَوْ يَمِينُ مَعَهُ وَالطَّيْرَ
وَالنَّالَهُ الْحَدِيدَ ۝

② إِنَّ أَعْمَلَ سَبِيغٍ وَقَدَّرُ فِي السَّرْدِ وَأَعْمَلُوا صَالِحًا
إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

ترجمہ

① ہم نے داؤد کو اپنے فضل سے ایک عظیم نعمت بخشی (ہم نے پہاڑوں اور پرندوں سے کہا) اے پہاڑو! اور اے پرندو تم اس کے ساتھ ہم آواز ہو جاؤ (اور اس کے ساتھ خدا کی تسبیح کہو) اور ہم نے لوہے کو اُس کے لیے نرم کر دیا۔

② (اور ہم نے انہیں حکم دیا کہ تم) کامل اور فراخ زبر ہیں بناؤ، اور حلقوں کو مناسب اندازے سے بناؤ، اور صالح اور نیک عمل بجالاؤ، یقیناً میں تمہارا عمل کو دیکھ رہا ہوں۔

تفسیر

داؤد پر خدا کے عظیم انعامات

چونکہ گزشتہ بحث کی آخری آیت میں کھٹکو "عبد منیب" اور توبہ کرنے والے بندے کے بارے میں تھی، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ توصیف بعض آیات میں (سورہ ص آیت ۲۴) داؤد پیغمبر کے لیے جس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ بیان ہوگی۔ ذکر ہوئی ہے، اس بنا پر بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم پیغمبر اور ان کے فرزند حضرت سلیمان کے حالات کا ایک گوشہ نمونہ کے طور پر بیان کیا جائے

اور گزشتہ بحث مکمل ہو جاتے، اور ضمنی طور پر یہ بات اُن تمام افراد کے لیے ایک تنبیہ ہو کہ جو خدا کی نعمتوں کو فراموش کر دیتے ہیں، اور جس وقت تخت اقتدار پر بیٹھتے ہیں تو پھر وہ خدا کے بندے ہی نہیں رہتے۔

پہلی آیت میں کہتا ہے: "ہم نے داؤد کو اپنے فضل سے ایک نعمت بخشی تھی" (ولقد آتینا داؤد منا فضلًا)۔

لفظ "فضل" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جو اُن تمام سواہب اور نعمتوں کو کہ جو خدا نے داؤد کو عطا کی تھیں شامل ہے اور "نکوہ" کی صورت میں اس کا ذکر اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

حضرت داؤد کو پروردگار کی طرف سے بہت سی نعمتیں۔ چاہے وہ معنوی پہلو رکھتی ہوں یا مادی حاصل تھیں کہ جن کو قرآنی آیات نے بیان کیا ہے۔

ایک مقام پر کہتا ہے کہ: "ہم نے اُسے اور اس کے بیٹے کو بہت سا علم دیا اور انہوں نے کہا، خدا کا شکر ہے کہ جس نے ہمیں اپنے بہت سے بندوں پر فضل و برتری بخشی" "ولقد آتینا داؤد و سلیمان علمًا و قالوا الحمد لله الذی فضلنا علیٰ کثیر من عبادہ المؤمنین" (نمل، ۵۰) دوسری جگہ خصوصیت کے ساتھ حیوانات سے باتیں کرنے کا علم رکھنے پر انحصار کیا ہے، اور اسے ایک عظیم نعمت کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے: "یا ایہا الناس علمنا منطق الطیر و آتینا من کل شیء ان هذا هو الفضل المبین" (اسے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر چیز سے برہ مند کیا گیا ہے اور یہ ایک واضح و آشکار فضیلت ہے پروردگار کی طرف سے)۔ (نمل، ۱۶)

وہ مختلف معجزات، کہ جن کے متعلق زیر بحث آیت کے ذیل میں گفتگو ہوگی، ان فضائل کا ایک حصہ ہے، علاوہ ازیں بہت ہی عمدہ لحن اور آواز، اور عادلانہ قضاوت پر قدرت کہ جس کی طرف سورہ "ص" میں اشارہ ہوا ہے، اس فضل الہی کا ایک دوسرا حصہ شمار ہوتا ہے، اور سب سے زیادہ اہم فضیلت نبوت و رسالت کی فضیلت ہے جو خدا نے داؤد کو عطا فرمائی تھی۔

بہر حال اس اجمالی اشارہ کے بعد اس کی تفصیل شروع ہوتی ہے اور ان کے کچھ معنوی فضائل اور چند مادی فضائل اس طرح بیان کرتا ہے: "ہم نے پہاڑوں سے کہا کہ تم داؤد کے ساتھ ہم آواز ہو جاؤ، اور اسی طرح اسے پرندو! تم بھی اس کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملاؤ، اور جس وقت وہ خدا کا ذکر اور تسبیح کرے تو، بھی زمزم سرائی کر دو" (یٰٰجبال اوبیٰ معہ والطیر)۔

لفظ "اوبیٰ" اصل میں "تاویب" سے آواز کو نکلنے میں گھمانے اور پھیرنے کے معنی میں ہے، یہ مادہ کبھی توبہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ اس کی حقیقت خدا کی طرف بازگشت ہے۔

اگرچہ عالم کے تمام ذرات خدا کا ذکر تسبیح اور حمد کرتے ہیں، خواہ کوئی داؤد ان کے ساتھ ہم صدا ہو یا نہ ہو، لیکن داؤد کا امتیاز یہ تھا کہ اُن کے صدا بلند کرنے اور تسبیح کی نغمہ سرائی کے وقت ان موجودات کے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا وہ آشکار و ظاہر ہو جاتا تھا اور اندرونی زمزمہ بیرونی نغمہ کے ساتھ تبدیل ہو جاتا تھا، جیسا کہ پیغمبر اسلام کے ہاتھ پر "سگریزہ" کی تسبیح کے بارے میں بھی روایات آئی ہیں۔

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

"انہ خرج یقرأ الزبور وکان اذا قرأ الزبور لا یسقی جبل ولا حجر ولا طائر الا اجابہ!"

"داؤد، دشت و بیابان کی طرف نکلے اور جس وقت آپ زبور کی تلاوت کرتے

تو کوئی پہاڑ اور پتھر اور پرندہ ایسا نہ تھا کہ جو اُن کے ساتھ ہم آواز نہ ہوتا ہو!"

اس معنوی فضیلت کا ذکر کرنے کے بعد ایک مادی فضیلت کا بیان شروع کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اور ہم نے اُس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا" (والنالہ الحدید)۔

ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ خدا نے داؤد کو معجزانہ طور پر لوہے کو نرم کرنے کا طریقہ سکھایا تھا، اس طرح سے کہ وہ اس سے زہر بنانے کے لیے مضبوط و محکم اور پتلی پتلی نازک قسم کی کڑیاں بنا سکیں، یا یہ کہا جائے کہ داؤد سے پہلے بھی جنگوں میں دفاع کے لیے لوہے کی سلیٹوں سے استفادہ ہوتا تھا، کہ جو بھاری بھی ہوتی تھیں، اور اگر انہیں پہنا جاتا تو وہ اتنی خشک اور بے لچک بھی ہوتی تھیں کہ جو جنگجو غازیوں کے لیے انتہائی پریشان کن ہوتی تھیں، کوئی بھی شخص اس زمانہ تک لوہے کی باریک اور مضبوط کڑیوں سے زہر کی مانند کوئی ایسی چیز نہ بنا سکا تھا کہ جو لباس کی مانند آسانی کے ساتھ بدن پر آسکے اور بدن کی حرکات کے ساتھ نرم اور رواں رہے۔

لیکن آیت کا ظاہر یہ ہے کہ لوہے کا داؤد کے ہاتھ میں نرم ہونا، خدا کے حکم سے اور معجزانہ صورت میں انجام پذیر ہوتا تھا۔ اس بات میں کیا چیز مانع ہے کہ وہی ذات کہ جو بھٹی کو لوہا نرم کرنے کی خاصیت بخشی ہے، اسی خاصیت کو ایک دوسری شکل میں داؤد کے پنچوں میں قرار دے دے، یعنی اسلامی روایات میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے داؤد کی طرف وحی بھیجی کہ:

"نعم العبد انت الا انک تأکل من بیت العمال فبکی داؤد اربعین

۱۔ محال الدین صدوق، (المیزان، جلد ۱۶، ص ۳۹۰ کے مطابق)۔

۲۔ تفسیر برطان جلد ۳، ص ۳۲۲ و تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۱۵۔

صباحاً فالان الله له الحديد وكان يعمل كل يوم درعاً — فاستغنى
عن بيت المال ۛ

”تم ایک اچھے آدمی ہو مگر تم بیت المال سے اپنی روزی حاصل کرتے ہو، داؤد
چالیس دن تک روتے رہے، (اور خدا سے اس کے حل کی درخواست کی) تو خدا نے لوہے
کو ان کے لیے نرم کر دیا اور ہر روز ایک زرہ بنا لیتے تھے.... اور اس طرح سے وہ
بیت المال سے بے نیاز ہو گئے۔“

یہ ٹھیک ہے کہ بیت المال ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ جو معاشرے کی بغیر
عوض کے خدمت کرتے ہیں اور ایسے اہم بوجھ اٹھاتے ہیں کہ جو پیمانہ ہوں، لیکن یہ بات زیادہ بہتر ہے
کہ انسان اس خدمت کو بھی انجام دے اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے۔ توانائی کی صورت میں۔ گذر اوقات
کرسے اور داؤد یہ چاہتے تھے کہ وہ اسی قسم کے متاثر بندے بنیں۔

بہر حال داؤد اس توانائی کے ذریعہ۔ کہ جو خدا نے انہیں دی تھی، بہترین طریق یعنی جہاد کا وسیلہ
بنانے سے، ایسا وسیلہ جو دشمن سے حفاظت کرے۔ استفادہ کرتے تھے، اور اس سے زندگی کے
عام مسائل میں ہرگز فائدہ نہ اٹھایا، اور عجب یہ کہ اس کی آمدنی سے۔ بعض روایات کے مطابق۔
اپنی سادہ زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے علاوہ کچھ نہ کچھ حاجت مندوں پر بھی خرچ کیا کرتے تھے۔
ان تمام باتوں کے علاوہ اس کام کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ ان کا ایک بولتا ہوا معجزہ شمار
ہوتا تھا۔

بعض مفسرین نے اس طرح نقل کیا ہے کہ ”لقمان“ داؤد کے پاس اس وقت پہنچے، جبکہ وہ
پہلی زرہ بنا رہے تھے، وہ لوہے کو بٹ بٹ کر کڑیوں اور حلقوں کی صورت میں بنا رہے تھے،
اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ آپس میں جوڑ رہے تھے۔ اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ کر لقمان
حیران رہ گئے اور وہ سوچنے لگے (کہ یہ کیا ہو رہا ہے) اُسے دیکھتے رہے، لیکن کوئی سوال نہ کیا، یہاں
تک کہ داؤد نے زرہ بنا کر تیار کر لی، اور کھڑے ہو کر اسے پہن لیا، اور کہا کہ جنگ میں دفاع کے لیے
یہ کیسا اچھا ذریعہ ہے، لقمان نے جو اس کا اصلی مقصد سمجھ چکے تھے، کہا کہ: الصمت حکمة وقيل فاعله؛
”خاموشی حکمت ہے مگر بہت کم لوگ اسے انجام دیتے ہیں؟“

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر ابو الفتح رازی، جلد ۹ صفحہ ۱۹۲۔

۳۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

بعد وال آیت داؤد کے زرہ بنانے اور اس سلسلے میں پروردگار کے بہت ہی پُر معنی
فرمان کی شرح ہے، کہتا ہے: ”ہم نے اس سے کہا کہ مکمل زرہ بنائو اور اس کے
حلقوں کو اندازے کے ساتھ اور مناسب رکھو (ان اعمالِ سابقات و قدر فی السرد)۔
”سابقات“ تسایع کی جمع۔ کامل اور فراخ زرہ کے معنی میں ہے، اور ”سباغ نعمت“ بھی نعمت
کی فراخی کے معنی میں ہے۔

”سرد“ اصل میں زرہ جیسی سخت چیزوں کو بٹننے کے معنی میں ہے، اور ”قدر فی السرد“
کے جملہ کا مفہوم وہی زرہ کے حلقوں میں مناسب اندازوں کا خیال رکھنا، اور اس کے
بٹننے کی طرز ہے۔

در حقیقت خدا داؤد کو ایسا حکم دینے رہا ہے کہ جو ساری دنیا جہان کے باایمان صنعت کاروں
کارگروں کے لیے ایک نمونہ ہو، یہ مصنوعات میں پختہ کاری و مضبوطی اور ان کی کیفیت و کمیت
میں انتہائی احتیاط برتنے کا حکم ہے، تاکہ انہیں استعمال کرنے والے اچھی طرح اور راحت و سکون کے
ساتھ اس سے استفادہ کر سکیں اور کامل استحکام سے فائدہ اٹھائیں۔

داؤد سے کہتا ہے: زرہ کو کشادہ اور آرام دہ بناؤ، تاکہ جنگ کرنے والے اسے پہننے وقت
قید خانہ میں ہی گرفتار نہ ہو جائے، نہ تو اس کے حلقوں کو اندازہ سے زیادہ چھوٹا اور باریک
بناؤ کہ اُس میں لڑنے کی حالت ہی باقی نہ رہے، اور نہ ہی زیادہ سخت اور کناردوں کے بغیر
کہ کبھی تلوار و خنجر و نیزہ و تیر کی نوک ہی اس کے اندر چلی جائے، بلکہ اس کی ہر چیز اندازے کے
مطابق اور مناسب ہو۔

خلاصہ یہ کہ خدا نے اس کے اصلی ”ماہ“ کو بھی ”الناله الحديد“ کے مطابق
داؤد کے اختیار میں دے دیا، اور اس کی شکل و صورت بنانے کی طرز اور زرہ
بنانے کا طریقہ بھی داؤد کو سکھا دیا، تاکہ اس ”ماہ“ اور ”صورت“ سے ایک کامل و
مکمل نتیجہ برآمد ہو۔

آیت کے آخر میں داؤد اور ان کے خاندان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، کہ:
”عمل صالح بجالاؤ، کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو، اُسے دیکھ رہا ہوں“ (واعملوا صالحاً
افی بما تعملون بصیر)۔

آیت کی ابتدا میں صرف داؤد مخاطب ہیں اور آخر میں وہ اور ان کا خاندان
یادہ اور ان کی قوم (مخاطب) ہیں، کیونکہ یہ تمام مسائل عمل صالح کے لیے ایک مقدمہ

اور تھیسہ ہیں، بندہ بنانے کا مقصد آمدنی کا حصول نہیں ہے، اصل مقصد عمل صالح ہے اور یہ چیزیں اس میں ایک وسیلہ اور ذریعہ ہیں، کہ جن سے داؤد بھی فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کا خاندان بھی۔

اور عمل صالح سے شگون و حالات میں سے ایک یہ ہے کہ مصنوعات میں ہر طرح سے کافی ودانی احتیاط کو ملحوظ رکھیں، اور ایک مفید اور کمال پیداوار تیار کر کے دکھائیں اور ہر طرح کی برائی اور کمی رکھنے سے بچنے کی کوشش کریں۔

یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس خطاب کے مخاطب داؤد اور وہ تمام لوگ ہیں کہ جو ان کے ہاتھ سے بنی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھاتے تھے، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس وقت عملی وسیلہ اور ذریعہ کو عمل صالح کی راہ میں استعمال کریں، نہ کہ علم و جوہر اور گناہ کی راہ میں۔

۱۲) **وَلَسَلِّمَنَّ الرِّيحَ عُدُّوَهَا شَهْرًا وَرَوَّاحَهَا شَهْرًا
وَاسَلَّنَا لَهُ عَيْنَ الْقَطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَعْمَلُ بَيْنَ
يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نَذِقْهُ
مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ** ○

۱۳) **يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِبٍ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ
كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رِاسِيَتٍ ۗ اِعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا وَ
قَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرُونَ** ○

۱۴) **فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَى مَوْتِهِ إِلَّا
دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَاتَهُ ۗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ
أَنَّ لَوْكَانُوا يَعْلَمُونَ ۗ الْغَيْبُ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ○**

ترجمہ

۱۲) اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تھا کہ وہ صبح کے وقت بھی ایک مہینہ کی راہ طے کیا کرتی، اور شام کے وقت بھی ایک مہینہ کی راہ طے کرتی تھی اور ہم نے ان کے لیے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا تھا، اور خدا کے حکم سے جنوں کا ایک گروہ، ان کی خدمت میں کام سرانجام دیا کرتا تھا، اور ان میں سے جو کوئی ہمارے حکم سے روگردانی کرتا تھا، تو ہم اُسے جلانے والی آگ کا مزہ چکھاتے تھے۔

۱۳ جو کچھ سلیمان چاہتے تھے وہ ان کے لیے بناتے رہتے تھے عبادت خانے، تصویریں (یا مورتیاں) کھانے کے لیے بڑے بڑے حوض جیسے برتن اور ایک ہی جگہ جمی ہوئی دیگیں (جو بڑی بڑی ہونے کی وجہ سے نقل و حمل کے قابل نہ تھیں، اور ہم نے ان سے کہا): "اے آل داؤد! تم ان نعمتوں کا شکر بجا لاؤ، لیکن میرے بندوں میں سے بہت کم لوگ شکر کرنے والے ہیں۔"

۱۴ (سلیمان کی اس شان و شوکت اور جاہ و جلال کا وجود) جب ہم ان کے لیے موت کا حکم جاری کر دیا، تو کسی نے بھی اس کے مرنے کی انہیں خبر نہ دی، سوائے زمین پر چلنے والی (دیک) کے کہ جو اُس کے عصا کو کھا رہی تھی (یہاں تک کہ وہ عصا ٹوٹ گیا اور سلیمان کا جسم زمین پر آگرا) جب وہ زمین پر گرے تو اُس وقت چنوں نے سمجھا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو وہ اس ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔

تفسیر

سلیمان کا جا و جلال اور ان کی عبرت انگیز موت

ان مواہب کی بحث کے بعد کہ جو خدا نے داؤد کو دیئے تھے، ان کے بیٹے سلیمان کا ذکر شروع کیا ہے۔ داؤد کے بارے میں تو وہ نعمتوں کا بیان کیا تھا، لیکن ان کے بیٹے سلیمان کے بارے میں تین عظیم نعمتوں کے متعلق بحث کرتا ہے، فرماتا ہے: "ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، جو صبح کے وقت بھی ایک ماہ کی راہ طے کرتی تھی اور عصر کے وقت بھی ایک ماہ کی راہ چلتی تھی" (و سلیمان الريح غدوھا شهر و

رواحما شهر) یہ

یہ بات قابل توجہ ہے کہ باپ کے لیے تو سخت اور حد سے زیادہ حکم جسم یعنی لوسہ کو مسخر کرتا ہے اور بیٹے کے لیے بہت ہی لطیف موجود کو مسخر کیا ہے، لیکن دونوں کام اصلاحی اور معجزہ نما ہیں اور مفید ہیں، سخت جسم کو تو داؤد کے لیے نرم کرنا ہے اور ہوا کی لطیف و نرم امواج کو سلیمان کے لیے فعال اور حکم۔

ہوا کی لطافت ہرگز اس سے مانع نہیں ہے کہ وہ اہم افعال کو انجام دے، یہ ہوائیں ہی تو ہوتی ہیں کہ جو بڑے بڑے بحری جہازوں کو سمندروں کی سطح پر چلاتی ہیں اور چلتی کے بھاری اور سنگین پتھروں کو چکر دیتی ہیں اور بڑے بڑے پیکروں کو آسمان کی بلندی پر ہوائی جہازوں کی شکل میں چلاتی ہیں ہاں! خدا نے اس لطیف جسم کو اس حیران کن قدرت و طاقت کے ساتھ حضرت سلیمان کے اختیار میں دے دیا تھا۔

یہ بات کہ ہوا سلیمان کی دستگاہ (اس کے تخت یا فرش کو) کس طرح چلاتی تھی، ہمارے لیے واضح نہیں ہے، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ کوئی چیز خدا کی قدرت کے مقابلہ میں مشکل اور پیچیدہ نہیں ہے، جہاں انسان اپنی ناپید قدرت کے ساتھ غباروں (یعنی ان حفاظتی چیزوں کو کہ جن میں ہلکی نہیں بھر دیا کرتے تھے اور وہ آسمان کی طرف پرواز کر جاتے تھے اور بعض اوقات کچھ آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے) اور موجودہ زمانے میں دیوہیکل بڑے بڑے ہوائی جہاز سینکڑوں مسافروں اور زیادہ سے زیادہ وسائل اور ساز و سامان کے ساتھ آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرتے ہیں تو خدا کے لیے سلیمان کی بساط کو ہوا کے ذریعہ چلانا کیسے مشکل ہو سکتا ہے؟

وہ کون سے عوامل تھے کہ جو سلیمان اور ان کی بساط و مسند کو گرنے، ہوا کے دباؤ اور آسمانی حرکت سے پیدا ہونے والی دوسری مشکلات سے حفاظت کرتے تھے؟! یہ بات بھی ایسے مسائل میں سے ہے کہ جن کی جزئیات ہمارے لیے واضح نہیں ہیں، لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ انبیاء کی تاریخ میں اس قسم کی خارق عادت چیزیں بہت تھیں، اگرچہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کچھ نادان لوگوں یا نادان دشمنوں نے ان میں خرافات کی آمیزش کر دی ہے، جس کے باعث ان مسائل کا اصلی چہرہ دگرگوں اور بدنام ہو گیا ہے اور ہم اس سلسلہ میں صرف اتنی ہی مقدار پر کہ جتنا قرآن

۱۔ سلیمان "میں جا رہا ہوں اور ایک مقدرفعل سے متعلق ہے یعنی "سخننا" کو جو گزشتہ آیات کے قرینہ سے سمجھا جاتا ہے اور سورہ ص کی آیت ۳۲ میں اس کی تصریح ہوئی ہے، جہاں لکھا ہے "فصخرنا لہ الریح" یعنی ضررین کا نفع یہ ہے کہ "سلیمان میں" لام "اختصاص کے لیے ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ یہ معجزہ اس پیغمبر کے ساتھ مخصوص تھا اور کوئی دوسرا پیغمبر ان کے ساتھ اس امر میں شریک نہیں تھا۔

نے اشارہ کیا ہے، قناعت کرتے ہیں۔

”غدو“ (بروز) صبح کے معنی میں ہے ”رواح“ کے مقابلہ میں کہ جو غروب کی طرف کو کہتے ہیں، کہ جس وقت جانور آرام کرنے کے لیے اپنی جگہ کی طرف لوٹتے ہیں، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ زبیر بخت آیت میں ”غدو“ دن کے پہلے آدھے حصے کے معنی میں ہے اور ”رواح“ دن کے دوسرے آدھے حصے کے معنی میں اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ سلیمان صبح سے ظہر تک اس راہوار مرکب پر اس زمانہ کے مسافروں کے ایک مہینہ کے سفر کی مقدار کے برابر سفر کرتے تھے اور دن کے دوسرے آدھے حصے میں بھی اسی مقدار میں راستہ چلتے تھے۔

اس کے بعد سلیمان کے لیے خدا کی دوسری نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: ”اور ہم نے اس کے لیے پچھلے ہونے تانبے کا چشمہ جاری کیا“ (واسلنا لہ عین القطر)۔

”اسلنا“ ”سلان“ کے مادہ سے جاری کرنے کے معنی میں ہے، اور ”قطر“ تانبے کے چشمے کی طرح بہنے لگا۔

بعض ”قطر“ کو دھاتوں کی مختلف اقسام کے معنی میں، یا کانسی کے معنی میں سمجھتے ہیں تو اس طرح باپ کے لیے تو لوہا نرم ہوا، اور بیٹے کے لیے دھاتیں پگھلا دی گئیں، (لیکن مشہور ہی پہلا معنی ہی ہے)۔

پچھلے ہونے تانبے کا چشمہ یا دوسری دھاتوں کو سلیمان کے اختیار میں کس طرح دیا گیا؟ کیا خدا نے اعجاز و الوہام کے ذریعہ اس پیغمبر کو ان دھاتوں کو پگھلانے کا طریقہ انتہائی وسیع اندازوں کے ساتھ سکھایا تھا؟

یا اس بہنے والی دھات کا چشمہ، انہیں چشموں کی مانند کہ جو آتش فشاں پہاڑوں کے فعال ہونے کے موقع پر ان کے دامن سے نیچے کی طرف بہتے ہیں، اعجاز آئینہ طریقہ سے ان کے اختیار میں قرار پایا؟ یا کسی اور طریقہ سے؟ یہ بات صحیح طور پر ہمارے لیے واضح نہیں ہے، ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اس عظیم پیغمبر کے بارے میں خدا کے لطافت میں سے ایک یہ تھا۔

آخر میں سلیمان کے لیے پروردگار کی تیسری مہربانی و نعمت جنوں میں سے ایک بہت بڑے گروہ کے مخزنیے جانے کو بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: ”اور خدا کے حکم سے جنوں کے گروہ اس کے سامنے اس کے لیے کام کیا کرتا تھا“ (ومن الجن من يعمل بین یدیه باذن ربہ)۔

اس سلسلے میں ہم نے جلد ۱ — (سورہ انبیاء کی آیت ۸۱ کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

”اور جب ان میں سے کوئی ہمارے حکم سے سرتابی کرتا تھا تو ہم اسے جلانے والی آگ کے ساتھ سزا دیتے تھے“ (ومن یتذغ منه عن امرنا نذقه من عذاب السعیر)۔

”جن“ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، ایک ایسا وجود ہے کہ جوت سے پوشیدہ اور عقل و قدرت کا حامل ہے، اور جیسا کہ قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے وہ واجبات و فرائض خداوندی کا مکلف بھی ہے۔

”جنوں“ کے بارے میں لوگوں نے بہت سے بیہودہ افسانے اور داستانیں گھڑ رکھی ہیں، لیکن اگر ہم ان خرافات کو ترک کر دیں، تو ان کا اصل وجود اور مخصوص صفات، جو قرآن میں جنوں کے لیے بیان ہوئی ہیں ایک ایسے مطلب کا حامل ہے جو علم و عقل سے قطعاً بعید نہیں ہے اور ہم انشاء اللہ سورہ جن کی تفسیر میں اس موضوع کو مزید تشریح و تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

بہر حال اوپر والی آیت کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم طاقت کی تغیر بھی پروردگار کے فرمان سے ہی تھی اور جس وقت وہ اپنے وظائف اور ذمہ داریوں سے سرتابی کرتے تھے تو انہیں سزا دی جاتی تھی۔

مضرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ یہاں ”عذاب السعیر“ سے مراد قیامت کے دن کی سزا ہے، جبکہ آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخالفت کرنے والوں کے لیے دنیا میں سزا ہے، سورہ ص کی آیات سے بھی یہ بات ابھی طرح ثابت ہے کہ خدا نے شیاطین کا ایک گروہ سلیمان کے قبضہ میں دے رکھا تھا، جو ان کے لیے اہم قسم کے تعمیراتی کام سرانجام دیا کرتے تھے اور جس وقت وہ خلافت درزی کرتے تھے تو انہیں زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا تھا! ”والشیاطین کل بناء وغواص و اخرین مقرنین فی الاصفاد“ (ص آیات ۳۷، ۳۸)۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ سلیمان کے ملک اور سلطنت ایسی، ایک وسیع و عریض سلطنت اور ملک کے نظام کو چلانے کے لیے بہت ہی زیادہ عوامل کی ضرورت ہے لیکن سب سے زیادہ اہم وہی تین عوامل ہیں جن کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

پہلا ایک مستقل اور حاوی تیز رفتار نقل و حمل کا وسیلہ ہے کہ جس کے ذریعہ رئیس حکومت و مملکت اپنے ملک کے تمام اطراف و جانب سے آگاہ ہو سکے۔

دوسرے خام مال، جو لوگوں کی زندگی کے لیے ضروری آلات و اسباب بنانے اور مختلف صنعتوں کے لیے کام آسکے۔

اور آخری کام کرنے کی فعال قوت، کہ جو اس خام مال سے کافی مقدار میں فائدہ اٹھا سکے، اور انہیں حسب ضرورت اپنے کام میں لاسکے، اور اس لحاظ سے ملک کی مختلف ضرورتوں

کو پورا کر سکے۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے یہ تینوں باتیں سلیمان کے اختیار میں دے دی تھیں، اور وہ بھی رفیع عامہ، عام آبادی اور امن و امان کے لیے ان سے احسن طریقے سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ موضوع صرف سلیمان کے زمانہ اور ان کی حکومت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے اور اس کی طرف توجہ کرنا، آج بھی اور کل بھی، یہاں بھی اور ہر جگہ، تمام ملکوں کا صحیح طور پر اہتمام چلانے کے لیے ضروری ہے۔

بعد والی آیت میں جنوں کے اہم تولیدی کاموں کے ایک حصہ کی طرف۔ جو وہ سلیمان کے حکم سے انجام دیتے تھے۔ اشارہ کرتے ہوئے کتاب ہے کہ:

”سلیمان جو کچھ بھی چاہتے تھے وہ ان کے لیے۔ عبادت خانوں، تماثلوں، حوض کے مانند بڑے بڑے کھانوں کے برتنوں اور زمین پر ثابت (جہی ہوئی یا گڑھی ہوئی) دیگوں سے۔ تیار کر کے دیتے تھے“ (یعلمون لہ ما یشاء من محاریب و تماثل و حضان کالجواب وقد ورا سیات)۔

ان میں سے ایک حصہ تو معنوی اور عبادت کے مسائل سے مربوط تھا، اور ایک حصہ انسانوں کی جسمانی ضروریات اور ان کے عظیم لشکریوں اور کارکنوں کی جمعیت کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔

”محاریب“ جمع ہے ”محراب“ کی کہ جو لغت میں ”عبادت گاہ“ یا ”محلّات“ اور ”بڑی بڑی عمارتوں“ کے معنی میں ہے، کہ جو عبادت کی خاطر بنائی جاتی ہیں۔

بعض اوقات صدر مجلس یا صدر مسجد و معبد کے حصہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، وہ چیز جس کو آج ”محراب“ کہتے ہیں وہ امام جماعت کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے، درحقیقت ایک نئی تعبیر اور ایک نیا معنی ہے جو اصل مادہ سے حاصل کیا گیا ہے۔

بہر حال چونکہ یہ لفظ ”حرب“ کے مادہ سے جنگ کے معنی میں ہے، لہذا عبادت خانوں کو ”محراب“ کا نام دینے کا سبب یہ سمجھا ہے، کہ یہ شیطان اور ہوائے نفس کے ساتھ ”محراب“ یعنی جنگ کرنے کی جگہ ہے۔

یا ”حرب“ اُس لباس کے معنی میں ہے کہ جو میدان جنگ میں دشمن کے بدن سے اتارا جاتا ہے، چونکہ انسان کو چاہیے کہ وہ عبادت خانوں میں دنیوی افکار اور دل کی پراگندگی کی پوشاک

لے مفردات راغب مادہ ”حرب“۔

کو اپنے اوپر سے اتار دے۔

بہر حال سلیمان کے یہ فعال اور چابک دست کارندے بڑے بڑے باشکوہ عبادت خانے، کہ جو حکومت النبیہ اور اس کی مذہبی سلطنت کے لائق تھے، اس کے لیے بناتے تھے تاکہ لوگ راحت و آرام کے ساتھ اپنے عبادت کے فرائض کو انجام دے سکیں۔

”تماثل“ جمع ہے ”تمثال“ کی جو بیل بوٹوں اور تصویر کے معنی میں آیا ہے اور عجمہ کے معنی میں بھی اُس بارے میں کہ یہ مجسمے یا نقوش، کون سے موجودات کی صورتیں تھیں اور سلیمان نے ان کی تیاری کا حکم کیوں دیا تھا، مختلف تفسیری بیان کی گئی ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ زیب و زینت اور سجاوٹ کا پلور رکھتے ہوں، جیسا کہ ہماری اہم قدیمی بلکہ جدید عمارتوں میں بھی نظر آتا ہے۔

یا یہ ان عمارتوں کا رعب اور دبدبہ بڑھانے کے لیے ہو، کیونکہ کچھ حیوانات مثلاً شیر کی تصویر، بہت سے لوگوں کے افکار میں رعب و دبدبہ پیدا کرنے والی ہے۔

کیا سلیمان کی شریعت میں ذی روح موجودات کا مجسمہ بنانا جائز تھا، جبکہ یہ اسلام میں ممنوع ہے؟ یا جو مجسمے وہ سلیمان کے لیے بناتے تھے، غیر ذی روح کی جنس سے تھے، مثلاً درختوں، پہاڑوں، سورج، چاند اور ستاروں کی تصویریں۔

یا اُن کے لیے صرف دیواروں پر نقش و نگار کیا کرتے تھے جیسا کہ قدیمی تاریخی آثار میں اکثر نگاروں کی صورت میں نظر آتی ہیں اور ہم یہ جانتے ہیں کہ نقش و نگار چاہے جیسے بھی ہوں۔ عجمہ کے برخلاف۔ حرام نہیں ہیں۔

یہ سب احتمالات ہیں، چونکہ اسلام میں مجسمہ سازی کو حرام قرار دیا جاتا ہے ممکن ہے کہ بت پرستی کے مسئلہ کے ساتھ شدید مبارزہ کرنے اور اس کی بیخ کنی کی خاطر ہو اور سلیمان کے زمانہ میں اس بات کی اتنی ضرورت نہ ہو اور یہ حکم ان کی شریعت میں نہ ہو۔

لیکن ایک روایت میں جو امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہے یہ بیان کیا گیا ہے:

”واللہ ما ہی تماثل الرجال والنساء ولكنہا الشجر وشہدہ“

خدا کی قسم سلیمان کے حکم سے بنائی جانے والی تماثل مردوں اور عورتوں کے مجسمے

نہ تھے، بلکہ درخت وغیرہ کی تصویریں تھیں۔

لے مفردات راغب مادہ ”حرب“۔

لے وساکی الشیخہ جلد ۱۲، اہواب ما یکتب بہ حدیث !۔

”جفان“ جمع ”جفہ“ (بروزن دزن) کھانا کھانے کے برتنوں کے معنی میں ہے اور ”جواب“ جمع ”جایبہ“ کی پانی کے حوض کے معنی میں ہے اور اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلیمان کے لیے بہت بڑے بڑے برتن، کھانا کھانے کی طرح ہوتے تھے، تیار کیا کرتے تھے، تاکہ ایک کثیر گروہ ان کے گرد بیٹھ کر کھانا کھا سکیں اور اگر ہم نے اس بات کو بھلا نہ دیا ہو تو تھوڑے ہی سے پہلے زمانہ کی بات ہے ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر بڑے بڑے (غذا کے) مجموعوں سے اٹھ کر کھایا کرتے تھے اور حقیقت میں ان کا دسترخوان وہی بڑا برتن ہوا کرتا تھا، اور موجودہ زمانہ کی طرح ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ مستقل طور پر برتنوں کا رواج نہیں تھا۔

”قدور“ جمع ”قدر“ (بروزن قشر) اُس برتن کے معنی میں ہے کہ جس میں کھانا پکایا جاتا ہے (دیگ) اور ”راسیات“ جمع ”راسیہ“ کی ہے جو ایک ہی جگہ پر گڑھی ہوئی یا ثابت و جہی ہوئی کے معنی میں ہے، اور یہاں وہ دیگیں مراد ہیں کہ جنہیں ان کے بڑے ہونے کی وجہ سے ان کی اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جاتا تھا۔

آیت کے آخر میں ان نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد داؤد کی اولاد سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اے آل داؤد! شکر گزاری کرو“ (اعملوا آل داؤد شکرًا)۔
”لیکن میرے بندوں میں سے بہت ہی تھوڑے لوگ شکر کرنے والے ہیں“ (و قلیل من عبادی الشکور)۔

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ اگر شکر گزاری سے مراد صرف زبان کے ساتھ شکر، شکر، کہنا ہو تو پھر تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، کہ اس پر عمل کرنے والے کم ہوں، بلکہ اس سے مراد ”عمل طور پر شکر“ ادا کرنا ہے، یعنی نعمتوں کو انہیں مقاصد میں استعمال کرنا جن کے لیے وہ پیدا کی گئیں اور عطا کی گئیں ہیں، اور یہ بات مسلم ہے، کہ وہ لوگ کہ جو خدا کی نعمتوں کو عام طور پر ان کی اپنی جگہ پر استعمال کریں بہت ہی تھوڑے ہیں۔

بعض بزرگ شکر کے لیے تین مراحل کے قائل ہوتے ہیں:

اول: دل کے ساتھ شکر کرنا، یعنی نعمت کا تصور کرنا، اور اس پر راضی ہونا اور خوشی کا اظہار کرنا۔

دوسرے: زبان کے ساتھ شکر کرنا یعنی نعمت دینے والے کی حمد و ثنا بیان کرنا۔

تیسرے: تمام اعضاء و جوارح کے ساتھ شکر کرنا اور وہ اعمال کو اس نعمت کے ساتھ ہم آہنگ بنانا ہے۔

”شکور“ مبالغہ کا صیغہ ہے اور بہت زیادہ شکر ادا کرنے کو ظاہر کرتا ہے جو کہ دل، زبان اور اعضاء

جوارح کے ساتھ متواتر و مسلسل شکر کو دہراتے رہتا ہے۔

البتہ بعض اوقات یہ صفت خدا کے لیے بھی لائی گئی ہے، جیسا کہ سورہ تغابن کی آیت، ۱ میں بیان ہوا ہے: ”واللہ شکور حلیم“ خدا کی شکر گزاری سے مراد یہ ہے کہ بندے جتنا اس کی اطاعت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں، اتنا ہی وہ انہیں اپنے الطاف و انعامات سے نوازتا ہے اور ان کی قدرانی کرتے ہوتے انہیں اپنے فضل و کرم سے اس سے کہیں زیادہ عطا فرماتا ہے کہ جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ تعبیر کہ میرے بندوں میں سے کم لوگ شکر گزار ہیں، ممکن ہے کہ یہ اس گروہ کے مقام کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے ہو کہ جو ایک نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں، یا مراد یہ ہو کہ تم بھی کوشش کرو اور ان کے زمرہ میں داخل ہو جاؤ تاکہ شکر کرنے والوں کی جماعت میں اضافہ ہو۔

آخری زیر بحث آیت، اس حال میں کہ وہ سلیمان کے بارے میں بھی، آخری گفتگو ہے، خدا کے اس عظیم پیغمبر کی عجیب و غریب اور عبرت انگیز موت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور اس حقیقت کو روشن کر رہی ہے، کہ اتنے باعظمت پیغمبر اور اتنی قدرت و عظمت اور دہد بہ رکھنے والے حکمران نے اپنی جان کس طرح آسانی کے ساتھ جان آفرین کے سپرد کر دی، یہاں تک کہ بستر پر بیٹھنے سے پہلے ہی موت کے چنگل نے ان کے گریبان کو پکڑ لیا۔

فرماتا ہے: ”جب ہم نے سلیمان کے لیے موت کا حکم نافذ کر دیا تو کسی نے بھی لوگوں کو اس کی موت سے آگاہ نہ کیا مگر زمین پر ریگنے والے نے کہ جس نے اس کے عصا کو کھایا یہاں تک کہ اس کا عصا ٹوٹ گیا اور سلیمان کا پیکر نیچے گر پڑا“ (فلما قضینا علیہ الموت ما د لہم علی موتہ الا دابة الارض تاكل منسأته)۔

اد پر والی آیت کی تعبیر اور اسی طرح متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سلیمان کی موت کا وقت آن پہنچا تو وہ اس وقت کھڑے ہوئے تھے اور اپنے عصا پر تکیہ کیے ہوئے تھے کہ اچانک موت نے ان کو آپکڑا، اور ان کی روح بدن سے پرواز کر گئی، وہ ایک مدت تک اسی حالت میں کھڑے

۱۔ ”منسأته“ مادہ نسا۔ (بروزن نج) اور نسیئ (بروزن نصیب) سے تاخیر کے معنی میں ہے اور چونکہ عصا سے چیزوں کو پکچھے کی طرف دھکیلتے ہیں اور دور کرتے ہیں لہذا لفظ ”منسأته“ اس پر بولا گیا ہے (یعنی پیچھے دھکیلتے کا ذریعہ) بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ لفظ ایل میں کے الفاظ سے یہ تھا اور چونکہ سلیمان اس علاقہ پر حکومت رکھتے تھے لہذا قرآن نے ان کے بارے میں لے استعمال کیا ہے۔
۲۔ مفردات راغب، تفسیر قرطبی اور روح البیان کی طرف رجوع کریں۔

رہے یہاں تک کہ دیکھنے والے نے قرآن مجید سے تائید الراضی (زمین پر ریگنے والی چیز) سے تعبیر کرتا ہے۔ ان کے عصا کو کھالیا، جس سے ان کا اعتدال برقرار نہ رہ سکا اور زمین پر گر پڑے تب لوگ ان کی موت سے آگاہ ہوئے۔

لہذا اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ: "جب سلیمان گرے تو اس وقت جنات سمجھے کہ اگر وہ غیب سے آگاہ ہوتے تو ذلیل کرنے والے عذاب میں گرفتار نہ رہتے" (فلما خسر تبیت الجن ان لو كانوا يعلمون الغیب ما لبثوا فی العذاب المہین)۔

"تبیت" کا جملہ "تبیین" کے مادہ سے عام طور پر آشکار و واضح ہونے کے معنی میں (فعل لازم) ہے اور بعض اوقات کسی چیز کو جاننے اور اُس سے آگاہ ہونے کے معنی میں (فعل متعدی کے طور پر) بھی آتا ہے اور یہاں دوسرے ہی معنی کے ساتھ مناسب ہے، یعنی اس وقت تک اگر وہ جن سلیمان کی موت سے آگاہ نہیں تھا، اور انہوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ اگر وہ غیب کے اسرار سے آگاہ ہوتے تو اس مدت میں ایسے سخت کاموں کی زحمت و تکلیف میں باقی نہ رہتے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس جملہ کو پہلے معنی میں لیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ آیت کا مضموم اس طرح ہے کہ سلیمان کے گر جانے کے بعد جنوں کی حالت انسانوں کے لیے واضح و آشکار ہو گئی کہ وہ غیب کے اسرار سے آگاہ نہیں ہیں، اور کچھ لوگ بلا جواز ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔

"عذاب مہین" کی تعبیر ممکن ہے کہ ان سنگین و سخت کاموں کی طرف اشارہ ہو کہ جو سلیمان جبران اور سزا کے عذاب سے جنوں کے ذمہ ڈالتے تھے، ورنہ خدا کا پیغمبر کسی شخص کو بلا وجہ کسی سختی اور عذاب وہ بھی ذلیل و خوار کرنے والے عذاب میں ہرگز نہیں ڈالتا۔

چند نکات

۱۔ سلیمان کی عبرت انگیز زندگی کا منظر قرآن مجید۔ موجودہ تورات کے برخلاف کہ جو سلیمان کو ایک جبار، بت خانہ ساز اور عورتوں کی ہوس میں مبتلا بادشاہ کے طور پر متعارف کراتی ہے۔ سلیمان کو خدا ایک عظیم پیغمبر شاد کرتا ہے۔

پہلی صورت میں آیت کی ترتیب اس طرح ہوتی، تبیت فعل جن فاعل (بیان معنی جمع کا ہے) اور ان لوکانوا... اس کے مفعول کی جگہ پر ہے اور دوسری صورت میں تبیت فعل اور "امرا الجن" فاعل پھر مضامین عذوبہ کی ہے اور معانی اس کا قائم مقام بنا ہے، وان لوکانوا... اس کا بیان و وضاحت ہے۔

تورات کتاب اول طوک و پادشاہان

اور انہیں قدرت اور بے نظیر حکومت کے نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے اور سلیمان سے مربوط مباحث کے دوران بہت ہی عظیم درس انسانوں کو دیتا ہے کہ ان داستانوں کے ذکر کرنے کا اصل مقصد وہی ہیں۔

ہم نے اوپر والی آیات میں پڑھا ہے کہ خدا نے اس بزرگ پیغمبر کو بہت ہی عظیم نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔

بہت ہی سریع اور تیز رو سواری کہ جس کے ذریعے وہ مختصر سی مدت میں اپنے سارے ملک کی سیر کر سکتے تھے۔

مختلف صنعتوں کے لیے فراوان معدنی مواد۔

اس معدنی مواد کو استعمال کرنے کے لیے کافی فعال قوت۔

انہوں نے ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے بڑے عبادت خانے بنائے اور لوگوں کو عبادت کی طرف ترغیب دی علاوہ ازیں حکومت کی فوجوں، کارکنوں اور کمزور لوگوں کے طبقات کی پذیرائی کے لیے وسیع و وسیع پر وگرام منظم کیا، کہ جس کے برتنوں کے نمونہ سے۔ کہ جو اوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے۔ باقی چیزوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ان تمام نعمتوں کے مقابلہ میں انہیں شکرگزاری کا حکم دیا، اس مطلب پر تاکید کرتے ہوئے کہ خدا کی نعمتوں کے شکر کا حق بہت ہی کم لوگ ادا کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد یہ واضح و روشن کیا کہ ایک شخص اس قدرت و عظمت کے باوجود موت کے مقابلہ میں کتنا کمزور اور ناتواں تھا، کہ وہ ایک ہی لمحہ میں ناگہانی موت کے ذریعہ دنیا سے چل بسا، اس طرح سے کہ اجل نے اسے بیٹھے یا بستر پر لیٹے تک کی مہلت بھی نہ دی تاکہ مغزور سرکشی کرنے والے یہ گمان نہ کر لیں کہ اگر وہ کسی مقام پر پہنچ جائیں اور قدرت و قوت حاصل کریں تو واقعی طور پر وہ توانا ہو گئے ہیں، وہ جس کے سامنے جن اور انسان، شیطان و پری خدمت میں لگے ہوتے تھے اور زمین و آسمان جس کی جولا لگاہ تھے اور جس کی شہمت اور شان و شوکت میں جو بھی شک کرے اس کی عقل و فکر پر مرغ و مایہ قہقہہ لگائیں، ایک مختصر سے لمحہ میں سمندر کی موجوں پر ابھرنے والے بلبلی کی طرح نمودار ہو گیا۔

اور یہ بھی واضح و روشن کر دے کہ ایک ناچیز عصا اُسے ایک مدت تک کس طرح اٹھاتے رہا اور "جن" اُسے کھڑا ہوتے یا بیٹھے ہوئے دیکھتے رہنے کی وجہ سے کیسے سرگرمی کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہے؟

اور یہ بھی (دکھا دے) کہ دیکھنے والے نے انہیں کس طرح زمین پر گرایا اور ان کے ملک کے تمام

رشتوں کو توڑ کے رکھ دیا۔ ہاں! ایک عصا ہی اُس وسیع وسیع ملک کی فعال قوت کو برودتے کا رلائے ہوتے تھا اور ایک چھوٹی سی دیک نے اس کو حرکت سے روک دیا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس دن سلیمان نے دیکھا کہ ایک خوبصورت اور خوش پوش جوان تھر کے ایک کونہ سے باہر آیا اور ان کی طرف بڑھا، سلیمان نے تعجب کیا، کہا: تو کون ہے؟ اور کس کی اجازت سے یہاں آیا ہے؟ میں نے تو یہ حکم دیا ہوا تھا کہ آج کوئی شخص یہاں نہ آنے پائے۔

اس نے جواب دیا: میں وہ ہوں کہ نہ بادشاہوں سے ڈرتا ہوں اور نہ کسی سے رشوت لیتا ہوں سلیمان نے بہت ہی تعجب کیا۔ لیکن اُس نے مہلت نہ دی اور کہا میں موت کا فرشتہ ہوں، میں اس لیے آیا ہوں تاکہ میں آپ کی روح قبض کر دوں! یہ کہتے ہی فوراً ان کی روح قبض کر لی۔ اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بہت سے انبیاء کی داستاؤں کی طرح حضرت سلیمان کی داستاں میں بھی افسوسناک حد تک گھڑی ہوئی روایات شامل کر دی گئی ہیں اور ان کے ساتھ بہت سی خرافات منسوب کر دی گئی ہیں کہ جنہوں نے اس عظیم پیغمبر کے چہرے کو بدل دیا ہے، اور ان خرافات کا زیادہ تر حصہ موجودہ توہرات سے لیا گیا ہے اور اگر ہم صرف اسی پر قناعت کر لیں کہ جو قرآن نے کہا ہے تو پھر کوئی شکل پیش نہیں آئے گی۔

۲۔ سلیمان کی موت ایک مدت تک کیوں پوشیدہ رہی؟

یہ بات کہ حضرت سلیمان کی موت ان کے کارکنان حکومت پر کتنی مدت تک مخفی رہی، صحیح طور پر واضح نہیں ہے، ایک سال؟ ایک ماہ؟ یا چند روز۔

مفسرین کا اس سلسلہ میں ایک نظریہ نہیں ہے۔

کیا یہ اخفا اور کتمان ان کے اصحاب اور ارکان سلطنت کی جانب سے صورت پذیر ہوا تھا؟ کیا انہوں نے جانتے بوجھتے اس غرض سے کہ میں امور سلطنت کا رشتہ وقتی طور پر بکھر نہ جائے، ان کی موت کو پوشیدہ رکھا؟

یا یہ کہ اصحاب و ارکان سلطنت بھی اس امر سے آگاہی نہیں رکھتے تھے۔

یہ بات بہت ہی بعید نظر آتی ہے کہ ایک طولانی مدت تک یہاں تک کہ ایک دن سے زیادہ ہی کسی ان کے اطرافیان (گر دو پیش رہنے والے اصحاب و ارکان سلطنت) بھی آگاہ نہ ہوں، کیونکہ

یہ بات تو مسلم ہے کہ کچھ لوگ ان کا کھانا لے جانے پر مامور تھے اور ان تک دوسری ضروریات پہنچاتے تھے، تو وہ تو اس واقعہ سے ضرور آگاہ ہو جاتے، اس بنا پر بعید نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے۔ کہ وہ اس امر سے آگاہ تھے لیکن اسے کچھ مصلحتوں کی بنا پر مخفی رکھا، اسی لیے بعض روایات میں آیا ہے کہ اس مدت میں، آصف بن برخیا، ان کے وزیر خاص ملک کے امور کی تدبیر کرتے اور نظم و نسق چلاتے رہے۔

کیا سلیمان کھڑے ہوتے عصا کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوتے تھے یا بیٹھے ہوتے اپنے ہاتھ عصا پر رکھے ہوتے تھے اور سر کو ہاتھوں پر ٹکاتے ہوتے تھے اور اسی حالت میں ان کی روح قبض ہو گئی اور وہ ایک مدت تک اسی طرح رہے؟ اس سلسلے میں مختلف احتمالات ہیں، اگرچہ آخری احتمال زیادہ نزدیک نظر آتا ہے۔

اگر یہ مدت طولانی تھی تو کیا غذا کا نہ کھانا اور پانی کا نہ پینا دیکھنے والوں کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا تھا۔

چونکہ سلیمان کے تمام کام عجیب و غریب تھے لہذا وہ شاید اس مسئلہ کو بھی عجیب و غریب شمار کرتے تھے یہاں تک کہ ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آہستہ آہستہ ایک گروہ کے درمیان یہ زمزمہ پیدا ہوا کہ سلیمان کی پرستش کرنا چاہیے، کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک عرصہ سے ایک ہی جگہ پر ثابت و برقرار ہے؟ نہ تو وہ سوتا ہے نہ کھانا کھاتا ہے اور نہ پانی پیتا ہے۔ لیکن جس وقت عصا ٹوٹا اور سلیمان نیچے گرے تو یہ تمام رشتے ایک دوسرے سے ٹوٹ گئے اور ان کے خیالات نقش بر آب ہو گئے۔

لیکن بہر حال جو کچھ بھی تھا سلیمان کی موت کے اظہار میں اس تاخیر نے بہت سی چیزیں کو فاش کر دیا۔

۱۔ سب پر واضح و روشن ہو گیا کہ اگر انسان قدرت و طاقت کی بلندی تک بھی پہنچ جائے تو پھر بھی حادثات کے مقابلہ میں ایک ضعیف و کمزور وجود ہے اور ایک پرکاشی کا مانند ہے کہ جو طوفان کے راستہ میں ہر طرف اڑتا رہتا ہے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام شیخ البلاغہ کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

قلوان احدًا یجد الی البقاء سلماً او لدفع الصوت سبیلاً لکان ذالک سلیمان

ابن داؤد (۵) الذی سخر له ملک الجن والانس مع النبوة وعظیم الزلفۃ۔

اگر کوئی شخص اس جہان میں عالم بقا کی طرف کوئی سیڑھی پاتا، یا اپنے آپ سے موت کو دُور کر سکتا، تو وہ سلیمان تھے کہ جن کے لیے نبوت و مقام بلند کے ساتھ ساتھ جنتوں اور انسانوں پر حکومت بھی فراہم تھی۔

۲۔ سب لوگوں پر یہ حقیقت واضح دردشن ہو گئی کہ جنتوں کو غیب کا علم نہیں ہے اور نادان و بے خبر انسان کہ جو ان کی پرستش کرتے تھے انتہائی غلط اور غلطی پر تھے۔
۳۔ تمام لوگوں کے سامنے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ کسی طرح کسی ملک کا نظام اور شیرازہ ایک چھوٹے سے موضوع کے ساتھ وابستگی پیدا کر لے تو اس کے وجود کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے اور اس کے گر جانے سے گر جاتا ہے اور ان امور کے پیچھے پردہ و گار کی بے انتہا قدرت جلوہ گر ہے۔

۳۔ قرآن اور موجودہ تورات میں سلیمان کی تصویر

اس حال میں کہ قرآن سلیمان کو ایک عظیم پیغمبر کہتا ہے، ایسا پیغمبر کہ جو علم سے سرشار اور بہت زیادہ تقویٰ شمار تھا، ایسا پیغمبر کہ جو عظیم حکومت و سلطنت کا حکمران ہونے کے باوجود ہرگز مقام و مال کا اسیر نہ ہوا اور ان لوگوں سے کہ اسے فریب دینے کے لیے بہت سے گراں بہا ہدایا لائے تھے یہ کہا کہ: "اتمدد دن بجمال فما اتانا فی اللہ خیر مما اتانا کما"۔ "کیا تم میری مال کے ذریعہ مدد کرنا چاہتے ہو، حالانکہ جو کچھ خدا نے مجھے دیا ہے وہ اُس سے برتر ہے کہ تمہیں دیا ہے" (نمل - ۳۶)۔ ایسا پیغمبر کہ جس کی ساری آرزوئیں اور تمناؤں میں یہ تھیں کہ وہ پردہ و گار کی نعمتوں کا شکر ادا کر سکے "قال رب ادرعنی ان اشکر نعمتک الی انعمت علی و علی والدتی"۔ "اُس نے کہا: پروردگارا میری مدد کر اور توفیق عطا فرما کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کر سکوں کہ جو تو نے مجھ پر ازیر سے مل باپ پر کی ہیں" (نمل - ۱۹)

ایسا رہبر کہ جو یہ تک بھی اجازت نہ دیتا تھا کہ کوئی شخص جان بوجھ کر ایک چوٹی پر بھی ظلم کرے اسی لیے وادی نمل میں ایک چوٹی نے یہ صدا بلند کی تھی کہ: "یا ایہا النمل ادخلوا مساکنکم لا یحطمنکم سلیمان و جنودہ وہم لا یשמرون"۔ "اے چوٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور اس کا لشکر تمہیں بے خبری میں روند نہ ڈالے" (نمل - ۱۸)

وہ ایسا عبادت گزار تھا کہ اگر کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی دنیا میں مشغول ہو کر ذکر خدا سے غافل ہو جاتا تو فوراً اس کی تلافی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا اور کہتا کہ: "آنی احببت حب الخیر عن ذکر ربی"

۱۔ افسوس کہ اچھی چیزوں سے تعلق نے مجھے ایک لمحہ کے لیے خدا کی یاد سے اپنی طرف مشغول رکھا (ص - ۳۲)

وہ ایسا حکیم و داناتا تھا کہ جو قدرت رکھنے کے باوجود منطق و دلیل کے سوا بات نہیں کرتا تھا، یہاں تک کہ ایک پرند کے ساتھ بھی۔ جیسا کہ ہڈ کے ساتھ بات کرنے میں۔ حق و عدالت کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔

وہ ایسا حاکم تھا کہ جس کا معاون و وزیر بھی "علم کتاب" سے اتنا سرشار تھا کہ وہ ایک ہی لمحہ میں بلقیس کے تخت کو حاضر کر سکتا تھا۔

اور قرآن اس کی "آواب" (خدا کی طرف سے زیادہ سے زیادہ بازگشت کرنے والا)۔ اور "نعم العبد" (بہت ہی اچھا بندہ) جیسے اوصاف کے ساتھ توصیف کرتا ہے۔

وہ شخص کہ خدا نے "حکومت" اور "علم" جس کے اختیار میں دے دیا تھا اور اسے اپنی ہدایت کے ساتھ نوازا تھا، اور جس نے اپنی ساری عمر میں ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کے ساتھ شکر نہ کیا تھا۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود، آئیے دیکھیں! کہ موجودہ تحریف شدہ تورات اس بزرگ پیغمبر کے پاک دامن کو کس طرح شکر اور دوسری آلائشوں کے ساتھ آلودہ کر رہی ہے۔

تورات نے بتکد سے بنانے، بُت پرستی کو رواج دینے، عورتوں سے بے حساب عشق رکھنے اور ان کے عشق و عاشقی کی بہت ہی بدنام کرنے والی داستانوں میں طوطا کرنے کے سلسلے میں بہت ہی بدترین نسبتیں ان کے لیے بیان کی ہیں، ان کو نقل کرنے سے شرم آتی ہے، ہم ایک ہتھ کو جو نسبتاً ملامت اور نرم نظر آتا ہے اس جگہ بیان کرنے پر قناعت کرتے ہیں۔

کتاب اول طوک و پادشاہان میں اس طرح لکھا ہے:

اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ "سوا بیوں"، "عونیوں"، "ادویوں"، "صیدونیوں" اور "حیتیوں" میں سے بہت سی بیگناہ، اجنبی اور غیر عورتوں سے محبت کیا کرتا تھا، (یہ عورتیں) ان امتوں سے تعلق رکھتی تھیں کہ جن کے بارے میں خدا کا یہی اسرائیل کو یہ حکم تھا کہ تم ان میں داخل نہ ہونا اور ان سے شادی بیاہ نہ کرنا، اور وہ تم میں داخل نہ ہوں، کیونکہ وہ تمہارے دلوں کو اپنے خداؤں کی طرف مائل کر دیں گی اور سلیمان ان سے عشق و محبت کرتے ہوئے چھٹ گیا۔

اور اس کے لیے سات سو بیویاں (عقد دائمی والی)، اور تین سو متعہ والی (موقت) تھیں، اور انہوں نے سلیمان کے دل کو پھیر لیا تھا، اور یہ سلیمان کے بڑھاپے کے وقت واقع ہوا، کہ اس کی بیویوں نے ان کا دل اپنے عجیب و غریب خداؤں کی طرف موڑ لیا، اور اس کا دل اس کے باپ دادا کی طرح اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ تھا، اور سلیمان "صیدونیوں" کے خدا، "عشریوں اور عونیوں" کے

مکروہ - ملامت (عمومیوں کے بت) کے پیچھے لگ گیا، اور سلیمان نے خدا کی نگاہ میں بدی کی اور اپنے باپ داؤد کی طرح مکمل طور پر خدا کی راہ پر نہ چلا۔

اس وقت سلیمان نے اس پہاڑ پر کہ جو "یروشلم" کے سامنے تھا، عمون کی مکروہ اولاد "عموش" کے لیے خصوصیت کے ساتھ ایک بلند مقام بنایا، پس خدا سلیمان پر غضبناک ہوا، کیونکہ اس نے اسرائیل کے خدا سے کہ جو اس کو دو مرتبہ دکھائی دیا تھا، اپنا دل پھیر لیا تھا.... اور خدا نے سلیمان سے کہا کہ چونکہ تجھ سے یہ عمل صادر ہو گیا ہے اور میرے عہد اور ان فرائض کی، جن کے بجالانے کا میں نے تجھے حکم دیا تھا، تو نے تعمیل نہیں کی، اس لیے میں تیری سلطنت تجھ سے چھین کر تیرے غلام کو دے دوں گا، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ میں تیری زندگی میں ایسا نہ کروں گا، تیرے باپ داؤد کے سبب سے اور تیرے بیٹے کے ہاتھ سے اُسے لوں گا.... البتہ اس کے ہاتھ (سلیمان) سے تمام سلطنت نہیں لوں گا بلکہ اپنے بندے داؤد کا لحاظ کرتے ہوئے کہ جسے میں نے اس لیے برگزیدہ بنایا تھا کہ اس نے میرے اور فرائض کی حفاظت کی تھی، اس کو اس کی زندگی کے تمام دنوں میں بادشاہ رہنے دوں گا۔

تورات کی اس ساری جھوٹی داستان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

۱۔ سلیمان بُت پرست قبیلوں کی عورتوں سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتے تھے، اور خدا کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے ان میں سے بہت زیادہ تعداد میں (عورتیں) رکھی ہوئی تھیں، اور وہ آہستہ آہستہ انہی کے مذہب کی طرف مائل ہو گیا تھا، اور باوجود اس کے کہ "وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ جس نے عورت کو نہ دیکھا ہو" بلکہ ۷۰ عورتیں عہد دائم دالی اور ۳۰۰ عورتیں متعہ والی اس کے پاس تھیں، عورتوں کے ساتھ شدید لگاؤ نے انہیں راہ خدا سے باہر نکال دیا تھا۔ (نعوذ باللہ)

۲۔ سلیمان نے کھلم کھلا بت خانہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور اس پہاڑ کے اوپر کہ جو اسرائیل کے مقدس مرکز "یروشلم" کے سامنے واقع تھا، ایک بت کدہ - قبیلہ "سواہیان" کے معروف بت "کوش" کے لیے اور قبیلہ "بنی عمون" کے خاص بت "موک" کے لیے - تعمیر کرایا، اور "صیدنیوں" کے بت عشترون کے ساتھ بھی خاص لگاؤ پیدا کر لیا تھا، اور یہ سب باتیں بڑھاپے کی حالت میں واقع ہوئیں۔

۳۔ خدا نے اس انحراف اور بڑے گناہ کی وجہ سے اس کے لیے ایک سزا تجویز کی، اور وہ سزا یہ تھی کہ اس کا ملک اس سے چھین لے گا، لیکن خود اس کے ہاتھ سے نہیں بلکہ اس کے بیٹے "رجبام" کے ہاتھ سے (پھینے گا) اور خود اس کو مہلت دے گا وہ جتنا چاہے، حکومت کرے، اور یہ بات بھی

خدا کے خاص بندے داؤد - سلیمان کے باپ - کی وجہ سے تھی، خدا کا وہی خاص بندہ کہ جو تورات کی تصریح کے مطابق (العیاذ باللہ) قتل نفس اور زنا کے حصنہ اور اپنے رشید اور خدمت گزار افسر کی بیوی کے ساتھ صحبت کرنے کا مرتکب ہوا تھا، کیا کوئی بھی شخص اس قسم کی ناروا تہمتیں سلیمان جیسے آدمی کی مقدس ذات پر لگا سکتا ہے۔

اگر ہم سلیمان کو - جیسا کہ قرآن کہتا ہے - پیغمبر سمجھیں، تو پھر تو بات بالکل صاف اور واضح ہے اور اگر ہم انہیں بنی اسرائیل کے بادشاہوں کے سلسلے میں سے جانیں تو پھر بھی اس قسم کی تہمتیں اور تہمتیں ان کے بارے میں صادق نہیں آسکتیں۔

کیونکہ اگر ہم اس کو پیغمبر نہ بھی سمجھیں تو پھر بھی مسلہ طور پر وہ پیغمبر کے بعد ان کا قائم مقام نائب جانشین تو تھا، کیونکہ عہد قدیم کی کتب میں سے دو کتابیں ایک "مواعد سلیمان" یا "حکمتائے سلیمان" اور دوسری "سرود سلیمان" کے نام سے اس بزرگ مرد خدا کے اقوال و فرامین پر مشتمل ہیں۔ واقعاً یہودی اور عیسائی کہ جو موجودہ تورات پر ایمان رکھتے ہیں، ان سوالات کا کیا جواب رکھتے ہیں؟ اور ان رسوائیوں کو کیسے قبول کرتے ہیں۔

۴۔ حقیقی شکر گزار بہت کم ہیں

اس سلسلے میں سب سے پہلے "شکر" کے لغوی بنیادی معنی کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ "راغب" مفردات میں کہتا ہے: "شکر - نعمت کا تصور کرنا اور اس کا اظہار کرنا ہی ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ اصل میں "کشر" بمعنی "کشف" (اور اسی کے وزن پر) تھا، اس کے بعد مقلوب ہو کر شکر ہو گیا، اور اس کا نقطہ مقابل کفر ہے کہ جو نعمت کو بھول جانا، اور اس پر پردہ ڈالنا ہے۔ اس کے بعد شکر کو تین شعبوں میں تقسیم کیا ہے: ۱۔ "دل کا شکر" یعنی نعمت کے بالے میں غور و فکر کرنا، ۲۔ "زبان سے شکر" یعنی منہ کی حمد و ثنا کرنا، ۳۔ "تمام اعضاء کے ساتھ شکر" یعنی نعمت کے لیے قدر دانی کرنا اور اس کا جواب دینا۔

اوپر والی آیات میں "اعملوا آل داؤد شکراً" کے جملہ کے ساتھ قرآن کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ شکر کا تعلق زیادہ تر عمل کے ساتھ ہے اور اس کو انسان کے اعمال کے اندر دکھائی دینا چاہیے۔ اور شاید اسی بنا پر قرآن نے واقعی اور حقیقی شکر گزاروں کی تعداد محدودی شمار کی ہے۔

اوپر والی آیات کے علاوہ سورہ ملک کی آیت ۲۳ میں بڑی بڑی نعمتوں مثلاً: کان، آنکھ اور دل کی پیداوار کا ذکر کرنے کے بعد مزید کہتا ہے کہ: "قلیلاً ما تشکرون" (تم اس کا بہت ہی کم

شکر ادا کرتے ہو اور سورہ نمل کی آیت ۳ میں یہ بیان ہوا ہے: "ولکن اکثرهم لا يشكرون" (ان میں سے اکثر شکرگزار ہی نہیں کرتے)۔ ایک طرف تو یہ ہے۔

اور دوسری طرف اس نکتہ پر توجہ کرتے ہوتے۔ کہ خدا کی وہ نعمتیں کہ جنہوں نے انسان کے وجود کو سر سے پاؤں تک گھیر رکھا ہے، اس قدر زیادہ ہیں کہ جنہیں شمار ہی نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها" (ابراہیم - ۳۴)۔ یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ تمام نعمتوں کے لیے شکر، اس کے واقعی مفہوم میں، اس طور پر کہ تمام نعمتوں کو انہیں کاموں کے لیے کہ جن کے لیے وہ پیدا ہوئی ہیں، بلا استثنا خدا کی بندگی کی راہ میں استعمال کرے۔ کیوں کم پایا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اور بعض بزرگ مفسرین کے قول کے مطابق "شکر مطلق" یہ ہے کہ انسان کسی قسم کی فراہمشی کے بغیر ہمیشہ خدا کی یاد میں لگا رہے، اور کسی قسم کی معصیت اور نافرمانی کیے بغیر اسی کی راہ میں قدم اٹھائے اور ہر قسم کی روگردانی کے بغیر اس کے فرمان کی اطاعت کرے اور سلسلہ طور پر یہ اوصاف بہت کم لوگوں میں جمع ہو سکتے ہیں اور یہ جو بعض نے اصولی طور پر انہیں محال خیال کیا ہے، بے بنیاد ہے اور ان مفاہیم اور عبودیت کے ان مراحل سے ان کی عدم آشنائی کی دلیل ہے۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ: پروردگار کے شکر کا حق ادا کرنا ایک لحاظ سے تو بہت ہی مشکل ہے کیونکہ جو نہی انسان مقام شکر میں داخل ہوتا ہے اور یہ توفیق اسے نصیب ہوتی ہے، اور شکرگزاری کے وسائل اس کے اختیار میں قرار پاتے ہیں، تو یہ خود ایک نئی نعمت ہے کہ جو ایک نئے شکر کی محتاج ہے، اور یہ موضوع تسلسل کی صورت اختیار کر لے گا، اور انسان جتنا زیادہ سے زیادہ اس کے شکر کے راستے میں سعی و کوشش کرے گا، تو اور زیادہ نعمتوں کا مشمول ہوتا چلا جائے گا کہ جن کا شکر ادا کرنے کی اس میں قدرت نہیں ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوتے، کہ شکر الہی کا حق ادا کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ اس کے شکر کو ادا کرنے سے بجز کا اظہار ہے۔ واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کے بہت ہی حقوڑے بندے۔ جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے۔ حقیقتاً اس راستہ میں قرار پاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل احادیث پر توجہ کرنے سے اس بحث میں کافی روشنی پڑ سکتی ہے:

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے: "کیا پروردگار کے شکر کی کوئی حد

ہے، کہ اگر انسان اس حد تک پہنچ جائے تو وہ شاکر محسوب ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اس نے سوال کیا: کس طرح؟ آپ نے فرمایا:

يحمد الله على كل نعمة عليه في اهل و مال، وان كان فيما انعم عليه في ماله حق اداء۔

"خدا کی تمام نعمتوں پر، چاہے وہ گھر والوں سے متعلق ہوں یا مال سے تعلق رکھتی ہوں، حمد و شکر کرے، اور اس مال میں کہ جو اسے دیا گیا ہے کوئی حق ہو تو اسے ادا کرے"۔

ایک اور حدیث میں انہی امام سے منقول ہے کہ:

شكر النعمة اجتناب المحارم

"نعمت کا شکر گناہ سے پرہیز کرنا ہے"۔

نیز ایک دوسری حدیث میں انہیں حضرت سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

فيما اوحى الله عز وجل الى موسى: يا موسى! اشكر فحق

شكركم، فقال يا رب! وكيف اشكرك حق شكركم وليس من

شكركم اشكرك به الا وانت انعمت به علي؟ قال يا موسى! الان

شكرتني حين علمت ان ذلك مني!

"خداوند تعالیٰ نے موسیٰ کو وحی کی۔ اے موسیٰ! میرے شکر کا حق ادا کر،

موسیٰ نے عرض کیا: میں تیرے شکر کا حق کیسے بجلاؤں جبکہ حال یہ ہے کہ میں جو

شکر بھی تیرا ادا کرتا ہوں، اس کی وجہ سے تو نے ایک اور نئی نعمت عطا کی ہے

فرمایا: اے موسیٰ! اب تو نے میرا شکر ادا کر دیا ہے، چونکہ تو نے یہ جان لیا ہے کہ شکر

ادا کرنے کی یہ توفیق بھی میری ہی طرف سے ہے"۔

اس نکتہ پر توجہ بھی ضروری ہے کہ ان لوگوں کا شکر ادا کرنا اور قدر دانی کرنا بھی کہ جو انسان

کے لیے کسی نعمت کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، شکر خدا کے شعبوں میں سے ایک ہے، جیسا کہ امام

سجاد علی بن الحسین علیہما السلام فرماتے ہیں:

"جب قیامت کا دن ہوگا تو خدا اپنے بعض بندوں سے کہے گا، کیا تو نے فلاں

شخص کا شکر یہ ادا کیا ہے، تو وہ عرض کرے گا، میں تیرا شکر بجا لایا ہوں، خدا فرمائے گا، چونکہ تو نے اس کا شکر یہ ادا نہیں کیا ہے، لہذا تو میرا شکر بھی بجا نہیں لایا، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ:

"اشکرکم للہ اشکرکم للناس"

"تم میں سے خدا کی بارگاہ میں زیادہ شکر گزار وہ ہے کہ جو لوگوں کے احسانات اور زحماتوں کا زیادہ شکر اور قدر دانی کرتا ہے"

- شکر، کی حقیقت کے بارے میں، اور شکر کس طرح نعمت کی زیادتی اور کفران نعمت کس طرح اس کے فنا ہونے کا سبب بنتا ہے، ہم نے چھٹی جلد سورہ ابراہیم کی آیہ ۷ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔

۱۳ لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكِنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتِ عَنْ يَمِينٍ
وَسَمَالٍ كَلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكَرُوا وَاشْكُرُوا لَهُ
بَلَدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبُّ غَفُورٌ ○

۱۴ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ السَّيْلَ الْعَرِيمَ وَبَدَّلْنَاهُمْ
بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتِ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثَلٍ وَشَيْءٍ
مِّنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ ○

۱۵ ذَلِكِ جَزَآئِنُهُمْ بِمَا كَفَرُوا وَهَلْ نُجْزِي
إِلَّا الْكَافِرَ ○

ترجمہ

۱۳ قوم سبا کے لیے ان کی سکونت کی جگہ میں (قدرت الہی کی) ایک نشانی تھی، دو (عظیم اور وسیع) باغ دائیں اور بائیں (افراداں پھلوں کے ساتھ، ہم نے ان سے کہا، اپنے پروردگار کی روزی میں سے کھاؤ اور اس کا شکر بجا لاؤ، (تمہارے لیے) پاک و پاکیزہ شہر ہے اور بخشنے والا (اور مہربان) پروردگار۔

۱۴ لیکن وہ (خدا سے) روگردان ہو گئے، تو ہم نے بھی دیران کرنے والا سیلاب ان کی طرف بھیج دیا، اور ان کے دو (پُر پر بکت) باغوں کو ایسے دو (گھٹیا قسم کے) باغوں کے ساتھ بدل دیا کہ جن کے پھل کڑے تھے، کچھ جھاؤ تھے، اور تھوڑے سے بیری کے درخت (باقی رہ گئے تھے)۔

۱۷) یہ ہم نے ان کے کفر کی وجہ سے انہیں سزا دی تھی اور کیا کفرانِ نعمت کرنے والوں کے سوا ہم کسی اور کو ایسی سزا دیتے ہیں؟

تفسیر

ایک درختان تمدن جو کفرانِ نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا

خدا نے داؤد و سلیمان کو جو اہم نعمتیں عطا کی تھیں اور ان دونوں پیغمبروں نے جس طرح سے ان کا شکر ادا کیا تھا، ان کا بیان کرنے کے بعد ایک اور قوم کے بارے میں کہ جو ان کے نقطہ مقابل میں قرار پائی تھی، گفتگو کر رہے ہیں اور شاید وہ اسی زمانہ میں یا تھوڑا سا ان کے بعد زندگی بسر کرتے تھے وہ بھی ایک ایسی قوم تھی کہ خدا نے انہیں انواع و اقسام کی نعمتیں عطا فرمائی تھیں، لیکن انہوں نے کفرانِ نعمت کی راہ اختیار کر لی لہذا خدا نے اپنی نعمتیں ان سے سلب کر لیں اور وہ اس طرح سے پریشان اور در بدر ہوئے کہ ان کی زندگی کا ماجرا سارے جہان کے لوگوں کے لیے ایک درس عبرت قرار پایا، اور وہ "قوم سبا" تھی۔

قرآن مجید نے ان کی عبرت انگیز سرگزشت پانچ آیتوں کے ضمن میں بیان کی ہے اور ان کی زندگی کے جزئیات و خصوصیات کے اہم حصہ کی طرف انہیں پانچ مختصر آیات میں اشارہ کیا ہے۔

پہلے کتا ہے: "قوم سبا کے لیے ان کے عمل سکونت میں خدائی قدرت کی ایک نشانی تھی" (لقد کان لسبا فی مسکنہم آیتہ)۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے خدا کی اس بزرگ آیت کا سرچشمہ یہ تھا، کہ قوم سبا۔ اس علاقے کے اطراف میں واقع پہاڑوں کے محل وقوع اور ان کے خاص حالات و شرائط، اور اپنی خدا داد ذہانت اور ہوشمندی سے استفادہ کرتے ہوئے۔ ان سیلابوں کو کہ جو سوائے ویرانی و تباہی کے کوئی نتیجہ نہ دیتے تھے، ایک قومی اور مستحکم بند کے پیچھے روک دینے پر قادر ہو گئے تھے اور اس کے ذریعہ انہوں نے بہت ہی آباد ملک تعمیر کر لیا تھا۔ یہ تھی عظیم آیت ہے کہ ایک ویران اور برباد کرنے والا عامل، عمران و آبادی کے اہم ترین عوامل میں بدل جائے۔

اس بارے میں کہ "سبا" (بروزن سب) کس کا نام ہے؟ اور یہ کیا چیز ہے؟ مورخین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن مشہور یہ ہے کہ "سبا" "مین" کے اعراب کے باپ کا نام ہے اور اس روایت کے مطابق کہ جو پیغمبر اسلام سے نقل ہوئی ہے، وہ ایک آدمی تھا اور اس کا نام "سبا" تھا،

اور اس کے دس بیٹے تھے، اور ان میں سے ہر ایک سے وہاں کے قبائل میں سے ایک قبیلہ وجود میں آیا۔

بعض "سبا" کو سرزمین یمن یا اس کے کسی علاقے کا نام سمجھتے ہیں، سورہ نمل میں سلیمان و ہڈ کے قصہ میں قرآن مجید کا ظاہر بھی یہی نشاندہی کرتا ہے کہ "سبا کسی جگہ، علاقے یا مقام کا نام ہے، جہاں پر وہ کتا ہے کہ (وجشتک من سبا بنبا یقین) "میں سرزمین سبا سے تیرے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں" (نمل-۲۲)

جبکہ زیر بحث آیت کا ظاہر یہ ہے کہ سبا ایک قوم تھی کہ جو اس علاقے میں رہتی تھی، کیونکہ ضمیر جمع مذکر (ھم) ان کی طرف لوٹ رہی ہے۔

لیکن ان دونوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ ابتدا میں سبا کسی شخص کا نام ہو، پھر اس کے تمام بیٹے اور قوم اس نام سے موسوم ہوئے ہوں اور اس کے بعد یہ نام اس سرزمین کی طرف بھی منتقل ہو گیا ہو۔

اس کے بعد قرآن اس خدائی آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہ جو قوم سبا کے اختیار میں قرار پائی تھی، اس طرح کتا ہے: "دو بڑے باغ تھے دائیں اور بائیں طرف" (جنتان من یمین و شمال)۔

یہ ماجرا اس طرح تھا کہ قوم سبا اس عظیم بند کے ذریعہ۔ جو انہوں نے اس علاقے کے اہم پہاڑوں کے درمیان بنایا تھا۔ اس بات پر قادر ہو گئی تھی کہ ان فراداں سیلابوں کو۔ جو دیرانی کا سبب بنتے تھے یا کم از کم بیابانوں میں بے کار و فضول طور سے ضائع اور تلف ہو جاتے تھے۔ اس بند کے پیچھے ذخیرہ کر لیں اور اس کے اندر کھڑکیاں بنا کر پانی کے اس عظیم مخزن سے استفادہ کرنے کے لیے اپنے کنٹرول میں کر لیں اور اس طرح سے وسیع و عریض زمینوں کو زیر کاشت لائیں۔

وہ اشکال جو فخرازی نے یہاں نقل کیا ہے، کہ دو باغوں کا ہونا کوئی عجیب یا اہم چیز نہیں ہے، کہ جنہیں آیت اور نشانی کے طور پر ذکر کیا جائے، اس کے بعد اس اشکال کا جواب دیا ہے، کہ جو ہماری نظر میں اس قابل نہیں ہے کہ اسے بیان کیا جائے، کیونکہ وہ کوئی معمولی اور سادہ قسم کے باغ نہیں تھے بلکہ یہ ایک عظیم نہر کے دونوں طرف باغوں کا مسلسل اور ملا ہوا سلسلہ تھا، جو اس عظیم سد کے ذریعہ سیراب ہوتے تھے اور وہ اتنے برکت والے تھے کہ تاریخیوں میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ٹوکری اپنے سر پر رکھ کر پھلوں کی فصل میں درختوں کے نیچے سے عبور کرتا تھا تو اس قدر پھل اس میں

گرتے تھے کہ تھوڑی سی دیر میں وہ ٹوٹ کر ہی بھر جاتی تھی۔

وہی سیلاب کہ جو خرابی و بربادی کا باعث بنیں، وہ اس طرح سے آبادی کا باعث بن جائیں، کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟ کیا یہ خدا کی عظیم آیت اور نشانی شمار نہیں ہوتی۔

ان تمام باتوں کے علاوہ اُس سرزمین پر حد سے زیادہ امن و امان سایہ فگن تھا کہ وہ خود بھی حق تعالیٰ کی ایک آیت شمار ہوتا تھا کہ جس کی طرف قرآن بعد میں اشارہ کرے گا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "ہم نے اُن سے کہا کہ اپنے پروردگار کی اُس فراواں روزی میں سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو" (کلوا من رزق ربکم واشکروا للہ)۔

"ایک پاک و پاکیزہ شہر ہے اور پروردگار بخشنے والا اور مسربان" (بلدۃ طیبۃ و رب غفور)۔

اس چھوٹے سے جملے نے تمام مادی و معنوی نعمتوں کے مجموعہ کو زیبا ترین شکل میں منعکس کر دیا ہے، مادی نعمتوں کے لحاظ سے تو وہ پاک و پاکیزہ زمین رکھتے تھے کہ جو چوروں، ظالموں، آفات، بلیات، خشک سالی و قحط اور بدآئینی و وحشت جیسی طرح طرح کے مصائب سے پاک تھی، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمین موذی حشرات سے بھی پاک و پاکیزہ تھی، پاک و پاکیزہ ہوا میں چلتی تھیں اور فرحت بخش نسیم رواں دواں تھی، زمین زرخیز تھی اور درخت پر بار تھے۔

اور معنوی نعمت کے لحاظ سے خدا کی بخشش و عفران ان کے شامل حال تھی، وہ ان کی تقصیر و کوتاہی سے صرف نظر کرتا تھا اور انہیں مشمول عذاب اور ان کی سرزمین کو بلا و مصیبت میں گرفتار نہیں کرتا تھا۔

لیکن ان ناشکرے لوگوں نے ان تمام نعمتوں کی قدر دانی نہیں کی اور آزمائش کی کٹھالی سے صحیح و سالم باہر نہ آ سکے۔ انہوں نے کفران نعمت اور روگردانی کی راہ اختیار کر لی لہذا خدا نے جہنم کی سستی کے ساتھ گوشالی کی۔

اسی لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "وہ خدا سے روگرداں ہو گئے" (فاعرضوا)۔

۱۔ "بلدۃ" خبر ہے مبتدائے محذوف کی، اور تقدیر میں اس طرح تھا "ہذہ بلدۃ طیبۃ و ہذا رب غفور" یہ پاکیزہ شہر ہے اور یہ بخشنے والا خدا ہے۔

۲۔ کیا یہ خدائی پیغام ان پیغمبروں کے ذریعہ جو ان کے درمیان مبعوث ہوئے تھے بھیجا گیا تھا۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے۔ یا حالات و شرائط زبان حال سے اور ادراک عقل سے اس قسم کا پیغام انہیں دیتے تھے، دونوں چیزیں ممکن ہیں۔

انہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناقدری کی، عمرانؑ کی آبادی اور امن و امان کو عام سی چیز خیال کیا حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو گئے، نعمت میں مست ہو گئے، مالدار لوگ، فقراء و مساکین اور غرباء کو حقیر خیال کرتے اور خود پر ناز کرتے اور ان غریبوں کو اپنے لیے رکاوٹ خیال کرتے کہ جس کی تفصیل بعد والی آیات میں آئے گی۔

یہ وہ موقع تھا کہ عذاب کا کوڑا ان کے پیکر پر آکر پڑا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "ہم نے بنیادوں کو اکھاڑ کر پھینک دینے والا وحشتناک سیلاب ان کے پاس بھیجا" اور ان کی آباد سرزمین ایک دیرانے میں بدل گئی (فارسلنا علیہم سبیل العرم)۔

"عرم" اصل میں "عراہہ" (بروزن علامہ) ہے، خشونت و سختی، کج خلقی اور سخت گیری کے معنی میں ہے اور سیلاب کی اس سے توصیف کرنا اس کی شدت و خشونت اور دیران گیری کی طرف اشارہ ہے اور سبیل العرم کی تعبیر۔ اصطلاح کے مطابق۔ موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے۔

بعض نے "عرم" کو جنگلی چوہوں کے معنی میں لیا ہے کہ جو اس سد میں سوراخ کرنے کی وجہ سے اس کی دیرانی کا سبب بنتے تھے (چوہوں کا سد میں نفوذ کرنے کا مسئلہ اگرچہ قابل قبول ہے اس طور سے کہ جس کی ہم بعد میں تشریح کریں گے، لیکن آیت کی تعبیر اس معنی سے چنداں مناسبت نہیں لگتی)۔ "لسان العرب" میں مادہ "عرم" کے مختلف معنی آئے ہیں، منجملہ ان کے، طاقت فرما سیلاب وہ رکاوٹیں جو دروں کے درمیان پانی کو روکنے کے لیے بناتے ہیں اسی طرح بڑے صحرائی چوہے بلے لیکن سب سے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی ہے اور تفسیر علی بن ابراہیم میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن اس سرزمین کی باقی ماندہ حالت و کیفیت کی اس طرح سے توصیف کرتا ہے: "ہم نے ان کے دد وسیع اور پُر نعمت باغوں کو، دڈ بے قدر و قیمت کر ڈرے پھلوں والے اور جھاؤ کے بے صرف و درختوں اور تھوڑے سے بیری کے درختوں میں بدل دیا" (و بدلنا ہو بجنتیہو جنتین ذواتی اکل خمط وائل وشیء من سدر قلیل)۔

۱۔ "اکل" ہر قسم کے غذائی مادہ کے معنی میں ہے۔

۲۔ "خمط" (بروزن عمد) کڑوی گھاس کے معنی میں ہے۔

۳۔ "ائل" (بروزن اصل) جھاؤ کے درخت کے معنی میں ہے۔

اور اس طرح سے ان تمام سرسبز و شاداب درختوں کے بجائے بہت ہی کم قدر و قیمت والے بیابانی اور جنگل قسم کے چند ایک درخت کہ شاید ان میں سے سب زیادہ اہم درخت وہی بیڑی کے درخت تھے، کہ وہ بھی تھوڑی سی ہی مقدار میں تھے، باقی رہ گئے تھے (اب تم اس کی اس مجمل داستان کو پڑھنے کے بعد خود ہی ان کی مفصل داستان کا اندازہ لگا لو، کہ خود ان کے اوپر اور ان کی آباد سرزمین پر کیا گزری؟)۔

مگر ہے کہ ان تین قسم کے درختوں کا بیان کہ جو اس سرزمین میں باقی رہ گئے تھے (درختوں کے تین مختلف گروہوں کی طرف اشارہ ہو، کہ ان درختوں میں سے ایک حصہ نقصان وہ تھا، بعض بے صرف تھے، اور بعض بہت ہی کم نفع دینے والے تھے۔

بعد میں آنے والی آیت سے نتیجہ نکالتے ہوئے صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ: "یہ ہماری طرف سے ان کے کفران نعمت کی سزا تھی" (ذالک جزینا ہم بما کفروا)۔ لیکن اس غرض سے کہ کہیں یہ تصور نہ کر لیا جائے کہ یہ انجام صرف اسی گروہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے کہ جو ان ہی جیسے اعمال کے مرتکب ہوں گے اس کی عموماً سزا ہے۔ اس طرح اضافہ کرتا ہے: "کیا ہم کفران نعمت کرنے والوں کے سوا کسی اور کو اس قسم کی سزا دیتے ہیں" (وہل نجازی الا الکفور)۔ یہ تھا خلاصہ سب کی سرگزشت کا، کہ جو بعد والی آیات میں زیادہ تشریح کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

۱۸) وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا فِيهَا لِيَأْتِيَا وَيَأْتِيَا مَنِينَ ○

۱۹) فَقَالُوا رَبَّنَا بَعْدَ بَيْنِ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَرِّقٍ ○ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ○

ترجمہ

۱۸) اُن کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان کہ جنہیں ہم نے برکت دے رکھی تھی، ہم نے کچھ ایسی اور آبادیاں بھی رکھی تھیں، جن میں ایسے مناسب اور نزدیک نزدیک فاصلے تھے (کہ ایک سے دوسری دکھائی دیتی تھی،) (اور اُن کے درمیان چلنے پھرنے کو آسان بنا دیا تھا، اور ہم نے ان سے کہا کہ تم مکمل امن و امان کے ساتھ راتوں میں بھی اور دنوں میں بھی ان آبادیوں کے درمیان سفر کرو۔

۱۹) لیکن (ان ناشکرے لوگوں نے) کہا، پروردگارا! ہمارے سفروں کے درمیان دُوری ڈال دے (تاکہ غریب و نادار لوگ مالدار لوگوں کے دوش بدوش سفر نہ کر سکیں! اور اس طرح سے) انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، اور ہم نے انہیں (دوسروں کے لیے) قصہ اور افسانہ بنا دیا، اور ہم نے ان کی جمعیت کو منتشر اور

تتر بتر کر دیا، اس ماجرا میں ہر صابر اور شکر کرنے والے کے لیے عبرت کی کنی اور نشانیاں ہیں۔

تفسیر

ہم نے انہیں اس طرح منتشر کیا کہ وہ دوسروں کیلئے ضرب المثل بن گئے

ان آیات میں قرآن دوبارہ قوم سبا کی داستان کی طرف لوٹتا ہے اور ان کے بارے میں مزید تشریح و تفصیل بیان کرتا ہے اور ان کی سزا اور عذاب کو بھی زیادہ شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتا ہے، اس طرح سے کہ یہ ہر سننے والے کے لیے ایک ایسا درس ہے جو بہت اہم، بہت آموز اور تربیت کنندہ ہے، فرماتا ہے کہ: ”ہم نے ان کی سرزمین کو اس حد تک آباد کیا تھا کہ نہ صرف ہم نے شہروں کو مرقع نعمت کیا ہوا تھا بلکہ ان کے اور ان کی ان زمینوں کے درمیان کہ جنہیں ہم نے برکت دے رکھی تھی، ظاہر (ایک سے دوسرے کو دکھائی دینے والے) اور آشکار شہر اور آبادیاں قرار دیا تھا“ (وجعلنا بینہم و بین القرى التي بارکنا فیہا قرىٰ ظاہرة)۔

درحقیقت ان کے اور ان کی مبارک سرزمین کے درمیان متصل اور ذخیر کی گڑیوں کی طرح آبادیاں تھیں اور ان آبادیوں کے درمیان اتنا کم فاصلہ تھا کہ وہ ہر ایک میں سے دوسری کو دیکھتے تھے (اور یہ ہے ”قریٰ ظاہرة“۔ واضح و آشکار آبادیوں کا معنی)۔

بعض مفسرین نے ”قریٰ ظاہرہ“ کی دوسری طرح تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ ان آبادیوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو ٹھیک راستہ کے درمیان واضح طور پر واقع تھیں اور مسافرین ان میں اچھی طرح توقف کر سکتے تھے، یا یہ کہ یہ آبادیاں بلندی کے اوپر واقع تھیں اور ہر عبور کرنے والے کو صاف طور پر دکھائی دیتی تھیں۔

باقی رہا یہ کہ مبارک زمینوں سے کونسا علاقہ مراد ہے، اکثر مفسرین نے اسے سرزمین شامات (شام فلسطین اور اردن) سے تفسیر کی ہے، کیونکہ یہ تعبیر اسی سرزمین کے لیے سورہ اسراء کی پہلی آیت اور سورہ انبیاء کی آیت ۸۱ میں آئی ہے، لیکن بعض مفسرین نے احتمال دیا ہے، کہ اس سے مراد صغناغ یا ”آراب“ کی آبادیاں ہیں کہ یہ دونوں ہی یمن کے علاقہ میں واقع ہیں اور یہ تفسیر بعید نہیں ہے، کیونکہ ”یمن کا“ جو جزیرہ عرب کا جنوبی ترین نقطہ ہے۔ ”شامات“ سے فاصلہ۔ کہ جو شمالی ترین نقطہ میں واقع ہے۔ اس قدر زیادہ ہے اور خشک اور جلے ہوئے بیابانوں سے اٹا ہوا ہے، کہ اس کے ساتھ آیت کی تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے اور تواریخ میں بھی نقل نہیں ہوا ہے، بعض نے احتمال

بھی دیا ہے کہ سرزمین ہائے مبارک سے مراد ”مکہ“ کی سرزمین ہے کہ وہ بھی بعید ہے۔ یہ بات تو آبادی کے لحاظ سے ہے، لیکن چونکہ لوگوں کی آبادی کافی نہیں ہے بلکہ اہم اور بنیادی شرط امن و امان ہوتا ہے، لہذا مزید کہتا ہے: ”ہم نے ان آبادیوں کے درمیان مناسب اور نزدیک نزدیک فاصلے رکھے“ (تاکہ وہ آسانی اور امن و امان کے ساتھ ایک دوسری میں آجائیں) (وقدرنا فیہا السیر)۔

اور ہم نے ان سے کہا: ”تم ان بستیوں کے درمیان راتوں میں اور دنوں میں پورے امن و امان کے ساتھ سفر کرو اور ان آبادیوں میں چلو پھرو“ (سیروا فیہا لیالی و ایامًا امنین)۔ اس طرح یہ آبادیاں مناسب اور چھٹا فاصلہ رکھتی تھیں اور وحوش اور بیابانی درندوں، یا چوروں اور ڈاکوؤں کے حملہ کے لحاظ سے بھی انتہائی امن و امان میں تھیں اس طرح سے کہ لوگ زاد راہ، سفر خرچ اور سواری کے بغیر ہی۔ اس صورت میں کہ نہ تو اکٹھے قافلوں میں چلنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی مسلح افراد ساتھ لینے کی کوئی احتیاج تھی۔ راستے کی بے امنی کی جہت سے یا پانی اور غذا کی کمی کی وجہ سے کسی ڈر اور خوف کے بغیر اپنے سفر کو جاری رکھ سکتے تھے۔

اس بارے میں کہ ”سیر وانیہا“۔۔۔ (ان آبادیوں میں چلو پھرو) کا جملہ کس شخص کے ذریعہ انہیں پہنچایا گیا، دو احتمال موجود ہیں، ایک تو یہ ہے کہ یہ انہیں ان کے پیغمبروں کے ذریعہ پہنچایا گیا اور دوسرے یہ کہ اس آباد سرزمین اور امن و امان والی مشکوٰۃ کی زبان حال یہی تھی۔

”لیالی“ (راتوں) کو ”ایام“ (دنوں) پر مقدم رکھنا، ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ راتوں میں امن و امان کا ہونا زیادہ اہم ہے، راستے کے چوروں سے امنیت کے لحاظ سے بھی اور جنگل کے وحشی درندوں کے لحاظ سے بھی، اور دن کے امن و امان کو قائم رکھنا زیادہ آسان ہے۔

لیکن یہ ناشکرے لوگ، خدا کی ان عظیم نعمتوں کے مقابلہ میں کہ جنہوں نے ان کی زندگی کو مکمل طور پر گھیر رکھا تھا، بہت سی دوسری متمتع قوموں کی طرح، مغرور و غفلت میں گرفتار ہو گئے، نعمت کی مستی اور کم ظرفی نے انہیں اس بات پر ابھارا، کہ ناشکری کا راستہ اختیار کریں حق کے راستے سے منحرف ہو جائیں اور خدا کے احکام کی طرف سے بے پروا ہو جائیں۔

ان کے مجنونانہ تقاضوں میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے خدا سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کے سفروں کے درمیان فاصلہ ڈال دے، ”انہوں نے کہا: پروردگارا! ہمارے سفروں کے درمیان فاصلہ ڈال دے“ تاکہ بے سہارا فقیر لوگ امراء کے دوش بدوش سفر نہ کر سکیں! (فقلوا ربنا باعد بسین اسفارنا)۔

ان کی مراد یہ تھی کہ ان آباد بستیوں کے درمیان فاصلہ ہو جائے اور کچھ خشک بیابان پیدا ہو

ہائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اغنیاء اور ثروت مند لوگ اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ تھوڑی آمدنی والے لوگ بھی انہی کی طرح سفر کریں، اور جہاں چاہیں بغیر کسی زاہد اور توشہ و سواری کے چلے جائیں، گویا سفر ان کے لیے ایک اعزاز و افتخار اور ان کی قدرت و ثروت کی نشانی تھا، اور یہ امتیاز و برتری ہمیشہ انہی کے لیے مخصوص رہنی چاہیے۔

اور یہ بات تھی کہ راحت و آرام نے انہیں بے چین کر رکھا تھا، جیسا کہ بنی اسرائیل "من و سلوی" (دو آسمانی غذاؤں) سے تنگ آگئے تھے اور خدا سے پیاز، بسن اور مسور کی وال کا تقاضا کرنے لگے تھے۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "باعد بین اسفارنا" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس قدر آرام طلب ہو گئے تھے کہ وہ اب چراگا ہوں سے استفادہ کرنے، یا تجارت و زراعت کے لیے سفر کرنے پر تیار نہیں تھے، لہذا انہوں نے خدا سے یہ مطالبہ اور تقاضا کیا کہ ہمیشہ وہ اپنے وطن میں ہی رہیں، اور ان کے سفروں میں زمانہ کے اعتبار سے بہت زیادہ فاصلہ ہو جائے۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ بہتر نظر آتی ہے۔

بہر حال "انہوں نے اپنے اس عمل سے اپنے اوپر ظلم کیا" (و ظلموا انفسہم)۔

ہاں اگر وہ سوچ رہے تھے، کہ وہ دوسروں پر ظلم کر رہے تھے تو وہ غلطی پر تھے، انہوں نے تو ایک ایسا خنجر اٹھایا ہوا تھا کہ جس سے وہ اپنے ہی سینہ کو زخمی کر رہے تھے اور اس ساری آگ کا دھواں خود انہیں کی آنکھ میں گیا۔

کس قدر عمدہ تعبیر ہے، قرآن اس جملہ کے بعد، کہ جو ان کے دردناک انجام کے بارے میں بیان کیا ہے، کہتا ہے: "ہم نے انہیں ایسی سزا دی اور ان کی زندگی کو لپیٹ کر رکھ دیا، کہ انہیں ہم نے دوسروں کے لیے داستان اور افسانہ بنا دیا" (فجعلناہم احادیث)۔

ہاں ان کی تمام تر بارونق زندگی اور درخشاں و وسیع تمدن میں سے زبانی قصوں دلوں کی یادوں اور تاریخوں کے صفحات پر چند سطروں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا: "اور ہم نے انہیں برسی طرح سے حیران و پریشان کر دیا" (ومزقناہم کل ممزق)۔

ان کی سرزمین ایسی ویران ہوئی کہ ان میں دہاؤں قیام کرنے کی طاقت نہ رہی، اور زندگی کو باقی رکھنے کے لیے وہ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ ان میں سے ہر گروہ کسی طرف کا رخ کرے اور خزاں کے ہتوں کی طرح، کہ جو تند و تیز ہواؤں کے اندر ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں ہر ایک محسوس گوشہ میں جا گرسے، اس طرح سے کہ ان کی پریشانی ضرب المثل بن گئی، کہ جب بھی لوگ یہ کہنا

چاہتے کہ فلاں جمعیت سخت پراگندہ اور تتر بتر ہو گئی تو وہ یہ کہا کرتے تھے کہ: "تفرقوا ایادی سبا!" (وہ قوم سبا اور ان کی نعمتوں کی طرح پراگندہ ہو گئے ہیں) بلکہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق قبیلہ "غسان" شام کی طرف گیا اور "اسد" عمان کی طرف "خزاعہ" تمامہ کی طرف اور قبیلہ "انمار" یثرب کی طرف بٹے۔

اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "یقیناً اس سرگزشت میں صبر اور شکر کرنے والوں کے لیے عبرت کی آیات اور نشانیاں ہیں" (ان فی ذلک لآیات لکل صبار شکور)۔

"صابرین" اور "شاکرین" ہی ان قصوں سے، کیوں درس عبرت لے سکتے ہیں؟ (خاص طور پر اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ صبار اور شکور دونوں ہی مبالغہ کے حصے ہیں اور تکرار اور تاکید کو بیان کرتے ہیں)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے صبر و استقامت کی بنا پر ہوا و ہوس کی سرکش سواری کو لگام دیتے ہیں اور گنہوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہتے ہیں، اور اپنی شکر گزاری کی وجہ سے خدا کی اطاعت کے راستہ میں آمادہ اور بیدار ہوتے ہیں، اور اسی بنا پر اچھی طرح سے عبرت حاصل کرتے ہیں، لیکن وہ لوگ کہ جو ہوا و ہوس کے مرکب پر سوار ہوتے ہیں، اور خدائی مواہب اور نعمتوں سے بے اعتنا ہوتے ہیں، وہ ان ماجروں سے کیسے عبرت حاصل کر سکتے ہیں؟

چند نکات

۱۔ قوم سبا کا عجیب و غریب ماجرا

جس طرح قرآن اور اسلامی روایات اور اسی طرح تواریخ سے معلوم ہوتا ہے، وہ ایک ایسی جمعیت اور قوم تھی کہ جو جزیرہ عرب کے جنوب میں رہتی تھی، اور ایک اعلیٰ حکومت اور درخشاں تمدن کی مالک تھی۔

یمن کا علاقہ وسیع اور زرخیز تھا لیکن زرخیز علاقہ ہونے کے باوجود چونکہ وہاں کوئی اہم دریا نہیں تھا، لہذا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا تھا، سیلاب اور بارشیں پہاڑوں پر پرستی تھیں

۱۔ یہ ضرب المثل دو صورتوں میں نقل ہوئی ہے: "تفرقوا ایادی سبا" و "ایادی سبا" پہلی صورت میں لشکر اور ان کے افراد کی پراگندگی کی طرف اشارہ ہے اور دوسری صورت میں ان کے اموال و مکانات و مواہب کی پراگندگی مراد ہے، کیونکہ ایادی عام طور پر نعمتوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ "تفسیر قرطبی" و "تفسیر ابو الفتوح رازی" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اور ان کا پانی بیابانوں میں بے کار اور بے فائدہ ضائع ہو جاتا تھا، اس سرزمین کے سجدار لوگ ان پانیوں سے استفادہ کرنے کی فکر میں لگ گئے اور اہم علاقوں میں بہت سے بند باندھے، کہ جن میں سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ پانی کا ذخیرہ رکھنے والا بند "مآرب" تھا۔

"مآرب" (پروژن مغرب) ایک شہر تھا کہ جو ان دروں میں سے ایک کے آخر میں واقع تھا، اور "صراة" کے کوہستانوں کے بڑے بڑے سیلاب اس کے قریب سے گزرتے تھے، اس درہ کے دہانہ پر اور "بلق" نامی دو پہاڑوں کے دامن میں انہوں نے ایک مضبوط بند باندھا تھا اور اس میں سے پانی کی کئی نہریں نکالی تھیں، اس بند کے اندر پانی کا اس قدر ذخیرہ جمع ہو گیا تھا کہ جس سے استفادہ کرتے ہوئے وہ اس بات پر قادر ہو گئے تھے کہ اس نہر کے دونوں طرف - کہ جو بند تک جاتی تھی - بہت ہی خوبصورت و زیبایا باغات لگائیں اور پُر برکت کھیت تیار کریں۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اس سرزمین کی آباد بستیاں ایک دوسری سے متصل تھیں اور درختوں کے وسیع سائے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ان کی شاخوں پر استنہ پھل لگا کرتے تھے کہ کتے ہیں کہ جب کوئی آدمی اپنے سر پر ایک ٹوکری رکھ کر ان کے نیچے سے گزرتا تھا، تو یکے بعد دیگرے استنہ پھل اس میں آکر گرتے تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹوکری پُر ہو جاتی تھی۔ امن و امان کے ساتھ نعمت کے دفرے پاک و صاف زندگی کے لیے بہت ہی عمدہ اور برف ماحول پیدا کر رکھا تھا، ایک ایسا ماحول جو خدا کی اطاعت اور معنوی پہلوؤں کے ارتقا و تکامل کے لیے مہیا تھا۔

لیکن انہوں نے ان تمام نعمتوں کی قدر کو نہ پہچانا اور خدا کو بھول گئے اور کفرانِ نعمت میں مشغول ہو گئے، اور فخر و مباہلات کرنے لگے اور طبقاتی اختلافات پیدا کر دیئے۔

بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ صحرائی چوہوں نے مغز و دست لوگوں کی آنکھوں سے دُور، مٹی کے اس بند کی دیوار کا رخ کیا اور اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا، اچانک ایسی شدید بارشیں برسیں اور ایسا عظیم سیلاب آیا کہ جس سے بند کی وہ دیواریں کہ جو سیلاب کے دباؤ کو برداشت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں دھرام سے گر پڑیں اور بہت ہی زیادہ پانی کہ جو بند کے اندر جمع ہو رہا تھا اچانک باہر نکل پڑا اور تمام آبادیوں، باغات، کھیتوں، فصلوں اور چوپایوں کو تباہ کر کے رکھ دیا اور خوبصورت سچے سچے صورت و محلات اور مکانات کو دیران کر دیا اور اس آباد سرزمین کو خشک اور بے آب و گیاہ صحرا میں بدل دیا اور ان تمام سرسبز و شاداب باغوں اور پھلدار درختوں میں سے صرف چند آراک کے کڑوے شجر، کچھ جھاؤ اور کچھ بیری کے درخت باقی رہ گئے، مغز خانی کرنے والے پرندے

وہاں سے کوچ کر گئے اور اُلوؤں اور کودوں نے ان کی جگہ لے لی یہ

ہاں! جب خدا اپنی قدرت دکھانا چاہتا ہے تو چند چوہوں کے ذریعہ ایک عظیم تمدن کو برباد کر دیتا ہے، تاکہ بندے اپنے ضنعت اور کمزوری سے آگاہ ہو جائیں، اور قدرت اور اقتدار کے وقت مغرور نہ ہوں۔

۲- قرآن کا ایک تاریخی معجزہ

قرآن مجید نے اد پر والی آیات میں قوم سبا کی داستان بیان کی ہے اور مدتیں گزر چکی تھیں کہ دنیا جہان کے مؤرخین اس قسم کی قوم اور اس طرح کے تمدن سے بے خبری کا اظہار کرتے تھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مؤرخین جدید انکشافات سے پہلے لوگ سبا کے سلسلہ اور ان کے عظیم تمدن کا نام تک نہیں لیتے تھے اور "سبا" کو صرف ایک فرضی شخص سمجھتے تھے، کہ جو حکومت "حیرہ" کے بانی کا باپ تھا، جبکہ قرآن میں ایک پوری سورت اسی قوم کے نام کی ہے اور ان کے تمدن کے مظاہر میں سے ایک منظر کی طرف جو مآرب کے تاریخی بند کی تعمیر ہے اشارہ کر رہی ہے لیکن بین میں اس قوم کے تاریخی انکشافات کے بعد ماہر دانشمندان کا عقیدہ دگرگوں ہو گیا ہے۔

اس بات کا سبب کہ اب تک قوم "سبا" کے تمدن کے آثار معلوم نہ ہوئے، دو باتیں تھیں ایک تو راستہ کی سختیاں اور آب و ہوا کی شدید گرمی اور دوسرے اس علاقے کے لوگوں کی بیگانوں اور اجنبی لوگوں کے بارے میں بدگمانی جسے بے خبر اور نا آگاہ یورپ والے کبھی کبھی وحشت سے تعبیر کرتے تھے، یہاں تک کہ چند ماہرین آثار قدیمہ، کہ جو سبا کے اسرار کھولنے کی طرف شدید لگاؤ رکھتے تھے، شہر "مآرب" کے قلب اور اس کے نواح میں وارد ہونے میں کامیاب ہو گئے، اور پتھروں پر ثبت شدہ آثار، خطوط اور نقوش کے نمونے اٹھا کر لے گئے، اور اس کے بعد انیسویں صدی عیسوی میں کئی گروہ نے یکے بعد دیگرے وہاں تک راہ نکالی اور وہاں سے گراں بہا آثار اپنے ساتھ یورپ لے گئے اور ان نقوش و خطوط اور دوسرے آثار کے مجموعے سے کہ جو ایک ہزار نقوش تک پہنچے ہوئے تھے، اس قوم کے تمدن کی جزئیات بلکہ سد مآرب کی بنا کی تاریخ اور دوسرے خصوصیات تک معلوم کر لیے اور اہل مغرب پر ثابت ہو گیا کہ قرآن نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا تھا، وہ کوئی افسانہ نہیں تھا، بلکہ وہ ایک تاریخی واقعیت اور حقیقت ہے، کہ جس سے وہ بے خبر تھے، اس طول پر کہ اب تو انہوں نے اس عظیم سد، اور پانی کے گزرنے کے مقامات اور دائیں بائیں باغوں کی

درمیانی نہروں اور اس کی دوسری خصوصیات کے بارے میں نقشے بھی تیار کر لیے ہیں۔

۳- ایک مختصر سے واقعہ میں عبرت کے اہم نکات

”سلیمان“ کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد، قرآن مجید میں قوم سبا کی داستان کا بیان کرنا ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔

۱- داؤد و سلیمان بہت ہی عظیم پیغمبر تھے کہ جنہوں نے ایک عظیم حکومت تشکیل دی تھی اور وہ ایک درخشاں تمدن کو وجود میں لائے تھے، لیکن داؤد و سلیمان کی وفات کے ساتھ ہی یہ تمدن ختم ہو گیا۔ قوم سبا نے بھی ایک عظیم تمدن قائم کیا تھا، کہ جو سبب ”نارب“ کے ٹوٹ جانے سے برباد ہو گیا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ۔ روایات کے مطابق۔ سلیمان کے عصا کو تو دیکھنے لکھا یا تھا، اور ”نارب“ کے عظیم بند میں صحرائی چوہوں نے سوراخ کیا تھا تاکہ یہ مغزور انسان سمجھ لے کہ مادی نعمتیں چاہے جتنی بھی عظیم کیوں نہ ہوں، ایک ہوا کے جھونکے سے ختم ہو جاتی ہیں، ایک کیرٹا یا ایک چھوٹا سا جانور انہیں زیر و زبر کر سکتا ہے، تاکہ باخبر لوگوں کے لیے عبرت ہو کہ وہ اس کے ساتھ دل نہ لگائیں اور مومن اس کے اسیر اور قیدی نہ بنیں اور مغزور لوگ مغزور کی مستی سے ہوش میں آجائیں اور تکبر اور علم و حکم کی راہ اختیار نہ کریں۔

۲- اس سے قطع نظر یہاں پر باشکوہ تمدن کے دو چہرے نظر آتے ہیں کہ جن میں سے ایک رحمانی ہے اور دوسرا شیطانی، لیکن نہ وہ باقی رہا اور نہ یہ، اور دونوں کے دونوں ہی فنا کی گود میں پلے گئے۔

۳- یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قوم سبا کے مغزور لوگ جو عامۃ الناس کو اپنے قریب نہیں دیکھ سکتے تھے، اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ بڑے بڑے لوگوں کی اقلیت اور کم آمدنی والے لوگوں کی اکثریت کے درمیان کوئی بہت بڑا بند اور ایک عظیم سرحد ہونی چاہیے تاکہ وہ ہرگز آپس میں نہ ملیں جلیں، لہذا انہوں نے خدا سے آبادیوں کے دور دور واقع ہونے اور سفریوں کے لمبا اور دور دراز ہونے کا تقاضا کیا۔ خدا نے بھی ان کی دعا قبول کر لی، اور وہ اس طرح سے بکھرے اور پراگندہ ہوئے کہ ان میں سے ہر ایک گروہ کسی ایک طرف چلا گیا اور وہ ایک دوسرے سے اس طرح سے دور ہوئے کہ اگر وہ ایک دوسرے کو دیکھنا اور ملاقات کرنا چاہتے بھی تو اس کے لیے ایک طویل عمر تک سفر و کار ہوتا۔

۴- جس وقت کوئی شخص سیل علم کے آنے سے پہلے اور اس کے آنے کے بعد کی اس سر زمین کی وضع و کیفیت پر نظر کرتا، تو وہ اس بات کا یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی سر زمین ہے کہ جو ایک دن سرسبز

شاداب اور میوہ دار درختوں سے پُر تھی، کہ جو آج ایک وحشتناک بیابان کی شکل میں۔ کہ جس میں ہمیں کہیں جھاؤ کے درخت، پلو اور بیریاں ایسے مسافروں کی طرح کہ جو راستہ بھول گئے ہوں اور ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہوں۔ نظر آتا ہے۔

یہ منظر زبان حال سے کہتا ہے کہ: انسان کے وجود کی سر زمین بھی اسی طرح ہے کہ اگر اس کی تعمیری قوتوں کو کنٹرول کیا جائے اور اس کی صلاحیتوں کا صحیح مصرف ہو، تو علم و عمل اور فضائل اخلاقی کے سرسبز و شاداب باغات بار آور ہوں گے، لیکن اگر تقویٰ کا بند ٹوٹ جائے اور خواہشات ایک دیران کرنے والے سیلاب کی شکل میں انسانی زندگی کی سر زمین کو ڈھانپ لیں۔

تو بے قدر و قیمت دیرانی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے گا، اور کبھی بھی ایک ایسا عامل جو ظاہری طور پر چھوٹا سا ہوتا ہے، آہستہ آہستہ بنیاد کو کاٹنا شروع کر دیتا ہے اور ہر چیز کو درہم برہم کر دیتا ہے لہذا ایسے چھوٹے چھوٹے عوامل تک سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

۵- آخری بات، کہ جس کی طرف اشارہ کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب ماجرا ایک دفعہ پھر اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ انسان کی موت اس کی زندگی کے اندر ہی چھپی ہوئی ہے اور وہی چیز کہ جو ایک دن اس کی حیات و آبادی کا باعث ہوتی ہے، دوسرے دن مٹن ہے اس کی موت اور دیرانی کا عامل بن جاتے۔

۲۰) وَلَقَدْ صَدَقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ اِلَّا
فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ○

۲۱) وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَن
يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ ۗ وَرَبُّكَ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ○

ترجمہ

۲۰) ہاں! یقیناً ابلیس نے ان کے بارے میں اپنا گمان سچا پایا، کہ سوائے
مومنین کے ایک تھوڑے سے گروہ کے سب ہی نے اس کی پیروی کی۔

۲۱) اس کا ان کے اوپر کوئی قابو تو نہیں تھا اور نہ ہی اس نے انہیں اپنی
پیروی پر مجبور کیا، اور شیطان کو اس کے دوسوں میں آزاد چھوڑنے کا مقصد
یہ تھا کہ آخرت پر ایمان رکھنے والے ان لوگوں سے کہ جو اس کے بارے
میں شک میں ہیں الگ پہچانے جائیں، اور تیرا پروردگار ہر چیز کا حافظ
اور نگہبان ہے۔

تفسیر

کوئی شخص شیطانی دوسوں کی پیروی پر مجبور نہیں ہے

ان آیات میں درحقیقت قوم سبکی داستان سے کلی نتیجہ نکال کر پیش کیا گیا ہے، جو گزشتہ
آیات میں بیان ہوئی تھی اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ ہوائے نفس اور شیطانی دوسوں کے سامنے تسلیم
کرنے کی وجہ سے ان تمام بد بختیوں اور ناکامیوں میں کس طرح گرفتار ہوئے۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے: "یقیناً شیطان نے اپنے گمان کو ان کے بارے میں (اور ہر اس
جماعت کے بارے میں جو ابلیس کی پیروی کرتی ہے) درست پایا" (ولقد صدق علیہم ابلیس ظنہ)۔
"ان سب نے ہی اس کی پیروی کی، سوائے مومنین کے تھوڑے سے گروہ کے" (فاتبعوه الا
فريقاً من المؤمنین)۔

یاد دوسری تعبیر کے مطابق ابلیس کی وہ پیشین گوئی۔ جو اس نے آدم کے سجدے سے روگردانی
کرنے اور بارگاہ خداوندی سے دھتکارے جانے کے بعد کی تھی کہ: "فبعزتک لا غوینہم اجمعین
الاعبادک منهم المخلصین" (تیری عزت کی قسم! تیرے مخلص بندوں کے سوائے ان سب کو گمراہ
کروں گا) اس گروہ کے بارے میں ٹھیک نکل۔

اگرچہ اس نے یہ بات گمان اور اندازے سے کہی تھی، لیکن وہی گمان اور اندازہ آخر کار حقیقت
بن گیا، کیونکہ یہ ارادوں کے کمزور اور ضعیف الایمان لوگ گروہ گروہ اس کے پیچھے چلنے لگے، مگر مومنین
کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا کہ جنہوں نے شیطانی دوسوں کی زنجیروں کو توڑ دیا، اور اس کے دام فریب
میں نہ آئے، آزاد رہی اس دنیا میں، آئے آزادی سے زندگی بسر کی، اور آزادی ہی اس دنیا سے گئے، اگرچہ
وہ تعداد کے لحاظ سے تو کم تھے، لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک پورے ایک جہان
کے ہم پلہ تھا، "اولئک ہم الاتقون عدا والا کثرون عند اللہ قدرًا"۔

بعد والی آیت میں۔ ابلیس کے دوسوں، اور ان لوگوں کے بارے میں کہ جو اس کے اثر و نفوذ
کا شکار ہو جاتے ہیں اور جو اس کے اثر و نفوذ سے باہر رہتے ہیں۔ دو مطالب کی طرف اشارہ کرتا ہے،
پہلے کہتا ہے: "شیطان کا ان کے اوپر کوئی تسلط اور قابو نہیں تھا، اور وہ کسی کو اپنی پیروی پر مجبور نہیں
کرتا" (وما کان لہ علیہم من سلطان)۔

یہ ہم ہی ہیں، کہ جو اُسے اپنے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں اور مملکت بدن کی سرحدوں
کو عبور کرنے کے بعد دل میں داخل ہونے کا پروانہ اس کے لیے جاری کرتے ہیں۔

یہ دہری چیز ہے کہ جسے قرآن دوسری جگہ پر خود شیطان کی زبانی نقل کر رہا ہے کہ: (وما کان لی علیہم
من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی) "میرا تم پر کوئی تسلط تو نہیں تھا، سوائے اس کے کہ میں نے
تمیں دعوت دی اور تم نے بھی میری دعوت کو قبول کر لیا" (ابراہیم - ۲۲)

لیکن یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ، ہوا پرست اور بے ایمان لوگوں کی طرف سے اس کی دعوت
قبول ہو جانے کے بعد وہ آرام سے نہیں بیٹھتا بلکہ اپنے غلبہ اور تسلط کی بنیادوں کو ان پر مسلط کر لیتا ہے۔

اس لیے آیت کے آخر میں مزید کتا ہے کہ: "ابلیس کو اس کے وسوسوں میں آزاد چھوڑ دینے کا مقصد یہ تھا کہ آخرت پر ایمان لانے والے اور شک میں پڑے ہوئے بے ایمان لوگ الگ الگ پہچانے جائیں۔ (الآن لنعلم من یؤمن بالآخرۃ ممن ہو منها فی شک)۔" یہ بات بدیہی ہے کہ خدا ازل سے ان تمام چیزوں سے کہ جو اس جہان میں ابد تک واقع ہوں گی، آگاہ ہے۔ اس بنا پر (لنعلم)۔ تاکہ ہم جان لیں۔" کے جملہ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو ان سے کہ جو شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں نہیں پہچانتے لہذا شیطانی وسوسوں کو درمیان میں آنا چاہیے، تاکہ وہ پہچانے جائیں، بلکہ اس جملہ سے مراد خدا کے علم کا تحقق عین ہے کیونکہ خدا ہرگز اشخاص کے باطن اور ان کے بالقوہ اعمال کو جاننے اور ان کا علم رکھنے کی بنا پر کسی کو سزا اور عذاب نہیں کرتا، بلکہ ضروری ہے کہ میدان امتحان فراہم ہو، شیطانی وسوسے اور خواہشات نفسانی کا آغاز ہو، تاکہ ہر شخص جو کچھ اپنے اندر رکھتا ہے، اپنے ارادہ اور اختیار کی پوری آزادی کے ساتھ اسے باہر نکال دے، اور خدا کا علم تحقق عینی حاصل کرے، کیونکہ جب تک خارج میں کوئی عمل انجام نہ پائے اس وقت تک عذاب و عقاب کا استحقاق حاصل نہیں ہوتا۔

دوسرے لفظوں میں وہ بات جو بالقوہ موجود ہے فعل میں نہ آئے صورت حسن باطن یا سوء باطن کی بنا پر کسی کو جزا یا کسی کو سزا نہیں دیتے۔

اور آیت کے آخر میں تمام بندوں کو تشبیہ اور خبردار کرتے ہوئے کتا ہے کہ: "اور تیرا پروردگار ہر چیز کا محافظ اور نگہبان ہے" (وربک علی کل شیء حفیظ)۔

تاکہ شیطان کے پیروکار یہ تصور نہ کر لیں کہ ان کے اعمال و گفتار میں سے کوئی چیز اس جہان میں ختم ہو جائے گی، یا خدا اس کو فراموش کر دے گا۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ خدا ہر چیز کی قیامت کے دن کے لیے نگہداری اور حفاظت کرتا ہے۔

۲۲) قُلْ اَدْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِ اللّٰهِ ؕ لَا یَمْلِكُوْنَ

مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِیْهَا

مِنْ شَرِّکٍ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِّنْ ظٰلِمٍ ۝

۲۳) وَلَا تَتَفَعَّلِ الشَّفَاعَةَ عِنْدَهُ اِلَّا لِمَنْ اٰذِنَ لَهُ حَتّٰی

اِذَا فَرَغَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوْا

الْحَقَّ ؕ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ ۝

۲۴) قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّا

اَوْ اِنَّا کَوْمٌ لَّعَلٰی هُدٰی اَوْ فِی ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

۲۵) قُلْ لَا تَسْئَلُوْنَ عَمَّا اَجْرَمْنَا وَلَا نَسْئَلُ

عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

۲۶) قُلْ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا شَوْءٌ یَّفْتَحُ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ

وَهُوَ الْفَتّٰحُ الْعَلِیْمُ ۝

۲۷) قُلْ اَرُوْنِی الَّذِیْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَکَآءَ کَلٰہٗ ۙ بَلْ

هُوَ اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

ترجمہ

۲۲) کہہ دو، کہ جن کو تم خدا کے سوا (اپنا معبود) خیال کرتے ہو انہیں پکارو!

(وہ ہرگز بھی تمہاری کسی مشکل کو حل نہ کریں گے کیونکہ) انہیں آسمانوں اور زمین

اس صحن کی بنا پر کہ جو ہم نے آیت کی تفسیر میں بیان کی ہے، استثناء، یہاں پر استثنائے متصل ہے، اس بات کے قرینہ سے کہ جو سورہ بقرہ آیت ۲۲ میں بیان ہوئی ہے کہ ان عبادی لیس لک علیہم سلطان الا من اتبعک من الغاوبین، کیونکہ اس آیت کا ظاہر ہے کہ شیطان، غاوبین، پر تسلط جاتا ہے، البتہ بعض مفسرین نے استثنائے متصل کا احتمال بھی دیا ہے۔

اگر وہ کسی مشکل کے حل پر قادر ہوں، تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تین اوصاف میں سے کسی ایک کے تو حامل ہوں، یا تو آسمان و زمین میں کسی چیز کی مستقل ملکیت رکھتے ہوں، یا کم از کم امر خلقت میں خدا کے ساتھ شرکت رکھتے ہوں، یا ان امور میں سے کسی میں پروردگار کے معاون و مددگار ہوں۔

حالانکہ یہ بات صاف طور پر واضح در روشن ہے کہ واجب الوجود ایک ہی ہے اور باقی سب کے سب ممکن الوجود اور اسی کے ساتھ وابستہ ہیں، کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے لطفت و کرم کی نظر ان سے اٹھ جائے تو وہ دیا بے عدم کی طرف چلتے نہیں۔

”اگر نازی کند یکدم، فردیزند قابیعا!“

اگر وہ ایک لمحہ کے لیے بھی فخر و ناز کریں، تو سارے سانچے گر پڑیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے: ”مثقال ذرۃ فی السعادت ولا فی الارض“ یعنی ایسی موجودات کہ جو ایک بے قدر و قیمت ذرہ کے وزن کی مقدار کے برابر ہیں اس بے کراں آسمان اور وسیع و عریض زمین میں کسی چیز کے مالک نہیں ہیں، تمہاری مشکلات تو رہی ایک طرف وہ اپنی ہی کون سی مشکل حل کرنے کے قابل ہیں؟!

یہاں یہ سوال فزادہ میں آتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے مسئلہ کا کیا بنے گا۔

بعد والی آیت میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: اگر خدا کی بارگاہ میں کچھ شفاعت کرنے والے موجود ہیں تو وہ بھی اس کے اذن و فرمان سے ہے کیونکہ ”اس کے یہاں کوئی شفاعت فائدہ نہ دے گی سوائے ان کے جن کے لیے اس نے اذن دیا ہوگا“ (ولا تنفع الشفاعۃ عندہ الا لمن اذن له)۔

اس بنا پر بڑے پرستوں کا بتوں کی پرستش کے بارے میں یہ ہمانہ کہ جو کہتے تھے: ”ھوؤا ذہ شفعاء ونا عند اللہ“ — یہ خدا کے یہاں ہماری شفاعت کرنے والے ہیں۔ (یونس - ۱۸) اس وسیلہ سے ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ خدا نے ہرگز انہیں شفاعت کی اجازت نہیں دی ہے۔

اس بارے میں کہ: ”الا لمن اذن له“ سوائے اس کے کہ جس کے لیے وہ اذن دے“ کا جملہ شفاعت کرنے والے کی طرف اشارہ ہے یا ان کی طرف کہ جن کی شفاعت کی جائے گی؟ مفسرین نے دونوں احتمال دیتے ہیں، لیکن اس مناسبت سے کہ گزشتہ آیت میں بتوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی اور وہ بتوں کو اپنا شیخ خیال کرتے تھے، لہذا مناسب یہی ہے کہ یہ ”شفاعت

کرنے والوں“ کی طرف اشارہ ہو۔

کیا یہاں ”شفاعت“ سے مراد دنیا کی شفاعت ہے یا آخرت کی دونوں ہی احتمال ہو سکتے ہیں لیکن بعد والے جملے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہاں آخرت کی شفاعت مد نظر ہے۔

لہذا اس جملہ کے بعد اس طرح کہتا ہے: ”اس دن دلوں پر اضطراب اور وحشت کا غلبہ ہوگا“ شفاعت کرنے والے بھی اور جن کی شفاعت کی جائے گی وہ بھی اضطراب میں ڈوبے ہوئے ہوں گے، اور وہ سب کے سب اس انتظار میں ہوں گے کہ دیکھیں خدا کن لوگوں کو شفاعت کی اجازت دیتا ہے؟ اور کن لوگوں کی شفاعت کرنے کے لیے؟ اور یہ اضطراب اور پریشانی کی حالت اسی طرح جاری رہے گی۔ ”یہاں تک کہ فزع و اضطراب ان کے دلوں سے زائل ہو اور خدا کی طرف سے یہ فرمان صادر ہو“ (حتیٰ اذا فزع عن قلوبہم)۔

بہر حال اُس دن ایک شور و غوغا برپا ہوگا، شفاعت ہونے والوں کی نگاہیں شفاعت کرنے والوں پر لگی ہوئی ہوں گی، اور زبان حال سے یا زبان قال سے مطلقاً ان سے شفاعت کا تقاضا کر رہے ہوں گے۔

لیکن شفاعت کرنے والوں کی نگاہیں بھی فرمان خدا پر لگی ہوئی ہوں گی، تاکہ دیکھیں کہ کس طرح اور کس کے حق میں شفاعت کی اجازت دیتا ہے، یہ عمومی اور ہر وقت کا وحشت و اضطراب بھی اسی طرح جاری رہے گا، یہاں تک کہ ان لوگوں کے بارے میں کہ جو اس کے لائق ہیں خدا کے حکم کی طرف سے شفاعت کا فرمان صادر ہوگا۔

یہ وہ مقام ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کی طرف رُخ کریں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے (یا جرم شفاعت کرنے والوں سے پوچھیں گے) اور ”کہیں گے کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم دیا ہے“ (قالوا ماذا قال ربکم)۔

”وہ جواب میں کہیں گے کہ خدا نے حق کو بیان کیا ہے“ (قالوا الحق)۔

اور حق تو اس کے سوا کچھ نہیں، کہ شفاعت کی اجازت صرف ان کے لیے ہوگی جنہوں نے خدا سے کُل طور پر اپنا رابطہ منقطع نہیں کیا تھا، نہ کہ ان گنہگاروں اور مجرموں کے لیے کہ جنہوں نے خدا، پیغمبر، اولیاء اللہ سے کُل طور پر بیگانگی اختیار کر لی ہے اور تعلقات کے تمام رشتوں کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔

۱ ”فزع“ مادہ ”فزع“ ہے جس وقت ”عن“ کے ذریعہ متعدی ہو تو فزع کے اذکار اور وحشت و اضطراب کے بطن ہونے کے معنی میں ہے۔

۲ مادہ اس صورت تک بھی جبکہ ”ثلاثی مجرد“ کی شکل میں ہو اور عن سے متعدی ہو تو پھر بھی یہی معنی دیتا ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "وہی ہے بلند مقام اور بزرگ مرتبہ خدا" (وہو العلیٰ العلیین)۔ یہ جملہ شفاعت کرنے والوں کی گفتگو کا آخری حصہ اور اس کی تکمیل کرنے والا ہے حقیقت میں وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ خدا علیٰ وکبر ہے لہذا وہ جو حکم دیتا ہے وہ عین واقعیت ہے اور ہر واقعیت اس کے احکام و دستور پر منطبق ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ایسی نزدیک ترین تفسیر ہے کہ جو آیہ کے جملوں کے ساتھ ہم آہنگ اور منظم ہے، یہاں مفسرین نے دوسری تفسیریں بھی بیان کی ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض میں آیت کے متن، اس کے ظاہر و باطن اور اس کے قبل و بعد کے ربط و تعلق کو کسی طرح بھی نظر میں نہیں رکھا گیا۔

بعد والی آیت میں ایک اور طریقہ سے مشرکین کے عقائد کو باطل کرنے کے لیے آغاز کیا ہے اور "رازقیت" کے مسئلہ کو مسئلہ "خالقیت" کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں بیان ہوا تھا، عنوان کرتا ہے یہ دلیل بھی سوال و جواب کی صورت میں ہے تاکہ ان کے سونے ہوئے وجدان کو اس طرح سے بیدار کرے، اور اس جواب سے کہ جو ان کے اندر سے جوش مارتا ہے، اپنی غلطی اور اشتباہ کو سمجھ لیں۔

کہتا ہے: "تم کہہ دو کہ کون ہے وہ کہ تمہیں آسمانوں اور زمین سے روزی دیتا ہے اور ان کی برکت کو تمہارے اختیار میں قرار دے دیتا ہے" (قل من یرزقکم من السماء والارض)۔ یہ بات صاف طور پر واضح و ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پتھر اور لکڑی کے بت آسمان سے بارش برساتے ہیں اور زمین سے گیاہ اور سبزے اگاتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کے منبعوں اور ذخائر کو ہمارے اختیار میں دیتے ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ بغیر اس کے کہ ان کے جواب کا انتظار کرتا، بلا فاصلہ فرماتا ہے: "کہہ دو کہ اللہ" (قل اللہ)۔

کہہ دو کہ وہ خدا ہی ہے کہ جو ان تمام برکات کا منبع ہے، یعنی یہ مطلب اس قدر واضح و روشن ہے کہ طرف مقابل کے جواب کا محتاج ہی نہیں ہے، کیونکہ مشرکین بھی خدا ہی کو خالق اور رزقوں کا عطا کرنے والا جانتے تھے اور بتوں کے لیے وہ بھی صرف مقام شفاعت ہی کے قابل تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ پروردگار کے رزق اور روزیاں جو آسمان کی طرف سے انسانوں تک پہنچتی ہیں وہ بارش میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ "سورج کی روشنی اور حرارت" اور "ہوا" کہ جو زمین کی فضا میں موجود ہے، بارش کے حیات بخش قطرات سے بھی زیادہ اہم ہے۔

جیسا کہ زمین کی برکات بھی گیاہ اور سبزہ زاروں میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ زیر زمین انواع و اقسام کے پانی کے منبع، طرح طرح کی معدنیات کہ جن میں سے بعض تو اس زمانہ میں بھی دریافت ہو چکے تھے اور بعض زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں سب کے سب اسی عنوان میں جمع ہیں۔

آیت کے آخر میں ایک ایسے مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو خود ایک دلیل کی بنیاد بن سکتا ہے، ایک ایسی دلیل کہ جو حقیقت بین اور انصاف و آدب سے ملی ہوئی ہے، اس طرح سے کہ مخالفت ہٹ دھرمی اور غرور کے مرکب سے نیچے اتر آئے اور غرور و فکر کرے، کہتا ہے: "یقیناً ہدایت پر یا کھلی ہوئی گمراہی میں ہم ہیں یا تم" (وانا وایاکم لعلیٰ ہدیٰ اونی ضلال مبین)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمارا اور تمہارا عقیدہ آپس میں واضح تضاد رکھتا ہے اس بنا پر ممکن نہیں ہے کہ دونوں حق ہوں کیونکہ تفسیریں اور ضدین میں جمع ممکن نہیں ہے پس ایک گروہ اہل ہدایت کا ہے اور دوسرا ضلالت و گمراہی میں گرفتار ہے۔

اب تم خود غور کرو کہ کونسا ہدایت یافتہ ہے اور کونسا گمراہ، دونوں گروہوں میں نشانیاں دیکھو کہ کس گروہ میں ہدایت کی نشانیاں ہیں اور کس میں گمراہی کی نشانیاں۔

اور یہ مناظرہ اور بحث کے طریقوں میں سے ایک بہتر طریقہ ہے کہ ہر مقابل اور فریق مخالفت کو خود بخود غور و فکر اور جوش میں آنے کے لیے ابھاریں، اور یہ جو بعض نے اسے تفسیر کی ایک قسم خیال کیا ہے انتہائی غلط اور اشتباہ والی بات ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "ہدایت" کو لفظ "علیٰ" کے ساتھ ذکر کیا ہے اور "ضلالت" کو "فی" کے ساتھ کہ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہدایت یافتہ تو گویا ایک تیز رو مرکب پر بیٹھے ہوئے ہیں، جبکہ گمراہ لوگ گمراہی اور جہالت کی ظلمت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ پہلے "ہدایت" کے بارے میں گفتگو کی ہے اور اس کے بعد ضلالت و گمراہی کے متعلق، کیونکہ پہلے جملہ کی ابتدا میں کہتا ہے "ہم" اور پھر کہتا ہے "تم" تاکہ یہ پہلے گروہ کی ہدایت اور دوسرے گروہ کے بے ہدایت ہونے کی طرف ایک لطیف اور ہلکا سا اشارہ ہو۔

اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت نے "ہبین" کی صفت کو صرف "ضلالت" کے ساتھ مربوط سمجھا ہے، کیونکہ ضلالت و گمراہی کسی اقسام رکھتی ہے اور ضلالت شرک سبب زیادہ واضح و آشکار ہے لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ توصیف "ہدایت" و "ضلالت" دونوں کے لیے ہو، کیونکہ

۱۔ یہ جملہ تقدیر میں اس ترتیب سے دو جملوں کی طرف لوٹتا ہے: وانا لعلیٰ ہدیٰ اونی ضلال مبین وانکم لعلیٰ ہدیٰ

اس قسم کے موقعوں پر نصحاء کے کلمات میں صفت کا تکرار نہیں ہوتا، اس بنا پر ہدایت بھی میں کے ساتھ توصیف ہوتی ہے اور ضلالت بھی، جیسا کہ دوسری آیات قرآنی میں یہ توصیف دونوں قسموں کے لیے نظر آتی ہے بلکہ

بعد والی آیت میں پھر اسی استدلال کو ایک دوسری شکل میں۔ پھر اسی منصفانہ لب لہجہ میں کہ جو مخالفت کو ہٹ دھرمی اور غرور کے مرکب سے اتار دے۔ جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: "کہہ دے کہ تم سے ہمارے گناہوں کے بارے میں باز پرس نہیں ہوگی اور نہ ہی ہم سے تمہارے اعمال کے بارے میں کچھ پوچھا جائے گا" (قل لا تسئلون عما اجرمنا ولا ننبئ عما تعملون)۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہاں پیغمبر اس بات پر مامور ہیں کہ اپنے بارے میں تو جرم کی تعبیر کرے اور اپنے مخالفین کے بارے میں ایسے کاموں سے تعبیر کرے کہ جو وہ انجام دیتے ہیں اور اس طرح سے اس حقیقت کو واضح و روشن کرے کہ ہر شخص کو اپنے اعمال کا جوابدہ ہونا چاہیے، کیونکہ ہر انسان کے اعمال کے نتائج۔ وہ بُرے ہوں یا اچھے خود اسے ہی سمجھنے ہیں۔

ضمنی طور پر اس نکتہ کی طرف بھی ایک لطیف سا اشارہ ہے کہ اگر ہم تمہاری رہنمائی پر اصرار کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمہارے گناہ ہمارے ذمہ لکھ دیئے جاتے ہیں یا تمہارا شرک ہمیں کچھ ضرر پہنچاتا ہے، بلکہ ہم تو دل سوزی و حق جوئی اور حق طلبی کی بنا پر اس کام پر اصرار کرتے ہیں۔

بعد میں آنے والی آیت درحقیقت گزشتہ دو آیات کے نتیجہ کا بیان ہے کیونکہ جس وقت انہیں اس بات سے آگاہ اور خبردار کر دیا گیا، کہ دونوں گروہوں میں سے ایک حق پر ہے اور دوسرا باطل پر ہے، اور اس بات کے لیے بھی خبردار کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے تو پھر اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ سب کی وضع و کیفیت کی جانچ پڑتال کیسے ہوگی، اور حق و باطل ایک دوسرے سے کس طرح جدا ہوگا، اور ہر کسی کو اس کی ذمہ داریوں اور مسئولیت کے مطابق ہی جزا و سزا ملے گی، لہذا فرماتا ہے: "ان سے کہہ دے کہ ہمارا پروردگار ہم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا، اور پھر ہمارے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ اور ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گا تاکہ ہدایت یافتہ گمراہوں سے پہچانے جائیں اور ہر ایک اپنے اعمال کے نتیجہ تک پہنچے" (قل یجمع بیننا ربنا شریعتہ بیننا بالحق)۔

اگر تم یہ دیکھ رہے ہو کہ آج سب کے سب ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ہر ایک ہی

دعویٰ کرتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور میں ہی اہل نجات میں سے ہوں، تو یہ کیفیت ہمیشہ باقی اور برقرار نہیں رہے گی اور آخر کار ان صفوں کی جدائی کا دن آن پہنچے گا، کیونکہ پروردگار کی "ربوبیت" کا تقاضا یہی ہے کہ اچھائی برائی سے، خالص ناخالص سے، اور حق باطل سے آخر کار جدا ہو جائیں اور ہر ایک اپنے مقام پر رہے۔

اب تم غور کرو کہ تم اس دن کیا کرو گے؟ اور تم کون سی صف میں قرار پاؤ گے، کیا تم نے اس دن کے لیے پروردگار کے سوالات کا جواب تیار کر لیا ہے۔ آیت کے آخر میں اس حقیقت کو واضح و روشن کرنے کی غرض سے کہ یہ کام یقینی طور پر ہو کر رہے گا، مزید کہتا ہے: "وہی ہے فیصلہ کرنے والا اور حق کو باطل سے جدا کرنے والا، آگاہ اور جاننے والا" (وهو الفتح العظیم)۔

یہ دونوں نام کہ جو خدا کے اسماء حسنیٰ میں سے ہیں، ان میں سے ایک صفوں کو الگ کرنے کے مسئلہ پر قدرت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرا اس کے بے پایاں علم کی طرف کیونکہ حق و باطل کی صفوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ان دو کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ادھر والی آیت میں "رب" (پروردگار) کے عنوان پر تکیہ کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا ہم سب کا مالک و مربی ہے، اور یہ مقام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس قسم کے دن کے لیے پروردگار ہم فراموش کیا جائے، اور حقیقت میں یہ "معاد" کی دلائل میں سے ایک دلیل کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

لفظ "فتح" جیسا کہ "راغب"۔ "مفردات" میں کہتا ہے، اصل میں شہادت اور پیچیدگی کو ختم کرنے کے معنی میں ہے، اور وہ دو قسم پر ہے: کبھی تو یہ آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے، مثلاً تالا کھولنا اور کبھی غور و فکر کرنے سے اس کا ادراک ہوتا ہے، مثلاً غم داندہ اور دکھ درد کی پیچیدگی کو دور کرنا، یا علوم کے سرسبستہ رازوں کو کھولنا، اور اسی طرح دو افراد کے درمیان فیصلہ کرنا، اور ان کے نزاع اور خصمت کی مشکل کو کھولنا۔

اس بنا پر اگر یہ لفظ صفوں کو جدا کرنے کے بارے میں۔ خاص طور پر جہاں وہ آپس میں ایک دوسرے سے ملی جلی ہوں۔ استعمال ہوا ہے، تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ اس طرح ان کے درمیان جدائی کے علاوہ تضاد اور فیصلہ بھی۔ کہ جو فتح کا ایک معنی ہے۔ انجام پا جاتا ہے اور ہر کسی کو جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، جزا دیتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں مشکلات کے حل کے لیے "یا فتاح" کے ذکر پر تاکید کیا گیا ہے، کیونکہ خدا کا یہ عظیم نام کہ جو "فتح" سے صیغہ مبالغہ کی شکل میں آیا ہے، پروردگار کی ہر

شکل کو حل کرنے کی طاقت، اور غم و اندوہ کو دور کرنے اور ہر فتح و کامرانی کے اسباب فراہم کرنے کی قدرت کو بیان کرتا ہے، واقعاً کوئی بھی اس کے سوا، "فتاح" نہیں ہے اور بند دروازوں کی مفتح اور چابی اسی کے دست قدرت میں ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں کہ جو پیغمبر کے لیے (اس سلسلے کا) پانچواں فرمان ہے پھر ایک مرتبہ مسئلہ توحید کی طرف۔ کہ جس سے گفتگو کی ابتداء کی تھی۔ دوبارہ لوٹتا ہے، اور اس مسئلہ کے ساتھ بحث کو ختم کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "کہہ دے کہ جنہیں تم نے شریک کے عنوان سے خدا کے ساتھ طعن کیا ہے مجھے دکھا تو سی" (قل اردو فی الذین الحق تعویبہ شرکاء)۔

ان میں کون سی صلاحیت اور کیا قدر و قیمت ہے، اگر تمہاری مراد یہی مٹھی بھر بے جان اور خاموش پتھر اور لکڑیاں ہیں تو کتنی بد بختی اور شرمساری کی بات ہے کہ عالم جمادات میں سے اپنے ہی ہاتھ کی ساختہ و پرداختہ چیزوں کو کہ جو موجودات میں سے سب سے پست ہیں لے لو اور انہیں خداوند عظیم کے مانند خیال کرو۔

اور اگر تم انہیں ارواح اور فرشتوں کے سہل اور نمونہ سمجھتے ہو تو پھر بھی یہ ایک مصیبت ہے اور گمراہی ہے کیونکہ وہ بھی اسی کی مخلوق اور اسی کے تابع فرمان ہیں۔

لہذا اس جگہ کے بعد ایک ہی لفظ کے ساتھ ان تمام ادہام پر خط بطلان کھینچتے ہوئے کہتا ہے: "نہیں ہرگز نہیں ایسا نہیں ہے" (کلا)۔

یہ قطعاً معبود ہونے کے لائق نہیں اور تمہارے ان خیالات میں کچھ بھی واقعیت نہیں ہے، انتہا ہو چکی ہے اب تو تم بیدار ہو جاؤ، کب تک اس غلط راستے پر چلتے رہو گے۔

حقیقت میں "کلا" ایک ایسا چھوٹا سا لفظ ہے کہ جو ان تمام معانی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور آخر میں اس بات کی تاکید اور فیصلہ کے طور پر کہتا ہے: "بلکہ وہی صرف خداوند عزیز و عظیم ہے" (بل هو اللہ العزیز الحکیم)۔

اس کی عزت اور اس کے شکست ناپذیر ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے حریم الوہیت تک کسی کی رسائی نہ ہو اور اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس قدرت کو صحیح طور سے صرف کرے۔

ہاں! ان صفات کا حامل ہونا واجب الوجود ہونے کی نشانی ہے اور واجب الوجود لامتناہی ہستی ہوتی ہے کہ جو کبھی بھی قابل تعدد نہیں ہوتی اور اس کا کوئی شریک اور مثل نہیں ہوتا، کیونکہ ہر تعدد اسے محدود مگر بنانا ہے، جبکہ وجود بے پایاں صرف ایک ہی ہے۔ (غور کیجئے)

نکتہ

دلوں کو تسخیر کرنے کا طریقہ

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اہل فضل اور دانشمند افراد، بحث و استدلال کے داؤ پیچ سے بے نیازی اور نفسیاتی پہلوؤں کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے، دوسرے کے افکار و نظریات میں بالکل نفوذ نہیں کر سکتے۔

اس کے برعکس ہم ایسے کسی افراد کو جانتے ہیں، کہ وہ علمی لحاظ سے اس پائے کے نہیں ہوتے، لیکن دلوں کو جذب کرنے اور انہیں سخر کرنے اور دوسروں کے افکار میں نفوذ کرنے میں کامیاب اور موفق ہوتے ہیں۔

اس کا اصل سبب یہ ہے کہ مباحث کو پیش کرنے کا طریقہ اور مد مقابل سے مباحثہ کرنے کی طرز ایسے اصولوں کے ساتھ ہونی چاہیے کہ جو اخلاقی اور نفسیاتی پہلو سے ملی ہوئی ہو تاکہ مد مقابل میں منفی پہلوؤں کو نہ ابھارے اور اُسے ہٹ دھرمی اور بغض و عناد پر نہ اکسائے، بلکہ اس کے برعکس اس کے وجدان کو بیدار کرتے ہوئے حق طلبی اور حق جوئی کی روح اس میں زندہ کرے۔

یہاں اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ انسان صرف غور و فکر اور عقل و خرد کا مجموعہ ہی نہیں ہے کہ وہ قدرت استدلال کے سامنے سر تسلیم خم کر دے، بلکہ وہ اس کے علاوہ گونا گوں "عواطف" اور "احساسات" و جذبات کا مجموعہ بھی ہے کہ جس کا اہم حصہ اس کی روح کو تشکیل دیتا ہے وہ اس کے وجود کے اندر ہی چھپا ہوا ہے کہ جسے صحیح اور معقول طریقہ سے مطالعہ کرنا چاہیے۔

قرآن نے ہمیں اس راہ و روش کی تعلیم دی ہے کہ مخالفین کے مقابلہ میں کس طرح منطقی مباحثہ پیش کرتے ہوئے انہیں اخلاقی اصول کے ساتھ اس عنوان سے طامیں کہ وہ ان کی گمراہیوں میں اتر جائیں۔

نفوذ کی شرط یہ ہے کہ مد مقابل یہ احساس کر لے کہ کسے والا ان اوصاف کا حامل ہے:

۱۔ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اُن باتوں پر ایمان بھی رکھتا ہے، اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کے دل کی گمراہیوں سے اٹھ رہا ہے۔

۲۔ اس بحث سے اس کا مقصد حق جوئی و حق طلبی ہے نہ کہ غالب آنا اور فوقیت حاصل کرنا۔

۳۔ وہ مد مقابل کی قطعاً تحقیر و تذلیل نہیں چاہتا، اور اپنے آپ کو بزرگ اور بڑا کر کے پیش کرنا نہیں چاہتا۔

۴۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے دلسوزی اور خلوص سے کہہ رہا ہے اور اس کا اس میں کوئی خاص شخصیت

نفع نہیں ہے۔

۵۔ وہ بزم مقابل کے لیے احترام کا قائل ہے، اور اسی وجہ سے وہ اپنی تعبیرات میں بحث کی نزاکت کو فراموش نہیں کرتا۔

۶۔ وہ اپنے بزم مقابل کی ہٹ دھرمی کی جس کو بلا وجہ بھڑکانا نہیں چاہتا اور اگر کسی موضوع پر کافی مقدار میں بحث ہو چکی ہو تو وہ اسی پر قناعت کر لیتا ہے اور بحث میں اصرار کرنے اور اپنی بات کو فوقیت دینے سے پرہیز کرتا ہے۔

۷۔ وہ انصاف کرنے والا ہے اور انصاف کے پہلو کو کبھی بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، چاہے بزم مقابل اس اصول کی رعایت نہ کرتا ہو۔

۸۔ وہ اپنے افکار کو دوسروں پر ٹھونسنا نہیں چاہتا، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ خود دوسروں میں ولولہ پیدا کر دے تاکہ وہ خود اپنے شوق میں آزادی کے ساتھ حقیقت تک پہنچ جائیں۔

اد پر والی آیات میں غور و فکر کرنا، اور حکم خدا سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مخالفین کے ساتھ مباحثہ کرنے کا طریقہ۔ جس میں بہت سے قابل غور نکات ہوتے تھے۔ اوپر والے مباحثہ پر بہترین گواہ ہیں۔

وہ بعض اوقات تو یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ وہ حتیٰ طور پر اس بات کا تعین بھی نہیں کرتے، کہ ہم تو راہ ہدایت پر ہیں اور تم گمراہی کے طریقہ پر ہو، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ: "ہدایت یا گمراہی پر ہم ہیں یا تم" تاکہ وہ اس بات میں غور کریں کہ ہدایت اور گمراہی کی نشانیاں کس گروہ میں پائی جاتی ہیں۔ یا وہ یہ کہتا ہے کہ: "قیامت کے دن خدا ہم سب کے درمیان فیصلہ کرے گا اور ہر کسی کو اس کی لیاقت کے مطابق جزا دے گا"۔

البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سب باتیں ان لوگوں کے بارے میں ہیں کہ جن کی ہدایت کی امید ہو، لیکن بے رحم، ظالم اور ہٹ دھرم دشمنوں کے ساتھ۔ جن کی طرف سے قبول کرنے کی کوئی امید ہی نہ ہو۔ قرآن ایک دوسرے طریقہ سے پیش آتا ہے۔

اس بحث کے لیے۔ پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کا اپنے مخالفین کے ساتھ بحث کا طریقہ۔ ایک بہترین نمونہ ہے، نمونہ کے طور پر اس سلسلے میں امام صادق سے کتب سیرت میں جو کچھ نقل ہوا اس پر توجہ کیجئے۔

توحید، مفصل بن عمر کی مشہور حدیث کے مقدمہ میں اس طرح نقل ہوا ہے: وہ کہتا ہے کہ میں

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر کے پاس تھا، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبہ و مقامِ عظمت کے بارے میں غور و فکر کر رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ "ابن ابی العوجاء" (مشہور ماہہ پرست شخص) وارد ہوا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا، اس طرح سے کہ میں اس کی باتیں سن سکتا تھا۔ جب اس کے سامنے اس کے گرد جمع ہو گئے، تو اس نے کفر آمیز باتیں شروع کر دیں کہ جن کا نتیجہ محمد کی نبوت کا انکار، اور اس سے بڑھ کر خداوند تبارک و تعالیٰ کا انکار تھا، اس نے بہت ہی شیطنیت آمیز اور جھج تلی باتیں کیں۔

میں اس کی باتیں سن کر غضبناک اور پریشان ہوا، میں اٹھ کھڑا ہوا اور چیخ کر کہا، اے دشمن خدا! کیا تو نے کفر کی راہ اختیار کر لی ہے؟ اور اس خدا کا جس نے تجھے بہترین شکل میں پیدا کیا ہے انکار کر دیا ہے؟ "ابن ابی العوجاء" نے میری طرف رخ کیا اور کہا، تو کون ہے، اگر تو علم کلام کا عالم ہے تو دلیل پیش کر، تاکہ ہم تیری پیروی کریں اور اگر تو عالم نہیں ہے، تو پھر تو بات نہ کر، اور اگر تو جعفر بن محمد صادق کے پیروکاروں میں سے، تو وہ تو ہم سے اس طرح سے بات نہیں کرتے، جس طرح سے تو بحث کر رہا ہے۔

انہوں نے تو اس سے بھی بڑھ کر باتیں ہم سے سنی ہیں، انہوں نے تو کبھی بھی نامنرا اور گالی نہیں دی اور ہمارے جواب میں غصہ یا زیادتی کا راستہ اختیار نہیں کیا، وہ تو ایک بردبار، عاقل، سمجھدار اور سنجیدہ آدمی ہیں، اور ان کے کبھی سبک سری دامن گیر نہیں ہوتی۔ وہ ہماری باتوں کو غور سے سنتے ہیں، اور ہمارے دلائل سے آگاہ ہوتے ہیں، جب ہم اپنی تمام باتیں کر لیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان پر فتیاب ہو گئے، تو اس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور جھج تلی باتوں کے ساتھ ہمارے تمام دلائل کا جواب دیتے ہیں، اور ہمارے تمام بہانوں کو قطع کر دیتے ہیں۔ اس طرح سے کہ پھر ہم میں جواب دینے کی قدرت و طاقت ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر تو ان کے اصحاب میں سے ہے، تو پھر تو بھی ہمارے ساتھ اسی طرح سے بات کرنا۔

۲۸ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○

۲۹ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○

۳۰ قُلْ لَّكُمْ مَعَادُ يَوْمٍ لَا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ ○

ترجمہ

۲۸ ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر تمام لوگوں کے لیے (رسول بنا کر) تاکہ (انہیں خدائی جزا اور ثواب کی) بشارت دے اور (اس کے عذاب سے) ڈرائے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۲۹ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ (قیامت کا) وعدہ کب ہوگا۔

۳۰ تم کہہ دو: تمہارا وعدہ اس دن ہوگا کہ جس میں نہ ایک گھڑی کی تاخیر ہوگی اور نہ (ہی اس پر) مقدم ہو سکو گے۔

تفسیر

تم تمام جہان والوں کے لیے مبعوث کیے گئے ہو

پہلی زیر بحث آیت پیغمبر اسلام کی نبوت کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور اس کے بعد والی آیات معاد و قیامت کے سلسلہ میں بحث کرتی ہیں اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ آیات میں گفتگو توحید سے متعلق تھی، عقائد دینی کے ایک کامل مجموعہ کو بیان کیا جا رہا ہے کہ جو سورہ سبا جیسی مکی سورتوں کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی وسعت اور تمام انسانوں کے لیے ان کی نبوت کی عمومیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر تمام جہان کے لوگوں کے لیے، دراصل یہ کہ تم سب کو خدا کی عظیم جزاؤں کی بشارت دیتے ہو اور عذاب الہی سے ڈراتے ہو، لیکن اکثر لوگ اس معنی سے بے خبر ہیں" (وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیراً و نذیراً و لکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

"کافۃ" مادہ "کف" سے ہاتھ کی پھیلی کے معنی میں ہی ہے، اور چونکہ انسان اپنے ہاتھ سے چیزوں کو پکڑتا ہے، یا اپنے سے دور کرتا ہے لہذا یہ لفظ بھی "جمع کرنے" کے معنی میں آتا ہے اور بھی "منع کرنے" کے معنی میں۔

مفسرین نے زیر بحث آیت میں دونوں احتمال دیئے ہیں، پہلا یہ کہ جمع کرنے کے معنی میں ہو، اور اس صورت میں آیت کا مفہوم وہی ہوگا کہ جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے "کہ ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے سب مگر جہان کے تمام لوگوں کے لیے" یعنی یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے عالمی اور جہانی ہونے کو بیان کرتا ہے۔

متعدد روایات کہ جو شیخہ اور سنی طرق سے اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہیں وہ بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔

اس بنا پر آیت کا مفہوم و مطلب سورہ فرقان کی آیت "ایک طرح ہے کہ جو یہ کہتی ہے کہ (تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیراً) "ہمیشہ ہی برکتوں والا ہے وہ خدا کہ جس نے اپنے بندے پر قرآن کو نازل کیا تاکہ سارے جہان کے تمام لوگوں کو ڈرائے"۔

اور سورہ انعام کی آیت ۱۹ کی طرح ہے کہ جو یہ کہتی ہے کہ: (واوحی الی ہذا القرآن لانذرکم بہ و من بلغ) "یہ قرآن مجھ پر وحی ہوا ہے تاکہ میں تمہیں بھیجوں اور تمام ان لوگوں کو بھیجوں کہ جن تک یہ بات پہنچے، ڈراؤں"۔

ایک حدیث میں، کہ جسے بعض مفسرین نے اوپر والی آیت کی مناسبت سے ذکر کیا ہے، پیغمبر کی دعوت کی عمومیت، ان کے ایک عظیم اعزاز و افتخار کی حیثیت سے منعکس ہو رہی ہے۔ آپ نے یہ فرمایا ہے کہ:

"اعطیت خمساً - و لا اقول فخرًا - بعثت الی الاحمر والاسود، و

جعلت لی الارض طہوراً و مسجداً، و احل لی المغنم و لا یحل لاحد قبلی،

نصرت بالرعب فہو یصیر امامی مسیرۃ شمر، و اعطیت الشفاعۃ فادخرتها

لامتی یوم القیامۃ"

”خدا نے مجھے پانچ چیزیں عطا فرمائی ہیں۔ اور میں اس بات کو فخر و مباہات کے طور پر نہیں کہتا۔ (بلکہ شکر نعمت کے طور پر کہتا ہوں) میں تمام انسانوں کے لیے، خواہ وہ گورے ہوں یا کالے، مہوٹ ہوں یا ہوں، اور میرے لیے زمین کو پاک و پاکیزہ اور اس کی ہر جگہ کو مسجد و عبادت گاہ قرار دیا گیا ہے، جنگ میں حاصل شدہ مال غنیمت میرے لیے حلال ہے، جو مجھ سے پہلے کسی کے لیے بھی حلال نہیں کی گئی تھی۔ دشمنوں کے دل میں دہشت اور رعب ڈال کر میری مدد کی گئی ہے“ اور خدا نے ہمارا رعب ہمارے دشمن کے دل میں ڈال دیا ہے، اس طور سے کہ وہ (رعب) میرے آگے آگے ایک مہینہ کی راہ کے برابر بڑھتا ہے اور مجھے مقام شفاعت دیا گیا ہے، اور میں نے اسے اپنی امت کی خاطر قیامت کے دن کے لیے ذخیرہ کیا ہوا ہے۔

اگرچہ اوپر والی حدیث میں آیت کی تفسیر کے طور پر تصریح نہیں ہوئی ہے، البتہ اس سلسلہ میں اور بھی احادیث ہمارے پاس موجود ہیں کہ جن میں یا تو آیت کی تفسیر کی تصریح ہوئی ہے، اور یا لئنا من کاخۃ کی تعبیر ہے، کہ جو وہی اوپر والی آیت کی تعبیر ہے۔ اور یہ سب کی سب اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اوپر والی آیت پیغمبر کی دعوت کے جانی ہونے کو بیان کر رہی ہے۔ دوسری تفسیر جو اس آیت کے لیے بیان کی گئی ہے ”کف“ کے دوسرے معنی یعنی منع کرنے سے لی گئی ہے، اس تفسیر کے مطابق ”کاخۃ“ پیغمبر کی صفت ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ خدا نے پیغمبر کو انسانوں کے لیے کفر و معصیت و گناہ سے روکنے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ نزدیک نظر آتی ہے۔

بہر حال چونکہ تمام انسان جلب منفعت اور دفع ضرر کی خواہش رکھتے ہیں، لہذا پیغمبر بھی مقام ”بشارت“ و ”نذارت“ کے حامل تھے، تاکہ وہ ان دونوں خواہشات کو مجتمع رکھیں، اور انہیں حرکت میں لے آئیں، لیکن غافل اور بے خبر اکثریت اپنے انجام پر توجہ کیے بغیر ان کے مقابلے میں گھڑی جوتانی اور خدا کی ان عظیم نعمتوں کا انکار کر دیتی۔

چونکہ گزشتہ آیات میں اس معنی کی طرف اشارہ ہوا تھا کہ خدا قیامت کے دن تمام لوگوں کو جمع کرنے

۱۔ تفسیر مجمع البیان ذیل آیات زیر بحث، یہ حدیث در المنثور میں بھی ابن عباس سے نقل ہوئی ہے۔

۲۔ تفسیر نور العین، جلد ۲، ص ۲۵۵، ۲۵۶۔

۳۔ کبھی ”تار“ اسم فاعل سے ملتی ہوتی ہے اور جہاں لفظ کا معنی دیتی ہے، مذکر تائید کا مثلاً ”راویہ“۔

کے بعد ان کے درمیان فیصلہ کریگا۔ لہذا بعد والی آیت میں منکرین معاد کی طرف سے ایک سوال کو اس صورت میں نقل کرتا ہے کہ، ”وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو پھر یہ قیامت کا وعدہ کس زمانہ میں پورا ہوگا“ (و یقولون حتیٰ ہذا الموعدان کنتم صادقین)۔

یہ سوال منکرین معاد، پیغمبر اسلام یا دوسرے تمام پیغمبروں سے بار بار کیا کرتے تھے، جو کبھی تو مطلب کو سمجھنے کے لیے ہوتا تھا، اور شاید اکثر استہزاء اور تمسخر کے طور پر ہوا کرتا تھا کہ آخر یہ قیامت جس کا تم ہمیشہ سہارا لیتے ہو، اگر تم سچ کہتے ہو تو بتلاؤ کہ وہ کب آئے گی۔ ان کا یہ پوچھنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچ بولنے والے آدمی کو اس مطلب کے تمام جزئیات کا جس کی وہ خبر دے رہا ہے علم ہونا چاہیے اور اس کے کم و کثرت اور زمان و مکان سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔

لیکن قرآن ہمیشہ اس مطلب کے صریح جواب اور قیامت کے وقوع کے زمان کی تعیین سے پہلوتی کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ یہ ان امور میں سے ہے کہ جس کا علم خدا کے ساتھ ہی مخصوص ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں ہے۔

لہذا بعد والی آیت میں اسی مطلب کو ایک دوسری عبارت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”کہہ دو کہ تمہارا وعدہ اس دن ہوگا کہ نہ ایک گھڑی اس سے تاخیر ہوگی اور نہ ہی ایک لمحہ پھر اس سے آگے بڑھو گے“ (قل لکم ميعاد يوم لا تستأخذون عنہ ساعة ولا تستقدمون)۔

یہ قیامت کی تاریخ کا معنی ہونا۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام پر بھی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، اس بنا پر کہ خدا چاہتا ہے کہ لوگ ایسی آزادی عمل۔ جو انہیں ہمیشہ آمادہ رہنے کی حالت میں تیار رکھے۔ کے حامل ہوں کیونکہ اگر قیامت کی تاریخ معین ہو جائے تو اگر اس کا زمانہ دور ہوتا تو سب کے سب غفلت، غرور اور بے خبری میں جا پڑتے، اور اگر اس کا زمانہ نزدیک ہوتا، تو ممکن تھا کہ وہ آزادی عمل کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے اور ان کے اعمال اضطرابی صورت اختیار کر لیتے اور دونوں صورتوں میں انسان کے تربیتی ہدف بے نتیجہ رہ جاتے، اسی بنا پر قیامت کی تاریخ تمام لوگوں سے پوشیدہ ہے، جیسا کہ شب قدر کی تاریخ وہی رات کہ جو ہزار ماہ کی فضیلت رکھتی ہے، یا حضرت مہدی کے قیام کی تاریخ۔

وہ تعبیر کہ جو سورہ طہ کی آیت ۱۵ میں آئی ہے: ”ان الساعة آتیة اکاد اخصیہا للتجزی علی نفسی بما تسعی“ (قیامت یقینی طور پر آئے گی، میں چاہتا ہوں کہ اسے مخفی رکھوں تاکہ ہر شخص کو اس کی اپنی سعی و کوشش کے مقابلہ میں جزادی جائے ہاں ہی معنی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

اس ضمن میں کہ وہ یہ تصور کرتے تھے کہ پیغمبر جو قیامت کے بارے میں خبر دے رہا ہے، اگر وہ سچ کہ رہا ہے تو اسے اس کی یقینی تاریخ کا بھی علم ہونا چاہیے۔ یہ ان کی انتہائی غلط فہمی ہے، اور ان کے ذہنی غمگین

سے بے خبری اور لاعلمی کی دلیل ہے، کیونکہ وہ تو صرف احکام کو پہنچانے اور بشارت و انداز پر مامور تھے باقی رہا قیامت کا مسئلہ تو وہ خدا سے مربوط ہے اور صرف وہی اس کے تمام جزئیات سے آگاہ ہے، اور صرف اسی حصہ کو جسے مسائل تربیتی کے لیے اُس نے ضروری سمجھا پیغمبر کے اختیار میں دیا ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن مخالفین کی تہدید کے مقام میں کتنا ہے کہ: "تم قیامت کے مقررہ وعدہ سے ایک لحظہ کے لیے بھی تاخیر نہیں کرو گے" (لا تستأخرون) لیکن یہ کیوں کتا ہے کہ ایک لحظہ کے لیے مقدم بھی نہیں ہوگی، قرآن کے ہدف میں اس بات کا کیا اثر ہے؟

اس کے جواب میں دو نکات کی طرف توجہ رکھنا ضروری ہے پہلا یہ ہے کہ ان دونوں کو اکٹھا ذکر کرنا ہمیشہ کسی چیز کی تاریخ کے قطعی اور یقینی ہونے کی طرف اشارہ ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں کام میں دیرری یا جلدی نہیں ہے بلکہ اس کے وعدہ کا وقت قطعی و یقینی ہے۔

دوسرا یہ کہ ہٹ دھرم کفار کی ایک جماعت ہمیشہ پیغمبروں پر دباؤ ڈالتی رہتی تھی کہ یہ قیامت آئی کیوں نہیں، دوسرے لفظوں میں انہیں اس کے لیے جلدی بھی بخواہ استہزاء کے طور پر یا بغیر استہزاء کے، قرآن انہیں کتا ہے کہ تم جلدی نہ کرو، اس کی تاریخ اور وقت وہی ہے جو خدا نے مقرر کیا ہوا ہے۔

۳۱) وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا نَتْرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْجَعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتَضَعَفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا وَالْوَالَا أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ○

۳۲) قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتَضَعَفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مَجْرُمِينَ ○

۳۳) وَقَالَ الَّذِينَ اسْتَضَعَفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَنْ نَكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَنْدَادًا وَأَسْرُوا النَّدَامَةَ تَصَارَؤُا الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا الْأَعْلَلَ فِي آعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

ترجمہ

۳۱) کافروں نے کہا کہ: ہم اس قرآن پر اور جو کتابیں اس سے پہلے تھیں ہرگز بھی ایمان نہیں لائیں گے، اور اگر تو دیکھے کہ جس وقت یہ ستمگر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں (حساب کتاب اور جزا و سزا کے لیے) کھڑے ہوتے ہوں گے (تو ان کی وضع کیفیت سے تجھے تعجب ہوگا) جبکہ ان میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن میں ڈال رہا ہوگا، مستضعفین مستکبرین سے کہہ رہے

ہوں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہو جاتے۔

(۳۲) لیکن مستضعفین مستضعفین کو جواب دیں گے کہ کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روک رکھا تھا، اس کے بعد کہ وہ تمہارے پاس آئی (اور تم نے اسے اچھی طرح سے پالیا تھا) بلکہ تم خود ہی مجرم تھے۔

(۳۳) مستضعفین مشرکین سے کہیں گے، تمہارے رات دن کے فریب دینے والے دوسو سے (ہماری گمراہی کا سبب بنے) جس وقت تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم خدا کا انکار کریں، اور اس کے لیے شریک قرار دیں، وہ جس وقت عذاب (الہی) کو دیکھیں گے تو اپنی ندامت اور پشیمانی کو چھپائیں گے (کہ کہیں زیادہ رسوا نہ ہوں) اور ہم کافروں کی گردن میں طوق و زنجیر ڈال دیں گے، کیا اس کے علاوہ کہ جو وہ عمل کرتے تھے کوئی اور جزا انہیں دی جائے گی؟!

تفسیر

اس بحث کی مناسبت سے کہ جو گزشتہ آیات میں مسئلہ معاد پر مشرکین کی طرف سے اعتراضات کے بارے میں تھی، زیر بحث آیات میں ان کے لیے معاد کے بعض دردناک مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے تاکہ وہ اپنے کام کے انجام سے واقف ہو جائیں۔

پہلے کتا ہے کہ: "ہم اس قرآن پر اور جو کتابیں اس سے پہلے تھیں ہرگز بھی ایمان نہیں لائیں گے" و قال الذین کفروا لن نؤمن بهذا القرآن ولا بالذی بین یدینہ۔

لفظ "لن" جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کی نفی کے لیے ہے، اس بنا پر وہ کتا یہ چاہتے ہیں کہ اگر تم ابد تک بھی ہمیں تبلیغ کرو تو ہم ایمان نہیں لائیں گے اور یہ ان کی ہڈی دھرمی کی دلیل ہے کہ انہوں نے ابد تک۔ کے لیے اپنے ارادے کو پختہ کر لیا تھا، حالانکہ ایک حق طلب آدمی اگر کسی دلیل سے مطمئن نہ ہو تو وہ آئندہ کی احتمالی دلیلوں کا سنے بغیر انکار نہیں کر سکتا، اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں دوسرے دلائل کو بھی روک رہا ہوں۔

اس بارے میں کہ "الذین کفروا" سے کون لوگ مراد ہیں، مفسرین کی ایک جماعت نے تو اس کی مشرکین کے ساتھ تفسیر کی ہے اور بعض نے یہود اور اہل کتاب کے ساتھ، لیکن بعد والی آیات کے قرائن، کہ جو شرک کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اس بات کی دلیل ہیں، کہ اس سے مراد مشرکین ہی ہیں "الذی بین یدینہ" سے مراد وہی کتب آسمانی ہیں کہ جو قرآن سے پہلے دوسرے پیغمبروں پر نازل ہوئی تھیں، کیونکہ قرآن کی بہت سی آیات میں یہ تعبیر۔ خصوصاً ذکر قرآن کے بعد۔ اسی معنی میں ہتعال ہوتی ہے اور یہ بات جس کا بعض نے احتمال دیا ہے کہ اس سے مراد "معاد" اور یا قرآن کے مضامین تھے، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

بہر حال پہلے انبیاء کی کتب پر ایمان سے انکار شاید اس بنا پر تھا کہ قرآن اس مطلب پر تکیہ کرتا ہے کہ پیغمبر اسلام کی نشانیاں تورات و انجیل میں وضاحت کے ساتھ آئی ہیں اور پیغمبر اسلام کی نبوت کی نفی کرنے کے لیے دوسری کتب آسمانی کی بھی نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہ ہم اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور نہ اس سے پہلے کی کتب پر۔

اس کے بعد پیغمبر کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے قیامت میں ان کی وضع و کیفیت بیان کرتے ہوئے کتا ہے کہ: "اگر تو دیکھے کہ جب یہ سنگراپنے پروردگار کی بارگاہ میں حساب و کتاب اور داد رسی کے لیے کھڑے کیے جائیں گے (تو ان کی وضع و کیفیت سے تو حیرت میں ڈوب جائے گا) جبکہ ان میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن میں ڈالے گا، اور ایک دوسرے کے خلاف جھگڑا اور لڑائی کر رہے ہوں گے" (ولو متزای اذا الظالمون موقوفون عند ربہم یرجع بعضہم الی بعض القول)۔

اور والی آیت سے ایک دفعہ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ "ظلم" کے اہم ترین مصادیق میں سے ایک وہی "شرک" اور "کفر" ہے۔

"عند ربہم" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسی ہستی کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے کہ جو ان کا مالک اور پروردگار ہے اور اس سے بڑھ کر شرمندگی و شرمساری کی اور کیا بات ہوگی کہ انسان ایک ایسی ہستی کے سامنے پیش ہو کہ نہ تو وہ اس پر ایمان لایا ہو اور نہ ہی اس کے احکامات و فرامین پر، در آنحالیکہ اس کا سارا وجود اسی کی نعمتوں کا مہر ہون منت ہو۔

"اس حال میں مستضعفین" وہی بے خبر لوگ کہ جو آنکھ، کان بند کیے ہوئے دوسروں کے پیچھے لگے

۱۔ "یرجع" فعل لازم کی شکل میں بھی استعمال ہوتا ہے اور فعل متعدی کی شکل میں بھی۔ اور یہاں دوسری شکل میں ہے اور ارجاع اور لوٹنے کا معنی دیتا ہے اور چونکہ اس کے بعد (بعضہم الی بعض) آیا ہے لہذا نتیجہ "مفاعلتہ" کا معنی دیتا ہے۔

ہوتے تھے، مستکبرین سے۔ یعنی انہیں لوگوں سے۔ کہ جو کبر و غرور اور دوسروں پر تسلط جانے اور انہیں شیطانی سوچ کا راستہ دکھاتے تھے، اس طرح کہیں گے: "اگر تم نہ ہوتے اور اگر تمہارے شیطنیت آمیز فریب دینے والے دوسرے نہ ہوتے تو ہم مومنین میں سے ہوتے" لایقول الذین استضعفوا للذین استکبروا والولا انسلو لکنا مؤمنین۔

وہ اس طرح سے اپنے تمام گناہ ان بے رحم مستکبرین کی گردن میں ڈالنا چاہیں گے، اگرچہ دنیا میں وہ اس قسم کی قطعی اور دو ٹوک بحث کرنے کی مجال نہ رکھتے تھے، چونکہ ضعف و ناتوانی ان کے وجود پر غالب آئی ہوئی تھی اور وہ اپنی حریت و آزادی کھو چکے تھے، لیکن اب جبکہ وہ تمام جھوٹے مغایب جنہوں نے مستکبرین کو ان سے جدا کیا ہوا تھا برباد ہو گئے، اور سب کے اعمال کے نتائج ظاہر آشکار ہو گئے تو ان کے عین سامنے کھڑے ہو جائیں گے اور صراحت کے ساتھ ان سے بات کریں گے اور ان سے پرخاش رکھیں گے۔

لیکن مستکبرین بھی خاموش نہیں رہیں گے، وہ جواب میں متضعفین سے یہ کہیں گے، "کیا ہم نے تمہیں ہدایت کی راہ سے روکا تھا، جبکہ ہدایت بھی تمہارے پاس آگئی تھی اور کانی حد تک اتمام حجت بھی ہو گئی تھی اور پیغمبروں نے بھی تمام ضروری باتیں کہہ دی تھیں" (وقال الذین استکبروا للذین استضعفوا انحن صد وناکو عن الہدی بعد اذ جاہشکو)۔

نہیں ہم تمہارے جوابدہ نہیں ہیں، "بلکہ تم خود ہی گنہگار تھے کہ تم نے آزادی ارادہ رکھنے کے باوجود ہماری بے بنیاد باتوں کے سامنے سر تسلیم خم کیا، کفر و الحاد کی طرف رُخ کیا، اور انبیاء کی منطقی باتوں کو جھلا بیٹھے" (بل کنتو مجرمین)۔

یہ ٹھیک ہے کہ مستکبرین اپنے دوسروں کی وجہ سے عظیم گناہ کے مرتکب ہوئے تھے لیکن ان کی یہ بات بھی واقعیت رکھتی ہے کہ ان پیچھے لگنے والوں کو آنکھ اور کان بند کر کے ان کے پیچھے نہیں لگ جانا چاہیے تھا، اس لحاظ سے ان کا گناہ خود انہیں کی گردن پر ہے۔

لیکن متضعفین اس جواب پر قناعت نہیں کریں گے، اور مستکبرین کو مجرم ثابت کرنے کے لیے دوبارہ گفتگو شروع کر دیں گے اور مستکبرین سے اس طرح کہیں گے: "بلکہ تمہارے دوسرے، سازشیں اور شب و روز کے مکارانہ پروپیگنڈے اس بات کا سبب بن گئے کہ ہم ہدایت حاصل کرنے سے باز رہیں، جس وقت تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم خدا کا انکار کر دیں اور اس کے لیے شریک و شبیہ قرار

ویں" (وقال الذین استضعفوا للذین استکبروا بل بکر اللیل والنهار اذ تأمرونا ان نکفر باللہ ونجعل له اندادا)۔

ہاں! تم ہی تو تھے جو اپنے بُرے پروپیگنڈے سے دست بردار نہیں ہوتے تھے اور دن رات اپنے بُرے مقاصد کی پیش رفت کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم قبول کرنے میں آزاد تھے اور قصور وار و گنہگار، لیکن عامل فساد ہونے کی بنا پر تم بھی جوابدہ اور گنہگار ہو، بلکہ سنگ بنیاد تو تمہارے ہی ناپاک ہاتھوں سے رکھا گیا، خاص طور پر جبکہ تم ہمیشہ ہی اپنی قدرت و طاقت اور اقتدار کی بنا پر بات کرتے تھے "تأمرونا" کی تعبیر اس مطلب پر گواہ ہے۔

یہ بات صاف طور پر واضح اور ظاہر ہے کہ مستکبرین اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے، اور اس عظیم جرم میں اپنی شرکت کا انکار نہیں کر سکتے تھے۔

لہذا دونوں گروہ اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے، مستکبرین تو دوسروں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے اور متضعفین ان بُرے دوسروں کو بلا قید و شرط قبول کرنے کی وجہ سے، "لیکن جس وقت عذاب الہی کو دیکھیں گے تو اپنی ندامت و پشیمانی کو چھپائیں گے کہ کہیں اور زیادہ رسوا نہ ہو جائیں، اور ہم طوق و زنجیر کا فرد کی گردن میں ڈال دیں گے" (واستدۃ الندامة لماراوا العذاب وجعلنا الاعلال فی اعناق الذین کفروا)۔

اگرچہ اس جہان میں کہ جو ہر چیز کے ظاہر ہو جانے کا دن ہے اور اس دن کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھی جاسکے گی، کسی چیز کو چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، لیکن وہ اپنی اسی پرانی عادت کے مطابق کہ جو وہ دنیا میں رکھتے تھے، اس خیال سے کہ وہ (یہاں بھی) اپنی حالت کو چھپا سکتے ہیں چھپانے کی کوشش کریں گے۔

ہاں! وہ دنیا میں بھی جس وقت اپنی غلطی کو محسوس کرتے تھے، اور اس پر نادم و پشیمان ہوتے تھے تو انہار ندامت کی جرات۔ جو تجدید نظر اور بازگشت کے لیے ضروری تھی۔ نہیں رکھتے تھے اور اپنی اسی اخلاقی خصوصیت کو قیامت میں بھی استعمال کریں گے، لیکن کیا فائدہ؟

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ ندامت کو پہنا رکھنا عذاب الہی کے مشاہدہ اور ان کی گردن میں طوق و زنجیر کے پڑنے سے شدت و حسرت کی بنا پر ہو گا ان کے سانس ان کے سینوں میں رُک جائیں گے اور ان کی زبان بات کرنے سے عاجز ہوگی۔

اگرچہ قیامت کے دوسرے ہواقت میں وہی لوگ "یا ویلنا انا کنا ظالمین" "ہائے افسوس! ہم ہی ظالم تھے" کی فریاد کریں گے۔ (انبیاء۔ ۱۴)

بعض نے یہاں "اسرار" کا معنی "ظہار" کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ لفظ عربی زبان میں دو تضا و معانی

میں استعمال ہوتا ہے اور اس کی مثالیں کم نہیں ہیں۔ لیکن قرآن میں بھی اور غیر قرآن میں بھی اس لفظ "اسرار" کے مواقع استعمال کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ معنی بعید نظر آتا ہے کیونکہ "سر" عام طور پر "علن" کے مقابلہ میں آتا ہے، اور راغب نے بھی "مفردات" میں اس قول کے ضعیف ہونے کی تصریح کی ہے اگرچہ بعض علماء لغت نے دونوں معانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہر حال یہ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے کہ جو انہوں نے پہلے سے فراہم کیا ہے، کیا انہیں کوئی اور جزا۔ سوائے ان اعمال کے کہ جو وہ انجام دیا کرتے تھے۔ طے گی " (ہل یجزون الّٰہا ما کانوا یعملون)۔ ہاں! یہ کفار و مجرمین کے اعمال دکرا رہی ہوں گے جو ان کی گردن اور ہاتھ پاؤں میں قید کی زنجیروں کی صورت میں ڈال دی جائے گی، وہ اس جہان میں بھی ہوائے نفس اور زرد زور اور پستی و بلندی کے اسیر تھے اور قیامت میں جب اعمال مجسم ہو کر سامنے آئیں گے تو وہی قیدیوں دوسری شکل میں ظاہر ہوں گی۔

اد پر والی آیت ایک مرتبہ پھر تجسیم اعمال کے مسئلہ کو جس کی طرف ہم نے بار بار اشارہ کیا ہے واضح کر رہی ہے، کیونکہ وہ یہی بات کہہ رہی ہے کہ "ان کی جزا خود انہیں کے اعمال میں ہے اور تجسیم اعمال کے لیے اس سے زیادہ ظاہر و واضح اور کون سی تعبیر ہوگی۔

"الذین کفروا" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اور گمراہ کرنے والے مستکبر بھی اسی انجام کو پہنچیں گے اور ان کو اور گمراہ ہونے والے مستضعف اور سب کا فر بھی اسی انجام میں گرفتار ہوں گے اور اصولی طور پر اس وصف کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی مجازات اور سزا کی علت وہی ان کا کفر ہے۔

۱۔ "لسان العرب" میں مادہ "سر" کے ذیل میں اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کی گئی ہے، اور اہل لغت و ادب کے اس بارے میں اختلاف کو نقل کیا ہے۔ (جلد ۲ صفحہ ۲۵)

۳۲) وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا
إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ○

۳۵) وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا
نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ○

۳۶) قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَكِن
أَكْثَرِ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○

۳۷) وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرَّبُكُمْ عِنْدَنَا
زُلْفَىٰ إِلَّا مَنَ أَمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ

۳۸) وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ
فِي الْعَذَابِ مُحَضَّرُونَ ○

ترجمہ

۳۲) ہم نے کسی شہر اور بستی میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے مترفین (جو ناز و نعمت میں مست تھے) نے کہا کہ ہم اُس سے کہ جو کچھ تم دے کر بھیجے گئے ہو کافر ہیں۔

۳۵) اور انہوں نے یہ کہا کہ ہمارے اموال اور اولاد (سب سے) زیادہ ہیں (اور یہ اس بات کی نشانی ہے کہ خدا کا ہمارے ساتھ تعلق ہے) اور ہمیں ہرگز

عذاب نہیں ہوگا۔

(۳۶) کہہ دے کہ میرا پروردگار جس کی چاہتا ہے روزی وسیع یا تنگ کر دیتا ہے (اور یہ بات اس کی بارگاہ میں قرب سے کوئی ربط نہیں رکھتی) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۳۷) تمہارے مال اور اولاد ہرگز تمہیں ہمارا مقرب نہیں بناتے، سوائے ان کے کہ ایمان لے آئیں اور عمل صالح انجام دیں، ان کے لیے ہی ان کے اعمال کے بدلے میں جو انہوں نے انجام دیئے ہیں کسی گنا جزا ہے اور وہ (جنت کے) بالا خانوں میں (انتہائی) امن و امان میں ہوں گے۔

(۳۸) اور وہ لوگ کہ جو ہماری آیات کے انکار و ابطال کی کوشش کرتے رہے اور یہ خیال کرتے رہے کہ ہماری قدرت کے چنگل سے نکل کر بھاگ جائیں گے، وہ عذاب (الہی) میں داخل ہوں گے۔

تفسیر

مال و اولاد قرب خدا کی دلیل نہیں ہیں

چونکہ گزشتہ آیات میں منکبرین کے (لوگوں کو) انکار کرنے کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں اس انکارگری کے ایک گوشے کو بیان کیا جا رہا ہے اور ضمنی طور پر پیغمبر گرامی اسلام کو بھی تسلیم ہی جا رہی ہے، کہ اگر وہ تیری مخالفت کریں تو اس بات پر تعجب نہ کر کیونکہ مرزا محمد علی منکبرین کی طرف سے سچے پیغمبروں کی مخالفت کرنا تو ان کا شیوہ اور عادت رہی ہے۔

کہتا ہے: "ہم نے کسی شہر یا بستی میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے مرتدین۔ وہی لوگ جو ناز و نعمت میں مست اور مغرور ہو چکے تھے۔ نے کہا ہم اس چیز کے کہ جو تم دے کر بھیجے گئے ہو منکر و کافر ہیں، اور جسے تم خدائی پیغام کا نام دیتے ہو اُسے ہم قبول نہیں کرتے" (روما ارسلنا فی قریۃ

من نذیر الا قال مترفوا انا بما ارسلتو بہ کافرون۔

"نذیر" کا معنی ہے ڈرانے والا اور یہ خدا کے پیغمبروں کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگوں کو ان کی کج رویوں، بیدادگریوں اور گنہ و فساد کے مقابلہ میں خدا کے عذاب سے ڈراتے تھے۔

"مترفوا" جمع ہے "مترف" کی "ترف" "بردزن طرف" کے مادہ سے جو تنعم کے معنی میں ہے اور مترف اس شخص کو کہتے ہیں کہ جسے نعمت کی زیادتی اور زندگی کی مرفہ الحالی نے مست، مغرور اور غافل کر دیا ہو اور سرکش پر اکسایا ہو۔

ہاں عام طور پر وہ لوگ کہ جو انبیاء کے صف اول کے مخالف تھے، وہ یہی مترف، سرکش اور غافل لوگ تھے، چونکہ وہ ایک طرف سے تو انبیاء کی تعلیمات کو اپنے مقاصد کے حصول اور اپنی ہوس لانی سے مزاج سمجھتے تھے اور دوسری طرف سے وہ اُسے اُن محدودین کے حقوق کا دفاع کرنے والا جانتے تھے کہ جن کے حقوق کو غصب کر کے وہ ایسی زرق برق زندگی گزار رہے تھے اور تیسری طرف سے وہ ہمیشہ اپنے مال و ثروت کی حفاظت کے لیے حکومت کی قدرت کو معاون و مددگار سمجھتے تھے، اور پیغمبروں کو ان تمام جہات میں اپنا تہ مقابل سمجھتے تھے لہذا فوراً ان سے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ کسی خاص حکم یا تعلیم کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ تو کلی طور پر یہ کہتے تھے کہ: "ہم اُن تمام چیزوں کے کہ جن کے ساتھ تم مبعوث ہوئے ہو کافر ہیں" یہاں تک کہ ہم ایک قدم بھی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہیں اور ان کی یہ بات خود حق کے مقابلہ میں ان کی لجاجت، ہٹ دھرمی اور عناد کی بہترین دلیل تھی۔

یہ حقیقت ایک اہم مسئلہ ہے کہ جس سے قرآن نے مختلف آیات میں پردہ اٹھایا ہے کہ عام طور پر محدودین ہی پہلے وہ افراد ہوتے تھے کہ جو انبیاء کی دعوت پر لبیک کہتے تھے، اور مغرور ثروت مند متنعین ہی وہ پہلا گروہ ہوتا تھا جو ظلم مخالفت بلند کرتا تھا۔

باوجودیکہ مسئلہ طور پر دعوت انبیاء کے منکر اسی گروہ میں منحصر نہیں تھے لیکن عام طور پر عاقلین فساد اور شرک و خرافات کی طرف دعوت دینے والے وہی ہوا کرتے تھے کہ جو ہمیشہ اس بات کی کوشش کیا کرتے تھے کہ زبردستی دوسروں کو بھی انہیں راستوں پر چلائیں۔

سورہ زخرف کی آیت ۲۳، سورہ ہود کی آیت ۱۱۶ اور سورہ مؤمنوں کی آیت ۲۳ میں بھی یہی مطلب

بیان ہوا ہے۔

صرف انبیاء کے مقابلہ میں بلکہ ہر اصلاحی قدم جو کسی دانشمند، مصلح اور عالم جاہد کی طرف سے اٹھے یہ گروہ مخالفت کے لیے سر اٹھاتا، اور مصلحین کے پروگراموں کو درہم برہم کرنے کے لیے سازشیں کرتا اور کسی بھی جرم کے ارتکاب سے باز نہیں رہتا۔

بعد والی آیت ان کی لچر اور پوچھ منق کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جس سے ہر زمانہ میں اپنی برتری کو ثابت کرنے کے لیے متوسل ہوا کرتے تھے۔ اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ: "اور انہوں نے یہ کہا کہ ہم سب سے زیادہ ثروت مند اور سب سے زیادہ آکل اولاد رکھتے ہیں" (وقالوا نحن اكثر اموالاً و اولاداً)۔
خدا ہم سے محبت رکھتا ہے، لہذا اس نے ہمیں مال بھی فراوان دے رکھا ہے اور بہت سی افرادی قوت بھی، اور یہ بات ہمارے حق میں اس کے لطف و کرم کی اور اس کی بارگاہ میں ہمارے مقام اور حیثیت کی دلیل ہے! اور ہم (نور چشموں) کو ہرگز بھی عذاب نہیں ہوگا" (وما نحن بمعذبين)۔
کیا خدا اپنے معززین اور پیاروں کو عذاب دے گا؟ اگر ہم اس کی بارگاہ سے دھتکارے ہوئے ہوتے، تو وہ یہ ساری نعمتیں ہمیں کیوں دیتا؟! خلاصہ یہ ہے کہ ہماری دنیا کا آباد ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری آخرت بھی آباد ہوگی۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ (وما نحن بمعذبين) کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کئی طور پر قیامت اور عذاب کے ہی منکر تھے، لیکن بعد والی آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ جملہ اس معنی میں نہیں ہے، بلکہ ان کی مراد یہ تھی کہ وہ اپنی ثروت و دولت کو مقرب بارگاہ خدا ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔

بعد والی آیت ان کی اس گھٹیا اور عوام کو فریب دینے والی منطق کا انتہائی اعلیٰ طریقہ سے جواب دیتی ہے اور ان کی سرکوبی کرتی ہے، روئے سخن پینبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ: "ان سے کہہ دے کہ میرا پروردگار جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہے اس میں تنگی کر دیتا ہے" (اور یہ سب کچھ ایسی مصلحتوں کے مطابق کرتا ہے کہ جنہیں مخلوق کی آزمائش اور انسانی زندگی کے نظم و نسق کے لیے ضروری سمجھتا ہے اور یہ چیز بارگاہ خداوندی میں قدر و منزلت اور مقام و حیثیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی) (قل ان ربي يبيسط الرزق لمن يشاء ويقدر)۔
اس بنا پر وسعت رزق کو سعادت کی اور تنگی رزق کو شقاوت کی دلیل ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے؛ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں "ولكن اكثر الناس لا يعلمون"۔

البتہ بے خبر اور نادان واقف اکثریت ایسی ہے روزنہ واقف اور آگاہ لوگوں جیسے یہ مسئلہ واضح و آشکار ہے۔

اس کے بعد مزید وضاحت کے ساتھ اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "ہرگز ایسا نہیں ہے، کہ تمہارا مال و اولاد تمہیں ہمارا مقرب بنا دے" (وما اموالكم ولا اولادكم بالتي تقر بكم عندنا زلفى)۔

یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ جو عوام کے ایک گروہ کو دامن گیر ہو گئی ہے۔ کہ جو یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ لوگ جو دنیا میں مادی لحاظ سے محروم ہیں وہ بارگاہ خدا میں مغضوب و مظلوم ہیں اور وہ لوگ جو نعمت کی فراخی میں ڈوبے ہوئے ہیں وہ اس کے محبوب و مقبول ہیں۔
کتنے ہی ایسے محروم افراد ہوتے ہیں کہ جن کی اس (مغروریت) کے ذریعہ آزمائش ہوتی ہے اور بدترین مقامات تک پہنچتے ہیں اور کتنے ہی مستم افراد ایسے ہیں کہ جن کا مال و دولت ان کے لیے بلائے جان بن جاتا ہے اور ان کی گناہ گاری یا حد سے بڑھ جانے کا مقدمہ بنتا ہے۔

کیا قرآن سورہ تغابن کی آیت ۱۵ میں صراحت کے ساتھ یہ نہیں کہتا کہ: (انما اموالكم و اولادكم فتنة والله عندنا اجر عظيم) "تمہارے مال اور اولاد تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں اور اجر عظیم خدا کے پاس ہے"۔

اس بات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان زندگی کے لیے لازمی و ضروری سہولتوں سے ہی دستبردار ہو جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اقتصادی وسائل اور افراد انسانی قدرت و طاقت ہرگز خدا کی بارگاہ میں انسانوں کی معنوی قدر و قیمت کا معیار نہیں ہوتا۔

اس کے بعد انسانوں کی قدر و قیمت کا اصلی معیار اور جو چیز خدا کی بارگاہ میں تقرب کا سبب بنتی ہے اسے بیان کرتے ہوئے (ایک استثنائے مفصل کی صورت میں) کہتا ہے کہ: "مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے ان کے لیے ان کے اعمال کے مقابلہ میں کئی گنا اجر و ثواب ہے، اور وہ جنت کے بالا خانوں میں انتہائی امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کریں گے" (الآمن امن وعمل صالحاً فاولئك لهم جزاء الضعف بما عملوا وهم في الغرفات آمنون)۔

اس بنا پر تمام معیار ان ہی دونوں امور کی طرف لوٹتے ہیں، "ایمان" اور "عمل صالح"۔

۱۔ "زلفی" اور "زلفۃ" مقام و منزلت اور منزل گاہ کے معنی میں آیا ہے (مفردات راغب) اسی بنا پر رات کی منازل کو زلف اللیل کہتے ہیں "التي" کی تعبیر اس بنا پر ہے، کیونکہ بہت سے موارد میں مفرد مؤنث کی ضمیر جمع مکرر کی طرف لوٹتی ہے اس بنا پر یہاں تقدیر کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ جزاء الضعف کی تعبیر صورت کی صفت کی طرف اضافت کی قبیل سے ہے۔

خواہ کوئی بھی آدمی ہو، ہر زمانے میں اور ہر جگہ، وہ کسی بھی طبقہ سے ہو یا کسی گروہ سے ہو، بارگاہِ خدایں انسانوں کے درمیان تفاوت اور فرق ان کے ایمان کے درجات اور عمل صالح کے مراتب کے تفاوت اور فرق کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے سوا اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

یہاں تک کہ علم و دانش اور بزرگ افراد کی طرف نسبت، یہاں تک کہ پیغمبروں کے ساتھ (نسبت بھی) اگر ان دونوں معیاروں سے توام نہ ہو، تو صرف یہ ایک نسبت انسان کی قدر و قیمت میں ذرا سا بھی اضافہ نہیں کرتی۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں قرآن نے اپنی بے نظیر صراحت کے ذریعہ پروردگار کے قرب کے حوالے کے سلسلہ میں اور انسان کی وجودی قدر و قیمت کے بارے میں تمام بے معنی اور لغو خیالات پر قلم بطلان کھینچ دیا ہے اور اصل معیار کا دو چیزوں میں خلاصہ کر دیا ہے کہ جن کے حاصل کرنے پر تمام انسان قدرت رکھتے ہیں اور مادی امکانات و وسائل اور مہرہ میتیں اس میں مؤثر نہیں ہیں۔

ہاں! اگر مال و اولاد بھی یہی راستہ اختیار کر لیں تو وہ بھی اسی خدائی رنگ میں رنگے جائیں گے اور ایمان اور عمل صالح کا رنگ قبول کر لیں گے اور قربِ خدا کا سبب بن جائیں گے، لیکن وہ مال اور اولاد کو جو انسان کو خدا سے دور کر دیں اور ایک بُت کی طرح پوجے جانے لگیں اور فساد برپا کرنے کا سبب بن جائیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں، اور قرآن کے کہنے کے مطابق انسان کی جان اور اس کی سعادت و نیک بختی کے لیے دشمن ہیں۔ (یا ایہا الذین آمنوا ان من ازواجکم و اولادکم عدوا لکم فاحذروہم) "اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور کچھ اولاد تمہاری دشمن ہے ان سے ڈرتے رہو" (تغابن - ۱۳)

ضمنی طور پر۔ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے۔ "ضعف" صرف "رکنے" کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ "چند برابر" (کئی گنا) کے معنی میں بھی آیا ہے، اور زیر بحث آیت میں اسی معنی میں ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر نیک کام کی پاداش اور اجرِ خدا کے ہاں کم از کم دس گنا ہے: (من جاد بالحسنۃ فلہ عشر امثالہا)۔ (انعام - ۱۶۰) اور کبھی اس سے بھی کئی گنا زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

"غرفات" جمع ہے "غرفہ" کی کہ جو ان کمروں کے معنی میں ہے کہ جو اوپر والے طبقہ میں ہوں کہ جن میں روشنی بھی زیادہ آتی ہے اور جو ابھی بہتر ہوتی ہے اور آفات سے بھی بچے ہوئے ہوتے ہیں اسی بنا پر یہ تعبیر جنت کے اعلیٰ منازل کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

یہ لفظ اصل میں مادہ "غرف" (بروزن برف) کسی چیز کو اوپر لے جانے اور اٹھانے کے معنی میں ہے۔

"امنون" (وہ لوگ جو امن و امان میں زندگی بسر کرتے ہیں) کی تعبیر اہل بہشت کے بارے

میں بہت ہی جامع تعبیر ہے، کہ جو ان کی روح اور جسم کے آرام و سکون کو ہر لحاظ سے ظاہر کرتی ہے، کیونکہ وہاں انہیں نہ تو فنا و ذوال کا اذموت کا خوف ہوگا، اور نہ ہی دشمن کے حملہ کا خطرہ، نہ کوئی بیماری اور آفت اور غم و اندوہ، یہاں تک کہ انہیں خوف کا بھی کوئی خوف نہیں ہوگا، اور اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوگی کہ انسان ہر لحاظ سے امن و امان میں زندگی بسر کرے، جیسا کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بد امنی سے بدتر کوئی بلا اور مصیبت نہیں ہے۔

اور بعد والی آیت میں ان کے بے مقابل گروہ کی توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے: "باقی رہے وہ لوگ کہ جو ہماری آیات کے انکار و ابطال کے لیے سعی و کوشش کرتے ہیں، نہ تو وہ خود ایمان رکھتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو حق کی راہ میں قدم رکھنے کی اجازت دیتے ہیں، اس حال میں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہماری قدرت کے چنگل سے نکل کر بھاگ جائیں گے، وہ تو قیامت کے دن دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے" (والذین یسعون فی آیاتنا ما جن اولئک فی العذاب محضرون)۔

یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے مال و اولاد اور افرادی قوت سے استغواہ کرتے ہوئے انبیاء کی تکذیب کرتے ہیں، اور مخلوقِ خدا کو دوسو سے میں ڈالنے میں مشغول رہتے ہیں، اور وہ اس قدر مغرور ہو گئے تھے کہ وہ یہ گمان کرنے لگ گئے تھے کہ وہ عذابِ الہی کے چنگل سے نکل کر بھاگ جائیں گے لیکن وہ سب کے سب خدا کے حکم سے جلائے والی آگ کے اندر جھونک دیئے جائیں گے۔

"اولئک فی العذاب محضرون" کے جملہ میں کیونکہ آئندہ زمانہ کے بارے میں کوئی بات نہیں ہے، لہذا ممکن ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اب اس وقت بھی عذاب میں گرفتار ہیں۔

اس زندان سے بڑھ کر اور کونسا عذاب ہوگا کہ جو انہوں نے مال و اولاد کے ذریعہ اپنے لیے بنا لیا ہے۔ یہ احتمال بھی اس میں موجود ہے کہ اوپر والی تعبیر اس بنا پر ہو کہ خدا کا یہ وعدہ ایسا مسلم اور یقینی ہے

کہ گویا وہ اسی وقت اس میں قرار پائے ہیں جیسا کہ جملہ "فہم فی الغرفات امنون" میں بیان ہوا ہے۔ "معاجزین" کی تعبیر۔ جیسا کہ بعض اربابِ لغت نے کہا ہے۔ اس معنی میں ہے کہ وہ

اس طرح خیال کرتے ہیں کہ وہ خدا کی قدرت اور اس کے عذاب سے نکل کر فرار کر سکتے ہیں، حالانکہ یہ خیال باطل اور بے بنیاد ہے۔

۱۔ "لسان العرب" اور "مفردات راغب" نے "معاجزین" کی (ظانین انہم یعجزون اللہ) "گمان کرتے ہیں کہ وہ خدا کو عاجز کر دیں گے" کے ساتھ تعبیر کی ہے اور حقیقت میں یہ "یخادعون اللہ ورسولہ" کی تعبیر کے مشابہ ہے کہ جو سورہ بقرہ کی آیت ۹ میں آئی ہے، کیونکہ باب مغالہ کبھی کبھی اس معنی میں آتا ہے۔

چند نکات قدروں کا تعین

فرد اور جامعہ کی زندگی میں اہم مسئلہ پہچاننے کے معیار اور اس جامعہ کے تمدن پر حاکم
اقدار کا نظام ہے۔

کیونکہ فرد اور معاشرے کی زندگی کی تمام تحریکیں قدروں کے اسی نظام سے چھوٹی ہیں اور پھر یہی
تحریکیں نئی اقدار کو پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔

اس مسئلہ میں محسوس قیام کی غلطی اور خیالی و بے بنیاد اقدار کو بروئے کار لانا، ان کی تاریخ و تباہی
کی طرف کھینچ لے جانے کے لیے کافی ہے، اور واقعی اقدار اور سچے معیاروں کا ادراک ان کے ایوان
سعادت کی حکم ترین بنیاد بنتا ہے۔

مغرور دنیا پرست قدر و قیمت کو صرف مال و منال مادی وسائل اور افرادی قوتوں تک محدود سمجھتے
ہیں، یہاں تک کہ بارگاہِ خدا میں شخصیت کا معیار بھی انہیں چیزوں میں تصور کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے اوپر
والی آیات میں اس کا نمونہ دیکھا، اور اس کے بہت سے اور نمونے قرآن میں نظر آتے ہیں۔

۱۔ زور و زور پرست اور جبار فرعون اپنے مصاحبین سے کہتا ہے: "مجھے یقین نہیں آتا کہ موسیٰ خدا
کی طرف سے ہو۔ اگر وہ سچ کہتا ہے تو پھر اُسے سونے کے کنگن کیوں نہ دیئے گئے؟" (فلولا لقی علیہ
اسودۃ من ذهب)۔ (سورہ زمرت، آیت ۵۲)

یہاں تک کہ وہ اس قسم کے زور و زور نہ رکھنے کو موسیٰ کے مقام اور مرتبہ کی پستی کی دلیل شمار کرتا تھا
اور کہتا تھا: "اننا خیر من هذا الذی هو مہین"۔ (سورہ زمرت، آیت ۵۲)

۲۔ پیغمبر کے زمانے کے مشرک اس بات سے کہ قرآن ایک تہی دست شخص پر نازل ہوا ہے تعجب
کرتے تھے اور کہتے تھے کہ: "لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم"۔ (یوسف، آیت ۲۱)
سرزمینِ مکہ یا طائف کی کسی عظیم ثروت مند شخصیت پر کیوں نازل نہ ہوا۔ (زمرت، آیت ۳۱)

۳۔ بنی اسرائیل نے اپنے زمانے کے پیغمبر۔ اشمویل سے لشکر کی فرماندہی کے لیے "طاوت" کے
انتخاب کے سلسلے میں اعتراض کرتے ہوئے کہا، "نحن احق بالملک منه ولم یؤت سعۃ
من المال"۔ (ہم فرماندہی اور حکمرانی کے لیے اس سے زیادہ حقدار ہیں، کیونکہ ہم مشہور و معروف خاندان
سے ہیں، علاوہ ازیں طاوت کے پاس کچھ مال و دولت نہیں ہے)۔ (سورہ بقرہ، آیت ۲۴۷)

۴۔ قوم نوح کے مشرک ثروت مندوں نے اُن پر اعتراض کیا: "ان پست اور ذلیل افراد نے تیرے
اطراف کو کیوں گھیر رکھا ہے" اور پستی سے ان کی مراد مال و ثروت کا نہ ہونا ہے (قالوا انؤمن

لک و اتبعك الارذلون)۔ کیا تم تجھ پر ایمان لے آئیں حالانکہ اراذل اور پست لوگوں نے تیری پیروی
کی ہے (اور تجھ پر ایمان لائے ہیں)۔ (سورہ شعراء، آیت ۱۱۱)

۵۔ یہی اعتراض مکہ کے ثروت مندوں نے پیغمبر اسلام پر کیا تھا، کہ پابربہنہ (غریب) لوگوں نے
تجھے کیوں گھیر رکھا ہے؟ ہم تو ان کے بدن کی بدبو سے بھی ناراحت اور پریشان ہو جاتے ہیں اگر تو
انہیں اپنے سے دور کر دے تو پھر ہم تیرے پاس آئیں گے۔ قرآن سورہ کف میں اُن پر سختی کے ساتھ حملہ
کرتا ہے اور شدید ترین لب و لہجہ میں انہیں تنہد کر تا ہے اور پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ تجھے ایسے ہی لوگوں
کی صحبت اختیار کرنی چاہیے کہ جو اگرچہ تہی دست ہیں، لیکن ان کے دل عشقِ خدا سے پُر ہیں اور وہ صبح و
شام درگاہِ خدا کی طرف رُخ کرتے ہیں، اور اس کے سوا کسی کو نہیں چاہتے، اسے پیغمبر! تم انہیں کے
ساتھ رہو، اور ان سے منہ نہ پھیرو، "واصبر نفسك مع الذین یدعون ربہم بالغداۃ والعشی
یریدون وجہہ ولا تعد عینک عنهم"۔ (سورہ، آیت ۲۸)

ان ہی وجوہات کی بنا پر انبیاء کا پہلا اور اہم ترین اصلاحی قدم اسی جھوٹی عزت اور قدر و قیمت
کی دیوار کو توڑنا تھا، انہوں نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ ان غلط معیاروں کو ختم کیا، اور اصل خدائی اقتدار
کو ان کا جانشین بنایا، اور ایک "علمی انقلاب" کے ذریعہ شخصیت کے محور کو مال و اولاد، ثروت و جاہ و
کنبہ و قبیلہ کی شہرت سے تقویٰ و ایمان اور عمل صالح میں بدل دیا۔

اس کا نمونہ ہم نے زیر بحث آیات میں پڑھ لیا ہے، کہ اسوالم و اولاد پر خط بطلان کھینچنے کے بعد
بارگاہِ الہی میں تقرب کے ایک وسیلہ کے عنوان سے اور روماء و اولاد کو ولا اولاد کو بالقی
تقربکم عندنا لقی، کہہ کر بلافاصلہ اصل قدر و قیمت کو (الآمن امن وعمل صالحاً) کے
جملہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

آیہ شریفہ: (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) کہ جو ایک اسلامی شمار اور نعرے کی شکل میں
آئی ہے، کنبہ اور قبیلہ سے وابستہ قدروں کی نفی کے بعد اسی فکری و اقداری انقلاب کو بیان کر رہی ہے۔
اسی آیت (سورہ حجرات، ۱۳) کے مطابق کوئی چیز بھی اُس تقویٰ اور ایمان کے سوا کہ جو احساس
مسئولیت اور پابندگی عمل کے ساتھ ہو۔ انسانوں کی شخصیت اور قدر و قیمت کا معیار اور خدا کی بارگاہ
میں ان کے قرب کا ذریعہ نہیں ہے، اور جو شخص اس اصل معیار سے زیادہ سے زیادہ حصہ رکھتا ہے وہی
زیادہ مقرب اور زیادہ باعزت اور گرامی قدر ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ سرزمینِ عرب کے ماحول میں، اسلام اور قرآن کی حیات بخش
تعلیمات کے ظہور سے پہلے، زور و زور کی قدر و قیمت کے نظام کی حاکمیت کی وجہ سے اس ماحول کا نتیجہ
اور ماحصل ابوسنیان، ابوجہل اور ابولہب جیسے غارت گرد اور منہ بھٹ لوگ تھے، لیکن اسی ماحول سے

اقدار کے نظام میں انقلاب آجانے کے بعد مسلمان، ابوذر، مقداد اور عمار یا سر جیسے افراد سامنے آئے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید سورہ زخرف میں ان آیات کے ذکر کرنے کے بعد کہ جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کتا ہے: "نہ صرف یہ کہ مادی شان و شوکت شخصیت کی دلیل نہیں ہے، بلکہ اگر ایسا کرنے سے کچھ مفاسد وجود میں نہ آتے، تو ہم کافروں کے لیے ایسے گھر قرار دے دیتے کہ جن کی چھتیں چاندی کی ہوتیں اور اس کی سیڑھیاں (گراں قیمت) ہوتیں کہ جن کے ذریعہ وہ اوپر والے طبقات کا طوف جاتے اور ان کے گردوں کے لیے (شان و شوکت والے) ایسے دروازے اور (خوب صورت) تخت قرار دیتے کہ جن پر نیکہ لگاتے، اور ہر قسم کے زیورات ہم ان کے اختیار میں دے دیتے، لیکن یہ سب کچھ دنیاوی زندگی کے مال و متاع ہیں، اور آخرت کا گھر تیرے پروردگار کے پاس پرہیزگاروں کیلئے ہے" (ولولا ان یکون الناس امة واحدة لجعلنا لمن یکفر بالرحمن لیبوتھو سقفاً من فضة و معارج علیھا یظھرون و لیبوتھو البوابا و سرراً علیھا یتکئون و زخرفاً و ان کل ذالک لعمامتاع الحیاة الدنیا و الاخرة عند ربک للمتقین) (زخرف، آیات ۲۲-۲۳-۲۴-۲۵)

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ بھوٹی متدریں انسان کی واقعی اور حقیقی امتداد کی جگہ نہ لے لیں۔

۳۹) قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَ يَقْدِرُ لَهُ ۗ وَ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۗ وَ هُوَ خَيْرُ الرَّزٰقِيْنَ ۝

۴۰) وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِهْلُوْاۤ اِيَّاكُمْ كَمَا نُوۡاۤ يَعْبُدُوْنَ ۝

۴۱) قَالُوۡا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَاٰتٰنَا مِنْ دُوۡنِهِمْۗ بَلْ كَانُوۡا يَعْبُدُوْنَ اِلٰهَ الْجِنَّۗ ۗ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝

۴۲) فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۗ وَ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوۡا ذُقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكذِّبُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۹) کہہ دے: میرا پروردگار جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ (اور محدود) کر دیتا ہے اور جو چیز تم (اس کی راہ میں) خرچ کرو گے وہ اس کی جگہ اور دے دے گا، اور وہ بہترین روزی دینے والا ہے۔

۴۰) اور اُس دن کو یاد کر کہ جب خدا ان سب کو محشور کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا، کیا یہ تمہاری عبادت کرتے تھے؟

(۴۱) وہ کہیں گے: تو (ان ناروا نسبتوں سے) منزہ اور پاک ہے، تو ہی ہمارا ولی ہے، نہ کہ وہ (وہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے) بلکہ وہ توجہ کی پرستش کیا کرتے تھے اور ان میں سے اکثر ان پر ایمان رکھتے تھے۔

(۴۲) آج کے دن تم میں سے کوئی بھی کسی دوسرے کے لیے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہے اور ہم ظالموں سے کہیں گے کہ تم اس آگ کا عذاب چکھو کہ جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے۔

تفسیر

معبودوں کی عبادت کرنے والوں سے بیزار

ان آیات میں دوبارہ ان لوگوں کی گفتگو کی طرف رخ کرتا ہے کہ جو اپنے اموال اور اولاد کو بارگاہِ خدا میں اپنے قرب کی دلیل سمجھتے تھے اور تاکید کے طور پر کہتا ہے: "کہہ دے کہ میرا پروردگار اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے روزی کو کشادہ یا محدود کر دیتا ہے" (قل ان ربی بیسط الرزق لمن یشاء من عباده ویقدر لہ)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "تم راہِ خدا میں جو کچھ بھی خرچ کر دو گے خدا اس کی جگہ اور دے دے گا، اور وہ بہترین روزی دینے والا ہے" (وما انفقتم من شیء فهو یخلفہ وهو خیر الرازقین)۔ اگرچہ اس آیت کا مضمون گزشتہ مطلب کی تاکید ہے، لیکن دو جہات سے نئی چیز بھی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ گزشتہ آیت، جس کا مفہوم یہی تھا، زیادہ ترکفار کے اموال و اولاد کے بارے میں تھی، جبکہ "عباد" (بندے) کی تعبیر زیر بحث آیت میں اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ مومنین کے بارے میں ہے، یعنی مومنین کے لیے بھی کبھی روزی کو فراخ اور کشادہ کرتا ہے۔ جہاں مومن کے لیے مصلحت ہو۔ اور کبھی ان کی روزی کو تنگ اور محدود کر دیتا ہے۔ جہاں اس کی مصلحت معلوم ہو، بہر حال معیشت کی وسعت و تنگی کسی چیز کی دلیل نہیں بن سکتی۔

دوسری بات یہ کہ گزشتہ آیت تو معیشت کی وسعت و تنگی کو دو مختلف گروہوں کے بارے میں بیان کر رہی تھی، جبکہ زیر بحث آیت میں ممکن ہے کہ یہ ایک ہی انسان کی دو مختلف حالتوں کی طرف

اشارہ ہو، کہ جس کی روزی کبھی کشادہ اور فراخ اور کبھی تنگ اور محدود ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ اس آیت کی ابتدا میں بیان کیا گیا ہے وہ حقیقت میں اس چیز کیلئے ایک مقدمہ اور تمہید ہے کہ جو آیت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے اور وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تشویق (شوق دلانا) ہے۔

فہو یخلفہ" (وہ اس کی جگہ کو پُر کر دیتا ہے) کا جملہ، ایک جالب اور عمدہ تعبیر ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو کچھ راہِ خدا میں خرچ کیا جاتا ہے وہ حقیقت میں ایک نفع بخش تجارت ہے، کیونکہ خدا نے اس کا بدلہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی کریم شخص کسی چیز کا بدلہ دینے کا وعدہ کر لے تو وہ صرف اس کے مساوی اور برابر ہی بدلہ نہیں دیتا بلکہ وہ اس سے کئی گنا اور کبھی سو گنا بدلہ دیتا ہے۔

یقیناً خدا کا یہ وعدہ آخری اور دوسرے جہان کے لیے ہی نہیں ہے، ویسے وہ اپنی جگہ پر تسلیم ہے لیکن وہ دنیا میں بھی راہِ خدا میں خرچ کرنے کی جگہ کو انواع و اقسام کی برکات سے احسن طریقہ سے پُر کرتا ہے۔

(ہو خیر الرازقین) "وہ بہترین روزی دینے والا ہے" کا جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور مختلف جہات سے قابلِ غور ہے۔

وہ تمام روزی دینے والوں سے بہتر ہے، اس بنا پر کہ وہ یہ جانتا ہے کہ کونسی چیز بخشنے، اور کتنی مقدار میں روزی دے کہ جو فساد و تباہی کا سبب نہ بنے، کیونکہ وہ ہر چیز کا عالم ہے۔

وہ جو کچھ چاہے عطا کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جو کچھ عطا فرماتا ہے اس کے بدلے میں کوئی اجر اور جزا نہیں چاہتا، کیونکہ وہ غنی بالذات ہے۔

وہ درخواست کرنے اور مانگنے کے بغیر بھی دیتا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز سے باخبر اور حکیم ہے۔ بلکہ حقیقت میں اس کے علاوہ کوئی بھی "روزی دینے والا" نہیں ہے، کیونکہ جو شخص بھی جو کچھ بھی رکھتا ہے، وہ اسی کی طرف سے ہے، اور جو شخص بھی کسی کو کوئی چیز دیتا ہے وہ "انتقالِ روزی کا واسطہ" ہے نہ کہ روزی دینے والا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ وہ "فانی" اموال کے مقابلہ میں "باقی رہنے والی" نعمتیں عطا فرماتا ہے، اور "قلیل" کے مقابلہ میں "کثیر" بخشتا ہے۔

اور چونکہ یہ ظالم اور سرکش دولت مندوں کا گروہ مشرکین کے زمرہ میں داخل تھا اور وہ یہ دعویٰ

کرتے تھے کہ ہم فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور وہ قیامت میں ہماری شفاعت کریں گے، قرآن اس بے بنیاد دعوے کے مقابلے میں جواب دیتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: یاد کر اس دن کو جس میں خدا سب کو عبادت کرنے والوں کو بھی اور جن کی عبادت کی جاتی ہے اُن کو بھی - محشور کرے گا، اس کے بعد فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہے گا، کیا یہ تمہاری عبادت کیا کرتے تھے؟ (ویوم یحشرهم جمعاً شو یقول للملائکة اهلؤا ایاکم کانوا یعبدون)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ سوال کوئی ایسا سوال نہیں ہے کہ جو کسی معمول چیز کو خدا کی ذات پاک کے لیے واضح کرے، کیونکہ وہ تو ہر چیز کا علم رکھتا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ فرشتوں کے بیان کے ذریعہ حقائق بتائے جائیں، تاکہ عبادت کرنے والوں کا یہ گروہ ناماد اور شرمندہ ہو اور جان لے کہ وہ ان کے عمل سے پورے طور پر بیزار ہیں، اور وہ ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائیں۔

اُن تمام مہبودوں کے درمیان سے کہ جن کی مشرکین عبادت کیا کرتے تھے، صرف فرشتوں کا ذکر یا تو اس بنا پر ہے کہ جن جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اُن میں سے فرشتے شریعت ترین مخلوق تھے، جہاں قیامت میں ان سے شفاعت حاصل نہ ہو تو پھر چند پھروں اور لکڑیوں، جن اور شیاطین سے کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔

یا اس لحاظ سے ہے کہ بُت پرست پتھر اور لکڑیوں کو موجودات علوی (فرشتوں اور ارواح انبیاء) کا منظر اور بسمل سمجھتے تھے، اور اس طرح ان کی پرستش کرتے تھے، اور جیسا کہ قوم عرب کے درمیان بُت پرستی کی تاریخ میں بیان کیا گیا ہے کہ "عمر بن لُحیؓ جس سفر میں شام گیا تھا تو اس نے وہاں ایک گروہ کو بُت پرستی کرتے دیکھا، اُس نے اُن سے اس سلسلہ میں سوال کیا، تو انہوں نے کہا کہ یہ وہ خدا ہیں کہ جنہیں ہم نے موجودات علوی کی شکل میں بنایا ہے، ان سے ہم مدد طلب کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے بارش کی دعا کرتے ہیں، عمر بن لُحیؓ نے ان کے اس عمل کو پسند کیا، اور ان کی پیروی اختیار کی، اور اپنے ساتھ ایک بُت سوغات کے طور پر حجاز کے لیے لایا، اور اسی وقت سے یہاں بت پرستی کی ابتداء ہوئی اور پھیلتی چلی گئی، یہاں تک کہ اسلام کا ظہور ہوا، اور اس کی بیخ کنی کی بنی۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ فرشتے پر دروغ گار کے سوال کے جواب میں کیا کہتے ہیں؟ وہ جامع ترین اور نہایت مؤدبانہ جواب کا انتخاب کرتے ہوئے، عرض کرتے ہیں: "اے پر دروغ گار، تو ان ناروا نسبتوں

۱۔ عمر بن لُحیؓ کی سزا کی جانی پہچانی شخصیت تھی (لُحی لام کی پیش اور جا کی زبرد اور یا کی تشبیہ کے ساتھ)۔

۲۔ تفسیر روح المعانی جلد ۲۲ ص ۱۴۰ (زیر بحث آیت کے ذیل میں) سیرت ابن ہشام میں بھی مفہوم مختصر سے فرق کے ساتھ آیا ہے اور وہاں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے ساتھ شام سے "ہبل" بت لایا تھا۔ (سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۷۹)

سے، کہ جو تیری مقدس ذات کی طرف انہوں نے دی ہیں پاک اور منزہ ہے (قالوا سبحانک)۔ ہمارا اس گروہ سے کسی طرح کا بھی ربط و تعلق نہ تھا، "صرف تو ہی ہمارا اولیٰ ہے نہ کہ وہ" (انت ولینا من دونہم)۔

"وہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ تو جنوں کی عبادت کرتے تھے اور اُن میں سے اکثر جنات پر ایمان رکھتے تھے" (بل کانوا یعبدون الجن اکثرہم بلہم مؤمنون)۔

اس بارے میں کہ فرشتوں کے جواب کا مفہوم کیا ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، اور ہر ایک نے ایک الگ تفسیر کی ہے، لیکن جو زیادہ نزدیک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ "جن" سے مراد شیطان اور تمام ایسی خبیث موجودات ہیں کہ جو بُت پرستوں کو اس عمل کا شوق دلاتے تھے اور اُسے ان کی نظروں میں زینت دیتے تھے، اس بنا پر جن کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے فرمان کی اطاعت و پیروی اور ان کے وسوسوں کو قبول کرتے تھے۔

فرشتے اس کام پر راضی نہ ہونے کے اعلان اور بیزاری و نفرت کے اظہار کے ضمن میں کہتے ہیں کہ فساد کے اصلی عامل شیاطین تھے، اگرچہ ظاہراً وہ ہماری عبادت کرتے تھے، لہذا اس کام کے واقعی پھرے کو کھول کر دکھانا چاہیے۔

اور اس طریقہ سے وہ اُن عبادت کرنے والوں کو مکمل طور پر اپنے سے دور کرتے ہوئے ناامید کر دیں گے۔

اس معنی کی مثال ہمیں سورۃ یونس میں بھی ملتی ہے، جہاں یہ ارشاد ہوتا ہے: (ویوم نحشرهم جمعاً شو نقول للذین اشرکوا ما کانکوا انتو وشرکاکو فزینلنا بینہم و قال شرکاکو وھو ما کانکنتو ایتانا تعبدون) "اس دن کو یاد کرو کہ جس میں ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، پھر ہم مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے معبود اپنی جگہ پر ٹھہرو، (تاکہ تمہارا حساب لیا جائے) پھر ہم انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیں گے اور ان کے معبود اُن سے کہیں گے کہ تم ہرگز ہماری عبادت نہیں کرتے تھے" (یونس - ۲۸)

یعنی حقیقت میں تم اپنی ہوا و ہوس اور ادا لام و خیالات کی پرستش کرتے تھے نہ کہ ہماری، اس سے قطع نظر ہماری یہ عبادت ہمارے حکم اور فرمان سے نہیں تھی اور نہ ہی ہماری رضامندی سے تھی اور جو عبادت اس طرح سے کی جائے وہ درحقیقت عبادت ہی نہیں ہے۔

اس طرح سے مشرکین کی امید اس دن مکمل ناامیدی میں بدل جائے گی اور یہ حقیقت اُن کے لیے واضح طور پر روشن ہو جائے گی کہ ان کے معبود ان کے کام کی چھوٹی سے چھوٹی گروہ بھی نہ کھول سکیں گے، بلکہ وہ ان سے متنفر و بیزار ہوں گے۔

اس لئے بعد والی آیت میں ایک معنی نیز نتیجہ نکالتے ہوئے کہتا ہے: "آج کے دن تم میں سے کوئی بھی دوسرے کے لیے سود و زیاں اور نفع و نقصان کا مالک نہیں ہے" (فالیوم لا یملک بعضکم لبعض نفعاً ولا ضرراً)۔

اس بنا پر نہ تو فرشتے ہی کہ جو ظاہراً ان کے موجود تھے ان کی کوئی شفاعت کر سکیں گے اور نہ ہی وہ خود آپس میں ایک دوسرے کی کوئی مدد انجام دے سکیں گے۔

یہ وہ سزل ہے کہ جہاں ہم ان ظالموں سے کہیں گے: "تم اس آگ کے عذاب کا مزہ چکھو کہ جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے" (ونقول للذین ظلموا ذوقوا عذاب النار الیٰ انتم بہا تکذبون)۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ جہاں قرآن مشرکین کے بارے میں ظالم اور مستحکم کی تعبیر کرتا ہے بلکہ قرآن کی بہت سی دوسری آیات میں "کفر" کو "ظلم" سے اور "کفار و مشرکین" کی ظالمین سے تعبیر ہوتی ہے کیونکہ وہ ہر چیز سے پہلے خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں کہ پروردگار کی عبودیت کا پورا فخر تاج اپنے سر سے اتار کر بتوں کی ذلیل کرنے والی بندگی کا طوق اپنی گردن میں ڈالتے ہیں اور اپنی ساری حیثیت شخصیت اور قسمت کو برباد کر لیتے ہیں۔

حقیقت میں وہ قیامت کے دن اپنے شرک کی سزا بھی دیکھیں گے اور معاد و قیامت کے انکار کا عذاب بھی، اور (ونقول للذین ظلموا ذوقوا عذاب النار الیٰ انتم بہا تکذبون) کے جملہ میں دونوں معانی جمع ہیں۔

چند نکات

۱- انفاق زیادتی کا باعث ہے نہ کہ کمی کا

جو تعبیر اور پر والی آیت میں انفاق کے بارے میں بیان کی گئی ہے: "کہ جو چیز بھی تم راہ خدا میں خرچ کر دو گے خدا اس کے بدلے میں اور دے دے گا بہت معنی نیز تعبیر ہے۔

اقل اس لحاظ سے کہ لفظ "شیء" اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے، انفاق کی تمام اقسام کے لیے۔ خواہ وہ مادی ہوں یا معنوی، چھوٹی ہوں یا بڑی۔ ہر ضرورت مند انسان کے لیے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو شامل ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان کے پاس جو بھی سرمایہ موجود ہے اُس میں سے خدا کی راہ میں بخشے جا سکتے ہیں اور جس مقدار میں ہو۔

دوسرے انفاق کو فنا کے مفہوم سے باہر نکالتا ہے اور اسے بقا کا رنگ دیتا ہے کیونکہ خدا نے اپنی مادی و معنوی نعمتوں کے ساتھ۔ کہ جو کئی گنا اور کبھی ہزاروں گنا اور کم از کم دس گنا ہیں۔ اس کی جگہ کو بچھرنے کی ضمانت لی ہے، اور اس طرح سے انفاق کرنے والا شخص جس وقت اس جذبہ اور عقیدہ

کے ساتھ میدان میں آتا ہے تو ہاتھ اور دل زیادہ کھلا رکھے گا، وہ کمی کے احساس اور فقر کی فکر کو ہرگز اپنے دماغ میں جگہ نہ دے گا بلکہ وہ خدا کا شکر ادا کرے گا کہ جس نے اُسے اس قسم کی پُر نفع تجارت کی توفیق عطا فرمائی۔

یہ وہی تعبیر ہے کہ جو قرآن مجید میں سورہ صفت کی آیہ ۱۰، ۱۱ میں بیان کی ہے کہ: (یا ایہا الذین امنوا هل ادلکم علیٰ تجارتہ تنجیککم من عذاب الیم۔ تؤمنون باللہ ورسولہ و تجاهدون فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون) "اے وہ لوگو! کہ جو ایمان لاتے ہو، کیا میں تمہیں ایک ایسی پُر نفع تجارت کی طرف نہ جو دردناک عذاب سے رہائی بخشنے رہنمائی کروں؟ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور راہ خدا میں اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔"

ایک روایت میں پیغمبر گرامی اسلام سے منقول ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

۶- ینادی مناد کل لیلۃ لدا للصوت!

۶- ینادی مناد ابنوا للخراب!

۶- ینادی مناد اللہم ہب للمنفق خلفاً!

۶- ینادی مناد اللہم ہب للممسک تلفاً!

۶- ینادی مناد لیت الناس لم یخلقوا!

۶- ینادی مناد لیتہم اذ خلقوا فکروا فیما لہ خلقوا!

۶- ہر رات ایک آسمانی ندا کرنے والا یہ ندا کرتا ہے کہ مرنے کے لیے جو۔

۶- اور دوسرا منادی یہ ندا کرتا ہے کہ ویرانی کے لیے بنا کرو۔

۶- اور ایک منادی یہ ندا کرتا ہے کہ خدا وندا! جو انفاق کرتے ہیں ان کے لیے عوض فترار دے۔

۶- ایک اور منادی یہ ندا کرتا ہے کہ خدا وندا! جو امساک کرتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے ان کے لیے تھمت قرار دے۔

۶- اور ایک منادی یہ ندا کرتا ہے کہ کاش انسان پیدا ہی نہ ہوتے۔

۶- ایک اور ندا کرنے والا یہ ندا کرتا ہے کہ اے کاش اب جبکہ وہ پیدا ہو ہی گئے ہیں تو وہ

اس امر میں غور و فکر کرتے کہ وہ کس لیے پیدا ہوئے ہیں۔

(ان بندگانے والوں سے مراد وہ فرشتے ہیں کہ جو فرمانِ خدا سے اس عالم کے امور کی تدبیر کرتے ہیں)۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت سے منقول ہے کہ:

”من یقن بالخلف سخت نفسه بالنفقة“

جسے اس بات کا یقین ہو کہ اُسے بدلہ ضرور ملے گا تو وہ خرچ کرنے میں زیادہ سخی ہوگا۔

یہی مفہوم امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوا ہے۔

لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ انفاقِ حلال اور مشروع اموال میں سے ہو، کیونکہ خدا اس کے سوا دوسرے کو قبول نہیں کرتا اور برکت نہیں دیتا۔

اس لیے ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے یہ منقول ہوا ہے کہ ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ قرآن میں دو آیات ایسی ہیں کہ میں جتنا ان پر عمل کرتا ہوں، اس کا نتیجہ نہیں دیکھتا، (اور اس کے مطلب کو حاصل نہیں کرتا)۔

امام نے فرمایا وہ کونسی آیات ہیں؟

اس نے عرض کیا، پہلی تو خداوند بزرگ کی یہ بات ہے کہ اس نے یہ فرمایا ہے کہ: (ادعونی استجب لکم) ”مجھے پکارو میں تمہاری دعا کو قبول کرتا ہوں“ میں خدا کو پکارتا ہوں لیکن میری دعا قبول نہیں ہوتی۔

آپ نے فرمایا: کیا تیرا خیال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے وعدہ سے خلافت کیا؟

اس نے عرض کیا کہ: نہیں!

آپ نے فرمایا: پس اس کا سبب کیا ہے؟

اس نے عرض کیا کہ: مجھے معلوم نہیں ہے!

آپ نے فرمایا: لیکن میں تجھے بتاتا ہوں:

”من اطاع الله عزوجل فيما امره من دعائه من جهة الدعاء اجابه“

”جو شخص خداوند متعال کی اس چیز میں دعا کرے جس میں اس نے دعا کا حکم دیا ہے،

اور اس میں جہتِ دعا کی رعایت کرے تو وہ اس کی دعا کو قبول کرے گا“

اس نے عرض کیا کہ: جہت دعا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: کہ پہلے تو خدا کی حمد کرے گا اور اس

کی نعمتوں کو یاد کرے گا، اس کے بعد شکر ادا کرے گا، اس کے بعد پینچہ پر درود بھیجے گا۔ پھر اپنے گناہوں کو دل میں لائے گا اور ان کا اقرار کرے گا، پھر اُن سے خدا کی پناہ مانگے گا اور توبہ کرے گا۔ یہ ہے جب دعا:

پھر آپ نے فرمایا: دوسری آیت کونسی ہے؟

اس نے عرض کیا: وہ یہ آیت ہے کہ اس نے فرمایا ہے:

”وما انفقت من شیء فہو یخلفہ و ہو خیر الرازقین“

لیکن میں خدا کی راہ میں انفاق کرتا ہوں، مگر وہ چیز جو اس کے بدلے میں دی جاتی ہے وہ مجھے نہیں ملتی۔

امام نے فرمایا: کیا تو یہ خیال کرتا ہے کہ خدا نے اپنے وعدے کے خلاف کیا؟

اس نے عرض کیا کہ: نہیں!

آپ نے فرمایا: کہ پھر ایسا کیوں ہے؟

اس نے عرض کیا کہ: میں نہیں جانتا!

آپ نے فرمایا: ”لو ان احدکم واکتسب المال من حله، وانفقہ فی حله،

لم ینفق درہماً الا اخلت علیہ“

اگر تم میں سے کوئی شخص کچھ حلال مال حاصل کرے، اور اُسے حلال طریقے سے

ہی خرچ کرے، تو وہ کوئی ایک درہم بھی ایسا خرچ نہیں کرتا مگر یہ کہ خدا اس کا عوض

اُسے دیتا ہے۔

۲۔ اموال کا خدائی بیمہ

ایک مفسر نے یہاں ایک عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے، وہ کتا ہے کہ:

تعجب کی بات یہ ہے کہ جب تاجر یہ جانتا ہو، کہ اس کے اموال میں سے کوئی مال تلف ہونے

والا ہے، تو وہ اس بات پر بھی تیار ہو جاتا ہے کہ اُسے ادھار کے طور پر فروخت کر دے، چاہے

بیٹے والا کوئی فقیر آدمی ہی ہو۔ وہ کتا ہے: یہ بات اس سے بہتر ہے کہ اس مال کو یونہی چھوڑ دوں

اور وہ نابود ہو جائے۔ اور اگر کوئی تاجر ان حالات میں اپنے مال کو فروخت کرنے

کا اقدام نہ کرے یہاں تک کہ وہ تلف اور نابود ہو جائے، تو اسے ”خط کار“

شمار کرتے ہیں۔

اور اگر ان حالات میں کوئی سرمایہ دار خریدار مل جائے اور وہ اس کے پاس فروخت نہ کرے تو اسے بے عقل کہتے ہیں۔

اور اگر ان تمام باتوں کے ساتھ وہ خریدار مضبوط مالی حیثیت رکھتے ہوئے ہر قسم کا وثیقہ اسے سپرد کر دے، اور ایک قابل اطمینان سند بھی اسے لکھ دے، اور وہ تاجر اس کے پاس نہ بیچے تو اس کو دیوانہ کہتے ہیں۔

لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ ہم سب یہی کام انجام دیتے ہیں اور کوئی اسے جہنم شمار نہیں کرتا۔

کیونکہ ہمارے تمام اموال معرض تلفت میں ہیں اور خواہ مخواہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ حالانکہ راہ خدا میں خرچ کرنا ایک قسم کا خدا کو قرض دینا ہے اور ایک بہت ہی معتبر ضمان، یعنی خدائے بزرگ فرماتا ہے کہ: (وما انفقتن من شیء فهو یخلفنہ) اور جو کچھ بھی تم خرچ کر دے گے وہ اس کا عوض دے گا۔ اور یہ اس حالت میں ہے جبکہ اُس نے اپنے اموال ہمارے پاس گروی رکھے ہوتے ہوں، کیونکہ جو کچھ انسان کے ہاتھ میں ہے وہ اس کی طرف سے عاریتہ ہے (اور) مکتب آسمانی میں سے ایک حکم ترین سند اس سلسلے میں اس نے ہمارے حوالہ کی ہوئی ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہم میں سے بہت سے اپنے اموال راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے، اور انہیں رہنے دیتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں، جس کے لیے نہ ہم کوئی اجر رکھتے ہیں نہ کوئی شکر لے۔

۳۔ "انفاق" کے مفہوم کی وسعت

اس بات کو جاننے کے لیے کہ "انفاق" کا مفہوم اسلام میں کس قدر وسیع ہے، ہمارے لیے حدیث ذیل کو مورد توجہ قرار دینا کافی ہے۔

پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

کل معروف صدقہ، وما انفق الرجل علی نفسه واهله کتب له صدقہ،
وما دق بہ الرجل عرضہ فهو صدقہ، وما انفق الرجل من نفقة فعلی اللہ
خلفها، الا ما کان من نفقة فی بنیان او معصیۃ۔

"ہر نیک کام جو کسی بھی شکل میں جو صدقہ ہے، اور راہ خدا میں انفاق شمار ہوتا ہے۔ (اور یہ بات مالی انفاق تک ہی منحصر نہیں ہے)۔"

"اور جو کچھ انسان اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضروریات زندگی میں صرف کرتا ہے وہ صدقہ لکھا جاتا ہے۔"

"اور جس کے ساتھ انسان اپنی آبرو کو محفوظ رکھتا ہے وہ صدقہ شمار ہوتا ہے۔"

"اور جو کچھ انسان راہ خدا میں انفاق کرتا ہے خدا اس کا عوض اسے دے گا سوائے اس کے کہ جو بناہ میں صرف ہو (مثلاً گھر بنانے میں) یا معصیت کی راہ میں صرف ہو۔"

مکن ہے کہ گھر کا استثناء اس لحاظ سے ہو کہ اس کی اصل باقی ہے علاوہ ازیں لوگوں کی زیادہ تر توجہ اس کی طرف ہوتی ہے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَنْ يَصُدَّ كُوعَمَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤَكُمْ ۗ وَقَالُوا مَا هَذَا إِلَّا أَفْكٌ مُّفْتَرَىٰ ۚ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ وَإِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

۲۲ وَمَا آتَيْنَهُمْ مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَذِيرٍ ۝

۲۵ وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَمَا بَلَّغُوا مَعَشَارَ مَا آتَيْنَهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرٍ ۝

ترجمہ

۲۲ جس وقت ہماری واضح آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ: یہ فقط ایک ایسا آدمی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں اس سے کہ جن کی تمہارے آباؤ اجداد پرستش کیا کرتے تھے روکے، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: یہ ایک بہت بڑے جھوٹ کے سوا کہ جو خدا پر باندھا گیا ہے اور کچھ نہیں ہے اور کافروں کے پاس جب حق پہنچا تو انہوں نے کہا کہ: یہ تو ایک کھلا جوا جادو ہے۔

۲۴ ہم نے (اس سے پہلے) کتب آسمانی میں سے کوئی چیز انہیں نہیں دی کہ جسے وہ پڑھیں (اور اس کا سہارا لے کر تیری تکذیب کریں) اور تجھ سے پہلے ہم نے

کوئی (بھی) پیغمبران کے لیے نہیں بھیجا۔

۲۵ وہ لوگ کہ جو ان سے پہلے تھے (انہوں نے بھی آیات خدا کی) تکذیب کی تھی، حالانکہ یہ (ان کی قدرت و طاقت کے) دسویں حصہ کو بھی نہیں پہنچے (ہاں) انہوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی، اب دیکھو! کہ میرا عذاب (ان کے لیے) کیسا تھا۔

تفسیر

کس دلیل کے ساتھ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں

گزشتہ آیات میں مشرکین اور بے ایمان افراد کی وضع و کیفیت کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں دوبارہ اس دنیا میں ان کی وضع و کیفیت کو بیان کرتے ہوئے قرآن سننے کے مقابلہ میں ان کے رد عمل کو بیان کیا جا رہا ہے، تاکہ یہ بات واضح و روشن ہو جائے کہ قیامت میں ان کا وہ بڑا انجام دنیا میں آیات الہی کے مقابلہ میں اس غلط تنقید اور طرز عمل کے باعث ہوگا۔

پہلے کہتا ہے: جس وقت ہماری واضح کرنے والی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ مرد تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہیں اس سے کہ جس کی تمہارے بڑے عبادت کرتے تھے باز رکھے۔ (واذا تلتی علیہم آیاتنا بیتیات قالوا ما هذا الا رجل یرید ان یصدکم عما کان یعبدا ابیا وکوم)۔

ان "آیات بیتیات" کے مقابلہ میں ان کا یہ پہلا رد عمل تھا، کہ جو وہ اس متعصب قوم میں تعصب کے احساس کو تحریک کرنے کے لیے پیش کرتے تھے۔

خصوصاً "ابا وکوم" (تمہارے آباؤ اجداد) کی تعبیر "ابائنا" (ہمارے آباؤ اجداد) کے بجائے زیادہ تر اسی بنا پر ہے تاکہ اس متعصب قوم کو سمجھائیں کہ تمہارے بزرگوں کی میراث خطرے میں ہے، لہذا تم کھڑے ہو جاؤ اور اس شخص کو اس کام سے روکو۔

"ما هذا الا رجل" کی تعبیر دو لحاظ سے پیغمبر کی تحقیر و توہین ہے ایک لفظ "هذا" (یہ) اور دوسرا "رجل" (مرد) نگرہ کی صورت میں، درآئیں ایک وہ سب کے سب پیغمبر کو اچھی طرح سے اس کے سابقہ واضح روشن کارناموں کی وجہ سے پہچانتے تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن "آیات" کی "بینات" کے ساتھ توصیف کرتا ہے یعنی اس کی حقانیت کی دلیلیں اس کے ساتھ ہیں اور جب بات عیاں ہو تو بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ان کی اُس دوسری گفتگو کو جو وہ پیغمبر کی دعوت کو باطل کرنے کے لیے پیش کرتے تھے بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) ایک بڑے جھوٹ کے سوا کہ جو خدا پر بانڈھا گیا ہے اور کچھ نہیں ہے" (وقالوا ما هذا الا افك مفتری)۔

"افك" (بروزن فکر) جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، کہ یہ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی اصلی صورت سے بدل ہوئی ہو، اسی لیے مخالفت بڑاؤں کو "مؤلفکات" کہتے ہیں، اس کے بعد جھوٹ، تمسٹ اور ہر قسم کی غلط بات کو "افک" کہا گیا، لیکن بعض کے قول کے مطابق "افک" ہٹ ٹسے جھوٹ کے لیے بولا جاتا ہے۔

بادجو اس کے کہ پیغمبر کو جھوٹ کے متہم کرنے کے لیے "افک" کی تعبیر کافی تھی، لیکن وہ لفظ "مفتوی" کے ذریعہ اس میں مزید تاکید پیدا کرتے تھے، جبکہ ان کے پاس اپنے اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں تھی۔

آخر میں تیسرا اہتمام جو انہوں نے پیغمبر پر بانڈھا "سحر" (جادو) کی تمسٹ تھی، جیسا کہ زیر بحث آیت کے آخر میں بیان ہوا ہے: "وہ لوگ کہ جو کافر ہو گئے، جس وقت حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ چیز سوائے واضح جادو کے اور کچھ نہیں" (وقال الذین کفرو والحق لهما جاثم ان هذا الا سحر مبین)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ گراہ گردہ اپنی تینوں تمسٹوں کو صریح ترین تاکید کے ساتھ اسی صحر کے ذریعہ بیان کرتے تھے، ایک جگہ کہتے تھے یہ فقط سحر ہے دوسری جگہ کہتے تھے، یہ فقط جھوٹ ہے اور آخر میں تیسری جگہ کہتے تھے کہ: وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے بزرگوں کے معبودوں سے روک دے۔

یقیناً یہ تینوں ناروا نسبتیں آپس میں متضاد نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ ضد و نقیض گفتگو سے انکار نہیں رکھتے تھے۔ اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق ہم ان تمسٹوں میں سے ہر ایک کو کافروں کے ایک گردہ سے نسبت دیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے پہلے اور دوسرے مرحلے میں لفظ "قالوا" کا استعمال کیا ہے لیکن تیسرے مرحلے میں اس کے بجائے (قال الذین کفرو) کا جملہ استعمال کیا ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ بد بختیاں کفر، حق کے انکار اور حقیقت کے ساتھ دشمنی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ورنہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان کسی دلیل کے بغیر ان تمام تمسٹوں کو یکے بعد دیگرے ایسے مرد کی طرف منسوب کرے

جس کی حقانیت کے دلائل اس کی گفتگو، اس کے عمل اور اس کے سابقہ کارناموں سے واضح ہیں۔ گویا وہ ان تینوں تمسٹوں کے ساتھ پیغمبر کے ساتھ مبارزہ کرنے میں ایک سوچے سمجھے پروگرام کو رد بہ عمل لاتے تھے، ایک طرف وہ یہ دیکھتے تھے کہ یہ ایک نیا دین و آئین ہے، اور اس میں جذب و کشش موجود ہے۔

دوسری طرف، پیغمبر کی دنیا و آخرت میں عذاب الہی سے تمہید خواہ خواہ ایک گردہ کو وحشت زدہ بناتی تھی

اور تیسری طرف پیغمبر کے معجزات خواہ خواہ عام لوگوں کے نفوس میں اثر انداز ہوتے تھے۔ انہوں نے ان تینوں موضوعات کو بے اثر کرنے کے لیے ایک نہ ایک تدبیر سوچ رکھی تھی، اس نئے دین و آئین کے مقابلہ میں اپنے گزرے ہوئے بزرگوں اور آباؤ اجداد کی میراث کی حفاظت کے سلسلہ کو سامنے لے آتے حالانکہ ان کے گزرے ہوئے بزرگوں اور آباؤ اجداد کی میراث کی حفاظت کے سلسلہ بھتدون، "کچھ نہیں سمجھتے تھے اور ہدایت یافتہ نہیں تھے" کے مصداق تھے۔ (بقرہ - ۱۷۰)

اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے کہ لوگوں کو اس قسم کی بیوہ رسومات سے کہ جو بے وقوف جاہلوں کی میراث ہیں بے باز رکھے۔

اور عذاب الہی سے پیغمبر کی تمہیدوں کے مقابلہ میں دروغ گوئی اور جھوٹ کا مسلہ گھڑ کے تیار کر لیا تھا تاکہ عامۃ الناس کو خاموش کر سکیں۔

اور معجزات کے مقابلہ میں "سحر" (جادو) کی تمسٹ لگاتے تھے، تاکہ اس کی اس ذریعہ سے توجیہ کر کے لوگوں کو اس کے سامنے جھکنے سے باز رکھیں۔

لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں اور تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے، کہ ان شیطانی دوسوں میں سے کوئی بھی مؤثر نہ ہوا، اور آخر کار لوگ فوج در فوج اس آئین و دین پاک میں داخل ہوئے۔



قرآن بعد دالی آیت میں ان کے تمام دعووں پر خط بطلان کھینچ دیتا ہے اگرچہ بغیر کسی بیان کے بھی ان کا بطلان واضح ہے، ان کے تمام فضول اور بیوہ دعووں کا ایک ہی جملہ کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہتا ہے: "ہم نے اس سے پہلے آسمانی کتابوں میں سے کوئی چیز انہیں نہیں دی ہے کہ جسے وہ پڑھ کر اس کی بنیاد پر تیری دعوت کا انکار کریں، اور تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر بھی ہم نے ان کے لیے نہیں بھیجا" (وما آتینا ہم من کتب یدرسونہا وما ارسلنا الیہم قبلک من نذیر)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دعوے ایسا شخص کر سکتا ہے کہ جس کے پاس پہلے کوئی پیغمبر آیا ہو اور آسمانی کتاب اس کے پاس لے کر آیا ہو۔ اور ذہ نئی دعوت کے مضمون کو اس کے مخالف

پاتا ہو، لہذا اس کی تکذیب کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے، کبھی تو وہ یہ کہتا ہے کہ تمہارے بزرگوں کا دین تمہارے ہاتھ سے نہ جانے پائے، اور کبھی یہ کہتا ہے کہ یہ نئی دعوت جھوٹی ہے اور کبھی اس کے لانے والے کو ساحر اور جادوگر کہتا ہے۔

لیکن وہ شخص کہ جس نے اپنی فکر پر تکیہ کرتے ہوئے۔ کسی قسم کی آسانی دہی کے بغیر۔ کچھ بھی علم نہ رکھنے کے باوجود، خرافات کو دل سے گھڑ لیا ہے، اس قسم کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس آیت سے ضمنی طور پر اس نکتہ کا استفادہ ہوتا ہے، کہ انسان صرف اپنی قوت عقل کے بل بوتے پر زندگی کی نشیب و فراز سے بڑراہ طے نہیں کر سکتا، بلکہ اُسے دہی کی قوت سے مدد لینا چاہیئے اور خضر رسالت کی مدد سے قدم اٹھانا چاہیئے، ورنہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے کہ جس میں گمراہ ہو جانے کے خطرے سے ڈرنا ضروری ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں اس سرکش گردہ کو ایک موثر اور بیخ بیان کے ساتھ تہدید کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: ”وہ لوگ کہ جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے بھی آیات الہی کی تکذیب کی تھی“ (و کذب الذین من قبلہم)۔

”در انحالیکہ یہ لوگ قوت و قدرت کے لحاظ سے اس قوت کے دسویں حصہ کو بھی نہیں پہنچے کہ جو ہم نے گزشتہ اقوام کو دی تھی“ (وما بلغوا معشار ما اتیناہم)۔

لیکن دیکھو! ان کا انجام کیا ہوا؟ ہاں! انہوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی تھی، تو دیکھ لو میرا عذاب ان کے لیے کس طرح کا تھا؟ (فکذبوا رسلی فکیف کان نکیر)۔

ان کے ویران شدہ شہر جو سرکوبی کرنے والے عذاب الہی کی ضربوں کے ذریعہ تباہ و برباد ہوئے تھے، تمہارے نزدیک ہی اور شام کی طرف جا۔ تے ہوئے تمہارے راستے میں پڑتے ہیں، اُن سے عبرت حاصل کرو، اور ان ویرانوں کی زبان سے ضروری و لازمی پند و نصائح سنو، اور اپنے انجام کا اس پر قیاس کر دیکھو کہ نہ تو سنت الہی تیرے پذیر ہے، اور نہ ہی تم اُن سے رتر ہو۔

”معشار“ ”عشر“ کے مادہ سے ہے اور وہی معنی (دسواں حصہ) یا ہے۔

بعض نے اس کو ”عشر عشر“ کے معنی، یعنی سواں حصہ، دلیا ہے، لیکن زیادہ تر کتب لغت و تفسیر نے اس پہلے معنی کو ہی ذکر کیا ہے، لیکن بہر حال اس قسم کے اعداد و تعدادی پہلو نہیں رکھتے اور تقلیل کے لیے ہیں، سات، ستر اور ہزار کے مقابلہ میں کہ جو تکثیر کے لیے ہیں۔

اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ ہم نے تو ایسے ایسے سرکشوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے، جبکہ یہ تو ان کی قدرت کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی نہیں رکھتے۔

اس معنی کی مثال قرآن کی دوسری متعدد آیات میں بھی وارد ہوئی ہے، مجملہ ان کے سوکھ انعام کی آیت ۶ میں بیان ہوا ہے کہ: ”العیروا کما اهلکنا من قبلہم من قرن مکنناہم فی الارض مالعون لکم وارسلنا السماء علیہم مدرارًا وجعلنا الانہار تجری من تحتہم فاہلکناہم بذنوبہم وانشأنا من بعدہم قرنًا اخرین“ ”کیا انہوں نے اس بات کا مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے گزشتہ اقوام میں سے کتنوں کو ہلاک کیا ہے، ایسی اقوام کہ جو تم سے زیادہ طاقتور تھیں انہیں ہم نے ایسے وسائل عطا کیے تھے کہ جو تمہیں نہیں دیئے، ہم نے ان کے لیے درپے درپے بارشیں برسائیں اور ان کے باغوں کے درختوں کے نیچے ہم نے نہریں جاری کر رکھی تھیں، لیکن جس وقت انہوں نے سرکشی اختیار کی، تو ہم نے ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں نیست و نابود کر دیا، اور ان کے بعد ہم ایک دوسرا گردہ وجود میں لے آئے“

اسی معنی کی مثال سورہ مومن کی آیت ۲۱ اور سورہ روم کی آیت ۹ میں بھی وارد ہوئی ہے۔

”نکیر“ کا لفظ انکار کے مادہ سے ہے، اور انکار ہی کے معنی میں ہے، اور خدا کے انکار کرنے سے مراد وہی سزا اور عذاب ہے۔

بعض مفسرین نے ایک اور خیال کا بھی اظہار کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ”وما بلغوا معشار ما اتیناہم“ کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ ہم نے تمام حجت کے لیے گزشتہ اقوام کے اختیار میں ان آیات کا دسواں حصہ بھی قسرا نہیں دیا تھا کہ جو مشرکین قریش کے اختیار میں دی ہیں، تو جب گزشتہ لوگوں کو ہم نے اتنا سخت عذاب کیا ہے تو پھر مشرکین قریش کی حالت کہ جن پر ان سے دس گنا زیادہ تمام حجت لیا ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ پہلی تفسیر کے مطابق آیت میں جو چار ضمیر ہیں ان میں سے پہلی اور دوسری ضمیر تو کفار قریش کی طرف لوٹتی ہے اور تیسری اور چوتھی گزشتہ مشرکین کی طرف، لیکن دوسری تفسیر کے مطابق پہلی مشرکین قریش اور دوسری گزشتہ کفار تیسری مشرکین قریش اور چوتھی گزشتہ کفار کی طرف لوٹتی ہے۔ (خوریجئے)

(۲۶) قُلْ إِنَّمَا أَعْظَمُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ إِنَّ تَقْوَمُ وَا
لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفِرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُونَ ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ
مِّنْ جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ
عَذَابٍ شَدِيدٍ ۝

ترجمہ

(۲۶) کہہ دے کہ میں تو تمہیں صرف ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں، کہ تم دو دو افراد (مل کر) یا ایکلے ایکلے ہی خدا کے لیے کھڑے ہو جاؤ، اس کے بعد غور کرو اور سوچو (کہ) یہ تمہارا دوست اور ساتھی (محمدؐ) کسی قسم کا بھی جنون نہیں رکھتا، وہ تو صرف (خدا کے) سخت عذاب سے تمہیں ڈرانے والا ہے۔

تفسیر

انقلاب فکری ہر اصل انقلاب کی بنیاد ہے

آیات کے اس حصہ میں اور آئندہ آیات میں کہ جن میں اس سورہ کے آخری مباحث بیان ہوئے ہیں، پیغمبر اسلام کو ایک بار پھر حکم دیا ہے، کہ اب ان لوگوں کو مختلف دلائل کے ذریعہ حق کی طرف دعوت دیں، اور گمراہی سے روکیں، اور گزشتہ مباحث کی طرح پانچ مرتبہ پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "ان سے کہہ دے۔" (قل.....)

پہلی آیت میں تمام اجتماعی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور فزیکل تغیرات اور تبدیلیوں کے اصل خمیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہت ہی مختصر اور پُر معنی جملوں میں کہتا ہے کہ: "ان سے کہہ دو کہ میں تو تمہیں صرف ایک ہی چیز کے بارے میں نصیحت کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ تم خدا کے لیے کھڑے

ہو جاؤ۔ دو، دو افراد (مل کر) یا ایک ایک فرد (ایکلے ایکلے ہی) اور پھر غور و فکر کرو" (قل انما اعظکم بواحدة ان تقوموا لله مشئى وفراذى مشئى تتفكروا)۔

"یہ تمہارا دوست اور ساتھی (محمدؐ) کسی قسم کی فکری گجی اور جنون نہیں رکھتا" (ما بصاحبکم من جنۃ)۔

• بلکہ وہ تو صرف تمہیں خدا کے سخت عذاب سے ڈرانے والا ہے" (ان هو الا نذیر لکم بین یدى عذاب شدید)۔

اس آیت کے کلمات و تعبیرات میں سے ہر ایک ایک اہم مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں سے دس نکات ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

۱- "اعظکم" (میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں) کا جملہ حقیقت میں اس واقعیت کو بیان کرتا ہے کہ اس گفتگو میں مجھے تمہاری خیر و صلاح مطلوب ہے نہ کہ کوئی اور دوسرا مسئلہ۔

۲- "واحدة" (صرف ایک ہی بات) کی تعبیر، خصوصاً "انما" کی تاکید کے ذریعہ اس واقعیت کی طرف ایک بولتا ہوا اشارہ ہے، کہ تمام انفرادی اور اجتماعی اصلاحات کی بنیاد فکر اور سوچ کو اہم عمل لانا ہے جب تک کسی قوم و ملت کی سوچ اور فکر سوتی ہوتی ہے اس وقت تک وہ قوم و ملت دین و ایمان اور آزادی و استقلال کے چوروں اور ڈاکوؤں کے حلوں کی زد میں رہتی ہے بلکہ جس وقت افکار بیدار ہو گئے، تو ان کے اوپر راستے بند ہو جاتے ہیں۔

۳- یہاں "قیام" کرنے کی تعبیر دو پاؤں پر کھڑے ہونے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ کام کو انجام دینے کی آمادگی کے معنی میں ہے، کیونکہ انسان جب اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے، تو وہ اپنی زندگی کے مختلف پروگراموں کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہوتا ہے، اس بنا پر غور و فکر کرنا پہلے سے آمادگی کا محتاج ہوتا ہے کہ جس سے انسان میں وہ حرکت اور تیاری وجود میں آتی ہے جس سے وہ پختہ ارادہ کے ساتھ غور و فکر کرنے لگتا ہے۔

۴- "لله" کی تعبیر اس معنی کو بیان کرتی ہے کہ قیام اور آمادگی میں خدائی جذبہ ہونا چاہیے، اور وہ سوچ جس کی تحریک اس طرح سے ہوتی ہے، اصولی طور پر کاموں میں خلوص، یہاں تک کہ سوچنے اور غور و فکر کرنے میں بھی نجات اور برکت کا سبب ہوتا ہے۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ "اللہ" پر ایمان کا ہونا یہاں پر تسلیم شدہ مانا گیا ہے، اس بنا پر دوسرے مسائل کے لیے غور و فکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توحید ایک فطری امر ہے کہ جو بغیر کسی غور و فکر کے بھی واضح و روشن ہے۔

۵- "مثنیٰ و فرادی" (دو دو یا ایک ایک) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غور و فکر

شور و غل سے دُور ہو کر کرنا چاہیے۔ لوگوں کو ایک ایک کر کے اکیلے ہی یا زیادہ سے زیادہ دو دو مل کر قیام کرنا چاہیے اور اپنی سوچ بچار اور فکر کو کام میں لانا چاہیے، کیونکہ شور و غوغا کے درمیان سوچ و بچار گھرا اور عمیق نہیں ہوگا، خصوصاً جبکہ مجمع اور بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اپنے اعتقاد سے دفاع اور اس کی حمایت میں خود خواہی اور تعصب کے عوامل زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس احتمال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ دونوں تعبیریں اس بنا پر ہیں چونکہ "انفرادی" اور "اجتماعی" افکار یعنی شور سے کی آمیزش کو اپنے ساتھ لیے ہوئے ہوتے ہیں، لہذا انسان کو چاہیے کہ ایک تو تنہائی میں سوچ بچار کرے اور دوم دوسروں کے افکار سے بھی فائدہ اٹھائے، کیونکہ فکر درانے میں ابتداء و استقلال تباہی کا باعث ہوتا ہے اور ہفکری اور علمی مشکلات کے حل کے لیے کوشش کرنا ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ، جہاں بات شور و غوغا تک نہ پہنچے وہاں پر قابل اطمینان حد تک اس کا بہتر اثر ہوتا ہے اور شاید اسی بنا پر منشی کو فرادہ پر مقدم رکھا ہے۔

۶۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن یہاں کہتا ہے، "تتفکروا" (غور و فکر کرو) لیکن کس چیز میں؟ اس لحاظ سے یہ مطلق ہے اور اصطلاح کے مطابق "متعلق کا حذف ہونا عمومیت پر دلالت کرتا ہے یعنی ہر چیز میں، عمومی زندگی میں، مادی زندگی میں، اہم مسائل میں، اور چھوٹے سے چھوٹے مسائل میں خلاصہ یہ کہ ہر کام میں پہلے غور کرنا چاہیے، لیکن سب سے زیادہ اہم، ان چار سوالات کے جواب معلوم کرنے کے لیے سوچ بچار کرنا چاہیے:

میں کہاں سے آیا ہوں؟ میں کس لیے آیا ہوں؟ میں کہاں جا رہا ہوں؟ اور اب میں کہاں ہوں؟

لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "تفکر" کا متعلق یہاں اس کے بعد کا جملہ: (ما یصاحبکم من جنت) ہے، یعنی اگر تم تھوڑا سا بھی غور و فکر کرو تو تمہیں اچھی طرح سے معلوم ہو جائے گا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنوں کے سلسلے میں تمہارے بیوردہ اہتمام سے پاک و منزه ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ واضح نظر آتا ہے۔

لیکن مسئلہ طور پر جملہ ان امور کے کہ جن میں غور و فکر کرنا چاہیے یہی مسئلہ نبوت اور برجستہ (عمد) صفات کا مسئلہ ہے کہ جو پیغمبر اسلام کی ذات اور ان کی عقل و خرد میں موجود تھیں، بغیر اس کے کہ (یہ غور و فکر کرنا) انہیں میں منحصر ہو۔

۷۔ "صاحبکم" (تمہارا ساتھی اور دوست) کی تعبیر پیغمبر کی ذات کے بارے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ آپ اُن کے غیر معروف اور ناشناختہ نہیں ہیں، آپ ان کے درمیان ساہماں سال رہے ہیں، انہیں امانت و درایت اور صدق و راستی کے ساتھ تم نے پہچانا ہے، اب تک تم

نے ان کی زندگی کے نامہ عمل میں کوئی کمزوری کا نقطہ مشاہدہ نہیں کیا ہے، تو اس بنا پر انصاف سے کام لو۔ جو اہتمامات تم ان پر باندھ رہے ہو وہ سب کے سب بے بنیاد ہیں۔

۸۔ "چشتہ" جنوں کے معنی میں اصل میں مادہ (جن) بروزن نطن سے ستر و پوشش کے معنی میں ہے، اور چونکہ جنوں کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ گویا اس کی عقل چھپی ہوئی ہے اور اس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ لہذا یہ تعبیر اس کے بارے میں استعمال ہوتی ہے۔ بہر حال قابل ملاحظہ نکتہ یہاں یہ ہے کہ گویا وہ اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ سوچ بچار اور فکر کی بیداری کی دعوت دینے والا خود جنوں ہو۔ جبکہ وہ سوچ بچار اور فکر کرنے کی منادی کر رہا ہے۔ اس کی یہی بات اس کی انتہائی عقل و درایت کی دلیل ہے۔

۹۔ "ان هو الا نذیر لکم" کا جملہ پیغمبر کی رسالت کو مسئلہ انذار میں خلاصہ کرتا ہے، یعنی خدا کی دادگاہ میں جو ابد ہی اور اس کے عذاب سے ڈرانا، یہ ٹھیک ہے کہ پیغمبر بشارت کی رسالت بھی رکھتا ہے لیکن جو چیز انسان کو زیادہ سے زیادہ حرکت پر ابھارتی ہے وہ مسئلہ انذار ہے۔ اسی لیے قرآن کی بعض دوسری آیات میں بھی پیغمبر کی تنہا ذمہ داری کے طور پر ذکر ہوا ہے، مثلاً سورہ احقاف کی آیہ ۹ میں: (وما انا الا نذیر مبین) "میں ایک واضح انذار کرنے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں" اسی معنی کی نظیر سورہ ص کی آیہ ۴۵ اور دوسری آیات میں بھی آئی ہے۔

۱۰۔ "بین یدی عذاب شدید" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت اس قدر نزدیک ہے کہ گویا تمہارے چہرے کے سامنے ہے، اور پرجہ دنیا کی عمر کے مقابلہ میں وہ اسی طرح ہے، یہ تعبیر اسلامی روایات میں بھی آئی ہے کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا:

"بعثت انا والساعة کھاتین" (وضم ص) الوسطی والسبابة)۔ میری بعثت اور قیامت قیامت ان دو کی طرح ہے۔ اس کے بعد آپ نے انکشت شہادت اور درمیانی انگلی کو ایک دوسری سے ملا دیا۔

چند نکات

۱۔ تمام انقلابات کی جڑ بنیاد

مادی اور کیمونسٹ مکاتب فکر کہ جو ہمیشہ سچے مذاہب کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے رہتے ہیں وہ ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ادیان کی دعوت اصل میں عوام الناس کے افکار کو بگاڑ کرنے

کے مترادف ہے۔ ان کی یہ رسوا تعبیر کہ "دین عوام ان س کے لیے ایفون ہے" مشہور و معروف ہے۔ اسی طرح شرق و مغرب کے سارا جی اس خوف و ہراس کی وجہ سے جو وہ مومنین کے قیام اور ان کے افکار مذہبی اور راہ خدا میں شہادت کو قبول کرنے کے ضمن میں رکھتے ہیں یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے ماہرین نفسیات اور اسکالرز کو اس مطلب کی تلقین کریں کہ وہ اپنی اپنی اصطلاح میں — اپنی علمی کتابوں میں انہیں بیان کریں کہ مذہب طبعی طور پر انسانی جمالت اور نادانی کی پیداوار ہے۔

البتہ یہ ایک وسیع بحث ہے، اور اپنی جگہ پر انہیں دو ٹوک اور دندان شکن جواب دیئے گئے ہیں، کہ ان سب کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ لیکن زیر بحث آج کی مانند بہت سی آیات کہ جو غور و فکر اور سوچ بچار کی طرف دعوت دیتی ہیں — بلکہ دین کا نچوڑ اور انسان کی پیش رفت اور تکامل و ارتقاء کا سبب اسی غور و فکر کو جانتی ہیں — ان جھوٹ اور افتراء باندھنے والوں کا سارا پل کھول کر دکھ دیتی ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام جیسا دین و آئین بے حس یا ش کر دینے کا ذریعہ یا جمالت کی پیداوار ہو۔ حالانکہ اس کا لانے والا اپنی بلند آواز کے ساتھ تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: ہونے ہوئے افکار کو بیدار کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہو اور قیام کرو۔ اور وہ بھی ایسے ماحول میں جو پُر سکون اور شور و غوغا سے خالی ہو۔

ایسے ماحول میں کہ جو ہواد ہوس اور مسموم اور زہریلے پروپیگنڈے سے دور ہو۔

تعبصات سے دور ہو، جھگڑوں اور ہٹ دھرمیوں سے دور ہو۔

خدا کے لیے قیام کرو اور غور و فکر کرو۔

کہ سیری طرف سے تمہیں ہی تنہا وعظ و نصیحت ہے۔ اور بس۔

جیسا کہ اس قسم کے دین کو کہ جو نہ صرف اس مقام پر بلکہ بہت سے دوسرے مقامات پر بھی اسی دعوت کو دہراتا ہے، افکار کو سن کرنے والے اور نشتر آور کے ساتھ متم کرنا، مضحکہ خیز اور حقہ لگانے والی بات نہیں ہے؟!

خاص طور پر یہ بات کہ وہ کہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ تم اکیلے تنہائی اور انفرادی طور پر غور و فکر کرو، بلکہ دو دو افراد کی شکل میں، اور ایک دوسرے سے تعاون اور معاونت کی صورت میں بھی غور و فکر کرنے میں مشغول رہو، انبیاء کی دعوت کے مطالب و مضامین کو سنو، ان کے دلائل کا بغور مطالعہ کرو، اگر وہ تمہاری عقل کے ساتھ ہم آہنگ ہوں تو اسے قبول کرو۔

ہمارے زمانہ میں شرق و مغرب کی تباہ کن جہنی طاقتوں اور قدرتوں کے مقابلہ میں جو حوادث، مختلف ممالک میں، انقلابی مسلمانوں کے قیام کی وجہ سے رونما ہوئے، انہوں نے مستکبرین کی نگاہ میں دنیا کو تیرہ و تار یک کر کے رکھ دیا ہے۔ اور ان کی طاقت و قدرت کی بنیادوں کو ہلاکے رکھ دیا ہے ان حوادث

نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ وہ یعنی مستکبرین اچھی طرح سے اس نکتہ کو سمجھ چکے تھے کہ ان کے سخت ترین دشمن (مسلمان) کے اصل مذہبی عقائد ان کے لیے عظیم خطرہ ہیں، اور انہوں نے یہ بھی نشاندہی کر دی کہ ان اتہامات کا ہدف و مقصد کہ جو مذہب کے بارے میں کیے گئے ہیں کیا ہے؟

واقعاً عجیب بات ہے کہ مغربی فلسفی مردم شناسی کی اصطلاح کی تحلیلوں اور تجزیوں میں اس مسئلہ کو تسلیم سمجھتے ہیں کہ مادہ اور طبیعت یعنی اس دنیا کے اوپر کوئی عالم نہیں ہے۔ اور دین فروع بشر کی ایک خود ساختہ چیز ہے، پھر اس مسئلہ کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ اس کا عامل کیا ہے؟ اقتصاد کی مسائل ہیں؟ انسانوں کا خوف ہے؟ بشر کی لاعلمی اور عدم آگاہی ہے؟ روحانی عقدے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ؟

لیکن وہ اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ایک لمحہ کے لیے ہی اس پہلے سے کیے ہوئے اپنے غلط فیصلہ سے خالی ہو کر فکر کریں کہ عالم طبیعت یعنی اس کائنات کے علاوہ ایک اور عالم ہے اور توحید کی روشن دلیلوں اور حضرت محمد جیسے انبیاء کی نبوت کی آشکار اور واضح نشانیوں میں سوچ بچار سے کام لیں۔

یہ لوگ زمانہ جاہلیت کے مشرکین سے ملتے جلتے ہیں اس فرق کے ساتھ کہ وہ تو متعصب اور ہٹ دھرم تھے اس صورت میں کہ وہ ان پڑھ تھے، یہ متعصب اور ہٹ دھرم ہیں پڑھے لکھے ہونے کے باوجود، اسی بنا پر زیادہ خطرناک اور زیادہ گمراہ کن ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات کا آخری حصہ تفکر، تعقل اور تدکر کی دعوت ہے۔

بھی کہتا ہے: "ان فی ذالک لآیۃ لقوم یتفکرون" (نمل - ۱۱ - ۴۹)۔

اور بھی کہتا ہے کہ: "ان فی ذالک لآیۃ لقوم یتفکرون" (زمر - ۳ - ۲۲ اور جاثیہ - ۱۳)۔

اور بھی کہتا ہے: "لعلہم یتفکرون" (حشر - ۲۱، اعراف - ۱۷۶)۔

اور بھی اس جگہ کو دوبارہ خطاب کی صورت میں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کذالک یتبین اللہ

لکم الایۃ لعلکم تتفکرون"

"اس طرح سے خدا تمہارے لیے اپنی آیات کو بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور و فکر کرو"

(لقمہ - ۲۱۹ - ۲۶۶)۔

اسی طرح کے جملے قرآن میں بہت زیادہ ہیں، مثلاً قرآن کی بہت سی آیات میں "فکر" (فہم) کی دعوت دی گئی ہے، عقل و تعقل کی دعوت اور ان افراد کی تعریف کی گئی ہے جو اپنی عقل کو استعمال کرتے ہیں، اور ان کی مذمت کہ جو اپنی فکر کو استعمال نہیں کرتے، یہ بات قرآن مجید کی ۴۶ آیات میں وارد ہوئی ہے۔

علماء اور دانشمندیوں اور علم و دانش کے مقام و مرتبہ کی اتنی زیادہ تعریف و توصیف کی ہے کہ اگر ہم ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے ان کی تفسیر کریں تو وہ خود ایک مستقل کتاب بن جاتے۔

اس سلسلہ میں بس اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن دوزخیوں کی صفات میں سے ایک صفت تفکر و عقل نہ کرنے کو بیان کرتا ہے: "وقالوا لو كنا نسمع أو نعقل ما كنا في اصحاب السعير" (دوزخی کہیں گے کہ اگر ہم سننے والے کان اور بیدار عقل رکھتے ہوتے تو دوزخیوں میں سے نہ ہوتے)۔ کیونکہ دوزخ میں صاحبان عقل کی جگہ نہیں ہے۔ (ملک - ۱۰)

اور ایک اور دوسری جگہ پر لکھا ہے: اصولی طور پر وہ لوگ کہ جو کان رکھتے ہیں لیکن سننے نہیں، آنکھ رکھتے ہیں لیکن دیکھتے نہیں، اور عقل رکھتے ہیں لیکن سوچتے نہیں، وہ جہنم کے لیے نامزد ہو گئے ہیں۔ "ولقد ذرأنا لجهنم كشيئاً من الجن والانس لهم قلوب لا يفقهون بيها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم اذان لا يسمعون بها اولئك كالانعام بل هم اضل اولئك هم الغافلون"

"یقیناً جنوں اور انسانوں کے بہت سے گروہ جہنم کے لیے قرار دے دیئے ہیں۔ ان کی نشانی یہ ہے کہ وہ عقل رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ سوچتے نہیں، آنکھ رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں لیکن ان کے ساتھ سننے نہیں، وہ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ وہی تو اصل غافل ہیں" (اعراف - ۱۷۹)

۲- غور و فکر کے سلسلے میں روایات اسلامی

روایات اسلامی میں قرآن کی پیروی کرتے ہوئے غور و فکر کا مسئلہ اہمیت کے اعتبار سے درج اول میں قرار پاتا ہے، اور بہت ہی بلیغ اور پرکشش تعبیرات اس سلسلہ میں دکھائی دیتی ہیں، کہ جن کے کچھ نمونے ہم یہاں پر پیش کرتے ہیں:

الف - غور و فکر کرنا عظیم ترین عبادت ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے:

"ليس العبادة كثرة الصلاة والصوم انما العبادة التفكير في امر الله عز وجل"

(عبادت نماز و روزہ کی کثرت میں نہیں ہے، عبادت واقعی تو خداوند تعالیٰ کے کاموں کو

جہاں آفرینش کے کاموں میں غور و فکر کرنا ہے)۔

لے اصول کافی جلد ۲ کتاب "الکفر والایمان" باب "التفکر" (ص - ۳۵)۔

ایک دوسری روایت میں یہ منقول ہوا ہے:

"كان اكثر عبادة ابي ذر التفكير"

(ابو ذر کی زیادہ تر عبادت غور و فکر اور سوچ بچار کرنا تھا)۔

ب - ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک رات کی عبادت سے بہتر ہے۔

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک شخص نے آپ سے سوال کیا کہ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ:

"تفكر ساعة خير من قيام ليلة"

ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک رات بھر عبادت کرنے سے بہتر ہے۔

اس سے کیا مراد ہے اور غور و فکر کس طرح کرنا چاہیئے؟

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

"يمر بالخرية او بالدار فيقول اين ساكنوك اين بائوك مالك لا تتكلمين"

جب تو کسی دیرانے کے پاس سے گزرتا ہے، یا کسی ایسے گھر کے پاس سے (کہ جو اپنے بسنے والوں سے خالی ہو) گزرتا ہے تو کہتا ہے: تجھ میں رہنے والے کہاں گئے؟ تیری بنیاد رکھنے

والوں کا کیا ہوا؟ تو بولتا کیوں نہیں؟

ج - غور و فکر سرچشمہ عقل ہے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان التفكير يدعوا الى البر والعمل به"

"غور و فکر کرنا نیکی اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے"

لے سفینۃ البحار، جلد ۲، ص ۳۸۳، مادہ فکر۔

لے مددک مذکورہ۔

لے سفینۃ البحار، جلد ۲، ص ۳۸۳، مادہ فکر۔

۴۶ قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ○

۴۸ قُلْ إِنْ رَبِّي يَشَاءُ بِالْحَقِّ عَلَامَ الْغُيُوبِ ○

۴۹ قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِيُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ ○

۵۰ قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فِيمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ○

ترجمہ

۴۶ کہہ دے کہ: جو اجر اور بدلہ میں نے تم سے مانگا ہے وہ خود تمہارے ہی لیے ہے میرا اجر تو صرف خدا پر ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

۴۸ کہہ دے کہ: میرا پروردگار حق کو (اپنے پیغمبروں کے دل پر) ڈالتا ہے۔ کیونکہ وہ علام الغیوب (اور تمام پوشیدہ اسرار سے واقف و آگاہ) ہے۔

۴۹ کہہ دے کہ: حق آگیا ہے اور باطل (سے کچھ نہیں ہو سکتا) نہ تو کسی چیز کا آغاز ہی کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تجدید۔

۵۰ کہہ دے کہ: اگر میں گمراہ ہوں تو میں خود اپنی طرف سے گمراہ ہوں گا اور اگر ہدایت یافتہ ہو جاؤں تو وہ اس وحی کے وسیلہ سے ہدایت حاصل کرتا ہوں کہ جو میرا پروردگار میری طرف کرتا ہے، وہ سننے والا اور نزدیک ہے۔

تفسیر

باطل سے کوئی کام نہیں ہوتا

ہم بیان کر چکے ہیں کہ خدا آیات کے اس سلسلے میں پانچ مرتبہ اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ ان بے ایمان گمراہوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے بات کرو اور ہر طرف سے ان پر عذر کی راہ بند کر دو۔ گزشتہ آیات میں تفکر کی دعوت کے بارے میں گفتگو تھی اور پیغمبر کی طرف سے ہر قسم کے روحانی عدم تعاون کی نفی تھی۔

پہلی زیر بحث آیت میں رسالت کے مقابلہ میں اجر اور مزدوری کے عدم مطالبہ کی گفتگو ہو رہی ہے۔

کھتا ہے: "کہہ دے کہ جو اجر و پاداش میں نے تم سے مانگا ہے وہ تمہارے ہی لیے ہے۔" (قل ما سألْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ)۔

اور میرا اجر اور صلہ تو خدا ہی کے ذمہ ہے (ان اجری الا علی اللہ)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عقل مند انسان جو کام بھی کرے اس کا کوئی نہ کوئی سبب اور محرک ہونا چاہیے۔ تو جب میری عقل کا کمال ہونا تم پر ثابت ہو چکا ہے، اور تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ میں کوئی مادی سبب اور محرک نہیں رکھتا، تو تمہیں یہ جان لینا چاہیے کہ خدائی اور معنوی محرک نے ہی مجھے اس کام پر آمادہ کیا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، میں نے تمہیں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے تو تم اب اچھی طرح سے سوچ لو، اور اپنے وجدان سے سوال کرو، کہ کونسی چیز اس بات کا سبب بنی ہے کہ میں تمہیں خدا کے سخت عذاب سے انذار کروں، اور ڈراؤں، اس کام سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ اور اس میں میرا کونسا مادی فائدہ ہے؟ اس کے علاوہ اگر اس مخالفت اور حق سے روگردانی کرنے میں تمہارا ہمانہ یہ ہے کہ تمہیں اس کیلئے بے بہا قیمت ادا کرنی پڑے گی، تو میں نے اصولاً تم سے کوئی اجر اور صلہ مانگا ہی نہیں ہے۔

چنانچہ یہی معنی سورہ قلم کی آیت ۴۶ میں بھی صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے: (ام تسلّموا اجراً فہو من مغرم مثقلون) "کیا تو نے رسالت کی ادائیگی پر کوئی اجر اور صلہ ان سے مانگا ہے کہ جو ان کے کندھوں پر بوجھ بن گیا ہے؟"

اس بارے میں کہ (فہو لکم) کا جملہ کیا معنی رکھتا ہے، اس کے لیے دو تفسیریں موجود ہیں: پہلی تفسیر تو یہ ہے کہ یہ مطلقاً ہر قسم کی اجرت کا مطالبہ نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ: "جو کچھ ہم نے تجھ سے چاہا ہے خود تیرا ہی مال ہے" یہ اس بات کے لیے کہ یہ ہے کہ میں نے تجھ سے

کچھ بھی مطالبہ نہیں کیا، اس بات کا شاہد اس کے بعد والا جملہ ہے، کہ جس میں وہ کہتا ہے: (ان اجری
الاعلیٰ اللہ) "میرا اجر اور صلہ تو صرف خدا پر ہے"

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اگر تم یہ دیکھتے ہو، کہ میں نے اپنی بعض باتوں میں، کہ جو میں پروردگار کی طرف
سے لایا ہوں تم سے یہ کہا ہے کہ: (لا اسئلكم علیہ اجزا الا المودۃ فی القربی) "میں تم سے
کوئی صلہ اور اجر نہیں مانگتا سوائے اپنے اقرباء کی دوستی کے" (شوری - ۲۳)

تو اس کا فائدہ بھی خود تمہاری طرف ہی لوٹتا ہے، چونکہ (مودت ذی القربی) مسئلہ "امامت و ولایت"
اور خط نبوت کے مسلسل جاری رہنے کی طرف بازگشت ہے کہ جو تمہاری ہدایت کے جاری رہنے
کے لیے ضروری ہے۔

اس بات کی گواہ وہ شان نزول ہے کہ جو بعض مفسرین نے یہاں نقل کی ہے، کہ جس وقت آیہ:
"قل لا اسئلكم علیہ اجزا الا المودۃ فی القربی" نازل ہوئی، تو پیغمبر نے مشرکین مکہ سے فرمایا
میرے اقرباء اور اعزاء کو اذیت نہ دو، تو انہوں نے بھی اس فرمائش کو قبول کر لیا، لیکن جس وقت پیغمبر نے
ان کے بتوں کو بڑا بھلا کہا تو وہ کہنے لگے کہ محمد ہم سے منصفاً نہ برتاؤ نہیں کرتا، ایک طرف تو ہم سے یہ چاہتا
ہے کہ ہم اس کے اعزاء و اقرباء کو بھی اذیت نہ پہنچائیں، لیکن دوسری طرف ہمارے خداؤں کو بڑا بھلا کہہ کر
ہیں اذیت و آزار پہنچاتا ہے تو اس موقع پر آیہ: "قل ما سألکم من اجر فهو لکم" (زیر بحث آیت)
نازل ہوئی، اور ان سے کہا کہ جو کچھ میں نے تم سے اس بارے میں سوال کیا ہے وہ تمہارے ہی نفع کیلئے
ہے، اب تمہاری مرضی ہے کہ آزار و تکلیف پہنچاؤ یا نہ پہنچاؤ۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "اور وہ ہر چیز پر شاہد و گواہ ہے" (وہو علی کل شیء شہید)۔
اگر میں اپنا اجر اور صلہ اسی سے چاہتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ میرے تمام اعمال اور نیتوں
سے آگاہ اور باخبر ہے۔

علاوہ ازیں وہ میری حقانیت کا گواہ ہے کیونکہ یہ تمام معجزات اور آیات، بینات اس نے میرے قبضہ
اور اختیار میں دے رکھے ہیں، اور واقعاً سب سے زیادہ برتر و افضل گواہ خود وہ ہے، کیونکہ جو شخص محتاق
کو سب سے بہتر طور پر جانتا ہے، اور وہ سب سے بہتر طور پر انہیں ادا کر سکتا ہے اور حق کے سوا کوئی چیز اس
سے صادر نہیں ہوتی، تو وہی سب گواہوں سے بہتر گواہ ہے، اور وہ خدا ہے۔

پیغمبر کی حقانیت کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس پر توجہ کرتے ہوئے، بعد والی آیت میں کتا

ہے: قرآن ایک ایسی حقیقت اور واقعیت ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ جو خدا کی طرف سے
پیغمبر کے دل پر اتار ہوا ہے۔ "کہہ دے کہ میرا پروردگار حق کو ڈالتا ہے، کہ جو علام الغیوب ہے اور تمام
اسرار نہاں سے آگاہ ہے" (قل ان ربی یقذف بالحق علام الغیوب)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "یقذف" "قذف" کے مادے سے (بروزن حذف)
دور دراز کی جگہ پر پھینکنے یا دور کے راستے سے اڑھکانے کے معنی میں ہے، اس آیت کے لیے بہت
سہی تفسیریں لکھی گئی ہیں، کہ وہ سب کی سب آپس میں قابل جمع ہیں۔

پہلی تفسیر تو یہ ہے کہ "حق" کو پھینکنے سے مراد، کتب آسمانی اور وحی الہی کو انبیا۔ اور پروردگار کے
بھیجے ہوؤں کے دلوں میں ڈالنا ہے۔ کیونکہ وہ علام الغیوب ہونے کے سبب آمادہ اور تیار دلوں کو
پہنچاتا ہے، اور ان کا انتخاب کر کے اپنی وحی کو ان میں ڈالتا ہے، تاکہ اس کی گھرائیوں میں
نفوذ کرے۔

تو اس طرح یہ آیت اُس مشہور حدیث:

"العلو نور یقذف اللہ فی قلب من یشاء"

"علم ایک نور ہے کہ جسے خدا جس دل میں چاہتا ہے اور جسے لائق دیکھتا ہے ڈال

دیتا ہے۔" سے مشابہت رکھتی ہے۔

تعبیر "علام الغیوب" اس معنی کی تائید کرتی ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد حق کو باطل پر پھینکنے اور حق کے ذریعہ
باطل کی سرکوبی کرنا ہے۔ یعنی حق اس طرح کی قوت و طاقت رکھتا ہے، کہ جو اپنے راستے سے تمام
رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے اور کسی شخص کو اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت اور قدرت نہیں ہے۔ تو
اس طرح سے یہ مخالفین کے لیے ایک تہدید ہے، کہ وہ قرآن کے مقابلہ کے لیے کھڑے نہ ہوں اور وہ یہ
جان لیں کہ قرآن کی حقانیت انہیں درہم برہم کر کے رکھ دے گی۔

اور اس صورت میں یہ اس مطلب کے مشابہ ہے کہ جو سورہ انبیا، کی آیت ۱۸ میں بیان ہوا ہے:
(بل نقذف بالحق علی الباطل فید مغہ فاذا هو زاہق) "ہم حق کو باطل کے سر پر پھینکیں گے
تاکہ وہ اس کو نابود اور ہلاک کر دے، اور باطل محو و نابود ہو جائے گا"

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہاں "قذف" کی تعبیر سے مراد قرآن کی حقانیت کا عالم کے دور و نزدیک
کے نقاط میں نفوذ ہے، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آخر کار یہ وحی آسمانی عالمگیر ہو جائے گی،
اور ہر جگہ کو اپنے نور سے روشن و سنور کر دے گی۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: "کہہ دے کہ حق آگیا ہے، اور باطل سے اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ نہ تو وہ کوئی نیا کام انجام دے سکتا ہے، اور نہ ہی پرانے پروگرام کو تجدید کر سکتا ہے" (قل جاء الحق وما يبدئ الباطل وما يعيد)۔

اور اس طرح سے حق کے مقابلہ میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا، نہ تو کوئی جدید نقش و اثر ہوگا اور نہ ہی کوئی تکراری نقش اثر ہوگا، کیونکہ اس کے تمام نقوش، نقش بر آب ہیں، اور ٹھیک اسی بنا پر وہ نور حق کی پردہ پوشی بھی نہیں کر سکتا اور اس کے اثر کو دلوں سے کم نہیں کر سکتا۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس آیت میں حق و باطل کو محدود و مصادیق میں محصور کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ان دونوں کا مفہوم وسیع و کشادہ ہے، قرآن، وحی خداوندی، تعلیمات اسلام، سب کے سب "حق" کے مفہوم میں جمع ہیں۔ جبکہ "شُرک" و "کفر ضلالت و گمراہی شیطانی" دوسرے اور طاقتور بدعتیں سب "باطل" کے معنی میں درج ہیں۔

اور حقیقت میں یہ آیت سورہ اسرار کی آیت ۸۱ کے مشابہ ہے کہ جس میں فرماتا ہے: "وقل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوفاً"۔ "کہہ دے کہ حق آگیا اور باطل چلا گیا، کیونکہ باطل تو جانے والا ہی ہے"۔

ایک روایت میں ابن مسعود سے اس طرح منقول ہے، کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: "اور کالیکہ خانہ خدا کے اطراف میں ۳۶۰ بُت تھے، آپ اس پھڑی کے ساتھ کہ جو آپ کے ہاتھ میں تھی ایک ایک بُت کو گراتے اور فرماتے جاتے تھے: "جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوفاً"۔ جاء الحق وما يبدئ الباطل وما يعيد"۔

سوال

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اوپر والی آیت یہ کہتی ہے، کہ حق کے ظہور کے ساتھ باطل رنگ باختہ ہو کر کلی طور پر کوئی نئی بات ایجاب کرنے سے باز آ جاتا ہے، حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ باطل ابھی تک مصروف کار ہے اور بہت سے علاقوں کو اپنے زیر تسلط قرار دینے ہوتے ہے؟

۱۔ "یبدئ" مادہ "ابدأ" سے ابتدائی طور پر ایجاب کرنے کے معنی میں ہے اور "یعيد" مادہ "اعاد" کے مادہ سے تکرار کے معنی میں ہے، باطل اس کا فاعل ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: "ما یبدئ الباطل شیئاً وما یعيد شیئاً" باطل نہ تو کسی چیز کی ابتداء کر سکتا ہے اور نہ ہی اعادہ کر سکتا ہے۔

تفسیر مجمع البیان، جلد ۸، ص ۳۹۷۔

جواب

اس کے جواب میں اس نکتہ کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ اولاً: تو حق کے ظاہر ہونے اور اس کے آشکار ہونے سے باطل یعنی شرک و کفر و نفاق اور جن جن کا وہ سرچشمہ ہے، بے رنگ ہو جاتے ہیں اور اگر وہ اپنی زندگی کو جاری بھی رکھیں تو وہ بھی زور و ظلم اور دباؤ کے طریقہ سے ہوگا۔ ورنہ اس کے چہرے سے نقاب ہٹ جائے گا اور اس کا مسکودہ چہرہ حق کے متلاشیوں کے لیے آشکار ہو جائے گا، اور حق کے آنے باطل کے محو ہو جانے سے یہی مراد ہے۔

ثانیاً: حق کی حکومت کے قیام، اور سارے عالم میں باطل کی حکومت کے زوال کے لیے، ان امکانات و وسائل کے علاوہ کہ جو خدا نے بندوں کے اختیار میں دیئے ہیں، ایسے شرائط و حالات کا وجود بھی ان کی طرف سے ضروری ہے کہ جن میں سے اہم ترین چیز ان امکانات و وسائل سے استفادہ کے لیے مقدمات کی ترتیب دینا ہے۔

دوسرے لفظوں میں حق کی باطل پر کامیابی نہ صرف محبتی، منطقی و دینی پہلوؤں میں ہے بلکہ اجرائی پہلوؤں میں دو بنیادوں پر قرار پاتی ہیں، "فاعلیت فاعل" اور "قابلیت قابل"۔ اور اگر قابلیتوں کے نہ ہونے کے باعث اجراء کے مرحلہ میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو تو حق کی عدم کامیابی کی دلیل نہیں ہے۔

مثال کے طور پر جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "ادعونی استجب لکم"۔ "مجھے پکارو تاکہ میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں" (تومن - ۶۰)۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ دعا کی قبولیت بے قید و شرط نہیں ہے، اگر اس کے شرائط حاصل ہو جائیں تو اس کی اجابت قطعی و یقینی ہے، ورنہ اس صورت کے علاوہ اجابت و قبولیت کی توقع نہیں ہونا چاہیے۔ اس معنی کی تشریح سورہ بقرہ کی آیہ ۱۸۶ کے ذیل میں (جلداول میں آپہلی ہے)۔

یہ ٹھیک اس طرح ہے کہ ہم ایک حاذق اور ماہر طبیب و ڈاکٹر کو ایک مریض کے پاس لائیں اور ہم کہیں کہ تیری نجات کے اسباب فراہم ہو گئے ہیں، اور جب ہم اس کی دوا بھی میا کر دیں، تو ہم کہتے ہیں کہ اب تیری شکل حل ہو گئی۔ حالانکہ یہ سب چیزیں تو وہ ہیں کہ جو مقتضی تھیں، نہ کہ علت تامہ۔ بیمار کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوا سے استفادہ کرے اور طبیب کی شرائط پر کار بند ہو، اور وہ پرہیز کر جو ضروری و لازمی ہیں ان کو نہ بھولے، تاکہ شفا کا حصول یقینی بن جائے۔ (غور کیجئے)

اس کے بعد اس بنا پر کہ وہ یہ واضح کر دے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے خدا کی طرف سے ہے۔ اور ہر ہدایت خدا کی جانب سے ہے، اور وحی الہی میں ہرگز خطا کا گز نہیں ہے۔ مزید کہتا ہے کہ: "کہہ دے کہ اگر میں گمراہ ہو جاؤں تو میں خود اپنی طرف سے گمراہ ہوں گا، اور اگر میں ہدایت پاؤں تو میں اُس

چیز کے ذریعے سے کہ جو میرے پروردگار نے مجھے وحی کی ہے ہدایت پاؤں گا۔ (قل ان ضللت فانا اضل علی نفسی وان اھتدیت فیما یوحی الی ربی) یہ

یعنی میں بھی اگر اپنی حالت پر رہوں تو گمراہ ہو جاؤں گا، کیونکہ باطل کے انبوہ میں سے راہ حق کو تلاش کرنا پروردگار کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور ہدایت کا وہ نور کہ جس میں گمراہی کا کوئی گزر نہیں ہے، اس کی وحی کا نور ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ عقل ایک پرندہ پرانچ ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ انسان محصور نہیں ہے اور اس پرانچ کی شعاع خلقت کے تمام پردوں کو نہیں چیر سکتی، پس آواز تم بھی اس وحی الہی کے دائرہ میں ہاتھ ڈالو تاکہ وادی ظلمات سے نکل سکو، اور سر زمین نور میں قدم رکھو۔

ہر حال جہاں پیغمبر باوجود اپنے پورے علم و آگاہی کے خدا کی ہدایت کے بغیر کسی جگہ پر نہیں پہنچتا تو دوسروں کا معاملہ تو ظاہر اور روشن ہے۔

آیت کے آخر میں مزید لکھا ہے: "وہ سننے والا اور نزدیک ہے" (انہ سميع قریب)۔

کہیں یہ خیال نہ کر لینا کہ وہ ہماری اور تمہاری باتوں کو نہیں سنتا، یا سنتا تو ہے لیکن ہم سے دور ہے، ایسا نہیں ہے، وہ سنتا بھی ہے، اور نزدیک بھی ہے، اس بنا پر ہماری گفتگوؤں اور خواہشات کا ایک ذرہ بھی اس سے مخفی نہیں رہ سکتا۔

۵۱) وَلَوْ تَرَىٰ اِذْ فَزِعُوْا فَلَاقُوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۝

۵۲) وَقَالُوْا اٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَاِنِّيْ لَهٗمُ التَّٰوٰشِ مِنْ مَّكَانٍ يَّعِيْدٍ ۝

۵۳) وَقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْدِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ يَّعِيْدٍ ۝

۵۴) وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مَُّرِيْبٍ ۝

ترجمہ

۵۱) اگر تو اُس وقت دیکھے جبکہ ان کی فریاد بلند ہوگی، لیکن وہ (عذاب الہی کے پہنچنے سے) بھاگ نہ سکیں گے، اور وہ نزدیک کی جگہ (ایسی جگہ کہ جس کی انہیں امید تک نہ ہوگی) سے پکڑ لیے جائیں گے (تو تو ان کی بے بسی پر تعجب کرے گا)۔

۵۲) اور وہ (اس حالت میں) یہ کہیں گے کہ ہم ایمان لائے، لیکن وہ دُور کے فاصلے سے اس بات پر کیسے رسائی حاصل کر سکیں گے۔

۵۳) وہ اس سے پہلے تو (جب کہ وہ انتہائی طور پر آزاد تھے) اس سے کافر ہو گئے تھے (اور اس کی طرف ناروا نسبتیں دیا کرتے تھے) اور دور ہی دور سے عالم غیب کے بارے میں اٹکل چچو باتیں بنایا کرتے تھے (اور اس کے لیے بغیر کسی غور و فکر

۱۔ اس بارے میں کہ پہلے جملہ میں "علی" کیوں لایا (علی نفسی) اور دوسرے جملہ میں "یا" (فیما یوحی الی ربی) بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ان جملوں میں سے ہر ایک میں محذوف ہے کہ جو ایک دوسرے قرینہ کی وجہ سے حذف ہوا ہے اور اس کی تقدیر اس طرح تھی "ان ضللت فانا اضل نفسی وان اھتدیت فانا اضل نفسی فیما یوحی الی ربی" اگر میں گمراہ ہو جاؤں تو میں خود سے گمراہ ہوا ہوں اور اگر میں ہدایت پاؤں تو میرے نفس نے اس چیز سے ہدایت حاصل کی ہے کہ جو میرے پروردگار نے میری طرف وحی کی ہے۔ (غور کیجئے)۔ تفسیر روح المعانی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کے فیصلے کیا کرتے تھے۔

(۵۴) (آخر کار) ان کے اور ان کی خواہشات، تمناؤں، آرزوؤں اور چاہتوں کے درمیان جدائی ڈال دی گئی، جیسا کہ ان کے پیروکاروں (اور ہم مسکوں) کے ساتھ اس سے پہلے کیا گیا تھا، کیونکہ وہ شک و شبہ میں مبتلا تھے۔

ان کے لیے راہ فرار نہ ہوگی

زیر بحث آیات میں کہ جو "سورہ سبا" کی آخری آیات ہیں، ان مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو ہٹ دھرم مشرکین کے بارے میں گزشتہ آیات میں گزر چکی ہیں، دوبارہ پیغمبر کی طرف رتنے سخن کرتے ہوئے، اس گروہ کی حالت کو عذاب الہی کے چنگل میں گرفتاری کے وقت مجسم کرتا ہے کہ وہ (عذاب الہی میں) گرفتار ہونے کے بعد کس طرح ایمان لانے کی فکر میں پڑیں گے لیکن ان کے ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ فرماتا ہے: "اگر تو اس وقت دیکھے جبکہ ان کی فریاد بلند ہوگی، لیکن وہ بھاگ نہ سکیں گے اور عذاب الہی کے چنگل سے نکل نہ سکیں گے، اور انہیں بالکل قریب سے ہی پکڑ لیں گے اور گرفتار کر لیں گے تو ان کی بچاؤ اور بے بسی پر تعجب کرے گا" (ولو تشری اذ فزعوا فخلا فوفت واخذوا من مکان قریب)۔

یہ بات کہ یہ نالہ و زاری اور فریاد و بے تابی کس زمانے سے تعلق رکھتی ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض اسے عذاب دنیا یا موت کے وقت کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں، اور بعض اسے روز قیامت کے عذاب سے متعلق جانتے ہیں۔

لیکن زیر بحث آیتوں میں سے آخری آیت میں ایک ایسی تعبیر موجود ہے کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ آیات، سب کی سب دنیا ہی میں پہنچنے والے عذاب کے ساتھ، یا جان کنی کے لمحے کے ساتھ مربوط ہیں۔ کیونکہ آخری آیت میں وہ یہ کہتا ہے کہ: "ان کے اور ان کی چھستی چیزوں کے

۱۔ ولو تشری: جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: "لو آیت امر اعظیماً" یا "لعبت من احوالهم" (تو ایک امر عظیم دیکھتا۔ یا ان کے حالات پر تعجب کرتا)۔

درمیان جدائی ڈال دی جائے گی" جیسا کہ اس سے پہلے کفار کے دوسرے گروہوں کے بارے میں یہی عمل انجام پایا ہے۔

یہ تعبیر روز قیامت کے عذاب کے ساتھ سازگار نہیں ہے کیونکہ اس دن تو سب کے سب ایک ہی جگہ حساب کے لیے جمع ہوں گے، جیسا کہ سورہ ہود کی آیت ۱۰۳ میں بیان ہوا ہے کہ: "ذالک یوم مجموع لہ الناس و ذالک یوم مشہود"۔ وہ ایسا دن ہے کہ جس میں تمام لوگ جمع ہوں گے اور وہ ایسا دن ہے کہ جس کا سب مشاہدہ کریں گے:

اور سورہ واقعہ کی آیت ۴۹ میں یہ بیان ہوا ہے کہ: "قل ان الاولین والآخرین لجمعون الی میقات یوم معلوم"۔ "کہہ دے کہ سب اولین و آخرین، روز مبین کے وقت اکٹھے کیے جائیں گے"۔ اس بنا پر "اخذوا من مکان قریب" کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ یہ سنگم اور بے ایمان لوگ نہ صرف یہ کہ وہ قدرت خدا کی حدود سے باہر نہ نکل سکیں گے بلکہ خدا انہیں ایسی جگہ سے گرفتار کرے گا کہ جو ان سے بہت ہی زیادہ قریب ہوگی۔

کیا فرعونی دریا سے نیل کی لہروں میں کہ جو ان کے لیے سرمایہ افتخار تھا دفن نہیں ہوتے؟ اور کیا قارن اپنے ہی خزانوں کے درمیان زمین میں نہیں دھنسا؟ اور کیا قوم سبا، کہ جن کی داستان اسی سورہ میں بیان کی گئی ہے، نزدیک ترین مکان یعنی اسی عظیم سد سے بچے جو ان کی آبادی کا دل اور ان کی زندگی اور حرکت کا سرمایہ تھی۔ گرفتار نہیں ہوتے؟ اسی بنا پر خدا انہیں بھی نزدیک ترین جگہ سے ہی گرفتار کرے گا تاکہ وہ اس کی قدرت نمانی کو جان لیں۔

بہت سے ظالم بادشاہ اپنے نزدیک ترین افراد کے ذریعہ قتل ہوتے، اور نابود ہو گئے اور بہت سے قدرتمند لشکروں نے اپنے گھر کے اندر ہی آخری ضرب کھائی۔

اذا کہم یہ دیکھتے ہیں کہ بہت سی روایات میں کہ جو شیعہ اور اہل سنت کے وسیلوں سے نقل ہوتی ہیں، یہ آیت "سفینی" کے خروج اور اس کے لشکر وہ گروہ کہ جو ابوسفینی کے مکتب کے پیرو اور زمانہ جاہلیت کے ہمسازگان ہیں اور حق کے طرفداروں کے خلاف قیامِ مہدی کی ابتداء میں فوج کریں گے) پر متعلق ہوتی ہے، کہ وہ مکہ کی تخیر کے لیے اس کی طرف چلنے کے موقع پر صحرائیں گرفتار عذاب ہوں گے، اور زمین میں اس کے شگافہ ہونے اور ان کے اس میں دھنس جانے کے سبب سے شدید زلزلہ اور لرزہ طاری ہوگا۔ تو یہ حقیقت میں (اخذوا من مکان قریب) کے ایک مصداق کا بیان ہے، کہ وہ اسی نقطہ سے کہ جو ان کے پاؤں کے نیچے ہے عذاب الہی کے چنگل میں گرفتار ہوں گے۔

اس حدیث کا مضمون "ابن عباس"۔ "ابن مسعود"۔ "ابو ہریرہ"۔ "ابو حذیفہ"۔ "ام سلمہ" اور حضرت عائشہ نے، اس کے مطابق کہ جو اہل سنت کی کتبوں میں آیا ہے، پیغمبر گرامی اسلام

سے نقل کیا ہے۔

اور بہت سے شیعہ مفسرین مثلاً "قی"۔ "مجمع البیان"۔ "تذکر الشکلیں"۔ "صافی" نے اور اہل سنت کے مفسرین کی ایک جماعت مثلاً "روح المعانی"۔ "روح البیان" اور "قرطبی" کے مفسرین نے بھی اس کو زیر بحث آیات کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

مروج علامہ مجلسی نے متعدد روایات بحار الانوار میں امام محمد باقرؑ اور پیغمبر گرامی اسلامؐ سے اس سلسلہ میں نقل کی ہیں کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ زیر بحث آیات کے مصداق میں سے ایک قیام مہدی کے وقت "خروج سفیانی" کا مسئلہ ہے کہ جس کو خدا (اس کے لشکر سمیت) نزدیک ترین جگہ سے گرفتار عذاب اور نابود کر دے گا۔

جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے جو روایات آیات کی تفسیر میں وارد ہوتی ہیں وہ زیادہ تر واضح مصداق کو بیان کرتی ہیں، اور وہ ہرگز آیات کے مفہوم کو محدود کرنے کی دلیل نہیں ہیں۔

بعد والی آیت میں، ان کے عذاب الہی کے چنگل میں گرفتار ہونے کے وقت ان کی حالت کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ کہیں گے کہ ہم اس (قرآن، اس کے لانے والے اور مبداء و معاد) پر ایمان لائے" (وقالوا ائمانا بہ)۔

"لیکن وہ اس دور دراز کے فاصلہ سے اس پر کس طرح دسترس حاصل کر سکیں گے" (و ائی لہم التناوش من مکان بعید)۔

ہاں! موت اور عذاب الہی کے آجانے پر بازگشت کے دروازے کلی طور پر بند ہو جاتے ہیں، اور انسان اور گزشتہ غلط کاریوں کی تلافی کے درمیان ایک محکم رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، اسی بنا پر اس وقت ایمان کا اظہار کرنا یا ہو گا جیسا کہ یہ بات کسی دور دراز مقام سے انجام پائے جہاں ہاتھ نہ پہنچ سکتا ہو۔

اصولی طور پر اس قسم کا ایمان۔ کہ جو اضطراری پہلو رکھتا ہو، اور اس عذاب کے حد سے زیادہ خون کی وجہ سے ہو، جسے وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں۔ کوئی وقعت نہیں رکھتا، لہذا قرآن

تفسیر میزان، جلد ۱۹ ص ۲۱۹۔

بحار الانوار، جلد ۵۲ ص ۱۸۵ سے باب علامات ظهور مہدی من السفیانی والرجال)۔

"یہ" کی تفسیر "حق" کی طرف لٹھی ہے، کہ جو اس سے قریب ترین مروج ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ آیات میں "حق"۔ قرآن اور اس کے مصداق اور مبداء و معاد اور پیغمبر اسلامؐ کے معنی میں ہے۔

کی دوسری آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ: "یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، اگر یہ پلٹ جائیں تو پھر انہیں پروردگاروں پر عمل کرنے لگیں گے" (انعام - ۲۸)۔

"تناوش" مادہ "نوش"۔ (بروزن خوف) کسی چیز کو پکڑنے کے معنی میں ہے اور بعض نے سہولت کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں لیا ہے، یعنی وہ ایسے دور دراز کے ہدف تک آسانی کے ساتھ کیسے پہنچ سکتے ہیں۔

اس وقت جبکہ تمام چیزیں ختم ہو گئی ہیں وہ ایمان لاکر اپنی خطاؤں کی تلافی کیسے کر سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے (جبکہ وہ انتہائی اختیار اور ارادہ کی آزادی کے مالک تھے) "اس سے کافر ہو گئے تھے" (وقد کفروا بہ من قبل)۔

وہ نہ صرف کافر ہی ہوئے تھے بلکہ پیغمبر اسلامؐ اور ان کی تعلیمات پر طرح طرح کی تہمتیں باندھتے تھے، اور عالم غیب۔ عالم ماوراء طبعیت، قیامت اور پیغمبر کی نبوت۔ کے بارے میں ناروا فیصلے کیا کرتے تھے، اور دور دراز مقام سے اس کی طرف ناروا نسبتیں دیتے تھے۔ "ویقذفون بالغیب من مکان بعید"۔

"قذف" جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، کسی چیز کو اٹھا کر پھینکنے کے معنی میں ہے۔ اور "غیب" عالم ماوراء جس کے معنی میں ہے، اور "مکان بعید" "دور کی جگہ" کے معنی میں ہے، اور مجموعی طور پر یہ ایک لطیف کنایہ ہے، ایسے شخص کے بارے میں کہ جو عالم ماوراء طبعیت کے لیے آگاہی و اطلاع کے بغیر فیصلہ کرے۔ جیسا کہ دور کی جگہ سے کسی چیز کو پھینکنا بہت ہی کم نشانہ پر لگتا ہے، اسی طرح ان کا یہ ظن و گمان اور فیصلہ بھی ہدف اور نشانہ پر نہیں لگتا۔

وہ کبھی تو پیغمبر کو ساحر اور جادوگر کہتے تھے، کبھی "دیوانہ" کبھی "کذاب" (جھوٹا) کبھی قرآن کو انسانی فکر سے گھڑا ہوا کلام جانتے تھے، اور کبھی جنت بہمن اور قیامت کا کلی طور پر انکار کر دیتے تھے، یہ تمام باتیں ایک قسم کا "غیب کے بارے میں اٹکل چبچو باتیں بنانا" اور "تاریکی میں تیر پھینکنا" اور "دور دراز کے مکان سے پھینکنا" "قذف من مکان بعید" تھا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ: "آخر کار ان کے اور ان تمام چیزوں کے درمیان کہ جن سے وہ علاوہ تعلق رکھتے تھے، موت کے ذریعہ جدائی ڈال دی جائے گی، جیسا کہ ان کے مانند و مشابہ گروہوں کے ساتھ اس سے پہلے عمل ہوا" (وحیل بینہم و بین ما یشتمون کما فعل باشیاعہم من قبل)۔

ایک ہی درد ناک لمحہ میں دیکھیں گے کہ ان کا تمام مال و دولت، تمام محلات اور مقام و منصب اور ان کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں اُن سے جدا ہو رہی ہیں وہ لوگ کہ جو ایک ایک پیسے کے ساتھ (ایک ایک درہم و دینار سے) سختی کے ساتھ چمٹے ہوتے تھے، اور معمول سے معمولی مادی وسائل و اسباب سے بھی دل کو الگ نہیں کرتے تھے، ان کا اس لمحہ میں۔ کہ جس میں انہیں ایک ہی مرتبہ سب کو الوداع کہنا پڑے گا، آنکھیں بند ہو جائیں گی اور ایک تاریک اور وحشت ناک مستقبل کی طرف قدم اٹھا رہے ہوں گے۔ کیا حال ہو گا!

”حیل بینہم و بین مابیشہون“ (ان کے اور ان تمام چیزوں کے درمیان کہ جن سے وہ علاقہ و تعلق رکھتے تھے جدائی ڈال دی جائے گی) کے جملہ کے لیے دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں:

پہلی تفسیر تو یہی ہے کہ جو اوپر بیان کی گئی ہے، دوسری تفسیر یہ ہے کہ وہ چاہیں گے کہ ایمان لے آئیں، اور گزشتہ کی تلافی کریں، لیکن ان کے اور ان کی اس خواہش کے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی۔ لیکن پہلی تفسیر ”مابیشہون“ والے جملے کے معنی کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ علاوہ ازیں گزشتہ آیات میں ”انی لہو التناوش من مکان بعید“ کے جملہ میں موت اور عذاب استیصال کے وقت ایمان پر ان کی دسترس نہ ہونے کا مسئلہ بیان ہوا تھا، لہذا اس کے تکرار کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ بہت سے مفسرین نے ان آیات کو روز قیامت کے عذاب اور عرصہ عشر میں گنہگاروں کی ندامت سے متعلق جانا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آخری زیر بحث آیت میں ”کما فعل باشیاعہم من قبل“ کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے، یہ معنی مناسب نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد موت کا لمحہ، اور خدا کی طرف سے ناپود کرنے والے عذاب کا مشاہدہ ہی ہے۔

اور امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے، اور جان کنی کے لمحات اور دنیا کی نعمتوں سے جدائی کی اپنے نورانی کلمات میں بہت ہی واضح طریقہ سے تصویر کشی کی ہے:

”اجتمعت علیہم سکرۃ الموت، وجرۃ الفوت، ففترت لہما اطرافہم و تغیرت لہما الوانہم!“

شعر ازاں الموت فیہم ولوجاً، فحیل بین احدہم و بین منطقہ، وانہ لبین اہلہ ینظر ببصرہ ویسمع باذنہ.....!

یفکر فیم افنا عمرہ؟ وفیم اذہب دھرہ؟ ویتذکر اموالہ اجمعہا اغض فی مطالبہا، واخذہا من مصرحاتہا و مشبہاتہا.....!

فہو یعض یدہ ندامۃ علی ما اصحرلہ عند الموت من امرہ، ویزہد

فیما کان یرغب فیہ ایام عمرہ، ویتصنی ان الذی کان یغبطہ بہا ویحسدہ علیہا قد حازہا دونہ!“

”سکرات موت، اور دنیا کی نعمتوں کو ہاتھ سے کھونے کی حسرتیں ان کے اوپر حملہ آور ہو جاتی ہیں، ان کے بدن کے اعضاء حسرت ہو جاتے ہیں اور ان کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے۔“

اس کے بعد موت کا پنجہ ان کے اندر اور زیادہ نفوذ کرنے لگتا ہے۔ اس طرح سے کہ ان کی زبان کام کرنا بند کر دیتی ہے، اس حالت میں کہ وہ اپنے گھر والوں کے درمیان پڑا ہوا ہوتا ہے، آنکھ سے دیکھ رہا ہوتا ہے، اور کان سے سن رہا ہوتا ہے، (لیکن اس میں بات کرنے کی طاقت باقی نہیں رہتی)۔

وہ یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کو کس راہ میں تباہ کر دیا؟ اپنی زندگی کا وقت کس راہ میں گزارا؟ اس مال و دولت کو یاد کرتا ہے کہ جسے حلال و حرام کی طرف توجہ کیے بغیر جمع کیا تھا، اور اس کے حصول کے طریقے کے بارے میں کبھی بھی نہ سوچا تھا۔

انگشت حسرت منہ میں رکھتا ہے، اور اپنا ہاتھ پشیمانی سے کاٹتا ہے کیونکہ موت کے وقت وہ مسائل اس پر روشن ہو جاتے ہیں کہ جو اس وقت تک مخفی و پوشیدہ تھے، وہ اس حالت میں ان تمام چیزوں سے کہ جن کے ساتھ وہ زندگی کے ایام میں شدت سے علاقہ اور لگاؤ رکھتا تھا بے اعتنا ہو جائے گا۔ اور یہ آرزو کرے گا کہ اے کاش! وہ لوگ کہ جو اس کی ثروت اور مال و دولت پر رشک اور حسد کیا کرتے تھے یہ مال اس کی بجائے ان کے قبضہ میں ہوتا۔

آخر میں آخری زیر بحث آیت کے آخری جملہ میں کہتا ہے کہ:

”ان سب مسائل کا سبب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ شک و شبہ کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے، لہذا طبعاً اس قسم کا انتخاب ان کے انتظار میں تھا، (انہم کانوا فی شک مریب)۔“

پروردگارا! ہمیں ان لوگوں سے سزا دے کہ جو اوقات کے ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے بیدار ہو جاتے ہیں، اور جو کچھ ان سے فوت ہو چکا ہے اس کی

تلافی کرتے ہیں۔

بارالہا! دنیا کا جال بڑا سخت ہے اور دشمن طاقت ور اور قوی ہے۔ اگر تیرا لطف و کرم شامل حال نہ ہو اور ہماری مدد نہ کرے تو ہمارا حال خراب ہے۔
خداوند! ہمیں ان لوگوں میں سے فترار دے کہ جو نعمتوں کے ملنے کے وقت ان کا شکر ادا کرتے ہیں، اور مغرور و غافل نہیں ہوتے، اور مصیبتوں کے نازل ہونے کے وقت آہ و زاری نہیں کرتے، بلکہ عبرت حاصل کرتے ہیں۔

سورہ سبہ کا اختتام

اول اسفندیار ۱۳۶۲ مطابق ۱۷/۱۷/۱۳۰۲ء

سُورَةُ قَطْرِ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۴۵ آیات ہیں

شروع: ۱۸/۱۷/۱۳۰۲ء
۲/اسفندیار/۱۳۶۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورہ فاطر کے مضامین

یہ سورہ کہ جسے کبھی سورہ فاطر اور کبھی سورہ طلائعہ کا نام دیتے ہیں (اس کے آغاز کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ جو "فاطر" اور "طلائعہ" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے) سبھی سورتوں میں سے ہے، اگرچہ بعض نے اس کی دو آیات کا استشہار کیا ہے اور انہیں مدنی شمار کیا ہے (آیہ ۲۹-۳۲) لیکن اس کے استثنائی واضح دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔

چونکہ یہ سورہ مکی ہے لہذا مکی سورتوں کے عام مضامین یعنی "مبادا" و "معاذ" و "شکر" کے ساتھ مبارزہ، "رسالت انبیاء کی دعوت"، "پروردگار کی نعمتوں کا تذکرہ" اور "روز جزا میں مجرموں کا انجام" اس میں پورے طور پر منعکس ہیں۔

اس سورہ کی آیات کو پانچ حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

۱- اس سورہ کی آیات کا ایک اہم حصہ عالم هستی میں خدا کی عظمت کی نشانیوں اور توحید کے دلائل کے سلسلہ میں گفتگو کرتا ہے۔

۲- اس کا دوسرا حصہ پروردگار کی ربوبیت اور سارے جہان کے لیے اور خصوصاً انسان کے بارے میں اس کی تدبیر، اس کی خالقیت و رازقیت اور مٹی سے انسان کی خلقت اور اس کے تکامل و ارتقاء سے بحث کرتا ہے۔

۳- اس کا تیسرا حصہ معاد اور آخرت میں نتائج اعمال اور اس جہان میں خدا کی رحمت کی وسعت اور مستبصرین کے بارے میں اس کی تخلف ناپذیر سنت سے متعلق ہے۔

۴- اس کی آیات کا ایک حصہ انبیاء کی رہبری اور ہٹ دھرم اور سخت قسم کے دشمنوں کے ساتھ مسلل اور متواتر مبارزہ اور اس سلسلے میں پیغمبر اسلام کی دلداری اور قسلی کے مسلک کی طرف اشارہ ہے۔

۵- آخری حصہ میں خدائی مواظب اور پند و نصائح کا بیان ہے، یہ بیان مختلف امور کے بارے میں گزشتہ مباحث کی تکمیل کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس ساری سورت کو ایک ہی حلقہ میں خلاصہ کیا ہے اور وہ خدا کی تائید کا مسئلہ ہے۔ یہ بات اگرچہ اس سورہ کی کچھ قابل توجہ آیات کے ایک حصہ کو مد نظر رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ تفسیر فی ظلال، آغاز سورہ فاطر۔

لیکن اس کے باوجود اس سورہ میں دوسری مختلف بحثوں کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس سورہ کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

"من قرأ سورة الفاتحة دعته يوم القيامة ثلاثة ابواب من الجنة ان ادخل من اى الابواب شئت"

"جو شخص سورہ فاطر کو پڑھے تو قیامت کے دن جنت کے دروازوں میں سے

تین دروازے اسے اپنی طرف دعوت دیں گے کہ وہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔"

"اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ جنت کے دروازے وہی عہد تد اور

اعمال صالحہ ہیں کہ جو بہشت میں داخل ہونے کا سبب بنتے ہیں، جیسا کہ بعض روایات میں باب الجاہدین کے عنوان سے ذکر ہوا ہے، ممکن ہے کہ یہ روایت توحید، معاد اور رسالت پیغمبر کے اعتقاد کے تین

دروازوں کی طرف اشارہ ہو۔"

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

"قرآن مجید میں دو سورتیں (یعنی بعد دیگرے قرار پاتی ہیں) سورہ سبأ و سورہ فاطر کہ جو

"الحمد لله" سے شروع ہوتی ہیں، جو شخص انہیں رات کو پڑھے گا تو خدا اسے اپنی حمایت

کے ساتھ میں حفاظت کرے گا، اور جو شخص دن میں پڑھے گا تو اسے کوئی تکلیف نہیں

پہنچے گی، اور خدا اسے اس قدر خیر دینا و آخرت عطا فرمائے گا کہ جو کسی کے دم و گمان میں بھی

نہ آیا ہو گا، اور کسی نے اس کی تمنا تک نہ کی ہو گی۔"

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ قرآن عملی پروگرام ہے اور اس کی تلاوت کرنا تفکر اور ایمان

کا مقدمہ اور تمہید ہے، اور وہ اس کے معنی و مفہوم پر عمل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، اور یہ سب اجر اور صلے

بھی اسی کی بنا پر ہیں اور انہیں شرائط کے ساتھ حقیقت بنتے ہیں۔ (غور کیجئے)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

① اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ
رُسُلًا اُولٰٓئِیْ اَجْنِحَةً مَّثْنِیَّ وَثَلٰثَ وَرُبْعًا یَزِیْدُ فِی
الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝
② مَا یَفْتَحُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكٍ لَهَا
وَمَا یُمْسِكُهَا فَلَا مُرْسِلَ لَهَا مِنْۢ بَعْدِهَا وَهُوَ
الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

③ یٰۤاٰیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ
هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرِ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

① حمد و ثنا مخصوص اس خدا کے لیے ہے کہ جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، وہی خدا کہ جس نے فرشتوں کو رسول قرار دیا ہے کہ جو دو، تین تین اور چار چار پروں والے ہیں، وہ جتنا چاہتا ہے آفرینش میں اضافہ کر دیتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

② خدا جس رحمت کو لوگوں پر کھول دے اُسے کوئی نہیں روک سکتا، اور خدا جس

کو روک لے اس کے سوا کوئی شخص اس کے بھیجنے پر قدرت نہیں رکھتا، اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

③ اے لوگو! تم اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو، کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق ہے کہ جو آسمان و زمین سے تمہیں روزی دے؟ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اس حالت میں تم باطل کی طرف کس طرح منحرف ہوتے ہو۔

تفسیر

بند دروازوں کا کھولنے والا وہی ہے

اس سورہ کی ابتدا سورہ "حمد" و "سبأ" اور "کہف" کی طرح پروردگار کی حمد سے ہوتی ہے اس کی حمد و ثنا وسیع عالم ہستی کی خلقت و آفرینش کی بنا پر فرماتا ہے: "حمد مخصوص ہے اس خدا کے ساتھ کہ جو آسمان اور زمین کا خالق ہے" اور عالم ہستی کی تمام نعمات و مواہب کا سرچشمہ اسی کا وجود ذی جود ہے (الحمد لله فاطر السماوات والارض)۔

"فاطر" بطور کے مادہ سے اصل میں شگافتہ کرنے کے معنی میں ہے اور چونکہ موجودات کی آفرینش خلقت عدم کے شگافتہ ہونے اور نور ہستی کے باہر آنے کی مانند ہے اس لیے یہ تعبیر خلقت و آفرینش کے معنی میں استعمال ہوتی ہے خصوصاً جدید علوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو یہ کہتے ہیں کہ عالم ہستی کا مجموعہ ابتداء میں ایک ہی ٹکڑا تھا کہ جو بتدریج شگافتہ ہوا اور اس سے مختلف حصے جدا ہوئے، خدا کی ذات پاک کے لیے لفظ "فاطر" کا اطلاق اپنے اندر زیادہ واضح اور روشن مفہوم رکھتا ہے۔ ہاں ہم اس کی خالقیت کی بنا پر اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں، کیونکہ جو کچھ بھی ہے اسی کی طرف سے ہے اور کوئی شخص اس کے علاوہ اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتا۔

اور چونکہ اس عالم کی تدبیر۔ اس بنا پر کہ یہ عالم، عالم اسباب ہے۔ پروردگار کی طرف سے فرشتوں کے ذمہ لگائی ہے، لہذا بلا فاصلہ ان کی خلقت اور ان کی عظیم قدرتوں کے متعلق کہ جو پروردگار عالم

۱۔ "فاطر" اور "نظور" کے معنی کے بارے میں چھٹی جلد — (سورہ ابراہیم) کی آیت ۱۰ کے ذیل میں، اور اسی طرح تیسری جلد (سورہ انعام) کی آیت ۱۳ کے ضمن میں بھی، ہم نے بیان کیا ہے۔

نے انہیں عطا کی ہیں گفتگو کرتا ہے: "وہی خدا کہ جس نے فرشتوں کو رسول قرار دیا ہے وہ دو دو تین تین اور چار چار پانچوں کے حامل ہیں" (جعل الملائكة رسلا اولیٰ اجنحة مثنیٰ وثلاث و رباع)۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خدا جتنا چاہتا ہے خلقت میں اضافہ کر دیتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے" (یزید فی الخلق ما یشاء ان الله علیٰ کل شیء و قدید)۔

یہاں تین سوال پیدا ہوتے ہیں:

پہلا سوال یہ ہے کہ ملائکہ اور فرشتوں کی رسالت کی جو اوپر والی آیت میں بیان کی گئی ہے، کس چیز میں ہے؟ کیا یہ رسالت تشریحی ہے؟ یعنی خدا کی طرف سے انبیاء کی طرف اس کے پیغام کا لانا ہے یا یہ رسالت تکوینی ہے؟ یعنی عالم آفرینش میں مختلف فرائض کی ذمہ داری کا سپرد ہونا، جیسا کہ نکات کی بحث میں اس کی طرف اشارہ ہوگا۔ یا یہ دونوں جہت ہیں؟

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ جملے میں آسمان اور زمین کی خلقت کے بارے میں گفتگو تھی، اور زیر بحث جملے میں فرشتوں کے متعدد پردوں کے متعلق گفتگو ہے، کہ جو ان کی قدرت کی نشاندہی کرتا ہے، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے بھی کہ تمام فرشتوں کے لیے رسالت کا بیان ہوا ہے۔

(یہ بات قابل توجہ ہے کہ "الملائکہ" ایسی جمع ہے کہ جس کے ساتھ "لھف" و "لام" آیا ہے لہذا یہ عموم کا معنی دیتا ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "رسالت" ایک وسیع و عریض معنی میں استعمال ہوا ہے کہ جو "رسالت تشریحی" اور "رسالت تکوینی" دونوں کو شامل ہے۔

رسالت کا اطلاق "تشریحی رسالت" پر اور انبیاء کی طرف وحی کے پیغام لانے پر، قرآن میں بہت زیادہ بیان ہوا ہے لیکن اس کا اطلاق "رسالت تکوینی" پر بھی کم نہیں ہے۔

سورہ یونس کی آیت ۲۱ میں بیان ہوا ہے کہ: "ان رسلنا ینکتبون ما تمکرون" "ہمارے رسول (ہمارے فرشتے) ہمارے محروم و فریب کو لکھتے رہتے ہیں"۔

اور سورہ انعام کی آیت ۶۱ میں بیان ہوا ہے کہ: "حتیٰ اذا جاء احدکم الموت توفته رسلنا" (جس وقت تم میں سے کسی کی موت کا وقت آن پہنچتا ہے تو ہمارے رسول اس کی روح قبض کرتے ہیں) سورہ عنکبوت کی آیت ۳۱ میں ان فرشتوں کے بارے میں کہ جو قوم لوط کی سرزمین کو زیر و زبر (ترہ و بالا) کرنے پر مامور تھے یہ بیان ہوا ہے کہ: "ولما جادت رسلنا ابراہیم بالبشریٰ قالوا انا مہلکوا اهل ہذہ القریۃ ان اہلہا کانوا ظالمین" (جس وقت ہمارے رسول ابراہیم کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم اس آبادی میں رہنے والوں کو ہلاک کر دیں گے، کیونکہ وہ منکر لوگ ہیں) قرآن کی دوسری آیات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ فرشتوں کے ذمہ جو مختلف کام لگائے گئے ہیں وہ

ان کی رسالتیں شمار ہوتے ہیں، اس بنا پر رسالت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ فرشتوں کے پردوں سے مراد، اور وہ بھی دو دو، تین تین اور چار چار، کیا ہے؟

بصید نہیں ہے کہ پردہ بال سے مراد یہاں قدرت اور حرکت کی توانائی ہو کہ جس سے بعض دوسروں کی نسبت برتر اور بیشتر رکھتے ہوں۔

لہذا وہ بال و پر میں ان کے لیے سلسلہ مراتب کا قائل ہوا ہے کہ بعض چار بال (مثنیٰ - دو دو) او بعض چھ بال اور بعض آٹھ بال رکھتے ہیں۔

"اجنحة" "جنح" (بروزن جمال) کی جمع ہے، جو پرندوں کے پردوں کے معنی میں ہے کہ جو انسان کے ہاتھوں کی طرح ہیں، اور چونکہ پرندوں کی نقل و انتقال اور ان کی حرکت و فعالیت کا ذریعہ ہوتے ہیں لہذا کبھی یہ لفظ فارسی یا عربی میں حرکت و اعمال کے وسیلہ اور قدرت و توانائی کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے بال و پر جل گئے، جو اس بات کا کنایہ ہے کہ اس سے حرکت و توانائی کی قوت سلب ہو گئی ہے، یا یہ کہ اُس نے فلاں شخص کو اپنے پردہ بال کے نیچے لے لیا، یا یہ کہ انسان کو چاہیے کہ وہ علم و عمل کے دو پردوں کے ساتھ پرواز کرے اور اس قسم کی تمام تعبیرات کہ جو سب کی سب اس لفظ کے کنایہ معنوں کو بیان کرتی ہیں۔

اور دوسرے موارد میں بھی کچھ تعبیرات، مثلاً: "عرش" - "کرسی" - "اور لوج" - "و قلم" ایسی نظر آتی ہیں کہ جن میں عام طور پر ان کے معنوی مفہوم کی طرف ہی توجہ ہے نہ کہ ان کے مادی جسم کی طرف۔

البتہ قرینہ کے بغیر قرآن کے الفاظ کو ظاہری معنی کے بغیر مدہم نہیں کرنا چاہیے، لیکن جہاں واضح قرآن پاتے جاتے ہوں وہاں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جبرائیل (وحی خدا پہنچانے والا) کے چھ سو پر ہیں اور جس وقت اس حالت میں پیغمبر اسلام سے ملاقات کی تو زمین و آسمان کے درمیانی فاصلہ کو پر کر رکھا تھا یہ

یاد ہے کہ "خدا کا ایک فرشتہ ہے کہ جس کے کان کی ٹو سے آٹھ تک کا فاصلہ پانچ سو سال کی راہ ہے (تیز پرواز) پرندے کے ذریعہ"۔

یاد ہے کہ، سنج البلاغہ میں جس وقت پروردگار کے فرشتوں کی عظمت کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے تو فرماتے ہیں کہ:

"ومنہم الثابتۃ فی الارضین السفلیٰ اقدامہم، والمارقاتۃ من

السما العلیا عناقھو، والخارجة من الاقطار ارکانھو، والمناسبة لقواشو العرش اکتافھو۔

بعض فرشتے اس قسم کی عظمت رکھتے ہیں کہ ان کے پاؤں تو زمین کے نچلے طبقے میں قائم ہیں اور ان کی گردن آسمان پر ہی سے برتر ہے ان کے وجود کے ارکان اقطار عالم سے باہر نکلے ہوئے ہیں اور ان کے کندھے عرش پر دو درگاہ کو اٹھانے کے لیے مناسب ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی تعبیرات کو مادی جسمانی پہلوؤں پر حمل نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ ان کی معنوی عظمت اور جہات قدرت کو بیان کرنے والی تعبیرات ہیں۔

اصولی طور پر ہم جانتے ہیں کہ پُر صرف زمین کی فضا میں اُڑنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں کیونکہ کرۂ زمین کے اطراف کو دباؤ ڈالنے والی ہوا نے گھیر رکھا ہے، اور پرندے اپنے پرؤں کے ذریعہ اجواج بڑا پر قرار پاتے ہیں، اور نیچے اوپر آجاسکتے ہیں، لیکن اگر زمین کی فضا کے محیط سے خارج ہو جائیں کہ جس میں ہوا نہیں ہے، تو دواں پر پر دباؤ اُڑنے کے لیے معمولی سے معمولی تاثیر بھی نہیں رکھتے، اور اس لحاظ سے وہ ٹھیک دوسرے اعضاء کے مانند ہوتے ہیں۔

اس سے قطع نظر وہ فرشتہ کہ جس کے پاؤں زمین کی گہرائیوں میں ثبت ہیں اور اس کا سر برتر ہی آسمان سے بالاتر ہے تو اسے جسمانی پرواز کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اس بارے میں بحث کہ فرشتہ جسم لطیف ہے یا مجردات میں سے ہے ایک دوسری بحث ہے کہ جس کی طرف انشاء اللہ نکات کی بحث میں اشارہ ہوگا۔

یہاں پر صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ہم جان لیں کہ پُر دباؤ بال فعالیت اور حرکت و قدرت کا ذریعہ ہیں۔ اور اس مقصد کو ثابت کرنے کے لیے اوپر والے مترادف کافی گویا ہیں، جیسا کہ عرش و کرسی کی بحث میں ہم نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ اگرچہ بلند پائے والے اور چھوٹے پائے والے۔ تختوں کے معنی میں ہے، لیکن مسلمہ طور پر اس سے مراد عالم کے مختلف جہات میں پروردگار کی قدرت ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

«الملائكة لا يأكلون ولا يشربون ولا ينجسون وانما يعیشون بنسيم العرش»

سبح البلاء، خطبہ ۱۔

فرشتے نہ تو کھانا کھاتے ہیں اور نہ پانی پیتے ہیں اور نہ ہی شادی بیاہ کرتے ہیں، وہ صرف نسیم عرش سے زندہ ہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا «یزید فی الخلق مایشاء» وہ خلقت میں جتنا چاہتا ہے اضافہ کر دیتا ہے۔ فرشتوں کے پر دباؤ کے اضافہ کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، یا یہ وسیع معنی رکھتا ہے، کہ جو اس کو بھی شامل ہے اور باقی افزائشوں کو بھی کہ جو آفرینش موجودات میں صورت پذیر ہوتے ہیں۔

ایک طرف تو جملہ کا مطلق ہونا، اور دوسری طرف بعض ایسی اسلامی روایات کہ جو اوپر والی آیات کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ ان میں سے ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے منقول ہوا ہے کہ آپ نے اس جملہ کی تفسیر میں فرمایا کہ:

«هو الوجه الحسن، والصوت الحسن، والشعر الحسن»

«اس سے مراد خوبصورت چہرہ، اچھی آواز اور خوبصورت بال ہیں۔»

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم سے منقول ہے کہ:

«حسنوا القرآن باصوات کفو فان الصوت الحسن یزید القرآن حسنا، وقرأ یزید فی الخلق مایشاء»

«قرآن کو خوبصورت آواز کے ساتھ زینت بخشو، کیونکہ اچھی آواز قرآن کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے، پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی» «یزید فی الخلق مایشاء»

❖ ❖ ❖

پروردگار کی خالقیت اور فرشتوں کی رسالت کا بیان کرنے کے بعد کہ جو فیض خدا کا واسطہ ہیں، اپنی رحمت کو بیان فرما رہا ہے کہ جو تمام عالم ہستی کی بنیاد ہے، فرماتا ہے کہ: «خدا جس رحمت کو لوگوں کے لیے کھول دے اُسے کوئی نہیں روک سکتا» (ما یفتح اللہ للناس من رحمة فلا ممک لها)۔

تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل نور الثقلین جلد ۲ ص ۲۴۹۔

عرش کے معنی کے بارے میں ہم نے چھٹی جلد ص ۱۰۰ (سورہ اعراف ذیل آیت ۵۲) کے ذیل میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

جمع البسیان زیر بحث آیات کے ذیل میں، قدس علی نے اپنی تفسیر میں اس حدیث کو زیر بحث آیت کے ذیل میں پیش کیا ہے۔

”اور جسے روک لے اس کے سوا کوئی شخص اس کے بھیجے پر قدرت نہیں رکھتا“ (اور یمسک فلا مرسل له من بعدہ)۔
”کیونکہ وہ ایسا قدرت والا ہے کہ جو شکست ناپذیر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ عظیم و آگاہ ہے“ (وہو العزیز الحکیم)۔

خلاصہ یہ ہے کہ رحمت کے تمام خزانے اس کے پاس ہیں، اور جس کو وہ لائق سمجھتا ہے اس کو مشمول رحمت کر لیتا ہے، اور جہاں اس کی حکمت کا تقاضا ہو اس کے دروازے کھولی دیتا ہے، اگر تمام جانوں کے لوگ مل کر یہ چاہیں کہ اس دروازے کو کہ جسے اس نے کھولا ہے بند کر دیں یا جس دروازے کو اس نے بند کیا ہے اُسے کھول دیں تو ان میں ہرگز یہ قدرت نہیں ہوگی، یہ حقیقت میں توحید کی ایک شاخ ہے کہ جو دوسری شاخوں کی بنیاد ہے۔ (غور کیجئے)

اس معنی کے مشابہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں بھی بیان ہوا ہے، جہاں کتاب ہے کہ: ”وان یمسک اللہ بضر فلا کاشف لہ الاہو وان یردک بخیر فلا راد لفضلہ یصیب بہ من یشاء من عبادہ وھو الغفور الرحیم“ ”اگر خدا (امتحان یا غلطی کی سزا کے لیے) تجھے کوئی نقصان پہنچاتے تو اس کے سوا کوئی بھی اسے برطرف نہیں کر سکتا، اور اگر وہ تیرے لیے کسی خیر اور بھلائی کا ارادہ کرے تو کوئی شخص اس کے فضل سے مانع نہیں ہوگا، وہ اپنے بندوں میں سے جس شخص کو چاہے اپنا فضل پہنچاتا ہے، اور وہ غفور و رحیم ہے۔“ (یونس - ۱۰۷)

چند توجہ طلب امور

۱۔ ”یفتح“ کی تعبیر ”فتح“ کے مادہ سے کھولنے کے معنی میں ہے، یہ رحمت الہی کے خزانوں کے وجود کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، توجہ طلب بات یہ ہے کہ یہ خزانے ایسے ہیں کہ جو کھلنے کے ساتھ ہی مخلوقات پر جاری ہو جاتے ہیں اور کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور کوئی شخص اس سے مانع نہیں ہو سکتا۔
رحمت کے کھولنے کو اس کے اسماک اور روکنے پر مقدم رکھنا اس بنا پر ہے کہ ہمیشہ خدا کی رحمت اس کے غضب پر مسبق رہتی ہے۔

۲۔ ”رحمت“ کی تعبیر بہت ہی وسیع اور کشادہ معنی رکھتی ہے کہ جو عالم کے سوا جب اور نعمات کو شامل ہے، کبھی معنوی پہلو رکھتی ہے اور کبھی مادی پہلو، اسی بنا پر جب کبھی کوئی انسان تمام ظاہری دروازوں کو اپنے سامنے بند دیکھتا ہے تو پھر بھی وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ رحمت الہی اس کے دل و جان میں جاری و ساری ہے۔ لہذا وہ خوش و خرم اور آرام و مطمئن ہے، اگرچہ وہ زندان کی کال کو ٹھہری

میں گرفتار ہو۔
اس کے برعکس کبھی تمام ظاہری دروازوں کو انسان اپنے اوپر کھلا ہوا دیکھتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے رحمت الہی کے دروازے اس کی جان پر بند ہو گئے ہیں، لہذا وہ اپنے آپ کو اس طرح تنگی اور دباؤ میں محسوس کرتا ہے کہ جیسے دنیا اپنی پوری وسعت کے باوجود اس کے لیے ایک تاریک اور وحشت ناک زندان ہے، اور یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو بہت سے لوگوں کے لیے حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔

۳۔ دو اوصاف ”عزیز و حکیم“ کی تعبیر رحمت کے ”ارسال“ اور ”اسماک“ پر اس کی قدرت کو بیان کرتی ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ کھولنا اور باندھنا ہر جگہ حکمت کی بنیاد پر ہے، کیونکہ اس کی قدرت اس کی حکمت سے مل ہوئی ہے۔
بہر حال اس آیت کے مفہوم و مضمون کی طرف توجہ ایک جو انسان کو اس طرح سکون و آرام پہنچاتی ہے کہ وہ تمام حوادث و مصائب کے مقابلہ میں کھڑا ہو جاتا ہے، اور کسی مشکل سے نہیں ڈرتا، اور کسی کامیابی سے مغرور نہیں ہوتا۔

بعد والی آیت میں ”توحید در عبادت“ کے مسئلہ کی طرف ”توحید در خالقیت و رازقیت“ کی اساس پر اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ: ”اسے لوگو! اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو“ (یا ایھا الناس اذکروا نعمۃ اللہ علیکم)۔

ٹھیک طریقہ سے غور و فکر کرو کہ یہ تمام انعامات اور برکات، اور زندگی کے یہ تمام وسائل و امکانات کہ جو تمہارے اختیار میں قرار دیئے گئے ہیں اور تم ان نعمتوں کے اندر ڈوبے ہوئے ہو، ان کا اصل پیدا کرنے والا کون ہے اور ان کا سرچشمہ کیا چیز ہے؟
”کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق آسمان و زمین سے تمہیں روزی دیتا ہے“ (ہل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض)۔

وہ کون ہے کہ جو سورج کی حیات بخش روشنی اور بارش کے زندہ کرنے والے قطرات اور باونیم

۴۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”فلا یمسک لھا“ کی ضمیر ”نفس“ کی شکل میں ہے اور ”فلا مرسل لہ“ میں مذکر کی شکل میں ہے۔ چونکہ پہلی کامیاب لفظ ”رحمت“ ہے، اور دوسری کا ”ما“ ہے، علاوہ ازیں ”من بعدہ“ ظاہر خدا کی طرف لوٹتا ہے یعنی خدا کے سوا کوئی اس کے کھولنے پر قادر نہیں ہے، یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ ضمیر ”اسماک“ کی طرف لوٹے ہیں ”من بعد اسماک“ کہ جو معنی کے لحاظ سے چنداں فرق نہیں رکھتا۔

کی روح پروردگار سے تباری طرف بھیجتا ہے؟ اور کون ہے وہ کہ جو زمین کے معاون و ذخائر اور مواد غذائی، انواع و اقسام کے نباتات اور پھل اور دوسری برکات اس زمین سے تمہارے لیے نکالتا ہے۔

اب جبکہ تم اس بات کو جانتے ہو کہ ان سب برکات کا سرچشمہ وہی ہے تو پھر جان لو کہ: "اس کے سوا کوئی اور معبود بھی نہیں ہے اور عبادت و پرستش صرف اسی کی ذات پاک کے لائق ہے۔ (لا الہ الاہو)۔"

"اس حالت میں تم کس طرح حق کی راہ سے باطل کی طرف منحرف ہوتے ہو اور اللہ کے بیانے بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہو۔" (غافق توفکون)۔

"توفکون"۔ "افک" (بروزن فکر) کے مادہ سے ہے، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ "افک" ہر اُس چیز کو کہتے ہیں کہ جو اپنی اصلی حالت سے بدل جائے لہذا ہر اُس بات کو کہ جو حق سے انحراف پیدا کرے "افک" کہتے ہیں، اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جھوٹ اور تہمت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ اسی لحاظ سے ہے، البتہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ لفظ جھوٹ اور بڑی بڑی تہمتوں کو بیان کرتا ہے۔

نکتہ

طائفہ قرآن مجید میں

قرآن مجید میں طائفہ کا بہت زیادہ بیان ہوا ہے۔

بہت سی آیات قرآن فرشتوں کی صفات، خصوصیات، فرائض اور وظائف اور ذمہ داریوں کے سلسلہ میں گفتگو کرتی ہیں، یہاں تک کہ قرآن نے طائفہ پر ایمان رکھنے کو خدا، انبیاء اور کتب آسمانی پر ایمان رکھنے کی روایت میں قرار دیا ہے، اور یہ چیز اس مسئلہ کی بنیادی اہمیت کی دلیل ہے و لا امن الرسول

بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون کل امن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسولہ

"پیغمبر اسلام اس چیز پر کہ جو ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے ایمان لائے، اور مؤمنین بھی خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور رسولوں سب پر ایمان لائے ہیں۔" (بقرہ-۲۸۵)

اس میں شک نہیں کہ فرشتوں کا وجود اور غیبیہ میں سے ہے کہ جس کے ثابت کرنے کے لیے ان صفات و خصوصیات کے ساتھ اذکار نقلیہ کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں ہے اور ایمان بالغیب کے حکم کے مطابق انہیں قبول کرنا چاہیے۔

قرآن مجید ان کی خصوصیات کو مجموعی طور پر اس طرح شمار کرتا ہے:

۱۔ فرشتے عاقل اور ہاشور موجودات ہیں اور خدا کے گرامی قدر اور معزز بندے ہیں؛ (بل

عباد مکرمون)۔ (انبیاء-۲۶)

۲۔ وہ خدا کے تابع فرمان ہیں اور ہرگز اس کی معصیت و نافرمانی نہیں کرتے؛ (لا یسبقونہ بالقول

وہم بامرہ یعملون) (انبیاء-۲۷)

۳۔ وہ خدا کی طرف سے اہم اور بہت ہی متنوع ذمہ داریاں اور وظائف اپنے ذمہ رکھتے ہیں۔

ایک گروہ حاملین عرش کا ہے۔ (حاقہ-۱۷)

ایک گروہ مدبر امر ہے، (نازعات-۵)

ایک گروہ قابض اور راح فرشتوں کا ہے۔ (اعراف-۳۷)

ایک گروہ اعمال انسانی کا نگران ہے۔ (سورہ انفطار-۱۰ تا ۱۳)

ایک گروہ انسان کی خطرات و حوادث سے حفاظت کرتا ہے۔ (انعام-۶۱)

ایک گروہ سرکش اقوام کو عذاب اور سزا دینے پر مامور ہے۔ (ہود-۷۷)

ایک گروہ جنگوں میں خدا کی طرف سے نوٹین کی مدد کرنے والا ہے۔ (احزاب-۹)

اور بالآخر ایک گروہ انبیاء کے لیے وحی کا پہنچانے والا اور ان کے پاس کتب آسمانی کا

لانے والا ہے۔ (نمل-۲)

اگر ہم چاہیں کہ ان کی ایک ایک ذمہ داری اور ماوریت کو شمار کریں تو بحث طویل ہو جائے گی۔

۴۔ وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں جیسا کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۵ میں بیان ہوا

ہے: "والملائکۃ یسبحون بحمد ربہم ویستغفرون لعن فی الارض" "فرشتے اپنے پروردگار

کی تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں، اور جو لوگ زمین میں ہیں ان کے لیے استغفار کرتے ہیں"

۵۔ اس کے باوجود انسان تکامل و ارتقاء کی استعداد کے مطابق ان سے بھی برتر و افضل تر ہے،

یہاں تک کہ تمام فرشتے بغیر استثنا کے آدم کی خلقت کے وقت اس کے سجدے میں گر پڑے، اور

آدم ان کے معلم قرار پائے۔ (بقرہ-۳۰-۳۲)

۶۔ وہ کبھی انسان کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور انبیاء بلکہ غیر انبیاء کے سامنے بھی آتے

ہیں، جیسا کہ سورہ مریم میں بیان ہوا ہے کہ: "ایک عظیم حسدانی فرشتہ ایک سوزوں اور ٹھیک ٹھاک

انسان کی شکل میں مریم کے سامنے ظاہر ہوا۔" (فارسلنا الیہا روحنا فتعثل لہا بشرًا سوئیًا)۔ (مریم-۱۷)

دوسرے مقام پر انسانوں کی شکل میں ابراہیم و لوط پر ظاہر ہوئے۔ (ہود-۶۹-۷۷)

یہاں تک کہ ان آیات کے ذیل میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوم لوط نے بھی انہیں سوزوں انسانی

شکلوں میں دیکھا تھا۔ (ہود-۷۸)

کیا چہرہ انسانی میں ظہور ایک واقعیت یعنی ہے، یا قوت ادراک میں تیشیل و تصرف ہے آیات قرآنی کا ظاہر پہلا معنی ہے۔ اگرچہ بعض بزرگ مفسرین نے دوسرے معنی کا انتخاب کیا ہے۔

۷۔ روایات اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ کسی طرح بھی انسان کے ساتھ قابل قیاس نہیں ہیں جیسا کہ ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جس وقت لوگوں نے آنحضرت سے پوچھا کہ کیا فرشتوں کی تعداد زیادہ ہے یا انسانوں کی تو آپ نے فرمایا: ”قسم ہے اس خدا کی کہ جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، آسمانوں میں خدا کے فرشتوں کی تعداد زمین کے خاک کے ذرات سے بھی زیادہ ہے اور آسمان میں ایک قدم رکھنے کی جگہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہاں ایک فرشتہ خدا کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے“۔

۸۔ وہ نہ غذا کھاتے ہیں، نہ پانی پیتے ہیں اور نہ ہی نکاح و ازدواج کرتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادق سے منقول ہے:

”ان الملائكة لا يأكلون ولا يشربون ولا ينكحون وانما يبشون بنسب العرش“

”فرشتے نہ کھانا کھاتے ہیں نہ پانی پیتے ہیں اور نہ ہی نکاح و ازدواج کرتے ہیں وہ تو صرف نسیم عرش سے زندگی بسر کرتے ہیں۔“

۹۔ نہ انہیں نیند آتی ہے نہ سستی و غفلت ان پر طاری ہوتی ہے جیسا کہ حضرت علیؑ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ:

”ليس فيهم فتره، ولا عندهم غفلة، ولا فيهم معصية.... لا يغشاهم نوم العيون ولا سهو العقول، ولا فتره الابدان، لم يسكنوا الاصلاب ولو تضمنهم الراحام“

”نہ ان میں سستی ہے اور نہ غفلت، نہ عصیان و نافرمانی ہے اور نہ ہی ان پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ ان کی عقل سہو و نسیان میں گرفتار نہیں ہوتی، ان کا بدن سستی کی طرف مائل نہیں ہوتا، اور وہ بالوں کے صلب اور ماؤں کے رحم میں

۱۔ بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۴۹ (حدیث ۷۰۰) اس سلسلے میں اور دوسری بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں۔

۲۔ بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۴۳ (حدیث ۲)۔

تسار نہیں پاتے بلکہ

۱۰۔ وہ مختلف مقامات اور متفاوت مدارج رکھتے ہیں، بعض ہمیشہ رکوع میں ہیں، اور بعض ہمیشہ سجدے میں ہیں۔

”مامتا الاله مقام معلوم وانما لنحن الصائقون وانما لنحن المسبحون“

”ہم میں سے ہر ایک معلوم مقام رکھتا ہے، ہم ہمیشہ صفت کشیدہ اس کے فرمان کے منتظر رہتے ہیں اور مسلسل اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں“ (صافات: ۱۶۶ تا ۱۶۴) امام صادق فرماتے ہیں:

”وان لله ملائكة ركنًا الى يوم القيامة وان الله ملائكة سجداً الى يوم القيامة“

”خدا کے کچھ فرشتے ایسے ہیں کہ جو قیامت تک رکوع میں ہیں اور کچھ فرشتے ایسے ہیں کہ جو قیامت تک سجدے میں ہیں“۔

ملائکہ کے اوصاف اور ان کے اصناف سے زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرنے کے لیے کتاب ”السماء والعالم“۔ بحار الانوار، ابواب الملائکہ (جلد ۵۹ ص ۳۲۴ تا ۳۲۶) کی طرف رجوع فرمائیں اسی طرح شیخ البلاغہ خطبہ ہائے اول و ۹۱۔ خطبہ اشباح: ۱۰۹ و ۱۰۷ سے رجوع کریں۔

♣ ♣ ♣

کیا ان اوصاف کے باوجود کہ جو فرشتوں کے بارے میں بیان ہوئے ہیں وہ کوئی مجرد وجود ہیں یا مادی؟

اس میں شک نہیں کہ وہ ان اوصاف کے ساتھ اس کیفیت عنصری مادہ سے تو نہیں ہو سکتے، لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے، کہ وہ اجسام لطیفہ سے خلق ہوئے ہیں، ایسے اجسام کہ جو اس عام مادہ سے مافوق ہو کہ جس سے ہم آشنا نہیں۔

فرشتوں کے لیے ”تجدد مطلق“ کا اثبات، جتنی زمان و مکان اور اجزاء سے ”تجدد کوئی آسان کام نہیں ہے، اور اس مسئلہ کے بارے میں تحقیق بھی کوئی زیادہ فائدہ مند نہیں ہے، زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم فرشتوں کو ان اوصاف کے ساتھ کہ جن کے ساتھ قرآن اور مسلمہ روایات اسلامی نے ان کی توصیف کی

۱۔ بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۴۵۔

۲۔ بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۴۳۔

ہے انہیں پہچانیں، اور انہیں خدا کی عظیم اور عمدہ موجودات میں سے ایک عظیم نوع سمجھیں، بغیر اس کے کہ ہم ان کے لیے مقام بندگی اور عبودیت کے سوا کسی اور مقام و مرتبہ کے ان کے لیے قائل ہوں اور انہیں خلقت یا عبادت میں خدا کا شریک سمجھیں، کیونکہ یہ شرک اور کفر محض ہے۔

فرشتوں کے بارے میں ہم اسی قدر بحث پر قناعت کرتے ہیں اور اس کی تفصیل ان کتب کے حوالہ کرتے ہیں کہ جو خصوصیات کے ساتھ اس سلسلہ میں لکھی گئی ہیں۔

تورات کی بہت سی عبارتوں میں فرشتوں کو "خداؤں" کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کہ جو شرک اولاد تعبیر ہے۔ اور موجودہ تورات کی تخریص کی نشانیوں میں سے ہے، لیکن قرآن مجید اس قسم کی تعبیروں سے پاک اور سزہ ہے۔ کیونکہ قرآن ان کے لیے مقام بندگی و عبادت اور احکام و فرامین الہی کے اجراء کے سوا اور کسی مقام کا قائل نہیں ہوا ہے۔ یہاں تک کہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کی مختلف آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کامل کا مقام فرشتوں سے بالاتر اور بالاتر ہے۔

۴) وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ

وَاللَّهُ تَرْجَعُ الْأُمُورُ ۝

۵) يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ

الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمُ بِاللَّهِ الْغُرُورُ ۝

۶) إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا إِنَّمَا يَدْعُوا

حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝

۷) الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝

ترجمہ

۴) اگر وہ تجھے جھٹلا میں (تو غم نہ کرو یہ کوئی نئی بات نہیں) تجھ سے پہلے جو پیغمبر

تھے انہیں بھی جھٹلایا گیا تھا، اور تمام کام خدا ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔

۵) اے لوگو! خدا کا وعدہ حق ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ زندگانی دنیا تمہیں مغرور کر

دے اور کہیں شیطان تمہیں دھوکا دے کہ خدا (کے کرم) سے مغرور نہ کر دے۔

۶) یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے، تم اس کو اپنا دشمن سمجھو وہ تو صرف اپنے ہی

حزب (گروہ) کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ جلانے والی (جہنم کی) آگ

والے ہو جائیں۔

۷) جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان کے لیے عذاب شدید ہے اور جو ایمان

لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

تفسیر

دنیا اور شیطان تمہیں فریب نہ دے

اس سورہ کی آیات کے دوسرے حصہ میں اس گفتگو کے بعد کہ جو توحید و خالقیت و رازقیت کے سلسلہ میں تھی پہلے رُوئے سخن پیغمبر کی طرف اور پھر عام لوگوں کی طرف کرتے ہوئے ان کے عمل پر دو گرام کی گزشتہ عقیدے سے متعلق پر دو گرام کے بعد تشریح کرتا ہے۔

پہلے پیغمبر کو اپنی راہ پر چلنے کے لیے استقامت کا درس دیتا ہے، کہ جو آپ کے لیے اہم ترین درس ہے، فرماتا ہے کہ: "اگر وہ تیری تکذیب کریں تو غم نہ کرو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، تجھ سے پہلے جو پیغمبر ہوئے ہیں ان کی بھی تکذیب کی گئی تھی" (وان یکذبوک فقد کذبت رسل من قبلك)۔

انہوں نے بھی اس راہ میں ثابت قدمی سے کام لیا، جب تک فرض رسالت کو ادا نہ کر لیا بیٹھے نہیں تھے۔ تم بھی مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور ادا نہ کرنا رسالت کو نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

"اہم بات یہ ہے کہ تمام کام خدا ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ ہر چیز پر ناظر اور ہر کام کا حساب کتاب کرنے والا ہے" (والی اللہ ترجع الامور)۔

وہ اس راہ میں تیری زحمت و تکالیف کو ہرگز بے اعتنائی سے نہیں دیکھتا جس طرح سے کہ ان ہٹ و دھرم مخالفین کے جھٹلانے کو بغیر سزا دینے نہیں چھوڑتا، اگر قیامت کا دن آنے والا نہ ہوتا تو پریشانی کا مقام تھا، لیکن اس عظیم واگاہ اور اس عظیم دن کے لیے لوگوں کے تمام اعمال کی مثبت مضبوطی ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے پریشانی کی کونسی بات ہے؟

اس کے بعد انسانوں کے اہم ترین پر دو گرام کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "اے لوگو! خدا کا وعدہ حق ہے" (یا ایھا الناس ان وعد اللہ حق)۔

قیامت، حساب و کتاب، میزان، مجازات، کیف، جنت، جہنم سب کے سب ایسے وعدے ہیں کہ جو خدا نے قادر و حکیم کی طرف سے پورے ہونے والے ہیں۔

اس وعدہ حق کی طرف توجہ کرتے ہوئے: "کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیاوی زندگی تمہیں دھوکہ دے دے، اور دھوکہ دینے والا شیطان کہیں تمہیں فریب نہ دے دے، اور خدا کے عفو و کرم سے مغرور نہ ہو کر کہے: فلا تغربکموا الحیوة الدنیاء ولا یغربکموا باللہ الغرور)۔

ہاں سرگرم کرنے والے عوامل اور اس جہان کے دل فریب ٹھاٹھ باٹھ چاہتے ہیں کہ تمہارے ساؤ دل کو ان سے بھر دیں، اور اس عظیم خدائی وعدے سے غافل بنا دیں۔

شیاطین، جن دانس فریب کاری کے گونا گوں وسائل کے ساتھ لگاتار دوسوہ میں مشغول ہیں، وہ بھی چاہتے ہیں کہ تمہاری ساری فکر کو اپنی طرف مشغول رکھیں اور اس عظیم روزِ موعود سے کہ جو آگے آ رہا ہے اس سے نہیں بخوف کر دیں، کہ اگر ان کے مکر و فریب اور دوسوہ سے مؤثر ہو جائیں تو پھر تمہاری ساری زندگی تباہ و برباد اور تمہاری سعادت کی آرزو نقش بر آب ہو جائے گی لہذا ان سے بھی بچتے رہو۔ لوگوں کو بار بار اس بات کی تنبیہ کرنا کہ نہ تو وہ شیطان و دوسوہ سے مغرور ہوں اور نہ ہی دینے واقع میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان میں گناہ کے نفوذ کی دورا ہیں ہیں۔

۱۔ دنیا کے فریب دینے والے مظاہر، جاہ و جلال اور مال و منال اور طرح طرح کی خواہشات۔
۲۔ خدا کے عفو و کرم پر مغرور ہونا، اور یہ وہ مقام ہے کہ جہاں شیطان ایک طرف تو اس عالم کے ٹھاٹھ باٹھ کو انسان کی نگاہ میں زینت دیتا ہے، اور اس کو ایک نقد متاع، پرکشش اور قیمتی اور دوست رکھنے کے لائق چیز ظاہر کرتا ہے۔

اور دوسری طرف جب انسان یہ چاہتا ہے کہ قیامت اور پروردگار کی عظیم واگاہ کو یاد کر کے اپنے آپ کو دنیا کے فریب اور اس کی شدید کشش کے مقابلہ میں کنٹرول کرے تو وہ اس کو عفو الہی اور اس کی رحمت کی وسعت کا بیان کر کے مغرور کر دیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اُسے گناہ اور سہکشی کی دعوت دیتا ہے۔

وہ اس بات سے غافل ہے کہ خدا جس طرح رحمت کے مقام پر "ارحمو الراحمین" (سب سے زیادہ رحم کرنے والا) ہے، سزا اور کیفر کے مقام پر "اشد العاقبین" (سب سے سخت عقاب کرنے والا) بھی ہے، اس کی رحمت کبھی بھی گناہ کا شوق پیدا نہیں کرتی جیسا کہ اس کا غضب یا اس و نا امیدی کا سبب نہیں ہو سکتا۔

"غرور" (بروزن جور) مبالغہ کا صیغہ ہے اور اُس موجود کے معنی میں ہے کہ جو حد سے زیادہ فریب کار ہو، اور یہاں ممکن ہے کہ اس سے فریب کاری کا ہر عامل مراد ہو، جیسا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے خصوصیت کے ساتھ شیطان مراد ہو۔

البتہ دوسرا معنی بعد کی آیت کے ساتھ زیادہ مناسب ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ قرآنی آیات میں بار بار "فریب و غرور" کی شیطان کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں ایک تجزیہ کیا ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔
وہ افراد کہ جو عوامل فریب کے مقابل قرار پاتے ہیں، تین گروہ ہیں:

ایک گروہ تو اس قدر ضعیف و ناتواں ہوتا ہے کہ جو معمولی سی چیز سے دھوکا کھا جاتا ہے۔ دوسرا گروہ کہ جو ان سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے وہ صرف دنیا کے مٹھاٹھ باٹھ اور زرق برق سے فریفتہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف اس صورت میں فریب کھاتے ہیں کہ کوئی طاقتور دوسرے ڈالنے والا انہیں تحریک کرے اور ان کے مفاسد اعمال کو ان کی نظر میں ہلکا کر کے پیش کرے، لہذا ایک طرف سے تو جلدی گزر جانے والی لذتیں اور دوسری طرف سے دوسرے انہیں بڑے اعمال کے انجام دینے پر ابھارتے ہیں۔

تیسرا گروہ وہ ہوتا ہے کہ جو ان سے بھی زیادہ طاقتور اور قوی ہے جو نہ تو خود ہی مغرور ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی دوسرا انہیں فریب دے سکتا ہے۔

”لا تغربنکم الحیاة الدنیا“ کا جملہ پہلے گروہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور ”ولا یغربنکم باللہ الغرور“ کا جملہ دوسرے گروہ کی طرف، اور باقی رہا تیسرا گروہ تو وہ درحقیقت ”ان عبادی لیس لک علیہم سلطان“ کے عنوان میں داخل ہے یہ

بعد والی آیت تمام مومنین کو، ان شیطانی دوسروں کے مسئلہ سے مربوط کہ جس کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہوا تھا، ایک تشبیہ ہے، کہتا ہے کہ: ”شیطان یقیناً تمہارا دشمن ہے، تم بھی اس کو اپنا دشمن سمجھو“ (ان الشیطان لکم عدو فانتخذوہ عدواً)۔

اس کی دشمنی آدم کی پیدائش کے پہلے دن سے ہی شروع ہو چکی تھی اور جس وقت وہ آدم کو سجدہ کرنے کے بارے میں حکم خدا کو تسلیم نہ کر کے راندہ درگاہ ہو گیا تو اس نے قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ کے لیے آدم اور اس کی اولاد سے دشمن رکھے گا، یہاں تک کہ اس کام کے لیے خدا سے مصلحت اولیٰ طویل عمر کا تقاضا کیا۔

وہ اپنی کسی ہوئی بات پر اڑا ہوا ہے، اور دشمن نکالنے کے لیے اور تم پر ضرب لگانے کے لیے تھوڑی سے تھوڑی فرصت کو بھی غنیمت شمار کرتا ہے۔ کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ تم اس کو اپنا دشمن نہ سمجھو اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے غافل رہو؟ چہ جائیکہ تم یہ چاہنے لگو کہ خطوات شیطان اور اس کے قدموں کی پیروی کرو، یا یہ کہ تم اسے اپنا شفقت کرنے والا رفیق اور صبح دوست سمجھنے لگو، (انتخذونہ وذریبہ اولیاء من دونی وهو لکم عدو) ”کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو میسر ہی بجائے اپنا دوست بناتے ہو، درحالیہ کہ وہ تمہارا بہت ہی سخت دشمن ہے“ (کہتے ہیں - ۵۰)

علاوہ ازیں وہ ایک ایسا دشمن ہے کہ جو ہر طرف سے حملہ کرتا ہے، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے: ”نحوہ لیتینہو من بین ید یدیہو ومن خلفہو وعن ایمانہم وعن شمالہم“ (پھر میں ہر طرف سے اولاد آدم کے پاس آؤں گا، ان کے آگے سے بھی، ان کے پیچھے سے بھی ان کے دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی)۔ (اعراف - ۱۷)

خصوصاً وہ جبکہ ایسی کمین گاہ میں ہے کہ: ”وہ تو انسان کو دیکھتا ہے، لیکن انسان اسے نہیں دیکھتا“ (انہ یراکو هو وقبیلہ من حیث لا ترونہو) ”شیطان اور اس کا قبیلہ تو تمہیں دیکھتا ہے، جبکہ تم اس کو نہیں دیکھتے“ (اعراف - ۲۷)

البتہ یہ بات اس کے دوسروں کے مقابلہ میں تمہارے اپنے آپ سے قدرت و دفاع میں مانع نہیں ہے۔

موسٰی بن عمران کو پروردگار کی وصیتوں میں ایک عمدہ تعبیر بیان ہوئی ہے، جیسا کہ امیر المومنین حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ خدا نے موسٰی سے فرمایا: میں تمہیں چار وصیتیں کرتا ہوں انہیں یاد رکھنا:

اولاً: ”مادمت لا تری ذنوبک تغرب فلا تشغل بعیوب غیرک“

والثانیة: ”مادمت لا تری کنوزی قد نفذت فلا تفتن بعباد ربک“

والثالثة: ”مادمت لا تری زوال ملکک فلا تخرج احدًا غیرک“

والرابعة: ”مادمت لا تری الشیطان میتا فلا تأمن مکرہ“

”پہلی وصیت تو یہ ہے کہ جب تک تو اپنے گناہوں کو بخشا ہوا نہ دیکھ لے دوسروں کی عیب جوئی نہ کر۔

دوسری وصیت یہ ہے کہ جب تک تو میرے خزانوں کو ختم ہونے والا نہ دیکھ لے

اپنی روزی کے لیے غمناک نہ ہو۔

تیسری وصیت یہ ہے کہ جب تک تو میری حکومت کو زائل ہونے والا نہ دیکھ لے

میرے علاوہ کسی اور سے امید نہ باندھنا۔

چوتھی وصیت یہ ہے کہ جب تک تو شیطان کو مرا ہوا نہ دیکھ لے اس وقت تک اس

کے مکر و فریب اور اس کے مضبوطوں سے امن میں نہ رہ۔“

بہر حال بنی آدم کے ساتھ شیطان کی دشمنی ایک ایسا مضمون ہے جس کی طرف قرآن کی بہت سی آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ بار بار تکرار کے ساتھ اسے ”عدو مبین“

(دافع دشمن) کے عزمان سے یاد کیا گیا ہے بلکہ

اس قسم کے دشمن سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے کتا ہے: ”وہ تو صرف اپنے ہی گروہ کو اس لیے دعوت دیتا ہے تاکہ وہ جہنم کی جلانے والی آگ میں داخل کیے جائیں“ (انصاید عواہزیہ لیکونوا من اصحاب السعیر)۔

”حزب“ اصل میں جماعت اور ایسے گروہ کے معنی میں ہے کہ جو تشکل اور شدت عمل کا حامل ہو، لیکن عام طور پر ہر اس گروہ اور جمعیت کے لیے بولا جاتا ہے کہ جو ایک خاص پروگرام اور مقصد کی پیروی کرتا ہے۔

”حزب شیطان“ سے مراد اس کے پیروکار اور وہ لوگ ہیں کہ جو اس کے کئے پر عمل کرتے ہیں۔

الہیہ شیطان ہر شخص کو اپنے حزب کا رسمی ممبر نہیں بنا سکتا، اور نہ ہی انہیں جہنم کی طرف دعوت دے سکتا ہے، اس کے حزب کے افراد تو وہ ہیں جن کا قرآن کی دوسری آیات میں بیان ہوا ہے، اور وہ ذیل کی نشانیاں رکھتے ہیں:

وہ لوگ کہ جنہوں نے اس کی بندگی اور ولایت و دوستی کا طوق اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے۔ انصا
سلطانہ علی الذین یتولونہ،، ”اس کا تسلط صرف ان افراد پر ہے کہ جو اس کی ولایت کو
قبول کرتے ہیں“ (نہل - ۱۰۰)

”وہ لوگ کہ جن پر شیطان کا غلبہ ہے اس طرح سے کہ ان سے خدا کی یاد کو بھلا دیا ہے وہ شیطان
کا حزب ہے اور شیطان کا حزب ہی واقعی زیاں کار ہے“ (استحوذ علیہم الشیطان فانسلھو
ذکر اللہ اولئک حزب الشیطان الا ان حزب الشیطان ہم الخاسرون)۔ (مجادلہ - ۱۸)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں تین مقامات پر تو حزب اللہ کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور تین ہی مقامات پر حزب شیطان کے بارے میں، تاکہ دیکھیں کہ کون کون سے افراد اس حزب میں اپنا نام لکھاتے ہیں، اور کون سے اس حزب کے ممبر بنتے ہیں۔

لیکن بہر حال یہ طبعی امر ہے کہ شیطان اپنے حزب کو کس چیز کی دعوت دیتا ہے، آلودگی اور گناہ کی، شہوات کی پبیدی کی، شرک و فنیان کی ظلم و ستم کی، اور آخر کار جہنم کی آگ کی طرف بلانے
ہم انشاء اللہ ”حزب اللہ“ اور ”حزب الشیطان“ کی خصوصیات کے بارے میں مزید تفصیل سورہ
مجادلہ کی آیہ ۲۲ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

آخری زیر بحث آیت میں حزب اللہ کا انجام کار اور حزب الشیطان کی دردناک عاقبت کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ: ”جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے تو وہ مغفرت اور اجر عظیم کے مستحق ہیں“ (الذین کفروا لہم عذاب شدید والذین آمنوا وعملوا الصالحات لہم مغفرة واجر کبیر)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں عذاب کے استحقاق کے لیے تو صرف مسئلہ کفر پر قناعت کرتا ہے، لیکن مغفرت اور اجر کبیر کے مسئلہ میں ایمان کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ ”عمل صالح“ کا بھی اس پر مزید اضافہ کرتا ہے، کیونکہ کفر تو تنہا ہی عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا سبب ہے، لیکن ایمان عمل کے بغیر سبب نجات نہیں ہوگا، بلکہ ایمان و عمل ایک لحاظ سے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں بلکہ

اوپر والی آیت میں آخر میں پہلے مغفرت کے بارے میں گفتگو ہے، اس کے بعد اجر کبیر کے بارے میں، کیونکہ مغفرت حقیقت میں مومنین کو ابتدا میں گناہوں سے دھو کر پاک کر دیتی ہے، اس کے بعد اس کو ”اجر کبیر“ کے قبول کرنے کے لیے آمادہ و تیار کر دیتی ہے۔ اصطلاح کے مطابق اولیٰ تخلیہ ہے اور دوسرا تحلیل ہے۔

۱۔ آیہ ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷

۸) أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَاهُ حَسَنًا فَإِنِ اللّٰهُ يُضِلِّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَتٍ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ○

۹) وَاللّٰهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَتُشِيرُ سَحَابًا فَمَسَّهٖ إِلَىٰ بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَآخَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ○

۱۰) مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا ۗ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۗ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۗ وَ مَكْرٌ أُولَٰئِكَ هُوَ يُبْوَرُ ○

ترجمہ

۸) وہ شخص کہ جس کے لیے اُس کا بُرا عمل (اس کی نظروں میں) زینت بنے دیا گیا ہے اور وہ اُسے اچھا اور خوبصورت لگتا ہے (اس شخص کی مانند ہے کہ جو واقع کو اسی طرح سے دیکھتا ہے کہ جس طرح سے وہ ہے) خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اس بنا پر ان کے اوپر شدتِ تاسف کی وجہ سے اپنی جان نہ دے کیونکہ خدا اس سے کہ جو وہ

انجام دیتے ہیں باخبر ہے۔

۹) اور خدا ہی ہے وہ کہ جس نے ہواؤں کو بھیجا تاکہ وہ بادلوں کو حرکت میں لائیں، پس ہم ان بادلوں کو مردہ زمینوں کی طرف بھیجتے ہیں اور ان کے ذریعہ زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتے ہیں، معاد و قیامت بھی اسی طرح ہے۔

۱۰) جو شخص عزت چاہتا ہے (اُسے خدا سے چاہنا چاہیے) کیونکہ ساری عزت خدا ہی کے لیے ہے، پاکیزہ باتیں اس کی طرف صعود کرتی ہیں اور وہ عمل صالح کو اوپر لے جاتی ہیں اور وہ لوگ جو بُرے منصوبے بناتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے، اور اُن کا مکر (اور فساد کی کوششیں) نابود ہو جائیں گی (اور وہ اس میں کامیاب نہ ہوں گے)۔

تفسیر

پاک اور صالح گفتار و کردار خدا کی طرف لے جاتے ہیں

چونکہ گزشتہ آیات میں لوگوں کی دو گروہوں میں تقسیم ہوتی تھی، ایک "گروہ نومن" اور "ایک گروہ کافر" یا ایک گروہ "حزب اللہ اور شیطان کا دشمن" اور دوسرا گروہ "اس کا پیرو اور اس کا حزب" پہلی زیر بحث آیت ان دونوں گروہوں کی ایک اہم خصوصیت کو جو واقع میں ان کے تمام پروگراموں کا سرچشمہ ہے، بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: "کیا وہ شخص کہ جس کے عمل کی برائی اس کی نظروں میں زینت دے دی گئی ہے، اور وہ اس کو ایک اچھی اور خوبصورت بات سمجھتا ہے، اس شخص کی مانند ہے کہ جو واقعات کو بعینہ اسی طرح سے جیسے کہ وہ ہیں - اچھے یا بُرے - درک کرتا ہے؟ (افمن زین) لہ سوو عملہ فراہ حسنًا)۔

حقیقت میں یہ مسئلہ گمراہ اور ہٹ دھرم قوموں کی سب بد بختیوں کی کلید ہے۔ کیونکہ ان کے تمام بُرے اعمال، ان کے سیاہ دل اور خواہشاتِ نفسانی سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے ان کی نظر

میں خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔

یہ بات محتاج ثبوت نہیں ہے کہ اس قسم کا آدمی نہ تو وعظ و نصیحت کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی تنقید کو سننے کے لیے آمادہ ہوتا ہے، اور نہ ہی اپنی رفتار کو بدلنے پر تیار ہوتا ہے۔

نزدہ اپنے اعمال کے سلسلہ میں تجزیہ و تحلیل کرتا ہے اور نہ ہی ان کے انجم سے ڈرتا ہے۔ اور اس سے بالاتر بات یہ ہے کہ جس وقت برائی اور اچھائی یا قباحت و زیبائی کی بات چڑتی ہے، تو اچھائیوں اور زیبائیوں کی ضمیر کا مرجع اپنی ذات کو سمجھتا ہے، اور برائیوں اور قباحتوں کی ضمیر کا مرجع مومنین کو۔ اور کہتے ہی کفار لہجہ ایسے میں کہ جس وقت انہوں نے حزب شیطان پر گزرتے ہوئے عذاب اور ان کے انجام کے بارے میں سنا تو انہوں نے اس کو سچے مومنین پر منطبق کر دیا اور خود اپنے آپ کو حزب اللہ کا مصداق شمار کیا۔

اور یہ ایک بہت ہی بڑی مصیبت اور دکھ کی بات ہے۔

لیکن وہ کون ہے کہ جو بدکاروں کے بُرے اعمال کو ان کی نظر میں جلوہ دیتا ہے؟ کیا خدا؟ یا ہوائے نفس؟ یا شیطان؟

اس میں شک نہیں کہ عامل اصلی تو ہوائے نفس اور شیطان ہی ہے، لیکن چونکہ یہ اثر خدا نے ان کے اعمال میں پیدا کیا ہے لہذا انہیں خدا کی طرف بھی منسوب کیا جاسکتا ہے، کیونکہ انسان جب کسی گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں تو ابتداء میں چونکہ ان کی فطرت پاک اور ان کا وجدان بیدار اور ان کی عقل واقع میں ہوتی ہے لہذا وہ اپنے بُرے عمل سے بے چین اور پریشان ہوتے ہیں۔ لیکن جس قدر وہ اُس عمل کو دہراتے ہیں تو ان کی پریشانی میں کمی ہوتی جاتی ہے۔

آہستہ آہستہ وہ بے پردا ہی کے مرحلہ تک پہنچ جاتے ہیں اور اگر پھر بھی اس عمل کو دہراتے رہیں تو برائیاں ان کی نظر میں اچھائیاں ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے لیے افتخارات اور فضائل شمار کرنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ بدبختی کی منجھار میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جس وقت قرآن اس سوال کو پیش کرتا ہے کہ: "کیا وہ شخص کہ جس کے عمل کی برائی اس کی نظر میں مرتبہ کر دی گئی ہے اور وہ اسے زیا اور خوبصورت نظر آتی ہے...." تو اس کے نقطہ مقابل کو صراحت کے ساتھ ذکر نہیں کرتا۔ گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ سننے والے کو ایک وسیع گنجائش دے تاکہ وہ ان مختلف امور کو کہ جو نقطہ مقابل بن سکتے ہیں اپنی نظر میں مجسم کرے۔ اور انہیں زیادہ سے زیادہ سمجھ سکے۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ کیا اس قسم کے افراد واقع میں انسداد کی طرح ہیں؟

کیا اس قسم کے آدمی کے لیے بھی نجات کی امید ہے؟

اس کے بعد قرآن ان دونوں گروہوں کے درمیان فرق کا سبب بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "خدا جس شخص کو چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت کرتا ہے" (فان اللہ یضلل من یشاء ویہدی من یشاء)۔

اگر پہلے گمراہی کے اعمال ان کی نظر میں زینت دے دیئے گئے ہیں تو یہ خدا کی طرف سے انہیں گمراہی میں رکھنے کا نتیجہ ہے، وہی خدا ہے کہ جس نے بُرے اعمال کی تکرار میں یہ خاصیت قرار دے دی ہے کہ نفس انسانی اس کا خوگر ہو جاتا ہے اور اس کے ہم رنگ اور ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

اور وہی خدا ہے کہ جو پاک دل مومنین کو ایسی ناقہ وینا آنکھیں اور ایسے کان۔ کہ جو حقائق کو اس طرح درک کرنے والے ہوں جیسے کہ وہ ہیں۔ بخشا ہے۔

واضح رہے کہ یہ مشیت الہی اس کی حکمت کے ساتھ توام ہے۔ اور ہر شخص کو جس کا وہ لائق ہے اس کو وہی دیتا ہے۔

اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "مبادا ان کی وضع و کیفیت پر شدت تاسف اور حسرت کے زیر اثر تو اپنی جان دے بیٹھے" (فلا تذهب نفسک علیہم حسرات)۔

یہ تعبیر اسی تعبیر کی طرح ہے کہ جو سورہ شعراء کی آیت ۳ میں بیان ہوئی ہے: (لعلک باخع نفسک الایکونوا مؤمنین) "گویا تو چاہتا ہے کہ اپنی جان گنوا بیٹھے کہ وہ ایمان نہیں لاتے"۔

"حسرات" کی تعبیر کہ جو اصطلاح کے مطابق "مفعول لاجلہ" ہے گزشتہ جملہ کے لیے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تو نہ صرف ایک ہی حسرت ان کے لیے رکھتا ہے، بلکہ تجھے ان پر کئی حسرتیں ہیں۔

نعمت ہدایت کو ہاتھ سے دینے کی حسرت، گوہر انسانیت ضائع کرنے کی حسرت، تشخیص کی جس ہاتھ سے دے بیٹھے کی حسرت، یہاں تک کہ وہ برائی کو اچھائی سمجھنے لگے ہیں اور آخر میں پروکار کے تہر و غضب کی آگ میں گرفتار ہونے کی حسرت۔

لیکن تو حسرت نہ کر، "اس لیے کہ خدا ان کے اعمال سے آگاہ ہے اور وہ جس چیز کے لائق ہیں

۱۔ اس سے واضح ہو گیا ہے کہ اس آیت میں ایک جملہ مقدر ہے جو ممکن ہے کہ اس طرح ہو: "کمن لیس کذا الذک.... کمن یصاب نفسہ ویسری القبیح قبیحا.... ہل یرجی لہ صلاح و متاب۔"

۲۔ اوپر والی آیت کے لیے مفسرین نے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ بغیر ان کے آزاروں اور مصلحتوں کی شدت اور سختی سے پریشان نہ ہو کیونکہ خدا ان کے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان سے بر عمل انتقام لے گا۔

دہی چیز انہیں دے گا" (ان الله عليه بما يصنعون)۔

آیت کے ب و لہجہ سے پیغمبر اسلام کی گراہوں اور مخرفین کے بارے میں دل سوزی پورے طور پر ظاہر ہے۔

اور ایک سچے خدائی رہبر کی حالت یہی ہوتی ہے، کہ وہ لوگوں کے حق کو قبول نہ کرنے، اور باطل کے سامنے تسلیم نہ کرنے اور سعادت و نیک بختی کے تمام وسائل کو پس پشت ڈال دینے سے اس طرح غلگلیں ہوتا ہے جیسے کہ وہ اپنی جان ہی دے دے گا۔

بعد والی آیت میں گزشتہ مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے۔ کہ جو ہدایت و ضلالت اور ایمان و کفر کے سلسلے میں گزر چکی ہیں۔ مبداء معاد کے بارے میں مختصر اور واضح بیان کر رہا ہے، اور مبداء معاد کے اثبات کو ایک عمدہ دلیل میں ایک دوسرے کے قریب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا وہی ہے کہ جس نے ہواؤں کو بھیجا تاکہ وہ بادلوں کو چلائیں" (والله الذي ارسل الرياح فتنسفن سحاباً)۔

"پھر ہم ان بادلوں کو مردہ اور خشک زمین کی طرف چلاتے ہیں" (فسقناہ الی بلد میت)۔ اور اس کے ذریعہ ہم زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتے ہیں" (فاجیبنا بہ الارض بعد موتہا)۔

"ہاں! مردوں کا موت کے بعد زندہ ہونا بھی اسی طرح ہے" (كذلك النشور)۔

ایک چچاٹا نظام جو ہواؤں کے چلنے، اور اس کے بعد بادلوں کی حرکت اور اس کے بعد بارش کے حیات بخش قطرات کے برسنے اور اس کے بعد مردہ زمینوں کے زندہ ہونے پر جاری ہے وہ خود بہترین دلیل اور عمدہ ترین گواہ ہے اس حقیقت پر کہ ایک حکیم و داناکا دست قدرت اس کارخانے کے پیچھے برقرار ہے اور وہ اس کی تدبیر کر رہا ہے۔

پہلے گرم اور جلا دینے والی ہواؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہ مناطق استواء سے سرد منطوقوں کی طرف جائیں اور اپنے راستے میں پڑنے والے سمندروں کے پانی کو بخارات میں تبدیل کرتے ہوئے آسمان کی طرف بھیجیں، اس کے بعد قطبین کی طرف سے منظم طور پر چلنے والی ٹھنڈی ہواؤں کو۔ کہ جو ہمیشہ پہلے چلنے والی ہواؤں کے مخالف سمت میں چلتی ہیں۔ حکم دیتا ہے کہ وہ حاصل شدہ بخارات کو جمع کر کے بادلوں کو تشکیل دیں۔

اس بارے میں کہ پہلا فعل ماضی کی شکل میں کیوں آیا ہے (ارسل) اور دوسرا فعل مضارع کی صورت میں (فتنسن) ایک غائب کی صورت میں آیا ہے (ارسل) اور دوسرا مکمل کی صورت میں (فسقناہ) اس کی ماضی نے کئی وجوہ بیان کی ہیں لیکن جو نکل ان میں کوئی دقیق بات نہیں لہذا ان سے صرف نظر کیا گیا ہے، مگر یہ کہ یہ بیان میں تفسیر اور گفتگو میں توجہ کے لیے ہو۔

پھر انہیں ہواؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہ بادلوں کو اپنے دوش پر اٹھا کر مردہ بیابانوں کی طرف دھکیل کر لے جائیں تاکہ بارش کے زندہ کرنے والے قطرات وہاں برسیں۔

پھر مخصوص حالات میں زمین اور ان نباتات کے بیجوں کو کہ جو اس میں بکھیرے ہوئے ہیں، پانی اور نشوونما کو قبول کرنے کا حکم دیتا ہے اور ظاہراً پست و بے قدر و قیمت موجود سے زندہ اور بہت ہی متنوع اور زیبا، خرم و سرسبز اور پُر بار موجودات کو وجود میں لاتا ہے۔ یہ اس کی قدرت کی بھی دلیل ہے اس کی حکمت پر بھی گواہ ہے اور قیامت کبریٰ کی نشانی بھی ہے۔

حقیقت میں اوپر والی آیت چند جہات سے توحید کی طرف دعوت دیتی ہے۔

برہان نظم اور برہان حرکت کے لحاظ سے، کہ ہر متحرک موجود کے لیے کسی محرک کی ضرورت ہے اور نعمتوں کے بیان کے لحاظ سے کہ جو فطری ہونے کی بنا پر منعم کا شکر ادا کرنے کا محرک ہے، اور کسی جہت سے مسئلہ معاد پر بھی دلیل ہے۔

موجودات کے سیر تکامل دار تقار کے لحاظ سے، اور مردہ زمین سے زندگی اور حیات کے چہرہ کے نمودار ہونے کے لحاظ سے، یعنی اسے انسان معاد کا منظر ہر سال کی مختلف فصلوں میں تیری آنکھ کے سامنے اور تیرے پاؤں کے نیچے ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ "فتنسن" کا جملہ "اشارہ" کے مادہ سے مشتق کرنے اور پانچوں کرنے کے معنی میں ہے اور اس مقام پر سمندروں کے اوپر ہواؤں کے چلنے کے اثر سے بادلوں کے پیدا ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے، چونکہ بادلوں کے چلنے کا مسئلہ بعد والے جملہ (فسقناہ الی بلد میت) میں آیا ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ جو ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے منقول ہوتی ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا کہ:

"یا رسول الله کیف یحیی الله الموتی وما ایتة ذالک فی خلقہ؟"

اے اللہ کے رسول! خدا مردوں کو کیسے زندہ کرے گا، اور عالم خلقت میں اس

کی نشانی اور نمونہ کیا ہے؟

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اما مررت بوادی اہلک ممحلا شو مررت بہ یہت زخضرا؟"

کیا تو بھی اپنے قبیلہ کی سرزمین سے نہیں گزرا درانجا ایک وہ مردہ اور خشک تھی

اور پھر تو وہاں سے اس حالت میں نہیں گزرا کہ وہ خرم و سرسبز ہونے کی وجہ سے ایسے لگتی

ہے جیسے کہ حرکت میں آگئی ہے۔

”قلت نعم یا رسول اللہ“

”میں نے عرض کیا جی ہاں اے اللہ کے رسول“

”قال: فكذا لک یحیی اللہ الموتی وتلک آیتہ فی خلقہ“

آپ نے فرمایا: ”خدا اس طرح سے مردوں کو زندہ کرتا ہے اور یہ عالم خلقت میں اس کا نمونہ اور نشانی ہے۔“

ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد نم میں سورہ روم کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں ایک دوسری بحث اس سلسلہ میں بیان کی ہے۔

توحید کی اس بحث کے بعد مشرکین کے ایک بہت بڑے اشتباہ اور غلطی کی طرف۔ کہ وہ اپنے لیے بتوں سے عزت کے خواستگار تھے، اور پیغمبر پر ایمان لانے کو اپنے گرد جمع شدہ لوگوں کی پراگندگی کا سبب سمجھتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ: ”ان نتبع الہدٰی معک نتخطف من ارضنا“ اگر ہم تیرے ساتھ ہدایت کو قبول کریں، تو طاقتور دشمن ہمیں اس سرزمین سے اچک لیں (قصص - ۵۷)۔ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ: ”جو لوگ عزت چاہتے ہیں وہ خدا سے طلب کریں کیونکہ ساری عزت خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے“ (من کان یرید العزۃ فللہ العزۃ جمعاً)۔

”عزت“ ”مفردات“ میں راغب کے قول کے مطابق اصل میں وہ حالت ہے کہ جو انسان کو حکم مضبوط اور ناقابل شکست بنا دیتی ہے، سخت اور حکم زمینوں کو بھی اسی لیے ”عزاز“ (بروزن اساس) کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ صرف اسی کی ذات پاک ہے کہ جو ناقابل شکست ہے۔ در نہ تمام مخلوقات اپنی محدودیت کی بنا پر قابل شکست ہے۔ لہذا ساری عزت اسی کے لیے ہے۔ اور جو شخص بھی عزت حاصل کرتا ہے وہ اسی کے غیر متناہی دریائے عزت کی برکت سے ہے۔

ایک حدیث میں انس سے منقول ہے کہ پیغمبر نے فرمایا:

”ان ربکم یقول کل یوم انا العزیز فمن اراد عزال الدارین فلیطع العزیز!“

”تمہارا پروردگار ہر روز کہتا ہے کہ عزیز میں ہوں پس جو شخص دونوں جہانوں کی عزت

چاہتا ہے وہ عزیز کی اطاعت کرے“

حقیقت میں آگاہ اور باخبر انسان کو چاہیے کہ وہ پانی سرچشمہ سے حاصل کرے کیونکہ وہاں صاف شفاف اور فراواں پانی ہوتا ہے، نہ کہ چھوٹے چھوٹے برتنوں سے، کیونکہ ایک تو وہ محدود ہیں اور دوسرے آلودہ بھی اور وہ اس کے اور اس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔

امام حسن علیہ السلام کے حالات زندگی میں ہم پڑھتے ہیں کہ اپنی زندگی کے آخری وقت میں جبکہ آپ کے ایک صحابی ”جنادہ بن ابی سفیان“ نے آپ سے وعظ و نصیحت کی درخواست کی تو آپ نے قیمتی اور نمونہ نصیحتیں اس کے لیے بیان کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ:

”واذا اردت عزاً بلا عشیرۃ وھیبۃ بلا سلطان فاخرج من ذل

معصیۃ اللہ الی عزطاعۃ اللہ“

”جب تو یہ چاہے کہ قبیلہ و عشیرہ کے بغیر عزیز رہے، اور اقتدار سلطنتی کے بغیر معیبت

رکھے تو خدا کی معصیت کی ذلت سے نکل کر اس کی اطاعت کی عزت کی پناہ میں آجا۔“ (عالم الازار، ج ۱ ص ۳۰۳)

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی بعض آیات میں ”عزت“ کو خدا کے علاوہ پیغمبر اور مومنین

کے لیے بھی قرار دیتا ہے: ”واللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین“ (مناقرن - ۸)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی پروردگار کی عزت کے سایہ سے عزت حاصل کی ہے، اور

اس کی اطاعت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں۔

اس کے بعد عزت حاصل کرنے کی راہ کی اس طرح تشریح کرتا ہے کہ: ”پاکیزہ باتیں اس کی طرف

صعود کرتی ہیں“ (الیہ یصعد الکلم الطیب)۔ ”اور وہ عمل صالح کو اوپر لے جاتا ہے“ (والعمل

الصالح یرفعہ)۔

”الکلم الطیب“ پاکیزہ باتوں کے معنی میں ہے، اور باتوں کی پاکیزگی اس کے مضمون کی

پاکیزگی سے ہوتی ہے اور مضمون کی پاکیزگی ان مفاہیم کی بنا پر ہوتی ہے کہ جو پاک و درخشاں معنی و معنیوں

اور حقیقتوں کے مطابق ہوتے ہیں، اور خدا کی ذات پاک سے بالاتر اور اس کے حق و عدالت کے

آئین سے بالاتر، اور ان نیک اور پاک ہستیوں سے کہ جو اس کی فشر و اشاعت کی راہ میں قدم اٹھاتے

ہیں، سے بڑھ کر اور کونسی حقیقت ہوگی؟

اسی لیے ”الکلم الطیب“ کی، مبداء و معاد اور دین خدا کے بارے میں صحیح اعتقادات

کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔

ہاں! ایسا ہی پاک و پاکیزہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جو خدا کی طرف بلند ہوتا ہے، اور اپنے حال کو بھی

پر پرواز دیتا ہے، تاکہ وہ حق تعالیٰ کے قرب میں جگہ حاصل کرے اور خدائے عزیز کی عزت میں

غلط ہو جائے۔

یقیناً اس پاک و پاکیزہ اصل سے ایسی شاخیں بھوٹتی ہیں کہ جن کا پھل عمل صالح ہے ہر شائستہ

مفید اور اصلاحی کام، چاہے وہ حق کی طرف دعوت ہو، چاہے مظلوم کی حمایت ہو، چاہے ظالم و مستکرم

کے ساتھ مبارزہ ہو، چاہے خود سازی و عبادت ہو اور چاہے تعلیم و تربیت ہو، خلاصہ یہ کہ ہر وہ چیز

کہ جو اس وسیع و عریض مفہوم میں داخل ہو، اگر وہ خدا کے لیے اور اس کی رضا کے لیے انجام پائے تو وہ بھی بلند ہو جاتی ہے اور لطف پروردگار کے آسمان پر عروج کرتی ہے اور اپنے حال کی معراج اور تکامل دار تقاضا کا سبب بنتی ہے اور حق تعالیٰ کی عزت سے بہرہ اندوز ہوتی ہے۔

یہ وہی چیز ہے کہ جس کی طرف سورۃ ابراہیم کی آیہ ۲۴ میں اشارہ ہوا ہے: "المعترکین ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء توئی اکلہا کل حین یدان رہبھا" "کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاکیزہ باتوں کے لیے کیسی مثل بیان کی ہے؟ جیسا کہ وہ ایک پاک درخت ہے کہ جس کی جڑ ثابت اور برقرار ہے اور اس کی شاخ آسمان میں پھیل ہوتی ہے، وہ ہر وقت اپنے پروردگار کے اذن سے اپنے پھل (اشتیاق رکھنے والوں کو) دیتا ہے۔"

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض مضمون نے کلمہ طیب کی "لا الہ الا اللہ" سے اور بعض دوسروں نے سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر" سے اور بعض نے توحید سے توحید کے بعد محمد رسول اللہ، وعلی ولی اللہ و خلیفۃ رسولہ" کے ساتھ تفسیر کی ہے، یا بعض روایات میں "الکلمہ طیب" و "العمل الصالح" و "الایۃ الیٰ بیت یا اسی کے مانند دوسری چیزوں سے تفسیر کی ہے، تو یہ سب اسی وسیع و عریض مفہوم کے واضح مصداق تھے بیان کی قبیل سے ہیں اور اس کے مفہوم کو محدود نہیں کرتے کیونکہ ہر وہ بات کہ جو پاک و پاکیزہ اور بلند مفہوم کی حامل ہو وہ سب اس عنوان میں جمع ہو جاتی ہیں۔

بہر حال وہی خدا کہ جو گزشتہ آیت کے اقتضا کے مطابق مُردہ زمین کو بارش کے حیات بخش قطرات سے زندہ کرتا ہے، وہی "کلام طیب" اور "عمل صالح" کو بھی پرورش کرتا ہے، اور اپنے قرب اور جوار رحمت تک پہنچاتا ہے۔

اس کے بعد لفظہ مقابل کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ لوگ کہ جو بُرے منصوبے بناتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے۔ (والذین یمکرون السیئات لہم عذاب شدید)۔

"اور ان کی آکوہ و ناپاک و فاسد سعی و کوشش نابود ہو جاتی ہے اور کسی مقام تک نہیں پہنچتی (و مکر اولئک ہو بیور)۔

اگرچہ یہ فاسدین و فاسد یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ظلم و ستم اور بھوٹ اور مکاری کے ذریعہ اپنے لیے عزت حاصل کر سکتے ہیں، اور مال و دولت اور طاقت و قدرت بھی، لیکن انجام کار انہوں نے اپنے لیے عذاب الہی بھی فراہم کیا ہے اور ان کی ساری کوششیں بھی برباد ہو جاتی ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جو قرآن کے بیان کے مطابق "بنائوئی خداؤں کو اپنے لیے باعث عزت خیال کرتے تھے" (واتخذوا من دون اللہ آلہۃ لیکونوا لہم عزاً)۔ (مریم - ۸۱)

اور ایسے منافق بھی تھے کہ جو اپنے آپ کو عزیز اور مومنین کو ذلیل خیال کرتے تھے اور: "وہ یہ کہتے تھے کہ اگر ہم مدینہ میں پلٹ کر گئے تو عزت والے ذلیلوں کو باہر نکال پھینکیں گے" (یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجننا الاعز منہا الا ذل)۔ (منافقون - ۸)

کچھ افراد ایسے بھی تھے کہ جو فرعونوں کے قرب کو اپنی عزت کا سبب تصور کرتے تھے، یا گنہ ظلم سے عزت و آبرو طلب کرتے تھے، لیکن وہ سب تباہ ہو گئے، اور یہ صرف ایمان و عمل صالح ہی ہے کہ جو خدا سے عزیز کی طرف ادھر جاتا ہے۔

"مکر" اگرچہ لغت میں ہر قسم کی چارہ جونی کے معنی میں ہے لیکن بعض مواقع پر ایسی چارہ جونی کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ جو فساد کے ساتھ تو آم ہو۔ زیر بحث آیت اسی معنی میں ہے۔ "سیئات" اور پر والی آیت میں تمام برائیوں اور قباحتوں کے لیے عام اس سے کہ وہ عقائد کی برائیاں ہوں یا عمل کی، سب کو شامل ہے۔

اور یہ جو بعض نے پیغمبر اسلام کو قتل کرنے یا مکہ سے جلا وطن کرنے کے سلسلہ میں مشرکین کی سازشوں کے ساتھ تفسیر کی ہے تو یہ واقع میں اس کے ایک مصداق کو بیان کیا ہے، نہ کہ اس کے پورے مفہوم کو۔ "بیور" کا جملہ "بور" اور "بوران" کے مادہ سے اصل میں حد سے زیادہ کساد بازاری کے معنی میں ہے، اور چونکہ اس قسم کا کساد نابودی کا سبب بنتا ہے، اس لیے یہ لفظ بلاکت و نابودی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مشہور ضرب المثل ہے، (کسد حتی فسد) "اس قدر کساد اور مند ہوا کہ فاسد ہو گیا"۔

چند نکات

۱۔ تمام "عزت" خدا کے لیے ہے

عزت کی حقیقت کیا ہے؟ کیا ناقابل شکست ہونے کے مرحلہ تک پہنچنے کے علاوہ کوئی چیز ہے؟ اگر اس طرح ہے تو پھر عزت کو کہاں تلاش کرنا چاہیے؟ اور کونسی چیز انسان کو عزت دے سکتی ہے؟ ہم ایک واضح تحلیل و تجزیہ کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عزت کی حقیقت پہلے درجہ میں ایک ایسی قدرت ہے کہ جو انسان کے دل و جان میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ اس کو طاغیوں، باغیوں اور سرکشوں کے مقابلہ میں خضوع و خشوع کرنے اور تسلیم ختم کرنے سے روکتی ہے۔

ایسی قدرت کہ جس کے ہوتے ہوئے انسان خواہشات کا اسیر نہیں ہوتا، اور ہوا و ہوس کے مقابلہ میں سر نہیں جھکاتا۔

ایسی قدرت کہ جو اسے نفوذ ناپذیری کے مرحلہ میں "زر" و "زور" کے مقابلہ میں ارتقا تکامل بخشتی ہے

کیا اس قدرت کا سرچشمہ ایمان بخدا یعنی قدرت و عزت کے اصل منبع سے ارتباط کے بغیر ہو سکتا ہے؟ یہ بات تو صحیح فکر و عقیدہ اور روح و جان کے مرحلہ میں لیکن عمل کے مرحلہ میں عزت کا سرچشمہ ایسے اعمال ہیں کہ جو صبح بنیادوں اور حساب شدہ پروگرام اور طریقہ کے حامل ہوں، دوسرے لفظوں میں اسے عمل صالح میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے، یہی وہ دو چیزیں ہیں کہ جو انسان کو سر بلندی و عظمت دیتی ہیں اور اُسے عزت اور ناقابل شکست ہونے کا شرف بخشتی ہیں۔

فرعون کے زمانے کے دنیا پرست جادوگروں نے اپنے عجائبات کا اس کے نام اور اس کی عزت کے ساتھ آغاز کیا، (وقالوا بعضة فرعون انا لنحن الغالبون) انہوں نے کہا فرعون کی عزت کی قسم کہ ہم ہی کامیاب ہوں گے۔ (شعرا۔ ۴۴)

لیکن وہ بہت ہی جلد موسیٰ کے عصا سے شکست کھا گئے، لیکن وہی جس وقت فرعون کے ذلت بار پرچم کے سانے سے باہر نکلے اور توجید کے ساتے میں قرار پائے اور ایمان لے آئے، تو ایسے طاقتور اور ناقابل شکست ہو گئے کہ فرعون کی سچت ترین دھکیاں بھی ان پر اثر انداز نہ ہوئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ پاؤں یہاں تک کہ اپنی جان بھی عاشقانہ راہ خدا میں دے دی اور شہرت شہادت نوش کر لیا۔ انہوں نے اپنے اس عمل کے ذریعے یہ واضح کر دیا کہ وہ زرد اور زور کے ساتے سر تسلیم خم نہیں کریں گے اور وہ ناقابل شکست ہیں اور ان کی یہ پُر افتخار تاریخ آج ہمارے لیے ایک سبق آموز دینا ہے۔

۲۔ "کلام طیب" اور "عمل صالح" میں فرق

ممکن ہے کہ یہ سوال کیا جائے کہ زیر بحث آیت "کلام طیب" کے بارے میں یہ کیوں کہتی ہے کہ وہ خود بخود پروردگار کی طرف بلند ہوتا ہے لیکن عمل صالح کے بارے میں یہ کہتی ہے کہ خدا سے اوپر لے جاتا ہے؟

اس سوال کا اس طرح جواب دیا جاسکتا ہے کہ "کلام طیب" جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ایمان اور پاکیزہ عقیدے کی طرف اشارہ ہے اور وہ خدا کی طرف عین بلندی ہے کیونکہ ایمان کی حقیقت اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے لیکن "عمل صالح" کو وہ قبول کرتا ہے اور اس کی پذیرائی کرتا ہے، اور اس پر کئی گنا اجر دیتا ہے اور اسے بقاء و دوام بخشتا ہے اور بلندی عطا کرتا ہے۔ (مخبر صحیح)

۱۱) وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ سُرَابٍ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ ۝ وَمَا يَعْمرُّ مِنْ مَّعْمَرٍ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ عُمْرِہٖ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ ۝ اِنَّ ذٰلِکَ عَلٰی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝

۱۲) وَمَا یَسْتَوِی الْبَحْرٰنِ ۝ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآءٌ شَرَابُہٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۝ وَ مِنْ کُلِّ تَاکُلُوْنَ لَحْمًا طَرِیًّا وَتَسْتَخْرِجُوْنَ حَلِیۡةً تَلْبَسُوْنَہَا وَتَرٰی الْفُلْکَ فِیْہِ مَوَآخِرَ لَبَتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ ۝ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۱) خدا نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے، کوئی مادہ حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بنتی ہے مگر اس کے علم کے ساتھ اور کسی شخص کی عمر نہیں بڑھتی اور نہ کسی شخص کی عمر میں کمی ہوتی ہے مگر یہ کہ (علم خدا کی) کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ خدا کے لیے آسان ہے۔

۱۲) یہ دونوں دریا یکساں نہیں ہیں۔ ایک دریا کہ جس کا پانی شیریں اور پینے میں خوشگوار ہے اور ایک یہ کہ جو کھاری اور گلوگیر ہے (لیکن) تم دونوں سے ہی تروتازہ گوشت کھاتے ہو، اور زمین کی چیزیں نکال کر پینتے ہو، اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں ان کا سینہ چیرتی ہوتی چل جاتی ہیں (اور ہر طرف کو بڑھ رہی ہیں) تاکہ تم فضل خدا

یہ حساس اور حیرت انگیز تغیرات کہ جو ایک طرف ماؤں کو اور دوسری طرف جنین کو پیش آتے ہیں، اتنے عمیق اور دقیق ہیں کہ جو خدا کے بے پایاں علم کے بغیر ممکن نہیں ہیں، کیونکہ اگر ان پر حکم فرمان نظام سوئی کی لوک کے برابر بھی مسلط ہو جائے، تو حمل یا وضع حمل کے سارے پروگرام میں خلل واقع ہو جائے اور معاملہ تباہی تک پہنچ جائے۔

انسان کی زندگی کے ان پانچ مرحلوں میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر عجیب اور تعجب نیز ہے۔

بے جان مٹی کہاں اور زندہ عقل مند، صاحب ہوش اور نورہ نوکام کرنے والا انسان کہاں؟ بے قدر و قیمت لطفہ کہ جو متعفن پانی کے چند قطروں سے بنا ہے کہاں؟ صاحب رشد و خوبصورت مختلف حواس کا حامل اور طرح طرح کی کارگیری کا منظر انسان کہاں؟

جب ہم اس مرحلہ سے گزر جاتے ہیں تو نوع انسان کی دو صنفوں "مذکر" اور "مونث" میں تقسیم کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ اس میں جسم اور فزیالوجی کے حوالے سے بہت سے اختلافات موجود ہیں۔ یہ دونوں انفراد لطفہ کے آغاز ہی سے اپنے اپنے راستے ایک دوسرے سے جدا کر لیتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی ذمہ داری کے مطابق آگے بڑھتے ہیں اور تکامل و ارتقاء کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

اس کے بعد اس بار کو قبول کرنے، اٹھانے، اس کی حفاظت کرنے، غذا دینے اور پرورش کرنے کے لیے ماں کی ذمہ داری کا ذکر آتا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس نے صدیوں سے عظیم علماء اور دانشوروں کے افکار کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوا ہے اور وہ اس بات کے معترف ہیں کہ یہ مسئلہ عالم ہستی کے عجیب ترین مسائل میں سے ہے۔

آخری مرحلہ بچہ کی پیدائش کا ہے، یہ ایک نہایت سخت اور تغیراتی مرحلہ ہے کہ جو بہت سے عجائبات کا حامل ہے۔ وہ کون سے عوامل ہیں کہ جو بچے کو شکم مادر سے باہر نکلنے کا حکم دیتے ہیں؟ اس حکم اور اندام مادر کا اس کے لیے آمادہ ہونا، ان دونوں کے درمیان کیسی مکمل ہم آہنگی برقرار ہوتی ہے؟

بچہ اس وضع و کیفیت کو کہ جس کا وہ نومادہ سے عادی تھا لحظہ بھر میں کیسے بالکل بدل دیتا ہے اور ماں سے اپنا رابطہ منقطع کر لیتا ہے اور آزاد ہوا سے استفادہ کرنے لگتا ہے۔ اس کی غذا کی آمد و رفت

۱۔ لطفہ جیسا کہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں، اصل میں پانی یا تھوڑے سے صاف پانی کو کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس تھوڑے سے پانی کے لیے یہ لفظ بلاوجہ لایا جانے لگا کہ جو انفراد جنین کی بنیاد بنتا ہے۔

سے فائدہ اٹھاؤ اور شاید کہ تم (اس کی نعمتوں کا) شکر ادا کرو۔

تفسیر

شریں اور شور پانی والے دریا یکساں نہیں ہیں

گزشتہ آیات میں توحید، معاد اور صفات خدا کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں بھی جاندار مخلوقات اور آفاق میں اللہ کی بعض اور نشانیوں کا ذکر ہے کہ جو خدا کی قدرت کی بھی دلیل ہیں اس کے علم کی بھی اور امکانِ مادی کی بھی۔

پہلے مختلف مراحل میں انسان کی پیدائش کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "خدا نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا" (واللہ خلقکم من تراب)۔

"پھر لطفہ سے" (مشر من لطفہ)۔

"پھر تمہارے جوڑے بنا دیتے" (مشر جعلکم ازواجاً)۔

یہ تین مرحلے انسان کی خلقت کے مراحل میں سے ہیں، مٹی، لطفہ اور زوجیت۔

یہ بات مسلم ہے کہ انسان مٹی سے بنا ہے اس لحاظ سے بھی کہ انسانوں کے جدِ اعلیٰ حضرت آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ تمام مادے کہ جو جسم انسانی کو تشکیل دیتے ہیں یا انسان ان سے غذا لیتا ہے، یا اس کا لطفہ ان سے بنا ہے وہ سب کے سب مٹی ہی سے نشوونما پاتے ہیں۔ بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ مٹی سے پیدائش صرف پہلی خلقت کی طرف اشارہ ہے لیکن لطفہ سے پیدائش بعد کے مراحل کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ پہلے انسانوں کی خلقت کا اجمال مرحلہ ہے (کیونکہ سب کا وجود آدم کے وجود سے چلتا ہے) اور دوسرا مرحلہ تفصیل ہے کہ جس میں انسان ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔

جبکہ زوجیت کا مرحلہ نسل انسانی کے تسلسل اور اضافے کا مرحلہ ہے۔

نیز یہ جو بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ "ازواج" یہاں "اصناف" یا "روح و جسم" وغیرہ کے معنی میں ہے، بہت بعید نظر آتا ہے۔

اس کے بعد حیات انسانی کے چوتھے اور پانچویں مرحلے کا ذکر ہوتا ہے اور ماؤں کے حامل ہونے اور بچہ جنم کے بارے میں بات کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "کوئی مادہ حاملہ نہیں ہوتی اور بچہ نہیں جنم مگر وہ خدا کے علم میں ہوتا ہے" (وما تحمّل من انثی ولا تضع الا بعلمہ)۔

حمل ٹھہرنا اور پھر جنین کی حالت میں بہت ہی عجیب اور پیچیدہ تبدیلیاں اور اس کے بعد وضع حمل

بنوات کی راہ سے اچانک بند ہو جاتی ہے اور غذا کی آمد و رفت کے لیے ایک نیا راستہ بنانے کا منہ کام کرنے لگتا ہے۔ ماں کے پیٹ کا تاریک ماحول چھوڑ کر روشنی میں آجاتا ہے اور ان تیز رفتاریوں کا مقابلہ کرتا ہے اور فوری طور پر خود کو ان کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

کیا یہ خدا کے بے پایاں علم و قدرت کی بہترین نشانی نہیں ہے؟ اور کیا بے شعور مادہ اور بے طبیعت اور اندھے اتفاقات زنجیر خلقت کے ہزاروں حلقوں میں سے ایک چھوٹے سے حلقے کو تنظیم کا کام بھی سہرا انجام دے سکتے ہیں؟ کس قدر بے انصافی ہے کہ انسان اپنی خلقت کے بارے میں اس قسم کے موبہوم خیالات کو قبول کرے۔

اس کے بعد اس عجیب و غریب نظام عمل کے چھٹے اور ساتویں مرحلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ عمر کے مختلف مراحل کی مختلف عموال کے زیر اثر زیادتی اور کمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "کوئی شخص طولانی عمر نہیں پاتا اور کسی کی عمر میں کمی نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ خدا کے علم کی کتاب میں ثبت ہے۔ یہ کام ایسے قوانین اور نظام کی پیروی کرتا ہے، کہ جن پر اس کا علم و قدرت حکم فرما ہے (روما یعمر من معمر ولا ینقص من عمرہ الا فی کتاب) ین"

وہ کون سے عموال ہیں جو حیات انسانی کو جاری رکھنے میں موثر ہیں اور وہ کون سے عموال ہیں کہ جو اس کی حیات کو جاری رکھنے کی مخالفت کرتے ہیں؟ یعنی وہ کون سے عموال ہیں کہ جن کے ہوتے ہوئے انسان سو سال یا اس سے کم ہمیشہ زندگی کو جاری رکھ سکے، اور وہ کون سے عموال ہیں کہ جو انسانوں کی عمر میں اختلاف کا سبب بنتے ہیں؟

یہ سب کے سب امور دقیق اور پیچیدہ حقائق رکھتے ہیں، کہ جن سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں ہے موجودہ زمانے میں ہم جو کچھ اس سلسلے میں جانتے ہیں وہ اس کے مقابلے میں کہ جسے ہم نہیں جانتے بہت ہی کم ہے اور زیادہ قدر و قیمت کا حامل نہیں ہے۔

"معمر" عمر کے مادہ سے ہے۔ اصل میں یہ لفظ "عمارت" سے لیا گیا ہے کہ جو آبادی کے معنی میں ہے۔ یہ جو حیات انسانی کی مدت کو "عمر" کہا جاتا ہے تو یہ اس بنا پر ہے کہ اس کے بدن کی "عمارت" اور آبادی اسی مدت میں ہے۔ "معمر" اس شخص کے معنی میں ہے کہ جس کی عمر طولانی ہو۔ آخر کار آیت کو اس جملے پر ختم کر دیا گیا ہے: "یہ سب کچھ خدا کے لیے آسان ہے" (ان ذلک علی اللہ یسیر)۔

۱۰ کتاب سے مراد خدا کا بے پایاں علم ہے اور یہ جو بعض اس سے لوح محفوظ یا "حیات انسانی کا نام اعمال" مراد لیتے ہیں تو یہ مفہوم بھی علم خدا کی طرف لوٹتا ہے۔

اس عجیب و غریب موجود کی "مٹی" سے خلقت اور "نطفہ کے پانی" سے ایک کامل انسان کی خلقت کا آغاز اور اسی طرح زوجیت، حمل، وضع حمل اور عمر کی زیادتی و کمی سے متعلق مسائل چاہے وہ قدرت کے لحاظ سے ہوں یا علم و حساب کے لحاظ سے، سب کے سب اس کے لیے سہل اور آسان ہیں۔ یہ سب دنیا کے انفس میں اس کی نشانیوں کا ایک گوشہ ہے۔ یہ امور ایک طرف تو ہمیں عالم ہستی کے مبداء سے مربوط و آشنا کرتے ہیں اور دوسری طرف معاد و قیامت کے امکان پر زندہ دلائل شمار ہوتے ہیں۔

وہ ذات کہ جو "مٹی" اور "نطفہ" سے پہلی خلقت پر قادر ہے، کیا وہ انسانوں کی حیات نو پر قادر نہیں ہے؟

اور وہ ذات کہ جو ان قوانین سے مربوط تمام جزئیات سے باخبر ہے، کیا اسے بندوں کے حساب کتاب کو قیامت کے میدان کے لیے محفوظ رکھنے میں کوئی مشکل ہوگی؟

بعد والی آیت میں آفاق میں اس کی عظمت و قدرت کی کچھ نشانیاں ذکر کی گئی ہیں۔ دریاؤں کی خلقت اور ان کی برکات و فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "دو دریا یکساں نہیں ہیں ان میں سے ایک عمدہ، شیریں اور پینے میں خوشگوار ہے اور ان میں سے دوسرا کھاری اور گلوگیر ہے (وما یتوی البحران ہذا عذب فرات سائغ شرابہ و ہذا ملح اجاج) ین"

اگرچہ وہ دونوں پہلے دن تو بارش کے شیریں قطرات کی شکل میں آسمان سے زمین پر برہے تھے اور دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا، لیکن اب گویا دونوں کا چہرہ مختلف ہے اور مختلف فوائد کے حامل ہیں۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ: "تم ان دونوں ہی سے ترو تازہ گوشت کھاتے ہو" (ومن کل تأکلون لحمًا طریثًا)۔

"اور دونوں سے ہی پیننے کے لیے زینت کی چیزیں نکالتے ہو (وتستخرجون حلیۃ تلبسونہا)۔ علاوہ ازیں دونوں ہی سے مال و متاع اور نقل و حمل کے لیے فائدہ اٹھاتے ہو، لہذا تم کشمکش کو دیکھتے ہو کہ جو ہر طرف دریاؤں کو چرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں تاکہ تم خدا کے فضل سے فائدہ اٹھاؤ، شاید اس کے شکر کا حق ادا کرو" (وتسری الفلک فیہ مواخر لتبتغوا من فضله ولعلکم تشکرون)۔

۱۰ عذاب "جیسا کہ راغب مفردات میں لکھا ہے پاکیزہ اور سرد کے معنی میں ہے اور "لسان العرب" میں اس کا معنی صرف پاکیزہ پانی بیان ہوا ہے (العاد الطیب) ممکن ہے کہ اس کا ضد شیریں ہو نا بھی "طیب" کے مفہوم میں داخل ہو۔

چند قابل غور نکات

۱۔ "فوات" "لسان العرب" کے مطابق ایسا پانی ہے کہ جو بہت صاف ستھرا اور شیریں ہو۔
"سائغ" اس پانی کے معنی میں ہے کہ جو خوشگوار ہونے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ گلے سے نیچے چلا جاتا ہے۔ "ملح" (شور پانی) کے برعکس۔ جبکہ "اجاج" ایسا کڑوا پانی ہے کہ جس سے گلے میں جلن ہو اور جو حلق کو بند کر دے۔

۲۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ نمون و کافر کی عدم مساوات کی ایک مثال ہے۔ لیکن قبل و بعد کی آیات کہ جو خلقت کی نشانیوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ یہ جملہ بھی اسرار توحید کے سلسلے میں ہے اور پانی کی مختلف قسموں، مختلف آثار اور مشترک فوائد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۳۔ اس آیت میں دریاؤں اور سمندروں کے بہت سے فوائد میں سے تین فائدے بیان ہوئے ہیں۔ ۱۔ غذا۔ ۲۔ زینت کی چیزیں اور ۳۔ نقل و حمل۔

ہم جانتے ہیں کہ سمندر اور دریا نوح بشر کے منابع غذائی میں سے ایک اہم منبع ہے، اور ہر سال کئی ملین ٹن گوشت اس سے حاصل کیا جاتا ہے، بغیر اس کے کہ انسان اس کے لیے تکلیف اور مشقت اٹھائے۔ کارخانہ قدرت نے اس سلسلے میں ایک دقیق نظام بنایا ہے تاکہ انسان خدا کے اس بچھے ہوئے دسترخوان اور خزانہ نعمت سے تھوڑی سی زحمت کر کے فائدہ حاصل کریں۔

زینت و تزیین کی مختلف چیزیں "صدف" "موتی" اور "مرجان" اس سے نکالے جاتے ہیں۔ قرآن نے اس مسئلے کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ انسان کی روح چو پاؤں کی طرح نہیں ہے بلکہ مختلف جہات کی حامل ہے کہ جن میں سے ایک زیبائش کی جس ہے جو ذوق، ہنر اور ادب کا سرچشمہ ہے۔ یہ انسانی جس اگر ہر قسم کے افراط و تفریط اور اسراف و تبذیر سے بچتے ہوئے صحیح صورت میں سیر ہو تو یہ روح کی شادابی کا باعث ہے اور اس سے انسان کو نشاط اور سکون ملتا ہے اور وہ زندگی کے سخت کاموں کی انجام دہی کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔

باقی رہا نقل و حمل کا مسئلہ تو یہ انسانی تمدن اور معاشرتی زندگی کی ایک اہم بنیاد ہے۔ سمندروں نے زیادہ تر زمین کے حصے کو گھیر رکھا ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، اس امر کی طرف توجہ کی جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نقل و حمل کے سلسلے میں سمندر انسانوں کی نہایت اہم خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔

اس ساز و سامان کا حجم کہ جس کی سمندروں کے ذریعے نقل و حمل ہوتی ہے اور وہ مسافر کو جان

کے ذریعے ادھر ادھر آتے جاتے ہیں، اس قدر زیادہ ہیں کہ کسی بھی دوسرے ذریعے پر اس کا قیاس نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ بعض اوقات ایک سمندری جہاز ہزار ہا موٹروں اور ٹرکوں کے برابر بار اٹھا کر لے جاتا ہے بلکہ

۴۔ البتہ سمندروں کے فوائد مذکورہ مسائل تک ہی منحصر نہیں ہیں اور قرآن ان کو ان ہی تین امور میں محدود نہیں کرتا، بادل ان سے بنتے ہیں، دوائیوں کے لیے مواد، تیل، پینے کی چیزیں، بجز زمینوں کی تقویت کے لیے مواد ان سے حاصل ہوتا ہے۔ بہو آؤں کے پیدا ہونے میں ان کا کردار بھی قابل ذکر ہے اور ان کے علاوہ سمندروں کی اور بھی برکات بہت سی ہیں۔

۵۔ "لحمًا طریبًا" (تروتازہ گوشت) پر قرآن کا اظہار اس قسم کے گوشت کے غذائی فوائد کے بارے میں، پرانے اور ڈبوں میں بند اور اسی قسم کے دوسرے گوشتوں کے مقابلے میں — ایک پُر معنی اشارہ ہے۔

۶۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کڑوے اور شور سمندر تو سارے کرۂ زمین میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن میٹھے پانی کے سمندر کہاں ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میٹھے پانی کے سمندر اور بحیرے بھی کرۂ زمین میں کم نہیں ہیں مثلاً ریاست تائیوان امریکہ وغیرہ میں میٹھے پانی کے چھوٹے چھوٹے سمندر ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے دریاؤں کو بھی "بحر" کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ کے واقعے میں لفظ "بحر" کا دریا سے نسل پر اطلاق ہوا ہے، (بقرہ۔ ۵۰، شعراء۔ ۶۳ اور اعراف۔ ۱۳۸)۔

اس سے قطع نظر بڑے بڑے دریاؤں کا پانی سمندروں کے اندر تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ سمندروں کے شور پانی کو پیچھے دھکیل دیتا ہے اور کچھ عرصے تک ان میں مخلوط نہیں ہوتا۔ اس طرح وہ خود میٹھے پانی کا ایک عظیم سمندر بنا دیتا ہے۔

۷۔ "لتبتنوا من فضله" (تاکہ اس کے فضل سے فائدہ اٹھاؤ) یہ جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس میں ہر وہ اقتصادی نقل و حرکت شامل ہے کہ جو سمندروں کے راستے سے ہوتی ہے۔

اور "لعلکم تشکرون" کا جملہ انسانوں کے احساس شکر گزاری کو بیدار کرنے کے لیے آیا ہے اور یہ احساس خدا جوئی اور خدا شناسی کے لیے ایک ذریعہ ہے۔

اس وقت بھی پانچ لاکھ ٹن تک تیل لے جانے والے جہاز موجود ہیں۔ نقل و حمل کا کوئی بھی دوسرا ذریعہ ان کی جگہ نہیں لے سکتا اور سمندروں کے علاوہ کوئی بھی اس کو اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ گزشتہ زمانوں میں بھی کشتیوں اور بحری جہازوں کی صلاحیت چو پاؤں کی نسبت بہت زیادہ تھی۔

طویل عمر اور کم عمر کے روحانی عوامل

زیر بحث آیات میں پروردگار کے فرمان سے عمر کی زیادتی اور کمی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں روایات بھی وارد ہوئی ہیں۔ اسی مناسبت سے مفسرین نے بھی عمر کے طویل اور کوتاہ ہونے کے بارے میں کئی بحثیں کی ہیں۔

البتہ طبیعی عوامل کا ایک سلسلہ عمر کی زیادتی یا کمی میں دخل رکھتا ہے کہ جن میں سے بہت سے عوامل کو نوع بشر نے اب تک پہچان لیا ہے۔ مثلاً افراط و تفریط سے بچتے ہوئے صحیح غذا کھانا، کام اور حرکت میں رہنا، ہر قسم کے نشے، خطرناک عادات اور الکحل کی مشروبات سے پرہیز کرنا، ہر وقت کے پہچانات سے ڈور رہنا اور قوی اور مضبوط ایمان رکھنا کہ جو انسان کی زندگی کی ناممورایوں میں سکون بخشن سکے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے عوامل ہیں کہ جن کا طویل عمر کے ساتھ ظاہری ارتباط ہم پر چنداں واضح نہیں ہے مگر روایات اسلامی میں ان کے بارے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ذیل کی چند روایات پر توجہ فرمائیں:

الف۔ پیغمبر گرامی فرماتے ہیں:

ان الصدقة و صلة الرحم تعمران الدیار و تنزیدان فی الاعمار۔
راہ خدا میں خرچ کرنا اور صلہ رہمی گھروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتا ہے۔

ب۔ ایک اور حدیث میں رسول اکرم ہی سے منقول ہے:

من سره ان يبسط في رزقه وينسى له في اجله فليصل رحمه۔
جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اُس کے رزق میں زیادتی ہو، اور اس کی اجل میں تاخیر ہو تو اسے چاہیے کہ صلہ رہمی کرے۔

ج۔ بعض گن ہوں بالخصوص زنا اور بدکاری کے متعلق وارد ہوا ہے کہ وہ انسان کی عمر میں کمی کا باعث بنتے ہیں۔ پیغمبر اکرم کی مشہور حدیث میں ہے کہ:

يا معشر المصلين اياكم والزنا فان فيه ست خصال: ثلاث في الدنيا،
وثلاث في الآخرة، اما التي في الدنيا فانه يذهب بالجماء ويورث
الفقر وينقص العمر۔

اے مسلمانو! زنا سے پرہیز کرو کیونکہ اس کے چھ بُرے نتائج ہیں، تین دنیا میں اور

تین آخرت میں۔ وہ تین کہ جو دنیا میں ہیں یہ ہیں: انسان کے چہرے کی رونق اور نورانیت ختم ہو جاتی ہے، فقر و فاقہ اور تنگدستی آجاتی ہے اور انسان کی عمر کم ہو جاتی ہے۔

د۔ امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

المبر و صدقة السر ينفیان الفقر و يزيدان فی العمر و یدفعان
عن سبعین مائة سوء۔

شکوہ کاری اور پوشیدہ طریقے سے صدقہ دینا فقر و فاقہ کو دور کرتا ہے، عمر میں زیادتی کرتا ہے اور ستر قسم کی بُری موت سے بچاتا ہے۔

بعض دوسرے گن ہوں کے متعلق مثلاً ظلم بلکہ مطلق گن ہوں کے بارے میں بھی کچھ اشارے آتے ہیں۔

بعض مفسرین کہ جو "اجل حتمی" اور "اجل معلق" کے درمیان فرق نہیں کر سکے، انہوں نے اس قسم کی احادیث پر سخت اعتراض کیا ہے اور انہیں نصوص قرآنی کے مخالفت سمجھا ہے کیونکہ وہ انسان کی حد عمر کو ثابت اور غیر متبدل سمجھتے ہیں۔

اس کی وضاحت

اس میں شک نہیں کہ انسان دو قسم کی اجل رکھتا ہے۔

ایک اجل حتمی کہ جو جسم انسانی کی استعداد و بقا کا اختتام ہے۔ اس کے پہنچ جانے سے ہر چیز زبان الہی سے ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری اجل معلق کہ جو حالات و شرائط بدلنے کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ مثلاً ایک انسان خود کشی کر لیتا ہے حالانکہ وہ اگر اس گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کرتا تو شاید سالہا سال زندہ رہتا۔ اسی طرح الکحل کے مشروبات، نشہ آور چیزیں اور بے لگام شہوت پرستی سے بھی انسان اپنے جسم کی توانائی مختصر سی مدت میں کھو بیٹھتا ہے، حالانکہ اگر یہ امور نہ ہوتے تو وہ سالہا سال تک زندہ رہ سکتا تھا۔

یہ ایسے امور ہیں کہ جو سب کے لیے قابل ادراک ہیں اور تجربے میں آچکے ہیں اور کوئی بھی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

اچانک پیش آنے والے واقعات اور حادثات کے بارے میں کچھ امور اہل مطلق کے ساتھ مربوط ہیں جو قابل انکار نہیں ہیں۔

اس بنا پر اگر بیشتر روایات میں یہ منقول ہوا ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرنا یا صلہ رحمی عمر کو طولانی کر دیتا ہے اور مصیبتوں کو برطرف کر دیتا ہے تو وہ بھی حقیقت میں انہیں عوامل کے پیش نظر ہے۔ اگر ہم اہل اور عمر کے خاتمہ کی یہ دو قسمیں ایک دوسرے سے جدا نہ کریں تو قصداً و قدر اور سعی و کوشش کے اثرات سے مربوط بہت سے مسائل انسانی زندگی میں لاینحل ہو کر رہ جاتیں۔

اس بحث کو ایک عام اور سادہ مثال کے ذریعے واضح کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نئی موٹروں کا ایک کارخانہ لگاتا ہے۔ فرض کریں کہ مختلف تخمینوں کے مطابق کہ وہ بیس سال تک چل سکتی ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پوری احتیاط کے ساتھ ان کی دیکھ بھال کی جائے اور ضروری حفاظت کی جائے۔ اس صورت میں اس موٹر کی حتمی عمر بیس سال ہوگی کہ جس سے آگے وہ نہ چل سکے گی۔

لیکن اگر ضروری حفاظت اور دیکھ بھال نہ کی جائے اور اسے ناواقف اور بے پرواہ لوگوں کے سپرد کر دیا جائے اور اس سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لیا جائے، روزانہ سنگلاخ راستوں پر اسے چلایا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس کی بیس سالہ عمر آدمی رہ جائے یا دسویں حصے تک کم ہو جائے تو یہ اس کی "اہل مطلق" ہے۔

ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ بعض مشہور مفسرین نے اس قسم کے واضح اور روشن مسئلے کی طرف توجہ کیوں نہیں کی ہے۔

۱۳) يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ لَا
وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ
ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۗ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ
مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ ۝

۱۴) اِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دَعَاءَكُمْ وَهُمْ سَمِعُوا مَا
اسْتَجَابُوا لَكُمْ ۗ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ ۗ وَلَا
يُنَبِّتُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ۝

ترجمہ

۱۳) وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ سورج اور چاند کو اس نے (تمہارے لیے) مسخر کر دیا ہے ان میں سے ہر ایک کو ایک معین وقت تک اپنی حرکت جاری رکھنا ہے۔ یہ ہے تمہارا پد در دگار اللہ (سائے عالم کی) حاکمیت اسی کے لیے ہے اور جنہیں تم اس کے علاوہ پکارتے ہو (اور ان کی عبادت کرتے ہو) وہ تو کھجور کی گٹھلی کی نازک جھلی کے برابر ہی حاکمیت (اور مالکیت) نہیں رکھتے۔

۱۴) اگر تم انہیں پکارو گے تو وہ تمہاری آواز نہیں سنیں گے اور اگر سن بھی لیں تو تمہیں کوئی جواب نہیں دیں گے، اور قیامت کے دن تمہارے شرک (اور پرستش) کا انکار کر دیں گے اور کوئی بھی تجھے خبیر (اور آگاہ خدا) کی مانند (حقائق سے)

باخبر نہیں کرے گا۔

تفسیر

یہ جھوٹے معبود تو تمہاری آواز تک نہیں سنتے

ان آیات میں قرآن ایک مرتبہ پھر توحید کی نشانیوں اور پردہ نگار کی بے پایاں نعمتوں کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ انسان کے احساس تشکر کو ابھار کر اُسے معبود حقیقی کی شناخت کی طرف لایا جائے اور اسے ہر قسم کے شرک اور بے ہودہ عبادتوں سے باز رکھا جائے، فرمایا گیا ہے: "وہ وہی ہے کہ جو رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے" (یولج الیل فی النہار ویولج النہار فی الیل)۔

"یولج" "ایلاج" کے مادہ سے داخل کرنے کے معنی میں ہے مکن ہے اس لفظ سے ذیل کے دو معانی میں سے ایک کی طرف یا دونوں کی طرف اشارہ ہو۔
۱۔ سال بھر میں رات دن کی تدریجی زیادتی اور کمی کہ جو۔ اپنے تمام آثار و برکات کے ساتھ۔
مختلف موسموں کی پیدائش کا سبب ہے۔

شفق اور بین الطلوعین کے ذریعے رات کا دن میں اور دن کا رات میں بتدریج منتقل ہونا، کہ جو اچانک اور ناگہانی طور پر ظلمت سے نور کی طرف اور نور سے ظلمت کی طرف منتقل ہونے کے خطرات سے روکتا ہے، اور انسان کو مکمل اور بے خطر ایک کیفیت سے دوسری میں جانے کے قابل بناتا ہے یہ اس کے بعد سورج اور چاند کی تغیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کتا ہے، "اس نے سورج اور چاند کو تہا سے لیے مٹو کیا ہے" (وسخر الشمس والقمر)۔

اس سے بڑھ کر اور تغیر کیا ہوگی کہ وہ سب انسان کے فائدے میں حرکت کر رہے ہیں اور انسانی زندگی میں انواع و اقسام کی برکات کا سرچشمہ ہیں۔ اُبر، ہوا، سورج، چاند اور فلک سب کے سب کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ انسان اپنی زندگی کو سنوار سکے اور غفلت میں وقت نہ گزارے اور مسلسل ان نعمات کے اصل منبع کی یاد میں رہے۔ (سورج اور چاند کی تغیر کے سلسلے میں ہم جلد ۵ سورہ رعد کی آیہ ۲ اور سورہ ابراہیم کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں)۔

لیکن یہ سورج اور چاند باوجودیکہ پورے طور پر منظم طریقے سے اپنے راستے پر چل رہے ہیں اور انسان

رات اور دن کی تدریجی تبدیلی کے بارے میں جلد دوم میں سورہ آل عمران کی آیہ ۲۷ کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔

کے اچھے خدمت گزار ہیں، تاہم جو نظام ان پر حاکم ہے وہ جاودانی اور ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ یہاں تک کہ یہ عظیم میاں سے بھی باوجود اس نور کے آخر کار تاریک اور بے کار ہو جائیں گے۔

اس لیے قرآن تغیر کے بارے میں بات کرنے کے بعد مزید کہتا ہے: "ان دونوں میں سے ہر ایک ایک خاص زمانے تک کہ جو ان کے لیے معین ہوا ہے اپنی حرکت جاری رکھے گا (کل میجری لاجل مستی)۔ اور "اذا الشمس سکوت، واذا النجوم انکدرت" (نور - ۲۵) کے تقاضے کے مطابق آخر کار یہ سب کے سب تاریکی اور خاموشی میں ڈوب جائیں گے۔

بعض مفسرین نے "اجل مستی" (معین وقت) کے لیے ایک دوسری تفسیر کی ہے اور وہ سورج اور چاند کی حرکت دوری ہے کہ جن میں سے پہلی ایک سال میں مکمل ہوتی ہے اور دوسری ایک ماہ میں ختم ہوتی ہے یہ۔

لیکن قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ تعبیر عمر کے ختم ہونے کے معنی میں آئی ہے۔ ان مواقع استعمال کی جانب توجہ کی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ تفسیر درست نہیں ہے اور پہلی تفسیر ہی درست ہے یعنی چاند اور سورج کی عمر کا اختتام۔ (نخل - ۶۱، فاطر - ۴۵، زمر - ۴۲، نور - ۴۷ اور مؤمن - ۶۷ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

پھر توحید کی اس بحث سے نتیجہ نکالنے کے طور پر فرمایا گیا ہے: "یہ ہے خدا تمہارا عظیم پردہ نگار" (ذالکو اللہ ربکوم)۔

وہ خدا کہ جس نے سورج اور چاند کی نور و ظلمت اور حرکات کے حساب شدہ نظام کو تمام برکات کے ساتھ مقرر فرمایا ہے۔

"عالم ہستی میں حاکمیت اسی کے ساتھ مخصوص ہے" (لہ الملک)۔
"اور وہ معبود کہ جنہیں تم اسے چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ تو کجھور کی گھٹلی کے اوپر کی نازک جھلی کے برابر بھی عالم ہستی میں حق حاکمیت اور مالکیت نہیں رکھتے" (والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطع میں) یہ۔

"قطمیر" مفردات میں راغب کے مطابق وہ جھلی ہے کہ جو کجھور کی گھٹلی کی پشت پر ہوتی ہے اور مجمع الیسان میں طبری کے مطابق اور تفسیر قرطبی کے مطابق یہ ایک پتلا سا سفید رنگ کا پھلکا ہے کہ جو پوری گھٹلی کو چھپاتے ہوتا ہے۔

تفسیر روح المعانی اور ابد الفتوح ہادی۔

الذین کی تعبیر کو جو عام طور پر جمع مذکر عاقل کے لیے آتی ہے، جنوں کے بڑی بڑی جنوں کی بنا رہے کہ جو وہ ان بے جان موجودات سے متعلق رکھتے تھے قرآن انہی کی تعبیر ذکر کر کے، پھر اس کی سختی سے تردید کرتا ہے۔

بر حال یہ بہت ہی چھوٹی اور حقیر اسم چیز کی طرف اشارہ ہے۔
جی ہاں! یہ بُت نہ تو کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان، نہ وہ تمہارا دفاع کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنا، نہ وہ حاکمیت رکھتے ہیں اور نہ ہی مالکیت۔ یہاں تک کہ کھجور کی گھٹلی کے ادھر کی جھلی پر بھی نہیں اس حالت میں تم بے عقل کس طرح ان کی پرستش کرتے ہو اور اپنی مشکلات کا حل ان سے چاہتے ہو۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: "اگر تم انہیں اپنی مشکلات کے حل کے لیے پکارو تو وہ ہرگز تمہاری پکار نہیں سنتے" (ان تدعوہو لا یسمعوا دعائکم)۔
کیونکہ وہ چند پتھروں اور لکڑی کے ٹکڑوں کے علاوہ کچھ نہیں ہیں وہ بے شعور جمادات ہی تو ہیں۔ اور بالفرض وہ تمہارے نالہ و فریاد کو سن بھی لیں تب بھی وہ تمہاری حاجات کا جواب دینے کی توانائی نہیں رکھتے۔ (ولو سمعوا ما استجابوا لکم)۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ تو کھجور کی گھٹلی کی جھلی کے برابر بھی عالم ہستی میں سود و زیاں کے مالک نہیں ہیں، اس کے باوجود تم کس طرح سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے لیے کوئی کام کر سکیں گے یا تمہاری کوئی مشکل آسان کر سکیں گے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "جب قیامت کا دن ہوگا تو وہ تمہاری عبادت اور شرک کا انکار کر دیں گے۔ (ویوم القیامۃ یکفرون بکفرکم)۔
اور کہیں گے کہ خدا وندا! یہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے، بلکہ حقیقت میں یہ تو اپنے نفس کی پرستش کرتے تھے۔

یہ گواہی یا تو زبان حال کے ساتھ ہے، کہ جو شخص بتوں کی حالت کو دیکھے تو وہ گوش گوش کے ساتھ یہ بات ان سے سنتا ہے اور یا یہ بات ہے کہ وہ خدا جو اُس دن انسان کے اعضاء و جوارح اور بدن کی جلد کو قوت گویائی دے گا، انہیں بھی بات کرنے کا فرمان جاری کرے گا، تاکہ وہ یہ گواہی دیں کہ یہ مغرور بُت پرست حقیقت میں اپنے اولام اور خواہشات کی پرستش کرتے تھے۔
سورہ یونس کی آیت ۲۸ میں بھی ایسی بات بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ویوم نحشرہو جمعیاً شو نقول للذین اشركوا مکانکم انتم وشرکاءکم
فزیلنا بینہم و قال شرکاءہم ما کنتمو ایانا تعبدون۔

"اور اس دن کو یاد کرو کہ جب ہم اُن سب کو جمع کریں گے، پھر ہم مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے معبود اپنی جگہ پر ٹھہرو (تاکہ تمہارا حساب کتاب چکایا جائے) پھر ہم انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیں گے (تاکہ ہر ایک سے الگ الگ سوال ہو) تو وہاں ان کے معبود ان سے کہیں گے، تم ہرگز ہماری

عبادت نہیں کرتے تھے۔

مفسرین کے ایک گروہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ تعبیر ملائکہ اور حضرت عیسیٰ جیسے "معبودوں" کے بارے میں ہے، کیونکہ قیامت میں صرف وہی بات کر سکیں گے اور "ان تدعوہو لا یسمعوا دعائکم" کا جملہ اُس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں ایسے مشغول ہوں گے کہ اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری باتوں کو نہیں سنیں گے۔

لیکن "والذین تدعون من دونہ" کے مفہوم کی وسعت کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہے کہ مراد بُت ہی ہیں: "ان تدعوہم لا یسمعوا دعائکم" (اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری آواز کو نہیں سنتے) یہ جملہ ظاہر اُردنیا کے ساتھ مربوط ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: "خدا کے مانند کہ جو ہر چیز سے آگاہ ہے، کوئی بھی تجھے باخبر نہیں کرے گا" (ولا ینبئک مثل خبیر)۔

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ بُت قیامت میں تمہاری پرستش کا انکار کر دیں گے اور تم سے بیزاری اختیار کریں گے تو اس سے تعجب نہ کرو، کیونکہ ایسی ذات اس موضوع کی خبر دے رہی ہے کہ جو تمام عالم ہستی اور اس کے ذرہ ذرہ سے آگاہ ہے، اس کے علم کی بارگاہ میں مستقبل بھی ماضی اور حال کی طرح آشکار ہے۔ اگرچہ اس جگہ میں ظاہر اُردنیا میں غائب ہے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ نظر تمام انسانوں پر ہے۔

آیات سے سوء استفادہ اور انحرافی تفاسیر

اگرچہ آیات کی تفسیر کے دوران میں واضح ہو گیا ہے کہ آخری زیر بحث آیت "ان تدعوہم لا یسمعوا دعائکم" سے مراد بُت ہیں کہ جو اول تو اپنی عبادت کرنے والوں کے تقاضوں کو سننے والا کان ہی نہیں رکھتے، اور اگر رکھتے بھی تو ان کی مشکل حل کرنے پر قادر نہیں ہیں، اور نہ ہی وہ عالم ہستی میں سونے کی ٹوک کے برابر مالکیت و حاکمیت رکھتے ہیں۔

لیکن بعض جٹ دھرم دہائیوں نے پیغمبر اسلام اور ہادیان برحق پیشواؤں سے توسل اور شفاعت طلب کرنے کے خلاف اس آیت اور اسی قسم کی دوسری آیات کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے کہ وہ تمام لوگ کہ جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو یہاں تک کہ انبیاء اور پیغمبر بھی تمہاری بات نہیں سنتے اور اگر سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے یا جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت ۱۹۷ میں بیان ہوا ہے کہ:

۱۔ یہ احتمال تفسیر مجمع البیان، تفسیر آلوسی اور قرطبی میں مذکور ہے۔

والذین تدعون من دونہ لا یستطیعون نصرکم ولا ینصرون۔
خدا کے علاوہ جن جن کو تم پکارتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے اور نہ ہی شکست
میں لہتی ہی مدد کر سکتے ہیں۔

وہ لوگ اس قسم کی آیات اور اس طرح سے پیغمبروں اور آئمہ کے ادراس سے ہر قسم کے توسل کی
فہمی کرتے ہیں اور اسے توحید کے مخالف قرار دیتے ہیں۔

حالانکہ ان آیات سے پہلے اور بعد کی آیات پر ایک سرسری سی نگاہ اس حقیقت کے ادراس
کے لیے کافی ہے کہ اس سے مراد بت ہیں کیونکہ ان تمام آیات میں بتوں ہی کے بارے میں گفتگو ہے۔
پتھر اور لکڑی کے متعلق گفتگو ہے کہ جنہیں وہ خدا کا شریک خیال کرتے تھے اور وہ ان کے لیے خدا کی قدرت
کے مقابلے میں قدرت کے قائل تھے۔

لیکن کون نہیں جانتا کہ شہداء راہ خدا کی طرح۔ کہ جن کی زندگی کے بارے میں قرآن صراحت کے
ساتھ بات کرتا ہے۔ انبیاء و اولیاء بھی حیات برزخی کے حامل ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ برزخی زندگی
میں روح کی فعالیت زیادہ وسیع اور کشادہ ہے۔ کیونکہ وہ مادی جہالت اور ذہنی تعلقات سے
رہائی پائی جاتی ہے۔

دوسری طرف ان ادراس پاک سے توسل اس معنی میں نہیں ہے کہ ہم ان کے لیے خدا کے مقابلے
میں کسی استقلال کے قائل ہوں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کی جاہ و منزلت جو بارگاہ خدا میں ہے اس
سے ہم مدد طلب کریں اور جو عظمت و احترام وہ درگاہ خدا میں رکھتے ہیں اس سے مدد چاہیں اور یہ عین
توحید اور عبودیت پر دروگاہ ہے۔ (خود بھیجے گا)

اس بنا پر جیسا کہ قرآن صراحت کے ساتھ مسئلہ شفاعت کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ خدا کے
اذن اور فرمان سے شفاعت کریں گے!

من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنه

”کون ہے کہ جو بارگاہ خدا میں اس کے فرمان کے بغیر شفاعت کر سکے۔“ (بقرہ۔ ۲۵۵)

اسی طرح ان سے توسل بھی اسی طریقے سے ہے۔

کون شخص ہے کہ جو توسل کی صریح آیات کا انکار کر سکے؟ یا اسے شرک خیال کرے اور قرآن کے مقابلے
میں کھڑا ہو جائے اور پھر توحید کا دم بھرے سوانے ایسے مفرد جہلوں کے کہ جنہوں نے ایسے منحوس راگ الاپے
ہیں کہ جو مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اور اختلاف پیدا کرنے کا سبب ہیں۔

لہذا ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کے حالات میں پڑھتے ہیں کہ وہ شکلات کے وقت رسول اللہ
کی قبر کے پاس آتے تھے اور توسل قائم کرتے ہوئے آپ کی روح پاک سے بارگاہ خداوندی میں مدد

طلب کرتے تھے۔

جیسا کہ اہل سنت کے مشہور محدث، بیہقی نے نقل کیا ہے کہ علیؑ دم کے زمانہ میں خشک سالی اور
قحط پڑی، تو حضرت بلالؓ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ حجرہ پاک کی قبر کے پاس آئے اور اس طرح کہا:
یا رسول اللہ استق لامتناک.... فانہم قد هلكوا

”اے خدا کے رسول! اپنی امت کے لیے بارش طلب کیجئے۔ کہ وہ ہلاک ہو گئی ہے۔“
آؤسی کے مانند اہل سنت کے بعض مفسرین نے اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل کی ہیں آؤسی
ان احادیث کے بارے میں سختی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں:

میں ان تمام باتوں کے باوجود بارگاہ خدا میں پیغمبر کے مرتبے سے توسل میں کچھ مانع
نہیں دیکھتا، چاہے وہ حیات ہوں یا ان کی وفات کے بعد۔

اس کے بعد کچھ دوسرے لوگوں کا کہ جو بارگاہ خدا میں رتہ و مقام رکھتے ہیں اضافہ
کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ ان سے توسل رکھنا جائز ہے۔
اس سلسلے میں ہم تفصیلی بحث جلد ۳ میں سورہ مائدہ کی آیت ۶۵ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

۱۵) يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝

۱۶) إِنْ يَشَاءُ يُدْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۝

۱۷) وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ۝

۱۸) وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۗ إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۚ وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ۝

ترجمہ

۱۵) اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور صرف خدا ہی بے نیاز ہے اور ہر قسم کی حمد و ثنا کے لائق ہے۔

۱۶) وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور ایک نئی مخلوق لے آئے۔

۱۷) اور یہ امر خدا کے لیے ناممکن (اور مشکل) نہیں ہے۔

۱۸) کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا اور اگر کوئی بھاری بوجھ والا کسی دوسرے کو اپنے گناہ کا بوجھ اٹھانے کے لیے بلائے، تو وہ اس میں سے کوئی چیز اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا، اگرچہ وہ اس کے نزدیکوں میں سے ہی ہو۔ تم تو صرف انہیں لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو کہ جو

بے دیکھے بھی اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو شخص پاکیزگی (اور تقویٰ) اختیار کرے تو اس کا نتیجہ اسی کو ملے گا اور سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے۔

تفسیر

کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا

گزشتہ آیات میں توحید کی دعوت تھی اور ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کی نفی کی گئی تھی لیکن اس سے بعض کے دل میں یہ توہم پیدا ہو کہ خدا کو ہماری پرستش کی کیا ضرورت ہے۔ اس قدر اصرار اور تاکید کیوں کی گئی ہے، اس لیے زیر بحث آیات میں اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے کہ ہمیں تو ضرورت ہے کہ اس کی عبادت کریں، وہ ہماری عبادت کا محتاج نہیں ہے، فرمایا گیا ہے: اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور وہ ہر لحاظ سے بے نیاز اور محدود و متناہی کے لائق ہے (یا ایہا الناس انتم الفقراء الى الله والله هو الغنى الحميد)۔

یہ کتنی اہم اور قیمتی گفتگو ہے کہ جو عالم ہستی میں ہمیں ہستی بخشنے والے کے سامنے ہماری حیثیت واضح کرتی ہے اور بہت سے عقیدے کھولتی ہے اور بہت سے سوالات کا جواب دیتی ہے۔

ہاں! حقیقی بے نیاز اور تمام عالم ہستی میں قائم بالذات ایک ہی ہے اور وہ خدا ہے۔ تمام انسان بلکہ تمام موجودات سر تا پا احتیاج و فقر ہیں اور اس مستقل وجود کے ساتھ وابستہ ہیں، کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی ان کا ربط اُس سے ٹوٹ جائے تو وہ بے کار ہو کر رہ جائیں۔

جیسا کہ وہ بے نیاز مطلق ہے، انسان فقیر مطلق ہے اور جس طرح کہ وہ قائم بالذات ہے، ساری مخلوق اس کے ساتھ قائم ہے، کیونکہ وہ ہر لحاظ سے ایک لامتناہی وجود ہے اور ذات و صفات میں واجب الوجود ہے۔

تو ان حالات میں اُسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ہماری عبادت کا محتاج ہو، یہ تو ہم ہی ہیں کہ جو اس کی عبادت اور اطاعت کے ذریعے تکامل و ارتقاء کی راہ طے کرتے ہیں اور بے پایاں فیض کے مبداء سے اس کی عبادت کے سامنے میں لمحہ بہ لمحہ زیادہ سے زیادہ نزدیک ہوتے جاتے ہیں، اور اس کی ذات و صفات کے انوار سے بہرہ اندوز ہیں۔

حقیقت میں یہ آیت ان گزشتہ آیات کی ایک وضاحت ہے کہ جن میں فرمایا گیا ہے کہ:

”ذالکواللہ ربکم لہ الملك....“

”یہ ہے خدا، تمہارا پروردگار، عالم هستی کی مالکیت و حاکمیت اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرے موجودات تو مجبور کی محض کی نازک جھلی کے برابر ہیں اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتے۔“
اس بنا پر انسان اس کے محتاج ہیں نہ کہ کسی اور کے۔ انہیں ہرگز اس کے غیر کے آستانے پر سر نہیں جھکانا چاہیئے۔

اور اپنی حاجت اُس کے غیر سے طلب نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ وہ سب کے سب اس مانگنے والے کی طرح ہی نیاز مند اور محتاج ہیں، یہاں تک کہ خدائی پیغمبروں اور پیشوایانِ حق کی بزرگی و عظمت بھی اس بنا پر ہے کہ وہ اس کے بھیجے ہوئے نمائندے ہیں، نہ کہ وہ اپنی طرف سے قائم ہیں۔
اس بنا پر وہ غنی بھی ہے اور حمید بھی یعنی بے نیاز ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر عطا والا ہے کہ ہر قسم کی حمد و ستائش کے لائق ہے، اور بخشش کی اور بندہ نوازی کے ساتھ ساتھ سب سے بے نیازی بھی ہے۔

اس حقیقت پر توجہ مومن انسانوں میں دو مثبت اثر رکھتی ہے ایک طرف تو وہ انہیں مزدور و تاجر اور خود خواہی اور سرکشی سے بچاتی ہے اور انہیں خبردار کرتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتے کہ جس پر فخر کر سکیں جو کچھ بھی ان کے پاس ہے پروردگار کی امانت ہے۔
دوسری طرف اس کے غیر کی بارگاہ میں دست نیاز دراز نہ کریں اور غیر اللہ کی عبودیت کا طوق اپنی گردن میں نہ ڈالیں اور ان تمام بندھنوں سے آزاد ہو کر ہمت سے کام لیں۔

مؤمنین اس نظر سے عالم میں جو کچھ دیکھتے ہیں اسے اسی کے وجود کا ثبوت سمجھتے ہیں اور ان کے اسباب کی طرف توجہ انہیں ہرگز مسبب الاسباب سے غافل نہیں کرتی۔
بعض فلاسفہ نے اس آیت کو ”فقد امکان“ یا ”امکان دو جو واجب الوجود“ کے بارے میں مشہور دلیل کی طرف اشارہ سمجھا ہے اگرچہ آیت وجود خدا کا استدلال پیش نہیں کر رہی بلکہ اس کے اوصاف بیان کر رہی ہے لیکن مذکورہ برہان کو مفہوم آیت کا ایک لازمی نتیجہ سمجھا جاسکتا ہے۔

برہان امکان و وجوب (فقر و غنی) کی وضاحت

تمام موجودات کہ جنہیں ہم اس جہان میں دیکھتے ہیں، وہ سب کے سب ایک دن معدوم تھے پھر انہوں نے یکسر وجود پونیا زیادہ دقیق تعبیر کے مطابق ایک دن وہ کچھ بھی نہ تھے اور پھر وجود میں آئے۔ یہ امر اس چیز کی دلیل ہے کہ وہ کسی اور وجود کے ”معلول“ ہیں اور وہ خود سے کوئی وجود و ہستی نہیں رکھتے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر معلول وجود اپنی علت سے وابستہ اور اس کے ساتھ قائم ہے اور سرپایا نیاز و احتیاج ہے۔ اب اگر وہ علت بھی کسی اور علت کی معلول ہو تو وہ بھی اپنے مقام پر محتاج اور نیاز مند ہوگی اور اگر یہ امر لامتناہی ہو تو نیاز مند اور محتاج موجودات کا ایک مجموعہ بن جائے۔ مسلم ہے کہ اس قسم کا مجموعہ ہرگز وجود میں نہیں آسکتا، کیونکہ لامتناہی احتیاج بہر حال احتیاج ہے اور لامتناہی فقر و نیاز بہر حال فقر و نیاز ہے۔ اور لامتناہی صفر کسی عدد کو وجود نہیں بخش سکتے اور لامتناہی وابستہ اور غیر مستقل سے استقلال حاصل نہیں ہو سکتا۔

تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انجام کار ہمیں ایک ایسے وجود تک پہنچنا چاہیئے کہ جو قائم بالذات ہو اور تمام حیات سے مستقل ہو۔ وہ خود علت ہو لیکن کسی اور کا معلول نہ ہو، اور وہی واجب الوجود ہے۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ زیر بحث آیت میں صرف انسانوں اور ان کی خدا کی طرف احتیاج کے بارے میں گفتگو کیوں کی گئی ہے، جبکہ یہ فقر و احتیاج عالم هستی میں عمومی حیثیت رکھتا ہے اور کائنات کی ہر چیز محتاج ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انسان جو کہ اس جہان کا اہل سرسبد ہے، سر تا پا اس کا محتاج ہے تو پھر باقی موجودات کی حالت واضح ہے۔ دوسرے لفظوں میں باقی موجودات بھی علت فقر یعنی امکان وجود میں انسان کے ساتھ شریک ہیں۔

انسان کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر گفتگو کی گئی ہے کہ اسے مرکب مزدور و تاجر سے نیچے اتارا جائے، اور وہ ہر حال میں ہر چیز کے لیے اور ہر جگہ اپنی حاجت کی خاطر خدا ہی کی طرف توجہ دے۔ وہی توجہ کہ جو صفات فاضلہ اور ملکات اخلاق کی اصل بنیاد ہے۔ وہی توجہ کہ جو تواضع و انکساری، ترکِ ظلم و ستم، ترکِ مزدور و تاجر اور ترکِ بخل و حرص و حسد کی رمز ہے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی محرک ہوتی ہے۔

بعد والی آیت میں انسانوں کی اسی احتیاج و فقر کی تاکید کے لیے ان سے فرمایا گیا ہے: ”اگر وہ چاہے تو تمہیں اٹھالے اور ایک نئی مخلوق لے آئے“ (ان یثا یدھبکھو ویأت بخلق جدید)۔
اسی بنا پر اسے تمہاری اور تمہاری عبادت کی کوئی احتیاج نہیں اور یہ تم ہو کہ جو اس کے محتاج ہو۔

اس بات پر بھی توجہ رہے کہ امکان دو وجہ کی برہان کی دو تفسیریں ہیں۔ کیونکہ فلاسفہ نے امکان کے دو معانی کیے ہیں۔ امکان ماہوی اور امکان وجودی، اور چونکہ محققین فلاسفہ کی نظر اصالت الوجود پر ہے اس بنا پر یہاں امکان کی امکان وجودی کی شکل میں تفسیر کرنا چاہیئے کہ علت کی طرف نیاز و وابستگی اصل وجود میں ہے (اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے کتب فلسفہ کا مطالعہ کریں)۔

یہ آیت اسی مطلب کی مثال ہے کہ جو سورۃ انعام میں بیان ہوا ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے،
 وربك الغني ذو الرحمة ان يشأ يذهبكم ويستخلف من بعدكم ما
 يشاء كما انشأ قوم من ذرية قوم آخرين۔

”تیرا پروردگار بے نیاز و مہربان ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور جسے چاہے
 تمہاری جگہ لے آئے جیسا کہ تمہیں دوسری قوموں کی نسل سے وجود میں لایا ہے۔“ (انعام۔ ۱۲۳)
 وہ نہ تو تمہاری اطاعت کا محتاج ہے اور نہ ہی اسے تمہارے گناہوں کا خوف ہے لیکن اس کے
 باوجود اس کی وسیع رحمت تم سب پر سایہ فگن ہے۔ نہ تو اس سارے جہان کے ختم ہو جانے
 سے اس کی عظمت میں کسی چیز کی کمی ہوگی اور نہ ہی اس عالم کی خلقت نے اس کے مقام کبریائی
 میں کوئی اضافہ کیا ہے۔

آیت کے آخر میں تھے سرے سے تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: ”اور یہ کام خدا کے لیے ناممکن
 نہیں ہے“ (وما ذالك على الله بعزيز)۔

جی ہاں! وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے، حکم دیتا ہے کہ ہو جا، وہ فوراً وجود میں آجاتی ہے تخلیق انسان
 تو معمولی سی بات ہے، یہ بات تو تمام عالم ہستی کے بارے میں صادق ہے۔
 بہر حال اگر وہ تمہیں ایمان، اطاعت اور پرستش کا حکم دیتا ہے تو سب تمہارے ہی فائدہ میں ہے
 اور اس کی برکات تمہیں ہی حاصل ہوتی ہیں۔

آخری زیر بحث آیت گزشتہ آیات کے ربط میں پانچ نکات کی طرف اشارہ کرتی ہے:
 اول یہ کہ گزشتہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ ”اگر خدا چاہے تو وہ تمہیں اٹھالے اور تمہاری جگہ
 دوسری قوم لے آئے۔“ یہ گفتگو ممکن ہے کہ بعض افراد کے لیے یہ سوال پیدا کرے کہ اس آیت کے مخاطب
 تمام گنہگار افراد نہیں ہیں، کیونکہ ہر زمانے میں سوئین صالح موجود رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے
 کہ وہ بھی دوسروں کے گناہوں کی سزا میں گرفتار ہوں اور وہ بھی فنا ہو جائیں؟
 اسی سبب سے فرمایا گیا ہے: ”کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بار اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا“
 (ولا تنزر وازرة وزر أخزى)۔

”وزر“ بوجھ کے معنی میں ہے اور ”وزر“ (بروزن) ”نظر“ سے لیا گیا ہے کہ جو پست ٹروں کی
 پینا گاہ کے معنی میں آیا ہے اور کبھی ستولیت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ”وزیر“ کو اس لحاظ
 سے ”وزیر“ کہتے ہیں کہ وہ ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے۔ ”موازرہ“ بھی معاونت
 کے معنی میں ہے کیونکہ ہر شخص معاونت کرتے وقت دوسرے کے بار کا ایک حصہ اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے۔

یہ جملہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ حقیقت میں یہ ایک طرف تو عدل خداوندی سے ارتباط
 رکھتا ہے کہ جو ہر شخص کو اس کے عمل کے بدلے گروی شمار کرتا ہے، اس کی سعی و کوشش کا اسے اجر دیتا
 ہے اور اس کے گناہوں کی اسے سزا دیتا ہے۔

اور دوسری طرف قیامت کے دن کی شدت مجازات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی بھی دوسرے کے
 گناہوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا چاہے اس سے انتہائی لگاؤ اور تعلق
 ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔

اس مطلب کی طرف توجہ انسانوں کی خود سازی میں زیادہ اثر رکھتی ہے کیونکہ جو شخص اپنے کو پہچانا
 چاہے وہ ہرگز اس بہانے سے کہ اس کا ماحول یا اس کا معاشرہ خراب ہے، برائی میں کودنے کے لیے تیار
 نہیں ہوگا اور ماحول کی خرابی کو اپنی بے راہ روی کے لیے وجہ جواز نہیں بنائے گا کیونکہ ہر شخص اپنے گناہ
 کا بوجھ خود ہی اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے۔

عدل الہی کا یہ پہلو انسانوں کو یہ ادراک اور سوجھ بوجھ بھی دیتا ہے کہ خدا معاشرہ کا مجموعی طور پر
 حساب نہیں لیتا، بلکہ ہر شخص کا اپنا حساب لینا چاہئے گا یعنی اگر اس نے اپنی اصلاح کے لیے اور برائی
 کے خلاف جہاد کرنے کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو نبھایا ہو تو اسے کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا چاہے اس
 کے علاوہ سارے جہان کے لوگ کفر و شرک اور ظلم و گناہ میں آلودہ ہوں۔

اصولی طور پر کوئی تربیتی پروگرام اس بنیادی اصول کی طرف توجہ دینے بغیر موثر نہیں ہو سکتا۔
 (غور کیجئے گا)۔

دوسرے جملے میں اسی مسئلے کو ایک دوسری شکل میں پیش کیا گیا ہے، قرآن کتا ہے: ”اگر کوئی شخص
 بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے ہو اور وہ کسی دوسرے شخص کو اپنے گناہوں کو اٹھانے کے لیے کہے، تو وہ
 اس کا منفی جواب دے گا اور اس کے گناہ اور جواب دہی میں سے کسی چیز کو نہیں اٹھائے گا، چاہے
 وہ اس کے قریبیوں اور رشتہ داروں میں سے ہو“ (وان تدع مشقة الی حملها لا یحمل
 منه شیء ولو کان ذا قربی)۔

”مشقة“ بھاری بوجھ کے معنی میں ہے اور یہاں وہ شخص مراد ہے جو گناہوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھائے
 ہوئے ہے اور ”حمل“ (بروزن) ”شعر“، ”مزدات“ میں راعب کے قول کے مطابق ”وہ بوجھ ہے جو پشت پر اٹھایا جاتا
 ہے“ ”عمل“ (بروزن) ”جد“ کے مقابلے میں کہ ”ایسا بوجھ ہے کہ جو بیٹھ میں اٹھایا جاتا ہے مثلاً ”جنین“ یا وہ پانی کہ جو بالوں
 کے اندر ہے یا وہ پھل کہ جو درخت کے اوپر ہے اور چونکہ زیر بحث آیت میں گناہ کو اس بوجھ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جو
 کندھے پر اٹھایا جاتا ہے، اس لیے ”عمل“ حار کی زیر کے ساتھ آیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے :

قیامت کے دن ایک ماں اور ایک بیٹے کو لایا جائے گا۔ ان دونوں ہی کے کندھوں پر گناہوں کا بھاری بوجھ ہوگا۔ ماں بیٹے سے تقاضا کرے گی کہ ان تمام زحمتوں کے بدلے میں کہ جو میں نے تیرے لیے دنیا میں پھیلی ہیں میرے گناہوں کی مسئولیت کا کچھ بوجھ اپنے کندھے پر اٹھالے، اس پر بیٹا ماں سے کہے گا کہ تو مجھ سے دور ہو جا، کیونکہ میں تو تجھ سے بھی زیادہ گرفتار ہوں۔

یہاں یہ سوال سنا ہے کہ کیا یہ آیت اُن بہت سی روایات کے منافی تو نہیں جن میں سنت حسنہ و سنت سیدہ کا ذکر ہے۔ کیونکہ وہ روایات یہ کہتی ہیں کہ جو شخص کوئی اچھی سنت قائم کرے گا تو ان تمام لوگوں کا اجر کہ جنہوں نے اس پر عمل کیا ہے اس کے لیے لکھا جائے گا بغیر اس کے کہ ان کے اجر میں کچھ کمی ہو اور جو شخص بُری سنت کی بنیاد رکھے گا تو ان لوگوں کا بوجھ بھی کہ جو اس پر عمل کریں گے اُس پر ہوگا بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کوئی کمی ہو۔

لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اس صورت میں ایک شخص کا گناہ دوسرے کے ذمہ نہیں لکھا جاتا کہ جب وہ کسی قسم کا دخل اس میں نہ رکھتا ہو لیکن اگر وہ کسی کام کی بنیاد رکھے، معاونت کرے یا ترغیب دے اور اس طرح اس میں حصہ دار ہو تو پھر یقیناً یہ اس کا عمل شمار ہوگا اور وہ اس میں شریک قرار پائے گا۔ تیسرے جملے میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ پیغمبرؐ کی تشبیہ صرف آمادہ دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "تم صرف انہی لوگوں کو ڈرا پاتے ہو جو اپنے پروردگار سے غیب اور تمہائی میں ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں" (انما تنذر الذین یخشون ربہم بالغیب و اقاموا الصلوٰۃ)۔

انبیاء اور اولیاء کے ڈراوے اس وقت تک بے اثر رہیں گے جب تک دل میں خوف خدا نہ ہو اور انسان پہناں و آشکار اپنے اوپر ایک مافوق قوت کی نگرانی کا احساس نہ کرے اور نماز کے ذریعے اس اندرونی احساس کو قوی نہ کرے کیونکہ نماز دل کو زندہ کرتی ہے اور ذکر حسد اپہر اجمالی ہے۔

اگرچہ یہ حدیث مختلف تفاسیر میں بھی فضیل بن عیاض سے اور کبھی ابن عباس سے نقل ہوئی ہے، لیکن یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ یہ بات انہوں نے خود اپنی طرف سے کہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اصل حدیث پیغمبرؐ سے منقول ہو (تفسیر ابراہیم، قرطبی اور روح البیان کی طرف رجوع کریں)۔

ابتداء میں جبکہ انسان نے کوئی عقیدہ نہ اپنایا ہو اور ایمان نہ لایا ہو، اگر اس میں حق جوتی اور حق ظلی کی روح موجود نہیں ہے، اور اس میں حقائق کی شناخت کے سلسلے میں جو ابدی احساس بھی نہیں ہے تو وہ انبیاء کی دعوت پر کان نہیں دھرے گا اور عالم ہستی میں پروردگار کی نشانیوں میں غور و فکر بھی نہیں کرے گا۔

جو حق جملے میں قرآن پھر اس حقیقت کی طرف لوٹتا ہے کہ خدا سب سے بے نیاز ہے اور مزید کہتا ہے کہ: "جو شخص پاکیزگی اور تقویٰ اختیار کرے تو اس پاکیزگی کا نتیجہ خود اسی کو حاصل ہوگا" (ومن تزکی فانما یتزکی لنفسہ)۔

آخر کار پانچویں اور آخری جملے میں قرآن خبردار کرتا ہے کہ اگر نیک و بد افراد اس جہان میں اپنے اعمال کے نتائج نہ پائیں تو کوئی اہم بات نہیں ہے کیونکہ "سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور آخر کار وہ سب کا حساب چکائے گا" (والی اللہ المصیبن)۔

- ۱۹ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۝
 ۲۰ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۝
 ۲۱ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ۝
 ۲۲ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ
 مَن يَشَاءُ ۚ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ ۝
 ۲۳ إِنَّ أَنتَ إِلَّا نَذِيرٌ ۝

ترجمہ

- ۱۹ نابینا اور بینا ہرگز برابر نہیں ہیں۔
 ۲۰ اور نہ ہی ظلمتیں اور روشنی۔
 ۲۱ اور نہ ہی (آرام بخش) سایہ اور گرم جلانے والی ہوا۔
 ۲۲ اور مردہ اور زندہ بھی ہرگز برابر نہیں ہیں۔ خدا اپنا پیغام جس کے کان تک چاہتا ہے پہنچاتا ہے اور تم قبروں (میں سونے) والوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے۔
 ۲۳ تم تو صرف ڈرانے والے ہو (اب اگر وہ ایمان نہ لائیں تو پریشان نہ ہونا کہ تم نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے)۔

تفسیر

نور و ظلمت یکساں نہیں ہیں

ان مباحث کی مناسبت سے کہ جو ایمان و کفر کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں بیان ہوئے تھے

زیر بحث آیات میں چار پرکشش مثالیں مومن اور کافر کے بارے میں بیان کی گئی ہیں جن میں ایمان و کفر کے آثار نہایت واضح طور پر مجسم ہو گئے ہیں۔

پہلی مثال میں کافر و مومن کو نابینا اور بینا کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے: "نابینا اور بینا ہرگز برابر نہیں ہیں" (وما یستوی الاععمی والبصیر)۔

ایمان نور ہے اور روشنی بخشنے والا ہے اور انسان کو کائنات شناسی، اعتقاد، عمل اور تمام زندگی میں روشنی اور آگاہی بخشتا ہے۔ لیکن کفر ظلمت اور تاریکی ہے اور اس میں نہ تو سارے عالم ہستی کے بارے میں صحیح دانش دینش ہے اور نہ صحیح اعتقاد اور عمل صالح کی کوئی خبر ہے۔

قرآن مجید اسی سلسلے میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۷ میں حق مطلب ادا کرتے ہوئے کہتا ہے:

اللہ ولی الذین امنوا یخرجہم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیائہم الطاغوت یشخرجونہم من النور الی الظلمات اولئک اصحاب النار ہم فیہا خالدون۔

"خدا مومنوں کا ولی، راہنما اور سرپرست ہے۔ وہ انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف ہدایت کرتا ہے لیکن کافروں کا ولی طاغوت ہے کہ جو انہیں روشنی سے ظلمتوں کی طرف بھینچ لے جاتا ہے، وہ اصحاب دوزخ ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔"

چشم بینا تنہا کافی نہیں ہے، لہذا روشنی اور نور بھی ہونا چاہیے تاکہ انسان ان دو عوامل کی مدد سے موجودات کا مشاہدہ کر سکے۔ بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: "نہ ہی تاریکیاں نور کے برابر ہیں" (ولا الظلمات ولا النور)۔

چونکہ تاریکی گمراہی کا سبب ہے، تاریکی سکون و وجود کی حامل ہے اور تاریکی طرح طرح کے خطرات کی حامل ہے لیکن نور اور روشنی حیات و حرکت، رشد و نمو اور تکامل دار تھا۔ کا منشاء ہے۔ اگر نور ختم ہو جائے تو عالم کی تمام قوتیں اور طاقتیں ختم ہو جائیں، اور موت سارے مادی عالم کو گھیر لے، اور اسی طرح عالم روحانی میں نور ایمان ہے کہ وہ رشد و تکامل کا حامل ہے اور حیات و حرکت کا سبب ہے۔ اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: "(آرام بخش) سایہ گرم ہوا اور جلانے والی ٹوکے برابر نہیں ہے" (ولا الظل ولا الحرور)۔

مومن اپنے ایمان کے سائے میں سکون اور امن و امان سے زندگی بسر کرتا ہے لیکن کافر اپنے کفر کی وجہ سے تکلیف اور رنج میں مبتلا رہتا ہے۔

راغب مفردات میں کہتا ہے "حرور" (بروزن "قبول") گرم اور جلانے والی ہوا کے معنی میں ہے (مارنے والی اور خشک کر دینے والی ہوا)۔

بعض اسے بادِ سموم کے معنی میں سمجھتے ہیں اور بعض سورج کی سخت اور شدید حرارت کے معنی میں۔

زخمشری کشف میں کہتا ہے کہ "سموم" موذی اور ہلاک کرنے والی ہواؤں کو کہتے ہیں۔ جو دن کے وقت چلتی ہیں لیکن "حور" کہا تو انہیں ہواؤں کو جانا ہے لیکن بغیر اس تیز کے کہ وہ دن کے وقت چلیں یا رات کو۔ بہر حال اس قسم کی ہواؤں کہاں اور ٹھنڈا اور نشاط آفریں سایہ کہاں کہ جو انسان کی روح اور جسم کو نوازتا ہے۔

آخری تشبیہ میں فرمایا گیا ہے: "اور زندہ اور مردہ ہرگز برابر نہیں ہے" (وما یستوی الا حیة ولا الاموات)۔

مومنین زندہ ہیں اور سنی و کوشش، حرکت و جنبش اور رشد و نمو کے حامل ہیں۔ وہ شاخیں، پتے، پھول اور پھل رکھتے ہیں لیکن کافر خشک لکڑی کی طرح ہیں کہ جس میں نہ طراوت ہے نہ پتہ، نہ پھول اور نہ کوئی سایہ اور سوائے جلانے کے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

سورۃ النعام کی آیت ۱۲۲ میں ہے کہ:

او من کان میتاً فاحییناہ وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس کن مثله فی الظلمات لیس بخارج منها۔

"کیا وہ شخص کہ جو مردہ تھا اور ہم نے اُسے زندہ کیا، اور ہم نے اُسے نور عطا کیا کہ جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اُس شخص کے مانند ہے کہ جو ظلمات اور تاریکیوں میں غوطہ زن ہے اور ہرگز اس سے نہیں نکلے گا؟"

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: "خدا جسے چاہتا ہے سننے والا بنا دیتا ہے" تاکہ وہ حق کی دعوت کو دل کے کان سے سنے اور توحید کی منادی کرنے والوں کی ندا پر لبیک کہے (ان اللہ یسمع من یشاء) اور تم اپنی بات ہرگز ان مردوں کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتے جو قبروں میں سوئے ہوئے ہیں (وما انت بمسمع من فی القبور)۔

تمہاری فریاد چاہے جس قدر رسا ہو اور تمہاری گفتگو جس قدر بھی دل نشین ہو اور تمہارا بیان جتنا بھی فصیح و بلیغ ہو مردے اس میں سے کسی چیز کو سمجھ نہیں سکتے اور وہ لوگ کہ جو گناہ پر اصرار اور تعصب، عناد، ظلم اور فساد میں غوطہ زن ہونے کی وجہ سے اپنی روح انسانی کو کھو بیٹھے ہیں، یقیناً تمہاری دعوت قبول کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔

اس بنا پر ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے پریشان اور بے تاب نہ ہو۔ تمہاری ذمہ داری تو

صرف بات کو پہچانا اور ڈرانا ہے۔ "تم تو صرف ڈرانے والے ہو" (ان انت الٰہ منذیر)۔

چند اہم نکات

۱۔ ایمان و کفر کے آثار: ہم جانتے ہیں کہ قرآن جزافیا، نسل اور طبقاتی قسم کی سرحدوں میں سے کہ جو انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں کسی کا قائل نہیں ہے۔ اس نے تو صرف ایک ہی سرحد شمار کی ہے اور وہ ایمان و کفر کی سرحد ہے اور وہ اس طرح سے تمام انسانی معاشرے کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

قرآن نے ایمان کے تعارف میں متعدد مواقع پر اُسے نور کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور کفر کو ظلمت کے ساتھ اور یہ تشبیہ۔ نتیجہ خیزی کے لیے۔ ایک زندہ ترین تشبیہ ہے یہ۔

ایمان ایک قسم کا باطنی اور ادراک اور بصیرت ہے۔ قلبی عقیدے اور جنبش و حرکت سے تو اُم یہ ایک قسم کا علم و آگاہی ہے۔ یہ ایک قسم کا یقین ہے کہ جو انسان کے قلب و روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور ایسے اسلامی کاموں کا سرچشمہ بن جاتا ہے کہ جو معاشرے کی رشد و نمو کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن کفر جہالت ہے، نا آگاہی اور بے یقینی ہے کہ جس کا نتیجہ عدم تحرک، احساسِ مسؤلیت کا فقدان اور شیطانی اور مخرب حرکات ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ "نور" عالمِ ماوہ میں انسان، حیوان اور نباتات کے لیے ہر قسم کی حیات، حرکت، نمو اور رشد کا مبداء ہے اور اس کے برعکس ظلمت و تاریکی خاموشی اور خواب و غفلت کی حامل ہے اور مسلسل جاری رہنے کی صورت میں موت ہے اور زندگی کے خاتمے کا سبب ہے۔

اس بنا پر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان آیات میں ایمان و کفر کو نور و ظلمت سے۔ حیات و موت سے اور آرام بخش سائے اور بادِ سموم سے تشبیہ دی گئی ہے اور اسی طرح مومن و کافر کو بینا و نابینا سے تشبیہ دی گئی ہے۔

کہنے کے لائق تمام باتیں ان چار تشبیہوں میں بیان ہو گئی ہیں۔

ہم زیادہ دیر نہ جائیں، جس وقت ہم ایک مومن کے ساتھ نشست و برخاست کرتے ہیں تو ہم اس کے تمام وجود میں اس نور کا اثر محسوس کرتے ہیں اس کے افکار و مضامین بخشنے ہوتے ہیں، اس کی باتیں درخشندہ ہوتی ہیں اور اس کے اعمال و اخلاق ہمیں حقیقت زندگی اور حیاتِ واقعی سے آشنا کرتے ہیں۔

لیکن کافر کے تمام وجود سے تاریکی برتی ہے۔ وہ اپنے مادی اور وقتی مفادات کے علاوہ کچھ نہیں

سوچنا اس کی فکر کا افق اور فضا اس کی شخصی زندگی کی چار دیواری سے اوپر نہیں جاتے، وہ شہوات و غوافنوں میں غوطہ زن ہوتا ہے اور اس کی ہمنشین انسان کے قلب و روح کو ظلمات و تاریکی کی موجوں میں ڈبو دیتی ہے کیونکہ،

سہ ہمدی مُردہ دہد مُردگی صحبت افسردہ دل افسردگی
مُردے کی ہمنشین سے مُردگی حاصل ہوتی ہے۔ اور افسردہ دل کی صحبت افسردگی ملتی ہے۔
اور اس طرح سے قرآن نے جو کچھ ان آیات میں بیان کیا ہے اسے ہم محسوس بھی کر سکتے ہیں سمجھ بھی
سکتے ہیں یعنی وہ قابلِ ادراک ہے۔
۲۔ کیا مُردے کسی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے؟ اور پر والی آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر توجہ دینے سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

پہلا یہ کہ قرآن یہ کیسے کہتا ہے کہ: "تم اپنی آواز مُردوں کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتے" حالانکہ مشہور حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم نے جنگ بدر کے دن یہ حکم دیا تھا کہ جنگ کے اختتام پر کھانکے بدلوں کو کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ اس کے بعد آپ نے انہیں پکارا کہ فرمایا:

هل وجدتم ما وعد الله رسوله حقا؟ فاني وجدته ما وعدني الله حقا۔

"کیا تم نے اس چیز کو کہ جس کا خدا اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا حق پایا ہے؟ میں نے تو جس کا خدا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اسے حق پایا ہے۔"
اس موقع پر حضرت عمر نے کہا کہ اے خدا کے رسول! آپ ایسے اجساد سے کس طرح گفتگو کر لے ہیں جن میں روح ہی نہیں ہے؟ پیغمبر اکرم نے فرمایا:

ما انتعوا باسمع لما اقول منهم، غير انهم لا يستطيعون ان يردوا شيئا۔

"تم میری باتوں کو ان سے بہتر طور پر نہیں سنتے، بات صرف اتنی ہے کہ وہ جواب دینے کی توانائی نہیں رکھتے۔"

اسی طرح آدابِ میت میں سے ایک یہ ہے کہ عقائدِ حقہ کی اسے تلقین کی جائے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات زیر بحث آیات کے ساتھ کس طرح مناسبت رکھتی ہے؟
اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ زیر بحث

تفسیر روح البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث عقوڑے سے فرق کے ساتھ بیان ہوئی ہے (صحیح بخاری جلد ۵ صفحہ ۹۰ باب قتل ابی جہل)۔

آیات مُردوں کے عدم ادراک کو معمول کے لحاظ سے اور طبعی حوالے سے بیان کرتی ہیں لیکن جنگ بدر کی روایات یا یقیناً میت والی روایت فوق العادہ شرائط و حالات کے ساتھ مربوط ہے کہ خدا نے اپنے پیغمبر کی باتیں فوق العادہ طور پر ان مُردوں کے کانوں تک پہنچائیں۔

دوسرے لفظوں میں عالمِ برزخ میں انسان کا ربط عالمِ دنیا سے منقطع ہو جاتا ہے، سوائے ان موقعوں کے کہ جن کے بارے میں خدا حکم دے دے کہ یہ ارتباط برقرار رہے اسی بنا پر عام حالات میں ہم مُردوں کے ساتھ ارتباط پیدا نہیں کر سکتے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ہماری آواز مُردوں کے کانوں تک نہیں پہنچتی تو پھر پیغمبر اکرم اور ائمہ پر سلام بھیجا اور انہیں وسیلہ قرار دینا اور ان کی قبور کی زیارت کرنا اور بارگاہِ خداوندی میں ان سے شفاعت کا تقاضا کرنا کیا مفہوم رکھتا ہے؟

دعا قبول کی ایک جماعت کہ جو عام طور پر فکری جہود کے حوالے سے مشہور ہے، قرآن کی دوسری آیات کا مطالعہ کیے بغیر ابتدائی ظواہر سے یہی بات کرتی ہے۔ یہ لوگ بہت سی احادیث کو کہ جو پیغمبر سے منقول ہوئی ہیں کوئی وقعت نہ دیتے ہوتے، مسئلہ توسل کی نفی کر دیتے ہیں اور یوں انہوں نے اپنے گمان ناقص سے ان پر خط بطلان کھینچ دیا ہے۔

اس سوال کا جواب بھی اسی سے کہ جو ہم نے پہلے سوال کے جواب میں دیا ہے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ پیغمبر اکرم اور اولیائے خدا کا معاملہ دوسرے لوگوں سے الگ ہے۔ وہ شہداء کے مانند (ملکان کی پہلی صف میں) قرار پاتے ہیں اور زندہ جاوید ہیں اور "احیاء عند ربہم میرزقون" کے مصداق پروردگار کی روزی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ خدا کے حکم سے اس جہان کے ساتھ ان کا ارتباط باقی رہتا ہے۔ جیسا کہ اس جہان میں رہتے ہوئے وہ مُردوں کے ساتھ ارتباط برقرار رکھ سکتے ہیں جیسا کہ مقتولین بدر کی مثال موجود ہے۔

اسی بنا پر بہت سی روایات ہیں کہ جو اہل سنت اور اہل تشیع کی کتابوں میں منقول ہوئی ہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرم اور ائمہ کچھ لوگوں کی باتیں جو دُور یا نزدیک سے اُن پر سلام بھیجتے ہیں سنتے ہیں اور انہیں جواب دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ امت کے اعمال بھی ان کی خدمت میں پیش ہوتے ہیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہمیں یہ حکم ہے کہ نماز کے تشہد میں پیغمبر اکرم پر سلام بھیجیں اور یہ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے چاہے وہ شیعہ ہوں یا اہل سنت، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم آنحضرت سے ایسی بات کریں

کشف الاستیاب صفحہ ۱۰۱، آیت ۱۰۵ سورہ توبہ کے ذیل میں ہم نے بھی "اعمال پیش ہونے کا مسئلہ" کی طرف اشارہ کیا ہے۔
(جلد ۸ تفسیر نورۃ صفحہ ۱۵۱ اردو ترجمہ کی طرف رجوع کریں)۔

کہ جسے آپ نے نکل نہیں سکتے۔
متعدد روایات میں صحیح مسلم میں ابوسعید خدریؓ ابو ہریرہ سے خود پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا،

لَقِنَا مَوْتَا كَمَا كَوَّلَا اللهُ الْآلَةَ

”اپنے مردوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کر دینا۔“

شیخ البلاغہ میں بھی مردوں کی ارواح کے ساتھ ارتباط کے مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ حضرت علیؓ نے ان مومنین کے ارواح سے کہ جو کونے کے فواحی قبرستان میں تھے گفتگو کی۔
۳۔ تعبیرات کا تنوع فصاحت کا ایک حصہ ہے: ان چار تشبیہوں میں کہ جو اوپر والی آیات میں بیان ہوئی ہیں مختلف تعبیرات نظر آتی ہیں۔ مثلاً ”اعطی“ و ”بصیص“۔ ”ظل“ و ”حور“ مفرد کی صورت میں آئی ہیں۔ جبکہ ”احیاء“ و ”اموات“ دونوں جمع کی صورت میں ہیں اور ”ظلمات“ و ”نور“ میں سے ایک لفظ مفرد اور دوسرا جمع کی صورت میں آیا ہے۔

نیز پہلی اور دوسری تشبیہ میں جو معنی صورت رکھتے ہیں انہیں مقدم رکھا ہے (اعطی و ظلمات) جبکہ تیسری اور چوتھی تشبیہ میں چونکہ مثبت صورت رکھتے ہیں ”ظل“ اور ”احیاء“ کو مقدم رکھا گیا ہے۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ پہلی تشبیہ میں حرف نفی کا تکرار نہیں ہوا جبکہ باقی تین تشبیہات میں نفی کا تکرار ہوا ہے۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ ”مایستوی“ صرف پہلی اور آخری تشبیہ میں آیا ہے اور باقیوں میں نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے اس تفاوت کے لیے کچھ نکات بیان کیے ہیں۔ جن میں سے کچھ تو قابل ملاحظہ ہیں اور بعض قابل اعتراض۔

جملہ ان نکات کے کہ جو قابل ملاحظہ ہیں ایک یہ ہے کہ ”ظلمات“ کا جمع ہونا اور ”نور“ کا مفرد ہونا اس بنا پر ہے کہ ظلمت یعنی کفر کے بہت سے شعبے ہیں، لیکن ایمان اور توحید کی صرف ایک ہی حقیقت ہے۔ ایمان خطا مستقیم ہے کیونکہ دو نقطوں کے درمیان ایک خط مستقیم کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا لیکن ظلمت کفر ٹیڑھے خطوط کی طرح ہے کیونکہ دو نقطوں کے درمیان ہزار ہا ٹیڑھے خطوط ہوتے ہیں۔

پہلی دو مثالوں میں معنی صورتوں کو مقدم رکھنا آغاز اسلام کی طرف اشارہ ہے کہ لوگوں نے جاہلیت کی نابینائی اور شرک کے ظلمات سے اسلام کی روشنی اور بینائی کی طرف ہدایت پائی۔

لیکن دو دوسری مثالیں دوسرے مراحل کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جب اسلام نے اپنی جڑوں کو دلوں کی زمین میں محکم کر لیا تھا اور اپنی اہمیت کی صورتوں کو معاشرے میں وضعت دی تھی۔

لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر اصولی طور پر بیان میں تنوع گفتگو میں ایک خاص قسم کی روح اور تازگی پیدا کر دیتا ہے اور اسے دل نشین، خوبصورت اور پرکشش بنا دیتا ہے۔ جبکہ ایک ہی طرح کے کلام کی تکرار۔ سوائے استثنائی مواقع کے۔ گفتگو کی لطافت ختم کر دیتی ہے۔ اسی بنا پر فصحاء و بلاغاء ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی گفتگو کی تعبیروں کو متنوع اور دل نشین بنائیں اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر ہے۔

اس بنا پر اگر فصاحت و بلاغت کے علاوہ ان تعبیرات میں اور کوئی نکتہ نہ بھی ہوتا تب بھی یہی چیز کافی تھی۔ اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ آنے والے حضرات ان اسرار کے علاوہ کہ جو ہم نے پیش کیے ہیں، ان تعبیرات میں دوسرے اسرار بھی تلاش کر سکیں کہ جو اس وقت ہم سے پوشیدہ ہیں۔

۲۳) اِنَّا اَوْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ
اَلَا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ

۲۵) وَاِنْ يَكْذِبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
جَاؤُا تَهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَاَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا
۲۴) ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاَكْفَيْتُ كَانَ نَكِيْرًا

ترجمہ

۲۲) ہم نے تجھے حق کے ساتھ بشارت اور نذارت کے لیے بھیجا اور گزشتہ
زمانہ میں ہر امت کے لیے کوئی نہ کوئی ڈرانے والا موجود رہا ہے۔

۲۵) اگر وہ تیری تکذیب کرتے ہیں (تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے) جو لوگ
ان سے پہلے تھے (وہ بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کیا کرتے تھے۔ وہ واضح دلائل،
پند و نصائح کی کتب اور روشنی عطا کرنے والی آسمانی کتابیں (کہ جو معارف و احکام پر مشتمل
تھیں) لے کر ان کے پاس آئے (لیکن دل کے اندھے ان پر ایمان نہ لائے)۔

۲۴) پھر میں نے کفار کو (تمام حجت کے بعد) پکڑ لیا (اور انہیں سخت عذاب دیا)
پس اُن پر میرا عذاب کیسا تھا؟

تفسیر
دل کے اندھے ایمان نہ لائیں تو تعجب نہیں

گزشتہ آیات میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ کچھ افراد ایسے ہیں کہ جو مردوں اور نابیناؤں کی مانند
ہیں کہ جن کے دل میں انبیاء کی باتیں مہوئی سا اثر بھی نہیں کرتیں۔ اس کے بعد زیر بحث آیات میں

پہنچا کر ہم کی اس سلسلے میں دلجوئی کے لیے تاکہ وہ غمگین اور پریشان نہ ہوں پہلے فرمایا گیا ہے، ہم نے
تجھے حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا اور گزشتہ زمانے میں کوئی امت ایسی
نہ تھی کہ جس میں ڈرانے والا نہ آیا ہو (اِنَّا اَوْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ
اَلَا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ)۔

تو "بشارت" و "انذار" کی ذمہ داری میں کوتاہی نہ کرے یہی تیرے لیے کافی ہے۔ تو اپنی نما ان
کے کانوں تک پہنچا، خدائی جواؤں کی بشارت دے اور پروردگار کے عذاب سے انہیں ڈرا، چاہے
وہ قبول کریں یا دشمنی اور ہٹ دھرمی اختیار کر لیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ گزشتہ بحث کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ: "ان انت الٰہ نذیر"۔
لیکن زیر بحث پہلی آیت میں یہ ہے کہ: "ہم نے تجھے برحق بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے"۔ یہ اس بات کی
طرف اشارہ ہے کہ اگر تو ڈرانے والا ہے تو خود اپنی طرف سے یہ کام نہیں کرتا، یہ تو ایک ماموریت
ہے کہ جو ہم نے تیرے سپرد کی ہے۔

اور اگر گزشتہ آیت میں صرف انذار کا ذکر ہوا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں ہٹ دھرم جاہلوں کے
بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ جو قبرستان کے مُردوں کی طرح کوئی بات قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں
تھے، لیکن یہاں پر انبیاء کی ذمہ داری کو عملی طور پر بیان کیا جا رہا ہے کہ جو بشارت و انذار کے دونوں پہلوؤں
کی حامل ہے۔ البتہ اس آیت کے آخر میں پھر نئے سرے سے "نذیر" کا ذکر ہے کیونکہ مشرکین اور غالموں
کے مقابلے میں انبیاء کی دعوت کا بنیادی حصہ "انذار" پر مشتمل تھا۔

"خلاء" "خلاء" کے مادہ سے اصل میں اس مکان اور جگہ کے معنی میں ہے کہ جس میں کوئی ڈھانپنے
والی چیز نہ ہو، یہ لفظ زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور مکان کے لیے بھی، اور چونکہ زمانہ گزر جانے
والی چیز ہے اس لیے گزشتہ زمانوں کو "ازمنہ خالیہ" کہا جاتا ہے، کیونکہ اب وہ باقی نہیں ہیں اور
دنیا ان سے خالی ہو چکی ہے۔

اس بنا پر "وان من امة الا خلا فیہا نذیر" کا جملہ اس معنی میں ہے کہ: گزشتہ امتوں میں سے
ہر امت کے لیے گزشتہ زمانے میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا موجود رہا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیت کے مطابق تمام امتیں خدا کی طرف سے انذار کرنے والی
پیغمبر رکھتی تھیں، اگرچہ بعض نے اس کو ایک وسیع تر معنی میں لیا ہے کہ جس میں علماء اور ایسے دانشور بھی شامل
ہیں کہ جو لوگوں کو متنبہ کیا کرتے ہیں لیکن یہ معنی ظاہر آیت کے خلاف ہے۔

بہر حال اس بات کا معنی یہ نہیں ہے کہ ہر شہر اور ہر علاقے میں ایک پیغمبر مبعوث ہوا ہو بلکہ اس سے
مراد یہ ہے کہ پیغمبروں کی دعوت اور ان کی باتیں ان سب لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئی تھیں، کیونکہ قرآن

کہتا ہے: "خلا فیہا نذیر" یعنی "ان میں ڈرانے والا موجود تھا" یہ نہیں کہتا کہ "منہا یعنی خود ان میں سے تھا۔ اس بنا پر جو کچھ زیر بحث آیت میں بیان ہوا ہے وہ سورہ سبأ کی آیہ ۴۴ سے اختلاف نہیں رکھتا کہ جو یہ کہتی ہے:

وما ارسلنا الیہم قبلک من نذیر۔

"ہم نے مشرکین تک کی طرف تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا تھا"

یہاں ڈرانے والا سے مراد خود انہیں میں سے ہے جبکہ زیر بحث آیت میں پیغمبر کی دعوت کا ان تک پہنچنا ہے۔

بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: "اگر وہ تمہاری تکذیب کریں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور تم اس پر عملگین نہ ہو، کیونکہ جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی جبکہ وہ واضح معجزات و دلائل، پند و نصائح سے مہمور کتب اور ایسی آسمانی کتب لے کر ان کے پاس آئے تھے کہ جو ضیاء بخش احکام و قوانین پر مشتمل تھیں" (وان یکذبوا کذب الذین من قبلہم جاہلتمہم رسلہم بالبینات وبالذبر وبالکتاب المنیر)۔ صرف تم ہی نہیں کہ جو معجزات اور آسمانی کتاب کے حامل ہو۔ اس کے باوجود اس جاہل قوم نے تمہاری تکذیب کی ہے، بلکہ گزشتہ پیغمبر بھی اسی طرح کی شکل سے گزرتے رہے ہیں۔ اس بنا پر تم عملگین نہ ہو اور مضبوطی کے ساتھ اپنے راستے پر قدم بڑھاتے دو اور جان لو کہ قبول کرنے والے قبول کر ہی لیں گے۔

"بیّنات" "ذبر" اور "کتاب منیر" کے درمیان فرق کے بارے میں مفسرین نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ ان میں سے زیادہ واضح دو تفسیریں ہیں:

۱۔ "بیّنات" ان واضح اور روشن دلائل و معجزات کے معنی میں ہے کہ جو پیغمبر کی حقانیت ثابت کر دیں لیکن "ذبر" کہ جو "ذبور" کی جمع ہے، ان کتابوں کے معنی میں ہے کہ جنہیں مستحکم کر کے لکھا گیا ہو (پتھر وغیرہ پر لکھی ہوئی تحریر کے مانند) جبکہ یہاں ان کے مطالب کے استحکام کے لیے کہا یہ ہے۔

بہر حال یہ ایسی کتابوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو حضرت موسیٰ سے پہلے نازل ہوئیں جبکہ "کتاب منیر" کتاب موسیٰ اور ان دوسری آسمانی کتابوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس کے بعد نازل ہوئیں (کیونکہ قرآن مجید میں سورہ مائدہ کی آیہ ۴۴ و ۴۵ میں تورات اور انجیل کو ہدایت و نور کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے اور اسی سورہ کی آیہ ۱۵ میں قرآن مجید کے بارے میں بھی نور کی تعبیر آئی ہے)۔

۲۔ راغب مفردات میں کہتا ہے:

زبروت الکتاب کتبہ کتابہ عظیمہ وکل کتاب علیہ الکتابہ یقال لہ زبور (مفردات مادہ زبر)
"میں نے مستحکم اور عظیم کتابت کی اور جس کتاب کی کتابت مستحکم اور سخت ہو اسے زبور کہتے ہیں۔"

۲۔ "ذبر" سے مراد کتب انبیاء کا وہ حصہ ہے جس کے مطالب اور مضامین صرف وعظ و نصیحت اور مناجات پر مشتمل تھے (مثلاً زبور داؤد)۔
لیکن "کتاب منیر" آسمانی کتابوں کی وہ قسم ہے کہ جو احکام و قوانین اور مختلف اجتماعی و انفرادی امور کی حامل تھیں، مثلاً تورات، انجیل اور قرآن مجید۔
دوسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں اس گروہ کے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ایسا نہیں تھا کہ وہ خدائی عذاب سے محفوظ رہ جائیں اور ہمیشہ اپنی تکذیبوں کو جاری رکھیں لہذا اس کے بعد ہم نے کافروں کو پکڑ لیا اور انہیں سخت سزا دی (شو اخذت الذین کفروا)۔
کسی گروہ کو طوفان نے آیا، کسی اور کو تیز اور دیران کن آندھی نے تباہ کر دیا اور کسی جماعت کو ہم نے آسمانی چنگھاڑ، صاعقہ اور زلزلہ کے ذریعے درہم برہم کر دیا۔

اس کے بعد آخر میں تاکید اور ان کی سزا کی شدت بیان کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: "ان کے لیے میرا عذاب کیسا تھا؟ (فکیف کان نکیب)۔"

یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ایک شخص کوئی اہم کام انجام دیتا ہے اور اس کے بعد حاضرین سے سوال کرتا ہے کہ میں نے یہ کام کیسا کیا ہے؟

بہر حال یہ آیات ایک طرف تو راہ خدا کے تمام راہیوں خصوصاً ہر زمانے اور ہر امت کے سچے راہبروں اور پیشواؤں کی دلجوئی کرتی ہیں اور ان کے دلوں کو گرماتی ہیں کہ وہ مخالفت صدائوں سے دل تنگ اور مایوس نہ ہوں اور یہ جان لیں کہ خدائی دعوتیں ہمیشہ ہٹ دھرموں، متعصبوں اور مفاد پرست ظالموں کی طرف سے شدید مخالفتوں کا سامنا کرتی رہی ہیں جبکہ کچھ دل سوز ظالمان حق اور عاشقان پاکباز بھی موجود رہتے ہیں کہ جو داعیان حق کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی جان کو قربان کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف یہ آیات ان ہٹ دھرم مخالفین کے لیے ایک دھمکی کی حیثیت رکھتی ہیں تاکہ وہ یہ جان لیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے شرمناک اور مخرب اعمال جاری نہیں رکھ سکتے۔ جلد یا بدیر خدائی عذاب دامگیر ہو کر رہے گا۔

• • •

۱۔ "اخذت" "اخذ" کے مادہ سے پڑنے اور گرفت کرنے کے معنی میں ہے لیکن یہاں سزا کے لیے کہا یہ ہے کیونکہ گرفت میں لینا اور پکڑنا سزا کی تہید ہے۔

۲۷) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجْنَا
 بِهٖ ثَمَرًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَّ
 حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَاخْرَابِيْبٌ سُوْدٌ ۝
 ۲۸) وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَاَلْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهُ
 كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓءُ
 اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝

ترجمہ

۲۷) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے پانی نازل فرمایا کہ جس کے
 ذریعے ہم نے زمین سے گونا گوں رنگ کے پھل نکالے اور پہاڑوں میں
 بھی (پروردگار کے لطف سے) سفید و سرخ رنگ کے راستے پیدا ہوئے مختلف
 رنگوں میں اور کبھی گہرے سیاہ رنگ میں۔

۲۸) اور انسانوں، چلنے پھرنے والے جانداروں اور چوپایوں کے بھی مختلف رنگ
 ہوتے ہیں۔ (ہاں!) حقیقت یہی ہے کہ خدا کے بندوں میں سے صرف علماء اُس
 سے ڈرتے ہیں۔ خدا عزیز و غفور ہے۔

تفسیر

وجود کے در و دیوار پر عجیب نقش و نگار

ان آیات میں پھر سکہ توحید زیر بحث ہے اور کتاب تکوین کا ایک نیا صفحہ انسانوں کی نگاہوں
 کے سامنے ہے، تاکہ ہٹ دھرم مشرکین اور سخت منکرین توحید کا ایک دندان شکن جواب پیدا ہو۔

اس عظیم کتاب آفرینش کے اس خوبصورت صفحہ میں بے جان موجودات کے تنوع کا ذکر ہے اور
 نباتات، حیوانات اور انسانوں کی دنیا میں حیات کے مختلف اور خوبصورت پھروں کی طرف توجہ
 دلائی گئی ہے اور دعوت دی گئی ہے کہ دیکھیں خدا نے کس طرح بے رنگ پانی سے لاکھوں رنگ
 ظاہر کیے ہیں اور معین و محدود عناصر سے بالکل متنوع موجودات پیدا کیے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک
 دوسرے سے زیادہ زیبا اور خوبصورت ہے۔

اس غالب و ماہر نقاش نے ایک ہی قلم اور سیاہی سے انواع و اقسام کے نقش ایجاد کر
 دیئے ہیں کہ جو دیکھنے والوں کو فریفتہ و شیفٹہ کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تو نے
 نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے ہم نے مختلف رنگ کے پھل
 پیدا کیے (الہم تران اللہ انزل من السماء ماء فاخرجنا به ثمرات مختلفا الوانها)۔

اس جگہ کی استہمام تقریری کے ذریعہ ابتداء، انسانوں کی تلاش و جستجو کی جس کو تحریک دیتے
 ہوئے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مطلب اتنا روشن و واضح ہے کہ جو شخص بھی نگاہ کرے گا،
 دیکھ لے گا۔ ہاں! وہ اس حقیقت کو دیکھ لے گا کہ ایک ہی پانی اور زمین سے کہ جن میں سے ایک بے رنگ
 ہے اور دوسری صرف ایک رنگ رکھتی ہے، یہ سب مختلف قسم کے رنگ طرح طرح کے پھلوں خوبصورت
 پھولوں پتوں اور شکوفوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔

الوان، ممکن ہے کہ پھلوں کے ظاہری رنگوں کے معنی میں ہو کہ ایک ہی قسم کے پھل میں بھی
 کئی قسم کے رنگ پائے جاتے ہیں۔ جیسے سیب مختلف رنگوں میں ہوتا ہے اور مختلف قسم کے پھلوں کی
 تو بات ہی اور ہے اور ہر سکتا ہے کہ یہ ان کے ذائقے، ساخت اور خواص میں اختلاف کی طرف اشارہ
 ہو، یہاں تک کہ ایک ہی پھل کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، مثلاً انگور کی شاید پچاس قسمیں ہیں اور کھجور کی
 تقریباً ستر قسمیں ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں فعل غالب کی شکل میں آیا ہے، اس کے بعد مستکم کی
 صورت میں شروع میں ہے کہ "خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا" پھر اضافہ کیا گیا ہے کہ "ہم نے اس
 کے ذریعہ رنگا رنگ میوے اور پھل نکالے" یہ طرز تعبیر صرف اسی آیت میں منحصر نہیں ہے، قرآن مجید
 میں دوسرے مقامات پر بھی یہی بات نظر آتی ہے۔ گویا پہلا جملہ مخاطب کو خدا کے ہارے میں ایک
 تازہ ادراک و معرفت عطا کرتا ہے، اور وہ اس ادراک و معرفت کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے
 اور جب وہ حاضر ہو جاتا ہے تو اللہ اُس سے گفتگو کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں ان راستوں کے تنوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو پہاڑوں میں پائے جاتے
 ہیں۔ یہ فرق مختلف راستوں کی پہچان کا سبب بنتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: پہاڑوں میں بھی راستے بناتے

گئے ہیں سفید و سرخ رنگ کے مختلف رنگوں کے اور کبھی گہرے سیاہ رنگ کے (ومن الجبال جدد بیض و حمر مختلف الوانها و غرابیب سود) یہ رنگوں کا یہ اختلاف ایک طرف تو پہاڑوں کو خوبصورت بناتا ہے اور دوسری طرف راستوں معلوم کرنے اور پرچہ کو ہستانی سڑکوں میں گم نہ ہو جانے کا سبب ہے اور آخر میں ہر چیز میں خدا کی قدرت کی دلیل ہے۔

”جدد“ جمع ”جدہ“ (بروزن ”فدہ“) جاہد اور راستے کے معنی میں ہے۔

”بیض“ ”ابيض“ کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے ”سفید“ اور ”حمر“ ”احمر“ کی جمع ہے، اس کا معنی ہے ”سرخ“۔

”غرابیب“ ”غرابیب“ (بروزن ”کبریت“) کی جمع جگہ گہرے سیاہ رنگ کے معنی میں ہے۔ یہ جو سب لوگ کتے کو ”غراب“ کہتے ہیں، تو یہ بھی اسی بنا پر ہے۔ نیز لفظ ”سود“ ”اسود“ کی جمع ہے اور سیاہ ہی کے معنی میں ہے۔ ”غرابیب“ کے بعد یہ لفظ اسی معنی کی تاکید کے طور پر آیا ہے اور یہیں کو ہستانی راستوں کے گہرے سیاہ ہونے کے معنی میں ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ خود پہاڑ بھی خطا اور راستوں کی مانند ہیں کہ جو زمین کی سطح کے اوپر کھینچے گئے ہیں اور وہ دُور کے فاصلوں سے خصوصیت کے ساتھ مکمل طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ ایسے خطوط کہ جو بعض سفید رنگ کے ہیں، بعض سرخ رنگ کے اور بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں، یہ ایسے خطوط ہیں کہ جو پردردگار کے دست تقدیر نے زمین کے چہرے پر نقش کیے ہیں۔

بعد والی آیت میں انسانوں اور دوسرے جانداروں میں رنگوں کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ”انسانوں، جانداروں اور چوپایوں میں سے بھی مختلف رنگوں والے ہوتے ہیں“ (ومن الناس

بعض نے اس جملہ کو جلا استیثا فیہ سمجھا ہے (”من الجبال“ ”خبر مقدم“ اور ”جدد“ ”بیتائے مؤخر ہے“) اور بعض نے سمجھا ہے کہ یہ تقدیر میں اس طرح تھا،

”الم تر ان من الجبال جدد بیض و حمر مختلف الوانها۔“

جس طرح سے کہ بعض کتب گفت مثلاً ”انسان العرب“ اور بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ زیر بحث آیت میں ”سود“ ”غرابیب“ کا بدل ہے کیونکہ رنگوں کے بارے میں تاکید مقدم نہیں ہوتی، (اس بات پر توجہ رکھیے کہ ”غرابیب“ میں سیاہی کے لحاظ سے ”سود“ کی نسبت زیادہ تاکید ہے) لہذا انہوں نے کہا ہے کہ اصل میں ”سود غرابیب“ تھا۔

تفسیر المیزان، جلد ۱، ص ۲۲۔

والد وابت والالانعام مختلف الوانہ۔

ہاں! سب انسان باوجودیکہ ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں، مگر طور پر مختلف قبیلوں اور رنگوں کے حامل ہیں۔ بعض برف کی طرح سفید، بعض سیاہی کے مانند سیاہ، یہاں تک کہ ایک ہی نسل اور خاندان میں بھی رنگوں میں بہت اختلاف ہے، بلکہ اگر خود سے دیکھا جائے تو جڑواں بچے بھی رنگ اور روپ میں یکساں نہیں ہوتے۔ اگرچہ انہوں نے جسم میں تمام مراحل ایک دوسرے کے ساتھ طے کیے ہیں اور ابتداء سے ایک دوسرے کے ہم آغوش رہے ہیں، باوجودیکہ وہ ایک ماں اور ایک باپ سے ہیں، ایک ہی وقت میں ان کا لفظ قرار پاتا ہے اور انہوں نے ایک ہی قسم کی غذا کھانی ہوتی ہے۔ ظاہری چہرے سے قطع نظر، ان کے باطنی رنگ، ان کے اخلاق و عادات، ان کی صفات و خصوصیات اور ان کی استعداد اور ذوق بالکل متضاد اور مختلف ہیں یہاں تک کہ تمام ضروریات کے ساتھ مجموعی طور پر ایک منظم اکائی معرض وجود میں آتی ہے۔

جانداروں کی دنیا میں ہزار ہا قسم کے حشرات، پرندے، رینگنے والے، دریائی اور وحشی جنگلی جانور موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک اپنی خصوصیات اور عجائبات خلقت کے ساتھ آفریدگار کی قدرت، حکمت اور علم کی نشانی ہیں۔

جس وقت ہم کسی بڑے چڑیا گھر میں قدم رکھتے ہیں، تو باوجودیکہ وہاں پر عالم کے زندہ موجودات کا ہزاروں حصہ بھی موجود نہیں ہوتا پھر بھی ہم اس طرح سے ہمت و سکون اور دلگ ہو جاتے ہیں کہ بے لگیا ہو کر اس خدا کی ستائش کرنے لگتے ہیں کہ جس نے وجود کے درو دیوار پر یہ تمام نقش بنائے ہیں۔

تو یہ کہ ان نشانیوں کو بیان کرنے کے بعد آخر میں مجموعی طور پر فرمایا گیا ہے: ”ہاں! تعاملہ اسی طرح ہے“ (كذلك)۔

اور چونکہ ان عظیم آیات خلقت سے بہرہ اندوز ہونا سب سے زیادہ عقلمند اور دانشمند افراد کا کام ہے اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ”صرف علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں“ (انصایحشی اللہ

اس بارے میں کہ ”كذلك“ کا اعراب کے لحاظ سے کیا مقام ہے علماء نے مختلف آراء ذکر کی ہیں بعض اسے مستقل جملہ کہتے ہیں جو تقدیر میں اس طرح تھا ”الامر كذلك“ اور ہم نے تفسیر میں اسی معنی کو اختیار کیا ہے کیونکہ یہ زیادہ پرکشش اور زیادہ مناسب ہے لیکن بعض نے اسے قبل کے جملے سے متعلق قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس کا معنی اس طرح ہے: ”کما ان الشرات و جدد الجبال مختلف الوانها كذلك انما والد وابت والالانعام یہ احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ بعد والے جملے سے مربوط ہے اور اس کا معنی یوں ہے:

كذلك متختلف احوال العباد فی الخشیة۔

من عبادہ العلماء۔

جی ہاں! تمام بندوں میں سے علماء ہی ہیں کہ جو خشیت کے عالی مقام پر فائز ہوتے ہیں یعنی وہ پروردگار کے مقام کی عظمت کو سمجھتے ہوئے دل میں مسنونیت کا خوف رکھتے ہیں۔ خشیت کی یہ حالت انفس و افاق کی نشانیوں میں سیر، پروردگار کے علم و قدرت سے آگاہی اور مقصد آفرینش کو جاننے کا نتیجہ ہے۔

راغب، مفردات میں لکھا ہے کہ خشیت، اس خوف کے معنی میں ہے کہ جس کے ساتھ تعظیم کی آمیزش ہو اور زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے کہ جب خوف کا سرچشمہ کسی چیز سے علم و آگاہی ہو۔ اس بنا پر قرآن مجید میں یہ مقام علماء کے ساتھ مخصوص شمار ہوا ہے۔

ہم نے بار بار بیان کیا ہے کہ خدا کا خوف ان مسنونیتوں اور ذمہ داریوں کے خوف کے معنی میں ہے کہ جو انسان پر خدا کی طرف سے عائد ہوتی ہیں۔ اس بات کا خوف کہ کہیں اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو جائے۔ اس سے قطع نظر اصولی طور پر عظمت کا ادراک، وہ بھی ایسی عظمت کہ جو غیر محدود ہے پایاں ہے، انسان جیسے محدود وجود کے لیے خوف آفرین ہے (غور کیجئے گا)

اس جملے سے مضنیہ واضح نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ حقیقی علماء وہی ہیں کہ جو اپنی ذمہ داریوں کی جوابدہی کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اہل علم ہیں، اہل گفتار نہیں ہیں، چونکہ علم بغیر عمل کے عدم خشیت کی دلیل ہے اور ایسے افراد زیر بحث آیت میں علماء کے زمرے میں شمار نہیں ہوتے۔

یہی حقیقت ایک حدیث میں امام زین العابدین علی بن حسین سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

وما العلم باللہ والعمل الا لفان مؤتلفان فمن عرفت اللہ خافہ، وحتہ الخوف علی العمل بطاعة اللہ، وان ارباب العلم واتباعہم (ہو) الذین عرفوا اللہ فعملوا لہ، ورجعوا الیہ، وقد قال اللہ: انما یخشى اللہ من عبادہ العلماء۔

”علم و عمل دو مخلص دوست ہیں، جو شخص خدا کو پہچان لے وہ اس سے ڈرتا ہے اور یہی خوف اسے عمل اور فرمان خدا کی اطاعت پر آمادہ کرتا ہے۔ صاحبان علم اور ان کے پیروکار وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کو اچھی طرح پہچانا ہے اور اس کے لیے عمل کرتے ہیں جو اس کے ساتھ عشق رکھتے ہیں جیسا کہ خدا فرماتا ہے: انما یخشى اللہ من عبادہ العلماء۔“

تفسیر نور العباد جلد ۲، ص ۲۵۹، بحوالہ روزنہ الکافی۔

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ:

یعنی بالعلماء من صدق قوله فعله ومن لم یصدق قوله فعله فليس بعالم۔

”علماء سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جن کے اعمال ان کے اقوال کے ساتھ ہم آہنگ ہوں جس شخص کی گفتار و کردار ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہ ہو وہ عالم نہیں ہے۔“

ایک اور دوسری حدیث میں آیا ہے:

اعلمکمو باللہ اخوفکمو للہ۔

”تم میں سے زیادہ عالم وہ ہے جس کا خوف خدا سب سے زیادہ ہے۔“

مختصر یہ کہ قرآن کی منطق کے مطابق علماء وہ لوگ نہیں ہیں کہ جن کا دماغ اس کی ادراک اور اس کی آرا و افکار کا صندوقچہ ہو اور عالمی قوانین اور ملی فارمولوں سے بھرا ہو اور ان کی زبان ان مسائل کو بیان کرتی ہو اور ان کی زندگی مدارس، یونیورسٹیوں اور کتاب خانوں میں گزرتی ہو بلکہ علماء تو وہ صاحب نظر اور دانشمند ہیں کہ جن کے نور علم و دانش نے ان کے تمام وجود کو خدا کے نور اور ایمان و تقویٰ سے روشن کیا ہو اور اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں سختی سے احساس مسنونیت رکھتے ہوں اور سب سے زیادہ پابند ہوں۔

ہم نے سورہ قصص میں بھی پڑھا ہے کہ جس وقت مغرور و خود پسند قارون نے کہ جو ایک مقام علم کا بھی مدعی تھا اپنی ثروت کی نمائش کی تو دنیا پرست لوگوں نے جو اس کے ٹھاٹھ باٹھ سے بہت زیادہ متاثر تھے، یہ آرزو کی کہ اسے کاش! وہ بھی اس قسم کے اموال دنیا سے بہرہ ور ہوتے لیکن بنی اسرائیل کے علماء نے پکار کر ان سے کہا: تم پر دوائے ہو! خدائی اجر و ثواب تو ان لوگوں کے لیے ہے کہ جو ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے اور وہ بہتر ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جو صرف صابر اور صاحب استقامت لوگوں کیلئے ہے۔“

وقال الذین اوتوا العلم ویکلم اللہ خیر لمن امن وعمل صالحاً ولا یلقاها الا الصابرون (قصص۔)

آیت کے آخر میں سابقہ بیان پر ایک مختصر دلیل کے عنوان سے فرمایا گیا ہے: ”خدا عزیز و مغفور ہے۔“

(ان اللہ عزیز مغفور)۔

اس کی بے پایاں عزت و قدرت علماء کے خوف و خشیت کا سرچشمہ ہے اور اس کی ”مغفوریت“ کہ جو اس کی بے انتہا رحمت کی نشانی ہے ان کی رجاء و امید کا سبب ہے اور اس طرح سے یہ دو مقدس نام خدا کے بندوں کو خوف و رجاء کے درمیان محفوظ رکھتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ تکامل و ارتقا کی طرف مسلسل حرکت ان دو صفات سے مقصد ہوتے بغیر ممکن نہیں ہے۔

لے و صلحہ مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

سزا و علانیۃ یرجون تجارتہ لن تبور ینہ

یہ بات واضح ہے کہ یہاں "تلاوت" "سرسری اور غور و فکر سے خالی قرأت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس سے ایسا پڑھنا مراد ہے کہ جو غور و فکر کا سرچشمہ ہو، وہ فکر کہ جو عمل صالح کا سرچشمہ بنے ایسا عمل کہ جو ایک طرف تو انسان کا خدا سے رشتہ جوڑ دے جس کا مظہر نماز ہے اور دوسری طرف اسے مخلوق کے ساتھ مربوط کر دے کہ جس کا مظہر انفاق ہے۔

خرچ بھی تمام چیزوں میں سے کہ جو خدا نے انسان کو دی ہیں اپنے علم میں سے اپنے مال و ثروت اور اثر و رسوخ میں سے، اپنی قومی فکر و نظر میں سے اور اپنے اخلاق و تجربہ بات میں سے تھلا صد یہ کہ تمام خدا داد نعمت میں سے۔

یہ انفاق کبھی تو پوشیدہ طریقے سے ہوتا ہے تاکہ مکمل اخلاص کی نشانی بنے (سوا) اور کبھی آشکارا اور علی الاعلان تاکہ دوسروں کے لیے تشویق کا سبب ہو اور شکار الہی کی تعظیم بھی ہو (علانیۃ)۔ ہاں! وہ علم کہ جو اس قسم کا اثر رکھتا ہو وہ رجا و امید کا سبب بنتا ہے۔

اس آیت میں اور گزشتہ آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ پسے علماء ان صفات کے حامل ہوتے ہیں۔

روحانی لحاظ سے ان کا دل حکمت خدا کے احساس سے خوف و خشیت سے معمور ہوتا ہے۔

گفتگو کے لحاظ سے ان کی زبان آیات خدا کی تلاوت میں مشغول ہوتی ہے۔

روحانی اور جسمانی عمل کے لحاظ سے نماز پڑھتے ہیں اور اسے بطور عبادت بجالاتے ہیں۔

دولت سے تعلق عمل کے لحاظ سے جو کچھ ان کے پاس ہے اسے آشکارا اور پنهان انفاق کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مقصد کے لحاظ سے ان کا افاق فکر اتنا بلند و بالا ہے کہ ان کا دل زود گزر مادی دنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے، ان کی نظر صرف سود مند خدائی تجارت پر ہوتی ہے کہ جس کے دامن کی طرف فنا کا ہاتھ دراز نہیں ہوتا۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "تبور" "بوار" کے مادہ سے سخت گھاٹے کے معنی میں ہے اور چونکہ شدید گھاٹا باعث تباہی ہوتا ہے لہذا "بوار" ہلاکت کے معنی میں آیا ہے اس طرح "بوار" سے خالی تجارت وہ ہے کہ جو نہ گھاٹا ہو اور نہ ہی تباہی۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

لے توجہ رکھے کہ "یرجون" "ان" کی خبر ہے۔

۲۹) اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنفَقُوْا

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلٰنِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۝

۳۰) لِيُوْفِيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهِ ۗ

اِنَّهٗ عَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝

ترجمہ

۲۹) جو لوگ کتاب خدا کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو

رزق ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے پنهان و آشکارا انفاق کرتے ہیں

وہ (ایسی نفع بخش) تجارت کی امید رکھتے ہیں کہ جس میں گھاٹا نہیں ہے۔

۳۰) (وہ یہ اعمال صالح اس لیے انجام دیتے ہیں) تاکہ خدا انہیں مکمل اجر

اور صلہ دے اور اپنے فضل کا ان پر اضافہ کرے کہ وہ بخشے والا اور قدردان ہے۔

تفسیر

پروردگار کے ساتھ نفع بخش تجارت

گزشتہ آیات میں علماء کے خوف و خشیت کے مقام کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ زیر بحث آیات میں ان کے مقام "امید و رجا" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ دو چیزوں کے ساتھ ہی انسان آسمان سعادت کی بلندی پر پرواز کر سکتا ہے اور نکال و ارتقا کی راہ طے کر سکتا ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: "جو لوگ کتاب الہی کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے پنهان و آشکارا خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں کہ جس میں گھاٹا نہیں ہے" (ان الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

ایک شخص نے رسول خدا کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے موت کیوں پسند نہیں؟
 آپ نے فرمایا: کیا تم اسے پاس کچھ مال و دولت ہے؟
 اس نے عرض کی: ہاں!
 فرمایا: اسے اپنے سے پہلے آگے بھیج دے۔
 عرض کیا: میں ایسا نہیں کر سکتا۔
 فرمایا:

ان قلب الرجل مع ماله ان قدمه احب ان يلحق به وان اخره احب ان يتاخر معه۔

”انسان کا دل اس کے مال کے ساتھ ہوتا ہے، اگر وہ اسے اپنے آگے بھیج دے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ جا لے اور اگر اسے اپنے پاس روک رکھے تو چاہتا ہے کہ وہ بھی اس کے ہمراہ رہے۔“

یہ حدیث حقیقت میں زیر بحث آیت کی روح کو منعکس کرتی ہے، کیونکہ ارشاد ہوتا ہے: کہ وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور راہِ خدا میں انفاق کرتے ہیں وہ دابرِ آخرت کی امید اور اس سے لگاؤ رکھتے ہیں چونکہ انہوں نے نیکیوں کو اپنے سے پہلے بھیج دیا ہے لہذا وہ اس کے ساتھ جانے کی آرزو کرتے ہیں۔

آخری زیر بحث آیت سچے مومنین کے مقصد کو اس طرح بیان کرتی ہے: ”وہ یہ اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں تاکہ خدا انہیں مکمل اجر اور صلہ دے اور اپنے فضل سے انہیں بھی کرے کہ وہ بخشے والا اور شکور ہے“ (یوسفیہ جو ویزید ہو من فضلہ انہ غفور شکور)۔

یہ جملہ حقیقت میں ان کے انتہائی خلوص کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے نیک اعمال میں خدائی اثر و ثواب کے سوا اور کسی چیز پر نظر نہیں رکھتے جو کچھ چاہتے ہیں اُس سے چاہتے ہیں اور لیا، دکھا دے اور لوگوں کی تعین و تعریف کے لیے قدم نہیں اٹھاتے کیونکہ اعمالِ صالح میں اہم ترین مسئلہ وہی نیتِ خالص ہے۔

جمع البیان، جلد ۱ صفحہ ۱۰۰ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

”لیوفیہم“ یا ”یتلون کتاب اللہ“ سے متعلق ہے اس کا منہم یہ ہوگا کہ ان کا مقصد تلاوت، نماز اور انفاق سے خدا کا اجر و ثواب حاصل کرنا ہے اور یا یہ ”لن تبور“ سے متعلق ہے اور اس کا منہم یہ ہوگا کہ ان کی تجارت بھی یہی گھانے کی طرف نہیں جائے گی کیونکہ ان کا اجر و صلہ دینے والا خدا ہے۔

”اجور“۔ ”اجر“ کی جمع ہے اور ”مزدوری“ کے معنی میں ہے۔ حقیقت میں یہ تعبیر پروردگار کی طرف سے ایک لطف کی نظر ہے کہ زیادہ بندوں کو اعمالِ صالح کے بدلے کا حقدار بھتا ہے۔ حالانکہ بندوں کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی کی طرف سے ہے، یہاں تک کہ اعمالِ صالح انجام دینے کی طاقت بھی اسی کی عطا کردہ ہے۔

اس تعبیر سے بھی زیادہ محبت آمیز و ویزید ہو من فضلہ کا جملہ ہے کہ جس سے انہیں توفیق اور خوشخبری دی گئی ہے کہ عام اجر کے علاوہ کہ جو خود بھی عمل سے سینکڑوں گنا اور کبھی ہزاروں گنا ہے، اپنے فضل سے مزید اس میں اضافہ کرتا ہے اور وہ نعمتیں کہ جو جنتی کے دہم و گمان میں بھی نہیں آتیں اور اس جہان میں کوئی بھی شخص ان کا تصور نہیں کر سکتا اپنے وسیع فضل سے انہیں بخشنے گا۔

ایک حدیث میں ابن مسعود سے منقول ہے کہ پیغمبر اکرم نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا:
 هو الشفاعة لمن وجبت له النار ممن صنع اليه معروفا في الدنيا۔

”اُس سے مراد مرتبہ و مقام شفاعت ہے کہ جو انہیں حاصل ہوگا تاکہ وہ ان لوگوں کی شفاعت کریں کہ جنہوں نے اُن سے دنیا میں کوئی نیکی کی ہے لیکن اپنے اعمال کی وجہ سے مستحق عذاب ہو گئے ہیں۔“

اس طرح سے نہ صرف وہ خود اہل نجات ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی پروردگار کے فضل سے نجات کا باعث ہیں۔

بعض مفسرین نے ”ویزید ہو من فضلہ“ کو مقام ”شہود“ کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو قیامت میں مومنین کو حاصل ہوگا یعنی وہ پروردگار کے جمال و جلال کی طرف دیکھیں گے اور اس منظر سے بہت لذت حاصل کریں گے۔

لیکن ظاہر مذکورہ جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں مذکورہ حدیث کا مضمون بھی شامل ہے اور دوسری نعمت بھی شامل ہیں۔

”انہ غفور شکور“ کا جملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پہلا لطف پروردگار تو اُن کے حق میں وہی گناہوں اور لغزشوں کی بخشش ہے کہ جو کبھی بھی ان سے سرزد ہوتے رہے کیونکہ انسان کی زیادہ تر پریشانی اسی وجہ سے ہوگی۔

جب وہ اس لحاظ سے آسودہ خاطر ہو جائیں گے تو اشد انہیں ان کے اعمال کا شکر یہ ادا کرے گا اور انہیں افضل ترین جزا دے گا۔

جمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

تفسیر مجمع البیان میں یہاں عربوں کی ایک جاذب نظر ضرب المثل نقل ہوئی ہے کہ وہ کہتے ہیں،

اشکر من بروقه

”فلاں شخص درخت بروقہ سے بھی زیادہ شکر گزار ہے یہ“

ادریہ ایک چھوٹے سے درخت کی طرف اشارہ ہے کہ جو سر زمین عربستان میں ہوتا تھا اور عربوں کا عقیدہ تھا کہ جب اس پر بادل کا سایہ ہوتا ہے تو یہ فوراً سرسبز ہو جاتا ہے اور بادل برسے بغیر اس کے پتے نکل آتے ہیں اور یہ انتہائی شکرگزاری کے لیے ایک ضرب المثل ہے کہ جو معمولی سی خدمت کے بدلے بڑی سے بڑی جزا اور اجر دینے کے موقع پر بولی جاتی ہے یہ۔ البتہ اس قسم کے درخت کا خالق و مالک اس سے بھی زیادہ قدر دانی کرنے والا اور بخشش کرنے والا ہے۔

اس تجارت کی عجیب شرائط

پُر لطف بات یہ ہے کہ بہت سی آیات قرآنی میں اس جہان کو ایسے تجارت گھر سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس کے تاجر انسان ہیں اور خریدار پروردگار عظیم اور مال و متاع عمل صالح میں اور قیمت بہشت اور خدا کی رحمت و رضا ہے یہ۔ اگر ہم صحیح طور پر غور و فکر کریں تو خداوند کریم کے ساتھ یہ عجیب و غریب تجارت بے مثال ہے کیونکہ یہ ایسے امتیازات کی حامل ہے جو کسی بھی تجارت میں موجود نہیں ہیں۔

۱۔ تمام سرمایہ اس نے خود ہی پیچنے والے کو دیا ہے اس کے بعد خود ہی خریدار بن جاتا ہے۔

۲۔ وہ خریدار ہے، حالانکہ اُسے ان اعمال کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر چیز کے خزانے اسی کے پاس ہیں۔

۳۔ وہ متاعِ قلیل، کو بہت زیادہ قیمت پر خریدتا ہے؛

یا من یقبل الیسیر و یعفو عن الکثیر

”اُسے وہ خدا کہ جو تھوڑے سے عمل کو قبول کر لیتا ہے اور بہت سے گنہگاروں کو بخش دیتا ہے“

۱۔ ”بروقہ“ بروزن، ”خمرہ“۔

۲۔ مجمع البیان، جلد ۱، ص ۲۲۶۔

۳۔ ص ۱، ۱، توبہ، ۱۱۱، بقرہ، ۲۰۴، نساء، ۴۲۔

۴۔ یہاں تک کہ وہ معمولی قسم کے مال و متاع بھی خرید لیتا ہے؛

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یسره۔

”جو ذرہ برابر بھی عمل کرتا ہے وہ اسے دیکھے گا“

۵۔ بھی وہ سات سو گنا اور بھی اس سے بھی کہیں زیادہ قیمت دیتا ہے۔ (بقرہ، ۲۶۱)

۶۔ اس عظیم قیمت کے علاوہ اپنے فضل و رحمت سے اتنا اضافہ کرے گا کہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ ”و میزید ہون من فضلہ“ (زیر بحث آیت)

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک آزاد اور عاقل انسان اس قسم کی تجارت سے آنکھ بند کر لے اور اس کے غیر کی طرف رخ کرے اور اس سے بھی بدتر بات یہ کہ اپنی ہمتی اور وجود کے مال و متاع کو بے قیمت بیچ ڈالے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وانہ لیس لا نفسکونن الا الجنة فلا تبیعوا الالبہا۔

”جان لو کہ تمہارے سرمایہ ہستی کی قیمت جنت کے علاوہ کچھ نہیں اسے جنت کے علاوہ کسی اور چیز کے بدلے نہ بیچو“

۳۱) وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ إِنَّ اللَّهَ بِعِبَادِهِ لَخَبِيرٌ بَصِيرٌ ○

۳۲) ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ
ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ
يَأْذِنُ اللَّهُ ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ○

ترجمہ

۳۱) ہم نے کتاب میں سے جو کچھ تجھے وحی کیا ہے وہ حق ہے اور اس
سے پہلے والی کتب کے ساتھ ہم آہنگ ہے، خدا اپنے بندوں سے باخبر
اور بینا ہے۔

۳۲) پھر ہم نے یہ کتاب آسمانی اپنے برگزیدہ بندوں میں سے ایک گروہ کو
میراث میں دے دی (لیکن) ان میں سے ایک گروہ نے اپنے اوپر ظلم کیا اور
ان میں سے کچھ میانہ رو تھے اور ایک جماعت اذنب خدا سے نیکیوں میں سب سے
(سبقت) لے گئی اور یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔

تفسیر

میراث انبیاء کے حقیقی وارث

گزشتہ آیات میں پاک دل مومنین کے بارے میں گفتگو تھی کہ جو کتاب اللہ کی آیات پڑھتے ہیں
اور اس پر عمل کرتے ہیں، زیر بحث آیات میں اس آسمانی کتاب اور اس کی صداقت کے دلائل اور
اسی طرح اس کتاب کے حقیقی حاملین کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے گزشتہ آیات میں

توحید کے بارے میں بحث تھی اور یہاں نبوت کے متعلق گفتگو سے سلسلہ کلام کی تکمیل کی گئی ہے ارشاد
ہوتا ہے: ہم نے کتاب میں سے جو کچھ تجھے وحی کیا ہے وہ حق ہے اور جو کچھ گزشتہ کتب میں آیا ہے
یہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔ خدا اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ اور بینا ہے (والذی اوحینا الیک
من الکتاب هو الحق مصدقاً لما بین یدیہ ان اللہ بعبادہ لخبیر بصیر)۔

حق کا معنی ہے "ایسی چیز جو واقعیت سے ہم آہنگ اور اس کے مطابق ہو یہ تعبیر اس مطلب
کو ثابت کرنے کے لیے ایک دلیل ہے کہ یہ آسمانی کتاب پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔
کیونکہ ہم اس کے مضامین میں جس قدر بھی غور و فکر کرتے ہیں اسے اتنا ہی حقائق کے ساتھ ہم آہنگ
پاتے ہیں۔

اس میں کوئی تناقض ہے نہ جھوٹ اور نہ کوئی بیودہ پن۔ اس کے اعتقادات و معارف عقل
منطق سے ہم آہنگ ہیں، اس کی تاریخ افسانوں اور من گھڑت قصوں سے خالی ہے اور اس کے
قوانین انسانی احتیاجات کے موافق ہیں۔ اس کی حقانیت اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ یہ
خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

اس مقام پر تو قرآن کے مقام اور حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے لفظ "حق" سے استفادہ کیا گیا
ہے جبکہ قرآن کی دوسری آیات میں لفظ "نور"۔ "برہان"۔ "فرقان"۔ "ذکر"۔ "موعظہ" اور "ہدیٰ"
سے استفادہ کیا گیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک قرآن کی مختلف برکتوں اور پہلوؤں میں سے کسی ایک کی
طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور "حق" لفظ ان سب کا جامع ہے۔

راغب مفردات میں کتا ہے کہ "حق" دراصل مطابقت اور موافقت کے معنی میں ہے اور یہ
لفظ کئی معانی کے لیے بولا جاتا ہے:

پہلا وہ ذات کہ جو کسی چیز کو حکمت کی اساس پر ایجاد کرے۔ اسی بنا پر خدا کو حق کہا جاتا ہے
فذلک کو اللہ ربکوا الحق (یونس۔ ۳۲)۔

دوسرا وہ چیز کہ جو حکمت کی بنیاد پر ایجاد ہوئی ہے اسے بھی حق کہا جاتا ہے اور چونکہ عالم ہستی
خدا کا فعل ہے اور حکمت کے موافق ہے لہذا وہ سب کا سب حق ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ما خلق اللہ ذالک الا بالحق۔

"خدا نے ان موجودات (سورج اور چاند اور ان کی منازل) کو حق کے سوا پیدا

نہیں کیا" (یونس۔ ۵)

تیسرا ان عقائد کو کہ جو حقیقت کے مطابق ہیں حق کہا جاتا ہے:

فہدی اللہ الذین امنوا لما اختلفوا فیہ من الحق۔

”خدا نے مومنین کی اس بات کی طرف توجہ سے اختلاف کیا

تھا ہدایت فرمائی“ (بقرہ - ۲۱۳)

چوتھا اُن باتوں اور افعال کو بھی حق کہا جاتا ہے جو ذمہ داری کے مطابق اور وقت مقررہ پر انجام پاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ تیری بات حق ہے اور تیرا کردار حق ہے یہ

اس بنا پر قرآن مجید کا حق ہونا اس لحاظ سے بھی ہے کہ یہ مصلحت اور حقیقت کے مطابق گفتگو کرتا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس میں موجود عقائد و معارف حقیقت سے ہم آہنگ ہیں اور یہ خدا کا کام بھی ہے کہ جسے اس نے حکمت کی بنیاد پر ایجاد کیا ہے۔ خود خداوند عالم کہ جو مین حق ہے کی اس میں تعجب ہے اور محض اس چیز کی تصدیق کرتی ہے کہ جو حق اور واقعیت ہے۔

”مصدقاً لما بین یدہ“ کا جملہ اس کتاب آسمانی کی صداقت کی دوسری دلیل ہے کیونکہ وہ ایسی نشانیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو گزشتہ کتب میں اس کے بارے میں اور اس کے لانے والے کے بارے میں آئی ہیں (اس سلسلے میں ہم سورہ بقرہ کی آیہ ۴۱ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں)۔

”ان اللہ بعبادہ لخبیر بصیر“ کا جملہ قرآن کی حقانیت کی علت ہے اور حقانیت اور انسانی تقاضوں کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کو بیان کرتا ہے کیونکہ یہ اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ جو اپنے بندوں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے اور ان کی احتیاجات کے بارے میں بصیر و بینا ہے۔

”خبیر“ اور ”بصیر“ کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس بارے میں عرض ہے کہ ”خبیر“ تو انسان کے باطن، اس کے عقائد، نیت اور روح کے معنی میں ہے اور ”بصیر“ اس کے ظواہر اور رونما ہونے والے جسمانی امور کے بارے میں بینا ہونے کے معنی میں ہے۔

بعض مفسرین ”خبیر“ کو انسان کی اصل خلقت کی طرف اور ”بصیر“ کو اس کے اعمال و افعال کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اگرچہ آیت سے دونوں معانی مراد ہونا بھی بعید نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں اس عظیم آسمانی کتاب کے حاملین کا ذکر ہے یعنی وہ لوگ کہ جنہوں نے پیغمبر اکرم

ﷺ سے مژدات راغب ادة ”حق“۔

جلد اول صفحہ ۱۴ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

فرازاوی تفسیر کبیر زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

روح البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کے پاکیزہ دل پر قرآن کے نزول کے بعد اس مثل فردزاں کو ہر زلنہ میں روشن رکھا اور اس کی پاسداری کی۔ ارشاد ہوتا ہے: ”پھر ہم نے یہ آسمانی کتاب اپنے برگزیدہ بندوں میں سے ایک گروہ کو میراث میں دے دی“ (شعور شنا الكتاب الذین اصطفینا من عبادنا)۔

واضح رہے کہ یہاں ”کتاب“ سے مراد وہی چیز ہے جو گزشتہ آیت میں بیان ہوئی ہے (یعنی قرآن مجید) اور اصطلاح کے مطابق اس میں العت اور لام عہد کا ہے اور یہ جو بعض علماء نے اسے تمام کتب آسمانی پر اشارہ سمجھا ہے اور اسے جنس کے لیے آنے والا العت لام سمجھا ہے بہت ہی بعید نظر آتا ہے اور گزشتہ آیات سے مناسبت نہیں رکھتا۔

قرآن مجید میں یہاں اور اس کے مشابہ دوسرے مواقع پر ”ارث“ کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ ”ارث“ ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی زحمت کے بغیر ہاتھ آئے اور خدا نے بھی یہ بہت ہی عظیم کتاب اسی طرح مسلمانوں کو عطا کر دی ہے۔

اس مقام پر اہل بیٹ کے حوالے سے بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں اُن سب میں خدا کے برگزیدہ بندوں سے مراد ائمہ مہمومین لیے گئے ہیں۔

یہ روایات جیسا کہ ہم نے بار بار بیان کیا ہے، واضح اور درجہ اول کے مصداق بیان کرتی ہیں۔ یہ بات اس میں مانع نہیں کہ امت کے علماء، صالحین اور شہداء کہ جنہوں نے اس کتاب آسمانی کی حفاظت و پاسداری اور اس کے فرامین کو دوام بخشنے کے لیے کوشش کی ہے ”الذین اصطفینا من عبادنا“ (خدا کے برگزیدہ بندے) کے مفہوم میں داخل ہوں۔

اس کے بعد اس سلسلے میں لوگوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان میں سے کسی گروہ نے اپنے اوپر ظلم کیا، کسی نے درمیانی راہ اختیار کی اور کسی گروہ نے حکم خدا سے نیکیوں میں دوسروں سے سبق حاصل کر لی اور یہ بہت بڑی فضیلت ہے (فمنہم ظالمون لفسہ و منہم مقتصد و منہم سابق بالخیرات باذن اللہ ذالک هو الفضل الکبیر)۔

آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ تینوں گروہ ”خدا کے برگزیدہ بندوں“ میں سے ہیں کہ جو وارث و حامل کتاب الہی ہیں۔

زیادہ واضح تعبیر میں خدا نے اس کتاب آسمانی کی پاسداری اور حفاظت اپنے پیغمبر کے بعد اس امت کے ذمہ رکھی ہے۔ وہ امت کہ جو خدا کی برگزیدہ ہے لیکن اس امت کے درمیان مختلف طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ان میں سے بعض اس کتاب کی پاسداری اور اس پر عمل کرنے کی عظیم ذمہ داری

میں کوتاہی کرتے ہیں اور انہوں نے حقیقت میں اپنے اوپر ظلم کیا ہے، یہ "ظالم لنفسہ کے مصداق ہیں۔ دوسرے گروہ نے کافی حد تک فریادیں کیں اور کہا ہے کہ ہم نے اپنی کوتاہی کی کوشش کی ہے اگرچہ ان سے کچھ غرضیں اور خطائیں بھی ہوئی ہیں یہ مقصد کے مصداق ہیں۔ ایک ممتاز گروہ وہ ہے جس نے اپنی بھاری ذمہ داری کو احسن طریقے سے انجام دیا ہے اور مقابلہ کے اس عظیم میدان میں یہ لوگ سب سے بازی لے گئے ہیں۔ یہ ان سب کے پیشوا ہیں جنہیں آیت میں "سابق بالخیرات باذن اللہ" کہا گیا ہے۔

مگر سب سے کہ یہاں یہ کہا جائے کہ "اصطفینا" اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام گروہ خدا کے برگزیدہ ہیں، لیکن یہاں ایک ظالم گروہ کا ذکر اس امر کے منافی ہے۔

ہم جو اب میں کہیں گے کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے بنی اسرائیل کے بارے میں سورہ مومن کی آیہ ۲۷ میں ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ولقد اتینا موسیٰ الہدیٰ واورشنا بنی اسرائیل الکتاب۔
 "ہم نے موسیٰ کو ہدایت (آسمانی کتاب) دی اور یہی آسمانی کتاب ہم نے بنی اسرائیل کو میراث کے طور پر عطا کی۔"

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ سارے بنی اسرائیل نے اپنی اس عظیم میراث کے بارے میں اپنا فریضہ انجام نہیں دیا۔

اسی طرح سورہ آل عمران کی آیہ ۱۱۰ میں بھی ہے کہ:

کنتم خیر امتہ اخرجت للناس۔
 "تم مسلمان بہترین امت ہو کہ جنہوں نے انسانوں کے فائدہ کے لیے مصلحتیات میں قدم رکھا۔"

اسی طرح سورہ جاثیہ کی آیہ ۱۶ میں بنی اسرائیل کے بارے میں ہے:

وفضلنا ہم علی العالمین۔

"ہم نے انہیں عالمین پر فضیلت دی۔"

اسی طرح سورہ مدید کی آیہ ۲۶ میں ہے کہ:

ولقد ارسلنا نوحًا و ابراہیم و جعلنا فی ذریعتہما النبوة و الکتاب
 فممنہم مہتد و کثیر منہم فاسقون۔

"ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی ان میں سے بعض تو ہدایت یافتہ ہیں اور بہت سے فاسق اور گنہگار ہیں۔"

مختصر یہ کہ اس قسم کی تعبیرات کا مقصد امت کا ہر فرد نہیں ہے بلکہ پوری امت مراد ہے، اگرچہ اس

میں مختلف طرح کے گروہ اور لوگ پائے جاتے ہیں۔

بہت سی روایات میں کہ جو اہل بیت کے طرق سے وارد ہوئی ہیں "سابق بالخیرات" سے امام معصوم مراد لیا ہے اور "ظالم لنفسہ" سے وہ افراد کہ جو امام کی معرفت اور شناخت نہیں رکھتے اور مقصد سے امام کے عارف پر دکار مراد لیے گئے ہیں۔

یہ تفاسیر اس بات کی واضح گواہ ہیں کہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ وارثان کتاب الہی میں یہ تینوں گروہ شامل ہیں جیسا کہ ہم نے تفسیر آیت میں کہا ہے۔

شاید اس بات کی یاد دہانی کی ضرورت نہیں کہ مذکورہ بالا روایات کی تفسیر واضح مصداق کا بیان ہے یعنی امام معصوم "سابق بالخیرات" کی صفت اول میں ہے اور علماء اور دین الہی کے محافظین دوسری صفوں میں ہیں۔

وہ تفسیر کہ جو ان روایات میں "ظالم" و "مقصد" کے بارے میں بیان کی گئی ہے وہ بھی مصداق بیان کرتی ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ روایات میں آیت کے مفہوم میں علماء کی بالکل نفی کی گئی ہے تو ایسا درحقیقت ان صفوں کے آگے آگے امام معصوم کے وجود کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ گزشتہ اور موجودہ مفسرین میں سے بعض نے ان تینوں گروہوں کے بارے میں دوسرے بہت سے احتمال بھی ذکر کیے ہیں کہ جو سارے کے سارے اس کے مصداق کا ہی بیان ہیں۔

بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ تقسیم "عبادنا" کے ساتھ مربوط ہے نہ کہ برگزیدہ افراد کے ساتھ۔ اس بنا پر یہ تینوں گروہ وارثان کتاب الہی میں شامل نہیں ہیں بلکہ وہ تمام بندگان خدا میں قوشاں ہیں لیکن برگزیدہ اور چنے ہوئے صرف تیسرے گروہ کے امتداد میں سابق بالخیرات ہوں گے۔ لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے۔ کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ گروہ ان لوگوں کا جن کا آیت میں ذکر کیا جا رہا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ آیت تمام عباد کے بارے میں نہیں بلکہ برگزیدہ لوگوں کے متعلق گفتگو ہے۔ اس سے قطع نظر "عباد" کی "نا" کی طرف اضافت ایک طرح کی مدح کو بیان کرتی ہے کہ جو دوسری تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

تفسیر فراتین جلد ۳ ص ۳۳ کے بعد تاسی طرح اصول کافی جلد ۱ باب ان من اصطفاه اللہ من عبادہ

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ "سابق بالخیرات" اصحاب پیغمبر ہیں اور "مقصد" تابعین کا طبقہ ہے اور "ظالم لنفسہ" دوسرے افراد ہیں۔ بعض دوسروں نے "سابق" سے وہ لوگ مراد لیے ہیں جن کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور "مقصد" سے وہ لوگ کہ جن کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہے اور ظالم وہ کہ جن کا ظاہر ان کے باطن سے بہتر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "سابقون" صحابہ ہیں اور "مقصدون" ان کے تابعین ہیں اور "ظالمون" متناقض ہیں۔

بعض نے اس آیت کو ان تینوں گروہوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جن کا ذکر سورہ واقعہ کی آیت ۷ تا ۱۱ میں آیا ہے: (باقی اگلے صفحہ پر)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے ظالمین کے بارے میں پھر درمیانے افراد کے بارے میں اور سب سے آخر میں سابق بالخیرات کے بارے میں بات کیوں کی گئی ہے جبکہ کئی ایک جہات سے الٹی ترتیب بہتر نظر آتی ہے۔

بعض بزرگ مفسرین نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس کا مقصد سلسلہ کمال میں لوگوں کے مقامات کی ترتیب بیان کرنا ہے کیونکہ پہلا مرحلہ صحیان و مخلصت کا ہے اس کے بعد توبہ و انابت کا مقام ہے اور انجام کار خدا کی طرف توجہ اور اس کے قرب کی منزل ہے۔ جس وقت انسان سے گناہ سرزد ہوتا ہے تو وہ "ظالم" ہے اور جس وقت وہ مقام توبہ میں آتا ہے تو "مقتصد" ہے اور جس وقت اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے اور خدا کی راہ میں اس کی مساعی بہت بڑھ جاتی ہیں تو وہ اس کے مقام قرب میں پہنچ جاتا ہے اور "سابق بالخیرات" میں شمار ہونے لگتا ہے۔

بعض نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ یہ ترتیب ان تینوں گروہوں کے افراد کی زیادتی اور کمی کے لحاظ سے ہے۔ ظالمین اکثریت میں ہوتے ہیں اور مقتصدین بعد والے مرحلہ میں اور سابقین بالخیرات کہ چھٹوں اور پاک لوگ ہیں سب سے کم ہوتے ہیں اگرچہ کیفیت کے لحاظ سے سب سے بلند مرتبہ ہیں۔ یہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام صادق سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: ظالم کو اس سبب سے مقدم رکھا ہے تاکہ وہ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو جائے اور سابقین بالخیرات کو اس لیے مؤخر کیا ہے تاکہ وہ اپنے عمل پر مغرور نہ ہوں۔ لہذا ممکن ہے کہ تینوں معانی مراد ہوں۔

آخری بات اس آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ "ذالک هو الفضل الکبیر" (یہ بہت بڑی فضیلت ہے) کے جملے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ اس میں مشار الیہ کیا ہے؟ بعض نے کہا ہے

سابقہ صوابہ حاشیہ: وکنتم ازواجاً ثلاثہ فاصحاب المیعنة ما اصحاب المیعنة واصحاب المشئمة ما اصحاب المشئمة والسابقون السابقون اولئک المقربون۔

ایک حدیث میں "سابق بالخیرات" سے اتر بزرگوار حضرت علی، امام حسن اور امام حسین اور شیدان آل محمد مراد لیا گیا ہے اور مقتصد سے متین مجاہد ہیں اور "ظالم" سے وہ کہ جن کے نیک اعمال غیر صالح اعمال کے ساتھ ملے جلتے ہیں۔

یہ تمام تفسیریں بیان مصداق کے عنوان سے قابل قبول ہیں سوائے پہلی تفسیر کے کہ اس کا کوئی درست منہم نہیں ہے۔

طبری "معجم البیان" ، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تفسیر ترقی حلال القرآن زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تفسیر ابوالخضر وازی، جلد ۹، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کہ اس سے مراد کتاب الہی کی میراث ہی ہے اور بعض نے اسے اس توفیق کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو کچھ سابقین بالخیرات کے شامل حال ہوتی ہے اور وہ اذن خدا سے اس راہ کو ملے کرتے ہیں لیکن پہلا معنی ظاہر آیت کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

کتاب الہی کے پاسدار کون ہیں؟

قرآن مجید کی گواہی کے مطابق خداوند تعالیٰ نے امت اسلامیہ کو اتنی عظیم نعمتیں عطا کی ہیں کہ جن میں سے زیادہ اہم خدا کی عظیم میراث قرآن مجید ہی ہے۔ اس نے امت مسلمہ کو ساری امتوں پر برتری عطا کی اور اُسے یہ نعمت دی لیکن انہیں اپنے نطفہ خاص سے نوازا ہے تو ان پر اسی نسبت سے ذمہ داری بھی عائد کی ہے۔

وہ صرف اسی صورت میں اس میراث عظیم کی پاسداری کا حق ادا کر سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو "سابق بالخیرات" کی صفت میں داخل کرنے کے قابل بنالیں یعنی تمام امتوں سے نیکیوں کی انجام دہی میں آگے بڑھ جائیں علم و دانش کے حصول میں سبقت حاصل کریں اور تقویٰ و پرہیزگاری میں عبادت و خدمت خلق میں جہاد و کوشش میں، نظم و ضبط اور حساب و کتاب میں اور ایثار و فداکاری میں سب سے بڑھ کر ہیں اس صورت کے علاوہ وہ اس کا حق ادا نہ کر سکیں گے۔

خصوصاً "سابق بالخیرات" کی تعبیر اتنا وسیع اور کشادہ منہم رکھتی ہے کہ جو زندگی کے تمام مثبت پہلوؤں میں اور نیک اعمال میں تقدم حاصل کرنے کو اپنے دامن میں سیٹھے ہوئے ہے۔

ہاں! اس قسم کی میراث کے حامل ایسے لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔

یہاں تک کہ وہ لوگ جو اس عظیم آسمانی عنایت کی طرف پشت کر لیتے ہیں اور اس کی حرمت کا خیال نہیں رکھتے، ظالم نفسہ کا مصداق ہیں اور خود اپنے ہی اوپر ظلم کرتے ہیں کیونکہ اس کے مطالب ان کی نجات بخش بختی اور کامیابی کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ وہ آدمی کہ جو کسی شفا بخش نسخہ کو استعمال نہیں کرتا اس نے اپنے درد اور تکلیف کے باقی رہنے میں خود تکلیف کی ہے اور جو شخص کسی تاریک راستے کو ملے کرنے کے موقع پر اپنے روشن چراغ کو توڑ دیتا ہے وہ خود کو بے راہی اور ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ خدا سب سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔

اس کے باوجود اس گنہگار گروہ کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ بھی زیر بحث آیت کے مضمون کے مطابق "پروردگار کے برگزیدہ لوگوں" کے زمرے میں آتا ہے اور یہ استعداد رکھتا ہے کہ مرحلہ علم کو پس پشت ڈال کر مقتصد کے مرحلے میں قدم رکھے اور وہاں سے پروا کر کے "سابق بالخیرات" کے ادج افتخار پر جا پہنچے کیونکہ وہ بھی فطرت اور روحانی ساخت کے لحاظ سے حق تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں۔

۳۲ جَنَّاتٍ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرٍ مِنْ
ذَهَبٍ وَ لُؤْلُؤًا وَ لِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ○
۳۳ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ إِنَّ
رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ ○
۳۵ الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا
نُصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ ○

ترجمہ

۳۲ (ان کی جزا) جنت کے ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں کہ وہ جن میں داخل
ہوں گے۔ وہاں پر انہیں سونے کے لنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا
اور وہاں ان کے لباس ریشم کے ہوں گے۔
۳۳ وہ کہیں گے کہ حمد (اور ستائش) اس خدا کے لیے ہے کہ جس نے ہمارا غم دور
کر دیا۔ بے شک ہمارا پروردگار غفور و شکور ہے۔
۳۵ وہ خدا کہ جس نے اپنے فضل سے (ابدی) قیام کی اس جگہ پر ہمیں ٹھہرایا ہے جہاں
نہ تو ہمیں کوئی رنج و تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی سستی اور تھکان ہوگی۔

تفسیر

جہاں غم نہ تھکان

جو کچھ گزشتہ آیات میں گزر چکا ہے یہ آیات حقیقت میں اُس کا ایک نتیجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

انہیں میں پیش قدمی کرنے والوں کے لیے دائمی بہشت کے باغات ہیں جس میں وہ سب کے سب
داخل ہوں گے (جنت عدن يدخلونها)۔

جنت عدن کی جمع ہے اور باغ کے معنی میں ہے اور عدن استقرار و ثبات کے معنی
میں ہے اور معدن کو اس وجہ سے معدن کہتے ہیں کیونکہ وہ مختلف دھاتوں اور جواہرات کے استقرار کی
جگہ ہے۔ اس بنا پر جنت عدن کا معنی ہے بہشت کے ہمیشہ رہنے والے باغات۔
بہر حال یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہشت کی عظیم نعمتیں جاودانی اور قائم رہنے والی
ہیں اور مادی دنیا کی نعمتوں کی طرح ان کے بارے میں زوال کا خوف نہیں ہے۔ بہشت میں رہنے والوں
کے لیے بہشت کا ایک ہی باغ نہیں ہوگا بلکہ بہشت کے باغات ان کے پاس ہوں گے۔
اس کے بعد جنت کی نعمتوں کے تین حصوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے بعض مادی اور
ظاہری پہلو رکھتے ہیں، بعض روحانی اور باطنی اور ایک حصہ ہر قسم کے مزاحم کی نفی کرتا ہے۔
ارشاد ہوتا ہے: "انہیں میں بڑھ جانے والے یہ لوگ بہشت جاودانی میں سونے کے لنگنوں اور موتیوں
سے آراستہ ہوں گے اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا" (یحلّون فیہا من اساور من ذہب
ولؤلؤا ولباسہم فیہا حریر)۔

انہوں نے اس دنیا میں اُس کے ذوق برق سے بے اعتنائی برقی تھی اور خود کو سونے اور زیورات
کا امیر نہیں بنایا تھا۔ غم لوگ سوتی لباس سے بھی غم تھے تو انہوں نے بھی فاخرہ لباس نہیں پہنا تھا خدا
اسی چیز کی تکافی کے طور پر انہیں دوسرے جہان میں بہترین لباس اور زیور پہنائے گا۔

انہوں نے اس جہان ظاہری میں اپنے آپ کو راہ خدا میں خیرات کے ساتھ آراستہ کیا تھا، جہاں
دوسرے جہان میں کہ جو جسم اعمال کا جہان ہے انہیں طرح طرح کے زیورات سے آراستہ کرے گا۔
ہم نے بار بار کہا ہے کہ ہمارے الفاظ اس جہان کی محدود زندگی کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ یہ
قیامت کے عظیم عالم کے مفہیم ہرگز بیان نہیں کر سکتے۔ ان نعمتوں کے بیان کے لیے کسی اور طرح کی
الفاظ۔ با اور کوئی دوسری زبان اور لغت کی ضرورت ہے لیکن بہر حال اس غرض سے کہ اس جہان میں
مقید افراد کو ان عظیم نعمتوں کا ایک تصور پیش کرنے کے لیے انہی ناچیز اور نارسا الفاظ سے مدد لینا پڑتی ہے
اس مادی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد ایک خاص روحانی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

جنت عدن... لیکن ہے کہ بہشت کے معدن کی خبر ہو اور تقدیر میں "جز انعم جنت عدن... یا اولئک لہم جنت عدن" تھا
(تفسیر آیہ ۳۱ سورہ کہف) بعض نے اسے ظلی کبر سے بدل کہا ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ فضل کبر تکاب آسانی کی طرف
کی طرف اشارہ ہے لہذا جنت اس سے بدل نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ ہم سب کو سبب کا جائزین بنائیں۔

جیسا ہے، وہ کہیں گے کہ حمد و ستائش اسی خدا کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس نے ہم سے غم دور کر دیا (وقال الحمد لله الذی اذهب عنا الحزن)۔

وہ اس عظیم نعمت کے لیے خدا کی حمد کرتے ہیں کہ جو انہیں نصیب ہوتی ہے اور خدا کے لطف کی برکت سے ان کی زندگی سے غم کے تمام عوامل دور ہو گئے ہیں اور ان کی روح کا آسمان رنج و غم کے تاریک بادلوں سے پاک ہو گیا ہے۔ نہ تو انہیں خدا کے عذاب کا کوئی خوف ہے اور نہ ہی مرگ و فنا سے کوئی وحشت۔ نہ دل کی بے اطمینانی کی کوئی وجہ ہے اور نہ بدخواہوں کی آزار دہنہ جابروں کا دباؤ ہے اور نہ ہی بُروں اور گم غزروں کی ہم نشینی۔

بعض مفسرین نے اس حزن کو دنیاوی غموں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو میدانِ حشر میں انہیں اپنے عمل کے نتیجے کے بارے میں ہو گا۔ یہ دونوں تفسیر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تضاد نہیں رکھتیں اور دونوں ہی آیت کے معنی میں جمع ہو سکتی ہیں۔

”حزن“ (بروزن) ”غدم“ اور ”حزن“ (بروزن) ”مزد“ جیسا کہ لغت اور تفسیر کی بہت سی کتابوں میں آیا ہے دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔ اصل میں یہ زمین کی ناہمواری کے معنی میں ہے اور چونکہ غم داندہ روح انسانی کو ناہموار اور سخت کر دیتے ہیں اس لیے یہ تعبیر اس معنی میں استعمال ہوتی ہے بلکہ اس کے بعد یہ بہشتی مزمین مزید کہیں گے کہ، ”ہمارا پروردگار بخود و شکور ہے“ (ان ربنا لغفور شکور)۔ اپنی بخوریت کی صفت کی بنا پر اس نے لغزشوں اور گناہوں کا مجاری غم دور کر دیا ہے اور اپنی شکوریت کے ذریعے ہمیشہ ہمیشہ کی نعمتیں کہن کے اوپر بھی غم داندہ کا منحوس سایہ نہیں پڑتا ہیں عطا کی ہیں۔

ہمارے بہت سے گناہوں کو اس کے غفران نے چھپا لیا ہے اور ہمارے حقیر اور تھوڑے سے اعمال کا اپنی شکوریت کی بنا پر ہمیں بہت زیادہ اجر اور صلہ دیا ہے۔

آخر میں آخری نعمت کا بیان ہے ان کا قول نقل کرتے ہوئے قرآن کتا ہے: ”حمد و ستائش اس خدا کے لیے ہے کہ جس نے اپنے فضل سے ہمیں اس ابدی ٹھکانے میں جگہ دی کہ جس میں نہ رنج و غم ہے

تاج العروس میں بعض علماء ادب سے منقول ہے کہ جس وقت یہ لفظ رخ اور جر کے اعراب کے ساتھ استعمال ہو تو پھر (ز) کے سکون کے ساتھ اس کا لفظ ہوتا ہے اور جب نصب اور زبر کی صورت میں ہو تو پھر (ز) کی فتح کے ساتھ لیکن ادبیات عرب میں یہ امر ایک قانون کی صورت میں ہمیشہ کے لیے نہیں ہو سکتا اگرچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں بعض مواقع پر حالت نصب میں بھی (ز) کے سکون کے ساتھ آیا ہے۔

اور نہ ہی خشکی اور تھکان (الذی احلنا دار المقامة من فضله لایمنا فیہا نصب ولا یمننا فیہا الغوب)۔

ایک طرف تودہ ٹھرنے اور قیام کی جگہ ہے اور ایسا نہیں ہے کہ انسان ابھی اس ماحول سے آشنا ہو رہا ہو گا اور اس کے ساتھ دل نگار ہو کہ کوہِ کافقارہ بچ جائے گا۔

دوسری طرف اس کے باوجود کہ اس کی عمر طولانی اور ابدی ہوگی اور اس قسم کی مدت میں قائم تھکانِ تکلیف اور زحمت ہوتی لیکن وہاں ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر روز نئی نعمت اور نعمتوں کی تازہ ہمارا در پر در و گار کے جلوے اہل بہشت کو نظر آئیں گے۔

”نصب“ (بروزن) ”حسب“ مشقت اور زحمت کے معنی میں ہے اور ”غوب“ کو بھی بہت سے ارباب لغت اور مفسرین نے اسی معنی میں لیا ہے جبکہ بعض نے ان دونوں کے درمیان یہ فرق کیا ہے کہ ”نصب“ جسمانی مشقتوں اور ”غوب“ روحانی تھکان کو کہتے ہیں بلکہ

بعض نے ”غوب“ کو بھی اس سستی اور تھکاوٹ کے معنی میں سمجھا ہے کہ جو مشقت اور رنج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح سے ”غوب“ ”نصب“ کا نتیجہ ہوگا بلکہ

گویا وہاں نہ تو مشقت جسمانی کے عوامل موجود ہیں اور نہ ہی روحانی رنج و تکلیف کے اسباب کی کوئی خبر ہے۔

نہیں آیا تھا؟ پس اب تم (اس کا مزہ) چکھو کیونکہ ظالموں کے لیے کوئی یاورد مددگار نہیں ہے۔

۳۸) خدا آسمانوں اور زمین کے غیب سے آگاہ ہے اور جو کچھ دلوں میں ہے وہ اُسے بھی جانتا ہے۔

تفسیر

میں لوٹا دو تاکہ ہم اچھے عمل کریں

عام طور پر قرآن "وعدوں" کے ساتھ "وعید" اور بشارت کے ساتھ نذارت کا ذکر کرتا ہے تاکہ خوف ورجاء کے دونوں عوامل کو تقویت دے، کیونکہ یہ دونوں باہم انسان کے رشد و کمال کا سبب ہیں انسان حُب ذات کے تعاقب کے ماتحت فائدے کے حصول اور دفع ضرر کی خواہش رکھتا ہے، اس لیے گزشتہ آیات میں "خیرات میں سبقت کرنے والے مومنین" کی عظیم اور روح پرور جزاؤں کے بارے میں گفتگو کی تھی اور زیر بحث آیات میں کفار کی دردناک سزا کے بارے میں بات کی جا رہی ہے۔ یہاں بھی مادی اور روحانی دونوں سزاؤں سے متعلق گفتگو ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "وہ لوگ کہ جنہوں نے راہ کفر اختیار کی ان کے لیے جہنم کی آگ ہے" (والذین کفروا لہم نار جہنم)۔

جس طرح اُن لوگوں کے لیے بہشت جاودانی ہے اور ہمیشہ رہنے کی جگہ اور ٹھہرنے کا گھر ہے اسی طرح دوزخ بھی اس گروہ کے لیے ہمیشہ رہنے کا مقام ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: "اُن کے لیے ہرگز موت کا حکم صادر نہیں ہوگا کہ وہ مرجائیں اور اس رنج و الم سے راتی پائیں (لایقضى علیہم فیموتوا)۔"

اس کے باوجود کہ جلائے والی آگ اور وہ تمام دردناک عذاب ہر لمحہ موت کے منہ میں لے جاسکتا ہے لیکن چونکہ موت و حیات سمیت ہر چیز اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لیے اس کی طرف سے موت کا حکم صادر نہیں ہوگا لہذا وہ نہیں مرس گئے بلکہ انہیں زندہ رہنا پڑے گا تاکہ وہ عذاب الہی کا مزہ چکھیں۔

موت تو اس قسم کے لوگوں کے لیے نجات کا ایک ذریعہ ہوگی لیکن اس جگہ میں یہ درجہ بند ہو گیا ہے

لے "لایقضى علیہم" "لایحکم علیہم" کے معنی میں ہے۔

۳۶) وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فِيمَوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا كَذَلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ ۝

۳۷) وَهُوَ يَصْطَرِّحُونَ فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۖ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ ۝

۳۸) إِنَّ اللَّهَ عَلِيمُ غَيْبِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ إِنَّهُ عَلِيمُ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

ترجمہ

۳۶) جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، ہرگز ان کی موت کا فرمان جاری نہیں ہوگا کہ وہ مرجائیں اور نہ ہی ان کے لیے عذاب میں کوئی تخفیف ہو سکے گی۔ اس طرح سے ہم ہر کفر ان کرنے والے کو سزا دیں گے۔

۳۷) وہ دوزخ میں فریاد کریں گے، پروردگار! ہمیں نکال، تاکہ ہم ان اعمال کے بجائے کہ جو ہم انجام دیا کرتے تھے (اب) نیک عمل بجالائیں۔ (انہیں جواب دیا جائے گا) کیا ہم نے تمہیں اس قدر عمر نہیں دی تھی کہ انسان چاہے تو اس میں متوجہ ہو جائے؟ اور کیا (خدا کی طرف سے) متنبہ کرنے والا تمہارے پاس

اب ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ زندہ رہیں اور ان کی سزائیں تدریجاً ختم ہو جائیں تو بت برداشت کا اضافہ ہو تاکہ اس کے نتیجے میں درد اور تکلیف میں تخفیف ہو۔ اس درد میں بھی ایک اور چیلے کے ساتھ بند کرتے ہوئے قرآن کتا ہے: دوزخ کے عذاب میں سے ان کے لیے چیز کی تخفیف نہیں کی جائے گی (ولا یخفف عنهم من عذابہا)۔

آیت کے آخر میں اس وحید الہی کے قطعی ہونے کی تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: ہر کفران کرنے والے کو ہم اسی طرح سے جزا دیں گے (کذالک نجزی کل کفور)۔

جنہوں نے پہلے تو وجود انبیاء اور کتب آسمانی کی نعمت کا کفران کیا ہے ان خدا داد صلاحیتوں کو کھو کر دیا ہے کہ جو راہ سعادت میں ان کے لیے مددگار ہو سکتی تھیں۔ ہاں! کفران کرنے والوں کی جزا آگ کے درد ناک عذاب میں جلنا ہی ہے۔ ایسی آگ کہ جس کو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے دنیا کی زندگی میں روشن کیا ہے۔ اس کا ایندھن ان کے انکار و اعمال اور ان کے وجود میں ہے۔

”کفور“ مبالغے کا میخ ہے اس لیے یہ کافر سے زیادہ عمیق اور گہرا معنی رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں کافر مومن کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن ”کفور“ تمام نعمتوں کا کفران کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہذا اس کا مفہوم زیادہ وسیع ہے۔ اس طرح سے ”کفور“ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہوں نے تمام خدائی نعمتوں کا کفران کیا ہے اور اس جہان میں اس کی رحمت کے تمام دروازوں کو اپنے اوپر بند کر لیا ہے۔ اس لیے آخرت میں خدا بھی نجات کے تمام دروازے ان پر بند کر دے گا۔

بعد والی آیت ان کے درد ناک عذاب کے ایک اور حصہ کو بیان کرتی ہے اور اس سلسلے میں بعض حساس نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: وہ دوزخ میں فریاد کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس جگہ سے نکال۔ تاکہ ہم عمل صالح بجالائیں، ان اعمال کے بجائے کہ جو ہم پہلے انجام دیتے تھے (وہو یصطرون فیما دینا اخرجنا نعمل صالحاً غیر الذی کنا نعمل)۔ ہاں! وہ اپنے بُرے اعمال کو دیکھ کر گہری ندامت میں جا پڑیں گے اور دل سے فریاد کریں گے۔ وہ ایک محال چیز کا تقاضا کریں گے یعنی اعمال صالح بجالانے کے لیے دنیا کی طرف بازگشت کرنے کا مطالبہ۔

”صالحاً“ کی تعبیر (نگرہ کی شکل میں) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے کوئی معمولی سا عمل

”یصطرون“ ”صراخ“ کے ادھ سے شدید فریاد اور چیخ و پکار کے معنی میں ہے کہ جو انسان استغاثہ کرنے اور درد و تکلیف دور کرنے کے لیے اور مددگار کو بلانے کے لیے دل سے نکالتا ہے۔

بھی انجام نہیں دیا اور لازمی طور پر یہ سب عذاب اور رنج و تکلیف ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے کہ جو زندگی میں خدا کے ساتھ کوئی ربط و تعلق اور واسطہ نہیں رکھتے تھے اور صحیباں و گنہ میں غرق تھے اس بنا پر ممکن ہے کہ کچھ عقوبتوں سے بہت اعمال صالح بھی نجات کا سبب بن جائیں۔

”نعمل“ کہ جو فعل مضارع اور استمرار کی دلیل ہے اسی معنی کی تاکید ہے کہ ہم ہمیشہ غیر صالح اعمال میں مشغول رہے۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ”صالح“ کی ”کنا نعمل“ کے جملہ کے ساتھ توصیف ایک لطیف نکتے کی حامل ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے بُرے اعمال کو بھڑائے نفس اور شیطان کی طرف سے مزین کیے جانے کی وجہ سے اعمال صالح خیال کرتے تھے۔ اب ہمارا مصمم ارادہ ہے کہ اگر ہم واپس چلے جائیں تو ان اعمال کے بجائے کہ جو ہم پہلے انجام دیتے تھے، واقعی اعمال صالح بجالائیں گے۔

ہاں! گنہگار شروع شروع میں اپنی پاکیزگی فطرت کے مطابق اپنے اعمال کی برائی کا ادراک کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کی برائی اس کی نظر میں کم ہوتی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ اس سے بھی ادا پر چلا جاتا ہے اور اس کی نظر میں وہی برائی اچھائی دکھائی دینے لگتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کتا ہے:

”ذین لہو سوء اعمالہو“

”ان کے بُرے اعمال کو ان کی نظر میں اچھا بنا دیا جاتا ہے۔“ (توبہ - ۲۷)

قرآن مجید یہ بھی کتا ہے:

”وہم یحسبون انہو یحسنون صنعا“

”وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ نیک عمل انجام دے رہے ہیں۔“ (زکف - ۱۰۴)

بہر حال اس تقاضے کے مقابلہ میں خدا کی طرف سے انہیں ایک قاطع اور دو ٹوک جواب دیا جائے گا: کیا ہم نے تمہیں بیداری اور غور و فکر کے لیے کافی عمر نہیں دی تھی (اولو نعمتو کما یتذکر فیہ من تذکر)۔

”اور کیا خدا کی طرف سے ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں آیا تھا“ (وجاء کما الذنیر)۔

اب جبکہ یہ بات ہے کہ نجات کے تمام وسائل تمہیں میسر تھے اور تم نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا تو پھر اسی جگہ گرفتار بلا رہو، ”پس اب تم مزہ چکھو کیونکہ سنگروں کے لیے کوئی یاد دہکار نہیں ہے (فدوقوا فما للظالمین من نصیر)۔

یہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں تھی کیونکہ تمہارے پاس کافی مہلت تھی اور ضروری تعداد میں خدا کی طرف سے ڈرانے والے بھی تمہارے پاس آئے۔ بیداری و نجات کے یہ دونوں

رکن ہمیں حاصل ہو گئے تھے اس بنا پر تمہارے لیے کوئی عذر اور بہانہ نہیں رہا۔ اگر تمہارے پاس کافی مقدار میں مہلت نہ ہوتی تو عذر تھا اور اگر مہلت نہ ہوتی، لیکن معلم و مربی اور رہبر و راہبر ہادی تمہارے پاس نہ آتا تب بھی کوئی عذر تھا لیکن ان دونوں کے ہوتے ہوتے کونسا عذر وہانہ باقی رہ جاتا ہے۔

لفظ "نذیر" (ڈرانے والا) آیات قرآن میں عام طور پر دو انبیاء خصوصاً پیغمبر اسلام کی طرف اشارہ کے طور پر آیا ہے لیکن بعض مفسرین نے اس کے لیے ایک وسیع تر معنی بیان کیا ہے کہ جس میں انبیاء کتب آسمانی اور بیدار کن حوادث۔ مثلاً دوستوں اور رشتہ داروں کی موت اور پیری و ناتوانی۔ بھی شامل ہے۔ خصوصاً عربی اشعار میں لفظ "نذیر" بڑھاپے کے معنی میں بہت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ذیل کے شعر میں:

س رَأَيْتَ الشَّيْبَ مِنْ نَذْرِ الْمَنِيَا

لصاحبه وحسبك من نذير

"میں نے بڑھاپے کے سفید بالوں کو موت سے ڈرانے والا دیکھا ہے اور تیرے لیے یہی "نذیر" کافی ہے۔"

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسلامی روایات میں عمر کی اس حد کے بارے میں جو انسان کی بیداری اور توجہ کے لیے کافی ہے، مختلف تعبیرات بیان کی گئی ہیں بعض میں ساٹھ سال بیان ہوئی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے:

من عمره الله ستين سنة فقد اعذرا ليه -

جسے خدا نے ساٹھ سال عمر دی ہے اس کے لیے عذر کی راہ بند کر دی ہے۔

یہی معنی امیر المؤمنین علی سے بھی نقل ہوا ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے کہ:

اذا كان يوم القيامة نودي (این) ابناء السنين؟ وهو العمر الذي قال الله

فيه: اولو نعمرکم ما يتذكر فيه من تذكرك -

"جس وقت قیامت کا دن ہوگا تو منادی ندا کرے گا کہ ساٹھ سالہ لوگ کہاں ہیں وہی

عمر ہے کہ جس کے بارے میں خدا فرماتا ہے: کیا ہم نے تمہیں اتنی مقدار میں عمر نہیں دی تھی

کہ جس میں لوگ ابھی طرح غور و فکر کرتے ہیں۔"

لے دیکھو دیکھو مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کے تفسیر قرطبی اور تفسیر در المنثور۔

لیکن ایک دوسری حدیث میں امام صادق سے اس کی مقدار صرف اٹھارہ سال معین ہوئی ہے۔ البتہ ممکن ہے کہ آخری روایت کم سے کم کی طرف اشارہ ہو اور گزشتہ روایات زیادہ سے زیادہ کی طرف اس بنا پر ان روایات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

یہاں تک کہ۔ افراد کے اختلاف کے ساتھ۔ دوسرے برسوں پر بھی قابل تطبیق ہے بہر حال آیت کے مفہوم کی وسعت پھر بھی باقی رہتی ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں کفار کے اس تقاضے کا جو وہ دوزخ میں دنیا کی طرف بازگشت کے لیے کریں گے جواب دیا گیا ہے: خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے ایسا خدا یقیناً اس چیز سے بھی آگاہ ہے کہ جو دلوں کے اندر ہے (ان الله عالم الغيب السماوات والارض انه عليهما بذات الصدور)۔

در حقیقت پہلا جملہ دوسرے جملے کی ایک دلیل ہے یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا دلوں کے بھیدوں سے بے خبر ہو جبکہ زمین و آسمان کے تمام اسرار اور عالم هستی کی تمام غیب چیزیں اس کے لیے آشکار ہیں۔

ہاں! وہ جانتا ہے کہ اگر دوزخیوں کے تقاضے کا مثبت جواب دیا جائے اور وہ دنیا کی طرف لوٹ آئیں تو وہی اعمال جاری رکھیں گے جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۲۸ میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے:

ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه وانهم لكاذبون

اگر وہ پلٹ جائیں تو وہ پھر انہیں کاموں کو انجام دیں گے کہ جن سے انہیں منع کیا

گیا ہے۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ آیت تمام مومنین کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ اپنی نیتوں میں اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کریں اور خدا کے علاوہ کسی پر نظر نہ رکھیں کیونکہ اگر ان کی نیت اور محرکات عمل میں معمول سی بھی ناخالصی ہوئی تو وہ جو تمام غیب سے آگاہ ہے اُسے بھی جانتا ہے اور اسی کے مطابق جزا دے گا۔

چند اہم نکات

۱۔ "ذات الصدور" سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید کی دس سے زیادہ آیات میں بعینہ یہی جملہ آیا ہے یا تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ بات آئی ہے:

لے مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ان الله عليه بذات الصدور۔

”ذات“ کا لفظ جس کا مذکر ”ذو“ ہے اصل میں ”صاحب“ کے معنی میں ہے۔ اگرچہ فلاسفہ کی تعبیرات میں، عین و حقیقت اور گوہر اشیا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن مفردات میں راجح کے قول کے مطابق یہ ایک ایسی اصطلاح ہے کہ جو کلام عرب میں موجود نہیں ہے۔ اس بنا پر ”ان الله عليه بذات الصدور“ کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا والوں کے صاحب و مالک سے باخبر ہے۔ یہ جملہ ان لوگوں کے عقائد و نیات کے بارے میں ایک لطیف کنایہ ہے کیونکہ عقیدے اور نیتیں جس وقت دل میں گھر کر لیں تو گو زیادہ قلب انسان کی مالک ہو جاتی ہیں اور اس پر حکومت کرتی ہیں اور اسی بنا پر یہ عقائد و نیات انسانی دل کے صاحب و مالک شمار ہوتے ہیں۔

یہ وہی بات ہے کہ جس سے بعض بزرگ علماء نے استفادہ کرتے ہوئے اسے اس عبارت میں مجسم کیا ہے؛

الانسان أرائه و افكاره، لاصورته و اعضائه۔

”انسان تو بس اس کے عقائد و افکار ہی ہوتے ہیں، نہ کہ اس کی شکل و صورت اور اعضاء بدن میں۔“

۲۔ واپسی کی کوئی راہ نہیں؛ یقیناً قیامت اور موت کے بعد کی زندگی دنیا کی نسبت ایک مرحلہ تکامل و ارتقا ہے اور دہاں سے اس جہان کی طرف بازگشت کوئی معقول بات نہیں ہے۔ کیا ہم گزرے ہوئے گل کی طرف لوٹ سکتے ہیں؟ کیا لومو لوہ پچہ جینی ذور کی طرف لوٹ سکتا ہے؟ کیا وہ پھل جو شاخ سے جدا ہو گیا ہے ممکن ہے کہ پھر شاخ کی طرف لوٹ جائے؟ اسی بنا پر آخرت والوں کے لیے دنیا کی طرف بازگشت ممکن نہیں ہے۔

اگر بالفرض ممکن بھی ہو تو بھی فراخوش کار انسان اپنی اس گزشتہ روش کو برقرار رکھے گا۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم نے بار بار خود اپنے آپ کو آزمایا ہے کہ خاص حالات میں جبکہ ہم کسی تنگی یا سختی میں گرفتار ہوتے ہیں، تو اس وقت اپنے خدا کے ساتھ مخلصانہ عہد و پیمانہ کرتے ہیں، لیکن جس وقت وہ حالات بدل جاتے ہیں تو ہم تمام قول و قرار بھول جاتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو سچ اپنے اندر ایک گہری تبدیلی پیدا کر لیتے ہیں۔ ایسی تبدیلی نہیں کہ جو حالات کے ساتھ مشروط ہو۔ یہ حقیقت قرآن مجید کی متعدد آیات میں بیان ہوئی ہے۔ سورہ انفصام کی آیت ۲۸ میں قرآن صریحاً ایسے افراد کی تکذیب کرتے ہوئے کہتا ہے؛

۱۔ عالم بزرگوار مرحوم کا شفت الغفار کی اصل الشیخہ واصولہ۔

”اگر یہ پلٹ بھی جائیں تو ان کا طرز عمل وہی پہلے والا ہوگا۔“

لیکن سورہ اعراف کی آیت ۵۳ میں صرف اسی بات پر قناعت کی گئی ہے کہ وہ دنیا کا لوگ ہیں لیکن ان کی بازگشت کی درخواست کا صراحت کے ساتھ جواب نہیں دیا گیا؛

فهل لمن شفعا فيشفعوا لنا او نرد فنعمل غيرالذي كنا نعمل قد خسروا انفسهم و ضل عنهم ما كانوا يفترون۔

”کیا آج ہمیں کوئی شافع مل جائیں گے کہ جو ہماری شفاعت کریں یا پھر ہمیں اجازت ملے کہ ہم واپس چلے جائیں اور جو عمل ہم پہلے کیا کرتے تھے اس کے بجائے نیک عمل انجام دیں؟ انہوں نے اپنے وجود کا سرمایہ گنوا دیا ہے اور اپنا ہی نقصان کیا ہے اور وہ سالے بھوٹے مبدو جو انہوں نے گھر رکھے تھے گم ہو گئے اور ان کے بناوٹی مبدووں کا کوئی نام و نشان وہاں نہیں ملے گا۔“

یہی مطلب سورہ مؤمنون کی آیت ۱۰۷ و ۱۰۸ میں دوسری طرح بیان ہوا ہے؛

ربنا اخرجنا منها فان عدنا فانا ظالمون قال اخلصوا فيها ولا تكلمون۔

”پروردگارا! ہمیں دوزخ سے نکال، اگر ہم پلٹ گئے (اور پھر انہیں اعمال کو دہرایا) تو پھر ہم ظالم ہیں وہ ان کے جواب میں فرمائے گا؛ دُور ہو جاؤ اور مجھ سے بات نہ کرو۔“

بہر حال یہ ایک بے بنیاد تقاضا ہے اور محال آرزو ہے۔ شاید وہ بھی کم و بیش یہ جانتے ہیں لیکن شدت بیچارگی کی وجہ سے اس تقاضے کو دہرائیں گے لہذا آج ہی جبکہ ہمیں موقع میسر ہے ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ انجام دینا چاہیے۔

۳۹) هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ خَلْقًا فِي الْأَرْضِ ۗ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۗ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا مَقْتًا ۗ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ۝

۴۰) قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ ۗ أَمْ آتَيْنَهُمُ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْهُ ۗ بَلْ إِنْ يَتَّبِعُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ۝

۴۱) إِنْ اللَّهُ يُمَسِّكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۗ وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ ۗ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ۝

ترجمہ

۳۹) وہ وہی ہے کہ جس نے تمہیں زمین میں جانئین بنایا۔ اب جو شخص کافر ہوگا تو اس کا نقصان خود اسی کو ہوگا اور کافروں کا کفر پروردگار کے ہاں ان کے لیے غضب کے سوا اور کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا اور ان کا کفر خالص کے سوا اور کچھ نہیں بڑھاتا۔

۴۰) کہو: کیا تم اپنے ان معبودوں کے بارے میں غور نہیں کرتے ہو جنہیں تم نے خدا کا شریک قرار دیا ہے۔ مجھے دکھاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین کی کس چیز کو پیدا کیا ہے یا یہ آسمانوں (کی خلقت اور مالکیت) میں کیا شرکت رکھتے ہیں؟ یا ہم نے

انہیں کوئی ایسی (آسمانی) کتاب دی ہے کہ جس میں سے اپنے (شرک کے) لیے کوئی دلیل رکھتے ہیں؟ نہیں ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے بلکہ ظالم لوگ صرف ایک دوسرے سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔

۴۱) خدا ہی آسمان و زمین کو روکے ہوئے ہے تاکہ وہ اپنے نظام سے منحرف نہ ہو جائیں اور اگر وہ منحرف ہو جائیں تو اُس کے علاوہ کوئی اور انہیں روک نہیں سکتا۔ وہ حلیم و غفور ہے۔

تفسیر

آسمان و زمین اس کی قدرت سے قائم ہیں

ان مباحث کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں کفار و مشرکین کے انجام کے بارے میں تھیں زیر بحث آیات میں ایک اور طریقے سے ان سے باز پرس کی گئی ہے اور ان کے طرز عمل کے بطلان کو کچھ اور واضح دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں جانئین بنایا (ہو اللہ الذی جعلکم و خلقت فی الارض)۔

یہاں پر "خلقت" چاہے زمین میں خدا کے خلفاء اور خدائی نمائندوں کے معنی میں ہو اور خواہ گزشتہ اقوام کے جانئینوں کے معنی میں (اگرچہ یہاں پر دوسرا معنی ہی زیادہ صحیح نظر آتا ہے) انسانوں پر خدا کے انتہائی لطف و کرم کی دلیل ہے کہ اس نے زندگی کے تمام وسائل انہیں عطا فرمائے ہیں۔ اسی نے عقل و شعور اور فکر و ہوش دیئے ہیں اور اسی نے مختلف جسمانی قوی انسان کو عطا کیے ہیں۔ اسی نے دوسرے زمین کو طرح طرح کی نعمتوں سے بھر دیا ہے۔ اسی نے ان وسائل سے استفادہ کرنے کا طریقہ بھی انسان کو سکھایا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے دلی نعمت کو بھلا کر بے حقیقت اور بناوٹی خداؤں کے دامن سے کیسے وابستہ ہو جاتا ہے؟

در حقیقت یہ جملہ توحید و ربوبیت کا بیان ہے کہ جو توحید و عبادت پر ایک دلیل ہے۔ ضمنی طور پر یہ جملہ تمام انسانوں کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے کہ وہ جان لیں کہ ان کی یہ زندگی ابدی جاوداتی نہیں ہے۔ جس طرح سے یہ دوسری اقوام کے جانئین بنے ہیں، کچھ دنوں کے بعد پٹے جائیں گے

اور دوسری قومیں ان کی جانئیں ہو جائیں گی۔ لہذا ٹھیک طرح سے سوچ لیں کہ وہ اس چند روزہ زندگی میں کیا کر رہے ہیں اور اپنے مستقبل کو کس طرح نگہ رہے ہیں اور ان سے متعلق دنیا میں کس طرح کی تاریخ باقی رہ جائے گی؟

اسی بنا پر ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے؛ جو شخص کافر ہو جائے گا اس کا کفر خود اسی کے نقصان میں ہوگا۔ (فمن کفر فعليه کفره)۔

”نیز کافروں کا کفر پروردگار کے نزدیک غضب کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا“ (ولایزید الا کفرین کفره عند ربہ و الا مقنتاً)۔

”اور ان کا کفر خسارے کے سوا ان کے لیے کچھ بھی زیادہ نہیں کرتا“ (ولایزید الا خساراً)۔

درحقیقت آخری دو جملے ”من کفر فعليه کفره“ کی تفسیر ہیں کیونکہ یہ جملہ کہتا ہے کہ انسان کا کفر صرف اس کے اپنے نقصان پر تمام ہوتا ہے اس کے بعد اس مسئلے کے لیے دو دلیلیں قائم کرتا ہے؛

پہلی دلیل یہ ہے کہ یہ کفر ان اور بے ایمانی ان کے پروردگار کے ہاں کہ جو تمام نعمتوں کا بخشنے والا ہے اس کے غضب کے سوا کوئی نتیجہ نہیں رکھتی۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ خشم الہی کے علاوہ یہ کفر گھاٹے کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا، وہ اپنی ہستی کا سرمایہ اپنے ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں اور انحطاط اور ظلمت کو اپنے لیے خرید لیتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا نقصان ہوگا؟

ان دونوں میں سے ہر ایک دلیل اس غلط روش کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے۔

”لا یزید“ (زیادہ نہیں کرتا) کی تکرار وہ بھی فعل مضارع کی شکل میں کہ جو استمرار کی دلیل ہے، اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان طبعی طور پر افزائش کی جستجو میں ہوتا ہے۔ اگر وہ توحید کا راستہ اختیار کر لے تو سعادت و جمال میں افزائش ہوگی اور اگر کفر کی راہ میں قدم رکھے گا تو اسے پروردگار کے غضب اور خسارے میں اضافہ نصیب ہوگا۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ پروردگار کا غضب اور غصہ اس معنی میں نہیں ہے کہ جو انسانوں میں ہوتا ہے کیونکہ انسان میں تو غصہ ایک قسم کا ہجیمان اور اندرونی برفروختگی ہے کہ جو تند تیز اور شدید حرکات کا سرچشمہ ہوتی ہے اور انسانی قوتوں کو دفاع کے لیے یا انتقام لینے کے لیے مجتمع کرتی ہے۔ لیکن پروردگار میں ان مفاہیم میں سے کوئی بھی بات نہیں۔ اور یہ تو متغیر اور ممکن موجودات کے آثار ہیں بلکہ غضب الہی سے مراد ایسے لوگوں سے کہ جو بڑے اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں رحمت کے دامن کو کھینچ لینا اور اپنے لطف کو روک لینا ہے۔

بعد والی آیت ایک اور دو ٹوک جواب مشرکین کو دیتی ہے اور انہیں یہ بات سمجھاتی ہے کہ اگر انسان محسوس کی پیروی کرتا ہے یا اس سے دل لگاتا ہے تو اسے چاہیے کہ اس کے لیے کوئی عقلی دلیل رکھتا ہو یا منقولات میں سے کوئی قطعی دلیل اس کے پاس ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے پاس تو ان دونوں میں سے کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے۔ اس صورت میں تو تم صرف دھوکے اور فریب میں مبتلا ہو۔

فرمایا گیا ہے؛ ”ان سے کہہ دے، کیا تم ان جعلی معبودوں کے بارے میں غور نہیں کرتے کہ جنہیں تم نے خدا کا شریک سمجھ لیا ہے۔ مجھے دکھاؤ تو میں کہ انہوں نے زمین میں سے کس چیز کو پیدا کیا ہے“ (قل اذیتو شرا کانکھو الذین تدعون من دون اللہ ارونی ما اذا خلقوا من الارض)۔

”یا کیا وہ آسمانوں کی خلقت میں شریک ہیں؟ (ام لہو شریک فی السماوات)۔ اس حال میں ان کی پرستش کی کیا دلیل ہے؟ معبود ہونا خالق ہونے کی فرع ہے اور جبکہ تم جانتے ہو کہ آسمان و زمین کا خالق تو صرف خدا ہے تو اس کے سوا کوئی اور معبود بھی نہیں ہوگا کیونکہ ہمیشہ کا عقیدہ میں توحید، عبودیت میں توحید کی دلیل ہے۔

اب جبکہ ثابت ہو گیا کہ کوئی عقلی دلیل تمہارے مدعا کے لیے نہیں ہے تو کیا کوئی دلیل منقول تمہارے پاس موجود ہے؟ ”کیا ہم نے کوئی (آسمانی) کتاب انہیں دی ہے اور اپنے اس کام کے لیے اس میں ان کے پاس کوئی واضح دلیل ہے؟ (ام انیتنا ہو کتابنا فہو علی بینۃ منہ)۔

نہیں کتاب الہی میں سے ان کے پاس کوئی واضح دلیل اور برہان نہیں ہے۔ پس ان کا سرمایہ مکرو فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ بلکہ یہ سنگم ایک دوسرے سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں (بل ان یعد الظالمون بعضہم بعضاً الا غروراً)۔

دوسرے لفظوں میں اگر ہر گروہ کے بت پرست اور تمام مشرک یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ روئے زمین میں ان کے بت ان کی مرادوں کو پورا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، تو انہیں چاہیے کہ کوئی ایسی چیز نونے کے طور پر پیش کریں کہ جو زمین میں ان کے معبودوں نے خلق کی ہو۔

اگر ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ بت فرشتوں اور آسمان کی مقدس مخلوقات کے منظر ہیں۔ جیسا کہ ان کی ایک جماعت کا عقیدہ تھا۔ تو انہیں چاہیے کہ آسمانوں میں ان کی خلقت کی شرکت کی نشاندہی کریں۔

اور اگر ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خلقت میں تو شریک نہیں ہیں البتہ انہیں صرف مقام شفاعت حاصل ہے۔ جیسا کہ بعض کا دعویٰ تھا۔ تو انہیں چاہیے کہ وہ کتب آسمانی سے کوئی سند اس مدعا کو ثابت کرنے

۱۔ ”ارایتو“ کا جملہ، کیا تم دیکھتے نہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟ کے معنی میں ہے لیکن بعض مفسرین نے اسے ”اخبودنی“ (مجھے خبر دو) کے معنی میں لیا ہے۔ ہم نے جلد ۳ میں سورہ انفام کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں تفصیل بحث کی ہے۔

کے لئے پیش کریں۔

اب جبکہ ان مدارک میں سے کوئی بھی مدارک ان کے پاس نہیں ہے تو یہ سنگریسے فریب کار ہیں کہ جو جھوٹی باتیں ان سے کہتے رہتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ "زمین و آسمان" سے مراد یہاں زمینی اور آسمانی مخلوق کا مجموعہ ہے اور زمین کے بارے میں خلقت اور آسمان کے بارے میں شرکت کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسمانوں میں شرکت بھی خلقت کے حوالے سے ہونا چاہیے۔

اور "کتایا" کی تعبیر "مگرہ" کی شکل میں اور وہ بھی پروردگار کی طرف استناد کے ساتھ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی بھی آسمانی کتاب میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی دلیل بھی ان کے دعویٰ پر نہیں ہے۔ "بیئنتہ" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ واضح روشن دلیل آسمانی کتب سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

"ظالمون" کی تعبیر دوبارہ اس معنی پر ایک تاکید ہے کہ "شکر" واضح اور آشکار "علم" ہے۔ "غور" کے وعدوں کی تعبیر اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ بت پرست یہ خرافات و ادھام کھوٹے وعدوں کی شکل میں ایک دوسرے سے کرتے تھے اور مروج اور بے بنیاد تقلیدوں کی صورت میں ایک دوسرے کی طرف الفا کرتے تھے۔

بعد والی آیت میں آسمانوں اور زمین پر خدا کی حاکمیت کے بارے میں گفتگو ہے۔ حقیقت میں بناوٹی معبودوں کی عالم ہستی میں وفات کی نفی کے بعد حقیقت و ربوبیت میں توحید کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "خدا ہی آسمان اور زمین کو رد کے ہوتے ہے تاکہ وہ اپنی راہ سے منحرف اور زائل نہ ہو جائیں" (ان الله يمسك السماوات والارض ان تنزولا)۔

صرف ابتدائی خلقت ہی خدا کی طرف سے ہے بلکہ ان کی نگہداری، تدبیر اور حفاظت بھی اسی کے دست قدرت میں ہے بلکہ ان میں ہر لحظہ جدید تخلیقات ہوتی رہتی ہیں اور ہر زمانے میں ایک نئی خلقت ہوتی ہے اور اس مبداء فیاض سے لمحہ بہ لمحہ فیض ہستی انہیں پہنچتا رہتا ہے کیونکہ اگر ایک لمحے کے لیے بھی ان کا رابطہ اس عظیم مبداء سے منقطع ہو جائے تو وہ فنا کی راہ اختیار کر لیں،

اگر نازی کشد یکدم فردیزندت لبسا

"اگر وہ ایک لمحے کے لیے بھی ناز کرے تو تمام سانچے گر پڑیں"

۱۔ ان نزولا کا جملہ تقدیر میں اس طرح تھا:

انزلنا نزولا۔ یا۔ کواہتہ ان نزولا۔

یہ درست ہے کہ آیت عالم ہستی کے اعلیٰ نظام کی حفاظت کا ذکر کرتی ہے لیکن جیسا کہ فلسفیانہ بحث میں ثابت ہو چکا ہے ممکنات یعنی بقا۔ میں بھی اسی طرح سے مبداء کے محتاج ہیں جس طرح سے کہ اپنے حدود میں لہذا اس طرح نظام کی حفاظت نئی تخلیقات کو جاری رکھنے اور فیض خداوندی کو جاری رکھنے کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آسمانی ٹرے بغیر اس کے کہ کسی جگہ بندھے ہوتے ہوں، ہزاروں لاکھوں سال سے اپنے مبین مدار پر حرکت کر رہے ہیں۔ بغیر اس کے کہ ذرہ برابر بھی انحراف کریں۔ اس کا نونہ نظام شمسی میں دیکھتے ہیں۔ ہماری زمین کئی ملین بلکہ کئی ارب سال سے سورج کے گرد اپنے راستے پر دقیق نظم کے تحت چکر لگا رہی ہے کہ جس کا سرچشمہ قوتِ جاذبہ اور قوتِ دافعہ کا اعتدال ہے اور فرماں پروردگار پر تسلیم خم کیے ہوتے ہے۔

پھر تاکید کے طور پر مزید فرمایا گیا ہے: "اگر وہ یہ چاہیں کہ اپنے مدار سے باہر نکل جائیں تو کوئی بھی خدا کے سوا انہیں روک نہیں سکتا (ولئن زالتا ان امسکھما من احد من بعدہ)۔ نہ تمہارے گھڑے ہوتے بت، نہ فرشتے اور نہ ہی ان کے علاوہ کوئی اور، کوئی بھی شخص اس کام پر قادر نہیں۔"

آیت کے آخر میں اس بنا پر کہ گمراہ مشرکین کے سامنے توبہ کا دروازہ بند نہ کیا جائے اور ہر مرحلے میں انہیں بازگشت کا موقع میسر رہے، فرمایا گیا ہے: "خدا ہمیشہ حلیم و مغفور ہے" (انہ کان حلیمًا غفورًا)۔ اپنے علم کی وجہ سے ان کی سزائیں جلدی نہیں کرتا اور اپنی مغفوریت کی وجہ سے ان کی توبہ اس کی شرائط کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ اس بنا پر آیت میں مشرکین کی کیفیت اور توبہ و بازگشت کے وقت خدا کی رحمت ان کے شامل حال ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے ان دو اوصاف کو آسمان و زمین کی حفاظت کے ساتھ مربوط سمجھا ہے کیونکہ ان کا زوال عذاب و مصیبت ہے اور خدا اپنے علم و خزان کی وجہ سے اس عذاب و مصیبت کو لوگوں کے دامن گیر نہیں ہونے دیتا اگرچہ ان میں سے بہت سوں کے گنہگار و اعمال کا تقاضا یہی ہے کہ یہ عذاب نازل ہو۔ جیسا کہ سورہ مریم کی آیات ۸۸ تا ۹۰ میں بیان ہوا ہے:

وقالوا اتخذوا الهنوزولدا لقد جئتم شيئا اذًا تكاد السماوات يتفطرن

منه وتنشق الارض وتخر الجبال هدا۔

"انہوں نے کہا کہ خدائے رحمن نے اپنے لیے بیٹا انتخاب کیا ہے۔ تم نے یہ کیسی بُری اور تکلیف دہ بات کہی ہے؟ قریب ہے کہ آسمان اس بات کو سن کر منتشر ہو جائے اور زمین پھٹ پڑے اور پہاڑ شدت سے نیچے گر پڑیں۔"

یہ کہتے بھی قابل توجہ ہے کہ "ولم یسئلوا... کا جملہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اگر وہ زائل ہو جائیں تو خدا کے سوا کوئی بھی انہیں نہیں روکے گا بلکہ اس معنی میں ہے کہ اگر وہ مائل بہ زوال ہوں تو خدا ہی ان کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ درنہ زوال کے بعد محفوظ رکھنے کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

پوری انسانی تاریخ میں بار بار یہ امر پیش آیا ہے کہ بعض ستارہ شناسوں نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ ممکن ہے کہ فلالِ دُمدار ستارہ یا اس کے علاوہ کوئی ستارہ اپنے راستے اس کرۂ زمین کے قریب سے گزرے تو اس کے ٹکرا جانے کا احتمال ہے۔ ایسی پیش گوئیوں نے کئی دفعہ تمام دنیا والوں کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ ان حالات میں سب کو یہ احساس ہوتا تھا کہ ایسے میں کسی شخص سے کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر فلالِ کرۂ آسمانی زمین کی طرف آجائے اور قوتِ جاہزہ کے زیر اثر دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں تو نوبِ بشر کے کئی ہزار سالہ تمدن کا نام و نشان مٹ جائے یہاں تک کہ دوسرے زندہ موجودات بھی صفحہ زمین پر باقی نہ رہیں۔ پروردگار کی قدرت کے سوا کوئی اس حادثے کو روکنے پر قادر نہیں۔

اس قسم کے حالات میں سب کے سب نیازِ مطلق کا احساس ہے نیازِ مطلق خدا کی طرف ہی کریں گے لیکن جب احتمالی خطرات برطرف ہو جائیں گے تو بھول اور نسیان انسانوں پر سایہ نکلن ہو جائے گا۔ نہ صرف آسمانی جُردوں اور سیاروں کا ٹکرانا ہولناک ہے بلکہ کسی ایک سیارے کا مختصر سا انحراف مثلاً زمین کا اپنے مدار سے ہٹ جانا کئی ہولناک حادثوں کا سبب ہو سکتا ہے۔

اس کی قدرت کے سامنے چھوٹا بڑا سب برابر ہے

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں آسمانوں کے ذہنی جگہ پر قائم رہنے کو خدا کی قدرت کے ساتھ منسک کیا گیا ہے۔ قرآن کی دوسری آیات میں یہی تعبیر امواجِ ہوا کے اوپر پرندوں کی موجودگی کے بارے میں آئی ہے:

العویروا الی الطیر مسخرات فی جوار السماء ما یمسکنن الا اللہ ان ذالک لآیات لقوم یؤمنون۔

نیکیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ جو آسمان کی بلندیوں میں مسخر ہیں۔ خدا کے سوا کوئی بھی انہیں نہیں روکتا۔ اس چیز میں ایمان لانے والوں کے لیے خدا کی عظمت و قدرت کی نشانیاں ہیں۔ (راطل - ۹۹)

تعبیرات کی یہ ہم آہنگی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پروردگار کی بے انتہا قدرت کے لیے تمام آسمانوں کے گرد اور زمین کی نگہداری امواجِ ہوا کے اوپر ایک پرندہ کی نگہداری کے مانند ہے۔ ایک مقام پر تو وہ وسیع آسمان کی خلقت کو اپنے وجود کی نشانی بتاتا ہے اور دوسری جگہ پھر جیسے چھوٹے

سے حشرہ کی خلقت کو اپنی قدرت کی نشانی قرار دیتا ہے۔

کبھی "سورج" کی قسم کھاتا ہے کہ جو عالمِ ہستی میں قوت و طاقت کا عظیم منبع ہے اور کبھی بہت ہی عام "انجیر" جیسے پھل کی قسم کھاتا ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی قدرت کے سامنے چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وما الجلیل واللطیف والثقیل والخیف، والقوی والضعیف فی خلقہ
الاسواء۔

چھوٹا اور بڑا، بھاری اور ہلکا، قوی اور ضعیف سب اس کی توانائی کے سامنے یکساں ہیں۔ ان تمام مسائل کی دلیل ایک ہی چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کا وجود ایک ایسا وجود ہے کہ جو ہر جہت سے لامتناہی ہے اور "لامتناہی" کے مفہوم پر غور و خوض اس حقیقت کو ابھی طرح ثابت کر دیتا ہے کہ "سخت" اور "آسان"، "چھوٹا" اور "بڑا"، "پہچیدہ" اور "سادہ" جیسے مفہیم صرف محدود موجودات کو پیش آتے ہیں۔ جس وقت لامحدود قدرت کے بارے میں بات ہوتی ہے تو پھر یہ مفہیم بالکل بدل جاتے ہیں اور سب کے سب بلا تفریق ایک ہی صفت میں قرار پاتے ہیں۔

۲۲) وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن جَاءَهُمْ نَذِيرٌ
يَكُونُنَّ أَهْدَىٰ مِنَ الْإِحْدَىٰ الْأَمَمِ ۗ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ
مَا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا ۝

۲۳) اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۗ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ
السَّيِّئِ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۗ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۗ
فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۗ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ
تَحْوِيلًا ۝

۲۴) أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۗ
وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي
الْأَرْضِ ۗ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ۝

ترجمہ

۲۲) انہوں نے انتہائی تاکید کے ساتھ قسم کھائی کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا پیغمبر
ان کے پاس آئے تو وہ سب سے زیادہ ہدایت یافتہ امت ہوں لیکن جب
ان کے پاس پیغمبر آیا تو سوائے فرار اور (حق سے) دوری کے ان میں کسی چیز
کا اضافہ نہ ہوا۔

۲۳) یہ سب کچھ اس بنا پر تھا کہ انہوں نے زمین میں استکبار کیا اور بُری سے بُری

چالیں چلیں لیکن بڑی چالیں زیاں صرف اپنے چلنے والوں کا دامن ہی پھرتی
ہیں۔ کیا انہیں اپنے سے پہلے لوگوں کے ساتھ برتے جانے والے طرز عمل (اور
ان پر ہونے والے سخت عذاب) سے مختلف کی توقع ہے۔ تم ہرگز خدا کے
طریقے میں کوئی تبدیلی نہ دیکھو گے۔ اور ہرگز خدا کی سنت میں کوئی تغیر نہ پاؤ گے۔
۲۴) کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو ان سے پہلے تھے ان کے
ساتھ کیا ہوا؟ (جبکہ) وہ لوگ ان سے زیادہ قوی (اور زیادہ طاقتور تھے) آسمان
اور زمین میں سے کوئی چیز اس کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں جائے گی۔
وہ دانا اور توانا ہے۔

شان نزول

تفسیر در المنثور، روح المعانی، مفاتیح الغیب اور دوسری تفسیروں میں ہے کہ مشرکین عرب جس
وقت یہ سنتے تھے کہ بعض گزشتہ امتوں مثلاً یہودیوں نے خدائی پیغمبروں کی تکذیب کی تھی اور انہیں شدید
کر دیا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ایسے نہیں ہیں اگر خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر ہمارے پاس آئے تو ہم تمام امتوں کی
نسبت زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں گے، لیکن وہی لوگ تھے کہ جب اسلام کا آفتاب عالم تاب
ان کی سرزمین سے طلوع ہوا اور پیغمبر اسلام سب سے عظیم کتاب لے کر ان کے پاس آئے تو نہ صرف
یہ کہ انہوں نے ان کی دعوت قبول نہ کی بلکہ جھٹلایا، طرح طرح کے محروم فریب بھی کیے اور آپ کے خلاف
لڑے بھی۔

زیر نظر آیات اسی ضمن میں نازل ہوئیں اور انہیں ان کھوکھلے اور بے بنیاد دعووں پر ملامت و سرزنش کی ہے

تفسیر

استکبار اور سازشیں - ان کی بد بختی کا سبب

گزشتہ آیات میں مشرکین اور دنیا و آخرت میں ان کے انجام کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث
سے اکثر تفسیر، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

آیات میں بھی وہی بحث جاری ہے۔

پہلی آیت کہتی ہے کہ: انہوں نے انتہائی تاکید کے ساتھ قسم کھائی کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے پاس آئے تو یقیناً وہ تمام امتوں کی نسبت زیادہ ہدایت یافتہ ہوں (و اقموا باللہ جہد ایمانہم لیون جادھو نذیب۔ لیکنون اھدی من احدی الامم) یہ

”ایمان“۔ ”بیمین“ کی جمع ہے اور قسم کے معنی میں ہے۔ ”بیمین اصل میں دائیں ہاتھ کے معنی میں ہے اور چونکہ قسم کھاتے اور عہد باندھتے وقت دائیں ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے اس بنا پر یہ لفظ آہستہ آہستہ قسم کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

”جہد“۔ ”جہاد“ کے مادہ سے سنی دگوشش کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر ”جہد ایمانہم“ کی تعبیر تاکید کی قسم کی طرف اشارہ ہے۔

جی ہاں! وہ جس وقت تاریخ کے صفحات کا مطالعہ کرتے تھے کہ جو گزشتہ امتوں خصوصاً یوں کی اپنے پیغمبروں سے بے وفائیوں، ناشکریوں، وعدہ شکنیوں اور جرائم کی داستان بیان کرتی تھی تو بہت تعجب کرتے تھے اور اپنے بارے میں دعوے اور لاف زنی کیا کرتے تھے۔

لیکن جب تجربے کی کسوٹی اور امتحان کی گرم جھٹی سے گزرے، ان کی خواہش کے مطابق اللہ کی طرف سے رسول آگیا تو انہوں نے ثابت کیا کہ وہ بھی اسی قماش کے ہیں۔ جیسا کہ قرآن اسی آیت کے آخر میں کہتا ہے: جس وقت خدا کی طرف سے خبردار کرنے والا اور ڈرانے والا ان کے پاس آیا تو فرار کرنے اور حق سے دور ہونے کے سوا ان میں کسی چیز کا اصرار نہیں ہوا (فلما جآ آتھم نذیر ما زادھم الا نفورا)۔

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ پہلے بھی اپنے دعویٰ کے برخلاف حق کے طرفدار نہیں تھے۔ دین ابراہیمی کا جو حصہ ان کے پاس تھا وہ اُسے محرم نہیں سمجھتے تھے۔ ہر روز کسی بہانے سے اسے پاؤں کے نیچے روندتے تھے۔ ”مستقلات عتلیہ“ اور علم عقل کی قدر و قیمت کے بھی قائل نہیں تھے۔ جب پیغمبر اسلام نے قیام کیا اور ان کے جاہلانہ تعصب اور ناجائز مفادات پر زد پڑی تو وہ حق سے اور زیادہ

پہلے ایک امدی مفرد ہے لہذا آیت کا معنی پہلی نظر میں یہ ہوگا کہ وہ امتوں میں سے ایک امت سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے کہ جو احتمالاً قوم یہود کی طرف اشارہ ہے (کیونکہ ایشیائے جلیل میں مفرد معوم کا معنی نہیں رکھتا) لیکن جیسا کہ بعض مفسرین نے اشارہ کیا ہے کہ قرآن حال اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کی مراد اس مفرد سے معوم تھا۔ کیونکہ وہ مخالف اور تاکید کے مقام پر تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دعویٰ کریں کہ ان کے درمیان پیغمبر کے مبعوث ہونے کی صورت میں وہ سب امتوں سے آگے نکل جائیں گے۔

دور ہو گئے۔ ہاں! وہ ہمیشہ سے حق سے دور ہی تھے اور اب یہ دوری ہر زمانے کی نسبت زیادہ ہو گئی تھی۔

بعد والی آیت اسی بات کی تشریح ہے کہ جو گزشتہ آیت میں گزر چکی ہے، یہ آیت کہتی ہے: ”حق سے ان کی دوری اس بنا پر تھی کہ انہوں نے زمین میں کبوتر کی راہ اختیار کر رکھی تھی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے تھے (استکباراً فی الارض) یہ

”اور اس بنا پر بھی تھا کہ انہوں نے قبیح اور بُری چالوں کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا“ (ومکر الیہ) یہ ”لیکن یہ بُری چالیں صرف چالباڑوں کے ہی دامن گیر ہوتی ہیں“ (ولا یحییٰ الممکر الیہ الا باھلہ)۔

”لا یحییٰ“۔ ”حاق“ کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے ”نازل نہیں ہوتا، درستی کو نہیں پہنچاتا، اور احاطہ نہیں کرتا“۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو سکتا ہے وقتی طور پر دوسرے لوگ ان کی چالوں کا شکار ہو جائیں لیکن آخر کار وہ جیلہ سازی خود جیلہ سازی کی طرف لوٹتی ہے۔ اُسے مخلوق خدا کے سامنے رسوا اور بدنام کرتی ہے اور بارگاہِ خدا میں شرمسار کرتی ہے۔ اور یہی رسوائی مشرکین مکر نے حاصل کی۔

درحقیقت یہ آیت کہتی ہے کہ انہوں نے صرف خدا کے عظیم پیغمبر سے دوری اختیار کرنے پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ آپ پر ضرب لگانے کے لیے اپنی پوری طاقت سے مدد لی اور اس کا اصل سبب اور محرک کبر و غرور اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنا تھا۔

اس آیت کے آخر میں اس مسکبر، مکار اور خیانت کار گروہ کو ایک پُر معنی اور بلا دینے والے جملے کے ساتھ تہدید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ”کیا انہیں گزشتہ لوگوں کے سے انجام کے علاوہ کسی اور کی توقع ہے؟“ (فهل یبظرون الا سنت الاولین) یہ

یہ مختصر جملہ تمام سرکش اقوام مثلاً قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم فرعون کے بُرے اور منحوس انجام

بہت سے مضمون ختم کیا ہے کہ استکباراً ترکیب نحوی کے لحاظ سے ”مفعول لہ“ ہے اور ”نفور“ اور حق سے دور ہونے کی علت کا بیان ہے اور ”مکر الیہ“ کو اس پر عطف سمجھتے ہیں اور بعض نے اسے ”نفوراً“ پر عطف سمجھا ہے۔

”مکر الیہ“ جنس کی نوع کی طرف اصناف کے قبیل سے ہے جیسے علم الفقه کیونکہ مکر قسم کی چارہ جاتی اور تدبیر کے معنی میں ہے چاہے بُری ہو یا اچھی، اسی لیے کہی اس کی خدا کی طرف بھی نسبت دی گئی ہے مثلاً ”ومکروا ومکر اللہ (آل عمران ۷۵) لیکن ”سیحی“ مکر کی ایک خاص نوع ہے کہ جو جیلہ سازی اور چال بازی ہے۔

”نظر“ اور ”انتظار“ جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے کہی ایک ہی معنی میں آتے ہیں۔

اور ان کے آثار کے اندر پہنچ کر خود اپنی آنکھ سے دیکھیں تاکہ بات عین یقین میں بدل جاسے۔
 فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے زمین میں پل بھر کر نہیں دیکھا کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا کہ جو ان سے پہلے تھے (اولو سیروا فی الارض فی نظر واکیف کان عاقبة الذین من قبلہم)۔
 اگر یہ لوگ تصور کرتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ طاقتور ہیں تو انتہائی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ وہ ان سے زیادہ قوی اور طاقتور تھے (وکانوا اشد منہم قوۃ)۔

وہ (موتی کی جنموں نے سرزمین مصر کو اپنے اقتدار کی جولان گاہ بنایا ہوا تھا اور وہ فردی کہ جنموں نے اپنی ہمدی طاقت و قوت کے ساتھ بابل کی دیہ سرزمین اور دوسرے ملکوں پر حکومت کی تھی اتنے قوی تھے کہ موت کے بت پرست تو ان کے مقابلے میں کسی شمار و قطار میں بھی نہیں۔

علاوہ ازیں انسان خواہ جتنے بھی طاقتور اور قوی ہوں، ان کی طاقت خدا کی قدرت کے مقابلے میں صفر ہے کیونکہ نہ کوئی چیز آسمان میں سے اور نہ ہی زمین میں سے، اس کی قدرت کے احاطے سے نہیں نکل سکتی اور نہ ہی اسے عاجز و ناتواں کر سکتی ہے۔ (وما کان اللہ لیعجزہ من شیء فی السواوات ولا فی الارض)۔

وہ دانابھی ہے اور توانابھی۔ نہ کوئی چیز اس کی بنگاہ سے مخفی رہ سکتی ہے اور نہ ہی کوئی کام اس کی قدرت کے سامنے مشکل ہے اور نہ ہی کوئی شخص اس پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ دل کے اندھے، ہیکبر اور مکلا جید اگر یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اس کی قدرت کے چنگل سے بھاگ کر نکل سکتے ہیں تو یہ ان کی کورہ چشمی ہے اور اگر وہ اپنے قبیح اور شرمناک اعمال سے دستبردار نہ ہوں گے تو وہ بھی آخر کار گرز سے ہرنے سرکشوں کے سے ہولناک انجام میں گرفتار ہوں گے۔

قرآن مجید میں بار بار یہ مطلب ہمارے سامنے آیا ہے کہ خدا بے ایمان اور سرکش افراد کو زمین میں سیر کرنے اور ان اقوام کے آثار کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتا ہے جو عذاب الہی میں گرفتار ہوتے۔
 سورہ روم کی آیہ ۹ میں ہے:

اولو سیروا فی الارض فی نظر واکیف کان عاقبة الذین من قبلہم
 کانوا اشد منہم قوۃ واثاروا الارض وعمروها اکثر مما عمروها ووجآوتھم
 رسلھم بالبینات فما کان اللہ لیظلمھم ولكن کانوا انفسھم یظلمون
 ”کیا انہوں نے زمین میں سیر نہیں کی تاکہ وہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا کہ جو

لیعجزہ، جیسا کہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں، اعجاز سے ہے اور عاجز کرنے کے معنی میں ہے اسی بنا پر بہت سے مواقع پر قہر و قدرت سے فرار نہ کر سکتے یا کسی پر قابو نہ پانے کے معنی میں آیا ہے۔

ان سے پہلے تھے۔ وہی کہ جو ان سے زیادہ قوت رکھتے تھے اور انہوں نے زمین کو دگرگوں کیا اور زمین پر ان کی آبادی ان سے زیادہ تھی اور ان کے پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ ان کے پاس آئے تھے مگر وہ اپنی خود سری پر قائم رہے اور خدا کے دردناک عذاب میں گرفتار ہوئے، خدا نے ہرگز ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔
 یہی مطلب سورہ یوسف کی آیہ ۱۰۹ میں،
 سورہ حج کی آیہ ۲۶ میں،
 سورہ تہمیں کی آیہ ۱۲۱ اور ۸۲ میں

اور سورہ انعام کی آیہ ۱۱ میں اور قرآن کی بعض دوسری سورتوں میں بھی بیان ہوا ہے۔
 یہ سکر تاکیدیں انسانوں کے نفس میں ان مشاہدات کے بہت اثر انداز ہونے کی دلیل ہیں۔ انہیں ان مقامات پر جانا چاہیے اور جو کچھ انہوں نے تاریخ میں پڑھا ہے یا لوگوں سے سنا ہے اسے آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔

وہ جاہیں اور فرعونوں کے اٹے ہوئے تخت، بادشاہان کسریٰ کے دیران مجلات، قیصروں کی کھڑی موتی قبروں اور فرودوں کی بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیوں اور قوم لوط و ثمود کی تباہ شدہ سرزمینوں کو قریب سے دیکھیں، خاموش آثار کے پند و نصائح سنیں، مٹی کے اندر سونے والوں کی فریادوں پر کان دھریں اور جو کچھ انجام کار ان کے اوپر آنے والا ہے اسے اپنی آنکھ سے دیکھیں۔

ایک معاصر شاعر نے اس سلسلے میں بہت عمدہ اشعار کہے ہیں اور اس قرآنی حقیقت کو مصر کے سفر اور فراعزہ کے آثار دیکھنے کے بعد بہت ہی لطیف، پرکشش اور بلا دینے والے اشعار میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

بمصر فرم و آثار باستان دیدم بر مصر آنچه شنیدم ز داستان دیدم
 بسی چنین دچساں خواندہ بودم از تاریخ بر مصر از توچه پنهان کہ بر عیاں دیدم
 تو کاخ دیدی دمن شکشاں در دل خاک ہنوز در طلب ملک جاوداں دیدم
 تو تاج دیدی دمن ملک ز رفہ بر تاراج تو عاج دیدی دمن مشبہ آسمان دیدم
 تو تخت دیدی دمن بخت نازگول انخت تو صخرہ دیدی دمن صخرہ زماں دیدم
 گوشہ در دل آئیدہ آنچه پنهان داشت بر مصر از توچه پنهان کہ بر عیاں دیدم

میں مصر گیا اور آثار قدیمہ دیکھے مصر کی جو داستان سنی تھی اُسے خود دیکھا۔

بہت سی ایسی ایسی باتیں تاریخ میں پڑھی تھیں اور مصر میں بہت سی چیزیں جو تھہ سے پنهان ہیں انہیں عیاں دیکھا۔
 ٹوٹنے لگ دیکھا اور میں نے مٹی میں سونے والے دیکھے جو ابھی تک ملک جاوداں کے طالب ہیں۔ (بیتہ عاشقہ اگلے صفحہ پر)

اشد کی وسیع رحمت کے ذکر سے ہوا تھا۔ اس طرح سے اس کے آغاز و اختتام پر رحمت الہی کا بیان ہے۔ گزشتہ آیت بے ایمان مجرموں کو گزشتہ لوگوں کی سرنوشٹ کے حوالے سے تہدید کرتی ہے۔ اس لیے بہت سے لوگوں کے سامنے یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اگر تمام سرکشوں کے بارے میں سنت الہی یہی ہے تو پھر مکہ کی اس مشرک اور سرکش قوم کو خدا سزا کیوں نہیں دیتا؟

اس سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے: اگر خدا تمام لوگوں کو ان اعمال کی بنا پر کہ جو انہوں نے انجام دیتے ہیں سزا دے (اور اصلاح، تجدید نظر اور خود سازی کے لیے انہیں کچھ بھی مہلت نہ دے) تو پھر کسی بھی جاندار کو زمین پر باقی نہ چھوڑے گا (ولو یؤاخذ اللہ الناس بما کسبوا ما ترک علی ظہرہا من دابۃ)۔

ایسے پلے در پلے عذاب نازل ہوں اور بجلیاں، زلزلے اور طوفان ظالم گنہگاروں کی سرکوبی کریں کہ زمین کسی کے لیے زندہ رہنے کی جگہ نہ رہے۔

لیکن خدا اپنے لطف و کرم سے انہیں معین زمانے تک تاخیر میں ڈالے گا اور انہیں توبہ و اصلاح کی مہلت دے گا۔ (ولکن یؤخرہم الی اجل مستقی)۔

لیکن یہ علم اور خدائی مہلت ایک حساب سے ہوتی ہے۔ یہ اس وقت تک کے لیے ہے کہ ان کی اہل آن پہنچے گی تو ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا کیونکہ خدا اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے، وہ ان کے اعمال کو بھی دیکھ رہا ہے اور ان کی نیوتوں سے بھی باخبر ہے۔ (فاذا جاء اجلہم فان اللہ کان بعبادہ بصیراً)۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں جن کا جواب اس سے کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے واضح ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ یہ حکم عام کہ اگر خدا لوگوں کو ان کے اعمال کی وجہ سے سزا دے تو کوئی بھی صفحہ زمین پر باقی نہ بچے گا، انبیاء و اولیاء اور صالحین کو بھی شامل کر لیتا ہے۔

۱۔ "اذا جاء اجلہم" کا جملہ شرط ہے اور اس کی جزا مقدر ہے یہ واقع میں اس طرح تھا:

فاذا جاء اجلہم یجازی کل احد بما عمل۔

اس بنا پر "فان اللہ" کا جملہ جزا کی علت ہے کہ جو محذوف معلول کا جانشین ہوا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "لا یستأخرون ساعة ولا یستقدمون" کی جزا ہو کہ جو قرآن کی دوسری آیات مثلاً سورہ نمل کی آیہ ۶۱ میں بیان ہوئی ہے۔

تو اس بنا پر "فان اللہ کان بعبادہ بصیراً" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ سب کو پہچانتا اور جاننا ہے کہ کس کی اہل آن پہنچی ہے، تاکہ اسے اپنی قدرت کے ذریعے پکڑ لے۔

۲۵ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهِرِهَا مِنْ دَابَّةٍ وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسْتَقَيٍّ ۗ فَاِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللَّهَ كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۲۵ اور اگر خدا لوگوں کو ان کاموں کی وجہ سے کہ جو انہوں نے انجام دیتے ہیں سزا دے تو زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا جاندار باقی نہ چھوڑے، لیکن (وہ اپنے لطف سے) انہیں ایک معین مدت تک تاخیر میں ڈالے گا (اور انہیں مہلت دے گا تاکہ وہ اپنی اصلاح کر لیں) لیکن جب ان کی اہل آجائے گی (تو پھر خدا ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا) کیونکہ وہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے (اور سب کے اعمال و نیات سے آگاہ ہے)۔

تفسیر

اس کا لطف نہ ہوتا تو کوئی جاندار زمین پر باقی نہ رہتا

زیر نظر آیت سورۃ قلم کی آخری آیت ہے۔ اس سورہ کی گزشتہ آیات میں تند و تیز بحثیں اور شدید تہدیدیں تھیں اور آخری آیت میں پروردگار کے لطف و رحمت کا بیان ہے۔ جیسے اس سورہ کا آغاز لوگوں پر

(بیتہ حاشیہ گزشتہ صفحہ): تو نے تاج دیکھا اور میں نے کراچ شدہ ملک دیکھا، تو نے ہاتھی دانت دیکھے اور میں نے نشی بھر پڑیاں دیکھیں۔

تو نے تخت دیکھا اور میں نے ہرنگوں شہ بخت دیکھا، تو نے پتھر دیکھے اور میں نے زلزلے کو ان کا مذاق اڑاتے دیکھا۔

ہاں میں نے ہر آنے والے کے دل میں جو کچھ چھپایا ہوا تھا وہ بہت کچھ صحر میں میں نے میاں دیکھا ہے۔

زمین میں برسر کرنے اور خدا کے آثار عجیب کا مطالعہ کرنے اور اسی طرح گزشتہ لوگوں کے آثار اور ان کے روح انسان کی تربیت

کے لیے بے حد انعامات کے سلسلے میں ہم نے سورہ آل عمران کی آیہ ۱۳۷ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔

اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ اس قسم کے احکام عامۃ الناس اور اکثریت قاطعہ سے متعلق ہیں۔ انبیاء و ائمہ اور صالحین کو جو اقلیت میں ہیں مسئلہ طور پر اس سے خارج ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر حکم اس وقت تک رہتا ہے اور وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بعینہ اس طرح ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں اہل جہان غافل ہیں، عربیں ہیں اور مغزور ہیں اور اس سے مراد ان کی اکثریت ہے۔

سورہ روم کی آیہ ۱۴ میں ہے:

ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ابدی الناس لیدیقہم بعض الذی عملوا العلم یرجعون

”لوگوں کے اعمال کی وجہ سے خشکی اور تری میں غزالی آشکار ہو گئی ہے، خدا چاہتا ہے کہ ان کے اعمال کے بعض نتائج انہیں چکھائے تاکہ وہ پلٹ آئیں۔“

ظاہر ہے کہ یہ غزالی تمام لوگوں کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اکثریت پر نظر ہے۔

اسی سورہ کی آیہ ۳۲ جو انسانوں کو تین گروہوں - ظالم، درمیانے اور ”سابق بالخیرات“ میں تقسیم کرتی ہے، اس معنی پر ایک اور گواہ ہے۔

اس بنا پر زیر بحث آیت عصمت انبیاء سے کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا زیر بحث آیت میں ”دابۃ“ (چلنے پھرنے والا) غیر انسانوں کے لیے بھی ہے یعنی وہ بھی انسانوں کی سنزائی بنا پر ختم ہو جائیں گے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دوسرے جانداروں کے وجود کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان ان سے فائدہ اٹھائیں اور جب نسل بشر ہی ختم کر دی جائے تو پھر ان کے وجود کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

آخر میں ہم اس بحث کو پیغمبر اکرم کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں کہ جو آخری آیت کی تفسیر میں بیان ہوئی ہے۔

اس حدیث کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

”خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ اسے آدم کے بیٹے تو میرے ارادے اور مشیت کے مطابق آزاد پیدا کیا گیا ہے کہ تو جو کچھ اپنے لیے چاہے اختیار کر سکتا ہے اور تو میرے ارادے کے ساتھ صابرا اور“

ہو اسے تو جو کچھ اپنے لیے ارادہ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ ان نعمتوں کے ذریعے کہ جو میں نے تجھے دی ہیں تو نے قوت حاصل کی ہے اور میری عصمت کا مرتکب ہوا ہے اور میری عطا کردہ قدرت و عافیت کے ساتھ تو میرے فرائض کو ادا کر سکتا ہے۔ اس بنا پر میں تیرے حسنات اور نیکیوں کے سلسلے میں خود تجھ سے ادنیٰ ہوں اور تو اپنے گنہوں کے سلسلے میں مجھ سے ادنیٰ ہے میری طرف سے ان نعمتوں کے ذریعے کہ جو میں نے تجھے دی ہیں ہمیشہ خیرات ہی پہنچی ہیں اور تیری طرف سے تیرے جرائم کی بنا پر ہمیشہ شر اور برائی تجھ تک پہنچی ہے۔ میں نے تجھے انذار کرنے اور ہند و نصیحت کرنے میں ہرگز کوئی کسر نہیں چھوڑی اور مغزور و غفلت کے موقع پر میں نے تجھے فوراً سزا نہیں دی (بلکہ میں نے توبہ و اصلاح کے لیے تجھے کافی مہلت دی)۔

اس کے بعد پیغمبر نے فرمایا کہ یہ وہی چیز ہے کہ جس کے متعلق خدا فرماتا ہے کہ:

”ولویق اخذ اللہ الناس بما کیوا ما ترک علی ظہرہا من دابۃ“

پروردگارا! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جو موقع نکل جانے سے پہلے بیدار ہو جاتے ہیں اور تیری طرف پلٹ آتے ہیں اور اپنے تاریک ماضی کو حسنات کے نور اور تیری رضائے روشن کرتے ہیں۔ بارالہ! اگر تیری رحمت شامل حال نہ ہوتی تو وہ آگ کہ جو ہمارے بُرے اعمال کے اندر سے بھڑکتی ہیں نکل جاتی اور اگر تیری بخشش کے نور اور روشنی کا ہمارے دل پر چھڑکاؤ نہ ہوتا تو شیطان کا لشکر اس پر قبضہ کر لیتا۔ خداوند! ہمیں ہر قسم کے شرک سے محفوظ رکھ اور ایمان اور خالص توحید کا چراغ ہمارے دل میں روشن فرما اور ہماری گفتار و اعمال میں تقویٰ کی روشنی زیادہ کر دے۔

سورہ فاطر کا اختتام

۱۲ رجب ۱۴۰۲ ہجری

”دابۃ“ وہی ہے کہ ”داب“ سواری کے جانوروں کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

سورۃ یس

، مکہ میں نازل ہوئی
، اس کی ۸۳ آیات ہیں

*

تاریخ آغاز ۱۳ رجب الخیر ۱۲۰۲ ہجری

روز ولادت باسعادت امام المتقین

امیر المؤمنین علی علیہ السلام

جعلنا اللہ من شیعته ومحبیہ

ورزقنا شفاعتہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورۃ یس کے مضامین

جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس بنا پر اس کے مضامین بالکل سبکی سورتوں کے سے ہیں یعنی توحید، معاد، وحی، قرآن اور نذارت و بشارت سے متعلق گفتگو۔ اس سورہ میں چار حصے خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں :

- ۱۔ سب سے پہلے پیغمبر اسلام کی رسالت، قرآن مجید، اس آسمانی کتاب کے نازل کرنے کا مقصد اور اس کے گردیدہ ہونے والوں کا بیان ہے اور یہ بیان آیہ ۱۱ تک جاری رہتا ہے۔
- ۲۔ اس سورہ کے دوسرے حصے میں انبیاء الہی میں سے تین کی رسالت اور توحید کی طرف ان کی دعوت کی کیفیت اور شرک کے خلاف ان کے مسلسل اور زبردست معرکے کے بارے میں بیان ہے کہ جو درحقیقت پیغمبر اسلام کو ایک قسم کی تسلی ہے اور انہیں اس عظیم ذمہ داری کی انجام دہی کی راہ دکھائی گئی ہے۔
- ۳۔ اس سورہ کا تیسرا حصہ آیہ ۳۳ سے شروع ہوتا ہے اور آیہ ۴۴ تک چلتا ہے یہ توحید کے پرکشش نکات سے سمور ہے اور عالم ہستی میں پروردگار کی نشانیوں کا صحیح و بلیغ بیان ہے۔ اس کے بعد پھر اسی بحث توحید اور آیات الہی کے بیان کی طرف بازگشت ہے۔
- ۴۔ اس سورہ کا ایک اہم حصہ معاد و قیامت سے مربوط مسائل، اس کے مختلف دلائل و شہود و شرکی کیفیت قیامت کے دن سوال و جواب، عالم کے انتقام اور جنت و جہنم کے بارے میں بیان پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں بہت ہی اہم اور دقیق نکتے پوشیدہ ہیں۔
- ان چاروں مباحث کے درمیان غفلوں اور بے خبروں کی بیداری کے لیے بلا دینے والی آیات آئی ہیں جو قلب و روح کے لیے بہت اثر آفریں ہیں۔
- خلاصہ یہ کہ اس سورہ میں انسان خلقت، قیامت، موت و حیات اور نذارت و بشارت کے مختلف مناظر کا سامنا کرتا ہے کہ جس سے مجموعی طور پر ایک بیدار کن اور شفا بخش نسخہ تیار ہوتا ہے۔

سورہ یس کی فضیلت

متعدد احادیث کی گواہی کے مطابق یہ قرآن کی ایک نہایت اہم سورہ ہے۔ اس طرح سے کہ احادیث میں اسے "قلب قرآن" کہا گیا ہے۔
ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے :

ان لكل شئ قلباً وقلب القرآن يس
 "ہر چیز کا ایک دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یس ہے"۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے بھی یہی مطلب منقول ہے۔ اس کے ذیل میں امام زید فرماتے ہیں:

فمن قرء يس في نهاره قبل ان يمسي كان في نهاره من المحفوظين والمرزوقين حتى يمسي. ومن قرأها في ليله قبل ان ينام وكل به الف ملك يحفظونه من كل شيطان رجيم ومن كل آفة.

"جو شخص سورہ یس کو غروب سے پہلے دن میں پڑھے تو سارا دن محفوظ اور روزی سے بھرا رہے گا اور جو اسے رات کو سونے سے قبل پڑھے تو خدا ایک ہزار فرشتے اس پر مامور کرتا ہے جو شیطان مردود اور ہر آفت سے اس کی حفاظت کرتے ہیں..."

اس کے علاوہ پیغمبر اکرم کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

سورة يس تدعى في التوراة المعمة قيل وما المعمة؟ قال نعم صاحبها خير الدنيا والآخرة...

"سورہ یس تو رات میں "عمومیت آفرین" کے عنوان سے موسوم ہوتی ہے۔ پوچھا گیا

کہ اسے عمومیت آفرین کیوں کہا جاتا ہے؟ فرمایا کہ اس بنا پر کہ جو شخص اس سورہ کا ہمدم اور ہم نشین ہو اسے تمام خیر دنیا و آخرت سے نوازا جاتا ہے..."

اہل تشیع اور اہل سنت کی کتابوں میں دوسری روایات بھی اس سلسلے میں وارد ہوتی ہیں۔ اگر ہم ان سب کو نقل کرتا چاہیں تو گفتگو طویل ہو جائے گی۔

اس طرح سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شاید قرآن مجید میں بہت کم ایسی سورتیں ہوں گی کہ جو ان تمام فضائل کی حامل ہوں۔

جیسا کہ بار بار بیان کیا گیا ہے یہ فضیلت ان لوگوں کے لیے نہیں جو صرف الفاظ پڑھتے ہیں اور ان کے مغاہم کو طاق نسیان پر رکھ دیتے ہیں بلکہ یہ عظمت اس سورہ کے عظیم مضامین اور مطالب کی بنا پر ہے۔

بیدار کرنے والے، ایمان پہنچنے والے، ذمہ داروں کا احساس دلانے والے اور تقویٰ بیدار کرنے والے مضامین کہ جب انسان ان پر غور و فکر کرتا ہے اور یہ غور و فکر اس کے اعمال میں سایہ فگن ہو جاتا ہے

تو پھر دنیا و آخرت کی بھلائی کا سبب بن جاتا ہے۔

مثلاً اس سورہ کی آیہ ۹۰ میں ایک پیمان کے بارے میں ذکر ہے کہ جو خدا نے تمام اولاد آدم سے لیا ہے کہ شیطان کی پرستش نہ کریں کیونکہ شیطان ایک کھلا دشمن ہے۔

الم اعهد اليكم يا بني اذ ان لا تعبدوا الشيطان انه لكم عدو مبين

یہ بات واضح ہے کہ جب انسان اس پیمان الہی کا پابند ہوگا۔ جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث میں بیان ہوا ہے۔ تو وہ ہر شیطان رجیم سے امان میں ہوگا لیکن اگر اس آیہ کو سرسری طور پر پڑھے اور عمل میں وہ شیطان کا مخلص دوست اور یار و فادار ہے تو پھر وہ اس عظیم افتخار کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اس سورہ کی ہر ہر آیت اور کلمے کے پیش نظر انسان کو اپنا عاصبہ کرنا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

- ۱ یَسَّ
- ۲ وَالْقُرْآنِ الْحَکِیْمِ
- ۳ اِنَّكَ لَعِنَ الْمُرْسَلِیْنَ
- ۴ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ
- ۵ تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ
- ۶ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا اُنذِرَ اَبَاؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ
- ۷ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰی اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ
- ۸ اِنَّا جَعَلْنَا فِیْ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلَالًا فَهٰی اِلَیَّ الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ
- ۹ وَجَعَلْنَا مِنْ بَیْنِ اَیْدِيْهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَعْشٰنُهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ
- ۱۰ وَسَوَاءٌ عَلَیْهِمْ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱ یَسَّ
- ۲ قرآن حکیم کی قسم!

- ۳ یقیناً تو (خدا کے) رسولوں میں سے ہے۔
- ۴ صراطِ مستقیم پر۔
- ۵ (یہ قرآن) خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے نازل ہوا ہے۔
- ۶ تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے کہ جن کے آباؤ اجداد کو ڈرایا نہیں گیا تھا اسی لیے وہ غافل ہیں۔

- ۷ ان میں سے اکثر کے بارے میں (اللہ کا) فرمان حق ہو کر آچکا ہے اسی بنا پر وہ ایمان نہیں لاتے۔
- ۸ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں کہ جو ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوتے ہیں اور اس لیے انہوں نے سروں کو اوپر کر رکھا ہے۔
- ۹ ہم نے ان کے سامنے بھی ایک دیوار بنا دی ہے اور ان کے پیچھے بھی ایک دیوار بنا دی ہے اور ان کی آنکھوں کو ہم نے ڈھانپ دیا ہے۔ اس لیے وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے۔
- ۱۰ ان کے لیے یکساں ہے چاہے تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر

”قلب قرآن کا آغاز“

یہ سورت قرآن مجید کی دوسری ۲۸ سورتوں کی طرح حروف مقطعات کے ساتھ شروع ہوتی ہے (یا اور سین)۔
ہم نے حروف مقطعات کی تفسیر کے بارے میں سورہ بقرہ، آل عمران اور اعراف کی ابتدا میں

مفصل گفتگو کی ہے یہ

لیکن خصوصیت کے ساتھ سورہ یسین میں ان حروف مقطعه کے لیے کچھ اور تفسیریں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لفظ مرکب ہے "یا۔ حرف ندا اور۔ سین۔ سے یعنی ذات پیغمبر اسلام سے اور اس طرح سے پیغمبر اکرم کو بعد دوائے مطالب کے بیان کرنے کے لیے مخاطب کیا گیا ہے۔ مختلف احادیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ یہ لفظ پیغمبر گرامی اسلام کے ناموں میں سے ایک نام ہے یہ

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہاں مخاطب انسان ہے "سین" اس کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ احتمال بعد والی آیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ ان آیات میں روئے سخن صرف پیغمبر اکرم کی طرف ہے۔ اسی لیے ایک روایت میں امام صادق سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

یقن اسم رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم والدليل على ذلك قوله تعالى انك لمن المرسلين على صراط مستقيم۔

"یسین رسول خدا کا نام ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تو مرسلین میں سے ہے اور صراط مستقیم پر ہے" (نور الثقلین جلد ۱ ص ۳۷۵)۔

ان حروف مقطعه کے بعد۔ بہت سی ان سورتوں کی طرح کہ جو حروف مقطعه سے شروع ہوتی ہیں۔ قرآن مجید کے بارے میں گفتگو ہے۔ البتہ یہاں قرآن کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے "والقرآن حکیم" (قرآن حکیم کی قسم)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی "حکیم" کے ساتھ توصیف کی گئی ہے جبکہ حکمت عام طور پر زندہ اور عاقل شخص کی صفت ہے۔ گویا قرآن کا زندہ و عاقل اور رہبر و پیشوا کے طور پر تعارف کروایا جا رہا ہے کہ جو حکمت کے دروازے انسانوں کے سامنے کھول سکتا ہے اور اس صراط مستقیم کی طرف کہ جس کی طرف بعد والی آیات میں اشارہ کیا ہے، رہنمائی کر سکتا ہے۔

البتہ خدا قسم کھانے کا محتاج نہیں ہے لیکن قرآن کی قسمیں ہمیشہ دو اہم فوائد کی حامل ہوتی ہیں۔ پہلا کسی مطلب کی تاکید کے لیے اور دوسرا اس چیز کی عظمت بیان کرنے کے لیے کہ جس کی قسم کھائی جا رہی ہے۔

تفسیر نمونہ جلد اول، جلد دوم اور جلد چہارم میں مذکورہ سورتوں کے آغاز کی طرف رجوع فرمائیں۔

نور الثقلین، جلد ۱ ص ۳۷۵ و ۳۷۶۔

کیونکہ کوئی بھی شخص کم قدر و قیمت موجودات کی قسم نہیں کھاتا۔

بعد والی آیت اس چیز کو کہ جس کی خاطر پہلی آیت میں قسم کھائی گئی تھی بیان کرتی ہے، فرمایا گیا ہے: "یقیناً تو خدا کے رسولوں میں سے ہے" (انك لمن المرسلين)۔

"ایسی رسالت کہ جو حقیقت اور تیرے صراط مستقیم پر ہونے سے منک ہے" (على صراط مستقيم) یہ پھر مزید ارشاد ہوتا ہے: "یہ وہ قرآن ہے جو خدا نے عزیز و رحیم کی طرف سے نازل ہوا ہے" (تنزيل العزيز الرحيم) یہ

خدا کے "عزیز" ہونے کا ذکر اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ وہ اس قسم کی عظیم اور شکست ناپذیر کتاب پر قدرت رکھتا ہے کہ جو تمام زمانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک معجزہ کی صورت میں باقی رہے گی اور کوئی طاقت اس کی عظمت کو دلوں سے محو نہیں کر سکتی۔ خدا کی "رحیمیت" کا ذکر یہ حقیقت بیان کرنے کے لیے ہے کہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ اس قسم کی عظیم نعمت انسانوں کو دے۔

بعض مفسرین نے ان دو اوصاف کو دو قسم کے رد عمل کا بیان سمجھا ہے جو ممکن ہے اس کتاب آسمانی کے نزول اور اس رسول کے بھیجے پر لوگوں کی طرف سے ظاہر ہو۔

اگر وہ انکار پر تامل جائیں تو خدا نے انہیں اپنی عزت و قدرت کے ساتھ تہدید کی ہے اور اگر اسے دل سے تسلیم اور قبول کر لیں تو خدا نے انہیں اپنی رحمت کی بشارت دی ہے یہ

اس بنا پر اس نے اپنی عزت و رحمت کو باہم ملا دیا ہے۔ جن میں سے عزت ڈراوے کی منظر ہے اور

۱۔ "علی صراط مستقیم" کی ترکیب کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض "جادو مجرد" کو "موسلمین" سے متعلق جانتے ہیں، جس کا مفہوم یہ ہے کہ "تیری رسالت جادو" مستقیم پر ہے۔ بعض نے اسے خبر کے بعد خبر جانا ہے، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تو صراط مستقیم پر قائم ہے بعض نے اسے موضع نصب میں "حال" ہونے کے معنی میں لیا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تو مرسلین میں سے ہے جبکہ تو صراط مستقیم پر ہے (البتہ معنی کے لحاظ سے ان تینوں احتمالوں میں چنداں فرق نہیں ہے)۔

۲۔ "تنزیل" کا منسوب ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ فعل مقدر کا مفعول ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا،

۳۔ "تنزیل" کے معنی میں "تنزیل العزیز الرحیم" اس جملے کی ترکیب کے بارے میں دوسرے احتمال بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

۴۔ تفسیر کبیر، فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

رحمت بشارت کی نظر ہے گویا اس نے اپنی عزت و رحمت کی بنا پر عظیم آسمانی کتاب انسانوں کو دی ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی پیغمبر یا آسمانی کتاب کی حقانیت کو قسم اور تاکید کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کا جواب خود زیر نظر آیات میں چھپا ہوا ہے کیونکہ ایک طرف تو قرآن کی حکیم ہونے کے ساتھ توصیف کی گئی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی حکمت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اور اپنی حقانیت کی دلیل آپ ہے۔

دوسری طرف یہ کہ پیغمبر کی صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کے ساتھ توصیف کی گئی ہے یعنی ان کی دعوت کے مطالب خود یہ بات بیان کرتے ہیں کہ ان کی راہِ سیدھی ہے۔ ان کی سابعہ زندگی کے حالات بھی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ صراطِ مستقیم کے سوا ان کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

ہم نے انبیاء کی حقانیت کے دلائل میں اس مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کی حقانیت کو معلوم کرنے کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی دعوت کے مضامین و مطالب کا بڑے غور کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ اگر وہ فطرت، عقل اور وجدان کے ساتھ ہم آہنگ ہوں اور ایسی سطح پر ہوں کہ جو ایک انسان کے بشری قوت کے ساتھ ممکن نہ ہوں، اس کے علاوہ خود پیغمبر کی زندگی کے سابعہ حالات بھی ایسے ہوں کہ جو اس بات کی نشاندہی کریں کہ وہ امین و صادق ہے اور اس میں دروغ و فریب نہیں ہے تو یہ امور اس بات کے زندہ قرآن ہوں گے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا ہے اور زیر بحث آیات حقیقت میں ان ہی دو مطالب کی طرف اشارہ ہیں۔ اس بنا پر یہ قسم اور دعویٰ ہرگز بے دلیل نہیں ہے۔

اس سے قطع نظر، فن مناظرہ کے لحاظ سے، ہٹ دھرم منکرین کے دلوں میں نفوذ کے لیے جس قدر زیادہ علم، زیادہ قاطع اور بیشتر تاکید کے ساتھ جہادیں آئیں گی اتنا ہی وہ ان پر اثر انداز ہوں گی۔

پھر ایک اور سوال سامنے آتا ہے کہ اس جملے میں ذاتِ پیغمبر کو کیوں مخاطب کیا گیا ہے اور مشرکین اور عام لوگوں کو کیوں نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مقصد یہ تھا کہ اس بات کی تاکید کی جائے کہ تو حق پر اور صراطِ مستقیم پر ہے، چاہے وہ قبول کریں یا نہ کریں۔ بنا بریں تو اپنی عظیم ذمہ داری کی ادائیگی میں کوشاں رہ اور مخالفین کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے خفایت میں ہرگز کمی نہ آنے دے۔

بعد والی آیت نزول شد ان کے اصل مقصد کو اس طرح پیش کرتی ہے:

”ہم نے تجھ پر مشرکان نازل کیا ہے تاکہ تو اس قوم کو خیر داور کرے کہ جن کے آبار و اجداد کو خیر دار نہیں کیا گیا۔ اس بنا پر وہ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں (لننذر قومًا ما

اننذر انبا وھنر فھنر غافلون ہٹ
یعنی اس قوم سے مراد وہی مشرکین عرب ہیں جو سکتا ہے یہ کہا جائے کہ کوئی قوم انذار کرنے والے کے بغیر نہیں تھی اور زمین بھی ججت خدا سے خالی نہیں رہی، اس کے علاوہ سورہ فاطر کی آیت ۲۲ میں یہ بیان ہوا ہے کہ:

وان من ائمة الاخلا فیھا نذیر

”کوئی امت ایسی نہیں تھی کہ اس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو“

اس کا جواب یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں ایسا عظیم اور آشکار ڈرانے والا پیغمبر مراد ہے کہ جس کی شہرت ہر جگہ پہنچی ہوئی ہو۔ ورنہ مشاق اور طالبانِ حق کے لیے ہر زمانے میں ججت الہی موجود ہوتی ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے دور اور پیغمبر اسلام کے درمیانی عرصہ کو فرمت کا زمانہ شمار کرتے ہیں تو یہ اس معنی میں نہیں کہ ان کے لیے ججت خدا مطلقاً موجود ہی نہیں تھی، بلکہ یہ عظیم اور اولوالعزم پیغمبروں کے لحاظ سے فرمت کا زمانہ تھا۔

امیرالمومنین علیؑ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

ان اللہ بعث محمدًا ولس احدا من العرب یقرہ کتابا ولا یدعی نبوة۔

اس بارے میں کہ اد پر والی آیت میں ”ما“ نافیہ ہے یا کوئی اور، مختلف احتمال ذکر کیے گئے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اسے ”نافیہ“ قرار دیا ہے اور ہم نے بھی مذکورہ بالا تفسیر میں ہی معنی اپنایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً ”فھنر غافلون“ اس معنی پر گواہ ہے کہ چونکہ انذار کرنے والے کا نہ ہونا غفلت کا سبب بنا ہے۔ سورہ سجدہ کی آیت میں بھی اسی بات پر شاہد ہے، جہاں قرآن کہتا ہے،

لننذر قومًا ما اتاہم من نذیر من قبلک لعلھم یمتدون

مقصد یہ ہے کہ تو ایسی قوم کو انذار کرے کہ جس کے لیے تجھ سے پہلے کوئی انذار کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت حاصل کریں۔

بعض ”ما“ کو موصول سمجھتے ہیں کہ جس سے اس کا منبوع یہ ہوگا:

”وہ انہیں اسی طرح انذار کرتا ہے کہ جس طرح ان کے آباؤ اجداد کو انذار کیا گیا تھا“

بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ ”ما“ مصدر ہے اور اس لحاظ سے اس جملہ کا معنی اس طرح ہوگا:

”تاکہ تو اس قوم کو انذار کرے اسی مقدار میں کہ جتنا ان کے آباؤ اجداد ڈرانے گئے تھے“

لیکن یہ دونوں احتمال ضعیف ہیں۔

”فلانی سے وقت میں محمد کو معوش فرمایا کہ جس وقت عرب میں کوئی بھی کتاب آسمانی

نہیں پڑھتا تھا اور نہ ہی کسی کو دعویٰ نبوت تھا“ (تبیخ البلاغہ خطبہ ۳۲، ۱۰۴)۔

ہر حال نزول قرآن کا مقصد یہ تھا کہ غافل اور سوتے ہوئے لوگوں کو بیدار کیا جائے، جن حضرات نے ان کا اعطاف کیا ہو اسے انہیں ان کی طرف متوجہ کیا جائے اور جن گناہوں اور شرک و فساد میں وہ آلودہ ہیں انہیں ان سے نکلنے کی دعوت دی جائے۔

ہاں! قرآن تو آگاہی و بیداری کی ایک بنیاد ہے اور قلب و روح کو پاک کر دینے والی کتاب ہے۔ اس کے بعد قرآن کفر و شرک کے سرخوں کے بارے میں ایک پیشگوئی کے طور پر کہتا ہے: ”ان میں سے اکثر کے ادب پر وعدہ الٰہی حق بن کر نافذ ہو چکا ہے، پس وہ ایمان نہیں لائیں گے“ (لقد حق القول علی اکثرہم فہم لا یؤمنون)۔

”قول“ سے یہاں کیا مراد ہے، اس ضمن میں مفسرین نے مختلف احتمال ذکر کیے ہیں لیکن غالباً مراد اس سے مراد شیطان کے پیروکاروں کے لیے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہی ہے۔ جیسا کہ سورہ سجدہ کی آیت ۱۳ میں ہے کہ:

”ولکن حق القول منی لاملئن جہنم من الجنة والناس اجمعین
”لیکن میری بات ان کے لیے نافذ ہو چکی ہے کہ میں دوزخ کو جن دانس سے بھر دوں گا“
سورہ زمر کی آیت ۱۷ میں بھی ہے:

”ولکن حقت کلمۃ العذاب علی الکافرین

”لیکن عذاب کا حکم اور وعدہ کافروں کے بارے میں حق ہو کر نافذ ہو چکا ہے“

ہر حال یہ ایسے افراد کے بارے میں ہے کہ جنہوں نے خدا سے ہر قسم کا ربط منقطع کر لیا تھا، ہر قسم کے رشتے توڑ لیے تھے اور اپنے لیے ہدایت کے تمام دریچے بند کر لیے تھے اور ہٹ دھرمی اور عناد کو آخری حد تک پہنچا دیا تھا۔ ہاں! یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور ان کے لیے بازگشت کی کوئی راہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے اپنے پیچھے کے تمام پل خود تباہ کر دیئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اسی صورت میں اصلاح پذیر اور قابل ہدایت ہے جبکہ اس نے بُرے اعمال اور اپنے پست اخلاق کے ذریعے اپنی فطرتِ توحیدی کو بالکل پامال نہ کر دیا ہو۔ ورنہ مطلق تاریکی اس کے دل پر غالب آجائے گی اور امید کے سارے دریچے اس پر بند ہو جائیں گے۔

ضمنی طور پر اس بات سے واضح ہو گیا کہ اس اکثریت سے مراد کہ جو ہرگز ایمان نہیں لائے گی شرک و کفر کے سرخوں میں کہ جن میں سے کچھ تو اسلامی جنگوں میں شرک اور بت پرستی کی حالت میں مارے گئے اور کچھ جو باقی رہ گئے تھے آخر عمر تک دل سے ایمان نہ لائے ورنہ مشرکین مکہ کی اکثریت تو فسح تک

کے بعد:

یدخلون فی دین اللہ افواجاً۔ (نصر۔ ۲)

کے مطابق گروہ درگروہ اسلام میں داخل ہو گئی تھی۔

اس کے بعد کی آیات کے مطابق ان کے سامنے اور پیچھے دیوار موجود ہے اور وہ ناپید ہیں اور آبرو یہ تصریح بھی کرتی ہے کہ ان کے لیے انذار کرنا اور نہ کرنا یکساں ہے۔ یہ آیت بھی اسی مذکورہ معنی کی مشابہ ہے بلکہ

ہر حال بعد والی آیت اس اثر ناپذیر گروہ کے تعارف میں ہے: ان کے پہلے تعارف میں کہتی ہے: ”ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں کہ جو ان کی ٹھوڑیوں تک آئے ہوئے ہیں اور ان کے سروں کو اوپر کیا ہوا ہے“ (اتاجعلنا فی اعناقہم اغلالاً فہی الی الاذقان فہم مقبعون)۔

”اغلال“ ”غسل“ کی جمع ہے اور اصل میں ”مادہ غل“ سے ایسی چیز کے معنی میں ہے کہ جو چند چیزوں کے درمیان موجود ہو، مثلاً وہ جاری پانی کہ جو درختوں کے درمیان سے گزرتا ہے اُسے ”غل“ (بروزن) ”عمل“ کہتے ہیں اور ”غل“ وہ حلقہ تھا کہ جسے گردن یا ہاتھ میں ڈالتے تھے پھر اُسے زنجیر کے ساتھ باندھ دیتے تھے اور چونکہ گردن یا ہاتھ اس کے درمیان ہوتا تھا لہذا یہ لفظ اُس کے بارے میں استعمال ہوا ہے کبھی وہ طوق کہ جو گردن میں ہوتے تھے انہیں علیحدہ زنجیر کے ساتھ باندھا جاتا تھا اور ہاتھ کے حلقے علیحدہ ہوتے تھے، لیکن کبھی کبھی ہاتھوں کو حلقوں میں ڈال کر اس حلقے کے ساتھ کہ جو گردن میں ہوتا تھا باندھ دیتے تھے اور قیدی کو انتہائی اذیت دی جاتی تھی۔

نیز پیکس یا شدتِ غم اور غصے کی حالت کو ”غلہ“ (بروزن) ”قلہ“ کہا جاتا ہے تو یہ بھی اس حالت کے انسان کے دل اور جسم پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے ہے۔ اصولاً مادہ ”غل“ (بروزن) ”جلد“ بھی داخل ہونے اور داخل کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ اسی لیے گھر کے اناج اور زراعت وغیرہ کو بھی ”غلہ“ کہتے ہیں بلکہ

ہر صورت میں جب طوق ”غل“ گردن میں ڈالا جاتا تھا تو وہ ٹھوڑی تک پہنچا ہوا ہوتا تھا اور سر کو اوپر کر دیتا تھا اور جب قیدی اور امیر اس کی وجہ سے بہت سختی میں ہوتا تھا تو اپنے گرد و پیش کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ”اکثرہم“ کی ضمیر ”قوم“ کی طرف کہ جو اس سے پہلے ہے نہیں ٹوٹی، بلکہ قوم کے سرخوں کی طرف ٹوٹی ہے اور اس کی شہاد اس کے بعد کی آیات میں۔

مزوات راغب اور قطر المحيط اور مجمع البحرین (مادہ ”غل“)

ہٹ دھرم بت پرستوں کی حالت کی یہ تشبیہ کتنی عمدہ ہے کہ جو ایسے انسانوں کے ساتھ دی گئی ہے کہ جتنے نے تقلید کا طوق اور بیہودہ عادات و رسوم کی زنجیر و طوق کو اپنی گردن اور ماتھ پاؤں میں باندھ لیا ہے، اور ان کے وہ طوق ایسے ہیں کہ انہوں نے ان کے سروں کو اوپر کر رکھا ہے اور حقائق کو دیکھنے سے غمگین کر دیا ہے وہ ایسے قیدی ہیں کہ نہ تو حرکت کر سکتے ہیں اور نہ ہی دیکھ سکتے ہیں۔

ہر حال زیر بحث آیت اس لیے ایمان گردہ کے حالات دنیا کی ایک تصویر ہے اور آخرت میں ان کے حالات کا ایک بیان بھی ہے، جو اس جہان کی کیفیت کا ایک مرقع ہے اور اگر یہ لفظ ماضی کی شکل میں ذکر ہوا ہے تو اس سے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں آئندہ ہونے والے سلسلہ اور یقینی واقعات میں ماضی میں بیان ہوتے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے کہ جو ادب کی زبان میں معروف ہے کہ "متفق الوقوع مضارع، ماضی کی شکل اختیار کر لیتا ہے" اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو، ان کی اس عالم میں حالت کے بارے میں بھی اور دوسرے جہان کے بارے میں بھی۔

مفسرین کی ایک جماعت نے زیر بحث آیت اور اس کے بعد کی آیت کی کئی شان نزول بیان کی ہیں اور ان کے مطابق یہ "الرجل" کے بارے میں یا قبیلہ بنی خزوم یا قریش کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، انہوں نے پیغمبر اکرم کے قتل کا بار مہم ارادہ کیا لیکن خدا نے انہیں معجزانہ طور پر اس کام سے باز رکھا اور اس حساس لمحے میں جب کہ وہ پیغمبر اکرم کے نزدیک پہنچ کر یہ چاہتے تھے کہ آپ پر ضرب کاری لگائیں تو ان کی آنکھیں بے کار ہو گئیں یا حرکت کی طاقت ان سے سلب ہو گئی۔

لیکن یہ تمام بیان کردہ شان نزول آیت کے مفہوم کی عمومیت اور اس کے معنی کی وسعت سے مانع نہیں ہے اور یہ کفر کے تمام سرغزوں اور ہٹ دھرم متعصب لوگوں کے بارے میں ہے۔ ضمنی طور پر ہم نے جو کچھ "فہم لایؤمنون" کی تفسیر میں بیان کیا ہے یہ اس کی ایک تائید ہے کہ اس سے مراد مشرکین کی اکثریت نہیں ہے بلکہ مشرک، کفر اور نفاق کے سرغزوں کی اکثریت مراد ہے۔

بعد والی آیت میں انہیں افراد کی ایک اور صفت بیان کی گئی ہے اور ان کی اثر ناپذیری کے حوالے کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہے۔ فرمایا گیا ہے: "ہم نے ایک دیوار تو ان کے سامنے بنا دی ہے اور ایک دیوار ان

ہم نے جو کچھ سطور بالا میں بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ "ہی" کی ضمیر (فعی الی الاذقان) میں "اعلال" کی طرف لوٹتی ہے کہ وہ ان کی عموماً ہی تک پہنچے ہوئے ہیں اور "فہم مقعون" اس پر تفریح ہے اور یہ جو ایک جماعت نے خیال کیا ہے کہ "ہی" کی ضمیر (ایدی) "ہاتھوں" کی طرف لوٹتی ہے کہ جس کا آپ میں ذکر نہیں، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

تفسیر آلوسی، جلد ۲۲ ص ۱۹۹۔

کے پیچھے (و جعلنا من بین یدیم سداً ومن خلفہم سداً)۔ وہ ان دونوں دیواروں کے درمیان اس طرح سے محصور ہو کر رہ گئے ہیں کہ نہ تو آگے جانے کے لیے

ان کے پاس کوئی راستہ ہے اور نہ ہی واپس لوٹنے کے لیے "اور اس حالت میں ہم نے ان کی آنکھوں کو ڈھانپ دیا ہے، لہذا وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے" (فاغشیتناہم فہم لایبصرون)۔

بھی عجیب بولتی ہوئی تصویر ہے۔ ایک طرف سے تو وہ ایسے قیدیوں کی مانند ہیں کہ جو طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور دوسری طرف سے گردن میں پڑے ہوئے طوق کا حلقہ اتنا بڑا ہے کہ اس نے ان کے سروں کو آسمان کی طرف اٹھا رکھا ہے اور وہ اپنے اطراف کی کوئی چیز نہیں دیکھ پاتے۔

ایک دیوار سے ان کا آگے سے اور ایک نے پیچھے سے محاصرہ کیا ہوا ہے اور آگے اور پیچھے کا راستہ ان کے لیے بند کر دیا ہے۔

نیز ان کی آنکھیں بھی بند کر دی گئی ہیں اور دیکھنے کی بصارت بے کار ہو گئی ہے۔ خوب غور کریں کہ جو شخص ایسی کیفیت سے دوچار ہو وہ کیا کر سکتا ہے، کیا دیکھ سکتا ہے اور کس طرح قدم بڑھا سکتا ہے؟ خود غرض و خود بین مسکین اندھے، ہرے عقلمند اور ہٹ دھرم متعصبین کی کیفیت حقائق کے سامنے ایسی ہی ہے۔

اسی بنا پر آخری زیر بحث آیت میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے: "ان کے لیے برابر ہے چاہے تو انہیں ڈراتے یا نہ ڈراتے، وہ ایمان نہیں لائیں گے" (وسواء علیہم ءانذرتہم ام لم تنذرہم لایؤمنون)۔

تیری گفتگو چاہے جتنی بھی پُر تاثیر ہو اور دہی آسمانی چاہے جس قدر بھی مؤثر ہو، جب تک دلوں کی زمین اہل اور تیار نہ ہو اثر نہ کرے گی۔ اگر آفتاب عالم تاب ہزاروں سال شورہ زار پر چمکتا رہے اور پُر برکت بارشیں اس پر برستی رہیں اور نسیم ہمارا مسلسل اس کے اوپر سے گزرتی رہے، خش و خاشاک کے سوا اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا کیونکہ قائل کی قابلیت کے ساتھ ساتھ قابل کی قابلیت بھی شرط ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ آلات شناخت کا بیکار ہو جانا: انسان اس بنا پر کہ اپنے وجود سے باہر کے عالم سے بھی آگاہ ہو سکے کچھ وسائل و آلات سے فائدہ اٹھاتا ہے، جنہیں آلات شناخت کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک حصہ تو "ذات کے اندر" ہوتا ہے اور دوسرا حصہ "ذات سے باہر"۔ عقل و خرد اور وجدان و فطرت تو ذات کے اندر والے شناخت کے آلات ہیں اور انسان کے حواس ظاہری۔ بیہوشی و شغوانی۔ ذات سے باہر کے آلات شناخت ہیں۔

ان خدا داد وسائل سے اگر صحیح طور پر استفادہ کیا جائے تو روز بروز زیادہ قوی اور زیادہ طاقتور ہوتے جائیں گے اور مزید بہتر اور مزید قیمتی حقائق کی شناخت کریں گے۔

لیکن اگر وہ ایک مدت تک اخلاقی راہوں میں چلتے رہیں یا ان سے بالکل استفادہ نہ کیا جائے تو آہستہ آہستہ کمزور پڑ جائیں گے یا بالکل بگڑ جائیں گے اور حقائق کی برعکس نشاندہی کریں گے، ٹھیک ایک صاف و شفاف آئینہ کی مانند کہ جسے ایک دبیز و ضخیم گردو خبا ڈھانپ لے یا زیادہ اور گہری خراشیں اس پر لگ جائیں تو پھر اس میں کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی اور اگر دکھائی دے بھی تو ہرگز حقیقت کے مطابق نہیں ہوگی۔

انسان کے یہی غلط اعمال اور اخلاقی فائدے اٹھانا، آلات شناخت کی اس عظیم نعمت کو اس سے چھین لیتے ہیں۔ اس بنا پر قصور وار وہ خود ہے اور اس کا گناہ بھی خود اسی کی گردن پر ہے۔

ادب و والی آیات اس اہم اور سرفہشت ساز مسئلہ کی بولتی ہوئی تصویر ہیں۔ منسکب ہوس بازوں اور مستصیب خود خواہوں کو ان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو طوق و زنجیر میں گرفتار ہیں۔ یہ وہی مواد ہوس، کبر و غرور اور انا کی عقیدہ کی زنجیریں ہیں کہ جو خود انہوں نے اپنے ہاتھ اور گردن میں ڈالی ہیں اور یہ ان لوگوں کے مشابہ ہیں کہ جو ایک قوی اور ناقابل عبور چار دیواری کے محاصرے میں آگئے ہیں۔

اور دوسری طرف سے ان کی آنکھیں بند اور نابینا ہیں۔

صرف طوق و زنجیر ہی ان کو حرکت سے روکنے کے لیے کافی ہیں جبکہ دو عظیم دیواریں بھی ان کی فعالیت میں مانع ہیں اور ان کی آنکھیں بھی کچھ دیکھنے کے قابل نہیں ہیں۔

یہ دونوں دیواریں گویا اس قدر بلند اور نزدیک ہیں کہ جو انہیں کچھ دیکھنے نہیں دیتیں اور انہیں حرکت سے بھی محروم کر دیتی ہیں۔

ہم نے بار بار بیان کیا ہے کہ انسان کا ہدایت قبول کرنا اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ اس مرحلے تک نہ پہنچ گیا ہو لیکن جب وہ اس مرحلے تک پہنچ جائے تو پھر تمام انبیاء و اولیاء بھی جمع ہو جائیں اور تمام کتب آسمانی اس کے سامنے پڑھی جائیں تو بھی اس پر توجہ نہ ہوں گی۔

اور یہ جو روایات اسلامی اور اسی طرح آیات قرآنی میں تاکید کی گئی ہے کہ اگر کسی انسان سے کوئی لغزش ہو جائے اور کوئی گناہ اس سے سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کر لے اور خدا کی طرف لوٹ آئے اور لیت و صل، تاخیر اور اصرار و تکرار سے پرہیز کرے، تو یہ اس لیے ہے کہ معاملہ اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ جو زنگ لگ چکا ہے اترنے ہی نہ پائے۔ چھوٹی چھوٹی رکاوٹوں کو ایک بڑی رکاوٹ میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی ختم کر دے اور پیش رفت اور حرکت کی گنجائش باقی رکھے اور غبار کو اپنی آنکھوں سے ہٹا دے تاکہ راستے کو واضح طور پر دیکھ سکے۔

۲۔ آگے اور پیچھے حامل دیواریں؛ بعض مفسرین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ حرکت کو جاری رکھنے میں اصل رکاوٹ تو آگے اور سامنے کی رکاوٹیں ہوتی ہیں، پیچھے کی دیوار کے کیا معنی ہیں؟ بعض نے توبہ جواب دیا ہے کہ انسان دو قسم کی ہدایت کا حامل ہے،

۱۔ فطری اور استدلالی ہدایت اور

۲۔ فطری و وجدانی ہدایت

سامنے کی دیوار اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ہدایت فطری سے محروم ہوگا، وہ چاہے گا کہ پیچھے کی طرف لوٹ جائے اور ہدایت فطری کی طرف نظر کرے تو پیچھے کی دیوار اسے فطرت کی طرف بازگشت سے روکے گی بلکہ

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ آگے والی دیوار ان رکاوٹوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو اُسے آخرت اور سعادت، جاودانی تک پہنچنے سے روکتی ہیں اور پیچھے والی دیوار وہ چیز ہے کہ جو اسے دنیا کی سعادت اور آرام و سکون تک پہنچنے نہیں دیتی بلکہ

یہ احتمال بھی آیت کی تفسیر میں موجود ہے کہ انسان جس وقت مقصد تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ کا سامنا کرتا ہے تو وہ پیچھے کی طرف لوٹتا ہے تاکہ مقصد تک پہنچنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے لیکن جب دونوں طرف ایک ایک دیوار بن چکی ہو تو وہ ہر حالت میں مقصد کی طرف جانے سے محروم ہو جائے گا۔ ضمنی طور پر اس سوال کا جواب واضح ہو گیا کہ دائیں اور بائیں طرف دیوار کا کوئی بیان کیوں نہیں ہوا کیونکہ دائیں بائیں چلنا کبھی بھی انسان کو مقصد تک نہیں پہنچاتا، اسے تو کوئی راستہ آگے کی طرف ہی نکالنا چاہیے۔ علاوہ ازیں عام طور پر دیوار ایسی جگہ پر بنائی جاتی ہے کہ جب دائیں اور بائیں طرف راستہ بند ہو اور دونوں کے درمیان صرف ایک ہی گزرگاہ موجود ہو تو دیوار تعمیر ہو جانے سے وہ گزرگاہ بھی بند ہو جاتی ہے اور عملی طور پر انسان محاصرے میں آجاتا ہے۔

۳۔ انفس و آفاق کی دنیا میں سیر سے محرومی؛ خدا کی شناخت کے لیے عام طور پر دو راستے موجود ہیں۔ ایک تو خدا کی اُن نشانیوں کا مطالعہ کہ جو انسان کے جسم و روح میں موجود ہیں اور انہیں "آیات انفس" کہا جاتا ہے۔

دوسرا ان آیات اور نشانیوں کا مطالعہ کہ جو اس کے وجود سے باہر زمین و آسمان، ثوابت و سیارات اور کوہ و دریا میں پائی جاتی ہیں۔ انہیں "آیات آفاق" کہتے ہیں کہ جن کی طرف قرآن مجید سورہ نجم السجدہ کی

تفسیر کبیر، قرآنی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

تفسیر قرطبی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

آیہ ۵۳ میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

سنزیمہ آیاتنا فی الأفاق وفي أنفسهم حتى يتبين لهم انه الحق
ہم مغرب انہیں آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر ثابت ہو
جائے کہ خدا حق ہے۔

جس وقت انسان کی قوت شناخت بے کار ہو جاتی ہے تو آیات انفس کا مشاہدہ بھی اس پر بند ہو
جاتا ہے اور آیات آفاق کا مشاہدہ بھی۔

زیر بحث آیات میں "انا جعلنا فی اعناقہم اغلاظاً فلمی الی الاذقان فمہم
مقمحون" کا جملہ پہلے معنی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ طوق ان کے سروں کو اس طرح سے اوپر کیے
ہوئے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بھی دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے اور آگے اور پیچھے کی دیواریں ان کی آنکھ کو
اس طرح سے اپنے اطراف کے مشاہدہ سے باز رکھتی ہیں وہ دیکھنے کی جتنی بھی کوشش کرتے ہیں اس دیوار کے
سوا انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا اور آفاقی آیات کے مشاہدہ سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

۱۱) اِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَنَ الْغَيْبَ

فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ

۱۲) اِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ
وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ

ترجمہ

۱۱) تو تو صرف اس شخص کو ڈرا سکتا ہے کہ جو اس خدائی نصیحت کی پیروی کرتا
ہے اور خدائے رحمن سے پوشیدہ طور سے ڈرتا ہے ایسے شخص کو بخشش اور
بہترین اجر و ثواب کی بشارت دے دے۔

۱۲) ہم ہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے اور
ان کے تمام آثار کو ہم لکھتے ہیں اور ہم نے ہر چیز کا واضح کتابت میں
احصاء کر دیا ہے۔

تفسیر

کس قسم کے لوگ تیری تشبیہ کو قبول کرتے ہیں

گزشتہ آیات میں ایسے گروہ کے بارے میں گفتگو تھی کہ جو کسی طرح بھی خدائی تشبیہوں کو قبول کرنے پر
آمادہ نہیں تھے اور ان کو ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ زیر بحث آیات ایک اور گروہ کے بارے میں گفتگو کرتی
ہیں۔ یہ لوگ مذکورہ گروہ کے بالکل متقابل قرار پاتے ہیں۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ایک کا دوسرے
سے موازنہ کر کے مسئلہ زیادہ واضح ہو جائے اور یہی قرآن کا طریق کار ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "تو تو صرف اسی کو خدا سے ڈرا سکتا ہے جو اس کے ذکر کی پیروی کرے اور خداوند
رحمان سے پوشیدہ طور پر اور غیب میں ڈرے" (انما تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمن بالغیب)۔

”اور جو ایسا ہے اسے مغفرت اور بہترین اجر و ثواب کی بشارت دے“ (فبشره بمغفرة واجر کریم)۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ اس آیت میں ایسے اشخاص۔ کہ جن پر پیغمبر کا ”انذار“ اور پند و نصیحت مؤثر ہے کے دو اوصاف بیان ہوئے ہیں:

- ۱۔ نصیحت کی پیروی۔
- ۲۔ پرشیدہ طور پر خدا سے ڈرنا۔

البتہ ان دو اوصاف سے مراد آمادگی اور صلاحیت ہے۔ یعنی انذار صرف ان افراد پر مؤثر ہوتا ہے جو سننے والا کان اور آمادہ دل رکھتے ہیں۔ انذار ان میں دو اثر پیدا کرتا ہے پہلا ذکر قرآن کی پیروی اور دوسرا پردردگار اور اس کی طرف سے ماند ذمہ داریوں کی ادائیگی کا احساس۔

دوسرے لفظوں میں ان دو اوصاف کی صلاحیت ان میں موجود ہے لیکن انذار کے بعد وہ عملی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بہت دھرم، دل کے اندھوں اور غافل لوگوں کے برخلاف کہ جو نہ تو سننے والے کان رکھتے ہیں اور نہ ہی خشیت و خوف الہی کے لیے آمادگی۔

یہ آیت سورہ بقرہ کی پہلی آیات کے مانند ہے کہ جن میں فرمایا گیا ہے:

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ

”اس کتاب آسمانی میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور یہ پرہیزگاروں کے لیے باعث ہدایت ہے۔“

۲۔ بہت سے مفسرین کے نظریے کے مطابق ”ذکر“ سے مراد قرآن مجید ہے۔ کیونکہ یہ حفظ قرآن میں بار بار اسی شکل میں ایسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اس سے مراد اس کا لغوی معنی یعنی ہر قسم کا تذکرہ اور نصیحت ہو اور اس میں آیات قرآن اور پیغمبر اکرم اور خدائی رہبروں کے تمام انذار اور پند و نصائح بھی اس کے مفہوم میں شامل ہوں۔

۱۔ سورہ نمل ۴۴، تم السجدہ ۱۱، زخرف ۴۲ اور قر ۲۵۔ جبکہ ”ذکر“ ہستہ آن میں بار بار مطلق ذکر کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

۳۔ ”خشیت“ جیسا کہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں، اس خوف کے معنی میں ہے کہ جس کے ساتھ احساس عظمت موجود ہو نیز ”رحمن“ کی تعبیر کہ جو خدا کی رحمت عامہ کی منظر ہے، یہاں ایک لطیف نکتے کی حامل ہے اور وہ یہ کہ عظمت خدا کے خوف کے ساتھ ساتھ وہ اس کی رحمت کی امید بھی رکھتے ہوں تاکہ خوف رعبہ کے دونوں پلڑے۔ کہ جو نکال دار تقار کی طرف مسلسل حرکت کے حامل ہیں۔ متوازن رہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض آیات قرآنی میں رعبہ و امید کے بارے میں تو ”اللہ“ کے نام کا ذکر ہوا ہے جو کہ ہیبت و عظمت کا منظر ہے:

لَمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ (احزاب ۲۱)

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رعبہ بھی خوف کے ساتھ ہونا چاہیے اور خوف رعبہ کے ساتھ (خورد کھچے گا)۔

۴۔ ”بالتعب“ کی تعبیر یہاں پر استدلال و جربان کے ذریعے خدا کی شناخت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کی پاک ذات انسانی حواس سے پنہاں ہے۔ صرف دل کی آنکھ سے اور اس کے آثار کے ذریعے اس کے اجلال و جمال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ”غیب“ یہاں پر لوگوں کی آنکھ سے پنہاں کے معنی میں ہو یعنی اس کا مقام خشیت و خوف، ریا کے پہلو سے اور لوگوں کی موجودگی میں ہی نہ ہو بلکہ وہ تہائی میں بھی خشیت کا حامل ہو۔ جس نے اسے ”قیامت“ کے معنی میں تعبیر کیا ہے کیونکہ اس کے واضح مصادیق میں سے وہ امور بھی ہیں کہ جو ہماری حس سے پنہاں ہیں لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۵۔ ”فبشره“ کا لفظ درحقیقت ”انذار“ کی تکمیل ہے کیونکہ خدا کا پیغمبر ابتدا میں انذار کرتا ہے اور جس وقت فرماں خدا کی پیروی اور احساس عظمت کے ساتھ خوف پیدا ہو جائے اور اس کے اخلاقیات انسان کے قول و فعل میں ظاہر ہوں، تو وہ بشارت دیتا ہے۔

کس بات کی بشارت دیتا ہے؟ پہلے تو اس بات کی کہ جو انسانی فکر کو ہر دوسری چیز سے زیادہ اپنی طرف مشغول رکھتی ہے اور پھر ان لغزشوں کے بارے میں کہ جو کبھی کبھار اس سے سرزد ہوتی ہیں۔ کہ خدائے بزرگ و برتر نے وہ سب بخش دی ہیں۔ اس کے بعد اجر کریم اور بہترین جزا کی بشارت دیتا ہے کہ جس کے مختلف پہلوؤں کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ لفظ ”مغفرت“ بھی نکرہ کی شکل میں بیان ہوا ہے اور ”اجر کریم“ بھی ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کے مواقع پر نکرہ کی صورت میں لفظ کا آنا عظمت کے بیان کے لیے ہے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ ”فبشره“ میں ”فأ“ کہ جو تفریح کے لیے ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے

کہ حضرت اور اجرِ کریم ترتیب وار نصیحت کی پیروی اور پروردگار کے خوف کا نتیجہ ہیں۔

گزشتہ آیات میں مومنین اور انبیاء کے انذار کو قبول کرنے والوں کے اجر و ثواب کا ذکر ہے۔ اسی مناسبت سے بعد والی آیت میں منکر معاد و قیامت اور حساب و کتاب اور جزا کے لیے مثبت اعمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم مُردوں کو زندہ کرتے ہیں (انما نحن نفی الموقن)۔
 "مخن" (ہم) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس عظیم قدرت کے ہوتے ہوئے کہ جس کا تم سب کو ہمارے متعلق علم ہے مزید کسی بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں ہے کہ بوسیدہ اور گلی مٹری بڑیاں نئے سرے سے کس طرح زندہ ہوں گی اور لباسِ حیات کس طرح زیب تن کریں گی۔
 نہ صرف یہ کہ ہم مُردوں کو زندہ کریں گے بلکہ ہم وہ تمام کچھ کہ جو انہوں نے آگے بھیجا ہے اور اُس کے تمام آثار بھی لکھ رہے ہیں (وکنکت ما قدموا و آثارہم)۔
 اس بنا پر کوئی چیز فرو گزاشت نہیں ہوگی اور ہر چیز نامہ اعمال میں روزِ حساب کے لیے محفوظ ہو جائے گی۔

"ما قدموا" (جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے) ان اعمال کی طرف اشارہ ہے کہ جو انہوں نے انجام دیئے ہیں اور اُن کا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ لیکن "و آثارہم" (ان آثارہم) کی تعبیر انسان کے ان اعمال کی طرف اشارہ ہے کہ جو باقی رہ جاتے ہیں اور ان کے آثار معاشرے میں منعکس ہوتے ہیں۔ مثلاً صدقات جاریہ (انسان کی تعمیرات، اوقاف اور ایسے مراکز کہ جو بعد ازاں باقی رہ جاتے ہیں اور لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں)۔

یہ احتمال بھی آیت کی تفسیر میں موجود ہے کہ "ما قدموا" تو ان اعمال کی طرف اشارہ ہے جو کہ جو شخصی جنبہ رکھتے ہیں اور "و آثارہم" ان کاموں کی طرف کہ جو رواج پا جاتے ہیں اور انسان کے بعد بھی موجب خیر و برکت یا موجب شر و زیاں اور سببِ گناہ بنتے ہیں۔

البتہ آیت کا مفہوم وسیع ہے اور ممکن ہے کہ دونوں تفاسیر اس کے مفہوم میں جمع ہوں۔
 آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے اضافہ کیا گیا ہے: ہم نے تمام چیزوں کا واضح اور آشکار کتاب میں احصا کر دیا ہے (وکل شیء احصینا فی امام مبین)۔

اکثر مفسرین نے یہاں "امام مبین" سے "لوح محفوظ" مراد لی ہے یعنی وہ کتاب کہ جس میں اس جہان کے تمام موجودات، واقعات اور اعمال ثبت و محفوظ ہیں۔

نیز "امام" کی تعبیر ممکن ہے کہ اس نظر سے ہو کہ یہ کتاب قیامت میں ثواب و عقاب کے تمام مامورین کے لیے رہبر اور پیشوا ہے اور انسانوں کے اعمال کی قدیم قیمت پر لکھنے کے لیے ان کی جزا و سزا کا

ایک معیار ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ لفظ "امام" قرآن کی بعض دوسری آیات میں "تورات" کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

افمن كان على بينة من ربه ويتلوه شاهد منه ومن قبله كتاب موسى اماما ورحمة (ہود - ۱۰)

"کیا وہ شخص کہ جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہو اور اسی کی طرف سے اس کے پیچھے ایک شاہد بھی ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب کہ جو امام اور رحمت تھی اس پر گواہی دیتی ہے (اس شخص کی مانند ہے کہ جو ایسا نہیں ہے)۔"

اس آیت میں لفظ "امام" کا اطلاق تورات پر اس کے معارف و احکام کی بنا پر ہے۔ اسی طرح اس میں بیان شدہ پیغمبر اسلام کی ان نشانیوں کی وجہ سے ہے اور ان تمام امور میں وہ مخلوق کے لیے رہبر و پیشوا بن سکتی ہے۔ اس بنا پر مذکورہ لفظ "امام" ہر موقع پر اس موقع کی مناسبت سے منہوم دیتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ مثبت اعمال کی مختلف کتابیں: قرآن مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال چند کتابوں میں ثبت ہوتے ہیں تاکہ حساب و کتاب کے وقت کسی شخص کے لیے بھی کسی قسم کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔
 پہلی کتاب تو "شخصی نامہ اعمال" ہے کہ جو ایک فرد کی ساری عمر کے اعمال ثبت کرتی ہے۔ قرآن لکھتا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص سے کہا جائے گا:

اقرا کتابک کفی بنفسک الیوم علیک حبیبنا
 "تُو خود ہی اپنا نامہ اعمال پڑھ لے، تو خود ہی اپنے نفس کا حساب کرنے کے لیے کافی ہے" (بنی اسرائیل - ۱۷)

یہ وہ مقام ہے کہ مجرمین کی فریاد بلند ہوگی:

يقولون يا ويلتنا مال هذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها
 "وہ کہیں گے کہ داسے جو ہم پر یہ کیسی کتاب ہے کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا گناہ ایسا نہیں ہے کہ جو اس میں ثبت نہ ہو" (کف - ۲۹)

"یہ وہی کتاب ہے کہ جو نیوکو کاروں کے دائیں ہاتھ میں اور بدکاروں کے بائیں ہاتھ میں ہوگی" (حاقة - ۱۹ و ۲۵)

دوسری کتاب "امتل" کا نامہ اعمال ہے اور ان کی اجتماعی زندگی کے اعمال بیان کرتی ہے جیسا کہ قرآن کتاب ہے،

کل امة تدعی الی کتابہا

قیامت کے دن ہر امت کو اس کے نامہ اعمال کی طرف بلایا جائے گا (جاوید - ۲۸)

تیسری کتاب اعمال نامہ جامع و عمومی یعنی لوح محفوظ ہے کہ جس میں نہ صرف اولین و آخرین کے تمام انسانوں کے اعمال بلکہ عالم کے تمام واقعات بجا ثبت ہیں۔ یہ قیامت کے اس عظیم موقع پر آدمی کے اعمال پر ایک اور گواہ ہے اور حقیقت میں یہ کتاب حساب و کتاب کے فرشتوں اور جزا و سزا کے ملائکہ کے لیے امام درہر ہے۔

۲- ہر چیز ثبت ہوتی ہے؛ ایک گویا اور بیدار کرنے والی حدیث میں امام صادق سے منقول ہے:

ان رسول اللہ نزل بارض قرعاء فقال لاصحابہ: ائتوا بحطب، فقالوا: یا رسول اللہ نحن بارض قرعاء قال فلیأت کل انسان بما قدر علیہ، فجاوا بہ حتی رموا بین ید یدہ، بعضہ علی بعض، فقال رسول اللہ (ص) ہکذا تجمع الذنوب شو قال ایاکو والمحقرات من الذنوب، فان لکل شیء طابا الاوان طابھا یکتب ما قدموا و اثارھو و کل شیء احصیناھ فی امام مبین۔

رسول خدام ایک بے آب و گیاہ علاقے میں پہنچے تو آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: لکڑیاں اور ایندھن اکٹھا کر کے لاؤ۔

انہوں نے عرض کیا، اسے خدا کے رسول! یہ خشک سرزمین ہے کہ جس میں کوئی لکڑی اور ایندھن نہیں ہے۔

آپ نے فرمایا: تم جاؤ اور تمہیں سے جس سے جتنا ہو سکتا ہے جمع کرے۔ ان میں سے ہر ایک تھوڑا سا ایندھن اور خشک لکڑی لے آیا اور اسے پیغمبر خدا کے سامنے ایک دوسرے پر ڈال دیا (اسے آگ لگائی گئی تو اس سے بڑے بڑے شعلے

۱- "لوح محفوظ" کے بارے میں ہم نے تفسیر نور کی جلد ۵ میں سورہ رعد کی آیہ ۲۹ کے ذیل میں اور اسی طرح جلد ۳ میں سورہ انفاس کی آیہ ۵۹ کے ذیل میں بحث کی ہے۔

جبر کئے گئے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا، اس طرح سے (چھوٹے چھوٹے) گناہ ایک دوسرے میں جمع ہوتے جاتے ہیں (اور تم ان کو فرداً فرداً ایک سمجھ کر اہمیت نہیں دیتے)۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا، چھوٹے چھوٹے گناہوں سے ڈرو کیونکہ ہر چیز کا ایک حساب کنندہ ہے اور جو کچھ تم نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ اس کے آثار باقی رہ گئے ہیں اس کا حساب کنندہ اُسے لکھا ہے اور اس نے ہر چیز کو کتاب مبین میں ثبت کیا ہے۔

یہ بلا دینے والی حدیث اس امر کی منہ بولتی تصویر ہے کہ جب چھوٹے چھوٹے گناہ جمع ہوتے ہیں تو ان کا مجموعہ ایک بہت بڑی آگ کا سامان بن جاتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ قبیلہ "بنو سلمہ" مدینہ سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ انہوں نے مسجد نبوی کے قریب نقل مکانی کرنے کا ارادہ کیا تو زیر بحث آیت نازل ہوئی (اتانحن نحی الموقفی.....) تو پیغمبر اکرم نے ان سے فرمایا: "ان انا رکبم تکتب" تمہارے آثار (مسجد کی طرف آنے کے لیے تمہارے قدم) تمہارے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے (اور ان کا اجر و ثواب تمہیں ملے گا) جب بنی سلمہ نے یہ سنا تو انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اپنی اسی جگہ پر رہ گئے۔

واضح رہے کہ یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور ان امور میں سے ہر ایک اس کا ایک مصداق ہے۔

وہ چیز کہ جو ممکن ہے ابتدائی نظر میں اور پر والی تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ تصور نہ ہو، اہل بیت سے مروی وہ روایات ہیں کہ جن میں "امام مبین" سے امیرالمومنین مراد لیے گئے ہیں۔

ان میں سے ایک حدیث امام باقر سے مروی ہے۔ آپ نے اپنے والد گرامی سے اور انہوں نے اپنے دادا سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جس وقت یہ آئے: "وکل شیء احصیناھ فی امام مبین" نازل ہوئی تو حضرت ابو جبر و عمر کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا اس سے مراد توورات ہے؟ فرمایا نہیں! عرض کیا: انجیل ہے؟ فرمایا نہیں! عرض کیا: قرآن ہے؟ فرمایا نہیں! اسی حالت میں امیرالمومنین علی رسول اللہ کی طرف آئے جس وقت آپ کی نگاہ ان پر پڑی تو فرمایا:

هو هذا؛ انه الامام الذی احصى اللہ تبارک و تعالیٰ فیہ علم کل شیء۔

۱- تفسیر نور اطفالین جلد ۳ ص ۳۷۸۔

۲- تفسیر قرطبی میں یہ حدیث ابو سعید خدری سے صحیح ترمذی سے نقل ہوئی ہے اور اس کے مشابہ حدیث صحیح مسلم میں جابر بن عبد اللہ انصاری سے بھی منقول ہے دوسرے مضمون مثلاً اکوسی فرزاز، طبری اور علامہ طباطبائی نے بھی اسے کچھ فرق کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

”امام مبین یہ شخص ہے یہی ہے وہ امام کہ جس میں خداوند تعالیٰ نے ہر چیز کے علم کا احصاء کر دیا ہے۔ یہ تفسیر علی بن ابراہیم میں ابن عباس کے واسطے سے خود امیر المومنین سے بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

انا والله الامام المبین ابین الحق من الباطل ورثته من رسول الله
 ”خدا کی قسم! میں وہ امام مبین ہوں کہ جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے۔ یہ علم میں نے رسول اللہ سے ورثہ میں حاصل کیا ہے اور ان سے سیکھا ہے۔“

اگرچہ بعض مفسرین جیسے آلوسی نے شیخ حوالوں سے ایسی روایات نقل کرنے سے خوف کھایا ہے اور اسے تفسیر آری سے بے خبری اور نادانی کی طرف منسوب کیا ہے لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس قسم کی روایات ”امام مبین“ کی ”لوح محفوظ“ کے ساتھ تفسیر کے منافی نہیں ہیں کیونکہ پیڑ کا پاک دل پہلے درج میں اور ان کے جانشین کا دل دوسرے درج میں ایسے آئینے میں کہ جو لوح محفوظ کو منکس کرتے ہیں اور ان علوم کا ایک عظیم حصہ کہ جو ”لوح محفوظ“ میں ہے خدا کی طرف سے ان کی طرف الامام ہوتا ہے۔ اس طرح سے وہ ”لوح محفوظ“ کا ایک نمونہ ہیں۔ اس بنا پر ”امام مبین“ کا اطلاق اس مطلب پر کوئی عجیب بات نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ایسی شاخ ہے کہ جو اسی جڑ کی طرف لوٹتی ہے۔ اس سے قطع نظر جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسان کامل کا وجود ایک ”عالم صغیر“ ہے کہ جس میں عالم کبیر سمایا ہوا ہے اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف یہ شرف منسوب ہے:

اشرعوا نك جرم صغیر؟ وفیك انطوم العالم الاكبر!
 ”کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جرم ہے حالانکہ عالم کبیر تجھ میں سمو دیا گیا ہے۔“

بیزم یہ بھی جانتے ہیں کہ عالم ہستی ایک لحاظ سے علم خدا اور لوح محفوظ کا ایک صفحہ ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ آلوسی نے باوجودیکہ مذکورہ روایات کا شدت سے انکار کیا ہے تاہم آخری تفسیر کو چنداں بعید نہیں سمجھا۔ بہر حال اس بات میں کہ ”امام مبین“ سے مراد ”لوح محفوظ“ ہی ہے کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ مذکورہ روایات بھی اس پر قابل تطبیق ہیں۔ (غور کیجئے گا)۔

۱۔ ”سمائی الاخبار صدوق“ باب معنی الامام المبین ص ۲۷۹۔
 ۲۔ نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۷۹۔

- ۱۳) وَأَضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ ۝
- ۱۴) إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُمْ مُّرْسَلُونَ ۝
- ۱۵) قَالُوا مَا آتَانَا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا أَنْزَلَ الرَّحْمَنُ مِنْ شَيْءٍ ؕ إِنَّا أَنْتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ۝
- ۱۶) قَالُوا رَبَّنَا عَلِّمْنَا لِنَا إِلَيْكُمْ لِمُرْسَلُونَ ۝
- ۱۷) وَمَا عَلَّمْنَا إِلَّا الْبَلْغَ الْمُبِينُ ۝
- ۱۸) قَالُوا إِنَّا نَطِّيرُ نَابِكُمْ لَئِن لَّمْ تَنْتَهُوا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝
- ۱۹) قَالُوا طَائِفُكُمْ مَعَكُمْ ؕ آيُنْ ذُكِّرْتُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ۝

ترجمہ

- ۱۳) اُن سے بستی والوں کی مثال بیان کیجئے کہ جس وقت خدا کے رسول ان کی طرف آئے۔
- ۱۴) جبکہ ہم نے دو رسول ان کی طرف بھیجے لیکن انہوں نے (ہمارے) رسولوں کی تکذیب کی۔ اس لیے ہم نے ان دونوں کی تقویت کے لیے تیسرے کو بھیجا

ان سب نے کہا کہ ہم تمہاری طرف (خدا کے) بھیجے ہوئے ہیں۔

۱۵) لیکن انہوں نے (جواب میں کہا) کہ تم تو ہم جیسے بشر کے سوا اور کچھ نہیں اور خداوند رحمن نے کوئی چیز نازل نہیں کی ہے تم صرف جھوٹ بولتے ہو۔

۱۶) انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار آگاہ ہے کہ ہم یقینی طور پر تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔

۱۷) اور ہمارے ذمہ تو واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۱۸) انہوں نے کہا کہ ہم تو تمہیں اپنے لیے فال بد سمجھتے ہیں (اور تمہارا وجود منحوس ہے) اور اگر تم ان باتوں سے دستبردار نہ ہو گے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک سزا ملے گی۔

۱۹) انہوں نے کہا کہ تمہاری نحوست تو خود تمہاری ہی طرف سے ہے، اگر تم اچھی طرح سے غور کرو، بلکہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو۔

تفسیر

بستی والوں کی سرگزشت ایک عبرت ہے

قبل ازیں قرآن، پیغمبر اسلام کی تہمت، سچے مومنین اور ہٹ دھرم منکرین کے بارے میں بحث گزری ہے۔ زیر بحث آیات میں اس ضمن میں سرگزشت امتوں کی کیفیت کا ایک نمونہ بیان ہو رہا ہے۔ ان آیات اور بعد والی چند آیات کے ضمن میں کہ جو مجموعی طور پر ۱۸ آیات بنتی ہیں، چند گزشتہ پیغمبروں کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ یہ انبیاء ایک مشرک اور بت پرست قوم کی ہدایت کے لیے مامور ہوئے تھے۔ مشرکوں نے انہیں "اصحاب القریہ" کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ لوگ مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے اور انجام کار عذاب میں گرفتار ہوئے۔ یہ سرگزشت اس لیے بیان کی گئی ہے تاکہ مشرکین مکہ کے لیے تہیہ ہو اور پیغمبر اکرم اور اس وقت کے تھوڑے سے مومنین کے لیے تسلی کا باعث ہو۔

بہر حال اس سورہ کے قلب میں کہ جو خود قرآن کا دل ہے اس سرگزشت کا ذکر اس زمانے کے مسلمانوں سے اس کی کامل شبہت کی بنا پر ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "تم ان سے سستی والوں کی مثال بیان کرو کہ جس وقت خدا کے رسول ان کی طرف آئے" (واضرب لہم مثلاً اصحاب القریہ اذ جاؤھا المرسلون) یہ

"قریہ" اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں کہ جہاں لوگ جمع ہوں اور کبھی خود انسانوں کو بھی "قریہ" کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جو شہروں کے لیے بھی ہے اور دیہات کے لیے بھی اگرچہ فارسی زبان میں عام طور پر صرف دیہات کے لیے بولا جاتا ہے لیکن عربی زبان میں اور قرآن مجید میں بارہا اہم شہروں اور علاقوں مثلاً مصر اور مکہ وغیرہ پر اطلاق ہوا ہے۔

اس بارے میں کہ شہروں میں سے یہ کونسا شہر تھا، چنانچہ مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ وہ شامات کے شہروں میں سے "انطاکیہ" تھا اور یہ قدیم روم کے مشہور شہروں میں سے تھا اور اب بھی جزائیائی خانہ سے ترکی کا حصہ ہے۔ اس کے بارے میں مزید تفصیل ہم نکات میں بیان کریں گے۔

بہر حال اس سورہ کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شہر کے رہنے والے بت پرست تھے اور یہ رسول انہیں توحید کی دعوت دینے اور شرک کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے ان کے پاس آئے تھے۔

قرآن اس اجمالی بیان کے بعد ان کے قصے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ وقت کہ جب ہم نے دو رسولوں کو ان کی طرف بھیجا لیکن انہوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی، لہذا ہم نے ان دو کی تقویت کے لیے تیسرا رسول بھیجا، ان تینوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف خدا کے بھیجے ہوئے ہیں" (اذ ارسلنا الیہمواشیین فکذبوہما فعززنا بثالث فقالوا انا الیکم مرسلون) یہ

اس طرح پروردگار کے تین رسول اس گمراہ قوم کی طرف آئے (دو پہلے آئے اور ایک بعد ازاں ان کی تقویت کے لیے)۔

اس بارے میں کہ یہ رسول کون تھے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ ان دو

بعض کا نظریہ ہے کہ "اصحاب القریہ" "اضرب" کا پہلا مفعول ہے اور "مثلاً" اس کا دوسرا مفعول ہے کہ جو پہلے مفعول پر مقدم ہوا ہے اور بعض نے اسے "مثلاً" کا بدلہ مراد لیا ہے۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

بعض مفسرین نے لفظ "اذ" کو یہاں "اصحاب القریہ" کا بدلہ مراد لیا ہے اور بعض — اسے فعل معذوف یعنی "اذکر" سے متعلق سمجھتے ہیں۔

کے نام "شمعون" اور "یوحنا" تھے اور تیسرے کا نام "تومس" تھا اور بعض نے ان کے دوسرے نام ذکر کیے ہیں۔

اس بارے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر اور رسول تھے یا حضرت مسیح کے بھیجے ہوئے اور ان کے مانند تھے (اور اگر خدا یہ فرماتا ہے کہ ہم نے انہیں بھیجا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیح کے بھیجے ہوئے بھی خدا ہی کے رسول ہیں)۔ زیر بحث آیات کا ظاہر پہلی تفسیر کے موافق ہے اگرچہ اس نتیجہ میں کہ جو قرآن لینا چاہتا ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس گمراہ قوم نے ان رسولوں کی دعوت پر کیا رد عمل ظاہر کیا؟ قرآن کہتا ہے، انہوں نے بھی وہی بہانہ کیا کہ جو بہت سے سرکش کافروں نے گزشتہ خدائی پیغمبروں کے جواب میں کیا تھا، "انہوں نے کہا، تم تو ہم ہی جیسے بشر ہو اور خدائے رحمن نے کوئی چیز نازل نہیں کی ہے۔ تمہارے پاس جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔" (قالوا ما انتم الا بشر مثلنا وما انزل الرحمن من شيء ان انتم الا تكذبون)۔

اگر خدا کی طرف سے کوئی بھیجا ہوا ہی آنا تھا تو کوئی مقرب فرشتہ ہونا چاہیے تھا، نہ کہ ہم جیسا انسان اور اسی امر کو انہوں نے رسولوں کی تکذیب اور فرمان الہی کے نزول کے انکار کی دلیل خیال کیا۔ حالانکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ پوری تاریخ میں سب رسول نسل آدم ہی سے ہوئے ہیں ان میں حضرت ابراہیمؑ بھی تھے کہ جن کی رسالت سب مانتے تھے یقیناً وہ انسان ہی تھے، اس سے قطع نظر کیا انسانوں کی ضروریات، مشکلات اور تکلیفیں انسان کے علاوہ کوئی اور سمجھ سکتا ہے۔

آیت میں خدا کی صفت رحمانیت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ ممکن ہے کہ یہ اس لحاظ سے ہو کہ خدا ان کی بات کو نفل کرتے ہوئے خصوصیت سے اس صفت کا ذکر کرتا ہے تاکہ ان کا جواب خود ان کی بات ہی سے حل ہو جائے۔ کیونکہ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کہ جس کی رحمت عامہ نے سارے عالم کو گھیر رکھا ہے وہ انسانوں کی تربیت اور رشد و تکامل کی طرف دعوت دینے کے لیے پیغمبر نہ بھیجے؟

یہ احتمال بھی ہے کہ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ وصف رحمن کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ یہ نہیں کہ خداوند مہربان اپنے بندوں کا کام پیغمبروں کے بھیجنے اور مشکل ذمہ داریاں عائد کرنے سے نہیں کرتا وہ تو آزاد رکھتا ہے۔ یہ کمزور اور بے بنیاد منطق اس گروہ کے انکار کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔

پیغمبروں اور امتوں کے ہم نوع ہونے کے فلسفہ کے بارے میں ہم جلد ۱ ص ۱۱۱ (سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۹۴ کے ذیل میں) تفصیل سے بحث کر چکے ہیں (اور ترجمہ دیکھیے)۔

ہر حال یہ پیغمبر اس گمراہ قوم کی شدید اور سخت مخالفت کے باوجود پائیس نہ ہوئے اور انہوں نے کمزوری نہ دکھائی اور ان کے جواب میں کہا: ہمارا پروردگار جانتا ہے کہ یقیناً ہم تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے ہیں" (قالوا ربنا يعلم انما الیکم لمرسلون)۔
"اور ہمارے ذمہ تو واضح اور آشکار طور پر ابلاغ رسالت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے" (وما علینا الا البلاغ المبین)۔

مسئلہ طور پر انہوں نے صرف دعویٰ ہی نہیں کیا اور قسم پر ہی قناعت نہیں کی، بلکہ "بلاغ مبین" کی تعبیر سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے دلائل و معجزات بھی پیش کیے تھے ورنہ ان کا ابلاغ "بلاغ مبین" کا مصداق نہ ہوتا کیونکہ "بلاغ مبین" تو اس طرح ہونا چاہیے کہ حقیقت سب تک پہنچ جائے اور یہ بات یقینی اور حکم دلائل اور واضح معجزات کے سوا ممکن نہیں ہے۔ بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح کی طرح بعض ناقابل علاج بیماروں کو حکم خدا سے، شفا بخشی۔

لیکن یہ دل کے اندھے واضح منطق اور معجزات کے سامنے نہ صرف جھکے نہیں بلکہ انہوں نے اپنی خشنودی اور سختی میں اضافہ کر دیا اور تکذیب کے مرحلے سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے شدید اور شدت عمل کے مرحلے میں داخل ہو گئے "انہوں نے کہا، ہم تو تمہیں خالی بد سمجھتے ہیں تمہارا وجود منحوس ہے اور تم ہمارے شہر کے لیے بد بختی کا سبب ہو" (قالوا اتانا تطییرنا بحکمو)۔

مکن ہے کہ ان انبیاء الہی کے آنے کے ساتھ ہی اس شہر کے لوگوں کی زندگی میں ان کے گناہوں کے زیر اثر یا خدائی تنبیہ کے طور پر بعض مشکلات پیش آتی ہوں۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے نقل ہی کیا ہے کہ ایک مدت تک بادشہ کا نزول منقطع رہا۔ لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ کوئی عبرت حاصل نہیں کی بلکہ اس امر کو پیغمبروں کی دعوت کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

پھر اس پر بس نہیں کی بلکہ کھلی دھمکیوں کے ساتھ اپنی قبیح نیتوں کو ظاہر کیا اور کہا، اگر تم ان باتوں سے دستبردار نہ ہوئے تو ہم یقینی طور پر تمہیں سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک سزا ملے گی (لئن لم تنتھوا النرجسکم ولیمسکم منا عذاب الیم)۔

کیا دردناک سزا (عذاب الیم) سنگسار کرنے کے بارے میں تاکید ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور

"تطییر" کے بارے میں اور خالی یہ لینے اور اس لفظ کے بنیادی مضمون کے متعلق ہم نے جلد ۱ میں سورہ اعراف کی آیت ۱۳۱ کے ذیل میں اور جلد ۸ میں سورہ نمل کی آیت ۷۴ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔
تفسیر قرطبی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

سزا ہے؟ یہ دو احتمال ہیں۔

دوسرا احتمال یہیں زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔ کیونکہ سنگسار کرنا سزا کی بدترین قسم ہے جو کبھی کبھی موت پر بھی منتج ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ "عذاب الیوم" کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہم تمہیں یہاں تک سنگسار کریں گے کہ وہ تمہاری موت کا سبب بن جائے یا یہ کہ سنگسار کرنے کے علاوہ دوسری قسم کی سختیاں ہوں گی جو گزشتہ زمانے کے ظالم لوگ کیا کرتے تھے۔ مثلاً سلاخیاں گرم کر کے آنکھوں میں داخل کرنا یا پھلی ہوتی دھاتا حلق میں ڈالنا اور اسی قسم کے دوسرے عذاب بھی ہم تمہیں دیں گے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ سنگسار کرنا تو جسمانی عذاب تھا لیکن "عذاب الیوم" روحانی عذاب تھا۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ہاں! باطل کے طرفدار اور ظلم و فساد کے حامی چونکہ کوئی منطق پیش کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے لہذا ہمیشہ دھکیوں، دباؤ اور تشدد کا سہارا لیتے ہیں وہ اس بات سے غافل ہیں کہ راہ خدا کے راہرو اس قسم کی دھکیوں کے آگے نہیں جھکتے بلکہ ان کی استقامت میں اور اضافہ ہوتا ہے جس دن انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا ہے اسی روز اپنی جان پھیلی پر رکھ کر ایثار و قربانی کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں۔

یہ وہ مقام تھا کہ خدا کے پیغمبر اپنی منہ بولتی منطق کے ساتھ ان کی فضول ہذیبانی باتوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہو گئے اور "انہوں نے کہا: تمہاری بد بختی اور نحوست خود تمہاری ہی طرف سے ہے اور اگر تم ٹھیک طرح سے غور کرو تو اس حقیقت سے واقف ہو جاؤ گے" (قالوا اظلمتم معکم امین ذکرتکم)۔ اگر بد بختی اور نحوست حادثات تمہارے معاشرے کو گھیرے ہوئے ہیں اور برکات الہیہ تمہارے درمیان میں سے اٹھ گئی ہیں تو اس کا عامل اپنے اندر اپنے پست افکار اور قبیح اعمال میں تلاش کرو نہ کہ بہاری دعوت میں۔ یہ تمہیں تو ہو کہ جنہوں نے بت پرستی، خود غرضی، ظلم اور شہوت پرستی سے اپنی زندگی کی فضا کو تیز و تاریک بنا ڈالا ہے اور خدا کی برکات کو اپنے آپ سے منقطع کر کے رکھ دیا ہے۔

بعض مفسرین نے "امین ذکرتکم" کو ایک مستقل مطلب کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خدا کے نبی آئیں اور تمہیں نصیحت کریں اور ڈرائیں تو کیا اس کی جزایہ ہے کہ تم انہیں عذاب اور سزا کی دھکیاں دو اور ان کے دجود کو نحوست خیال کرو؟ وہ تو تمہارے لیے نورو

لے اور یہ اس صورت میں ہے کہ "لنرجعنکم" "رجع" کے مادہ سے گایاں دینے، ناسزا کہنے اور تہمت لگانے کے معنی میں ہو۔

ہدایت اور نیر و برکت کا تحفہ لائے ہیں تو کیا اس خدمت کا جواب وہ دھکیاں اور بد کلامیاں ہیں جو رات دن تم انہیں دیتے رہتے ہو یہ

آخر کار پروردگار کے ان بھیجے ہوئے افراد کی آخری گفتگو ان سے یہ تھی کہ "تم حد سے بڑھے ہوئے اور تجاؤز کرنے والے لوگ ہو" (بل افسو قوم مسرفون)۔

تمہاری اصلی بیماری وہی تمہارا حد سے تجاؤز ہے اگر تم توحید کا انکار کرتے ہوئے شرک کی طرف رخ کرتے ہو تو اس کی وجہ حق سے تجاؤز ہے اور اگر تمہارا معاشرہ بڑے انجام میں گرفتار ہوا ہے تو اس کا سبب بھی گناہ میں زیادتی اور شہوات میں آلودگی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر غیر خواہوں کی غیر خواہی کے جواب میں تم انہیں موت کی دھمکی دیتے ہو تو یہ بھی تمہارے تجاؤز کی بنا پر ہے۔

ہم ان رسولوں کے تاریخی واقعہ اور ان حوادث کے وقوع کے مقام کے بارے میں اس داستان کی باقی ماندہ آیات کی تفسیر کے بعد تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

بہر حال جملہ شرطیہ کی جزا عذوت ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: امین ذکرتکم بالتموننا بھذہ الامور۔ یا۔ امین ذکرتکم علمتو صدق ما قلنا۔

- ۲۰ وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ۝
- ۲۱ اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْئَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مَهْتَدُونَ ۝
- ۲۲ وَمَالِي لَأَعْبُدَ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝
- ۲۳ ءَأَتَّخِذُ مِنْ دُونِهِ آلِهَةً إِنْ يُرِدْنِ الرَّحْمَنُ بِضُرٍّ لَأُنْزِلَنَّ سَحَابًا مُمْسِكًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا لِئَلَّا يَعْلَمُوا أَيَّ آلِهَةٍ نَحْنُ عَابِدُونَ وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَلِكَ وَلَئِنْ لَأُتَوَلَّى أَعْقَابُ الظَّالِمِينَ ۝
- ۲۴ إِنْ أَمِنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُونَ ۝
- ۲۵ قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يَلَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ ۝
- ۲۶ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ ۝
- ۲۷ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى قَوْمِهِ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ جُندٍ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِينَ ۝
- ۲۸ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ خُمُودًا ۝
- ۲۹ يُحَسِرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝

ترجمہ

۲۰ ایک (با ایمان) مرد شہر کے دور دراز مقام سے دوڑتا ہوا آیا (اور) اُس

- نے کہا: اے میری قوم! رسولانِ خدا کی پیروی کرو۔
- ۲۱ ایسے لوگوں کی پیروی کر لو کہ جو تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے اور وہ خود ہدایت یافتہ ہیں۔
- ۲۲ میں کیوں اس ہستی کی پرستش نہ کروں کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔
- ۲۳ کیا میں اسے چھوڑ کر دوسرے معبود اپنالوں جبکہ خدا نے رحمن چاہے کہ مجھے نقصان پہنچے تو اُن کی شفاعت میرے لیے کچھ بھی فائدہ مند نہ ہو اور نہ ہی وہ مجھے (اس کے عذاب سے) نجات دلا سکیں۔
- ۲۴ اگر میں ایسا کروں تو پھر تو میں کھلی گمراہی میں ہوں گا۔
- ۲۵ (اسی بنا پر) میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہوں، میری باتیں کان لگا کر سنو۔
- ۲۶ (آخر کار انہوں نے اُسے شہید کر دیا) اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا تو اس نے کہا کہ اے کاش میری قوم کو علم ہوتا۔
- ۲۷ کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا ہے اور مکرم و محترم لوگوں میں سے قرار دیا ہے۔
- ۲۸ ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر کوئی لشکر آسمان سے نہیں بھیجا اور نہ ہی ہماری یہ سنت تھی۔
- ۲۹ صرف ایک آسمانی لٹکار تھی، پس اچانک سب خاموش ہو گئے۔

۳۰) افسوس ہے ان بندوں پر کہ جن کی ہدایت کے لیے جو بھی پیغمبر آیا وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے۔

تفسیر

ایک جان بکف مجاہد

زیر بحث آیات میں ان رسولوں کی جدوجہد کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے تھوڑے سے مومنین نے بڑی شجاعت سے ان انبیاء کی حمایت کی اور وہ کافر و مشرک اور ہٹ دم اکثریت کے مقابلے میں کھڑے ہوئے اور جب تک جان باقی رہی انبیا۔ الہی کا ساتھ دیتے رہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "ایک (با ایمان) مرد شہر کے دروازے کے ساتھ بھاگتا ہوا کافر گروہ کے پاس آیا اور کہا: اے میری قوم! مرسلین خدا کی پیروی کرو اور جو جاء من اقصا المدينه رجل یسعی قال یا قوم اتبعوا المرسلین۔"

اس شخص کا نام اکثر مفسرین نے "صیب بخار" بیان کیا ہے۔ وہ ایسا شخص تھا کہ جو پروردگار کے پیغمبروں کی پہلی ہی ملاقات میں ان کی دعوت کی حقانیت اور ان کی تعلیمات کی گہرائی کو پا گیا تھا۔ وہ ایک ثابت قدم اور مصمم کارموس ثابت ہوا۔ جس وقت اُسے خبر ملی کہ وسط شہر میں لوگ ان انبیاء الہی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور شاید انہیں شہید کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس نے خاموش رہنے کو جائز نہ سمجھا، چنانچہ "یسعی" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی تیزی اور جلدی کے ساتھ مرکز شہر تک پہنچا اور جو کچھ اس کے بس میں تھا حق کی حمایت اور دفاع میں فرود گزاشت نہ کی۔

"رجل" کی تعبیر ناشائستہ شکل میں شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک عام آدمی تھا، کوئی قدرت و شوکت نہیں رکھتا تھا اور اپنی راہ میں یکہ و تنہا تھا لیکن اس کے باوجود ایمان کے نور و حرارت نے اس کا دل اس طرح سے روشن اور مستعد کر رکھا تھا کہ راہ توحید کے مخالفین کی سخت مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میدان میں کود پڑا اس کا واقعہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ آغاز اسلام میں مومنین کی جو بہت تھوڑی سی تعداد میں تھے اسے اپنے لیے نمونہ عمل سمجھیں اور جان لیں کہ تمہارا ایک مومن بھی پوری طرح ذمہ دار ہوتا ہے اور اس کے لیے خاموش رہنا جائز نہیں ہے۔

"اقصی المدينه" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان رسولوں کی دعوت شہر کے دور دراز کے مقامات تک پہنچ گئی تھی اور آمادہ دلوں میں اثر کر چکی تھی۔ اس سے قطع نظر کہ شہر کے دروازے

کے علاقے ہمیشہ ایسے مستضعفین کے مرکز ہوتے ہیں کہ جو حق کو قبول کرنے کے لیے زیادہ آمادہ و تیار ہوتے ہیں اس کے برعکس شہروں میں نسبتاً خوشحال لوگ زندگی بسر کرتے ہیں جن کو حق کی طرف راغب کرنا آسانی کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔

"یا قوم" (اے میری قوم) کی تعبیر اس شخص کی اہل شہر کے بارے میں ہمدردی کو بیان کرتی ہے اور رسولوں کی پیروی کی دعوت ایک مخلصانہ دعوت ہے جس میں اس کی ذات کے لیے کوئی فائدہ اور نفع نہیں ہے۔

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ یہ مومن مجاہد اپنے شہر والوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کس منطق اور دلیل کو اختیار کرتا ہے۔

اس نے پہلے یہ دلیل اختیار کی کہ: "ایسے لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے اپنی دعوت کے بدلے میں کوئی اجر طلب نہیں کرتے" (اتبعوا من لا یسئلکم اجرا)۔

یہ ان کی صداقت کی پہلی نشانی ہے کہ ان کی دعوت میں کسی قسم کی مادی منفعت نہیں ہے۔ وہ تم سے کوئی مال چاہتے ہیں اور نہ ہی جاہ و مقام، یہاں تک کہ وہ تو تشکر و سپاس گزاری بھی نہیں چاہتے اور نہ ہی کوئی اور صلہ۔

عظیم انبیاء کے خلوص، بے نرضی اور ان کی صفائے قلب کی نشانی کے طور پر بارہا آیات قرآنی میں اس بات کا ذکر آیا ہے۔ صرف سورہ شعراء میں پانچ مرتبہ "وما اسئلکم علیہ من اجر" کی تکرار ہے۔ اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: (علاوہ ازیں) یہ رسول ہیں ان کی دعوت کے مطالب اور ان کی باتوں سے مسلم ہوتا ہے کہ وہ ہدایت یافتہ افراد ہیں (وہم مہتدون)۔

یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ کسی کی دعوت کو قبول نہ کرنا یا تو اس بنا پر ہوتا ہے کہ اس کی دعوت حق نہیں ہے اور وہ بے راہ ردی اور گمراہی کی طرف بھیج رہا ہے یا یہ کہ ہے تو حق لیکن اس کو پیش کرنے والے اس کے ذریعے کوئی خاص مفاد حاصل کر رہے ہیں کیونکہ یہ بات خود اس قسم کی دعوت کے بارے میں بدگمانی کا ایک سبب ہے لیکن جب نہ وہ بات ہو اور نہ یہ، تو پھر تامل و تردد کے کیا معنی؟

اس کے بعد قرآن ایک اور دلیل پیش کرتا ہے اور اصل توحید کے بارے میں بات کرتا ہے کیونکہ یہی انبیاء کی دعوت کا اہم ترین نکتہ ہے۔ کہتا ہے: "میں اس ہستی کی پرستش کیوں نہ کروں کہ جس نے مجھے پیدا

کیا ہے (رومانی لا اعبد الذی فطرنی)۔

وہ ہستی پرستش کے لائق ہے کہ جو خالق و مالک ہے اور نعمات بخشنے والی ہے، نہ کہ یہ بت کہ جن سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ فطرت سلیم کہتی ہے کہ خالق کی عبادت کرنا چاہیے نہ کہ اس بے قدر و قیمت مخلوق کی۔ فطرنی (جس نے مجھے پیدا کیا ہے) ممکن ہے اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو کہ میں جس وقت اپنی فطرت اصلی اور سرشت حقیقی پر خود کرتا ہوں تو ابھی طرح سے محسوس کرتا ہوں کہ میرے اندر سے ایک ایسی رسا آواز بلند ہوتی ہے کہ جو مجھے میرے خالق کی پرستش کی طرف دعوت دے رہی ہے۔ وہ دعوت کہ جو عقل و خرد کے ساتھ ہم آہنگ ہے، میں "فطرت" اور "عقل و خرد" کی اس ڈھری دعوت کو کس طرح اہمیت نہ دوں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ شخص یہ نہیں کہتا کہ "مالک فلا تعبدون الذی فطركم" (تم اس خدا کی عبادت کیوں نہیں کرتے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے) بلکہ کہتا ہے کہ "میں کیوں اس طرح نہ کروں" یعنی خود اپنے آپ سے شروع کرتا ہے تاکہ بات زیادہ مؤثر ہو۔

اس کے بعد خبردار کرتا ہے کہ یاد رکھو "تم سب کے سب آخر کار اکیلے ہی اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے" (والیہ ترجعون)۔

یعنی نہ صرف تمہارا اس جہان کی زندگی میں اس کے ساتھ تعلق ہے بلکہ دوسرے جہان میں بھی تمہاری ساری سر نوشت اسی کے دست قدرت میں ہوگی ہاں! اسی کی طرف رخ کرو کہ دونوں جہانوں میں تمہاری سر نوشت جس کے اختیار میں ہے۔

اپنے تیسرے استدلال میں بتوں کی کیفیت بیان کرتا ہے اور خدا کے لیے عبودیت کے اثبات کو، بتوں کی عبودیت کی نفی کے ذریعے نکیل کرتے ہوئے کہتا ہے: کیا میں خدا کے سوا اور عبود اپنالوں۔ جبکہ خدائے رحمن مجھے کچھ نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے معمولی سا فائدہ بھی نہ دے گی اور وہ مجھے اس کے عذاب سے نہ بچا سکیں گے (ما اتخذ من دونه الهة ان یرد الرحمن بضر لا تغن عني شفاعتھو شیئاً ولا ینقذون)۔

اس مقام پر پھر اپنے بارے میں بات کرتا ہے تاکہ حکم اور آمریت کا لہجہ نہ ہو اور دوسرے اپنا حجاب

۱۔ "رومانی لا اعبد.... میں کچھ محذوف ہے اور وہ تقدیر میں اس طرح تھا،

ای شیئی اذا المر اعبد خالقہ (جمع البیان)۔

بعض مفسرین نے "مالی" کو "لغو" کیوں کے معنی میں لیا ہے۔ (تبیان زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

وہ دراصل بت پرستوں کے ہمارے ہی نشانہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم تو ان کی اس بنا پر پرستش کرتے ہیں کہ وہ بارگاہِ خدا میں ہمارے شیع ہوں۔ کہتا ہے: کونسی شفاعت اور کونسی مدد و نجات؟ وہ تو خود تمہاری مدد کے محتاج ہیں، عبادت کی نکلنے میں وہ تمہارا کیا کام دے سکتے ہیں۔

"الرحمن" کی تعبیر یہاں پر خدا کی رحمت کی دعوت اور تمام نعمتوں کی اسی کی طرف بازگشت ہونے کی جانب اشارہ ہے اور یہ خود توحیدِ عبادت کی دلیل ہے اس کے علاوہ یہ اس نکتے کو بھی بیان کرتی ہے کہ خدائے رحمن کسی کے لیے ضرر اور نقصان نہیں چاہتا مگر یہ کہ انسان کی غلط روش اپنے انتہائی درجہ کو پہنچ جانتے جو اس کو خدا کی وسیع رحمت سے دور کر کے اس کے غضب کی وادی میں گرفتار کر دے۔

اس کے بعد یہ مجاہد مومن مزید تاکید و توضیح کے لیے کہتا ہے: اگر میں اس قسم کے بتوں کی پرستش کروں اور انہیں پروردگار کا شریک قرار دوں تو میں کھلی گمراہی میں ہوں گا (انی اذا لقی ضلال میںین)۔ اس سے بڑھ کر کھلی گمراہی کیا ہوگی کہ عاقل و باشعور انسان ان بے شعور موجودات کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور انہیں زمین و آسمان کے خالق کے برابر جانے۔

اس مجاہد مومن نے ان استدلالات اور مؤثر و وسیع تبلیغات کے بعد ایک پُر تاثر آواز کے ساتھ سارے مجمع کے سامنے اعلان کیا سب لوگ جان لو کہ میں ان رسولوں کی دعوت پر ایمان لایا ہوں اور میں نے ان رسولوں کی دعوت کو قبول کر لیا ہے (انی امنت برسکھ)۔

"اس بنا پر میری باتوں کو سنو" اور جان لو کہ میں ان رسولوں کی دعوت پر ایمان رکھتا ہوں اور تم میری بات پر عمل کرو کہ یہی تمہارے فائدہ کی بات ہے (فاسمعون)۔

اس جگہ میں اور اسی طرح "انی امنت برسکھ" میں، مخاطب کون ہے؟ اس بارے میں یہ عرض ہے کہ گزشتہ آیات کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہی مشرکین اور بت پرستوں کا گروہ ہے کہ جو اس شہر میں رہتا تھا، "رسکھ" (تمہارا پروردگار) کی تعبیر بھی اس معنی سے تضاد نہیں رکھتی کیونکہ یہ تعبیر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں استدلالات توحید بیان کرتے ہوئے آئی ہے۔

نیز "فاسمعون" (میری بات پر کان دعو) بھی اس بات کے ساتھ کہ جو بیان ہوئی کوئی مخالفت نہیں رکھتا کیونکہ وہ یہ لفظ انہیں اپنی گفتگو کی پیروی کرنے کی دعوت کے لیے کہتا ہے۔ جیسا کہ مومن، اہل فرعون کی داستان میں آیا ہے۔ وہ فرعونوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

یا قوم اتبعون اهدکم سبیل المرشاد

۱۔ آیت ۳، ۲۲ یونس - ۳ ہود - ۵۲ ہود - ۲۲ نمل - ۲۹ کف وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔

”اسے میری قوم میری پیروی کرتا کہ میں تمہیں یہ سب سے راستے کی ہدایت کروں۔“ (مومن - ۳۸)

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس جگہ میں وہ رسول مخاطب ہیں کہ جو خدا کی طرف سے اس قوم کو دعوت دینے کے لیے آئے تھے اور - ربکم کی تعبیر اور فاسمہون کو اس پر فریضہ قرار دیا ہے، اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

آیت اب دیکھتے ہیں کہ اس پاکباز مومن کے جواب میں اس ہرٹ دھم قوم کا رد عمل کیا تھا۔ قرآن نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کہی لیکن بعد والی آیات کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے شہید کر دیا۔

ہاں! اس کی پُرجوش اور ولولہ انگیز گفتگو قوی اور طاقتور استدلالات اور ایسے عمدہ و دلنشین نکات کے ساتھ تھی۔ مگر اس سے نہ صرف یہ کہ ان سیاہ دلوں اور سگڑو غرور سے بھرے ہوئے سردوں پر کوئی مثبت اثر نہیں پڑا بلکہ کینہ و عداوت کی آگ ان کے دلوں میں ایسی بھڑکی کہ وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور انتہائی سنگدلی اور بے رحمی سے اس شجاع مرد مومن کی جان کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے اسے پتھر مارنے شروع کیے اور اس کے جسم کو اس طرح سے پتھروں کا نشانہ بنایا کہ وہ زمین پر گر پڑا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اس کے لبوں پر سلسل یہ بات تھی کہ ”خداوند! میری اس قوم کو ہدایت فرما کہ وہ جانتے نہیں ہیں۔“

ایک اور روایت کے مطابق اسے اس طرح پاؤں کے نیچے روندنا کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ لیکن قرآن اس حقیقت کو ایک عمدہ اور سرسبز جملہ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ”اُسے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا“ (قبیل ادخل الجنة)۔

یہ وہی تعبیر ہے کہ جو راہ خدا کے شہیدوں کے بارے میں قرآن کی دوسری آیات میں بیان ہوئی ہے:

ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتاً بل احياء عند ربهم يرزقون

”یہ گمان نہ کرو کہ جو لوگ راہ خدا میں قتل کیے گئے ہیں وہ مردہ ہیں بلکہ وہ تو زندہ جاوید ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق پاتے ہیں۔“ (آل عمران - ۱۶۹)

جاذب توجہ بات یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ مرد مومن شہادت پاتے ہی جنت میں داخل ہو گیا۔ ان دونوں کے درمیان اس قدر کم فاصلہ تھا کہ قرآن مجید نے اپنی لطیف تعبیر میں اس

تفسیر قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تفسیر مجمع البیان، تبیان، تفسیر ابو الفتح رازی وغیرہ۔

کی شہادت کا ذکر کرنے کے بجائے اس کے بہشت میں داخل ہونے کو بیان کیا۔ شہیدوں کی منزل یعنی بہشت سعادت - کس قدر نزدیک ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں بہشت سے مراد برزخ والی بہشت ہے کیونکہ قرآنی آیات سے بھی اور روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہشت جاوداں مومنین کو قیامت میں نصیب ہوگی اور دوزخ بھی بدکاروں کے لیے اسی طرح ہے۔

اس بنا پر عالم برزخ میں ایک دوسری جنت دوزخ ہے کہ جو قیامت کی جنت دوزخ کا ایک نمونہ ہے جیسا کہ امیر المومنین علیؑ کی ایک روایت میں قبر کے بارے میں منقول ہوا ہے:

القبر اما روضة من رياض الجنة او حفرة من حفرة النيران۔

”قبر جنت کے باغوں میں ہے ایک باغ یا جنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔“

بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ جملہ اس خطاب کی طرف اشارہ ہے کہ جو قیامت کے دن اس مجاہد اور ایثار پیشہ مومن سے کیا جائے گا اور یہ مستقبل کا پہلو دکھاتا ہے نہ کہ حال کا۔ یہ احتمال ظاہر آیت کے خلاف ہے۔

بہر حال اس شخص کی پاک روح آسمانوں کی طرف، رحمت الہی کے قرب اور بہشت نعیم کی طرف پرواز کر گئی اور وہاں اسے صرف یہ آرزو تھی کہ: ”اے کاش میری قوم جان لیتی“ (قال یایلت قومی بیلون)۔

”اے کاش وہ جان لیتے کہ میرے پروردگار نے مجھے اپنی بخشش اور عنوسے نوازا ہے اور مجھے محرم لوگوں کی صف میں جگہ دی ہے۔“ (بما غفر لی ربی وجعلنی من المعکمین)۔

اسے کاش ان کی آنکھ تھی بین ہوتی۔ ایسی آنکھ کہ جس پر مادی دنیا کے منہم پر دے پڑے ہوتے نہ ہوتے اور جو کچھ اس پر دے کے پیچھے ہے اسے دیکھ لیتے۔ یعنی وہ ان سب نعمتوں اور خدا کے اکرام و الطاف کو دیکھ لیتے اور جان لیتے کہ ان کی امانتوں کے بدلے خدا نے میرے حق میں کیا لطف فرمایا ہے! اے کاش! وہ دیکھتے اور ایمان لے آتے لیکن افسوس!

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر گرامی اسلامؐ نے فرمایا:

انہ نصح لہم فی حیاتہ وبعد موتہ۔

لہ بحار الانوار، جلد ۶ ص ۲۱۸۔

لہ ”ما“ ”بما غفر لی ربی“ میں مصدر یہ ہے یا موصول ہے یا استفہامیہ؟ تین احتمال ذکر کیے گئے ہیں لیکن استفہامیہ والا احتمال بعید نظر آتا ہے۔ دوسرے دو احتمالوں میں سے موصول والا احتمال زیادہ تر صحیح معلوم ہوتا ہے اگرچہ معنی کے لحاظ سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

”اس باایمان شخص نے اپنی زندگی میں بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور موت کے بعد

بھی ان کی ہدایت کی آرزو رکھتا تھا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ وہ پہلے خزان الہی کی نعمت کا ذکر کرتا ہے اور پھر اس کے اکرام کا۔ کیونکہ پہلے انسان کی روح کو گناہوں کی آلودگی سے مغزرت کے پانی کے ساتھ پاک ہونا چاہیے اور جب پاک ہو جاتے تو پھر بساط قرب اور اکرام الہی کا مقام پاتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ خدا کا اکرام و اعزاز اور بزرگی — بہت سے بندوں کو نصیب ہوتی ہے اور اصولاً ”تقویٰ“ اور ”اکرام“ دوش بدوش آگے بڑھتے ہیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

ان اکرمکرم عند اللہ اتقاکم (حجرات - ۱۳)۔

لیکن ”اکرام“ بطور کامل اور کسی شرط کے بغیر قرآن مجید میں دو گروہوں کے بارے میں آیا ہے۔ پہلا گروہ خدا کے مقرب فرشتے ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ:

بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول و هم بامزہ یعملون

”وہ خدا کے مکرم بندے ہیں کہ جو بات کرنے میں اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے فرمان پر کار بند رہتے ہیں“ (انبیاء - ۲۶-۲۷)

اور دوسرے کامل الایمان بندے کہ جنہیں قرآن نے ”مخلصین“ کے نام سے یاد کیا ہے اور ان کے بارے میں کہتا ہے:

اولئک فی جنتک مکرمون

”وہ جنت کے باغوں میں مکرم ہوں گے قدر ہوں گے“ (مجادلہ - ۳۵)۔

بہر حال یہ تو اس مرد مومن اور سچے مجاہد کا انجام تھا کہ جس نے اپنی ذمہ داری کی انجام دہی اور خدا کے پیغمبروں کی حمایت میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور آخر کار شریعت شہادت نوش کیا اور خدا کے چار رحمت میں جگہ پائی۔

لیکن آئیے دیکھیں کہ اس عالم اور سرکش قوم کا انجام کیا ہوا؟

اگرچہ قرآن میں ان تین پیغمبروں کے انجام کار کے متعلق — کوئی بات نہیں کی گئی کہ جو اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔ لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس قوم نے، اس مرد مومن کو شدید کرنے کے علاوہ اپنے

پیغمبروں کو بھی شدید کر دیا جبکہ بعض نے تصریح کی ہے کہ اس مرد مومن نے لوگوں کو اپنے ساتھ مشغول رکھا تاکہ وہ پیغمبر اس سازش سے بچ جائیں۔ کہ جو ان کے خلاف کی گئی تھی۔ اور کسی پر اس جگہ منتقل ہو جائیں لیکن اس قوم پر خدا کا درد ناک عذاب نازل ہوا کہ جس کی طرف بعد والی آیات میں ارشاد ہوا ہے یہ امر پہلے قول کی ترویج کے لیے قرینہ ہے۔ اگرچہ ”من بعدہ“ (اس مرد مومن کی شہادت کے بعد) کی تعبیر نزول عذاب کے بارے میں اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ دوسرا قول صحیح ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

ہم نے دیکھا کہ شہر انطاکیہ کے لوگوں نے خدا کے پیغمبروں کی یکسے مخالفت کی۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے: ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر کوئی لشکر آسمان سے نہیں بھیجا اور اصولاً ہمارا یہ طریقہ ہی نہیں ہے کہ ایسی سرکش اقوام کو نابود کرنے کے لیے ان امور سے کام لیں (وما انزلنا علی قومہ من بعدہ من جند من السماء وما کنا منزلین)۔

ہم ان امور کے عجاج نہیں ہیں۔ صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ جس سے ہم ان سب کو خاموش کر دیں اور انہیں دیار عدم کی طرف بھیج دیں اور ان کی زندگی کو درہم برہم کر دیں۔

صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ ان کے حیات کے عوامل ہی ان کی موت کے عامل میں بدل جائیں اور مختصر سے وقت میں ان کی زندگی کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیں۔

پھر قرآن مزید کہتا ہے: ”صرف ایک آسمانی بیج پیدا ہوئی، ایسی بیج کہ جو بلا دینے والی اور موت کا پیغام تھی اچانک سب پر موت کی خاموشی طاری ہو گئی“ (ان کانت الاصبحة واحدة فاذا هم خامدون)۔

کیا یہ بیج بجلی کی کرک تھی کہ جو بادل سے اٹھی اور زمین پر جا پڑی اور ہر چیز کو لرزہ بر اندام کر دیا اور تمام عمارتوں کو تباہ کر دیا اور وہ سب خوف کی شدت سے موت کی آغوش میں چلے گئے؟

یا یہ ایسی بیج تھی کہ جو زمین کے اندر سے ایک شدید زلزلے کی صورت میں اٹھی اور فضا میں دھماکہ ہوا اور اس دھماکے کی لہر نے انہیں موت کی آغوش میں سلا دیا۔

ایک بیج وہ جو کچھ بھی تھی، لہجہ سے زیادہ نہ تھی۔ وہ ایک ایسی آواز تھی کہ جس نے سب آوازوں کو خاموش کر دیا اور ایسی بلا دینے والی تھی کہ جس نے تمام حرکتوں کو بے حرکت کر دیا اور خدا کی قدرت ایسی ہی ہے اور ایک گمراہ اور بے ثمر قوم کا انجام یہی ہوتا ہے۔

بسوزند بوب درختان بی بر سزا خود ہیں است مرئی بری را

”بے ثمر درختوں کی لکڑی جلانے ہی کے کام آتی ہے کیونکہ بے ثمر چیز کی سزا یہی ہے“

آخری زیر بحث آیت میں بہت ہی جامع اور موثر انداز میں تاریخ کے تمام سرکشوں کے دعوتِ ابراہیم سے ٹکراؤ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "افسوس ہے ان بندوں پر کہ کوئی ایسا پیغمبران کی ہدایت کے نہیں آیا جس کا انہوں نے مذاق نہ اڑایا ہو یا حصرۃ علی العباد مایا تیہم من رسول الا کافرا بہ (پستزدون)۔"

دائے سے ان لوگوں پر کہ جنہوں نے خدا کی رحمت کا دریچہ خود سے بند کر لیا۔

افسوس ان پر کہ جنہوں نے اپنی ہدایت کے چراغ توڑ ڈالے۔

ہائے سعادت سے محروم وہ لوگ کہ جو نہ صرف پیغمبروں کی نڈا پر کان نہیں دھرتے بلکہ ان کا مذاق اڑانے لگتے ہیں اور پھر انہیں تہ تیغ کر دیتے ہیں حالانکہ گزشتہ بے ایمان سرکشوں کا بُرا انجام دیکھ چکے ہیں اور ان کے دردناک انجام کے بارے میں سن چکے ہیں یا تاریخ کے صفحات میں پڑھ چکے ہیں لیکن انہوں نے کچھ بھی تو عبرت حاصل نہیں کی اور انہوں نے بھی اسی وادی میں قدم رکھ دیا اور اس انجام میں گرفتار ہو گئے۔

واضح رہے کہ یہ جملہ خدا کی گفتار ہے چونکہ یہ تمام آیات اس کی طرف سے بیان ہو رہی ہیں۔ البتہ "حسرت" کا لفظ۔ ان واقعات پر کہ جن کے بارے میں انسان سے کچھ ہوتا ہو نہ سکے اندرون پریشانی کے معنی میں ہوتا ہے۔ خدا کے بارے میں یہ لفظ کوئی معنی نہیں رکھتا جیسا کہ "خشم" اور "غضب" اور اس قسم کے دیگر امور بھی اس کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان بد بختوں کا حال ایسا تھا کہ جو انسان بھی ان کی کیفیت سے آگاہ ہوتا، وہ متاسف و متاثر ہوتا کہ وہ نجات کے ان تمام وسائل کے ہوتے ہوئے اس ہولناک گرداب میں کیوں غرق ہو گئے۔

"عباد" (خدا کے بندے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تعجب اس چیز پر ہے کہ خدا کے بندے کہ جو اس کی نعمتوں میں مستغرق ہیں اس قسم کا جرم کرتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ انطاکیہ کے رسولوں کی داستان: انطاکیہ، شام کے علاقہ کا ایک قدیم شہر ہے بعض کے قول کے مطابق یہ شہر مسیح علیہ السلام سے تین سو سال پہلے تعمیر ہوا۔ یہ شہر قدیم زمانے میں دولت و ثروت اور علم و تجارت کے لحاظ سے مملکتِ روم کے تین بڑے شہروں میں سے ایک شمار ہوتا تھا۔ شہر انطاکیہ حلب سے ایک سو کلومیٹر سے کچھ کم اور اسکندریہ سے تقریباً ساٹھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "حسرت" اس چیز پر غم کے معنی میں ہے کہ جو انسان کے ہاتھ سے نکل جاتا۔

یہ شہر قلعہ ثانی کے زمانہ میں ابو عبیدہ جراح کے ہاتھوں فتح ہوا اور وہ میوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس میں رہنے والے لوگ عیسائی تھے۔ انہوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا اور اپنے مذہب پر باقی رہ گئے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ شہر فرانسیزیوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اہل انطاکیہ زیادہ تر عیسائی اور فرانسیسیوں کے ہم مذہب تھے اس لیے جب فرانسیسیوں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو اس بات کے پیش نظر کہ ان کے شام سے نکلنے کے بعد اس ملک میں ہونے والے فتنہ و فساد سے عیسائیوں کو کوئی گزند نہ پہنچے انہوں نے اسے ترکی کے حوالے کر دیا۔

انطاکیہ عیسائیوں کی نگاہ میں اسی طرح سے دوسرا مذہبی شہر شمار ہوتا ہے جس طرح سے مسلمانوں کی نظر میں مدینہ ہے اور ان کا پہلا شہر بیت المقدس ہے کہ جس سے حضرت عیسیٰ نے اپنی دعوت کی ابتدا کی اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے والوں میں سے ایک گروہ نے انطاکیہ کی طرف ہجرت کی اور پولس اور برنابا شہروں کی طرف گئے۔ انہوں نے لوگوں کو اس دین کی طرف دعوت دی۔ وہاں سے دین عیسوی نے وسعت حاصل کی۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں اس شہر کے بارے میں (زیر بحث آیات میں) خصوصیت کے ساتھ گفتگو ہوئی ہے۔

مفسر عالی قدر طبری مجمع البیان میں کہتے ہیں: حضرت عیسیٰ نے حواریین میں سے اپنے دو نمائندے انطاکیہ کی طرف بھیجے جس وقت وہ شہر کے پاس پہنچے تو انہوں نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ جو چند بھیڑیس چرانے کے لیے لایا تھا۔ یہ "حبیب" صاحب یس تھا۔ انہوں نے اسے سلام کیا۔ بوڑھے نے جواب دیا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم عیسیٰ کے نمائندے ہیں، ہم اس لیے آئے ہیں کہ تمہیں بتوں کی عبادت کے بجائے خدائے رحمان کی طرف دعوت دیں۔

بوڑھے نے کہا کہ کیا تمہارے پاس کوئی معجزہ یا نشانی بھی ہے؟

انہوں نے کہا: ہاں! ہم بیماروں کو شفا دیتے ہیں اور مادر زاد اندھوں اور برص میں مبتلا لوگوں کو حکمِ خدا سے صحت و تندرستی بخشتے ہیں۔

فرہنگ قصص قرآن مادہ "انطاکیہ" ص ۲۲۔

"پولس" مشہور عیسائی مبلغ ہے۔ اس نے حضرت عیسیٰ کے بعد عیسائیت پھیلانے میں بہت کوشش کی ہے اور "برنابا" کا اصلی نام "یوسف" ہے، اور وہ "پولس" اور "مرقس" کے اصحاب میں سے تھا۔ اس کی ایک انجیل ہے جس میں پیغمبر اسلام کے ظہور کی بہت زیادہ بشارتیں نظر آتی ہیں۔ لیکن عیسائی اسے غیر قانونی شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایک مسلمان نے بھی ہے۔

تفسیر ابوالفتح رازی حاشیہ از مرحوم عالم بزرگوار شہرانی۔

لوڑے نے کہا: میرا ایک بیار بیٹا ہے کہ جو سالہا سال سے بستر پر پڑا ہے۔

انہوں نے کہا: ہمارے ساتھ چلو تاکہ ہم تمہارے گھر جا کر اس کا حال معلوم کریں۔

لوڑھا ان کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے اس کے بیٹے پر ہاتھ پھیرا تو وہ صبح وصال اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی اور خدا نے اس کے بعد بیماروں میں سے ایک کثیر گروہ کو ان کے ہاتھ سے شفا بخشی۔

ان کا بادشاہ نیت پرست تھا۔ جب اس تک خبر پہنچی تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور ان سے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟

انہوں نے کہا: کہ ہم عیسیٰ کے فرستادہ ہیں، ہم اس لیے آئے ہیں کہ یہ موجودات جو نہ سننے میں اور نہ دیکھتے ہیں ان کی عبادت کے بجائے ہم تمہیں اس کی عبادت کی طرف دعوت دیں جو سننا بھی ہے اور دیکھنا بھی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کیا ہمارے خداؤں کے علاوہ کوئی اور معبود بھی موجود ہے؟

انہوں نے کہا: ہاں، وہی کہ جس نے تجھے اور تیرے معبودوں کو پیدا کیا ہے۔

بادشاہ نے کہا: اٹھ جاؤ کہ میں تمہارے بارگاہ میں کچھ سوچ بچار کروں۔

یہ ان کے لیے ایک دھمکی تھی۔ اس کے بعد لوگوں نے ان دونوں کو بازار میں پکڑ کر مارا پیٹا۔

لیکن ایک دوسری روایت میں ہے کہ عیسیٰ کے ان دونوں نمائندوں کو بادشاہ تک رسائی حاصل نہ ہوئی اور ایک مدت تک وہ اس شہر میں رہے۔ ایک دن بادشاہ اپنے محل سے باہر آیا ہوا تھا تو انہوں نے بغیر کسی آواز بلند کی، اور "اللہ" کا نام عظمت کے ساتھ لیا۔ بادشاہ غضب ناک ہوا اور انہیں قید کرنے کا حکم دے دیا اور ہر ایک کو سوکوڑے مارے۔

جس وقت عیسیٰ کے ان دونوں نمائندوں کی تکذیب ہو گئی اور انہیں زد و کوب کیا گیا تو حضرت عیسیٰ نے شعور العسا کو ان کے پیچھے روانہ کیا۔ وہ حواریوں کے بزرگ تھے۔

شعور انجینی صورت میں شہر میں پہنچے اور بادشاہ کے اطراف میں سے دوستی پیدا کر لی۔ انہیں ان کی دوستی بہت بھائی اور ان کے بارے میں بادشاہ کو بھی بتایا۔ بادشاہ نے بھی ان کو دعوت دی اور انہیں اپنے ہمشینوں میں شامل کر لیا۔ بادشاہ ان کا احترام کرنے لگا۔

شعور نے ایک دن بادشاہ سے کہا: میں نے سنا ہے کہ دو آدمی آپ کی قید میں ہیں اور جس وقت انہوں نے آپ کو آپ کے دین کے بجائے کسی دوسرے دین کی دعوت دی تو آپ نے انہیں مارا پیٹا، کیا کبھی آپ نے ان کی باتیں سنی ہیں؟

بادشاہ نے کہا: کہ مجھے ان پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے ان کی کوئی بات نہیں سنی۔

شعور نے کہا: اگر بادشاہ مصلحت سمجھیں تو انہیں بلا لیں تاکہ ہم دیکھیں تو سیں کہ ان کے پتے ہے کیا۔

بادشاہ نے انہیں بلا لیا۔ شعور نے یوں ظاہر کیا جیسے انہیں پہچانتے ہی نہ ہوں اور ان سے کہا: تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ انہوں نے کہا: اس خدا نے کہ جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور جس کا کوئی

شریک نہیں ہے۔

شعور نے کہا: تمہارا معجزہ اور نشانی کیا ہے؟

انہوں نے کہا: جو کچھ تم چاہو!

بادشاہ نے حکم دیا اور ایک اندرے غلام کو لایا گیا جسے انہوں نے حکم خدا سے شفا بخشی۔ بادشاہ کو بہت

تعجب ہوا۔ اس مقام پر شعور بول اٹھے اور بادشاہ سے کہا: اگر آپ اس قسم کی درخواست اپنے خداؤں سے

کرتے تو کیا وہ بھی اس قسم کے کام کی قدرت رکھتے تھے؟

بادشاہ نے کہا: تم سے کیا چھپا ہوا ہے۔ ہمارے یہ خدا کہ جن کی ہم پرستش کرتے ہیں نہ تو کوئی ضرر پہنچا سکتے

ہیں نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی اور خاصیت رکھتے ہیں۔

اس کے بعد بادشاہ نے ان دونوں سے کہا: اگر تمہارا خدا تمہارے کو زندہ کر سکتا ہے تو ہم اس پر اور

تم پر ایمان لے آئیں گے۔

انہوں نے کہا: ہمارا خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بادشاہ نے کہا: یہاں ایک مردہ ہے جسے مرے ہوئے سات دن گزر چکے ہیں ابھی تک ہم نے اُسے

دفن نہیں کیا۔ ہم اس انتظار میں ہیں کہ اس کا باپ سفر سے آجائے۔ اُسے زندہ کر دکھاؤ۔

مردہ کو لایا گیا تو وہ دونوں تو آشکار دعا کر رہے تھے اور شعور دل ہی دل میں۔ اچانک مردے میں

حکمت پیدا ہوئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ میں سات روز سے مرجھا ہوں۔ میں نے جہنم کی

آگ اپنی آنکھ سے دیکھی ہے اور میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ تم سب خدا سے یگانہ پر ایمان لے آؤ۔

بادشاہ نے تعجب کیا۔ جس وقت شعور کو یقین ہو گیا کہ اس کی باتیں اس پر اثر کر گئی ہیں تو اسے خدا نے یگانہ

کی طرف دعوت دی اور وہ ایمان لے آیا اور اس کے ملک کے باشندے بھی اس کے ساتھ ایمان لے

آئے۔ اگرچہ کچھ لوگ اپنے کفر پر باقی رہے۔

اس روایت کی نظیر تفسیر عیاشی میں امام باقر اور امام صادق سے بھی نقل ہوئی ہے۔ اگرچہ ان کے درمیان کچھ فرق ہے۔

لیکن گزشتہ آیات کے ظاہر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس شہر والوں کا ایمان لانا بہت بعید نظر آتا ہے۔
کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ وہ صیغہ آسمانی کے ذریعہ ہلاک ہو گئے۔

ممکن ہے کہ روایت کے اس حصہ میں راوی سے اشتباہ ہوا ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں "موسلون" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ پیغمبر اور خدا کے بھیجے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں قرآن کہتا ہے کہ شر کے لوگوں نے اُن سے کہا کہ تم جیسے بشر ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو اور خدا نے کوئی چیز نازل نہیں فرمائی۔
قرآن مجید میں اس قسم کی تعبیرات عام طور پر خدائی پیغمبروں کے بارے میں آئی ہیں یہ کتنا پیغمبروں کے بھیجے ہوئے ہی خدا کے بھیجے ہوئے ہیں تو یہ توجیہ یہاں بعید نظر آتی ہے۔

۲۔ اس داستان کے تربیتی اور اصلاحی نکات : زیر بحث آیات میں اس داستان کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے بہت سے مسائل سیکھے جاسکتے ہیں کہ جن میں سے کچھ حسب ذیل ہیں :
(۱) صاحب ایمان افراد راہ خدا میں کبھی بھی تنہائی سے نہیں گھبراتے جیسا کہ ایک مرد مومن صیب بن ہار شہر کے مشرکین کے انہو سے وحشت زدہ نہیں ہوا۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں :
ایھا الناس لا تستوحشوا فی طریق الہدی لقلۃ اہلہ
اے لوگو! ہدایت کی راہ میں افراد کی کمی سے کبھی بھی وحشت نہ کرو۔

(ب) مومن لوگوں کی ہدایت کا عاشق ہوتا ہے اور ان کی گمراہی سے اسے دکھ پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی شہادت کے بعد بھی یہ آرزو رکھتا ہے کہ اسے کاش ! دوسرے لوگ اس کے مقامات کو دیکھ لیتے اور ایمان لے آتے۔

(ج) انبیاء کی دعوت کے مطالب خود اس کی ہدایت و حقانیت کے بہترین گواہ ہوتے ہیں (وہم مہتدون)۔

(د) اللہ کی طرف دعوت میں کسی بھی اجر پر نگاہ نہیں ہونی چاہیے ورنہ وہ اثر انداز نہ ہو سکے گی۔
(۵) بعض اوقات گمراہی کا عامل پوشیدہ نہیں ہوتا بلکہ یہ عامل ضلال مبین اور آشکار ہوتا ہے اور بہت پرکاش شرک۔ ضلال مبین کا واضح مصداق ہیں۔

(۶) مردان حق حقیقتوں پر تکیہ کرتے ہیں اور گمراہ لوگ مہمو مات و خیالات پر۔

(ز) اگر نحوست و بدبختی موجود ہو تو اس کا سرچشمہ خود انسان اور اس کے اعمال ہیں۔

(ح)۔ اسراف اور تجاؤز بہت سی بدبختیوں اور انحرافات کا عامل ہے۔

(ط)۔ پیغمبروں اور ان کے راستے پر چلنے والوں کا فریضہ "بلاغ مبین" اور ہر میدان میں واضح و آشکار دعوت دینا ہے۔ چاہے لوگ اُسے قبول کریں یا نہ کریں۔

(ی)۔ اجتماع و جمعیت کامیابی، عزت اور قوت کے اہم عوامل میں سے ایک ہے (فحصرزنا بمثلث)۔

(ک)۔ خدا سرکش لوگوں کی سرکوبی کے لیے آسمان و زمین کے عظیم لشکر جمع نہیں کرتا بلکہ ایک ہی اشارے سے اُن کی ہر چیز درہم برہم کر دیتا ہے۔

(ل)۔ شہادت اور بہشت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے اور شہید اپنی سواری سے زمین پر آنے سے پہلے ہی حورالعین کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔

(م)۔ خدا انسان کو پہلے تو گناہ کی آلودگی سے پاک کرتا ہے اور پھر اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ دیتا ہے (بما غفر لی ربی وجعلنی من المکرمین)۔

(ن)۔ دشمنان حق کی مخالفت اور سختی سے گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ پوری تاریخ میں یہ ان کا ہمیشہ سے طریقہ رہا ہے (ینحصر علی العباد ما یا یتھمسون رسول الا کانوا بہ یتستھزون)۔

اس سے بڑھ کر اور کونسی حسرت کی بات ہوگی کہ انسان ہدایت کے دروازوں کو قہقہہ بہت دھری اور غرور کی بنا پر اپنے اوپر بند کر دے اور حق کے آفتاب عالیا کو نہ دیکھے۔

(۳)۔ انبیاء پر سب سے پہلے ایمان لانے والے معاشرے کے مستضعفین ہوا کرتے تھے (وجاء رجل من اقصی المدینۃ)۔

(ع)۔ وہی لوگ تھے کہ جو راہ طلب میں کبھی ٹھکے نہیں تھے اور ان کی سعی و کوشش ہمیشہ جاری رہتی تھی (یسعی)۔

(ف)۔ تبلیغ کا طریقہ انبیاء الہی سے ہی سیکھنا چاہیے کہ جو بے خبر دلوں پر تاثیر کرنے کے لیے نام موثر طریقوں سے استفادہ کرتے تھے کہ جن کا ایک نمونہ زیر بحث آیات اور ان روایات میں کہ جو ان کی تفسیر میں آئی ہیں مشاہدے میں آتا ہے۔

۳۔ بزورِ حق سزا و جزا

زیر بحث آیات میں ہے مذکورہ "مومن" نے شہادت کے بعد خدائی بہشت میں جگہ پائی اور وہ یہ آرزو رکھتا تھا کہ اسے کاش ! پیچھے رہ جانے والے اس کی قسمت سے آگاہ ہو جاتے۔ یقیناً یہ آیات شہداء سے مربوط آیات کی طرح قیامت والی ابدی و جاودانی جنت سے مربوط نہیں ہیں جس میں آیات قرآنی کے مطابق مردوں کے قیامت میں اٹھنے اور محشر کے حساب و کتاب کے بعد داخل ہوگا۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے لیے برزخ میں بھی ایک طرح کی جنت و دوزخ ہے کہ میں شیدائے قیامتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور اہل فرعون جیسے سرکش مع و شام اس کی آگ میں سوزتے ہیں۔ اس مطلب کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت سے ایسے مسائل حل ہو جاتے ہیں کہ جو ہمیشہ دوزخ کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ معراج کی روایات اور اس جیسے دیگر واقعات کے بارے میں پیدا ہونے والے سوالات۔

۴۔ امتوں میں سب سے سبقت کرنے والے: تفسیر ثعلبی میں پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:

سابق الامم ثلاثۃ لم یکفروا باللہ طرفۃ عین علی بن ابی طالب وصاحب یس و مؤمن آل فرعون، فہم الصدیقون و علی افضلہم۔

”امتوں میں سب سے سبقت کرنے والے تین افراد ہیں کہ جنہوں نے ایک چشم زدوں کے لیے ہرگز خدا سے کفر نہیں کیا، علی بن ابی طالب اور صاحب یس (حبیب نجار) اور توہن آل فرعون۔ انہوں نے اپنے زمانے کے پیغمبر کی (قولاً اور عملاً) تصدیق کی ہے اور علی ان سب سے افضل و برتر ہیں۔“

یہی معنی و مفہوم تفسیر درمنثور میں ایک دوسری جگہ سے رسول اللہ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

الصدیقون ثلاثۃ: حبیب النجار مؤمن آل یس الذی قال یا قوم اتبعوا المرسلین، و حزقیل مؤمن آل فرعون الذی قال اقتتلون رجلاً ان یقول ربی اللہ و علی بن ابی طالب (ع) و هو افضلہم۔

”انبیاء کی تصدیق کرنے والے تین آدمی تھے حبیب نجار مؤمن آل یس کہ جس نے پکار کر یہ کہا کہ اے میری قوم! خدا کے رسولوں کی پیروی کرو اور حزقیل مؤمن آل فرعون (کہ جس نے موسیٰ کا دفاع کیا اور ان کی حمایت کرتے ہوئے ان کے قتل کی سازش کے مقابلے میں جو فرعون کی طرف سے ترتیب دی گئی تھی) کہا: کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے؟ اور علی بن ابی طالب کو جو ان سب سے افضل و برتر ہیں۔“

۱۔ مجمع البیان، تفسیر قرطبی، المیزان اور نور الثقلین۔

۲۔ المیزان، جلد ۱۰، ص ۸۶ بحوالہ تفسیر درمنثور۔

۳۱۔ اَلْمُتَبَرِّوۡا كَمَا اَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُوۡنِ اَنۡهَمۡ
اَلْبَہۡمۡ لَا یُرۡجِعُوۡنَ ۝
۳۲۔ وَاِنۡ کُلٌّ لَّمَّا جَمِیۡعٌ لَّدَیۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ ۝

ترجمہ

۳۱۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی اقوام کو (ان کے گناہوں کی بنا پر) ہلاک کیا ہے۔ وہ ہرگز ان کی طرف واپس نہیں لوٹیں گے۔

۳۲۔ اور وہ سب کے سب قیامت کے دن ہمارے پاس حاضر ہوں گے۔

تفسیر

دائمی غفلت

گزشتہ آیات زمانہ ماضی میں دنیا کے لوگوں کے ایک بڑے حصے کی مسلسل غفلت کے بارے میں گزری ہے۔ اب ان آیات میں فرمایا گیا ہے: ”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے پہلی اقوام میں سے بہت سے افراد کو ان کے ظلم اور سرکشی کے سبب ہلاک کر ڈالا اور العیوب و اھلکنا قبلہم من القرون“۔

یہ کوئی پہلا گروہ نہیں ہے کہ جس نے روئے زمین پر قدم رکھا ہے بلکہ ان سے پہلے دوسری سرکش قومیں بھی اس جہان میں زندگی بسر کرتی رہی ہیں ان کا درد ناک انجام کہ جو تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے اور ان کے ظلم و ستم آثار کہ جو ان کے شہروں کے دیوانوں میں باقی رہ گئے ہیں ان کی آنکھوں کے

ذریعہ آیت میں استغناء، تقریری استغناء ہے اور ”کو“ خبریہ ہے اور یہاں کثرت کے معنی میں آیا ہے اور (سیروا) کا مفعول ہے اور ”من القرون“ اس کا بیان ہے۔ ”قرون“ جیسا کہ ہم نے پہلے ہی بیان کیا ہے، ”قرون“ کی جمع ہے کہ جو طویل زمانے کے معنی میں بھی بولا گیا ہے اور ایسے لوگوں کے معنی میں بھی کہ جو ایک ہی زمانے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

سامنے موجود ہیں۔ کیا اتنا کچھ درسِ عبرت کے لیے کافی نہیں ہے؟

اس بارے میں کہ "الموسیروا" (کیا انہوں نے دیکھا نہیں) میں جمع کی ضمیر کس کی طرف لوثی ہے مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر "اصحاب القریۃ" کی طرف لوثی ہے کہ جن کے بارے میں گزشتہ آیات میں گفتگو ہوئی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد اہل مکہ ہیں کہ جنہیں یہ آیات تشبیہ کرنے اور خبردار کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں۔

لیکن گزشتہ آیت (یا حصرۃ علی العباد ۱۰۰۰) اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس سے مراد تمام انسان ہیں کیونکہ مذکورہ آیت میں لفظ "عباد" پوری تاریخ کے ان تمام انسانوں کے لیے ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے افراد کی تکذیب کرتے اور مذاق اڑاتے۔ گہر حال یہ عالم کے تمام لوگوں کو ایک دعوت ہے کہ وہ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا غور کے ساتھ مطالعہ کریں اور ان کے باقی ماندہ آثار کو دیکھیں اور انہیں عبرت حاصل کرنے کے لیے دل کی نگاہوں سے دیکھیں اور سرکشوں کے دیران مفلوں کے ایوانوں کو آئینہ عبرت سمجھیں۔

آیت کے آخر میں قرآن مزید کہتا ہے: "وہ کہیں بھی ان کی طرف نہیں لوٹیں گے" (انہم الیہم لا یرجعون) بلکہ

سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ دنیا کی طرف بازگشت اور گزشتہ گناہوں اور بد بختیوں کی تلافی کا امکان باقی نہیں رہا۔ ان کے گزشتہ سفر کے تمام پل تباہ ہو چکے ہیں اور اب ان کا لوٹ کر جانا ممکن ہی نہیں رہا۔

یہ تفسیر اُس بات کے مانند ہے کہ جو علی علیہ السلام نے مُردوں سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہوئے نبی البلاغہ کے ایک خطبہ میں ارشاد فرمائی ہے:

لا عن قبیح یستطیعون انتقا لا ولا فی حسن یستطیعون ازدا یاداً
 "نہ تو اُس بات ہی کا امکان ہے کہ وہ اپنے قبیح اعمال سے نکل سکیں گے اور نہ ہی وہ اس بات کی طاقت رکھتے ہیں کہ اپنی نیکیوں میں اضافہ کر سکیں (کیونکہ واپس لوٹنے کی راہ

یہ جملہ کم اہلکنا کا بدل ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے:

الم یرود انہم الیہم لا یرجعون۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ عالیہ ہے (ہلاک ہونے والوں کا حال)۔

بند ہو چکی ہے اور تلافی کا امکان نہیں رہا" (نبی البلاغہ خطبہ ۱۸۸)

بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: "وہ سب کے سب بلا استثناء قیامت کے دن ہمارے پاس حاضر ہوں گے" (و ان کل لّمّا جمیع لذینا محضرون) یہ

یعنی اس طرح نہیں ہے کہ اگر وہ ہلاک ہو گئے اور اس جہان میں واپس نہ پلٹ سکے تو مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ موت حقیقت میں نہ تو ابتدائے کار ہے اور نہ ہی انتہائے کار، بلکہ وہ سب کے سب بہت جلد عرصہ عشر میں حساب کتاب کے لیے جمع ہوں گے اور اس کے بعد دردناک عذاب الہی، کہ جو ایک مسلسل اور دائمی سزا ہوگی ان کا منتظر ہے۔

تو ان حالات میں کیا یہ عبرت حاصل کرنے کا مقام نہیں ہے؟ چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو ان کے سے انجام میں مبتلا نہ کریں اور جب تک کچھ بھی سوتق باقی ہے اس بولناک گرداب سے دُور رہیں۔

ہاں! اگر موت پر ہر چیز کا خاتمہ ہو جانا ہوتا تو یہ بات ممکن بھی کہ وہ کہتے کہ یہ زندگی تو ہمارے سکون و راحت کی ابتدا ہے لیکن افسوس کہ اس طرح نہیں ہے اور بقول شاعر:

ولو انا اذا متنا شرکنا لکان الصوت راحة کل حی

ولکننا اذا متنا بعثنا ونسئل بعدہ عن کل شیء

"اگر ہمیں مرجانے کے بعد اپنی حالت پر پھوڑ دیا جاتا تو موت تمام زندوں کے لیے راحت و آرام کا باعث ہوتی"

"لیکن جب ہم مرجائیں گے تو ہم دوبارہ زندہ ہوں گے اور اس کے بعد ہم سے ہر چیز کے متعلق سوال ہوگا"

اس آیت کی ترکیب کے بارے میں مفسرین کے درمیان مشور ہے کہ "ان" نافیہ ہے (اور بعض نے کہا ہے کہ یہ محققہ ہے۔ اسی بنا پر اُس نے اپنے مابعد کو نصب نہیں دیا) اور "لّمّا" "الا" کے معنی میں ہے کیونکہ "لّمّا" کا "الا" کے معنی میں آنا عرب ادب کے کلام میں مراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس بنا پر "کسانی" کی مخالفت سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور "جیس" "مجموع" کے معنی میں "کل" کی خبر ہے (کل، کی تخرین مضاف الیہ محذوف کا بدل ہے اور اصل میں یہ "کلیفم" تھا اور "محضرون" یا تو خبر کے بعد خبر ہے یا جیس کی صفت ہے۔ اس طرح سے اس جملے کا معنی کچھ اس طرح ہوگا:

وما کلہم الا مجموعون یوم القیامۃ محضرون لدینا۔

"اور نہیں ہیں وہ سب کے سب مگر قیامت کے دن اکٹھے مجموعی طور پر ہمارے پاس حاضر ہوں گے تو"

۳۳) وَ آيَةٌ لَهُمُ الْأَرْضُ الْمَيِّتَةُ ۖ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا
حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ ○

۳۳) وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّنْ نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا
فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ○

۳۵) لِيَأْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ ۗ
أَفَلَا يَشْكُرُونَ ○

۳۴) سُبْحٰنَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُثْبِتُ الْأَرْضُ
وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ○

ترجمہ

۳۳) مُردہ زمین بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے۔ ہم نے اسے زندہ کیا اور
اس سے دانے نکالے۔ اسی میں سے وہ کھاتے ہیں۔

۳۴) اور ہم نے اس میں بھجوروں اور انگوروں کے باغات اُگائے اور اس
میں چشے جاری کیے۔

۳۵) تاکہ وہ اس کے پھل کھائیں جبکہ اس کے بنانے میں ان کے ہاتھ کا کوئی
عمل دخل نہیں ہے۔ کیا وہ خدا کا شکر ادا نہیں کرتے۔

۳۴) منزہ ہے وہ ذات کہ جس نے زمین سے اُگنے والی چیزوں کے اور خود
انہی لوگوں کے اور ان چیزوں کے جنہیں یہ نہیں جانتے سب کے جوڑے

پیدا کیے ہیں۔

تفسیر

کچھ اور نشانیاں

گزشتہ آیات میں فرستادگان الہی کی شرک و بت پرستی کے خلاف جدوجہد کے بارے میں گفتگو
تھی۔ نیز گزشتہ آخری آیت میں مسک معاد کی طرت اشارہ ہوا تھا۔ اب زیر بحث آیات توحید و معاد
کی نشانیوں کو یکجا بیان کرتی ہیں تاکہ یہ نشانیاں منکرین کے لیے بیداری اور مبدا و معاد پر ایمان لانے
کا ذریعہ بن جائیں۔

ان آیات میں پہلے مُردہ زمینوں کے زندہ کرنے اور ان برکات سے کہ جن سے انسان فائدہ
اٹھاتے ہیں بحث کی گئی ہے فرمایا گیا ہے: "مردہ زمین بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے (مبدا و معاد
کی) ہم نے اسے زندہ کیا اور اس سے دانے نکالے اور اسی میں سے وہ کھاتے ہیں" (و آية لهم
الارض الميتة احيينها و اخرجنا منها حبا فمنه يأكلون) یہ

وجود حیات توحید کے اہم ترین دلائل میں سے ہے۔ یہ بہت زیادہ پیچیدہ اور حیرت انگیز مسئلہ
ہے کہ جس نے تمام علماء اور دانشوروں کی عقل کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور تمام ترقیوں کے باوجود
کہ جو علم و دانش میں نوع بشر کو نصیب ہوئی ہیں ابھی تک کسی نے اس کے معنی کو حل نہیں کیا۔ ابھی
تک کوئی بھی شخص ٹھیک طرح سے نہیں جانتا کہ کن عوامل کے زیر اثر پہلے دن بے جان موجودات زندہ
ظہیوں میں تبدیل ہوتی ہیں۔

ابھی تک کوئی نہیں جانتا کہ نباتات کے بیج اور ان کے مختلف طبقات کس طرح بنے ہیں اور
کون سے قوانین درموز ان پر حکم فرما ہیں۔ موافق حالات فراہم ہوتے ہی یہ بیج حرکت میں آجاتے ہیں
اور نشوونما کا آغاز کر دیتے ہیں اور مردہ زمین کے ذرات کو اپنے وجود میں جذب کر لیتے ہیں اور
اس طریقے سے مُردہ موجودات کو زندہ موجود کی بافت و بن میں تبدیل کر دیتے ہیں، تاکہ ہر روز حیات کا
ایک نیا جلوہ دکھائیں۔

زیر بحث آیت کے سلسلے میں علماء نے بہت سے احتمال ذکر کیے ہیں لیکن جو چیز سب سے زیادہ واضح نظر
آتی ہے وہ یہ ہے کہ "آیة لهم" غیر مقدم ہے اور "الارض الميتة" مبتدأ ہے اور "احيينها" مسند
ہے جو گزشتہ لفظ کی توضیح و تفسیر ہے۔

عالم نباتات و حیوانات میں حیات کا مسئلہ اور مُردہ زمینوں کا زندہ ہونا، ایک طرف تو اس بات کی ایک واضح و روشن دلیل ہے کہ اس جہان کی خلقت میں ایک عظیم علم و دانش سے کام لیا گیا ہے اور دوسری طرف سے یہ قیامت کی ایک واضح نشانی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ "لحم" کی ضمیر "عباد" کی طرف لوٹتی ہے کہ جو گزشتہ آیات میں ہے اور یہاں "عباد" سے مراد وہ تمام بندے ہیں جو مہذب و معاد سے مربوط مسائل میں انحراف یا غلط فہمی میں گرفتار ہیں اور قرآن ان کی کیفیت کو حسرت و تاسف کا سبب شمار کرتا ہے۔

"آیۃ" کی تعبیر نگرہ کی صورت میں اس توحیدی نشانی کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔ "فمنہ یأکلون" ایک طرف تو اس بات کا اشارہ ہے کہ انسان نباتات کے کچھ دانوں سے غذا حاصل کرتا ہے اور کچھ انسان کی غذا کے قابل نہیں ہیں لیکن ان کے دوسرے فوائد ہیں مثلاً جانوروں کی غذا، رنگ کرنے کے مادے، دوائیاں اور دوسرے امور کہ جن سے انسانی زندگی میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

دوسری طرف "منہ" کو "یأکلون" پر مقدم رکھنا کہ جو عام طور پر حصر کے لیے آتا ہے، اس نکتے کو بیان کرتا ہے کہ انسان کے لیے زیادہ تر اور بہترین غذا نباتات سے حاصل ہوتی ہے بلکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ تمام تر غذا گویا اسی سے حاصل ہوتی ہے۔

بعد والی آیت گزشتہ آیت کی توضیح و تشریح ہے اور مُردہ زمینوں کی حیات کی کیفیت بیان کرتی ہے فرمایا گیا ہے: "ہم نے زمین میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات اگائے ہیں اور اس میں سے چشمے نکالے ہیں" (وجعلنا فیہا جنتا من نخیل و اعناب و فجربنا فیہا من العیون)۔

گزشتہ آیت میں اناج کے متعلق گفتگو تھی لیکن یہاں قوت بخش اور غذائی پھلوں کے متعلق بات کی گئی ہے۔ ان کے دو عمدہ اور قابل نمونے "کھجور" اور "انگور" ہیں کہ جن میں سے ہر ایک مکمل غذا شمار ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی مفصل طور سے بیان کر چکے ہیں کہ ماہرین کے مطالعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ دونوں پھل انواع و اقسام کے ضروری دماغ اور انسانی بدن کے لیے دیکر مختلف حیاتی مواد کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں یہ دونوں پھل سال بھر تازہ اور خشک شکل میں غذا کیلئے محفوظ رکھنے اور استفادہ کرنے کے قابل ہیں۔

۱۔ ان دونوں حیات بخش پھلوں (انگور و جرب) کے بارے میں اور ان کی غذائی اہمیت کے متعلق ماہرین کی گواہی کے سلسلے میں ہم بالترتیب جلد ۶ اور جلد ۷ (سورہ نحل آیہ ۱۱- اور سورہ مریم آیہ ۲۶) میں بحث کر چکے ہیں۔

راعب کے بقول "اعناب" جمع ہے "عنب" کی اور "نخیل" جمع ہے "نخل" کی۔ فرق یہ ہے کہ "عنب" خود انگور کو کہا جاتا ہے اور انگور کے پودے کے لیے یہ لفظ شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا ہے لیکن "نخل" اس درخت کا نام ہے اور اس کے پھل کو "رطب" "تمر" (تازہ اور خشک کھجور) کہتے ہیں۔

بعض کا نظریہ ہے کہ تعبیر کا یہ فرق کہ ایک جگہ تو درخت کی بات ہے اور دوسری جگہ پھل کی، اس وجہ سے ہے کہ کھجور کے درخت کی جیسا کہ مشہور ہے ہر چیز قابل استفادہ ہے اس کا تنا، شاخیں اور پتے سب مختلف امور میں کام آتے ہیں اور اس کا پھل ان سب کا سردار ہے۔ جبکہ انگور کا پودا عام طور پر اس کے پھل کی وجہ سے مطلوب ہے اور اس کا تنا، شاخیں اور اس سے جدا شدہ اجزاء، کا کوئی زیادہ مصرت نہیں ہے۔

نیز یہ بات کہ یہ دونوں صیفی جمع کی صورت میں آئے ہیں تو ممکن ہے کہ یہ ان دونوں پھلوں کی مختلف انواع و اقسام کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی دسیوں قسمیں ہیں جن کی مختلف خصوصیات اور ذائقے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ گزشتہ آیت میں صرف مُردہ زمینوں کے زندہ کرنے کا ذکر تھا کہ جو قرآن مجید میں عام طور پر بارش کے نزول کے ساتھ آیا ہے لیکن اس آیت میں جاری پانی کے چشموں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے کیونکہ بہت سی زراعتوں کے لیے تو اکیلا بارش کا پانی ہی کافی ہے جبکہ پھلدار درختوں کو عام طور پر جاری پانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

"فجربنا" "تفجیر" کے مادہ سے یہ لفظ وسیع اور کھلا شکاف پیدا کرنے کے معنی میں ہے۔ چشمے چونکہ زمین کو شکاف سے پھوٹتے ہیں، اس لیے یہ تعبیر چشموں کے زمین سے باہر نکلنے کے بارے میں استعمال ہوتی ہے۔

بعد والی آیت ان پُر بار درختوں کے مقصد خلقت کو یوں بیان کرتی ہے: "مقصد یہ ہے کہ وہ اس کے پھل کھائیں، حالانکہ ان کے بنانے میں ان کے ہاتھ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ کیا وہ خدا کا شکر بجا نہیں لاتے" (لیأکلوا من ثمرہ و ما عملتہ ایدہم و افلا یشکرون)۔

ہاں وہ پھل کے جو درختوں کی شاخوں پر ایک کامل غذا کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، انہیں پکانے یا دوسری کسی قسم کی تبدیلی کی معمولی سے معمولی ضرورت بھی نہیں ہوتی، وہ درختوں سے توڑتے

۱۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس کا ثنائی مُردہ کا صیغہ بھی شکاف کرنے کے معنی میں ہے لیکن جب اسے باب "تفجیر" کی طرف لے جاتے ہیں (جیسا کہ زیر بحث آیت میں ہے) تو پھر تکثیر اور تشدید کا معنی دیتا ہے۔

یہ قابل استعمال ہوتے ہیں اور یہ بات پروردگار کی انسانوں کے لیے انتہائی لطف اور عظمت کی نشاندہی کرتی ہے۔

یہاں ہمک کہ اس نے اس تیار اور لذیذ غذا کی اس طرح سے پیکنگ کی ہے کہ وہ ایک مدت تک محفوظ رہ سکتی ہے اور ان کی غذائی قدر و قیمت بھی ضائع نہیں ہوتی، ان غذاؤں کے برخلاف کہ جنہیں انسان خدا واد مواد غذائی سے اپنے ہاتھ سے بناتا ہے کہ جو زیادہ تر جلدی خراب ہو جاتی ہیں۔

آیت کے معنی میں ایک دوسری تفسیر بھی موجود ہے اور وہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن چاہتا ہے کہ ایسے پھلوں کی طرف بھی اشارہ کرے کہ جو بغیر کسی تبدیلی کے استعمال کے قابل ہوتے ہیں اور ایسی مختلف غذاؤں کی طرف بھی کہ جو ان پھلوں پر کچھ عمل انجام دینے سے حاصل ہوتی ہیں (پہلی تفسیر کی رو سے "ما عملتہ ایدیہو" میں "ما" نافیہ ہے اور دوسری تفسیر کی رو سے موصولہ۔

بہر صورت مقصد یہ ہے کہ انسانوں میں حق شناسی اور شکرگزاری کی جس کو بیدار کیا جائے تاکہ وہ شکرگزاری کے ذریعے معرفت پروردگار کے مرحلے میں قدم رکھیں کیونکہ شکر نعم معرفت کردگار کا پہلا قدم ہے۔

آخری زیر بحث آیت پروردگار کی تسبیح و تنزیہ کے بارے میں بات کرتی ہے، او مشرکین کے شرک پر جس کے بارے میں گزشتہ آیات میں گفتگو تھی خط بطلان بھینچتی ہے اور سب کو راہ توحید اور یکتا پرستی کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتی ہے: "منزہ ہے وہ ذات کہ جس نے زمین سے اُگنے والی چیزوں کے اور خود انہی لوگوں کے اور ان چیزوں کے جنہیں یہ نہیں جانتے سب کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔"

(سبحان الذی خلق الازواج کلہما مما تنبت الارض ومن انفسہو ومما لا یعلمون) یہ ہاں! وہ خدا کہ جس نے ان تمام جوڑوں کو اس وسیع عالم ہستی میں پیدا کیا ہے، اس کا علم و قدرت بے انتہا ہے۔ اس میں کوئی نقص اور عیب موجود نہیں ہے، اس لیے اس کا کوئی شریک و شبیہ و نظیر بھی نہیں ہے۔

یہ جو بعض نے بے جان پتھروں، لکڑیوں اور دوسری مخلوقات کو اس کا شبیہ قرار دے رکھا ہے، ایسی

بعض مفسرین اور علماء ادب کے قول کے مطابق "سبحان"۔ "علم" ہے۔ "تسبیح" کا کیا کہ علم (مخصوص نام) کبھی تو اشخاص کے لیے ہوتا ہے اور اس کو "علم شخص" کہتے ہیں اور کبھی جنس کے لیے ہوتا ہے اور اسے "علم جنس" کہتے ہیں اور کبھی کسی معنی کے لیے ہوتا ہے اور اس کو "علم معنی" کہتے ہیں۔ اس بنا پر اس کا مفہوم خدا کی تنزیہ اور اسے ہر اس چیز سے پاک شمار کرنا ہے کہ جو عیب و نقص ہو۔ ایسی تنزیہ کہ جو عظمت پروردگار کے شایان شان ہو اور علم معنی کے سوا "علم" کی کبھی بھی اوصاف نہیں ہوتی۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "سبحان" مصدری معنی رکھتا ہے اور فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے اور ہر صورت میں خدائی تنزیہ کو نہایت پر زور طریقے سے بیان کرتا ہے۔

نار و آہستوں سے اس کے دائرہ کبریائی پر کوئی گرد نہیں پڑتی۔

یہ بات واضح ہے کہ خدا اس چیز کا محتاج نہیں ہے کہ وہ خود اپنی تسبیح و تنزیہ کرے، بلکہ یہ تو بندوں کے لیے ایک تعلیم ہے اور تکامل و ارتقا کا سفر طے کرنے کے لیے ایک دستورِ اصل ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں "ازواج" سے کیا مراد ہے مفسرین نے بہت اختلاف کیا ہے۔

جو بات مسلم ہے وہ یہ ہے کہ "ازواج" "زوج" کی جمع ہے۔ یہ لفظ عام طور پر مذکر و مؤنث دونوں کے لیے بولا جاتا ہے، چاہے وہ حیوانات ہوں یا ان کے علاوہ۔ بعد ازاں اس لفظ کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی اور ہر ان دو موجود پر کہ جو ایک دوسرے سے نزدیک ہوں یہاں تک کہ ایک دوسرے کی ضد ہی ہوں "زوج" کا اطلاق ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک گھر کے دو مشابہ کمروں کے لیے یا

دواڑے کے دو کواڑوں کے لیے یا دو اکٹھے کام کرنے والے ساتھیوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس طرح سے عالم ہستی کے ہر موجود کے لیے ایک زوج (جوڑا) تصور ہوتا ہے۔

بہر حال بعید نہیں ہے کہ یہاں پر "زوجیت" اسی خاص معنی یعنی صفت مذکر و مؤنث میں جو اور قرآن مجید اس آیت میں تمام عالم نباتات، انسانوں اور دوسرے موجودات میں کہ جن سے لوگ مطلع نہیں ہیں، زوجیت کی خبر دے رہا ہو۔

ممکن ہے یہ موجودات نباتات ہوں۔ اُس زمانہ میں ان میں زوجیت کے دائرے کی وسعت ابھی

تک ظاہر نہ ہوتی تھی۔

یا ہو سکتا ہے سمندروں کی گہرائیوں میں پاتے جانے والے حیوانات کی طرف اشارہ ہو کہ جن سے اس زمانے میں کوئی آگاہ نہیں تھا اور موجودہ زمانے میں ان کا کچھ حصہ انسان کے لیے ظاہر ہوا ہے۔

یا دوسری موجودات کی طرف اشارہ ہو کہ جو دوسرے آسمانی کرہوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

یا خوردبینی زندہ موجودات مراد ہوں، اگرچہ اس زمانے کے ماہرین ان کے نراور مادہ کو ابھی تک معلوم نہیں کر سکے، لیکن اس زندہ موجودات کی بنا اس قدر پوشیدہ معمول میں سے ہے کہ ممکن ہے کہ انسانوں کے علم و دانش نے ابھی تک اس کے اس حصہ تک رسائی حاصل نہ کی ہو، یہاں تک کہ عالم نباتات میں نراور

مادہ ہونے کا وجود بھی۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے قرآن کے نزول کے زمانے میں۔ سوائے خاص خاص مواقع مثلاً کجور وغیرہ کے درختوں کے۔ پہچانا نہیں گیا تھا اور قرآن نے اس سے پردہ اٹھایا تھا اور آج

کے زمانے میں سائنسی طریقوں سے یہ مطلب پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ عالم نباتات میں مسئلہ زوجیت ایک عمومی اور مشترک امر ہے۔

یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ یہاں "زوجیت" تمام ایٹموں کے اندر مثبت اور منفی ذرات کے وجود کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس جہان کی تمام چیزیں ایٹم سے بنی ہیں اور ایٹم حقیقت میں عالم

بادہ کے اس عظیم عمل کی عظیم تعمیر کے لیے اینٹ کے مانند ہے۔

جس وقت تک ایٹم کو توڑا نہیں گیا تھا اس وقت تک اس زوجیت کا کوئی پتہ نہیں تھا لیکن اس کے بعد ایٹم میں اور ان الیکٹرانوں کی صورت میں کہ جو اس کے گرد گھومتے ہیں اور ان پر ٹوٹوں کی صورت میں کہ جو ان کے اندر موجود ہیں ازدواج (جوڑوں) کا وجود پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔

بعض نے اسے اشیاء کی بادہ و صورت یا جوہر و عرض سے ترکیب کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعض دوسرے اسے نباتات انسانوں، حیوانوں اور دوسری موجودات کی مختلف انواع و اقسام کیلئے کہا یہ سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ جب ہم ان الفاظ کو حقیقی معنی (صفت مذکر و مؤنث) پر محمول کر سکتے ہیں اور اس کے برخلاف کوئی قرینہ بھی موجود نہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم کئی معانی کی طرف جائیں اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ زوجیت کے حقیقی معنی کی کئی عمدہ تفسیریں یہاں پر موجود ہیں۔

بہر حال یہ آیت بھی ان آیات میں سے ایک ہے کہ جو انسانی علم کا محدود ہونا بیان کرتی ہیں اور اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس جہان میں بہت سے حقائق ایسے ہیں کہ جو ہمارے علم و دانش سے پوشیدہ ہیں۔

۳۷) وَآيَةٌ لَهُمُ اللَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَإِذَا هُمُ مُظْلِمُونَ ۝

۳۸) وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذِيكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝

۳۹) وَالْقَمَرَ قَدَرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝

۴۰) لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝

ترجمہ

۳۷) رات بھی ان کے لیے (عظمتِ خدا کی) ایک نشانی ہے ہم اس سے دن کو لے جاتے ہیں تو اچانک تاریکی انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔

۳۸) اور سورج (بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے) کہ جو ہمیشہ اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں ہے یہ خدائے قادر و داناکے تقدیر ہے۔

۳۹) اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں قرار دی ہیں (اور جب وہ ان منازل کو طے کر لیتا ہے تو) آخر کار کھجور کی پرانی شاخ (زرد کمان) کے مانند ہو جاتا ہے۔

۴۰) نہ تو سورج چاند تک پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں چلتا رہتا ہے۔

۱۔ موجودات عالم کی زوجیت کے بارے میں اور خصوصاً عالم نباتات میں مذکور مؤنث کی موجودگی سے متعلق ہم جلد ۵ ص ۶۲۱ (زائد ترجمہ) اور جلد ۸ سورہ شہار کی آیت ۷ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

سورج اور چاند بھی آیت الہی ہیں

زیر بحث آیات عالم ہستی میں عظمت خدا کی نشانیوں کے ایک اور حصے کو بیان کرتی ہیں گزشتہ آیات میں قیامت، مژدہ زمینوں کے زندہ ہونے اور نباتات اور درختوں کی پرورش کے بارے میں بات ہوئی تھی۔ اب توحید کا ایک اور پہلو بیان کیا جا رہا ہے۔
پہلے فرمایا گیا ہے: "رات بھی ان کے لیے عظمت خدا کی ایک آیت اور نشانی ہے" (وایۃ لیلہم العلیل)۔

"جب آفتاب کی روشنی ہر جگہ پھیلی ہوتی ہے اور اس نے تاریکی کے لشکر کو پیچھے دھکیلا ہوتا ہے اس وقت ہم دن کی روشنی کو اٹھالیتے ہیں اور ان سب کو اچانک تاریکی ڈھانپ لیتی ہے" (نسلخ منہ النهار فاذا هو مظلمون)۔

"نسلخ" کی تعبیر مادہ "نسلخ" (بروزن "بلخ") سے ہے۔ اصل میں یہ لفظ جانور کا چڑھانا مارنے کے معنی میں ہے۔ یہ ایک لطیف تعبیر ہے، گویا دن کی روشنی سفید لباس کے مانند ہے کہ جو رات کے بدن پر پہنایا گیا ہے۔ غروب آفتاب کے وقت یہ لباس اس سے اتار لیا جاتا ہے تاکہ اس کا باطن اُد اندر کا حصہ آشکار ہو جائے۔

اس تعبیر کے بارے میں غور و غوض کرنے سے یہ نکتہ عیاں ہو جاتا ہے کہ کرۂ زمین کی اصل فطرت تاریکی اور ظلمت ہے۔ نور اور روشنی اس کی ایک عارضی صفت ہے کہ جو ایک دوسرے منبع سے اُسے دی جاتی ہے۔ اس لباس کی طرح کہ جو کسی کے بدن پر پہناتے ہیں کہ جس وقت وہ اس لباس کو اتار دے تو بدن کا فطری اور اصلی رنگ ظاہر ہو جاتا ہے۔

یہاں قرآن مجید نے رات کی تاریکی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گویا گزشتہ آیات میں آیت الہی کے طور

پر "راغب" مفردات میں لکھتا ہے کہ "سلخ" کا معنی جانور کی کھال اتارنا ہے اور بدن سے زرہ اتارنے اور سینے کے انشاک کے لیے بھی بولا جاتا ہے لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ اس صورت میں ہے کہ جب سلخ "عن" کے ساتھ متعدی ہو اور اگر "من" کے ساتھ متعدی ہو تو پھر باہر نکالنے کے معنی میں ہے لیکن اس فرق کی کوئی واضح دلیل نہیں کتب لغت میں نہیں ملی اگرچہ لسان العرب میں یہ ہے کہ:

النسلخ النہار من الیل خروج منہ خروجا
دن رات سے نسلخ ہوا یعنی اس سے نکلا۔
لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ پہلے ہی معنی سے لیا گیا ہے۔

پر مژدہ زمینوں کو زندہ کرنے کے ذکر کے بعد۔ دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں تبدیل ہوجانے کو زندگی کے بعد موت کے نمونے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

بر حال جس وقت انسان رات کی تاریکی میں ڈوب جاتا ہے تو وہ نور اور اس کی برکات، ہیمانات اور اس کے منبع وجود کو یاد کرتا ہے اور ایک موازنے کے ذریعے "نور و ظلمت" کے خالق سے آشنا ہوتا ہے۔

تیسری نشانی کہ جس کی طرف رات کی نشانی کے بعد اشارہ ہوا ہے نور، روشنی اور سورج کی نشانی ہے۔ قرآن کہتا ہے: "خورشید بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے کہ جو ہمیشہ اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں ہے" (والشمس نتجری لمتفرقا لھا)۔

یہ آیت سورج کی مسلسل اور دائمی حرکت کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے لیکن اس بارے میں کہ اس حرکت سے کیا مراد ہے، مفسرین نے بہت بحث کی ہے۔

بعض اسے زمین کے گرد سورج کی ظاہری حرکت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ یہ حرکت اس عالم کے اختتام تک جاری و ساری ہے۔ کہ جو درحقیقت سورج کا ٹھکانا اور اس کی زندگی کا اختتام ہے۔ بعض نے گرمیوں اور سردیوں میں، زمین کے شمال و جنوب کی طرف، سورج کے جھکنے کی طرف اشارہ سمجھا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ سورج موسم بہار کے آغاز سے خط اعتدال سے شمال کی طرف جھکنے لگتا ہے اور ۲۳ درجہ شمال کے مدار تک جاتا ہے اور گرمیوں کے آغاز سے پیچھے کی طرف لوٹتا ہے یہاں تک کہ آغاز خزاں تک خط اعتدال تک پہنچ جاتا ہے اور اسی خط پر وہ اپنا سفر سردیوں کے آغاز تک جنوب کی طرف جاری رکھتا ہے اور سردیوں کے آغاز سے خط اعتدال کی طرف حرکت کرتا ہے اور آغاز بہار میں وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔

البتہ یہ تمام حرکتیں حقیقت میں زمین کی حرکت اور اس کے محور کے اس کے مدار کی نسبت جھکاؤ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ ظاہر میں سورج کی حرکت محسوس ہوتی ہے۔

بعض دوسروں نے اسے "کرۂ آفتاب" کی حرکت و ضمنی کی طرف اشارہ جانا ہے کیونکہ ماہرین اور سائنسدانوں کی تحقیق نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ سورج خود اپنے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔
زیر بحث آیت کی آخری اور جدید ترین تفسیر وہی ہے جو ماہرین نے کشف کی ہے اور وہ سورج کا،

اس جگہ کی ترکیب میں دو احتمال ہیں، پہلا یہ کہ "اللیل" پر عطف ہے۔ اس صورت میں معنی اس طرح ہوگا "وایۃ لیلہم العلیل" "راڈ سورج ان کے لیے آیت ہے" اور دوسرا یہ کہ اشش مبتدا ہے اور تجویر اس کی ضمیر ہے۔ ہم نے پہلے احتمال کو اختیار کیا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق "لمستقر لھا" میں "لام" "فی" کے معنی میں ہے۔

جہاری ٹھکانوں کے وسط میں، تمام نظام شمسی کے ساتھ ایک سمت اور دور دراز کے ستارے کی طرف کہ جسے - دگا - کہتے ہیں، حرکت کرتا ہے۔

یہ سب معانی ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تضاد نہیں رکھتے اور ممکن ہے کہ - تجویہی - ان تمام حرکات اور بعض دوسری حرکات کی طرف بھی اشارہ ہو کہ جن تک ہمارا علم نہیں پہنچا اور شاید آئندہ زلزلے میں وہ معلوم ہو جائیں۔

بہر حال سورج کے اتنے بڑے عظیم کڑے کو حرکت دینا کہ جو جہاری زمین سے بارہ لاکھ گن بڑا ہے اور وہ بھی اس فضا نے بیکراں میں پورے حساب کتاب کے ساتھ حرکت دینا، کسی کے بس میں نہیں ہے سوائے اس خدا کے کہ جس کی قدرت تمام قدوتوں سے مافوق ہے اور جس کا علم غیر متناہی ہے۔ اسی بنا پر آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "یہ خدا ہے قادر ودانا کی تقدیر ہے" (ذالک تقدیر العزیز العلیم)۔ اس آیت کے سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ اس کی تعبیرات میں شمسی سال کے پُر معنی نظام کی طرف اشارہ ہے کہ جو مختلف بروج میں سورج کے حرکت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسا نظام کہ جو انسانی زندگی کو نظم و ضبط اور پروگرام دیتا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو منظم کرتا ہے۔

اس لیے بعد والی آیت میں اس بحث کی تکمیل کے لیے، چاند کی حرکت اور اس کی منازل کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے کہ جس سے بیسنے کے دنوں کا نظام بنتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: "ہم نے چاند کے لیے منزلیں قرار دی ہیں اور جس وقت وہ ان منزلوں کو طے کر لیتا ہے تو آخر کار کجور کی پرانی شاخ کی مانند، کمان کی صورت اور زرد رنگ اختیار کر لیتا ہے" (والقمر قدرنا منازل حتی عاد العرجون القديم)۔

"منازل" سے مراد وہی اٹھائیس منزلیں ہیں کہ جنہیں چاند - عحاق - اور مطلق تاریکی سے پہلے طے کرتا ہے۔ کیونکہ جس وقت بیسنے کے تیس دن پورے ہوں تو وہ اٹھائیس راتوں تک آسمان پر دیکھا جاسکتا ہے لیکن اٹھائیسویں رات بہت ہی باریک زرد رنگ، کم نور لکڑال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور باقی دو راتوں میں نظر بھی نہیں آتا۔ کہ جسے - عحاق - کا نام دیتے ہیں لیکن وہ بیسنے جو اسی دن کے ہوتے ہیں ان میں ستیسویں رات تک چاند آسمان پر نظر آتا ہے اور باقی دو راتیں - عحاق - کی ہیں۔

یہ منزلیں مکمل طور پر حساب شدہ ہیں اس طرح سے کہ جنہیں سینکڑوں سال پہلے اپنے دقیق حساب کتاب کے مطابق پیش گوئی کر سکتے ہیں۔

یہ عجیب و غریب نظام انسانوں کی زندگی کو نظم و ضبط بخشتا ہے اور یہ ایک طبیسی آسمانی تقویم ہے کہ جسے ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ نجوی پڑھ سکتا ہے۔ اس طرح سے کہ اگر انسان مختلف راتوں میں چاند کی کیفیت میں تھوڑا سا تغیر کرے تو اسے دیکھنے سے ہی صبح - صبح یا قریب قریب جان سکتا ہے کہ یہ رات بیسنے کی کون سی

رات ہے (ہم نے خود اس بات کو آزمایا ہے)۔

کیونکہ ابتدائے ماہ میں چاند کی لوکیں ادبہر کی طرف ہوتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ چاند کے عم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ساتویں تک پورے چاند کا آدھا دائرہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ چودھویں رات کو بدر کمال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے بعد چاند نیچے کی سمت سے گھٹتا اور کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اکیسویں تک (گھٹنے گھٹنے) پھر آدھے دائرے کی شکل میں ہو جاتا ہے اور اسی طرح اس میں کمی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اٹھائیسویں شب کو ضعیف اور کم رنگ ہلال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس رات اس کی لوکیں نیچے کی طرف ہوتی ہیں۔ ہاں! انسانوں کی زندگی کی بنیاد تنظیم سے ہی درست رہتی ہے اور نظم و ضبط، زمانہ اور وقت کے دقیق تعین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ خدا نے آسمان میں یہ ماہانہ اور سالانہ دقیق تقویم اسی مقصد کے لیے قرار دی ہے۔ "کالعرجون القديم" کی لطیف تعبیر کا مضمون واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ "عرجون" جیسا کہ اکثر مفسرین اور ارباب لغت نے بیان کیا ہے، کجور کے خوشے کے اس حصے کو کہتے ہیں کہ جو درخت سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ خرے خوشے کی شکل میں درخت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس خوشے کا پھیلا حصہ زرد رنگ کمان کی شکل میں ہوتا ہے کہ جو درخت کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور اس کی نوک جاو کی طرح ہوتی ہے اور خرے کے دانے انگور کے دانوں کی طرح اس کے داگوں کے ساتھ متصل ہوتے ہیں۔ جس وقت کجور کے خوشے کو کاٹتے ہیں تو وہ قوسی شکل کا پھیلا حصہ درخت پر باقی رہ جاتا ہے اور جس وقت وہ خشک اور پٹھردہ ہو جاتا ہے تو مکمل طور پر - عحاق - سے پہلے دانے ہلال کی طرح ہوتا ہے کیونکہ جس طرح آخری ماہ میں ہلال آسمان کے مشرق کی طرف صبح کے وقت یوں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خمیدہ، پٹھردہ اور زرد رنگ ہوتا ہے اور اس کی لوکیں نیچے کی طرف ہوتی ہیں "عرجون القديم" بھی اسی طرح ہوتا ہے۔

حقیقت میں یہ مشابہت مختلف جہات میں ظاہر ہوتی ہے کجور کے خوشے کی لکڑی کے ہلالی ٹانہنے کے لحاظ سے زرد رنگ ہونے کے لحاظ سے پٹھردہ ہونے کے لحاظ سے اس کی قوس کی نوک کے پھلی طرف مائل ہونے کے لحاظ سے اور کجور کے درخت کی سبز رنگ شاخوں کے درمیان ہونے کے لحاظ سے کہ جو سیاہ رنگ آسمان پر آخری رات کے ہلال کے قرار پانے

"عرجون" بعض ارباب لغت کے مطابق - افواج - کے مادہ سے - اعوجاج - اور - انعطاف - (زیر پھرن اور جھکانے کے معنی میں) لیا گیا ہے۔ اس بنا پر اس کی نون زائد ہے اور - فعلون - کے وزن پر ہے لیکن بعض دیگر کے نزدیک یہ لفظ - عرجون - کے مادہ سے لیا گیا ہے اور اس کی نون اصلی ہے اور یہ شاخ کے پھلے حصے کے معنی میں ہے کہ جو ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور کجور کے درخت پر باقی رہ جاتا ہے اور - قدیم - ہر اس کمنہ اور پرانی چیز کے معنی میں ہے کہ جسے ایک زمانہ گزر گیا ہو۔

کے ساتھ غیر مشابہ نہیں ہے۔

نیز اسے "قدیم" کہنا اس کی کنگی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جس قدر یہ شاخیں زیادہ کٹے ہو جاتی ہیں اسی قدر زیادہ باریک اور زیادہ زرد رنگ ہو جاتی ہیں آخر ماہ کے ہلال سے زیادہ مشابہ ہو جاتی ہیں پیمانہ اللہ ایک چھوٹی سی تعبیر میں کتنی لطافتیں اور کیسی کیسی زیبائیاں پنہاں ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں سال، ماہ اور شب و روز کے اس نظام کے ثبات و دوام کے بارے میں گفتگو ہے۔ پروردگار نے ان کے لیے اس طرح سے پروگرام منظم کیا ہے کہ ان کی کیفیت میں معمولی سا اختلاف بھی پیدا نہیں ہوتا اور تاریخ بشر اسی ثبات کی بنا پر مکمل طور سے منظم رہتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "تو سورج کے بس میں ہے کہ چاند تک پہنچ جائے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں (لا الشمس ینبی لھا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النہار وکل فی فلک یسبحون)۔"

ہم جانتے ہیں کہ سورج اپنا دورہ بارہ برسوں میں ایک سال میں مکمل کرتا ہے جبکہ چاند اپنی منزلوں کو ایک مہینے میں طے کرتا ہے۔

اس بنا پر چاند کا اپنے مدار میں گردش کرنا، سورج کی اپنے مدار میں گردش سے بارہ گنا زیادہ تیز ہے۔ لہذا فرمایا گیا ہے کہ سورج اپنی گردش میں ہرگز چاند تک نہیں پہنچتا اور وہ اپنی ایک سالہ حرکت کو ایک ماہ میں انجام نہیں دیتا اور سالانہ نظام درہم برہم نہیں ہوتا۔

اسی طرح رات دن پر سبقت حاصل کر کے اس کا ایک حصہ اپنے اندر داخل نہیں کر لیتی کہ موجودہ نظام ٹوٹ جائے بلکہ یہ سب کے سب اپنا سفر ہزاروں سال سے بغیر کسی تبدیلی کے جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس بحث میں سورج کی حرکت سے مراد اس کی وہ حرکت ہے کہ جو ہماری جس کے مطابق ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ تعبیر اس امر کے پائے ثبوت کو پہنچ جانے کے بعد بھی۔ کہ سورج اپنی جگہ پر ساکن ہے اور زمین ایک سال کی مدت میں اس کے گرد چکر لگاتی ہے۔ کارآمد ہے، مثلاً آج بھی ہم یہ کہتے ہیں کہ سورج برج حمل میں داخل ہو گیا ہے یا سورج دائرہ نصف النہار پر پہنچ گیا ہے یا اس کا میل کلی تک پہنچا ہے (میل کلی سے مراد گرہوں کی ابتدا میں نصف کرہ شمالی میں سورج کا اپنے آخری نقطہ ارتفاع تک پہنچ جانا یا اس کے برعکس سردیوں کی ابتدا میں آسمانی بجلی مد تک پہنچنا ہے)۔

یہ سب کی سب تعبیریں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ زمین کے سورج کے گرد گردش کرنے اور

سورج کے ساکن ہونے کے انکشاف کے بعد بھی سورج کی حرکت سے متعلق گزشتہ تعبیرات ہی استعمال ہوتی ہیں کیونکہ حتی طور پر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ سورج حرکت میں ہے۔

سورج اور چاند کا اپنے اپنے افلاک میں تیرنے (کل فی فلک یسبحون) کا مفہوم بھی یہی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ سورج کے اپنے فلک میں تیرنے سے مراد نظام شمسی اور اس ککشوں کے ساتھ اس کا حرکت کرنا ہے کہ جس میں ہم موجود ہیں۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ ہمارا نظام شمسی اس عظیم ککشوں کا ایک جز ہے کہ جو خود اپنے گرد گردش کر رہی ہے۔

کیونکہ "فلک" جیسا کہ ارباب لغت نے بیان کیا ہے اصل میں لڑکیوں کے پستان اُبھرنے اور گول شکل اختیار کرنے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ زمین کے ان قطعات کے لیے کہ جو گول ہیں یا دوسری گول چیزوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اسی بنا پر سیاروں کی گردش کے راستوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

"کل فی فلک یسبحون" کا جملہ بہت سے مفسرین کے نظریے کے مطابق سورج، چاند اور ستاروں میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ ہے کہ جو اپنا اپنا راستہ اور مدار رکھتے ہیں، اگرچہ آیات میں ستاروں کا نام نہیں آیا لیکن "لیل" (رات) کے ذکر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور ستاروں کا چاند اور سورج کے مانند ہونے کو دیکھتے ہوئے مذکورہ جملے سے اس معنی کو سمجھنا بعید نظر نہیں آتا۔ خاص طور پر جبکہ "یسبحون" صیغہ جمع کی شکل میں بیان ہوا ہے۔

یہ تعبیر بھی موجود ہے کہ ممکن ہے یہ جملہ سورج، چاند اور رات اور دن کی طرف اشارہ ہو کیونکہ رات اور دن میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک مدار رکھتے ہیں اور کرۂ زمین کے گرد گردش کرتے ہیں۔ تاریکی کرۂ زمین کے نصف حصہ کو ہمیشہ چھپائے رکھتی ہے اور روشنی دوسرے نصف حصہ پر رہتی ہے اور یہ دونوں جو ہیں گھٹنوں میں ایک پورا دور زمین کے گرد لگاتے ہیں۔

"یسبحون" "مباحث" کے مادہ سے ہے۔ ہمزوات میں راغب کے مطابق اصل میں یہ لفظ پانی کا ہوا میں سرخ اور تیز حرکت کے معنی میں ہے۔ یہاں یہ لفظ آسمانی کرّوں کی سرخ حرکت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یہ حرکت اس حرکت کے علاوہ ہے کہ جو پورے نظام شمسی کی ککشوں کے اندر ہے کہ جو ستارہ "دگا" کی طرف حرکت میں ہے اور اس کی طرف ہم نے اشارہ بھی کیا ہے۔

یہ جو خدا کے ذکر اور اس کی عبادت کو "تسبیح" کہتے ہیں تو وہ بھی اسی درجے سے ہے کہ وہ بھی پروردگار کی اطاعت و عبادت کی راہ میں ایک تیز حرکت ہے۔ ہمزوات راغب مادہ "سج"۔

ہے اور انہیں ایسی عاقل موجودات سے تشبیہ دے رہا ہے کہ جو تیزی کے ساتھ اپنی گردش جاری رکھے چوتے ہوں۔ موجودہ زمانے میں بھی یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ اجرام سماوی بہت ہی حیران کن تیزی کے ساتھ اپنے مدار میں حرکت کرتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ سورج کی "دورانی" اور جریانی حرکت: عربی زبان میں "دوران" دائرہ کی صورت میں حرکت کو کہتے ہیں جبکہ "جریان" طولی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ زیر بحث آیات میں قرآن سورج کے لیے جریانی حرکت کا بھی قائل ہے اور دورانی حرکت کا بھی۔ ایک جگہ کہتا ہے: "والشہر تجری...." اور دوسری جگہ سورج کے فلک میں تیرنے (دائرے کی صورت میں حرکت) کی بات کرتا ہے: "کل فی فلک یسبحون"

جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، ہیئت بطلیوس کا مفروضہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ مخالف علمی تسلیم شدہ تھا۔ اس مفروضے کے مطابق اجرام فلکی کی اپنی کوئی حرکت نہیں بلکہ وہ افلاک کے اندر میخوں کی طرح گولے ہوئے ہیں جبکہ افلاک پیاز کے پھلکوں کے مانند ایک دوسرے کے اوپر تہ تہ بلوریں اجسام کی صورت میں ہیں اور اجرام فلکی کی حرکت ان کے افلاک کی حرکت کے تابع ہے اس بنا پر اُس زمانے میں سورج کا تیرنا کوئی مفہوم رکھتا تھا اور نہ ہی اس کی طولی و جریانی حرکت۔

لیکن حالیہ صدیوں کے انکشافات نے بطلیوس کے مفروضے کو ختم کر دیا اور اجرام آسمانی کے بلوریں افلاک سے آزاد قرار دے دیا۔ اس کے بعد اس نظریے نے قوت پکڑی کہ سورج نظام شمسی کے مرکز میں ثابت اور غیر متحرک ہے اور سارا نظام شمسی پروانہ وار اس کے گرد گھومتا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر بھی زیر بحث آیات کی تفسیروں کا مفہوم واضح نہیں تھا کیونکہ یہ تو سورج کی طرف طولی اور جریانی حرکت کی نسبت دے رہی تھیں۔

یہاں تک کہ سائنس نے اپنی پیش رفت مزید جاری رکھی اور آخر کار سورج کی چند ایک حرکات ثابت ہو گئیں:

- (۱) اس کی خود اپنے گرد وضعی حرکت۔
 - (۲) نظام شمسی کے ساتھ آسمان کے ایک مشخص نقطے کی طرف اس کی طولی حرکت۔
 - (۳) اس کی دورانی حرکت اس کمکشاں کے محور کے ساتھ کہ جس کا یہ سورج حصہ ہے۔
- اس طرح سے قرآن کا ایک اور علمی معجزہ ثبوت کو پہنچ گیا۔
- اس مسئلے کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ہم اس بحث کا ایک حصہ یہاں پیش کرتے ہیں کہ جو دائرۃ المعارف

میں سورج کی حرکت کے بارے میں بیان ہوا ہے:

سورج "ظاہری" حرکات (یعنی حرکت اور سالانہ حرکت) اور "واقعی" حرکات کا حامل ہے۔ سورج کرۂ آسمانی کی یومیہ اور ظاہری حرکت میں شریک ہے۔ ہمارے آدھے کرہ میں مشرق سے طلوع کرتا ہے، جنوب کی طرف نصف النہار کے مقام سے گزرتا ہے اور مغرب میں غروب کرتا ہے۔ نصف النہار سے اس کا محور حقیقی ظہر کو متخص کرتا ہے۔

سورج کی ایک سالانہ "ظاہری" حرکت زمین کے گرد بھی ہے کہ جو اس کو ہر "روز" مغرب سے مشرق کی طرف تقریباً ایک درجے لے جاتی ہے۔ اس حرکت میں سورج سال میں ایک مرتبہ برجوں کے سامنے سے گزرتا ہے۔ اس حرکت کا مدار "دائرۃ البروج" میں واقع ہے۔ یہ حرکت علم نجوم کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے "اعتدالین" و "انقلاب" اور "میل کلی" اسی کے ساتھ مربوط ہے اور شمسی سال اسی سے وجود پاتا ہے۔

ان ظاہری حرکات کے علاوہ کمکشاں کی حرکت دورانی سورج کو قریباً گیارہ لاکھ تیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار کے ساتھ فضا میں گردش دیتی ہے لیکن کمکشاں کے اندر بھی سورج ثابت دساکن نہیں ہے بلکہ قریباً بہتر ہزار چار سو کلومیٹر کی رفتار سے صورت فلکی (جاقی علی دکتیہ) کی جانب حرکت کرتا ہے۔ اور یہ جو ہم فضا میں سورج کی اس تیز حرکت سے بے خبر ہیں، تو یہ اجرام فلکی کے دوری ہونے کی وجہ سے ہے، کہ جو اس خاص حرکت وضعی کی تشخیص کا ماخذ بھی ہے۔

سورج کی حرکت وضعی اس کے استوار میں تقریباً پچیس دن میں ہوتی ہے۔ ۴۔ "تدرک" اور "سابق" کی تعبیر: قرآنی تعبیرات اس قدر بھی ٹکی ہوتی ہیں کہ جن کی باریکیاں شمار نہیں ہو سکتیں۔ زیر بحث آیات میں جس وقت سورج اور چاند کی ماملانہ اور سالانہ گردش کے سلسلے میں ظاہری حرکت کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے، تو قرآن یہ کہتا ہے کہ سورج کے لیے سزاوار نہیں ہے کہ وہ چاند تک پہنچ جائے (کیونکہ چاند اپنے سفر کو ایک ماہ میں طے کرتا ہے اور سورج ایک سال میں، تیز رفتاری کا

۱۔ "جاقی علی دکتیہ" ستاروں کا ایک مجموعہ ہے کہ جو ایک فلکی صورت تشکیل دیتا ہے۔ یہ اس شخص سے مشابہ ہے کہ جو گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا دکھڑا ہونے کے لیے تیار ہو اور یہ تعبیر اس معنی سے لی گئی ہے۔

۲۔ یعنی سورج ہمارے پچیس شب و روز میں ایک مرتبہ اپنے گرد گردش کرتا ہے۔ یہ امر ماہرین نے سورج کے سطحی ٹکڑوں کے مطالعے سے اخذ کیا ہے کیونکہ انہوں نے دیکھا ہے کہ یہ ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں اور پچیس دنوں کے بعد پھر مکمل طور پر اپنی جگہ پر واپس آ جاتے ہیں۔

یہ فرق اس قدر ہے کہ یہ ہرگز اس تک نہیں پہنچ سکتا (لا الشمس یبغی لها ان تدرك القمر)۔
لیکن دن رات کے بارے میں وہ آپس میں چنداں فاصلہ نہیں رکھتے اور بالکل ایک دوسرے کے پیچھے موجود ہیں۔

۳۔ انسانی زندگی میں نور و ظلمت کا نظام : آیات زیر بحث میں دو ایسے موضوعات کی طرف اشارہ ہے کہ جو انسانی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور انہیں الہی قرار دیا گیا ہے اور وہ ہیں رات کی تاریکی اور دوسرا سورج اور اس کی روشنی۔

اس سے پہلے بھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ نور، عالم مادہ کے موجودات میں سے لطیف ترین اور پُرکرت ترین موجود ہے۔ نہ صرف روشنی اور ہماری زندگی بلکہ ہر حرکت سورج کے نور کے ساتھ وابستگی رکھتی ہے۔ بارش کے قطرے، انور، نباتات کی نشوونما، شیخوں کا چمکنا، پھولوں کا پکنا، ندی نالوں کا زرمزہ، انسانوں کے دستروان پر انواع و اقسام کی غذائیں۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے کارخانوں کے میوں کا پلانا، بجلی اور طرح طرح کی صنعتی پیداوار سب کا تعلق توانائی (ENERGY) کے اسی عظیم منبع یعنی سورج کی روشنی سے ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ کوہ زمین کی تمام توانائیاں (سوائے اس توانائی کے جو اٹم کے ذرے کو توڑنے سے پیدا ہوتی ہے) سورج کے نور سے مدد یعنی ہیں اور اگر وہ نہ ہوتا تو ہر جگہ خاموشی ہوتی اور ہر چیز بے روح، بے نور، بے حرکت اور مژدہ ہوتی۔

رات کی تاریکی اگرچہ موت اور فنا کی بُودتی ہے لیکن نور آفتاب کی تبدیلی کے لحاظ سے اور ہم درج کے آرام و سکون نیز سورج کی روشنی کی ایک ہی طرح کی تپش کے خطرات سے بچانے میں اس کا کردار انسانوں کے لیے حیات بخش شمار ہوتا ہے کیونکہ اگر رات اور دن باری باری نہ آتے تو کوہ زمین میں حرارت اتنی بڑھ جاتی کہ تمام چیزوں کو آگ لگ جاتی۔ جیسا کہ چاند میں طولانی راتیں اور دن ہیں (ہر ایک کوہ زمین کے پندرہ رات دن کے برابر ہے) اگر کوئی ہوتا تو دونوں میں تباہ کن گرمی ہوتی اور راتوں کو ہولناک سردی ہوتی۔

اس بنا پر ان دونوں (نور و ظلمت) میں سے ہر ایک آیات الہیہ میں سے ایک عظیم آیت ہے۔ اس سے قطع نظر ایک بہت ہی دقیق نظام کہ جو ان دونوں پر حاکم ہے، انسانوں کی زندگی کی نظم تاریخ کو وجود میں لانے والا ہے۔ ایسی تاریخ کہ اگر وہ نہ ہوتی تو اجتماعی روابط ختم ہو کر رہ جاتے اور انسان کے لیے زندگی بہت مشکل ہو جاتی۔ اس لحاظ سے بھی یہ دونوں آیات الہیہ میں سے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن ان آیات میں کتا ہے کہ: "رات دن پر ہیبت حاصل نہیں کرتی" یہ تفسیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ دن رات سے پہلے خلق کیا گیا ہے اور رات اس کے بعد میں۔ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اگر کوئی شخص کوہ زمین کے باہر سے نگاہ کرے تو وہ ان دونوں کو دو سیاہ و سفید موجودات کے

مانند دیکھے گا کہ جو سلسلہ کوہ زمین کے گرد گردش کر رہے ہیں، اور اس دائرے کی حرکت میں پہلے اور بعد کا تصور نہیں ہو سکتا۔

لیکن ہمیں اس حقیقت پر توجہ دینا چاہیے کہ ہماری زمین کا یہ کرہ پہلے سورج کا ہی ایک جز تھا اور اس وقت ہر جگہ دن ہی دن تھا اور رات کا کوئی وجود ہی نہیں تھا، لیکن جو مٹی زمین اس سے جدا ہوئی تو اس کا غزوی شکل کا سایہ نور آفتاب کی مخالفت سمت میں پڑا تو رات پیدا ہو گئی، وہ رات کہ جو دن کے پیچھے حرکت کر رہی ہے۔ اس پہلو پر نظر کرنے سے یہاں اس تعبیر کی دقت دگرانی اور لطافت واضح ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے نہ صرف سورج اور چاند اس فضا سے بیکرال میں تیر رہے ہیں بلکہ رات اور دن بھی اس فضا میں کوہ زمین کے گرد تیر رہے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک مدار اور گردش کی روگڈز رکھتا ہے۔

ایسی بہت سی روایات میں بھی کہ جو اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہیں، اس معنی کی تصریح ہوتی ہے کہ خدا نے دن کو رات سے پہلے پیدا کیا ہے۔

ایک روایت میں امام صادق سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

خلق النهار قبل اللیل

"دن کو رات سے پہلے خلق کیا گیا ہے۔"

ایک دوسری روایت میں امام علی بن موسیٰ رضا سے منقول ہے:

النهار خلق قبل اللیل

"دن رات سے پہلے خلق ہوا۔"

پھر امام نے "لا الشمس یبغی لها ان تدرك القمر ولا اللیل سابق النهار" کی آیت سے اس سلسلے میں استدلال فرمایا ہے۔

اسی مطلب کی ایک حدیث امام باقر سے بھی بصورت ذیل منقول ہے:

ان الله عز وجل خلق الشمس قبل القمر وخلق النور قبل الظلمة۔

"خدا نے بزرگ نے سورج کو چاند سے پہلے اور نور کو ظلمت سے پہلے خلق کیا ہے۔"

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ نور الثقلین، جلد ۳ ص ۳۸۷، بحوالہ احتجاج طبرسی۔

۳۔ نور الثقلین، جلد ۳ ص ۳۸۷، بحوالہ روضۃ الکافی۔

۴۱) **وَآيَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلِكِ الْمَشْحُونِ**

۴۲) **وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ**

۴۳) **وَإِنْ نَشَاءُ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيحَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقذُونَ**

۴۴) **إِلَّا رَحْمَةً مِنَّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ**

ترجمہ

۴۱) یہ بھی ان کے لیے (عظمت پروردگار کی) ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی ذریت کو (وسائل زندگی اور ساز و سامان سے) بھری ہوئی کشتیوں میں سوار کیا۔

۴۲) اور ہم نے ان کے لیے اُس جیسی دوسری سواریاں بھی پیدا کیں۔

۴۳) اور اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں، اس طرح سے کہ نہ تو کوئی ان کا فریاد کرے ہو اور نہ ہی کوئی انہیں دریا سے نکال سکے۔

۴۴) مگر یہ کہ پھر دوبارہ ہماری رحمت ہی ان کے شامل حال ہو اور ایک معین وقت تک وہ اس زندگی سے بہرہ ور ہوں۔

تفسیر کشتیوں کا دریاؤں میں چلنا بھی آیت الہیہ

اگرچہ قرطبی اور بعض دوسرے مفسرین نے زیر بحث پہلی آیت کو اس سورہ کی پیچیدہ ترین آیت قرار دیا ہے۔

کیا ہے لیکن ان آیات میں غور کرنے اور گزشتہ آیات سے ان کا تعلق دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ ان آیات کی تفسیر میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں ہے کیونکہ گزشتہ آیات میں سورج، چاند، رات، دن اور اسی طرح زمین اور زمین کی برکات کی خلقت میں پروردگار کی نشانیوں کے بارے میں گفتگو تھی جبکہ زیر بحث آیات میں دریاؤں اور سمندروں کی نعمتوں یعنی ان میں تجارتی اور مسافر بردار کشتیوں اور جہازوں کے چلنے کے بارے میں گفتگو ہے۔

علاوہ ازیں کشتیوں کا سمندر کے اندر چلنا، آسمانی ستاروں کی فضا کے سمندر میں حرکت کرنے کے ساتھ غیر مشابہ نہیں ہے۔

اس لیے پہلے فرمایا گیا ہے کہ: "یہ بھی ان کے لیے عظمت پروردگار کی ایک نشانی ہے کہ ہم ان کی اولاد و ذریت کو ان کشتیوں میں کہ جو وسائل زندگی سے پُر ہیں سوار کرتے ہیں" (و آیتہ لہم اننا حملنا ذریتہم فی الفلک المشحون)۔

"لہم" کی ضمیر نہ صرف مشرکین مکہ کی طرف بلکہ ان تمام عباد اور بندگان خدا کی طرف لومٹی ہے کہ جن کے بارے میں گزشتہ آیات میں گفتگو تھی۔

"ذریۃ" جیسا کہ راجح نے مفردات میں بیان کیا ہے اصل میں چھوٹی اولاد کے معنی میں ہے اگرچہ بعض اوقات تمام چھوٹی بڑی اولاد پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ لفظ مفرد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور جمع کے معنی میں بھی۔

قرآن کتا ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو (چھوٹی اولاد کو) ان کشتیوں میں سوار کیا۔ گویا اولاد کے بارے میں گفتگو ہے اور خود ان کے بارے میں کوئی بات نہیں۔ شاید یہ اس مناسبت سے ہے کہ بچے اس سواری کی زیادہ احتیاج رکھتے ہیں کیونکہ بڑی عمر کے لوگ تو دریاؤں کے ساحل کے ساتھ ساتھ چل کر بھی راست طے کر لیتے ہیں۔

اس سے قطع نظر یہ تعبیر ان کے احساسات و میلانات کی تحریک کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

لفظ "مشحون" (ملو اور پُر) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نہ صرف وہ خود کشتی میں سوار ہوتے ہیں بلکہ ان کے مال تجارت اور ضروریات زندگی کی نفل و حمل بھی اس کے ذریعے ہوتی ہے۔ بعض نے اس آیت میں "فلک" سے خاص طور پر حضرت نوح کی کشتی مراد لی ہے اور "ذریۃ" کی آباؤ اجداد کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ "ذرا" کے مادہ سے خلقت کے معنی میں ہے۔

یہ تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے۔ ہاں اگر اس سے مراد ایک واضح مصداق بیان کرنا ہو تو پھر ٹھیک ہے۔

بہر حال کشتیوں کا چلنا کہ جو بشر کے لیے نفل و حمل کا ایک عظیم اور اہم ترین ذریعہ ہے اور ان سے

جو کام لیا جاتا ہے وہ دوسرے ذرائع نقل و حمل کی نسبت ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے پانی کے اپنے خواص کا، ان اجسام کے مخصوص وزن کہ جن سے کشتی بنتی ہے، بادبانی کشتیوں کے لیے ہڈاؤں کی خاصیت کا۔ انجن والی کشتیوں کے بخارات کی قوت کا اور ان کشتیوں میں کہ جو اٹمی طاقت سے کام کرتی ہیں ایسی توانائی کا۔

یہ سب ایسی قوتیں اور طاقتیں ہیں کہ جنہیں خدا نے انسان کے لیے مخر کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک (علیحدہ علیحدہ بھی) اور مجموعی طور پر بھی آیات الہی میں سے ہیں۔ نیز اس بنا پر کہ یہ دم نہ ہو کہ خدا داد سواریاں صرف کشتیاں ہی ہیں اس کے بعد والی آیت میں قرآن مزید لکھا ہے: "تم نے ان کے لیے دوسری سواریاں بھی ان کے مانند خلق کی ہیں" (وخلقنا لہم من مثله ما یرکبون)۔ وہ سواریاں کہ جو خشکی یا ہوا اور فضا میں چلتی ہیں اور انسانوں اور ان کے سڑوسانوں کو اپنے دوش پر اٹھاتی ہیں۔

اگرچہ بعض نے خصوصیت کے ساتھ یہاں اونٹ مراد لیا ہے جس کا نام "صحرائی کشتی" یا "صحرا کا جہاز" پڑ گیا ہے۔ بعض نے تمام چوپائے مراد لیے ہیں اور بعض نے ہوائی جہاز اور فضائی کشتیاں مراد لی ہیں جو ہمارے زمانے میں بنی ہیں (اور ان کے باکس "خلقنا" کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ ان کا مواد اور وسائل پہلے سے خلق شدہ ہیں)۔

لیکن آیت کی تعبیر کا اطلاق ایک وسیع مفہوم کی تصویر پیش کرتا ہے جس میں یہ سب اور ان کے علاوہ اور دوسری سواریاں بھی موجود ہیں۔

البتہ قرآن کی متعدد آیات میں "انعام" (چوپائے کا) "فلک" (کشتیوں) کے ساتھ ذکر ہوا ہے مثلاً:

وجعل لکم من الفلک والانعام ما ترکبون

کشتیوں پر بھی اور چوپاؤں میں سے بھی اس نے ایسے پیدا کیے ہیں کہ جن پر تم سوار ہوتے ہو (زخرف - ۱۲)۔

اور سورہ تومن کی آیت ۸۰ میں ہے:

وعلیہا وعلی الفلک تحملون

اور تم چوپاؤں اور کشتیوں پر بوجھ لادتے (اور سوار ہوتے) ہو۔

لیکن یہ آیات بھی زیر بحث آیت کے مفہوم کی عمومیت کے ساتھ تضاد نہیں رکھتیں۔

بعد والی آیت میں، اس عظیم نعمت کو زیادہ واضح کرنے کے لیے، ایک حالت بیان کی گئی ہے۔ کہ جو اس نعمت کے دگرگوں ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ فرمایا گیا ہے: "اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں اس طرح کہ نہ تو کوئی ان کا فریاد رس ہو اور نہ ہی کوئی ایسا آدمی کہ جو انہیں دریا سے باہر نکال سکے" (وان

نشأ نفرقہم فلا صریخ لہم ولا ہم ینقذون)۔

ہم کسی عظیم لہر کو حکم دے دیں گے کہ وہ ان کی کشتی کو الٹ دے یا ایک بھنور کو مامور کر دیں گے کہ وہ انہیں نکلے یا ایک طوفان کو حکم دیں گے کہ وہ انہیں ایک تنگے کی طرح اٹھا کر موجوں کے اندر پھینک دے۔

اگر ہم چاہیں تو پانی اور کشتی کی خاصیت اور ہوا چلنے کے نظام اور دریا کے سکون کو درہم برہم کر دیں تاکہ ان کی ہر چیز تباہ ہو جائے۔ یہ ہم ہی ہیں کہ جو اس نظام کو دوام بخشتے ہیں تاکہ وہ بہرہ ور ہوں اور اگر ہم بھی بھی اس قسم کے حادثات بھیجتے ہیں تو یہ اس بنا پر ہے کہ وہ اس نعمت کی اہمیت کو سمجھیں کہ جس میں وہ متفرق ہیں۔

"صریخ" "صراخ" کے مادہ سے، فریاد رس کے معنی میں ہے اور "ینقذون" "انقاذ" کے مادہ سے پکڑ لینے اور نجات دینے کے معنی میں ہے۔

آخر میں آخری زیر بحث آیت۔ اس گفتگو کی تکمیل کے لیے مزید کہتی ہے: "مگر یہ کہ پھر بھی ہماری رحمت ہی ان کے شامل حال ہو اور وہ ایک معین زمانے تک اس زندگی سے فائدہ اٹھائیں" (والا رحمتنا و ما تاغیا الی حین)۔ ہاں! وہ کسی بھی ذریعے سے نجات نہیں پاسکتے مگر یہ کہ ہماری ہی رحمت کی باندھنیم پہلے اور ہمارا ہی لطف و کرم ان کی مدد کے لیے آئے۔

"حین" وقت کے معنی میں ہے اور اس آیت میں انسان کی زندگی کے اختتام اور اس کی اجل کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے اس سے اس جہان کا اختتام مراد لیا ہے۔

ہاں وہ لوگ کہ جو کشتی پر سوار ہوتے ہیں (خواہ وہ قدیم زمانے کی چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیاں ہوں یا موجودہ زمانے کے کوہ پیکر سمندری جہاز) انہوں نے اچھی طرح سے اس آیت کی تعبیر کی گہرائی کو سمجھا ہے کہ دنیا بھر کے عظیم بحری جہاز، دریاؤں کی عظیم موجوں اور سمندروں کے ہولناک طوفانوں کے مقابلے میں ایک تنگے کے مانند ہیں اور اگر رحمت الہی انسانوں کے شامل حال نہ ہو تو ان کی نجات ممکن نہیں ہے۔

وہ چاہتا ہے کہ اس مختصر سے وقفے میں کہ جو موت اور زندگی کے درمیان ہے، اپنی عظیم قدرت کی انسانوں کو نشاندہی کرے کہ شاید راستے سے بھٹکے ہوئے انسان ہوش میں آجائیں اور اس طریقے سے اس کے راستے پر آجائیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○

۳۶) وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ○

۳۷) وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمْ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ نَطْعَمُ مَنْ تَوْيْشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ○

ترجمہ

۳۵) اور جس وقت ان سے یہ کہا جائے کہ جو کچھ (عذاب الہی میں سے) تمہارے آگے اور پیچھے ہے اس سے ڈرو تاکہ رحمت الہی تمہارے شامل حال ہو (تو وہ پرواہ نہیں کرتے)۔

۳۶) اور ان کے پروردگار کی آیات میں سے کوئی آیت نہیں آتی مگر یہ کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔

۳۷) اور جس وقت ان سے یہ کہا جائے کہ خدا نے جو تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے (خدا کی راہ میں) خرچ کرو، تو کفار مومنین سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے شخص کو کھانا کھلائیں کہ جسے خدا چاہتا تو کھلا دیتا (لہذا خدا نے یہی چاہا ہے کہ وہ بھوکے رہے) تم تو محض کھل گمراہی میں ہو۔

وہ تمام آیات الہی کو نظر انداز کر دیتے ہیں

گزشتہ آیات میں، وسیع عالم ہستی سے متعلق پروردگار کی آیات کے بارے میں گفتگو تھی، اب زیر بحث آیات میں ہمت دہم کنار کا طرز عمل بیان کیا گیا ہے کہ جو وہ آیات الہی اور رحمت پرہیز اور عذاب الہی سے ڈرانے کے جواب میں پیش کرتے ہیں۔

زیر نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے، جس وقت ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ عذاب الہی میں سے جو کچھ تمہارے آگے اور تمہارے پیچھے ہے اس سے ڈرو تاکہ رحمت الہی تمہارے شامل حال ہو تو وہ پہلو تہی کرتے ہیں اور روگردان ہو جاتے ہیں (اور اذاقیل لہم اتقوا ما بین ایدیکم وما خلفکم لعلکم ترحمون)۔ "ما بین ایدیکم" (جو کچھ تمہارے سامنے ہے) "وما خلفکم" (اور جو کچھ تمہارے پیچھے ہے) کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں۔

ان میں ایک یہ ہے کہ "ما بین ایدیکم" سے مراد دنیا کی سزائیں اور عذاب ہیں کہ جن کا ایک نمونہ گزشتہ آیات میں بیان ہوا ہے اور "وما خلفکم" سے مراد آخرت کے عذاب ہیں کہ جن کے بارے میں پیچھے ہیں۔ پیچھے کی تعبیر اس بنا پر ہے، کہ ابھی ان کی نوبت نہیں آئی، گویا وہ انسان کے پیچھے چل رہے ہیں اور انجام کار کسی دن اس تک پہنچ جائیں گے اور اس کا دامن پکڑ لیں گے اور ان عذابوں سے پرہیز کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے عوامل مہیا نہ کیے جائیں دوسرے لفظوں میں ایسے کام نہ کیے جائیں کہ جن کی وجہ سے انسان ان عقوبتوں کے مستحق بنیں۔

اس گفتگو کا شاید یہ ہے کہ آیات قرآنی میں "اتقوا" کی تعبیر یا تو خدا کے بارے میں استعمال ہوتی ہے یا قیامت کے دن اور خدائی عذاب کے متعلق جبکہ حقیقت میں دونوں کی بازگشت ایک ہی سنی کی طرف ہے کیونکہ خدا سے ڈرنا اس کے عذاب سے ڈرنا ہے۔

یہ بات خود اس امر کی دلیل ہے کہ زیر بحث آیت میں بھی اس جہان اور دوسرے جہان میں خدائی عذاب اور سزا سے پرہیز ہی مراد ہے۔

"واذاقیل لہم... جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے کہ جس کا بعد والی آیت سے استفادہ ہوتا ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا،

واذاقیل لہم اتقوا.... امر ضواعنہ۔
جب ان سے کہا جائے کہ ڈرو تو وہ اعراض کرتے ہیں۔

بعض نے اس معنی کے برعکس تعبیر کی ہے۔ انہوں نے "ما بین ایدیکم" سے عذابِ آخرت اور "ما خلفکم" سے عذابِ دنیا مراد لیا ہے کیونکہ آخرت ہمارے سامنے قرار پاتی ہے (یہ تفسیر نتیجے کے لیے ہے)۔
لیکن بعض نے کہا ہے کہ "سامنے" سے مراد وہ گناہ ہیں کہ جو پہلے انجام پاتے ہیں اور ان سے پرہیز تو بہ و گلائی کے معنی میں ہے اور "پچھے" سے مراد وہ گناہ ہیں کہ جو بعد میں انجام پاتے گے۔
بعض دوسرے تفسیرین کا نظریہ ہے کہ "سامنے" سے مراد آشکارا اور ظاہری گناہ ہیں اور "پچھے" پوشیدہ پنہاں گناہوں کے معنی میں ہے۔

بعض دوسرے "ما بین ایدیکم" کو طرح طرح کے عذابِ دنیا کی طرف اشارہ اور "ما خلفکم" کو موت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں (جبکہ موت کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے پرہیز کیا جاسکے)۔
بعض مفسرین جیسے "فی ظلال" کے مولف نے ان دونوں تعبیروں کو موجباتِ غضب اور عذابِ الہی کے اعطاء کے لیے لگا کر سمجھا ہے کہ جنہوں نے کافروں کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔
آلوسی نے "روح المعانی" میں اور خرازی نے "تفسیر کبیر" میں یعنی ہر دو نے متعدد احتمال ذکر کیے ہیں کہ جن میں سے کچھ بیان ہو چکے ہیں۔ علامہ طباطبائی تفسیر "المیزان" میں "ما بین ایدیکم" کو دنیا کے شرک و معاصی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور "ما خلفکم" کو عذابِ آخرت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔
حالات آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ دونوں جملے ایک ہی چیز کی طرف اشارہ ہیں صرف زمانے کا فرق ہے نہ کہ ایک شرک و گناہ کی طرف اور دوسرا عذاب و سزا کی طرف اشارہ ہو۔
ہر حال اس جملے کی بہترین تفسیر وہی ہے کہ جو ابتدا میں بیان ہو چکی ہے اور قرآن کی مختلف آیات بھی اس پر گواہ ہیں اور وہ یہ کہ "ما بین ایدیکم" سے مراد دنیا کا عذاب ہیں اور "ما خلفکم" سے مراد آخرت کا عذاب۔

بعد والی آیت میں اسی مطلب پر تاکید کی گئی ہے اور دلچسپانہ اندھوں کی آیات الہی اور پیغمبروں کی تعلیمات کو نظر انداز کرنے میں ہٹ دھرمی کو واضح کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے، ان کے پروردگار کی آیات میں سے کوئی آیت ان کے پاس نہیں آتی مگر یہ کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں (وما تاتاہم من آیت من آیات ربہم الا کانوا عنہا معرضین)۔

ز تو آیات انفس کا بیان ان پر مؤثر ہے اور نہ ہی آیات آفاقی کا ذکر نہ تمہید و انذار اور نہ ہی رحمت الہی ان پر اثر کرتی ہے۔

الہی کی بشارت و نوید۔ نہ ہی وہ عقل و خرد کی منطوق کو قبول کرتے ہیں اور نہ ہی فرمانِ فطرت کو۔ وہ ان انہوں کے مانند ہیں کہ جو اپنے اطراف کی نزدیک ترین چیزوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے یہاں تک کہ وہ تو سورج کی روشنی اور رات کی تاریکی میں بھی فرق نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد قرآن ان کی ہٹ دھرمی اور روگردانی کی ایک اہم صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، جس وقت ان سے یہ کہا جائے کہ خدا نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کرو تو کفارِ مومنین سے کہتے ہیں کہ کیا ہم اسے کھانا کھلائیں کہ جسے خدا چاہتا تو سیر کر دیتا تم تو واضح گمراہی میں ہو (و اذا قيل لہم انفقوا مع رزقکم اللہ قال الذین کفروا للذین امنوا انطعم من لویثاء اللہ اطعمہ ان انتم الا فی ضلال مبین)۔

یہ وہی ایک عایارِ منطوق ہے کہ جو ہر زمانے میں خود معرض اور بنیادِ اخلاق کی طرف سے پیش ہوتی رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر فلاں شخص فقیر ہے تو ضرور اس نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس کی وجہ سے خدا چاہتا ہے کہ وہ فقیر رہے اور اگر ہم تو نیکو اور مالدار ہیں تو ضرور ہم نے کوئی ایسا عمل انجام دیا ہے کہ ہم اطعمہ خداوندی کے حامل ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر ان کا فخر اور جاری تو نیکو حکمت و مصلحت کے بغیر نہیں ہے۔

وہ اس بات سے غافل ہیں کہ یہ جہانِ آزمائش و امتحان کا میدان ہے خدا ایک کی تنگدستی کے ساتھ آزمائش کرتا ہے اور دوسرے کو غنا و تو نیکو سے اور بعض اوقات ایک ہی انسان کو دو زمانوں میں ان دونوں کے ساتھ امتحان کی بھٹی میں سے گزارتا ہے کہ کیا وہ فقرو خاقد کے موقع پر امانت، قناعت طبع اور شکرگزاری کے مراتب بجالاتا ہے یا سب کو پاؤں کے روند ڈالتا ہے؟ اور تو نیکو کے موقع پر جو کچھ اس کے پاس ہے اُسے اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے یا نہیں؟

اگرچہ بعض نے اس آیت کو کسی مخصوص گروہ پر منطبق کیا ہے مثلاً یہودی مشرکین عرب، یا دین و آئینِ انبیاء کے منکرین و طغیان۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت عمومی مفہوم رکھتی ہے کہ جس کے مصداق ہر زمانے میں مل سکتے ہیں اگرچہ نزدیک آیت کے زمانے میں اس کے مصداق یہودی مشرکین کے کچھ افراد تھے۔

یہ تو ہمیشہ سے ایک بہانہ تھا اور ہے کہ ایسے اشخاص کہتے ہیں، اگر خدا رازق ہے تو پھر ہم سے کیوں چاہتے ہو کہ ہم فقیروں کو کھانا کھلائیں اور خدا نے یہ چاہا ہے کہ وہ محروم رہیں تو پھر ہم کیوں کسی ایسے کو بہرہ مند کریں جسے خدا نے محروم کر رکھا ہے؟

وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ نظامِ حکومت ایک چیز کا تقاضا کرتا ہے اور نظامِ تشریح کسی دوسری چیز کا۔

نظامِ حکومت کا تقاضا ہے کہ خدا زمین کو اس کی تمام نعمتوں کے ساتھ بشر کو دے دے اور اسے نکال دے۔

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○
مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ
يَخِصِّمُونَ ○

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ○
وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ
رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ ○

قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا ۗ هَذَا مَا وَعَدَ
الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ○
إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ
لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ○

جس

وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ (قیامت کا) وعدہ کب پورا ہوگا۔

انہیں اس کے علاوہ اور کوئی انتظار نہیں ہے کہ ایک عظیم (آسمانی) پیچ
انہیں آگھیرے جبکہ وہ (دنیاوی امور میں) جھگڑ رہے ہوں۔

(وہ ایسے غافل ہوں گے کہ) وہ وصیت بھی نہ کر سکیں گے اور نہ ہی اپنے گھر
والوں کی طرف لوٹ کر جا سکیں گے۔

(پھر دوبارہ) صور پھونکا جائے گا تو وہ یکایک (اپنی قبروں سے) نکل کر دوڑتے

اور قتار کی راہ طے کرنے کے لیے ان کے اعمال میں آزاد چھوڑ دے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں کچھ عظیم
ظن کی ہیں کہ جو اسے اپنے تقاضوں کے مطابق چلنے کو کستی ہیں۔

نظام تشریح کا تقاضا ہے کہ کچھ قوانین، ایثار و قربانی، خداکاری و درگذر اور انفاق کے ذریعے سے
انسانوں کی جبلت کو کنٹرول کیا جائے اور اس طریقے سے تہذیب نفوس کی جائے اور انسان کو جو طبعاً
کے مقام تک پہنچنے کی استعداد رکھتا ہے، اس طریقے سے اس بلند مقام تک پہنچایا جائے۔ زکوٰۃ کے ذریعے نفوس
کی تطہیر کی جائے، راء خدا میں خرچ کے ذریعے عمل کو دلوں سے دُور کیا جائے اور طبعاً حاصل کردہ جو انسان کی
زندگی میں ہزار ہا مقاصد کے پیدا ہونے کا سبب ہے، اس کو ختم کیا جائے۔

یہ بات بالکل ایسے ہے کہ کچھ افراد یہ کہیں کہ کیا ضرورت ہے جو ہم پڑھیں یا دوسرے کو دوسری پڑھائیں
اگر خدا چاہتا تو ہم سب کو علم دیتا تاکہ کسی شخص کو علم حاصل کرنے کی احتیاج نہ رہتی۔ کیا کوئی بھی مائل اس منظر کو قبول کرنے کا
قال الذین کفروا کما جلا کہ ان کے کفر کا ذکر کر رہا ہے، حالانکہ اس کے بجائے ضمیر سے بھی استفادہ ہو سکتا تھا۔
یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان ہمان سازوں کی اس خرافاتی منظر کا سرچشمہ کفر ہے۔

یہ جو مومنین سے کہا گیا ہے کہ "انفقوا مآرزکم اللہ" (انفاق کرو اس رزق سے کہ جو خدا نے تمہیں دیا ہے
اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت اصلی مالک خدا ہے اگرچہ یہ امت چند دنوں کے لیے انسانوں کے سپرد ہوئی
ہے کتنے جہیل ہیں وہ لوگ کہ جو کسی کے مال کو اسی کے حکم سے بھی دوسرے کو دینے کے لیے تیار نہیں ہیں؟

ان انتم الا فی ضلال بینین (تم واضح گمراہی میں ہو) کی تفسیر کے بارے میں تین احتمال ہیں،
پہلا احتمال: یہ ہے کہ یہ کفار کی مومنین کے ساتھ گفتگو کا تمہ ہے۔

دوسرا احتمال: یہ ہے کہ یہ خدا کا کفار سے خطاب ہے۔

تیسرا احتمال: یہ ہے کہ یہ کفار کے مقابلے میں مومنین کی گفتگو ہے۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ کفار کے کلمات کے ساتھ متصل اور مربوط ہے، درحقیقت
وہ یہ چاہتے تھے کہ مومنین کو بالمش جواب دیں اور ان کی طرف "ضلال بینین" کی نسبت دیں۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ عرب اس زمانے میں مسلمان فوازی میں مشور تھے اور خرچ کرنے سے دریغ نہیں
کرتے تھے کافروں کا مقصد یہ تھا کہ وہ مومنین کا مذاق اڑائیں کیونکہ وہ سب چیزوں کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے۔ انہوں نے
بھی استزاکے طور پر کہا کہ اگر خدا چاہتا اور اس کی مشیت ہوتی تو فقرا کو بے نیاز کر دیتا لہذا ہمارے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں
ہے لیکن جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے وہ زیادہ مناسب نظر آتی ہے (تفسیر تیسرا، تفسیر چہمی، تفسیر روح المعانی کی طرف
زیر بحث آیات کے ذیل رجوع کریں)۔

ہوتے اپنے پروردگار کی (عدالت کی) طرف جائیں گے۔

(۵۲) وہ کہیں گے: وائے ہو ہم پر! ہمیں ہماری خواہگاہوں سے کس نے اٹھا

(ہاں) یہ وہی چیز ہے کہ جس کا خدائے رحمن نے وعدہ کیا تھا اور (اس
رسولوں نے سچ کہا تھا۔

(۵۳) وہ ایک چیخ سے زیادہ نہیں ہوگی (ایک زور دار آواز بلند ہوگی) ناگہ
سب کے سب ہمارے پاس حاضر ہو جائیں گے۔

تفسیر

قیامت کی چیخ

گزشتہ آیات میں فریخ کرنے کے سلسلے میں کفار کی کمزور اور بہانہ ساز منطق کا ذکر کرنے کے بعد اس
زیر بحث آیت میں قیامت کے بارے میں ان کے استہزاء سے بات شروع کی گئی ہے۔ نیز انکار معاد کے
بارے میں ان کی بوسیدہ منطق کو دو ٹوک جواب کے ساتھ توڑ دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں گزشتہ آیات میں توحید کے بارے میں جو گفتگو آئی ہے معاد کی گفتگو کے اس سلسلہ کلام
کی تکمیل کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ وعدہ جس کا تم ذکر کر رہے ہو کب پورا
گاڑو بقولون متی هذا الوعدین کنتم صادقین۔" یہی بات کہ تم قیامت کی تاریخ کا تعین نہیں
کرتے اس امر کی دلیل ہے کہ تم اپنی گفتگو میں سچے نہیں ہو۔

بعد والی آیت میں استہزاء کے طور پر کہتے گئے اس سوال کا ایک حکم اور سنجیدہ جواب دیا گیا ہے، فرمایا
گیا ہے: قیامت اور اس جہان کا اقتتام خدا کے لیے کوئی پیچیدہ مسئلہ اور مشکل کام نہیں ہے۔ "وہ اس
کے علاوہ کسی اور چیز کے منتظر نہیں ہیں کہ ایک عظیم صیور آسمانی انہیں اپنی گرفت میں لے لے اور انہیں اپنا
اس حالت میں گھیر لے کہ وہ دنیاوی امور کے بارے میں جھگڑ رہے ہوں" (ما یبظرون الا صیور
واحدة تأخذهم وهم یخصمون)۔

ایک زور دار آسمانی چیخ ہی کافی ہے کہ سب لوگوں کی روح قبض کر لے۔ ایک ہی لمحے میں ہر
ایک کو اسی مکان میں اور اسی حالت میں کہ جس میں وہ ہے اچک لے۔ اور ان کی پر غوغا دنیوی زندگی ایک

خاموش اور بے صدا دنیا میں بدل دے۔ وہی دنیا کہ جو ہمیشہ سے ان کا میدان جنگ بنا ہوا ہے۔
روایات اسلامی میں پیغمبر گرامی اسلام سے منقول ہے:

تقوم الساعة والرجلان قد نشرنا ثوبهما بتبایعانه فما یطویا منه
حتى تقوم! والرجل یرفع اکلته الی فیہ فما تصل الی فیہ حتی تقوم!
والرجل یلیط حوضه لیسقی ما شیتہ فما یسقیها حتی تقوم! ے

صیور آسمانی اس طرح غفلت کی حالت میں ہوگی کہ دو آدمیوں نے کپڑے کا تھکان
کھولا ہوگا اور وہ معاملہ کرنے میں مشغول ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ معاملہ ختم ہو اور وہ
اس کو لپیٹیں دنیا ختم ہو جائے گی۔ کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ انہوں نے کھانے کا لٹیر پٹی
سے اٹھایا ہوگا لیکن اس سے پہلے کہ ان کے منہ تک پہنچے صیور آسمانی اُن پہنچے گی اور دنیا ختم
ہو جائے گی۔ کچھ لوگ حوض کی تعمیر میں مشغول ہوں گے کہ جو پا یوں کو اس سے سیراب کریں
اس سے پہلے کہ جو پائے سیراب ہوں قیامت برپا ہو جائے گی۔

"ما یبظرون" یہاں "انتظار نہیں کریں گے" کے معنی میں آیا ہے، کیونکہ "نظر" کا مادہ جیسا کہ زلف
مفردات میں کتا ہے، کسی چیز کے مشاہدے یا ادراک کے لیے غور و فکر کرنے کے معنی میں ہے اور
بھی تامل اور جستجو کرنے کے معنی میں۔ اور جستجو کرنے سے حاصل شدہ معرفت کے معنی میں بھی
آیا ہے۔

بنیادی طور پر "صیور" کلمہ یا کپڑے کو چیرنے یا پھاڑنے سے بلند ہونے والی آواز کے معنی میں ہے
بعد ازاں ہر بلند صدا اور چیخ جیسی آواز کے لیے استعمال ہوا ہے۔ بعض اوقات طول قامت کے لیے بھی
آیا ہے۔ مثلاً کھما جاتا ہے کہ:

بارض فلان شجر قد صاح

"فلان زمین میں ایک درخت ہے کہ جو چیخ رہا ہے۔"

یعنی اس قدر لمبا ہو گیا ہے کہ گویا چیخ دیکھا کر رہا ہے اور لوگوں کو اپنی طرف
بلا رہا ہے۔

"یخصمون" خصوصیت کے مادہ سے نزاع اور جنگ کے معنی میں ہے۔

لیکن وہ کس چیز کے بارے میں جنگ و جدال کرتے ہیں، آیت میں اس کا ذکر نہیں ہوا۔ البتہ واضح

۱۔ مجمع البیان "زیر بحث آیات کے ذیل میں، یہی روایت مختصر سے فرق کے ساتھ دوسری تفسیر مثلاً تفسیر قرطبی اور
روح المعانی وغیرہ میں بھی آئی ہے۔

ہے کہ اس سے مراد امر و مینا اور مادی زندگی کے امور میں جدال کرتا ہے۔ البتہ بعض نے اسے امر معاد میں جدال کے معنی میں لیا ہے جبکہ پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ اگرچہ ایسے جامع معنی مراد لینا بھی بعید نہیں جو دونوں معانی پر محیط ہو اور ہر قسم کے جنگ و جدال اور مخالفت کو اپنے اندر لے لے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیت میں موجود تمام ضمیریں مشرکین مکہ کی طرف لوثی ہیں کہ جو امر معاد میں تنگ رکھتے تھے اور استہزاء کے طور پر کہتے تھے کہ قیامت کب برپا ہوگی؟

لیکن یہ بات مسلم ہے کہ اس سے ان کی ذات مراد نہیں ہے بلکہ ان کی نوع ہے (معاذ سے غافل اور بے خبر انسانوں کی نوع) کیونکہ وہ تو مر گئے اور انہوں نے اس ضمیر آسمانی کو ہرگز نہیں سنا۔ (غور کیجئے گا)۔

بہر حال قرآن اس مختصر اور دو ٹوک تعبیر کے ساتھ انہیں تنبیہ کرتا ہے کہ اول تو قیامت ناگہانی طور پر اور غفلت کی حالت میں برپا ہوگی اور دوسرے یہ کوئی ایسا پیچیدہ موضوع نہیں ہے کہ وہ اس کے امکان کے بارے میں بحث و مخالفت کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اس ایک ہی بیخ کے ساتھ ہر چیز ختم ہو جائے گی اور دنیا تمام ہو جائے گی۔

اس لیے بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر تیز رفتار بجلی کی طرح غافلانہ ہوگا کہ انہیں وصیت کرنے تک کی بھی طاقت نہیں ہوگی اور انہیں اپنے گھر اور گھر والوں کی طرف واپس لوٹنے کی بھی صلت نہیں ملے گی (فلا یستطیعون توصیة ولا الی اہلہم یرجعون)۔

عام طور پر جب کوئی عاوض انسان کو پیش آتا ہے تو وہ یہ احساس کرتا ہے کہ اس کی زندگی قریب اتمام ہے لہذا کوشش کرتا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے اپنے گھر اور ٹھکانے تک جا پہنچے اور اپنے بچوں اور بچوں کے پاس چلا جائے اور پھر اپنے ادھر سے پڑے ہوئے کاموں اور اپنے ہمسائے گان کی سرفروخت و وصیت کے ذریعے کسی رخصتی کے ذمہ لگائے اور دوسروں کو ان کے بارے میں سفارش کر جائے۔

مگر کیا دنیا کے خاتمہ کی بیخ کسی کو صلت دے گی یا بالفرض صلت ہو بھی تو کیا کوئی زندہ بچے گا کہ وہ کسی انسان کی وصیت کو سنے یا کیا مثلاً بیوی اور اولاد اپنے شوہر اور باپ کے سر ہانے بیٹھیں گے اور اس کا سراپنی آغوش میں لیں گے تاکہ وہ آرام و سکون کے ساتھ جان دے دے؟ ان امور میں سے کوئی چیز بھی ممکن نہیں ہے۔

اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "توصیة" مکرہ کی صورت میں آیا ہے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں ایک وصیت اور چھوٹی سی سفارش کرنے تک کی بھی صلت نہیں ملے گی۔

اس کے بعد ایک دوسرے مرحلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو موت کے بعد حیات کا مرحلہ ہے۔

ارٹھاد ہوتا ہے، (پھر دوبارہ) صور پھونکا جائے گا تو وہ بیکارک (اپنی) قبروں سے (نکل کر) دوڑتے ہوئے اپنے پروردگار کی (عدالت کی) طرف جائیں گے (و نفع فی الصور فاذا ہم من الاجداث الی ربہم ینسلون)۔

مٹی اور بوسیدہ ہڈیاں حکم پروردگار سے نیکس حیات زریب تن کر لیں گی اور قبر سے نکل آئیں گی اور حساب و کتاب کے لیے سب کے بیب اس عجیب عدالت میں حاضر ہو جائیں گے۔ جس طرح سے ایک ہی مہموہ کے ساتھ سب مر گئے تھے اسی طرح سے ایک ہی نفع (صور پھونکنے سے سب کے سب زندہ ہو جائیں گے۔ ان کا مارتا خدا کے لیے کوئی شکل کام ہے اور نہ ہی ان کا زندہ کرنا۔ ٹھیک اس بگل کے مانند کہ جو لشکر کو جمع کرنے اور تیار کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے تو ایک ہی لمحے میں وہ سب کے سب نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں اور خمیوں سے باہر دوڑ پڑتے ہیں اور صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدا کے لیے مردوں کو زندہ کرنا بھی اسی طرح آسان اور سریع ہے۔

"اجداث"۔ "جدت"۔ (بروزن۔ قفس) کی جمع ہے اور قبر کے معنی میں ہے یہ تعبیر اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ معاد و قیامت جنبہ روحانی کے علاوہ جنبہ جسمانی بھی رکھتی ہے اور اسی پہلے ٹالے جسم کے مواد سے ہی جدید جسم تیار ہوگا۔

"نفع"۔ (پھونکا جائے گا) کی تعبیر فعل ماضی کی شکل میں اس بنا پر ہے چونکہ عرب آئندہ کے یقینی مسائل کو عام طور پر فعل ماضی کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے، گویا یہ کام پہلے سے ہو چکا ہے۔

"ینسلون"۔ "نسل"۔ (بروزن۔ نسل) کے مادہ سے سریع اور تیزی کے ساتھ چلنے کے معنی میں ہے۔ راجعہ مفردات میں کہتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں کسی چیز سے جدا ہونے کے معنی میں ہے اور یہ جو انسان کی اولاد کو نسل کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے ماں باپ سے جدا ہوتے ہیں (اس بنا پر جب انسان سرعت کے ساتھ دور ہوتا ہے اور جدا ہو جاتا ہے تو یہ تعبیر استعمال ہوتی ہے)۔

"ربہم"۔ (ان کا پروردگار) کی تعبیر گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی ربوبیت مالکیت اور پرورش ظاہر کرتی ہے کہ حساب و کتاب اور معاد و قیامت ہونا چاہیے۔

بہر حال آیات قرآنی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا اتمام اور دوسرے جہان کا آغاز دونوں ایک ہی جنبش انقلابی کے ساتھ اپنا تک صورت پذیر ہوگا اور ان میں سے ہر ایک کو نفع (صور پھونکنے) سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس کی مکمل تشریح انشاء اللہ سورہ زمر کی آیہ ۶۸ کے ذیل میں آئے گی۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: "اس وقت قیامت اور معاد کے منکر یہ کہیں گے کہ وائے جو ہم پر ہیں کس نے ہماری خوابگاہ سے اٹھا دیا ہے" (قالوا یا ویلنا من بعثنا من مرقدا نا)۔

”یہ تو وہی چیز ہے کہ جس کا خدا نے رحمن نے وعدہ کیا تھا اور اس کے رسولوں نے پچ کما تھا (ہذا ما وعد الرحمن وصدق المرسلون)۔“

ہاں! یہ منظر ایسا ہی منبولتا اور دہشت انگیز ہوگا کہ انسان تام باطل اور لغو سائل کو بھول جائے گا اور حقیقتوں کے صریح اعتراف کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ نہ ہوگا۔ قبروں کو خوابگاہ سے تشبیہ دے گا اور قیامت کو نیند سے بیدار ہونا قرار دے گا جیسا کہ ایک مشہور حدیث میں بھی آیا ہے:

”کما تنامون تموتون وکما تستیقظون تبعثون“

”جس طرح سے تم سوتے ہو اسی طرح مرو گے اور جس طرح نیند سے بیدار ہوتے ہو اسی طرح زندہ ہو جاؤ گے۔“

یہاں وہ پہلے وحشت زدہ ہو کر فریاد کریں گے کہ دانتے ہو ہم پر ہمیں کس نے اس نیند سے بیدار کر دیا ہے اور کس نے ہماری خوابگاہ سے ہمیں اٹھا دیا ہے۔

لیکن بہت جلد وہ متوجہ ہو جائیں گے اور انہیں یاد آجائیں گے کہ کچھ پیغمبروں نے خدا کی طرف سے انہیں اسی دن کا وعدہ کیا تھا لہذا وہ خود اپنے آپ کو یہ جواب دیں گے کہ یہ تو خدا نے رحمن کا وعدہ ہے۔ وہ خدا کہ جس کی رحمت عامہ نے سب کو گھیر رکھا ہے اور اس کے پیغمبروں نے سچ کہا ہے اور ہمیں اس دن سے آگاہ کیا ہے لیکن افسوس کہ ہم نے ان سب کا مذاق اور تمسخر اڑایا ہے۔

اس بنا پر ”ہذا ما وعد الرحمن وصدق المرسلون“ کا جملہ قیامت کے انہیں منکرین کی گفتگو کا آخری حصہ ہے لیکن بعض نے اسے فرشتوں یا مومنین کا کلام سمجھا ہے جو کہ آیت کے ظاہر کے برخلاف ہے اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ اس دن منکرین کا حقائق کا اعتراف کرنا کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو اسی آیت میں آئی ہو جیسا کہ سورہ انبیاء کی آیت ۹۷ میں بیان ہوا:

واقترب الوعد الحق فاذا هي شاخته ابصار الذين كفروا ياولينا قد كنا في غفلة من هذا ابل كنا ضالعين

”وعدہ حق (قیامت کے بارے میں) نزدیک ہو جائے گا، اس وقت کافروں کی آنکھیں شدت و وحشت سے پتھر جایشیں گی (اور وہ کہیں گے): دانتے ہو ہم پر کہ ہم اس امر سے غافل تھے، بلکہ ہم تو ظالم تھے۔“

بہر حال ”مرقد“ کی تعبیر کہ جو ”خوابگاہ“ اور ”نیند“ کے معنی میں آتی ہے اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ وہ لوگ عالم برزخ میں ایک ایسی حالت میں ہوں گے کہ جو نیند کے مشابہ ہوگی نیز جیسا کہ ہم نے سورہ

پہلی صورت میں اسم مکان اور ذریعہ موت میں، مصدر میں ہے۔

مومن کی آیت ۱۰۰ کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ جو ایمان و کفر کی ایک درمیانی حالت میں ہوں گے ان کیلئے عالم برزخ نیند کی حالت سے غیر مشابہ نہیں ہے، جبکہ اچھے مومنین اور حد سے بڑھے ہوئے بدکار کافروں کے لیے طور پر ایک طرح کی بیداری کے عالم میں ہوں گے اور مومن نعمتوں سے فیضیاب ہوں گے اور کافر طرح طرح کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ قیامت کا بھول اور وحشت اس قدر ہے کہ اس کے مقابلے میں برزخ کا عذاب آرام دہ اور نیند سے زیادہ نہیں ہے۔

اس کے بعد اس نفع صور کے وقوع کی سرعت کے بارے میں وضاحت کے لیے فرمایا گیا ہے: ”وہ ایک بیخ سے زیادہ کچھ نہیں ہے ایک زرد دار آواز بلند ہوگی اور وہ سب کے سب ہمارے پاس حاضر ہو جائیں گے“ (ان كانت الاصححة واحدة فاذا هم جميع لدينا محضرون)۔

اس بنا پر مژدوں کے زندہ ہونے اور ان کے قبروں سے باہر نکلنے اور پروردگار کی عدالت میں حاضر ہونے کے لیے زیادہ وقت اور زمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ لوگوں کو مارنے کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت نہیں تھی۔ پہلی بیخ موت کی پیکار ہے اور دوسری بیخ پھر سے زندگی ملنے اور پروردگار کی عدالت میں حاضر ہونے کی پیکار ہے۔

”صیحۃ“ (ایک بیخ) کی تعبیر اور ”واحدة“ کے ساتھ اس کی تاکید اور پھر ”اذا“ کہ جو اس قسم کے موقوفوں پر کسی چیز کے ناگہانی اور اچانک وقوع کی خبر دیتا ہے اور جملہ اسمیہ کی صورت میں ”ہم جميع لدينا محضرون“ کی تعبیر سب قیامت کے تیزی کے ساتھ واقع ہونے کی دلیل ہیں۔

ان آیات کا دو ٹوک لب و لہجہ اور ان کا پُر تاثر انداز انسانوں کے دل میں اس طرح سے اتر جاتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اس آواز کو دل کے کانوں سے سن رہے ہیں کہ اے ستمو ہوتے انسانو! اے بکھری ہوئی مٹی! اور اے بوسیدہ ہڈیو! کھڑی ہو جاؤ اور حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ نے دیکھا کہ کس قدر زبیا میں قرآنی آیات اور کس قدر ناطق ہیں اس کی تیبیں؟

۷ ”برزخ“ کے بارے میں اور وہاں لوگوں کی کیفیت کے متعلق جلد ۸ میں گفتگو کر چکے ہیں۔

۵۲) قَالِيَوْمَ لَا تُظَلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ○

۵۵) إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغْلٍ فَاكُهُونَ ○

۵۶) هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلِّ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَكئون ○

۵۷) لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَا يَدْعُونَ ○

۵۸) سَلَوْت قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِيمٍ ○

ترجمہ

۵۲) آج کے دن کسی پر ظلم نہیں ہوگا اور سوائے اس عمل کے کہ جو تم کیا کرتے تھے تمہیں اور کوئی جزا نہیں دی جائے گی۔

۵۵) بہشت والے آج کے دن خدا کی نعمتوں میں مشغول و سرور ہوں گے (اور بے آرام کرنے والی ہر فکر سے دور ہوں گے)۔

۵۶) وہ اور ان کی بیویاں (بہشت کے معلوں اور درختوں کے سایوں کے نیچے تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے)۔

۵۷) ان کے لیے جنت میں بہت ہی لذت بخش پھل ہیں اور جو کچھ وہ چاہیں گے انہیں میسر ہوگا۔

۵۸) ان کے لیے (خدائی درود و) سلام ہے یہ قول ہے مہربان پروردگار کی طرف سے۔

تفسیر

اہل بہشت مادی و روحانی نعمتوں سے سرشار ہونگے

قرآن یہاں میدانِ محشر میں حساب و کتاب کی کیفیت کے بارے میں بحث کو سر بہتہ چھوڑتے ہوئے گزر جاتا ہے اور صالح مومنین اور بد اعمال کافروں کے انجام کار کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: آج کے دن کسی پر ظلم نہیں ہوگا (قالیوم لا تظلم نفس شیئا)۔

نہ تو کسی کے اجر و ثواب میں کمی ہوگی اور نہ ہی کسی کی سزا میں اضافہ ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک سونی کی نوک کے برابر بھی کمی، زیادتی، نا انصافی اور ظلم و ستم نہیں ہوگا۔

اس کے بعد ایک ایسے امر کو بیان کیا گیا ہے کہ جو حقیقت میں اس عظیم عدالت میں ظلم و ستم کے نہ ہونے کی ایک واضح اور روشن دلیل ہے۔ فرمایا گیا ہے: تمہیں سوائے اس عمل کے کہ جو تم کیا کرتے تھے اور کوئی جزا نہیں دی جائے گی (ولا تجزون الا ما کنتم تعملون)۔

اس تعبیر کا ظاہر بغیر اس کے کہ اس میں کوئی چیز مقدر ہو یہ ہے کہ تم سب کی جزا وہی تمہارے اعمال ہی میں بخور کیجئے کونسی عدالت اس سے بہتر و برتر ہو سکتی ہے؟

دوسرے نظروں میں، جو نیک و بد اعمال تم اس دنیا میں انجام دیتے ہو وہی وہاں تمہارے ہمراہ ہوں گے۔ وہی اعمال مجسم ہو جائیں گے اور محشر کے تمام موافق میں اور حساب و کتاب کے اختتام کے بعد تمہارے ہمد و ہم نشین ہوں گے۔ کیا کسی کے اعمال کا حاصل اس کے حوالے کرنا عدالت کے خلاف ہے اور کیا خود اعمال کو مجرم کرنا اور اس کا ساتھی بنانا ظلم ہے؟

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ بنیادی طور پر ظلم کا اس جگہ کوئی مفہوم ہی نہیں ہے اور اگر ہماری اس دنیا میں انسانوں کے درمیان کبھی عدالت ہوتی ہے اور کبھی ظلم، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ توانائی نہیں رکھتے کہ ہر شخص کے اعمال خود اس کی تحویل میں دے دیں۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ تصور کر لیا ہے کہ آخری جلد بد اعمالوں اور کفار کے لیے مخصوص ہے کہ جو اپنے اعمال کے مطابق سزا بھگتیں گے اور مومن اس میں شامل نہیں ہیں کیونکہ خدا انہیں ان کے اعمال سے زیادہ اجر و ثواب دے گا۔

لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے یہ اشتباہ دور ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں جزا و سزا میں عدالت اور استحقاق کی بنیاد پر صلہ حاصل کرنے سے متعلق گفتگو ہے اور یہ چیز اس سے تضاد نہیں رکھتی کہ خدا مومنین کے لیے اپنے فضل و رحمت سے ہزاروں گنا اضافہ کر دے اور یہ "تفضل" کا مسئلہ ہے اور وہ استحقاق کا مسئلہ ہے۔

اس کے بعد مومنین کی جزا کے ایک گوشے کو بیان کیا گیا ہے سب سے پہلے سکون قلب اور راحت آرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اہل بہشت اس دن خدا کی نعمتوں میں ایسے مشغول ہوں گے کہ ہر قسم کی بے آرام کرنے والی فکر سے دور ہوں گے (ان اصحاب الجنة الیوم فی شغل)۔ اور وہ انتہائی خوشی و سرور میں ہوں گے (فاکھون)۔

مشغل (بروزن، شتخ اور شغل) (بروزن، قفل) دونوں ایسے امور و حالات کے معنی میں ہیں کہ جو انسان کو پیش آتے ہیں اور اسے اپنے ساتھ مشغول رکھتے ہیں چاہے وہ مسرت بخش ہوں یا غم انگیز۔ لیکن چونکہ اس کے بعد بلافاصلہ لفظ "فاکھون" لایا گیا ہے اور یہ لفظ "فاکہ" کی جمع ہے کہ جو سرزد شاداب کے معنی میں ہے اس لیے ہو سکتا ہے یہ ایسے امور کی طرف اشارہ ہو کہ جو انسان کو فرط مسرت سے اس طرح مشغول رکھتے ہیں کہ جو پریشان کن امور سے بالکل غافل کر دیتے ہیں گویا وہ سرور و نشاط میں اس طرح محو ہو گا کہ اس پر کوئی غم و اندوہ غالب نہ آسکے گا۔ یہاں تک کہ وہ وحشت جو قیام قیامت اور عدالت الہی میں حاضر ہوتے وقت اسے ہوتی تھی وہ بھی بھول جائے گا کیونکہ اگر سچ سچ وہ نہ بھولے تو ہمیشہ پریشانی اور غم و اندوہ کا سایہ اس کے دل پر بوجھ بنا رہے گا۔ اس بنا پر اس اشغال ذہنی کا ایک اثر عشر کی ہوننا کیوں کو بھول جانا ہے۔

بہر حال اطمینان قلب کی نعمت جو تمام نعمتوں کی بنیاد ہے اور تمام نعمتوں سے استفادہ کی شرط ہے اس کے بعد دوسری نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "وہ اور ان کی بیویاں لذت بخش سالیوں کے نیچے (خلوت گاہوں میں) تختوں کے اوپر تکیہ لگاتے ہوں گے" (ہم و ازواجہم فی ظلال علی الارائٹ متکئون)۔

"ازواج" ہبشتی بیویوں یا ان سون بیویوں کے معنی میں ہے کہ جو اس دنیا میں ان کی شریک حیات تھیں۔ بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ ہمطراز دہم فکر افراد کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ سورہ صافات کی آیت ۲۲ میں بیان ہوا ہے:

احشروا الذین ظلموا و ازواجہم
"ظالموں اور ان کے ہمطراز لوگوں کو حاضر کرو"

۱۔ راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "فاکہ" ہر قسم کے بھل کے معنی میں ہے اور "فکاء" ان باتوں کو کہنا جاتا ہے کہ جو انسان کو ماوس و مشغول رکھیں اور ابن المنثور لسان العرب میں کہتا ہے کہ "فکاء" مزاج کے معنی میں ہے اور "فاکہ" خوش مزاج انسان کو کہنا جاتا ہے۔
۲۔ اس آیت کی ترکیب میں علمائے بہت سے احتمال ذکر کیے ہیں لیکن ان سب میں سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ "ہم" مبتداء اور "متکئون" خبر ہے اور "علی الارائٹ" اس کے متعلق ہے اور "فی ظلال" بھی اسی کے متعلق ہے یا ایک محذوف کے متعلق ہے۔

بیابان یہاں بہت بعید نظر آتا ہے خاص طور پر جبکہ مفسرین اور ارباب لغت کی ایک کثیر جماعت کے مطابق "ارائٹ"۔ "اریکہ" کی جمع ہے کہ جو ان تختوں کے معنی میں ہے جو جگہ گاہ میں ہوتے ہیں۔ "ظلال" (سائے) کی تعبیر جنت کے درختوں کے سالیوں کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے نیچے اہل جنت کے تخت بچھے ہوں گے یا ہبشتی مخلوق کے سائے کی طرف اشارہ ہے اور یہ سب امور اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہاں بھی ایک سورج ہو گا لیکن وہ آزار و تکلیف دینے والا سورج نہیں ہو گا۔ ہاں! انہیں جنت کے دل پسند سالیوں میں ایک اور ہی نشاط و سرور حاصل ہو گا۔

علاوہ ازیں ان کے لیے بہت ہی لذت بخش میوے اور پھل ہوں گے اور وہ جو کچھ چاہیں گے انہیں میسر ہو گا (لھو فیہما فاکھة ولھم ما یدعون)۔

قرآن مجید کی دوسری آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کی غذا صرف پھل ہی نہیں ہیں لیکن زیر بحث آیت کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس کے پھل بھی۔ جو ایک خاص قسم کے پھل ہیں جو اس جہان کے پھلوں سے ذائقے میں بہت زیادہ لطیف ہیں۔ بہشت کی افضل ترین غذا ہیں، یہاں تک کہ اس جہان میں بھی غذا شناس ماہرین کی گواہی کے مطابق پھل انسان کے لیے بہترین اور مناسب ترین غذا ہیں۔

"یدعون"۔ "دعا یہ" کے مادہ سے طلب کرنے کے معنی میں ہے یعنی وہ جو کچھ طلب کریں گے اور جس چیز کی تمنا کریں گے وہ انہیں حاصل ہو جائے گی اور ان کے دل میں کوئی ایسی آرزو نہ ہوگی جو پوری نہ ہو۔

مرام طبری "جمع البسیان" میں کہتے ہیں کہ عرب یہ تعبیر "تنا" کے موقع پر استعمال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں:

ادع علی ماشئت

"جو تمنا دل چاہے مانگ اور مجھ سے تمنا کر"

اس طرح سے آج جو کچھ انسان سوچ سکتا ہے وہ بھی اور جو اس کے دہم و گمان میں بھی نہ آئے وہ بھی طرح طرح کی نعمتیں وہاں مہیا ہیں اور خدا اپنے مہانوں کی بہت اچھی پذیرائی کرے گا۔

لیکن سب نعمتوں سے زیادہ اہم وہی روحانی نعمتیں ہیں کہ جن کی طرف آخری زیر بحث آیت میں اشارہ

کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، ان کے لیے سلام اور خدائی تمہنیت ہے، یہ قول ہے ان کے رحیم اور مہربان پروردگار کی طرف سے (سلام قولاً من رب رحیم)۔

اس کی یہ روح افزا دلنشاط بخش اور مردِ محبت سے پُر نداء، انسان کی روح کو اس طرح سے اپنے اندر جذب کرے گی اور اسے لذت و خوشی اور روحانی سرور بخشنے گی کہ کوئی نعمت اس کے برابر نہیں ہوگی۔ ہاں! محبوب کی نداء سنا، ایسی نداء جو محبت بھری ہو اور لطف و کرم سے پُر ہو، اہلِ بہشت کو سرتاپا سرور و خوشی میں غرق کر دے گی کہ جس کا ایک ہی لمحہ دنیا و مایہا سے برتر ہے۔

ایک روایت میں پیغمبرِ گرامی اسلام سے منقول ہوا ہے کہ جس وقت بہشتی لوگ جنت کی نعمتوں سے متع ہو رہے ہوں گے تو ایک نور ان کے سروں کے اوپر ظاہر ہوگا۔ یہ لطفِ خدا کا نور ہے کہ جو ان کے اوپر سایہ فگن ہوگا اور اس سے نداء آئے گی کہ سلام ہو تم پر اسے بہشت میں رہنے والو اور یہ وہی ہے کہ جو قرآن میں آیا ہے "سلام قولاً من رب رحیم"۔ یہ وہ مقام ہے کہ لطفِ خدا کا احساس انہیں اس طرح مشغول کر دے گا کہ وہ سوائے اس کے ہر چیز سے غافل ہو جائیں گے اور اس حالت میں جنت کی تمام نعمتوں کو فراموش کر دیں گے اور یہ وہ منزل ہے کہ فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے اور کہیں گے تم پر درود ہو رہے ہاں! محبوب کے شہود کا جذبہ اور لطفِ دوست کا دیدار اس قدر لذت بخش اور شوق انگیز ہے کہ اس کا ایک لمحہ بھی کسی نعمت کے یہاں تک کہ سارے جہان کے برابر نہیں ہے۔ اس کے دیدار کے عاشق اس طرح ہیں کہ اگر فیضِ روحانی ان سے منقطع ہو جائے تو ان کی روح جسم سے پرواز کر جائے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں امیر المؤمنین سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لو حجت عنہ ساعة لمت

"اگر میں گھڑی بھر کے لیے اس کے دیدار سے محروم رہ جاؤں تو جان دے دوں"۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ پروردگار کا یہ سلام کہ جو بہشتی مومنین پر نچھاور ہوگا مستقیم بلا واسطہ سلام ہے۔ ایک ایسا سلام کہ جو پالنے والے اور پروردگار کی طرف سے ہے۔ ایسا سلام کہ جو اس کی رحمتِ خاصہ یعنی مقامِ رحیمیت کے سرچشمہ سے حاصل ہوتا ہے کہ جس میں تمام الطاف و کرامات جمع ہیں اور یہ کتنی عمدہ نعمت ہے؟

۱۔ "قولاً" کے اعراب کے محل کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے اور سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ وہ منقولِ مطلق ہے۔ فعلِ محذوف کا اور تقدیر میں "يقول قولاً"۔

۲۔ تفسیر روح المعانی جلد ۲۳ ص ۳۵ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ روح البیان جلد ۲ ص ۲۱۶۔

سلام کہ جو اہلِ بہشت پر نچھاور ہوں گے

اصولی طور پر بہشت "دارالسلام" ہے جیسا کہ سورہ یونس کی آیت ۲۵ میں بیان ہوا ہے کہ:

والله يدعوا الي دارالسلام

"خدا لوگوں کو دارالسلام اور سلامتی و آرام کی طرف دعوت دیتا ہے"

ہشتی کہ جو اس سرزمین کے ساکن ہیں بھی تو انہیں فرشتے سلام کریں گے کہ جو ان کے جنت میں داخل ہونے کے وقت ہر دروازے سے آئیں گے اور کہیں گے،

"جو صبر تم نے کیا ہے اس کی وجہ سے تم پر سلام ہو اور یہ گھر کیسا اچھا نتیجہ ہے کہ جو تمہیں نصیب ہوا ہے"

والصلاۃ تکذبون علیہم من علی باب سلام علیکم بما صبرتم فنعو عباقی العار (رواد ۲۲)

اور کبھی اعراف میں رہنے والے انہیں پکاریں گے اور کہیں گے،

"تم پر سلام ہو"

ونادوا اصحاب الجنة ان سلام علیکم (اعراف - ۴۶)

اور کبھی جنت میں داخل ہونے کے بعد فرشتوں کے سلام و درود پہنچیں گے اور کبھی قبضِ روح کے وقت یہ سلام موت کے فرشتوں کی جانب سے نذر ہوگا اور وہ کہیں گے:

"تم پر سلام ہے جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کی وجہ سے جو تم انجام دیتے تھے"

الذین تتوفونہم الملائکة طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنة بما کنتم تعملون (نحل - ۳۲)

کبھی وہ خود ایک دوسرے پر سلام و درود بھیجیں گے اور اصولاً:

"وہاں پر ان کا تہیتہ وہی سلام ہے"

تہیتہم فیہا سلام (ابراہیم - ۲۳)

بالآخر "ان سب سے برتر اور بالاتر پروردگار کا سلام ہے"

بسلام قولاً من رب رحیم۔

خلاصہ یہ ہے کہ:

"نہ تو وہاں پر کوئی لغو بات سنی جائے گی اور نہ ہی کوئی بیوہ کلام صرف سلام ہی سلام ہے۔

لا یسمعون فیہا لغوا ولا تاتینا الا قیلاً سلاماً سلاماً (واقف - ۲۵، ۲۶)

لیکن یہ ایسا سلام نہیں ہوگا کہ جو صرف لفظوں ہی سے عبارت ہو۔ بلکہ یہ ایسا سلام ہوگا کہ اس کا آرام بخش اور سلامت آفرین اثر انسان کی روح اور دل کی گرائیوں میں اثر جائے گا اور سب کو آرام و سکون اور سلامتی میں شراہور کرے گا۔

۵۹) وَاصْأَرُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ○

۶۰) أَلَمْ آعْهَدْ لَكُمْ يَبْنَىٰ آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ○

۶۱) وَإِنِ اعْبُدُونِي هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ○

۶۲) وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبَلًا كَثِيرًا أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ○

ترجمہ

۵۹) اے گنہگارو! آج کے دن الگ ہو جاؤ۔

۶۰) اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے؟

۶۱) اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا کیونکہ صراطِ مستقیم یہی ہے؟

۶۲) اُس نے تم میں سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

تفسیر

شیطان کی پرستش کیوں کرتے ہو؟

گزشتہ آیات میں اہل بہشت کے شوق انگیز اور پُر افتخار انجامِ کچھ ذکر تھا۔ زیر بحث آیات میں اہل دوزخ اور شیطان کے بندوں کے انجامِ کچھ تذکرہ ہے۔

پہلے تو یہ کہ اس دن انہیں تخیراً نیز انداز سے خطاب کیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا، اے گنہگارو!

آج کے دن تم الگ ہو جاؤ (وامتازوا اليوم ایہا المعجمون)۔ تمہی تو سنے کہ جو دنیا میں اپنے آپ کو مومنین کی صفوں میں رکھ کر ان کے رنگ میں سامنے آتے تھے اور ان کی حیثیت اور اعتبار سے استفادہ کرتے تھے۔ آج تم ان سے الگ ہو جاؤ اور اپنے اصلی چہرے میں ظاہر ہو جاؤ۔ یہ حقیقت میں اسی وعدہ الہی پر عملدرآمد ہے کہ جو سورہ ص کی آیت ۲۸ میں بیان ہوا ہے،

ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصالحات کالعضدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفتجار

”کیا ہم ان لوگوں کو کہ جو ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیئے ہیں زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح قرار دے دیں؟ یا پرہیزگاروں کو بد اعمالوں کی طرح کا قرار دے دیں؟“

بہر حال زیر بحث آیت کا ظاہری مفہوم مجرموں کی صفوں کا مومنین سے جدا کرنا ہی ہے اگرچہ مفسرین نے کئی دوسرے احتمال بھی ذکر کیے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ مجرموں کی صفوں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا اور ان میں سے ہر گروہ کا ایک صفت میں اشتراک پانا۔

۲۔ یا ان کا اپنے شیعوں اور مہودوں سے جدا ہونا۔

۳۔ یا ان کے ہر فرد کا ایک دوسرے سے جدا ہونا اس طرح سے کہ دوزخ کے عظیم رنج و غم کے علاوہ ہر شخص اور ہر چیز سے جدائی کا غم بھی ان پر اپنا سایہ ڈالے۔

لیکن خطاب چونکہ سب سے ہے لہذا، وامتازوا، کا مفہوم پہلے معنی کو ہی تقویت دیتا ہے کہ جو ہم نے بیان کیا ہے۔

بعد والی آیت قیامت کے دن خدا کی طرف سے مجرموں کے لیے معنی خیز ملازمتوں اور سرزنشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش اور اطاعت نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (الم آعہد الیکم یابنای آدم ألا تعبدوا الشیطان انہ لکم وعدو مبین)۔

یہ خدائی پیمان مختلف طریقوں سے انسان سے لیا گیا ہے اور بار بار یہ مفہوم اسے گوش گزار کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اُس دن کہ جب آدم کی اولاد نے زمین میں پھلنا پھولنا شروع کیا تو انہیں یہ خطاب ہوا،

یابنای آدم لایفتننکم الشیطان کما اخرج البویکو من الجنة یفزع عنہما لیاسہما لیبرہما سوا قہما انہ یرسکو ہو و قبیلہ من حیث لا ترونہو

انا جعلنا الشیاطین اولیاء للذین لا یؤمنون۔

”اے اولادِ آدم! شیطان تمہیں دھوکا نہ دے جس طرح سے کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کا لباس ان کے بدن سے اتروا دیا تھا تاکہ ان کی شرگاہ کو ان پر ظاہر کر دے۔ وہ اور اس کے پیرو تو تمہیں دیکھتے ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھتے۔ (راہی طرح) ایمان لو کہ ہم نے شیاطین کو ایسے لوگوں کے (دوست اور) اولیاء قرار دیا ہے کہ جو ایمان نہیں لاتے۔“ (اعراف - ۲۷)

اس کے بعد یہی تفسیر بار بار انبیاء کی زبان پر جاری ہوئی۔ جیسا کہ سورہ زخرف کی آیت ۶۲ میں ہے :
ولا یصد نکموا الشیطان اِنَّه لکرمعدو مبین
”شیطان تمہیں راہِ حق سے روک نہ دے کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“

نیز سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۸ میں ہے :

ولا تتبعوا خطوات الشیطان اِنَّه لکرمعدو مبین

”تم شیطان کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“

دوسری طرف یہ پیمان عالم ”مکونین“ میں انسان سے اعطائے عقل کے حوالے سے بھی لیا گیا ہے کیونکہ عقلی دلائل وضاحت کے ساتھ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انسان کو کبھی ایسے کا حکم نہیں ماننا چاہیے جس نے پہلے ہی دن سے اس کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ جس نے اُسے جنت سے باہر نکلوایا ہے اور اس کی اولاد کو گمراہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔

تیسری طرف تمام انسانوں کو خدا کی دی ہوئی سرشت اور فطرت توحید اور ذاتِ الہی کے لیے اطاعت کے منخر ہوئے سے بھی علیٰ طور پر انسان سے یہ عہد لیا ہے۔ اس طرح سے صرف ایک زبان سے نہیں بلکہ یہ خدائی تہذیب کئی زبانوں سے ہو چکی ہے اور یہ سرشت ساز عہد قبول ہو چکا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ”لا تعبدوا الشیطان“ میں ”عبادت“، اطاعت کے معنی میں ہے کیونکہ عبادت ہمیشہ پرستش اور رکوع و سجود کے معنی میں نہیں آتی بلکہ اس کی ایک صورت اطاعت کرنا ہے۔ جیسا کہ سورہ مومنوں کی آیت ۷۴ میں ہے کہ فرعون اور اس کے اطرافیوں نے موسیٰ اور ہارون کے مہوت ہونے کے بعد کہا :

انؤ من لبشرین مثلنا و قومہما لنا عابدون

”کیا ہم ایسے دو انسانوں پر کہ جو ہم ہی جیسے ہیں ایمان لے آئیں حالانکہ ان کی قوم ہماری عبادت (اطاعت) کرتی ہے۔“

نیز سورہ توبہ کی آیت ۳۱ میں ہے کہ خدا پیرو و نصاریٰ کے بارے میں فرماتا ہے :

ایتخذوا احبارہم و رہبانہم ارباباً من دون اللہ و العیض ابن مریم و ما امروا الا لیعبدوا اللہ و اللہا واحداً

”انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو خدا کے مقابلے میں معبود قرار دے لیا اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ انہیں خدا نے یگانہ کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے کی عبادت کے سوا کسی اور کی عبادت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔“

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک روایت میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے اس آیت کے ذیل میں منقول ہے :

اما واللہ ما دعوہم الی عبادۃ انفسہم ولو دعوہم ما اجابوہم
ولکن احلوا اللہ حراماً و حرموا علیہم حلالاً فعبدوہم
حیث لا یشعرون

خدا کی قسم! انہوں نے (علماء اور راہبوں نے) یہود و نصاریٰ کو اپنی عبادت کی طرف دعوت نہیں دی تھی اور اگر وہ اُس بات کی دعوت دیتے تو یہود و نصاریٰ کبھی بھی ان کی اس دعوت کو قبول نہ کرتے لیکن انہوں نے تو ان کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیا تھا اور انہوں نے اُسے قبول کر لیا تھا، اور اسی طرح سے لاشعوری طور پر ان کی عبادت کی تھی۔

اسی مفہوم کی نظیر کچھ فرق کے ساتھ دوسری روایات میں بھی موجود ہے۔ ان میں سے ایک روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے :

من اطاع رجلاً فی معصیۃ فقد عبده

”جس شخص نے کسی انسان کی پروردگار کی معصیت میں اطاعت کی تو اس نے اس کی پرستش کی۔“

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے :

من اصغی الی ناطق فقد عبده ، فان کان الناطق یؤدی عن اللہ
فقد عبده اللہ ، وان کان الناطق یؤدی عن الشیطان فقد عبده الشیطان۔
”جو شخص کسی بولنے والے کی بات پر کان دھرے (اور اس کی باتوں کو قبول کرے)

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۸۹ / اجواب صفات القاضی باب ۱۰ حدیث - (۱)۔
۲۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۹۱ / اجواب صفات القاضی باب ۱۰ حدیث - (۲)۔

تو اس نے اس کی پرستش کی اگر بولنے والا حکم خدا کو بیان کرتا ہے تو اس نے خدا کی عبادت کی ہے اور اگر وہ شیطان کی طرف سے بات کر رہا ہے تو اس نے شیطان کی عبادت کی ہے۔

﴿﴾

بعد والی آیت میں مزید تاکید اور اولاد آدم کی ذمہ داریوں اور فرائض کو بیان کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ: میری ہی عبادت کرنا اور میری اطاعت کرنا کیونکہ سیدھا راستہ ہی ہے (وان اعبدونی ہذا صراط مستقیم)۔

ایک طرف تو یہ عہد لیا کہ شیطان کی اطاعت نہ کرنا کیونکہ اس نے اپنی دشمنی اور عداوت کو پہلے ہی دن سے آشکار کر دیا تھا لہذا کونسا عقلمند ایسا ہے کہ جو اپنے دیرینہ اور کھلے ہونے دشمن کا حکم مانے گا۔ اس کے مقابلے میں یہ عہد لیا کہ صرف اسی کی اطاعت کریں اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ صراط مستقیم ہی ہے۔ یہ بات حقیقت میں انسانوں کے لیے بہترین عہد ہے کیونکہ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص خشک اور جلا دینے والے بیابان میں پھنس جائے اور اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی جان اور اپنے مال متاع کو چوروں اور بھیریلوں کے خطرے میں دیکھے تو سب سے اہم چیز کہ جس کے بارے وہ غور و فکر کرے گا وہ یہ ہے کہ منزل کی طرف سیدھی راہ کونسی ہے ایسی راہ کہ جو زیادہ جلدی اور زیادہ آسانی کے ساتھ اس منزل نجات تک پہنچا دے۔

معنی طور پر اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہان قیام کرنے کا مقام نہیں ہے۔ کیونکہ راستہ ایسے شخص کو دکھایا جاتا ہے کہ جو کسی گزرگاہ سے عبور کر رہا ہو اسے کسی منزل مقصود تک پہنچانا ہو۔

﴿﴾

اس کے بعد اس دیرینہ خطرناک دشمن سے زیادہ سے زیادہ آگاہی کے لیے مزید فرمایا گیا ہے: اُس نے تم میں سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ (ولقد اضل منکم جبلاً کثیراً افلحوا تکونوا تعقلون)۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ شیطان اپنے پیروکاروں پر کیسی کیسی بد بختیاں لایا ہے؟ کیا تم نے گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا تاکہ تم دیکھتے کہ اس کے بندے اور غلام کس بڑے اور دردناک انجام میں گرفتار ہوئے ہیں؟ اُن کے اُن دیکھے شہروں کے دیرانے تہذیبی آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کا ختم انجیز انجام ہر اُس شخص کے لیے واضح ہے کہ جو تھوڑی سی بھی عقل رکھتا ہو۔

پھر تم نجدگی کے ساتھ اس دشمن کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے۔ کہ جو بارہا اپنی عداوت و دشمنی ثابت کر چکا ہے؟ پھر اس سے دوبارہ دوستی کاٹتے ہو، یہاں تک کہ اسے اپنا رہبر، ولی اور رہنما بناتے ہو۔

مفردات راغب کے مطابق "جبیل" اس جماعت اور گروہ کے معنی میں ہے کہ جو عکث و بزرگی کے لحاظ سے جبیل ہے (بروزن "عقل") جو پہاڑ کے معنی میں ہے سے مشابہت رکھتا ہو اور "کشیراً" کی تعبیر شیطان کے پیروکاروں کے بارے میں زیادہ تاکید کے لیے ہے کہ جو ہر معاشرہ کا ایک بہت بڑا حصہ ہوتے ہیں۔

بعض نے "جبیل" کی تعداد دس ہزار یا اس سے زیادہ لکھی ہے اور اس سے کتر کے لیے یہ تعبیر مناسب نہیں سمجھی۔

لیکن بعض اس تعداد کو ضروری نہیں سمجھتے۔

بہر حال عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس قسم کے خطرناک دشمن سے خوب ڈرتا رہے کہ جو کسی انسان پر رحم نہیں کرتا اور اس کے ہاتھوں برباد ہونے والے ہر جگہ خاک ہلاکت پر پڑے ہوتے ہیں۔ ایسے دشمن سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہمارے آگاہ و بیدار پیشوا امیر المؤمنین حضرت علیؑ اپنے ایک خطبے میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فاخذروا عباد الله! عدوا لله، ان بعدد یككم بدائتہ، وان يستفزكم بنداہ، وان یجلب علیكم بیخلہ ورجلہ، فلعمری لقد فوق لکم سہم الوعید، واغرق الیکم بالغزع الشدید، ورماکم من مکان قریب، فقال رب بما اغویتنی لا زمین لہم فی الارض ولا غویبہم اجمعین۔

"اے خدا کے بندو! خدا کے اس دشمن سے ڈرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں اپنی بیماری (غزور و تکبر) میں مبتلا کر دے اور آواز دے کر تمہیں حرکت میں لے آئے اور اپنے سوار اور پیادہ لشکر کے ذریعے تمہیں اپنا بنا لے۔ مجھے اپنی جان کی قسم! اُس نے تمہیں شکار کرنے کے لیے ایک خطرناک تیرکمان میں رکھا ہوا ہے اور اپنی پوری توانائی سے شدت کے ساتھ کھینچا ہوا ہے اور اس نے نزدیک ترین جگہ سے تمہیں نشانہ بنا رکھا ہے۔ اس نے

۱۰ تفسیر روح المعانی و قرطبی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۱۰ تفسیر فرازی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

یہ اعلان بھی کر رکھا ہے کہ اسے پروردگار! مجھے تو تو نے گمراہ کیا ہی ہے لہذا میں بھی زندگی کے ذوق دہری اور ٹھاٹھ باٹھ کی ان کی آنکھوں میں چکا چوند کر دوں گا اور ان سب کو اغوا اور گمراہ کر دوں گا، حالانکہ خدا اس کی گمراہی کا سبب نہیں تھا بلکہ جو اسے نفس نے اسے گمراہ کیا تھا۔

واقعاً عجیب بات ہے کہ ہم اس قسم کے دشمن کو اپنا دوست بتائیں۔
بتولی شاعر ۵۔

نجا بر سر اکیم ازیں عاروننگ

کہ بااد بر صلیم د با حق بر جنگ

”ہم اس عاروننگ سے کس طرح باہر نکل سکتے ہیں کہ اس (شیطان) سے تو ہماری صلح ہے اور حق کے خلاف جنگ ہے۔“

۴۳ ○ هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ○

۴۴ ○ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ○

۴۵ ○ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَ

تَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○

۴۶ ○ وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ

فَأَنَّىٰ يُبْصِرُونَ ○

۴۷ ○ وَلَوْ نَشَاءُ لَمَسَخْنَاهُمْ عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوا

مُضِيًّا وَلَا يَرْجِعُونَ ○

۴۸ ○ وَمَنْ نَعْمَرَهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۗ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ○

ترجمہ

۴۳ ○ یہ وہی دوزخ ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

۴۴ ○ آج تم اس میں داخل ہو جاؤ اور اس کی آگ میں جلو اس کفر کی بنا پر کہ جو تم کیا کرتے تھے۔

۴۵ ○ آج ہم ان کے منہ پر ٹھہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے خود کردہ کاموں کی گواہی دیں گے۔

۴۶ ○ او اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں موند دیں پھر اگر وہ چاہیں راستہ طے کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں تو وہ دیکھ کیسے سکیں گے۔

مڑ لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں ان کاموں کی کہ جو انہوں نے انجام دیئے تھے ہمارے حضور شہادت دیں گے (الیوم نختبر علی افواہہم وتکلمنا بیدہم وتشهد ارجلہم بما کانوا یفکسون)۔

ہاں! اس دن انسان کے اعضا۔ اس کی مرضی کے تابع نہیں ہوں گے وہ اپنا صاحب انسان کے پورے وجود سے جدا کر کے پروردگار کا حکم مانیں گے اور اس کے آستانہ مقدس پر سر جھکا دیں گے اور اپنی شہادت کے ذریعے حقائق آشکار کر دیں گے۔ وہ کتنی عجیب عدالت ہے کہ جس کے گواہ خود انسان کے بدن کے اعضا۔ ہیں وہی آلات کہ جن کے ذریعے اس نے گناہ انجام دیا تھا۔

شاید اعضا کی گواہی اس بنا پر ہو کہ ان جرموں کو جس وقت یہ کہا جائے گا کہ جو عمل تم انجام دیا کرتے تھے اس کی سزا جنم ہے، تو وہ یہ گمان کرتے ہوئے کہ شاید یہ دنیاوی عدالت ہے کہ جس میں حقائق سے پیٹھ پھیر کر انکار کیا جاسکتا ہے، ان کا انکار کر دیں گے۔ اس پر اعضا کی گواہی شروع ہو جائے گی۔ ایسے میں ان پر تعجب اور وحشت چھا جائے گی اور بھاگنے کے تمام راستے ان پر بند ہو جائیں گے۔

اعضا کے بولنے کی کیفیت کیا ہوگی، اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں:

۱۔ خدا اس دن ایک ایک عضو میں بات کرنے کا ادراک و شعور پیدا کر دے گا اور اعضا پر سچ باتیں کریں گے اور اس میں تعجب کی کوئی بات ہے کہ وہی ذات جس نے گوشت کے ایک ٹکڑے کو جسے زبان کہتے ہیں، یا انسان کے دماغ میں یہ قدرت پیدا کی ہے، وہ دوسرے اعضا میں بھی یہ قدرت پیدا کر سکتا ہے۔

۲۔ وہ ادراک و شعور سے بہرہ مند نہیں ہوں گے، لیکن خدا انہیں بات کرنے کا حکم دے گا اور حقیقت میں اعضا گفتگو کے طور کا عمل ہوں گے، اور حقائق کو خدا کے فرمان اور حکم سے آشکار کریں گے۔

۳۔ ہر انسان کے بدن کے اعضا کے ساتھ ان اعمال کے آثار بھی یقیناً ہوں گے جو انہوں نے عمر بھر میں انجام دیئے ہیں کیونکہ اس جہان میں کوئی عمل بھی نابود نہیں ہوتا۔ یقیناً اس کے آثار بدن کے ایک ایک حصے پر اور فضا کے محیط میں باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ دن کہ ہر ظاہر و آشکار ہونے کا دن ہے یہ آثار بھی ہاتھ پاؤں اور باقی اعضا پر ظاہر ہو جائیں گے اور ان آثار کا ظہور ان کی شہادت شمار ہوگا۔

یہ تعبیر روزمرہ کی باتوں اور ادباً کی تعبیر میں بھی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں،

عینک تشهد بسہرک

”تیری آنکھ تیرے جاگتے رہنے کی گواہ ہے۔“

یا ہم کہتے ہیں:

العیطان تبکی علی صاحب الدار

۹۷

اؤ اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کی جگہ پر ہی مسخ کر دیں (اور انہیں بے جان پلٹ میں بدل کے رکھ دیں) کہ نہ تو وہ آگے کو سفر جاری رکھ سکیں اور نہ ہی پیچھے طرف پلٹ سکیں۔

۹۸

جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں اُسے خلقت کے اعتبار سے پلٹ دیتے ہیں (اور اُسے بچپن کی ناتوانی کی طرف پلٹا دیتے ہیں) کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے؟

تفسیر

جب زبان چپ ہوگی، اعضا گواہی دیں گے

گزشتہ آیات میں قیامت میں مجرموں کے لیے خدا کی سزائیں کا ذکر ہے اور اس کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ دیگر باتوں کا بیان ہے۔ زیر بحث آیات میں بھی وہی سلسلہ کلام جاری ہے۔

ہاں! اس دن کہ جب کہ جسم کی جلانے والی بھڑکتی ہوئی آگ مجرموں کی آنکھوں کے سامنے ہوگی تو اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجرموں کو مخاطب کیا جائے گا: ”یہ وہی دوزخ ہے کہ جس کا تم سے منہ کیا جاتا تھا (ہذہ جہنم الیٰ کنتم توعدون)۔“

خدا کے نبی یکے بعد دیگرے آتے رہے اور تمہیں اس دن اور ایسی آگ سے ڈراتے رہے لیکن تم نے ان سب کا سحر اڑایا: آج اس میں داخل ہو جاؤ اور اس کی آگ میں جلو، کیونکہ یہ اس کفر کی جزا ہے کہ جو تم کرتے تھے (اصلوہا الیوم بما کنتم تکفرون)۔

اس کے بعد قیامت کے دن کے گواہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ گواہ کہ جو خود انسان کے جسم کا حصہ ہیں اور ان کی باتوں کے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے: ”آج ہم ان کے منہ پر

۱۔ ”اصلوہا“ صلی۔ کے مادہ سے آگ جلاتا یا آگ میں جلانا اور مہیوتا، یا آگ میں داخل ہونا، اور اس کو لازم کر لینے کے معنی میں ہے۔

”دیواریں اس گھر کے مالک پر گریہ کرتی ہیں“

ایک فارسی شاعر بھی کہتا ہے ،

سے رنگ رخسارہ خبری دھدا ز سر درون
”رخسار کارنگ اندرونی راز کی خبر دے رہا ہے۔“

ہر حال قیامت میں اعضا کی گواہی مسلم ہے۔ اب یہی بات کہ کیا ہر خاص عضو اسی کام کو بیان کرے گا کہ جو اس نے انجام دیا ہے یا تمام کاموں کو؟ تو بلاشک و شبہ احتمال اول ہی مناسب ہے۔ لہذا قرآن کی دوسری آیات میں کان، آنکھ اور جلد بدن کے بات کرنے کا ذکر ہوا ہے۔

جیسا کہ سورۃ حم السجدہ کی آیہ ۲۰ میں ہے ،

حتى اذا ما جاوهما شهد عليهم سمعهم وابصارهم وجلودهم بما

كانوا يعملون

”جس وقت وہ جہنم کی آگ کے کنارے اکھڑے ہوں گے، تو ان کے کان، آنکھ اور بدن کی جلد ان اعمال کی گواہی دے گی کہ جو وہ انجام دیتے تھے۔“

نیز سورۃ نور کی آیہ ۲۴ میں آیا ہے :

يوم تشهد عليهم السنتهم وايديهم وارجلهم بما كانوا يعملون

”اس دن ان کی زبان، ہاتھ اور پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے کہ جنہیں وہ انجام دیتے تھے۔“

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ایک جگہ تو یہ فرمایا گیا ہے :

”ان کی زبانیں گواہی دیں گی“

جیسا کہ سورۃ نور میں ہے اور زیر بحث آیات میں فرمایا گیا ہے ”ہم ان کی زبان پر ٹھہر لگا دیں گے“ ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس بنا پر ہو کہ پہلے تو انسان کی زبان پر ٹھہر لگا دی جائے گی اور اس کے دوسرے اعضاء کلام کریں گے۔ جب وہ دیکھے گا کہ دوسرے اعضاء شہادت دے رہے ہیں تو اس کی زبان کھل جائے گی اور اب انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی لہذا زبان بھی اعتراف کرنے گی۔

یہ احتمال بھی ہے کہ زبان کی شہادت سے مراد عام تکلم نہ ہو بلکہ باقی اعضاء کی طرح کا تکلم ہو کہ جو اس کے اندر سے ابھرے نہ کہ باہر سے (اس عظیم عدالت کے گواہوں کی تعداد اور ان کی گواہی کی کیفیت سلسلے میں ہم انشاء اللہ سورۃ حم السجدہ کی آیات ۱۹-۲۳ کے ذیل میں اس سے زیادہ تفصیل گفتگو کریں گے)۔

آخری بات یہ ہے کہ اعضاء کی گواہی کفار اور مجرموں کے ساتھ مربوط ہے، ورنہ مومنین کا مسئلہ تو واضح ہے اس لیے امام باقر علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے :

ليست تشهد الجوارح على مؤمن ، انما تشهد على من حقت عليه لمة

العذاب ، فاما المؤمن فيعطى كتابه بيمينه ، قال الله عز وجل فمن

اوتى كتابه بيمينه فاولئك يقرءون كتابهم ولا يظلمون فتيلاً۔

”اعضائے جہانی مومن کے خلاف گواہی نہیں دیں گے بلکہ اس شخص کے برخلاف گواہی

دیں گے جس پر فرمان عذاب مسلم ہو چکا ہوگا، باقی رہا مومن تو اس کا نامہ اعمال اس کے اپنے

ہاتھ میں ہوگا (اور وہ خود ہی اُسے پڑھے گا) جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :

”جن کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے (وہ سرفرازی اور افتخار کے ساتھ)

اپنا نامہ اعمال پڑھیں گے اور ان پر معمولی سا ظلم بھی نہیں ہوگا۔“

۰ ۰ ۰

بعد والی آیت میں ایک عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن ہے کہ خدا اس مجرم گروہ کو اسی دنیا

میں اس عذاب میں مبتلا کر دے ایک ایسا عذاب کہ جو دردناک بھی ہے اور وحشت انگیز بھی، ارشاد ہوتا

ہے : ”اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں لیا میٹ کر دیں“ (ولونشاء لطمنا على اعينهم) یہ

اس حالت میں انہیں انتہائی وحشت گھیرے گی ”وہ چاہیں گے کہ جیسے وہ پہلے کیا کرتے تھے اسی

طرح ایک دوسرے پر سبقت حاصل کریں لیکن وہ کس طرح سے دیکھ سکتے ہیں“ (فاستبقوا الصراط

فانقي بيصرون)۔

وہ تو اپنے گھر کا راستہ تک بھی تلاش نہ کر پائیں گے چہ جائیکہ وہ راہ حق کو تلاش کر سکیں اور صراطِ مستقیم

پر چل سکیں۔

دوسری دردناک سزا یہ ہے کہ ”اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کی اپنی جگہ پر ہی سح کر دیں (بے روح او

بے حس و حرکت مجسموں یا مخلوج جانوروں کی طرح) اس طرح سے کہ نہ تو وہ آگے کو سفر جاری رکھ سکیں اور نہ

پہ پیچھے کی طرف ٹھسکیں“ (ولونشاء لطمناهم على مكانتهم فَمَا اسْتَطَاعُوا مُضِيًّا وَلَا يَرْجِعُونَ) یہ

۱۔ تفسیر صافی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ ”لطمنا“۔ ”لطمس“ (بروزن شستن) کے مادہ سے ہو کر نے اور کسی چیز کے آثار ختم کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں آنکھ کے نور یا خود

آنکھ کو اس طرح ہو کر نے کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں سے کوئی چیز باقی نہ رہ جائے اور وہ بالکل محو ہو جائے۔

۳۔ ”مکانة“۔ ”مٹھرنے کی جگہ“ کے معنی میں ہے اور یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا انہیں ان

کی اسی جگہ قیام میں، انسانی شکل سے محروم کر دے گا۔ ان کی شکل بھی بدل جائے گی اور چلنے پھرنے کی توانائی بھی ان

میں باقی نہ رہے گی بالکل بے روح مجسموں کی طرح۔

”فاستبقوا الصراط“ ممکن ہے کہ اس راستے کی تلاش میں ایک دوسرے پر بہتت حاصل کرنے کے معنی میں ہو جس پر وہ عام طور پر جایا کرتے تھے۔ یا راستے سے جھٹک جانے اور اسے نہ پا سکنے کے معنی میں ہو۔ کیونکہ بعض ارباب لغت نے کہا ہے کہ: ”فاستبقوا الصراط“ جاووزہ و ترحوکہ حتی ضلوا۔ کے معنی میں ہے۔ یعنی راستے سے آگے نکل گئے اور اسے پیچھے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو گئے۔

بہر حال اس تفسیر کے مطابق کہ جسے اکثر مفسرین نے قبول کیا ہے یہ دونوں آیات عذاب دنیا کے مارت مارتوں اور کفار و مجرمین کو اس بات کی تنبیہ و تہدید کرتی ہیں کہ خدا انہیں اس جہان میں ایسے دردناک انجام میں مبتلا کر سکتا ہے لیکن اس نے اپنے لطف و رحمت کی بنا پر ایسا نہیں کیا کہ شاید یہ ہٹ و دم بیدار ہو جائیں اور راہ حق کی طرف پلٹ آئیں۔

لیکن ایک احتمال اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ آیات روز قیامت کے عذاب سے متعلق ہیں نہ کہ دنیا کے۔ درحقیقت گزشتہ آیت کہ رہی تھی کہ ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے۔ ان آیات میں دو دوسری سزاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا چاہے تو یہ سزائیں ان پر لاگو کر دے۔

پہلی یہ کہ ان کی آنکھوں کو نابینا کر دے تاکہ وہ ”صراط“ جنت کے راستے کو نہ پا سکیں اور دوسری یہ کہ ان لوگوں کو جو دنیا میں راہ سعادت پر نہیں چلتے تھے اس دن انہیں بے روح جموں کی صورت میں ظاہر کر دے تاکہ وہ عرصہ محشر میں حیران و پریشان ہو کر رہ جائیں۔ نہ تو انہیں آگے کی طرف کوئی راستہ بھائی دے اور نہ ہی پیچھے کی طرف۔ البتہ تفسیر ہم نے بیان کی ہے آیات کی مناسبت اس تفسیر کے لیے ایک تائید ہے۔ اگرچہ اکثر مفسرین نے پہلی تفسیر کو قبول کیا ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں، عقل و جسم کے ضعف و ناتوانی کے لحاظ سے، عمر کے آخر میں انسان کی حالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ ان لوگوں کے لیے کہ جو راہ ہدایت اختیار کرنے میں آج اور کل کرتے رہتے ہیں ایک تنبیہ بھی ہو اور ان لوگوں کا جواب بھی ہو کہ جو اپنی کوتاہیوں کو عمر کی کمی کے سزا ڈال دیتے ہیں اور یہی بات خدا کی قدرت کی دلیل بھی ہو کہ وہ جس طرح ایک قوی اور طاقتور انسان کو ایک نومولود کی ناتوانی کی طرف پلٹا سکتا ہے کچھ ایسے ہی وہ معاد پر بھی قادر ہے اور اسی طرح مجرموں کو نابینا کرنے اور چلنے پھرنے

۱۔ انسان العرب، قطر الحیط، المنجد (مادہ - سبق ۱۰)۔

۲۔ اس تفسیر کو ”فی کلال“ نے اپنی تفسیر کی صورت میں ذکر کیا ہے جبکہ پہلی تفسیر کو جمع البیان، بیان، المیزان، صافی، روح المعانی، روح البیان، قرطبی اور تفسیر کبیر از فرامین رازی میں اختیار کیا گیا ہے۔

سے باز رکھنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ”جس شخص کو ہم طول عمر دیتے ہیں اسے خلقت کے اعتبار سے پلٹ دیتے ہیں، کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے؟“ ومن نعمتہ ننکسہ فی المخلق افلا یعقلون)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ”ننکسہ“ ”تنکیس“ کے مادہ سے کسی چیز کو اس طرح سرنگوں کر دینا ہے کہ سر پاؤں کی جگہ اور پاؤں سر کی جگہ آجائیں اور یہاں انسان کے بالکل بچپن کی حالت کی طرف پلٹ جانے کے لیے کہنا ہے کیونکہ انسان ابتدائے خلقت میں ضعیف ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ رشد و کمال کی طرف جاتا ہے۔ شکم مادر کے دوز میں ہر روز تھی خلقت اور جدید رشد سے گزرتا ہے۔ پیدا ہونے کے بعد بھی جسم و روح میں اپنے تکامل و ارتقاء کو تیزی کے ساتھ جاری و ساری رکھتا ہے اور خدا داد قوتیں اور صلاحیتیں کہ جو اس کے وجود کے اندر چھپی ہوئی ہیں بیکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ جوانی کا دور اور اس کے بعد بچپن کا وقت آگے پہنچتا ہے اور انسان جسمانی و روحانی تکامل و ارتقاء کی بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں بعض اوقات جسم و روح اپنے سفر کو ایک دوسرے سے جدا کر لیتے ہیں۔ روح تو اسی طرح سے اپنے تکامل و ارتقاء کو جاری رکھتی ہے جبکہ جسم پیچھے کی طرف پلٹنا شروع کر دیتا ہے لیکن انجام کار عقل میں بھی تیز رفتاری شروع ہو جاتا ہے اور یہ آہستہ آہستہ اور گہمی تیزی کے ساتھ بچپن کے مراحل کی طرف لوٹ آتی ہے۔ بچوں جیسی حرکتیں، بچوں جیسی سوچ، یہاں تک کہ بہانہ تراشیاں بھی بچوں کی طرح ہی ہو جاتی ہیں اور جسمانی کمزوری بھی اس کے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ بچوں کی یہ حرکتیں اور پیاری لگتی ہیں اور امید بخش مسرت آؤں مستقبل کی خوشخبری ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے بالکل قابل برداشت ہوتی ہیں لیکن بوڑھوں کی طرف سے ناپسندیدہ اور کبھی نفرت خیز یا ترم ایجز ہوتی ہیں۔

پہلے ایسے دن آگے پہنچتے ہیں کہ جو بہت ہی دردناک ہوتے ہیں اور جن کی تکلیف کی گہرائی کا بڑی شکل سے تصور کیا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید سورہ حج کی آیت ۵ میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے: ”ومنکم من یورد الی ارض العمر نکم یعلم من بعد علم شیئاً“ تم میں سے بعض اس قدر عمر رسیدہ ہو جاتے ہیں کہ وہ بدترین زندگی اور بڑھاپے کے مرحلے کو پہنچ جاتے ہیں اس طرح سے کہ جو علم انہوں نے حاصل کیا ہے وہ بھی یاد نہیں رہتا (یہاں تک کہ اپنے گھر کے افراد میں سے قریب ترین افراد کو بھی نہیں پہچان سکتے)۔

لہذا بعض روایات میں ستر سالہ افراد کو ”اصیر اللہ فی الارض“ (زمین میں خدا کے قیدی) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

۱۔ یہ جملہ حدیث نبوی (کتاب سفینہ مادہ ”عمر“) میں آیا ہے جبکہ دوسری روایات میں نوے سال کا ذکر ہے۔

ہر حال "افلا یعقلون" اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب تئیر ہے اور انسانوں سے سختی ہے کہ اگر یہ قدرت و توانائی کو جو تم رکھتے ہو عاریتاً نہ ہوتی تو اتنی آسانی کے ساتھ تم سے نہ چھین لی جاتی۔ جان لو کہ کسی اور کا دست قدرت تمہارے سر پر ہے کہ جو ہر چیز پر قادر ہے۔

جب تک تم اس مرحلے تک نہیں پہنچتے اپنی خبر لو اور اس سے پہلے کہ نشاط و زیبائی پر مردگی میں تبدیل ہو اس چین کے بھول چن لو اور آخرت کے طولانی سفر کا توشہ اس جان سے لے لو۔ کیونکہ ناتوانی، بڑھاپے اور در ماندگی کے وقت تم سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

اسی لیے جن پانچ چیزوں کی پیگیری اگر تم نے اب روڑو کو وصیت کی تھی ان میں سے ایک یہ تھی کہ بڑھاپے سے پہلے دُور جوانی کو نصیبت جانو۔

اغتمم خمسا قبل خمس، شابک قبل هرمك، صحتك قبل سقمك، وغناك قبل فقرك، و فراغك قبل شغلك و حياتك قبل موتك

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے نصیبت جانو۔ اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، اپنی صحت کو بیماری سے پہلے، اپنی تونگری کو فز و فاقہ سے پہلے، اپنی فراغت کو مشغولیت سے پہلے اور اپنی زندگی کو موت سے پہلے بلے یا بقول شاعر:

چنین گفت روزی بہ پیری جوانی کہ چوں است با پیریت زندگانی
بگفتا دریں نامہ حرفی است ہم کہ مینش جز وقت پیری ندانی
تو بہ کہ توانائی خویش گونی چہ می پرسی از دورہ ناتوانی
متاعی کہ من رایگان دادم از کف تو گری توانی مدہ رانگانی

"ایک دن ایک نوجوان نے ایک بوڑھے سے پوچھا کہ تیرے بڑھاپے کے دن کیسے گزار رہے ہیں؟ اُس نے جواب دیا کہ اس خط میں ایک ہم بات ہے کہ جس کا معنی تو بڑھاپے سے پہلے نہیں جان سکتا۔

بہتر ہے کہ تو اپنی قوت و توانائی کی بات کرے۔ ناتوانی اور بوڑھے کے دور کے متعلق کیا پوچھتا ہے۔

"وہ متاع کہ جو میں اپنے ہاتھ سے مفت میں دے چکا ہوں اگر تجھ سے ہو سکے تو اسے رایگان اور مفت میں دے گا۔"

۴۹ وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ
وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ۝

۵۰ لِيُنذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى
الْكَافِرِينَ ۝

ترجمہ

۴۹ ہم نے ہرگز اُسے شعر نہیں سکھایا اور وہ اس کے لائق بھی نہیں ہے۔ یہ (کتاب آسمانی تو) صرف ذکر اور قرآن مبین ہے۔

۵۰ مقصد یہ ہے کہ تو ان لوگوں کو ڈرانے کہ جو زندہ ہیں اور کفار پر اتمام حجت ہو جائے اور عذاب کا حکم ان کے لیے مسلم ہو جائے۔

تفسیر

رسول شاعر نہیں بلکہ وہ زندوں کو ڈرانے والا ہے

ہم نے بیان کیا تھا کہ اس سورہ میں اصول دین میں سے توحید، معاد اور نبوت کے بارے میں آئندہ اور جامع مباحث بیان کیے گئے ہیں اور گفتگو کے مختلف حصے یکے بعد دیگرے ایک خاص انداز سے آتے چلے جاتے ہیں۔

گزشتہ آیات میں توحید و معاد کے سلسلے میں مختلف بحثیں آئی ہیں۔ زیر نظر دونوں آیات میں نبوت کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام پر جو اتہامات لگائے جاتے تھے ان میں سے جو اہتمام سب سے زیادہ تھا اسے عنوان بنا کر انہیں دغماں شکن اور بہن آموز جواب دیا گیا ہے اور وہ ہے شعر گوئی کا الزام۔ فرمایا گیا ہے: "ہم نے اُسے شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی اس کے لیے مناسب اور لائق ہے کہ وہ شاعر ہو" (وما علمناه الشعر وما ينبغي له)۔

وہ پیغمبر اکرم پر ایسے الزامات کیوں لگاتے تھے حالانکہ آپ نے کسی بھی شعر نہیں کہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب لوگ دلوں میں قرآن کی تاثیر اور کشش محسوس کرتے تھے اور اس کے لفظ و معنی کی زیبائی اور فصاحت و بلاغت انکار کے قابل نہیں تھی۔ یہاں تک کہ خود مشرکین بھی قرآن کی آواز اور بیان سے اتنے متاثر ہوتے تھے کہ بعض اوقات رات کے وقت چھپ چھپ کر پیغمبر اکرم کی منزل کے قریب آتے تھے تاکہ رات کی تاریکی میں آپ کی تلاوت کا زمرہ سن سکیں۔

کتنے ہی لوگ ایسے تھے جو قرآن کی چند آیات سنتے ہی اس کے شیفہ اور فریفتہ ہو گئے اور ایک ہی مجلس میں اسلام قبول کر لیا اور قرآن کی آغوش میں پناہ لے لی۔

یہی سبب تھا کہ اس عظیم تاثیر کی توجیہ اور اس آسمانی وحی سے لوگوں کو غافل رکھنے کے لیے انہوں نے ہر جگہ پیغمبر اکرم کی شرگوئی کا پردہ بیکندہ کیا اور یہ باطنی طور پر قرآن کی انسانی تاثیر کا ایک اعتراف تھا۔

لیکن شاعر ہونا پیغمبر کی شان کے لائق کیوں نہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ "وحی" کا راستہ شعر کے راستے سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ:

۱۔ عام طور پر شعر کا سرچشمہ تخیل ہے، تصورات ہوتے ہیں۔ شاعر زیادہ تر خیال کے دوش پر سفر کرتا ہے جبکہ وحی "کا سرچشمہ مبداء ہستی ہے اور یہ حقیقتوں کے گرد گردش کرتی ہے۔

۲۔ شعر انسانی تفسیر پذیر حالت سے وقوع میں آتا ہے اور ہمیشہ تغیر کی حالت میں ہوتا ہے جبکہ وحی آسمانی ثابت شدہ حقائق کو بیان کرتی ہے۔

۳۔ شعر کا لطف اکثر موقوں پر مہانہ آرائی میں ہوتا ہے، یہاں تک کہ یہ کہا گیا ہے کہ:

احسن الشعر الكذبہ

"سب سے بہتر شعر وہ ہے کہ جس میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو"

جبکہ وحی میں صداقت اور سچائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

۴۔ شاعر ہمت سے موقوں پر لفظ کی زیبائیوں کی خاطر مجبور ہو جاتا ہے کہ خود کو الفاظ کے پردوں اور اس کے پیچھے پیچھے چلے اور کتنے ہی حقائق ایسے ہوتے ہیں کہ جو ایسی باتوں میں پامال ہوتے ہیں۔

۵۔ ایک معرکے خوبصورت خیال میں "شعر" ان آرزوؤں کا مجموعہ ہے کہ جو زمین سے آسمان کی طرف پرواز کرتی ہیں لیکن وحی ایسے حقائق کا مجموعہ ہے جو آسمان سے زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں اور یہ دونوں راستے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان شعراء کا حساب جدا سمجھیں کہ جو مقدس مقاصد کے لیے قدم اٹھاتے ہیں اور اپنے شعر کو غیر مطلوب عوارض سے دور رکھتے ہیں۔ چاہیے کہ ایسے شعراء کے مقام اور فن کی قدر و قیمت کو فراموش نہ کریں۔ لیکن ہر حال عام طور پر شعر کا مزاج اور طبیعت یہی ہے کہ جو بیان ہر جگہ

اسی بنا پر قرآن مجید سورہ شعراء کے آخر میں کتا ہے:

والشعراء يتبعهم الغاؤون

"شعراء تودہ ہیں جن کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں" (شعراء - ۲۲۳)

اس کے بعد مختصر اور پر معنی عبارت میں اس کی دلیل پیش کرتے ہوئے قرآن کتا ہے:

الم تر انهم في كل واد يهيمون ؕ وانهم يقولون مالا يفعلون ؕ

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں (بیشہ خیالات و تصورات کی دنیا اور اپنی شاعرانہ تخیلات میں ڈوبے رہتے ہیں) اور بیجا بات کی موجوں اور تخیلات کی قمرکات کے سامنے جھکے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیکھتے نہیں ہو کہ جو باتیں وہ کہتے ہیں ان پر عمل نہیں کرتے" (شعراء - ۲۲۵-۲۲۶)

البتہ انہی آیات کے آخر میں ان شعراء کو جو صاحب ایمان اور نیک و صالح ہیں اور جن کا فن ان کے اہداف و مقاصد کے کام آتا ہے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور ان کی قدر افزائی کی گئی ہے اور ان کا معاملہ دوسروں سے جدا رکھا گیا ہے۔

لیکن ہر حال پیغمبر شاعر نہیں ہو سکتا اور جس وقت قرآن یہ کتا ہے کہ "خدا نے اُسے شرکی تعلیم نہیں دی" تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا پیغام شرکی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کی تمام تعلیمات کا منبع خدا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ تواریخ و روایات میں بار بار نفل ہوا ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم چاہتے تھے کہ کسی شعر کو بطور مثال پیش کریں اور اُسے اپنے قول کا شاہد قرار دیں تو اسے توڑ کر پیش کرتے تھے تاکہ دشمن کے ہاتھ کوئی ہمانہ نہ آجائے، چنانچہ ایک دن پیغمبر چاہتے تھے کہ عربوں کا یہ مشہور شعر چڑھیں:

متبدي لك الايام ماكنت جاهلا وياتيك بالاخبار من لم تزود

"مغتریب زمانہ تیرے لیے ایسے حقائق آشکار کر دے گا جن سے تو آگاہ نہیں تھا اور ایسے افراد تیرے لیے خبریں لے کر آئیں گے جن کے لیے تو نے زاد و توشہ میا نہیں کیا تھا"

تو پیغمبر اکرم نے فرمایا:

ياتيك من لم تزود بالاخبار، اور جملے کو آگے پیچھے کر دیا

قرآن پیغمبر اکرم کے بارے میں شرکی نفی کرتے ہوئے مزید کتا ہے کہ "یہ آیات سوائے بیداری کے وسیلہ اور آشکار قرآن کے اور کچھ نہیں ہیں" (ان هو الاذکر وقرآن مبین)۔

جمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

”اس سے مقصد یہ ہے کہ تو ان لوگوں کو ڈراتے جو زندہ ہیں اور کافروں پر اتمامِ حجت ہو جائے اور حکمِ عذاب ان کے لیے مسلم ہو جائے (لینڈرمن کان حیثاً ویحق القول علی الکافرین) یہ لائن! یہ آیات ”ذکر“ ہیں اور نصیحت و بیداری کا وسیلہ ہیں۔ یہ قرآنِ مبین کی آیات ہیں کہ جو کسی قسم کی پردہ پوشی کے بغیر بڑی صراحت کے ساتھ حق کو بیان کرتی ہیں اور اسی بنا پر بیداری اور حیات کا موجب ہیں۔

ایک مرتبہ پھر ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ قرآن ”ایمان“ کو ”حیات“ اور ”مؤمنین کو ”زندہ“ اور بے ایمان افراد کو ”مردہ“ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ایک طرف تو ”حی“ (زندہ) ہے اور اس کے مقابل میں ”کافرین“ ہے۔ یہ وہی معنوی حیات و موت ہے جو ظاہری موت و حیات سے کئی درجے بڑھ کر ہے اور اس کے آثار زیادہ وسیع ہیں۔ اگر حیاتِ سانس لینے، کھانا کھانے اور چلنے پھرنے کا نام ہو تو یہ ایسی چیز ہے کہ جس میں تمام جانور شریک ہیں۔ یہ انسانی حیات نہیں ہے۔ حیاتِ انسانی تو، روحِ انسانی میں، عقل و خرد اور اعلیٰ ملکات کے پھول کھلنے، تقویٰ، ایثار، فداکاری، نفس پر قابو رکھنے اور فضیلت و اخلاق کا نام ہے اور قرآن انسانوں کے وجود میں اس حیات کی پرورش کرتا ہے۔

بہر حال انسان قرآن کی دعوت کے مقابلے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ زندہ و بیدار افراد کا ہے کہ جو اس کی ہر دعوت پر لبیک کہتا ہے اور اس کی تہنیتوں پر توجہ دیتا ہے۔ دوسرا گروہ مردہ دل کفار کا ہے کہ جو اس کے جواب میں مثبت رد عمل کا اظہار نہیں کرتا لیکن یہ اندازان پر اتمامِ حجت اور حکمِ عذاب کے مسلم ہونے کا باعث ہے۔

دلوں کی موت اور زندگی:

انسان چند قسموں کی موت و حیات کا حامل ہے۔

پہلی تو ”نباتی“ موت و حیات ہے جو نشوونما، غذا کھانے اور تولیدِ نسل کی منظر ہے۔ اس لحاظ سے انسان تمام نہاتات کے مانند ہے۔

دوسری موت و حیات ”جوانی“ ہے کہ جس کی واضح نشانی حس و حرکت ہے اور ان دونوں خصوصیات میں انسان تمام حیوانات کے ساتھ شریک ہے۔

البتہ تیسری قسم حیات کی وہ ہے جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے، جو انہیں نہاتات اور دوسرے

”لینڈرمن“ ذکر سے متعلق ہے کہ جو اس سے پہلے کی آیت میں ہے اور بعض نے اسے ”علمتنا“ یا ”نزلنا“ سے متعلق کہا ہے کہ جو مقدر ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

حیوانات سے جدا کرتی ہے اور وہ ہے حیاتِ انسانی و روحانی۔ یہ وہی چیز ہے جسے اسلامی روایات میں حیاتِ القلوب قرار دیا گیا ہے۔ یہاں پر ”قلب“ سے مراد وہی روح، عقل اور احساساتِ انسانی ہیں۔ امیرالمؤمنین علی علیہ السلام کے ارشادات میں بیخِ البلاغہ کے خطبات اور کلماتِ قصار میں اس مسئلے کا ذکر بہت کیا گیا ہے۔ ایک خطبے میں آپ قرآن کے بارے میں فرماتے ہیں:

تفقهوا فیہ فانہ ربيع القلوب

”قرآن کے بارے میں غور و فکر کرو، کیونکہ اس میں دلوں کو حیات بخشنے والی بہار ہے۔“

دوسری جگہ حکمت و دانش کے متعلق فرماتے ہیں:

ھی حیات للقلب العیت

”حکمت و دانائی مردہ دلوں کے لیے سبب حیات ہے۔“

بھی دل کی بیماری کا بدن کی بیماری سے تقابل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وامتد من مرض البدن مرض القلب

”بدن کی بیماری سے دل کی بیماری بدتر ہے۔“

بھی فرماتے ہیں:

ومن قل و رعه مات قلبه

”جس میں پرہیزگاری کی روح کم ہو جائے اس کا دل مرجاتا ہے۔“

دوسری طرف قرآن مجید نے انسان کے لیے ظاہری بینائی و شہواتی اور شعور و ادراک کے علاوہ ایک خاص قسم کی بینائی و شہواتی اور شعور و ادراک کا ذکر کیا ہے جیسا کہ کفار کے بارے میں ہے:

صم بکم عمی فہم لا یعقلون

”وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اور اسی بنا پر عقل و شعور نہیں رکھتے“ (بقرہ - ۱۷۱)

دوسری جگہ منافقین کو دل کے بیماروں کا نام دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فی قلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضاً

”خدا ان کی بیماری میں اضافہ کر دیتا ہے۔“ (بقرہ - ۱۰)

۱۔ بیخِ البلاغہ، خطبہ ۱۱۰۔

۲۔ بیخِ البلاغہ، خطبہ ۱۳۳۔

۳۔ بیخِ البلاغہ، کلماتِ قصار کلمہ ۳۸۸۔

۴۔ بیخِ البلاغہ، کلماتِ قصار کلمہ ۳۴۹۔

نیز جن لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہے انہیں قرآن سنگدل قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

شعرت قلوبکم بعد اللہ فی کالجارة او اشد قسوة

”ان کا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔“ (بقرہ - ۷۴)

اور کافروں کو ”ناپاک دل والے افراد کے ساتھ تعارف کراتے ہوئے قرآن کتا ہے:

اولئک الذین لیسیر اللہ ان یطہر قلوبہم

”وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کو پاک نہیں کرنا چاہتا۔“ (مائدہ - ۴۱)

ایک اور جگہ کتا ہے:

”تیری دعوت کو صرف وہ زندہ لوگ ہی قبول کریں گے کہ جو سننے والے کان رکھتے ہیں،
نہ کہ مُردہ لوگ۔“

انما یتجیب الذین یسمعون والموتی یتجہم اللہ شو الیلہ یرجعون

ایک اور جگہ ہے:

”صرف وہ لوگ ہی کہ جو سننے والے کان رکھتے ہیں تیری دعوت قبول کریں گے۔ باقی سب

مُردے تو انہیں خدا قیامت میں اٹھائے گا پھر وہ اس کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔“ (انعام - ۳۶)

ان تعبیرات کے مجموعے اور ان سے مشابہت سبھی دوسری تعبیروں سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے

کہ قرآن موت و حیات کا محور اسی عقل والے انسانی محور کو شمار کرتا ہے کیونکہ انسان کی تمام قدر و قیمت اسی
حصے میں چھپی ہوئی ہے۔

حقیقت میں حیات و ادراک، دیکھنا اور سننا وغیرہ انسانی وجود کے اسی حصے میں مجتمع ہوتا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے ان تعبیرات کو مجاز سمجھا ہے لیکن وہ اس مقام پر راجح قرآنی سے ہم آہنگ نہیں

ہیں کیونکہ قرآن کی نگاہ میں حقیقت یہی ہے اور حیوانی موت و حیات ایک مجاز سے زیادہ نہیں ہے۔

روحانی موت و حیات کے عوامل و اسباب بہت زیادہ ہیں لیکن قدر مسلم یہ ہے کہ فحاشی، بکری، غرور،

تصعب، جہالت اور گناہان کبیرہ دل کو مردہ کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ امام زین العابدین علی بن الحسین علیہ السلام کی

پندرہ مناجاتوں میں سے تانبہن کی مناجات میں بیان ہے:

وامات قلبی عظیم جنابتی

”میرے بڑے بڑے جرائم نے میرے دل کو مُردہ کر دیا ہے۔“

زیر بحث آیات بھی اسی حقیقت پر ایک تاکید ہیں۔

کیا وہ لوگ زندہ ہیں کہ جو زندگی میں صرف اس بات پر قانع ہو گئے ہیں کہ وہ بے خبری کی حالت میں
ہمیشہ ہمیش و لوش میں زندگی بسر کریں، نہ کسی مظلوم کی فریاد سنیں نہ مٹاؤ جان حق کی نڈا پر لیکہ کہیں نہ ظالم کے ظلم
سے ناراضت اور پریشان ہوں اور نہ مظلومین کی عرومیت پر ان میں جنبش و حرکت پیدا ہو، صرف اپنے ہارے
میں سوچیں اور اپنے غیر ملکہ خود اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہوں۔

کیا زندگی یہی ہے کہ جس کا حاصل صرف کچھ غذا کا کھالینا کچھ پڑوسے بوسیدہ کر لینا اور سونے اور
جاگنے کی تکرار کرتے رہنا؟

اگر زندگی یہی ہے تو پھر حیوان اور عالم انسانی میں کیا فرق ہے؟

پس یہ بات قبول کرنی ہی پڑے گی کہ اس ظاہری زندگی کے ماوراء اور پس پردہ ایک حقیقت ہے کہ
جس کا قرآن ذکر کرتا ہے اور اس کے ہارے میں بات کرتا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایسے مرنے والے کہ جن کی موت میں بھی حیات انسانی کے آثار پائے جاتے ہیں
قرآن کی نگاہ میں مر کر بھی زندہ ہیں لیکن وہ زندہ کہ جن میں حیات انسانی کے آثار میں سے کوئی نظر نہیں آتا، قرآن
کی مطلق میں مُردہ ہیں۔ ایک جانگاہ و رقت بار موت۔

۴۱) اَوْلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَا
اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَلِكُونَ ○

۴۲) وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ ○

۴۳) وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبٌ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُونَ ○

۴۴) وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اِلَهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ ○

۴۵) لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَلَا هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ
مُّحَضَّرُونَ ○

۴۶) فَلَا يَحْزَنُكَ قَوْلُهُمْ ؕ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ
وَمَا يُعْلِنُونَ ○

ترجمہ

۴۱) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جو چیزیں ہم اپنی قدرت سے رو بہ عمل لاتے
ہیں ان میں ہم نے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے ہیں کہ جن کے وہ
مالک ہیں۔

۴۲) ہم نے انہیں ان کے لیے یوں رام کر دیا ہے کہ انہی میں سے سواری
کا کام بھی لیتے ہیں اور انہیں میں سے غذا بھی حاصل کرتے ہیں۔

۴۳) نیز ان (جوانات) میں ان کے لیے دوسرے منافع بھی ہیں اور پینے کی اچھی
چیزیں ہیں، کیا وہ اس حالت میں شکر نہیں کرتے۔

۴۲) انہوں نے اپنے لیے خدا کے علاوہ کچھ معبود بنا لیے ہیں۔ اس امید پر کہ
شاید ان کی مدد کی جائے۔

۴۳) لیکن وہ ان کی مدد پر قادر نہیں ہیں اور یہ (عبادت کرنے والے قیامت میں)
آتش جہنم میں حاضر ہونے والا ان کا لشکر ہوں گے۔

۴۴) لہذا ان کی باتیں تمہیں غمگین نہ کریں، ہم ان تمام باتوں کو جانتے ہیں کہ جنہیں
وہ پنهال رکھتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں۔

تفسیر

چوپایوں کے عظیم فائدے

ان آیات میں قرآن مجید ایک بار پھر توحید و شرک کے مسئلے کی طرف لوٹتا ہے اور انسانوں کی
زندگی میں عظمت خدا کی کچھ نشانیوں کا ذکر کرتا ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ خدا ہی اپنے بندوں
کی حاجات کو پورا کرتا ہے اور بت اس سلسلے میں بے بس اور ناتواں ہیں۔ اس طرح ایک واضح موازنہ
کرتے ہوئے راہ توحید کی حقانیت اور راہ شرک کے بطلان کو واضح کیا گیا ہے۔
ارشاد ہوتا ہے: کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جو چیزیں ہم اپنی قدرت سے رو بہ عمل لاتے ہیں ان
میں ہم نے ان کے لیے چوپائے بھی پیدا کیے ہیں کہ جن کے وہ مالک ہیں (اولم یروا انا خلقنا لهم
مما عملت ایدینا انعاما فہم لہا مالکون) یہ

اس غرض سے کہ وہ ان چوپایوں سے اچھی طرح فائدہ اٹھا سکیں۔ ہم نے انہیں ان کے لیے رام
کر دیا ہے۔ (و ذللناھا لہم)۔
یہ ان میں سے اپنے لیے سواریاں بھی فراہم کرتے ہیں اور ان سے غذا بھی حاصل کرتے ہیں (فمنھا
رکوبہم ومنھا یأکلون)۔

۱۔ اولم یروا... ایک ایسا جملہ ہے کہ جو ادا عطف کے ساتھ اپنے سے پہلے جملہ پر عطف ہوا ہے البتہ چونکہ ہرہ استعمال ہمیشہ صد
نیشن ہوتا ہے اس لیے ادا عطف سے پہلے آیا ہے اور یہاں ممکن ہے کہ رویت جانتے نادیکھ کر سمجھ لیں۔

ان چوپایوں کے فائدے صرف یہی نہیں ہیں بلکہ ان کے لیے ان حیوانات میں دوسرے فائدے بھی ہیں اور اچھے مشروبات بھی ہیں (ولہذا فیہا منافع و مشارب)۔
"کیا ان حالات میں بھی وہ ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے؟ وہ شکر کہ جو اللہ کی معرفت کا وسیلہ اور دلِ نعمت کی شناخت کا ذریعہ ہے (افلا یشکرون)۔"

چند قابل توجہ نکات

۱۔ مختلف نعمتیں کہ جن میں انسان سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا ہے، ان میں سے یہاں چوپایوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کیونکہ وہ انسان کی روزمرہ کی زندگی میں ہمیشہ حاضر رہتے ہیں۔ انسانی زندگی ان کے ساتھ اس حد تک وابستہ ہے کہ اگر وہ انسانی زندگی سے حذف ہو جائیں تو واقعاً انسان کی زندگی مشکل اور پیچیدہ ہو جاتی ہے۔

۲۔ "عملت ایڈینا" (ہمارے ہاتھوں نے انہیں انجام دیا)۔ یہ جملہ پروڈگار کی مستقیم DIRECT قدرت کے اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ انسان کا اہم ترین عضو جس کے ساتھ وہ اپنی قدرت کو عمل میں لاتا ہے، اس کے ہاتھ ہیں۔ اسی وجہ سے "اید" (ہاتھ) قدرت کے لیے کیا رہا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

یٰٰد اللہ فوق ایڈیہو

"خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے" (فتح - ۱۰)

بہر حال "ایدی" کا ذکر حج کی شکل میں پروردگار کی قدرت کے گونا گوں مظاہر کی طرف اشارہ ہے۔
۳۔ "فہم لہما مالکون" (فار تفریح کے ساتھ) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے چوپایوں کو اپنی قدرت کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن اس کی مالکیت انسانوں کو بخش دی ہے اور اس سے لطف پروردگار کی انتہا ظاہر ہوتی ہے۔ اس بنا پر وہ اشکال کہ جو بعض مفسرین کے لیے یہاں "فار تفریح" میں پیدا ہو گیا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ہم کسی سے کہیں کہ یہ باغ ہم نے آباد کیا ہے لیکن تم اس سے فائدہ اٹھاؤ گے اور یہ انتہائی محبت و ایثار کی نشانی ہے۔

۴۔ "ذللناھا لہم" انسانوں کے لیے چوپائے رام ہونے کے اہم مسئلے کی طرف اشارہ ہے یہ طاقتور حیوانات کہ جو کبھی کبھی نادر طور پر خدا کے "ذللناھا" کے فرمان کو فراموش کرتے ہوئے صحیان و طغیان پر اتر آتے ہیں تو اس قدر خطرناک ہو جاتے ہیں کہ دیوں اور اذان کے مقابلہ میں عاجز آجاتے ہیں لیکن عام حالات میں اونٹوں کی ایک قطار کو ایک رسی سے باندھ کر ایک چند سالہ بچے کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے تو وہ انہیں جہاں اس کا دل چاہے لے جاتا ہے۔

واقعاً عجیب بات ہے، نہ تو انسان اس بات پر قادر ہیں کہ ایک مکھی ہی پیدا کر سکیں اور نہ ہی وہ

ایک مکھی کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا سکتے ہیں، لیکن خدائے قادر و منان نے لاکھوں قسم کے چوپائے پیدا کیے ہیں اور انہیں انسان کے لیے رام اور مطیع کر دیا ہے اور وہ ہمیشہ انسان کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔

۵۔ "فصنھا رکوبہم ومنھا یا کلون" میں "رکوب" صفت مشہ ہے اور "مرکوب" یعنی وہ جانور کہ جس پر سوار ہوتے ہیں کے معنی میں ہے۔ یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کچھ حیوانات کو تو مرکب اور سواری کے طور پر استعمال کرتا ہے اور کچھ کو کھانے کے لیے۔

اگرچہ تمام عام جانوروں کا گوشت اسلام کی نظر میں حلال ہے لیکن عملی طور پر ان میں سے کچھ ہی جانور کھانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً گدھے کا گوشت سوائے جمبوری کی حالت کے کوئی نہیں کھاتا۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ "منھا" کو دونوں جملوں میں "تبعیض" کے معنی میں لیا جائے لیکن اگر پہلا "منھا" تبعیض حیوانات اور دوسرا "تبعیض" اجزاء کے لیے ہو، تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ بعض جانوروں کو تم اپنی سواری بناتے ہو اور بعض کے اجزائے بدن سے غذا حاصل کرتے ہو (کیونکہ ہڈیاں وغیرہ غذا کے قابل نہیں ہیں)۔

۶۔ "لہم فیہا منافع" کا جملہ ان دوسرے بہت سے فوائد کی طرف اشارہ ہے کہ جو چوپایوں سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی اذن سے طرح طرح کے لباس اور خیمے بنتے ہیں اور ان کا چمڑا لباس، جوتا، ٹوپی اور زندگی کی دوسری مختلف ضروریات کا آنا ہے۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں بھی جبکہ مصنوعات نے انسانی زندگی کا چہرہ ہی بدل کے رکھ دیا ہے، پھر بھی انسانوں کی یقینی ضرورت لباس کے لحاظ سے بھی اور باقی وسائل زندگی کے لحاظ سے بھی چوپایوں سے اپنی پوری شد و مد کے ساتھ باقی ہے۔

یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں انواع و اقسام کے سیرم (EXTRACT) اور ویکسین (VACCINE) کہ جو بیماریوں کا مقابلہ کرنے یا حفظاً تقدم کے لیے مؤثر ترین ذریعہ ہیں چوپایوں سے ہی حاصل ہوتی ہیں کہ جو ان کے خون سے کیا جاتا ہے۔

یہاں تک کہ چوپایوں کی زندگی کی بے قدر و قیمت چیزیں گوہر اور پیشاب سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے اور اسے زمینوں اور درختوں کے لیے کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

۷۔ "مشارب" کی تعبیر اس دودھ کی طرف اشارہ ہے کہ جو مختلف جانوروں سے حاصل کیا جاتا ہے اور انسان کی غذا کا ایک اہم حصہ اس سے اور اس سے بنائی ہوئی چیزوں سے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ آج دنیا میں دودھ کی پیداوار اور دودھ سے بنی ہوئی صنعتیں مختلف ممالک کی درآمد و برآمد کا ایک اہم حصہ ہیں۔ وہی دودھ کہ جو انسان کے لیے ایک مکمل غذا ہے اور یہ خوش گوار دودھ گوہر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے کہ جو پینے والے کے لیے باعث لذت اور ناکوانوں

کے لیے قرآنی بخش ہے۔

۸۔ "افلا يشكرون" استغمام انکاری کی صورت میں آیا ہے۔ یہ جملہ خدا کی بے پایاں نعمتوں پر احساس تشکر اظہار کے لیے غرض سے ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں "شکر معنم کا لڑوم" معرفت خدا کے لیے ایک بنیادی چیز ہے۔ کیونکہ شکر، نعمت بخشنے والے کی پہچان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ان نعمتوں کا مطالعہ اور اس بات کا شعور کہ بتوں کا ان میں ہرگز کوئی عمل دخل نہیں، شرک کو باطل کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔

اس لیے بعد والی آیات میں مشرکین کی حالت بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، انہوں نے خدا کے علاوہ اپنے لیے کچھ معبود بنا لیے ہیں، اس امید پر کہ وہ ان کی مدد کریں گے اور انہیں بتوں کی حمایت حاصل ہوگی (واتخذوا من دون الله الهة لعلهم ينصرون)۔ کیا خیال خام اور باطل نظریہ ہے کہ ان کمزور موجودات کو جو خود اپنے دفاع پر بھی قادر نہیں ہیں، زمین و آسمان کے خالق اور ان تمام نعمتوں کے بخشنے والے کے برابر قرار دے دیا جائے اور زندگی کے مشکل امور میں ان سے مدد طلب کی جائے۔

واتخذوا من دون الله لیکونوا لهم عزا

"ہاں! وہ کہیں اس بنا پر بتوں کے پیچھے جاتے تھے کہ وہ ان کے لیے سرمایہ عزت ہوں گے" (مریم - ۸۱)

اور کہیں انہیں خدا کی بارگاہ میں شیخ خیال کرتے۔

ويعبدون من دون الله مالا یضرهم ولا ینفَعهم ویقولون هؤلآء شفعاؤنا عند الله

"وہ خدا کے علاوہ کچھ ایسی موجودات کی پرستش کرتے ہیں کہ جو نہ انہیں کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نفع دے سکتے ہیں کہ یہ بارگاہ خدا میں ہمارے شیخ ہیں" (یونس - ۷۸)

بہر حال یہ تمام خیالات نقش پر آب ہیں اور جیسا کہ قرآن سورہ اعراف کی آیت ۱۹۲ میں فرماتا ہے،

ولا یستطیعون لہم نصرا ولا انفسہم ینصرون

"یہ بے ثبوت نہ تو اپنے عبادت گزاروں کی کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی خود اپنی کوئی مدد کر سکتے ہیں۔"

جانوروں کے پستانوں سے نکلنے والے دودھ میں خدا کی قدرت نمائی اور دودھ کی خوبوں کے بارے میں ہم تفصیلی بحث جلد ۱ میں سورہ نحل کی آیت ۶۶ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے، وہ اپنے عبادت گزاروں کی مدد کرنے پر قادر نہیں ہیں اور یہ عبادت کرنے والے قیامت کے دن ان کا لشکر ہوں گے اور سب کے سب دوزخ میں حاضر ہوں گے (لا یستطیعون نصرہم وهم لہم جند محضرون)۔

کتنی دردناک صورت حال ہے کہ یہ پیروکار اس دن سپاہیوں کی صورت میں بتوں کے پیچھے کھڑے ہوں گے اور سب کے سب خدا کی عدالت میں حاضر ہوں گے۔ اس کے بعد سب کے سب دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے بغیر اس کے کہ وہ اپنے لشکر کی کوئی مشکل حل کر سکیں۔

اصولی طور پر، محضرون کی تعبیر ہر جگہ تحقیر و تذلیل کی علامت ہوتی ہے اور لوگوں کو ان کے مائل ہونے بغیر حاضر کرنا ان کی حقارت کی نشانی ہے۔

اس تفسیر کے مطابق "وہم لہم جند محضرون" میں پہلی ضمیر "ہم" عابدوں کی طرف اور دوسری ضمیر مجبوروں کی طرف لوثی ہے۔ جبکہ بعض مفسرین نے اس کے برخلاف بھی خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ یہ کہ معبود اور بت اس دن عبادت کرنے والوں کا لشکر ہوں گے اور لشکر ہونے کے باوجود معمولی سی مدد بھی ان سے نہ ہو سکے گی۔

البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

بہر حال یہ تعبیریں صرف صاحب شعور شیاطین اور کشر جن و انس جیسے مجبوروں کے بارے میں صادق آتی ہیں لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس دن خدا ان بتوں میں عقل و شعور پیدا کر دے گا جو انہوں نے پتھر اور لکڑی سے بنائے ہوں گے۔ تاکہ وہ اپنے عبادت کرنے والوں کی سرزنش کریں جنہی طور پر یہی پتھر اور لکڑیاں جہنم کے ایندھن کے طور پر ان کے ساتھ ہوں گی۔ جیسا کہ قرآن مجید سورہ انبیاء کی آیت ۹۸ میں کہتا ہے:

انکم وما تعبدون من دون الله حسب جہنم انتم لھا وارثون

"تم بھی اور جن جن کی تم خدا کے سوا عبادت کیا کرتے تھے، جہنم کا ایندھن ہوں گے اور سب کے سب اس میں داخل ہوں گے۔"

آؤکار زبیر بحث آخری آیت میں پیغمبر اکرم کی تسلی اور ان مخالفتوں، فتنہ انگیزیوں اور خرافاتی اعمال و افکار کے مقابلے میں انکی رضائی تعویب کے لیے فرمایا گیا ہے، اب جبکہ ایسا ہے تو ان کی باتیں تجھے ٹھیک نہ کریں کہ کبھی وہ تجھے شاعر کہتے ہیں اور کبھی جادوگر اور کبھی دوسری تمہیں ہاندھتے ہیں کیونکہ جس چیز کو وہ دلوں میں مخفی رکھتے ہیں یا زبان کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں ہم وہ سب کچھ جانتے ہیں (فلا یحوزنک قولہم انا نعلم ما یسرون وما یعلنون)۔

نہ تو ان کی نیکی ہم سے پوشیدہ ہیں اور نہ ہی ان کی خفیہ سازشیں اور نہ ہی انکی آرزو، ناکامی،

اور فیطیتیں۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں اور ان کا حساب روزِ حساب کے لیے محفوظ رکھتے ہیں اور تجھے اس جہان میں بھی ان کے شر سے محفوظ رکھیں گے۔

نہ صرف پیغمبر بلکہ ہر مومن اس الہی گفتار سے مطمئن ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس عالم کی ہر چیز خدا کے حضور میں ہے اور دشمنوں کے محروم فریب میں سے کوئی چیز اس پر مخفی نہیں۔ وہ اپنے دوستوں کو سختی کے لمحات میں اکیلا نہیں چھوڑتا اور ہمیشہ ان کا حامی و محافظ رہتا ہے۔

ایک اہم نکتہ

خدا پرستوں کے لیے توحید کی بصیرت، زندگی میں ایک خاص راستہ پیدا کر دیتی ہے کہ جو انہیں شرک آلود راستوں سے جدا کر دیتی ہے کہ جو بتوں اور اپنے ہی جیسے کمزور انسانوں کی پناہ لینے کی بنیاد بننے لیا۔ ہم اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ آج کی دنیا میں جبکہ سارا عالم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے اور مشرق و مغرب کی دو سپر طاقتیں ان پر حکومت کر رہی ہیں تو عام طور پر بہت سے چھوٹے اور درمیانے ممالک یہ سوچتے ہیں کہ اپنی حفاظت کے لیے ان دو طاقتوں یعنی ان دو بتوں میں سے کسی ایک کی پناہ لینا چاہیے اور اس کی حمایت حاصل کرنی چاہیے۔ حالانکہ تجربات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سخت حالات، مشکلات اور بحرانوں میں، یہ بظاہر بڑی طاقتیں نہ تو اپنی کوئی مشکل حل کر سکتی ہیں اور نہ ہی اپنے شہروں اور بیروکاروں کی۔ قرآن نے کیا خوب کہا ہے:

وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهَا نَصْرًا وَلَا لَهَا أَنْفَ هُمْ يَنْصُرُونَ

”نہ تو اپنے عبادت کرنے والوں کی مدد و حمایت کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی

خود کو بچا کر رکھ سکتے ہیں“ (الاعراف - ۱۹۲)

یہ تمام سببوں اور توجیہ خالص کے حامیوں کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ ان تمام بتوں انگ ہو جائیں اور لطف الہی کے سامنے میں پناہ لیں۔ صرف اپنے آپ پر اور قوت ایمانی اور مسلمانوں کی روحانی قوت پر تکیہ کریں اور ان شرک آلود افکار کو ہرگز ذہن میں جگہ نہ دیں کہ مشکل کے دن ان طاقتوں سے مدد لینا چاہیے اور اصولی طور پر اسلامی معاشروں کو اس قسم کے افکار سے پاک کرنا چاہیے اور جان لینا چاہیے کہ انہوں نے اب تک اس طریقے سے کس قدر مصیبتیں اٹھانی ہیں۔ خواہ غاصب اسرائیل سے مقابلہ ہو یا دوسرے دشمنوں سے۔ حالانکہ قرآن کا اگر یہ بنیادی قانون ان کے درمیان حاکم ہوتا تو کبھی بھی ایسی المناک شکستوں کا سامنا نہ کرتے۔ اس دن کی امیدیں کہ جب ہم سب اس قرآنی تعلیم کے سامنے میں اپنے افکار کو نئے سرے سے درست کریں اپنے اوپر بھروسہ کریں اور اللہ کے لطف و کرم کے سامنے میں پناہ لیں اور سر بلند اور آزاد زندگی بسر کریں۔

۴۴ ﴿۴۴﴾ أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿۴۴﴾

۴۸ ﴿۴۸﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿۴۸﴾

۴۹ ﴿۴۹﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿۴۹﴾

ترجمہ

۴۴ ﴿۴۴﴾ کیا انسان نے دیکھا نہیں (وہ جانتا نہیں) کہ ہم نے اُسے ایک بے وقعت نطفے سے پیدا کیا ہے اور (جب اُسے قدرت و شعور اور نطق حاصل ہوا تو) وہ کھلم کھلا جھگڑنے لگا۔

۴۸ ﴿۴۸﴾ اور ہمارے لیے مثال دینے لگا اور اپنی خلقت کو بھول گیا اور کہنے لگا کہ جب یہ ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہوں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا۔

۴۹ ﴿۴۹﴾ کیسے! اُسے وہی زندہ کرے گا جس نے اُسے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق سے خوب آگاہ ہے۔

شان نزول

اکثر تفسیر میں نقل ہوا ہے کہ مشرکین میں سے ایک شخص جس کا نام ابی بن خلف یا امیہ بن خلف یا عامر بن دائل تھا بوسیدہ ہڈی کا ایک ٹکڑا تلاش کر کے لایا اور کہا کہ میں اس علم دہل کے ساتھ

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جھگڑا کروں گا اور معاد کے بارے میں اس کی بات کو باطل کر دوں گا۔ اور اسے لے کر پیغمبر اسلام کے پاس آیا اور شاید اس میں سے کچھ حصہ میں کر ریزہ ریزہ کیا اور زمین پر پھینک دیا اور کہا کہ ان بوسیدہ پڑیوں کو از سر نو کون زندہ کر سکتا ہے (اور کونسی عقل اسے مان سکتی ہے) اس کے جواب میں مذکورہ بالا آیات اور ان سے بعد کی چار آیتیں نازل ہوئیں جو مجموعی طور پر سات آیتیں بنتی ہیں۔ ان آیات میں اسے اور اس کے ہم فکر لوگوں کو ایک منطقی اور دندان شکن جواب دیا گیا ہے۔

تفسیر

خلقت اول معاد پر ایک دلیل قاطعہ

ہم نے بیان کیا تھا کہ سورہ یٰسین میں کہ جو قلب قرآن ہے مبداء، معاد اور نبوت سے مربوط گفتگو مختلف حصوں میں آتی ہے یہ سورہ قرآن مجید اور مسئلہ نبوت سے شروع ہوتی تھی اور سات ایسی منظم آیات پر ختم ہو رہی ہے کہ جو معاد کے بارے میں قوی ترین بیانات کی حامل ہیں۔

پہلے تو انسان کو خود اس کی زندگی کے آغاز کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جبکہ وہ ایک حیرت نطفے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ بات انسان کو سوچنے پر آمادہ کرتی ہے اور کہتی ہے: کیا انسان نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اُسے نطفے سے پیدا کیا ہے اور بڑھتے بڑھتے وہ ایسا جری، باشعور اور ذی نطق ہوا کہ خدا ہی کے ساتھ جھگڑنے کھڑا ہو گیا اور حکم کھلا جھگڑا کرنے والا ہو گیا اور لہذا میرا انسان اتنا خلقناہ من نطفۃ فاذا هو خصیم مبین) یہ

کیسی عمدہ اور منہ بولتی تعبیر ہے! پہلے انسان کا ذکر کرتا ہے، یعنی ہر انسان۔ چاہے جس اعتقاد اور مکتب سے تعلق رکھتا ہو، جتنی بھی عقل کا مالک ہو، اس حقیقت کو پاسکتا ہے۔

پھر قرآن، نطفہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ لغت میں، نطفہ، دراصل ناپختہ اور بے قدر و قیمت پانی کے معنی میں ہے۔ یہ ذکر اس لیے ہے کہ مغرور و خود پسند انسان تھوڑا بہت خورد و خوراک کے لیے جان لے کر پہلے روزہ کیا تھا؟ دوسری بات یہ ہے کہ پانی کا یہ ناپختہ قطرہ بھی مکمل طور پر اس کی نشوونما کا مبداء نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی چھوٹا سا زندہ خلیہ LIFE CELL کہ جو آنکھ سے دیکھا نہیں جاسکتا۔ وہ ہزاروں خلیے کی جو پانی کے قطرے میں تیر رہے تھے یہ ان میں سے ایک تھا۔ ایک بہت ہی چھوٹے سے زندہ خلیے کے ساتھ کہ جو عورت کے دم میں منتقل کر کے ایک مرکب بنا اور انسان نے اس خورد بینی موجود سے عالم ہستی میں قدم رکھا۔

۱۔ خصیم، اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو ضرورت اور جھگڑے کے درپے ہو اور، رویت، یہاں جانتے کے معنی میں ہے۔

پھر اس نے نکال و ارتقاء کے مراحل کے بعد دگرے طے کیے۔ جن میں سے قرآن کی سورہ نمونہ کے اوائل کے مطابق پھر مرحلے دم کے اندر تھے (نطفہ، پھر علقہ، اس کے بعد مضغ، اس کے بعد ہڈیوں کا ظاہر ہونا، پھر ہڈیوں پر گوشت کا چرٹھنا اور آخر میں روح یعنی حس و حرکت کا پیدا ہونا)۔

تولد کے موقع پر وہ ایک بہت ہی ضعیف و ناتواں بچہ تھا۔ اس کے نکال و ارتقاء کے مراحل تیزی کے ساتھ طے کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جسمانی اور عقلی بلوغ و رشد کی حد تک پہنچ گیا۔

ہاں! یہ ضعیف و ناتواں موجود اتنا قوی ہو گیا کہ "اللہ کی دعوت کے مقابلے میں لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو گیا اور اس نے اپنے ماضی و مستقبل کو بالکل ہی فراموش کر دیا اور "خصیم مبین" کا واضح مصداق بن گیا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "خصیم مبین" (واضح طور پر جھگڑنے والا) کی تعبیر ایک تو قوت کے جنبہ کی حامل ہے اور ایک ضعف و کمزوری کے جنبہ کی۔ یہاں پر ظاہراً قرآن کے پیش فطردونوں جہات ہیں۔ ایک طرف قویہ کام انسان کے سوا کسی اور سے نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ صاحب عقل و شعور ہے اور استقلال، ارادہ، اختیار اور قدرت رکھتا ہے (اور ہم جانتے ہیں کہ انسانی زندگی کا اہم ترین امتیاز یہ ہے کہ وہ صاحب نطق ہے) بات کرتا ہے اور ان باتوں کے مصادیق و مطالب اس کے دماغ میں پہلے پیدا ہوتے ہیں، پھر جملوں کے قالب میں ڈھلتے ہیں اور پھر یہ باتیں دہن سے یوں نکلتی ہیں جیسے کسی خود کار ہتھیار سے گولیاں کسی ہدف کی طرف مسلسل پھینکی جاتی ہیں اور یہ ایسا کام ہے کہ جو انسان کے علاوہ کسی بھی جاندار سے ممکن نہیں ہے۔

اس طرح سے قرآن خدا کی قدرت نمائی کو اس عظیم قوت میں مجسم کرتا ہے کہ جو اس نے پانی کے اس ناپختہ قطرے کو دی ہے۔

لیکن دوسری طرف انسان ایک فراموش کار اور مغرور ذات ہے۔ ان نعمتوں کو کہ جو اس کے ولی نعمت نے اُسے بخشی ہیں اسی کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے اور لڑنے جھگڑنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے اس بے خبری اور خیرہ سری کو کیا کہیے؟

اس کی بے خبری کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ "اس نے ہمارے لیے مثال دی اور اپنے خیال میں اس نے ایک دندان شکن دلیل پیدا کر لی۔ حالانکہ وہ اپنی ابتدائی خلقت کو بھول گیا اور اس نے کہہ دیا کہ ان ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے، جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں (و ضرب لنا مثلاً ونسی خلقہ قال من یحیی العظام وہی رمیم) یہ

۱۔ "رمیم" مادہ "رم" سے ہے۔ معزوات راغب کے مطابق اصل میں "رم" (بروزن) "رم" کو کہتا ہے۔

یہاں ضرب المثل سے مراد عام ضرب المثل اور تشبیہ و کما یہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد بیان استدلال ہے اور ایک مطلب کلی کے اثبات کے لیے مصداق کا ذکر کرنا مراد ہے۔

ہاں! (ابی بن خلف یا امیر بن خلف یا عاص بن دائل) نے بیابان سے بوسیدہ ہڈی کا ایک ٹکڑا تلاش کیا اور وہ ہڈی جس کے بارے میں یہ معلوم نہیں تھا کہ کس کی ہے، کیا وہ طبیعی موت سے مرا تھا؟ یا زمانہ جاہلیت کی کسی جنگ میں المناک موت کا شکار ہوا تھا؟ یا بھوک کی وجہ سے مرا تھا؟ بہر صورت وہ یہ سوچتا تھا کہ نفعی مصلحت کے لیے اسے ایک دندان شکن دلیل مل گئی ہے۔ غصے اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ، ہڈی کے ٹکڑے کو اٹھا کر کہتا ہے:

لاخصمن محمداً

”میں اس دلیل کے ساتھ محمد (ص) سے لڑوں گا، اس طرح سے کہ وہ کوئی جواب نہ دے سکے گا۔“

وہ تیزی سے پیغمبر اسلام کے پاس آیا اور جرح کر کے لگا:

مجھے بتاؤ کس میں یہ قدرت ہے کہ اس بوسیدہ ہڈی کو دوبارہ زندہ کر دے۔

اس کے بعد اس نے ہڈی کے کچھ حصے کو پیس کر زمین پر چھڑک دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پیغمبر اسلام اس دلیل کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ قرآن مجید نے ایک ہی مختصر سے جملہ ”وہی خلقہ“ سے اس کا جواب دے دیا۔ اگرچہ اس کے بعد مزید وضاحت اور اضافی دلائل بھی بیان کیے۔

قرآن کہتا ہے: اگر تو اپنی خلقت کو بھول نہ گیا ہوتا تو ہرگز ایسا بے ہودہ اور کمزور استدلال اختیار نہ کرتا۔ اسے فراموش کار انسان! تو اپنے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھ اور اپنی خلقت پر نگاہ کر۔ تو کس طرح سے ایک ناچیز لفظ تھا۔ اس خالق مطلق نے ہر روز ایک نیا لباس حیات تیرے بدن پر پہنایا۔ تو تو ہمیشہ سے موت و مصلحت کی حالت میں ہے۔ مردہ جمادات سے تیری بنیاد ہڈی پھر مردہ نہایت سے حیوان نے استفادہ کیا۔ اور مردہ حیوانات سے تیری نشوونما ہوتی اور تو انسان ہو گیا۔ لیکن تو ایسا فراموش کار ہے کہ ان تمام چیزوں کو بھول کر اب پوچھتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟

یہ ہڈیاں اگر مکمل طور پر بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو جائیں تو زیادہ سے زیادہ پھر مٹی ہو جائیں گی۔ تو کیا تو پہلے دن مٹی نہیں تھا؟

بیتہ جاریہ گزشتہ صفحہ ۱۔ کی اصلاح و ترمیم کے معنی میں ہے۔ ”رمۃ“ (بروزن ہمت) خصوصیت کے ساتھ بوسیدہ ہڈی کے معنی میں آتا ہے اور ”رمۃ“ (بروزن قبۃ) بوسیدہ اور پرانی کتاب کو کہا جاتا ہے۔

لہذا بلا فاصلہ پیغمبر اسلام کو حکم دیا گیا ہے کہ اس خیرہ سر، مغزور اور فراموش کار سے ”کیسے کہ اسے وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے دن اسے خلق کیا تھا“ قل یحییہما الذی انشاھا اول مرۃ۔

اگر آج اس کی ایک یادگار ہڈی باقی رہ گئی ہے تو ایک دن ایسا بھی تھا کہ یہ بوسیدہ ہڈی بھی نہیں تھی۔ بلکہ مٹی تک بھی موجود نہیں تھی۔ ہاں! وہی ذات کہ جس نے اُسے عدم سے وجود بخشا ہے اس کے لیے بوسیدہ ہڈی کو نئی زندگی عطا کرنا زیادہ آسان ہے۔

اگر تم یہ سوچتے ہو کہ یہ بوسیدہ ہڈیاں جب مٹی بن جاتی ہیں اور ادھر ادھر بکھر جاتی ہیں تو ان کے اجزاء کو کون پہچان سکتا ہے اور کون انہیں مختلف مقامات سے جمع کر سکتا ہے؟ تو اس کا جواب بھی واضح ہے ”وہ ہر مخلوق سے آگاہ ہے“ اور ان کی تمام خصوصیات کو جانتا ہے (وہو بکل خلق علیم)۔

جو ہستی اس قسم کا علم اور اس قسم کی قدرت رکھتی ہو اس کے لیے مسئلہ معاد اور مردوں کو زندہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اگر ہم مٹی کے ڈھیر میں کہ جس میں لوسے کے چھوٹے چھوٹے ذرات بکھرے ہوتے ہیں، مقتطیس کا ایک ٹکڑا گھمیں تو وہ ان تمام ذرات کو فوراً جمع کر لے گا۔ حالانکہ وہ ایک بے جان موجود سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ خداوند تعالیٰ ہر انسان کے تمام ذرات بدن کو خواہ وہ کرۂ زمین کے کسی بھی گوشہ میں ہوں ایک ہی حکم سے آسانی کے ساتھ جمع کر دے گا۔

وہ نہ صرف انسان کی بنیاد خلقت سے آگاہ ہے بلکہ ان کی نیتوں اور اعمال سے بھی آگاہ ہے اور ان کا حساب و کتاب اس کے سامنے واضح و روشن ہے۔

اس بنا پر اعمال و ثبات اور اندرونی اعتقادات کا حساب بھی اس کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گا۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیہ ۲۸۲ میں ہے:

وان تبدوا ما فی انفسکوا و تخفوه یحاسبکموبہ اللہ

”اگر تم اس چیز کو جسے دل میں رکھتے ہو چھپاؤ یا ظاہر کرو، خدا اس کا تم سے حساب لے لے گا“

فرعون مسئلہ معاد میں شک کرتا تھا اور گزشتہ لوگوں کے زندہ ہونے اور ان کے حساب و کتاب سے اظہار تعجب کرتا تھا۔ حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ اس سے یہ کہیں کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ایک کتاب میں ثبت ہے اور میرا پروردگار نہ تو اشتباہ کرتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے۔“

قال علمہا عند ربی فی کتاب لا یصل ربی ولا ینسی (طہ۔ ۵۲)

۸۰) الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ○

ترجمہ

۸۱) وہی ذات کہ جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی اور تم اس کے ذریعے آگ روشن کرتے ہو۔

تفسیر

توانائیوں کی بازگشت

گزشتہ آیات میں معاد کے سلسلے میں بحث تھی اور اس میں مسد معاد کے امکان اور ہر قسم کا شکیبہ رفع کرنے کے لیے معنی خیز اور زندہ اشارے موجود تھے۔ زیر بحث آیات قلب قرآن یعنی سورہ یسین کی آخری آیات ہیں۔ ان میں بھی اسی مسئلے کی مزید تشریح و توضیح پیش کی گئی ہے اور تین چار اچھے طریقوں سے اسے بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "وہ خدا کہ جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی اور تم اسکے ذریعے آگ روشن کرتے ہو" وہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے (الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا فاذا انتم منه توقدون)۔

کتنی عجیب اور عمدہ تعبیر ہے۔ ہم اس میں جتنا زیادہ غور و فکر کرتے ہیں اتنے ہی زیادہ عمیق اور گہرے معانی کھلتے چلے جاتے ہیں۔

اصولی طور پر قرآن مجید کی بہت سی آیات کئی کئی معنی دیتی ہیں۔ بعض تو ہر زمانے اور ہر جگہ کے لوگوں کے سمجھنے کے لیے سادہ اور عام ہیں اور بعض دوسری آیات ذرا عمیق ہیں جو خواص کے سمجھنے کے لائق ہیں اور بعض آیات بہت عمیق اور گہری ہیں جو خواص میں سے بھی منتخب افراد کو، یا دوسرے زمانوں اور مستقبل بعید میں سمجھ میں آنے والی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود یہ معانی آپس میں ایک دوسرے کے متناقض نہیں ہیں اور ایک ہی وقت میں ایک ہی پر معنی تعبیر میں جمع ہیں۔

زیر بحث آیت ہی مفہوم بیان کرتی ہے۔

پہلی تفسیر بہت سے گزشتہ مفسرین نے بیان کی ہے اس کا ایک سادہ اور واضح مفہوم ہے کہ جو عام لوگوں کے لیے بھی قابل فہم ہے۔ وہ یہ ہے کہ قدیم زمانوں میں عربوں کے اندر یہ بات رائج تھی کہ وہ آگ جلانے کے لیے درختوں کی لکڑی استعمال کرتے تھے خصوصاً "مرخ" اور "عفار" کے درختوں کی لکڑی کہ جو حجاز کے بیابانوں میں عام آگتی تھی۔

"مرخ" (بروزن "پرخ") اور "عفار" (بروزن "تبار") دو قسم کی "آگ لگانے والی" لکڑیاں ہیں کہ پہلی کو نیچے رکھ کر دوسری کو اس کے اوپر مارنے سے اور اس سے آگ لگانے والے پتھر (پتھان) کی طرح شعلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ موجودہ زمانے کی ماچس کے بجائے لوگ اسی سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ قرآن کتنا ہے: وہ خدا کہ جو ان سبز درختوں سے آگ نکال سکتا ہے، وہ مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

"پانی" اور "آگ" دو متضاد چیزیں ہیں۔ جو ہستی ان دونوں کو ایک ساتھ اکٹھا رکھنے پر قادر ہے، وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ "زندگی" کو "موت" کے ساتھ اور "موت" کو "زندگی" کے ساتھ جمع کر دے۔ کیا کتنا ہے اس عالم ہستی کے خالق کا کہ جس نے آگ کو پانی کے اندر اور پانی کو آگ کے اندر محفوظ کر رکھا ہے۔ مسئلہ طور پر اس کے لیے مژدہ انسانوں کے جسموں پر لباس زندگی پنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگر ہم اس معنی سے ذرا اور آگ کے قدم بڑھائیں تو اس سے زیادہ دقیق تفسیر تک پہنچ جائیں گے۔ وہ یہ ہے کہ آگ جلانے کی خاصیت درختوں کی لکڑیوں کے ذریعہ "مرخ" اور "عفار" کی لکڑیوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ خاصیت تمام درختوں میں اور تمام اجسام عالم میں موجود ہے (اگرچہ مذکورہ دونوں لکڑیاں اپنے مخصوص مواد اور وضع و کیفیت کے لحاظ سے اس کام کے لیے زیادہ کارآمد ہیں)۔

خلاصہ یہ کہ تمام درختوں کی لکڑیاں اگر زور کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو ان سے شعلہ نکلے گا، یہاں تک کہ "سبز درختوں کی لکڑیوں سے بھی"۔

اسی وجہ سے بعض اوقات جنگوں میں وسیع اور دشتتاک آگ لگ جاتی ہے کہ جس کا عامل کوئی انسان نہیں ہوتا۔ صرف وہ ہوائیں اور طوفان کہ جن کے چلنے سے درختوں کی شاخیں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتی ہیں اور ان کے ٹکرانے سے چنگاری نکل کر خشک پتوں پر جاگتی ہے، اس کے بعد ہوا کے چلنے سے آگ پھیل جاتی ہے اور یہ سب چیزیں اس کا اصلی عامل ہوتی ہیں۔

یہ وہی بجلی کا شعلہ ہے کہ جو ٹکرانے اور ایک دوسرے کے ساتھ ٹپنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہی آگ ہے کہ جو تمام موجودات عالم کے ذرات میں چھپی ہوئی ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے اور ٹپنے سے ظاہر ہوتی ہے اور "شجر اخضر" (سبز درخت) سے "نار" (آگ) پیدا کر دیتی ہے۔

یہ ایک زیادہ وسیع تفسیر ہے کہ جس میں زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماع اعداد نظر آتا ہے اور "فنا میں بقا" کی زیادہ واضح نشاندہی ہوتی ہے۔

لیکن اس سلسلے میں ایک تیسری تفسیر بھی ہے کہ جو اس سے بھی گہری، عین ترسے اور ہم نے دور حاضر کے علوم کی مدد سے اس تک دسترس حاصل کی ہے اور اسے ہم نے "توانائیوں کی بازگشت" قرار دیا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ نباتات کا ایک اہم کام ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ لینا اور "نباتاتی خلیے" بنانا ہے (یہ سبیل کہ جو درختوں کا بنیادی جزو ہیں ان کے بڑے اجزاء کاربن، آکسیجن اور ہائیڈروجن ہیں)۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خلیے (CELLS) کس طرح بنتے ہیں؟ درختوں اور نباتات کے اجسام ہوا سے "کاربن ڈائی آکسائیڈ" حاصل کر کے اس کا تجزیہ کرتے ہیں اس کی "آکسیجن" کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور کاربن کو اپنے وجود میں محفوظ کر لیتے ہیں اور اسے پانی کے ساتھ ترکیب دے کر اس سے درختوں کا جسم بنتے ہیں۔ لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ طبیعی علوم کی گواہی کے مطابق جو بھی کیمیائی ترکیب انجام پاتی ہے وہ یا تو توانائی کو جذب کر کے وجود میں آتی ہے یا اسے آزاد کرنے سے (غور کیجئے گا)۔

اس بنا پر جس وقت درخت کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرنے کے عمل میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ اس قانون کے مطابق ایک انرجی کے وجود کے محتاج ہیں اور یہاں وہ سورج کی کچھ گرمی اور روشنی سے ایک توانائی کے طور پر استفادہ کرتے ہیں۔

اس طرح سے درختوں کا جسم بنتے وقت سورج کی توانائی کی کچھ مقدار بھی ان کے اندر جمع ہو جاتی ہے اور جس وقت ہم لکڑیوں کو جلاتے ہیں تو وہی سورج کی ذخیرہ شدہ توانائی آزاد ہو جاتی ہے کیونکہ کاربن ہوا کی آکسیجن کے ساتھ مل کر دوبارہ کاربن ڈائی آکسائیڈ بنا دیتی ہے اور آکسیجن اور ہائیڈروجن (پانی کی کچھ مقدار) آزاد ہو جاتی ہے۔

ان اصطلاحی تعبیروں کو چھوڑتے ہوئے بہت ہی سادہ اور آسان عبارت میں یہ ایک مطبوع نور اور حرارت کے جو سردیوں میں کسی دیہاتی کی گلیا یا کسی شہری کی انگٹھی کو گرم اور روشن کرتی ہے سورج کا وہی نور و حرارت ہے کہ جو چند سالوں یا دسیوں سالوں میں ان درختوں کی لکڑی میں ذخیرہ ہوتی ہے اور جو کچھ درخت نے اس طویل عمر میں تدریجاً اور آہستہ آہستہ سورج سے لیا ہے اور بے کم و کاست اسے واپس دے رہا ہے۔

توانائی جذب کرنے کے عمل کو ENDOTHERMIC کہتے ہیں اور خارج کرنے کا عمل EXOTHERMIC کہلاتا ہے۔ (شون)۔

یہ جو کہتے ہیں کہ کورہ زمین کی تمام توانائیاں سورج کی توانائی کی طرف لوٹتی ہیں، اس کی ایک صورت یہی ہے۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ہم توانائیوں کی بازگشت تک پہنچ جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نور و حرارت کہ جو اس ضمن میں بکھر جاتی ہے اور درختوں کے پتوں اور ان کی لکڑیوں پر نوازش کرتی اور ان کی پرورش کرتی ہے وہ کبھی بھی ناپوش نہیں ہوتی بلکہ اس کا چہرہ بدل جاتا ہے اور ہم انسانوں کی آنکھوں سے دور درختوں کے تنوں، شاخوں اور پتوں کے اندر پنہاں ہو گئی ہے اور جس وقت آگ کا ایک شعلہ خشک لکڑی تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی قیامت شروع ہو جاتی ہے اور سورج کی وہ تمام توانائی جو درخت میں پنہاں تھی اسی لمحے اس کا حشر و نشر ظاہر ہو جاتا ہے، بغیر اس کے کہ ایک شمع کی روشنی کے برابر بھی اس میں کچھ کمی ہو (چرخور کیجئے گا)۔

اس میں شک نہیں کہ یہ معنی آیت کے نزول کے زمانہ میں عامۃ الناس پر واضح نہیں تھا، لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ قرآنی آیات کے معانی کے کئی مرحلے ہیں مختلف سطحوں میں اختلاف استعداد کے لحاظ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

ایک دن لوگ اس آیت سے ایک چیز سمجھتے تھے، آج ہم اس سے کہیں زیادہ چیزیں سمجھ رہے ہیں اور شاید آئندہ آنے والے اس سے بھی کچھ آگے بڑھ جائیں اور زیادہ سمجھ سکیں۔ اس کے باوجود یہ تمام معانی صحیح ہیں اور مکمل طور پر قابل قبول اور آیت کے معنی میں جمع ہیں۔

چند نکات

۱۔ سبز درخت ہی کیوں؟ بعض اوقات ذہن میں آتا ہے کہ قرآن نے یہاں "شجر اخضر" (سبز درخت) کی تعبیر کیوں بیان کی ہے حالانکہ سبز اور گیلی لکڑی سے آگ جلانا بہت ہی مشکل ہے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کے بجائے "الشجر الیابیس" (خشک درخت) کی تعبیر استعمال ہوتی کہ جو زیادہ بر عمل تھی۔

لیکن قابل توجہ بات یہی ہے کہ یہ سبز درخت ہی ہیں کہ جو کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرتے ہیں اور سورج کی روشنی ذخیرہ کرنے کا عمل انجام دیتے ہیں۔ خشک درخت اگر سینکڑوں سالوں تک سورج کی حرارت اور روشنی کے سامنے رکھے رہیں تو ان کی حرارت کی توانائی کے ذخیرے میں ذرہ بھر اضافہ نہ ہوگا۔ وہ اسی وقت تک اس کام پر قادر ہیں جب تک کہ وہ سبز اور زندہ ہیں۔

اس بنا پر صرف "شجر اخضر" (سبز درخت) ہی ہے کہ جو اپنی سبز و مرطوب لکڑی میں حرارت اور روشنی کو پُر اسرار طریقے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

لیکن جس وقت وہ خشک ہو جائے تو کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرنے اور سورج کی توانائی کو ذخیرہ

کرنے کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ اس اصول کی بناء پر یہ تعبیر توانائیوں کی بازگشت کی خوبصورت تصویر کشی بھی کرتی ہے اور قرآن مجید کے ایک جادوئی علمی معجزے کو بھی پیش کرتی ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہم مذکورہ بالا دیگر تفسیروں کی طرف بھی رجوع کریں تو "شجر اخضر" کی تعبیر پھر بھی مناسبہ زیادہ ہے کیونکہ سبز درختوں کی لکڑیاں جس وقت ایک دوسرے کے ساتھ زور سے ٹکراتی ہیں تو چنگاری پیدا ہوتی ہے ایسی چنگاری کہ جو آگ جلانے کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ہم قدرت خدا کی عظمت جان سکتے ہیں کہ جس نے آگ کو پانی کے اندر اور پانی کو آگ کے اندر محفوظ کر دیا ہے۔

۲- آتش زہ اور آتش گہر میں فرق: "توقدون" "وقود" کے مادہ سے (بروزن "توقدون" آگ روشن ہونے کے معنی میں ہے اور "ایقاد" آگ لگانے کے معنی میں ہے اور "وقود" (بروزن "شوقد") اس ایندھن کے معنی میں ہے کہ جو آگ جلانے کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔

تو اس بناء پر "فاذا انتھو منھ توقدون" (تم اس سے آگ روشن کرتے ہو) کا جملہ اس ایندھن کی طرف اشارہ ہے کہ جس سے آگ جلاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آگ پکڑنے والے (آتش گیر) کی طرف اشارہ ہے نہ کہ آگ لگانے والے "آتش زہ" کی طرف۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم فارسی میں ایندھن کو "آتش گیرہ" (آگ پکڑنے والا) اور ماچس یا لائٹ کو "آتش زہ" (آگ لگانے والا) کہتے ہیں اور عربی میں ایندھن کو "وقود" اور ماچس یا لائٹ کو "زند" یا "زنداد" کہتے ہیں۔

اس بناء پر قرآن کہتا ہے کہ وہ خدا کہ جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ فراہم کی ہے اور تم اس سے ایندھن تیار کرتے ہو آتش زہ "آگ لگانے والا" نہیں فرماتا، وہ اس پر بھی قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے اور یہ تعبیر کاٹا توانائیوں کی بازگشت پر منطبق ہے (غور کیجئے گا)۔

بہر حال درختوں کی لکڑیوں کے ساتھ آگ روشن کرنے کا مسئلہ اگرچہ ہماری نظر میں ایک سادہ مسئلہ ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عجیب ترین مسائل میں سے ہے کیونکہ وہ مواد کہ جس سے درخت بنتے ہیں اس کا ایک اہم حصہ پانی اور کچھ مقدار زہی کے اجزاء ہیں اور ان میں سے کوئی بھی جل اٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ تو یہ کونسی قدرت ہے کہ جس نے پانی، مٹی اور ہوا سے توانائی پیدا کرنے والا یہ مادہ پیدا کیا ہے کہ انسانوں کی زندگی ہزار ہا سال سے اس سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔

۱ "زند" (بروزن "بند") اصل میں اوپر والی لکڑی کے معنی میں ہے کہ جس سے آگ جلاتے ہیں اور پھلی لکڑی کو زندہ اور دونوں کو زندان کہتے ہیں اور "زند" کی جمع "زنداد" ہے۔

۲ مگر یہ کہ ہم "منہ توقدون" کے جملے میں "من" کو "با" کے معنی میں لیں تاکہ دوسری تفسیروں سے ہم آہنگ ہو جائے۔

۸۱) أُولَئِكَ الَّذِينَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَدْرِ عَلَى
أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ۝

۸۲) إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ
كُنْ فَيَكُونُ ۝

۸۳) فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ
تُرْجَعُونَ ۝

ترجمہ

۸۱) کیا وہ ذات کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کے مانند (خاک شدہ انسانوں) کو پیدا کر دے۔ ہاں وہ خلاقِ علیم ہے۔

۸۲) اس کا امر تو صرف یہ ہے کہ جس وقت وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے کہتا ہے "ہو جا" تو وہ بلا فاصلہ ہو جاتی ہے۔

۸۳) پس منزہ ہے وہ خدا کہ جس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز کی مالکیت و حاکمیت ہے اور (سب کے سب) اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

تفسیر

وہ ہر چیز کا مالک و حاکم ہے

گزشتہ آیات میں خلقتِ اول اور سبز درخت سے آگ پیدا کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مباد

کے دلائل کا ذکر ہے۔ اب پہلی زیر بحث آیت میں ایک اور حوالے سے اس مسئلے کو بیان کیا گیا ہے اور وہ خدا کی بے پایاں قدرت کا بیان ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: کیا وہ ہستی کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اس تمام عظمت، عجائبات اور حیرت انگیز نظاموں کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان خاک شدہ انسانوں کے مانند نئی تخلیق کرے (اور انہیں ایک نئی زندگی کی طرف لوٹا دے) ہاں! وہ ایسا کر سکتا ہے اور وہ آگاہ و دانایا خلاق ہے (اولیس الذی خلق السموات والارض بقادر علی ان یخلق مثلہم بلی و هو الخلاق العلیو)۔

یہ جملہ کہ جو استفہام انکاری سے شروع ہوا ہے، حقیقت میں بیدار عقل و وجدان کے سامنے ایک سوال پیش کرتا ہے کہ کیا تم اس عظیم آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ جو عجیب و غریب ثوابت و سیارات اور منظومات اور کائناتوں کا حامل ہے۔ جس کا ہر گوشہ ایک وسیع دنیا ہے۔ تو وہ ذات کہ جو ان عظیم اور منظم عوامل کی خلقت پر قادر ہے، کیسے ممکن ہے کہ مردوں کے زندہ کرنے پر قادر نہ ہو؟

اس سوال کا جواب چونکہ ہر بیدار انسان کے قلب و روح میں موجود ہے، لہذا وہ جواب کا انتظار نہیں کرتا بلکہ بلافاصلہ کہتا ہے: ہاں! وہ اس قسم کی قدرت رکھتا ہے۔ اس کے بعد خدا کی دو عظیم صفات کا ذکر ہے کہ جو اس مسئلے میں قابل توجہ ہیں، یعنی صفت خلاقیت اور اس کا بے پایاں علم۔ یہ حقیقت میں گزشتہ بات کی ایک دلیل ہے کہ اگر تمہارا شک و شبہ خلقت کے بارے میں اس کی قدرت کی وجہ سے ہے تو وہ خلاق ہے (تو جہ رہے کہ خلاق مہلنے کا صیغہ ہے)۔

نیز اگر ان ذرات کو جمع کرنا علم و دانش کا محتاج ہے تو وہ ہر لحاظ سے عالم و آگاہ ہے۔

”مثلاً، کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ ضمیر انسانوں کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمین کا خالق اس بات پر قادر ہے کہ وہ انسانوں کی مثل پیدا کر دے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ وہ خود از سر نو پیدا کرنے پر قادر ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ ”ان کی مثل“ پیدا کر سکتا ہے۔

اس سوال کے بہت سے جواب دیئے گئے ہیں لیکن جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ جب انسان کا بدن مٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کی اپنی شکل و صورت باقی نہیں رہتی اور قیامت کے دن جو کچھ لوٹے گا وہ اس کا پہلا مواد ہی ہوگا کہ جو وہی پہلے کی سی صورت اختیار کر لے گا۔ یعنی مادہ تو وہی ہوگا لیکن شکل و صورت گزشتہ صورت کی مثل ہوگی۔ کیونکہ عین اسی صورت کا خصوصاً قید زمانی کے ساتھ لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ ہم جانتے ہیں کہ قیامت میں تمام انسان اپنی تمام گزشتہ کیفیات کے ساتھ حضور نہیں

ہوں گے۔ مثلاً پڑھے جوان کی شکل میں اور مطول صحیح و سالم صورت میں ہوں گے۔

دوسرے لفظوں میں انسانوں کا بدن اُس اینٹ کے مانند ہے جو ریزہ ریزہ ہو کر پراگندہ ہو جائے اور اس کی مٹی کو جمع کر لیا جائے اور دوبارہ اس کا گارا بنا کر سانچے میں ڈالی لیا جائے اور اس سے نئی اینٹ بنائی جائے۔

یہ نئی اینٹ ایک حیثیت سے بعینہ وہی ہے اور ایک لحاظ سے اس کی مثل ہے (اس کا مادہ تو وہی ہے لیکن اس کی شکل و صورت پہلی صورت کی مثل و مانند ہے) (غور کیجئے گا) یہ بعد والی آیت اس حقیقت پر ایک تاکید ہے کہ اس کے ارادہ اور قدرت کے سامنے ہر قسم کی

ایجاد سہل و آسان ہے، اس کے لیے عظیم آسمانوں اور کرۂ خاکی کا ایجاد کرنا اور ایک چھوٹے سے کپڑے کی ایجاد برابر دیکھا ہے، فرماتا ہے: ”اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز (کے پیدا کرنے) کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ فوراً ہو جاتی ہے، جیسا کہ خدا نے چاہا ہے (انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون)۔“

تمام چیزیں اس کے ایک اشارے اور فرمان کے ساتھ وابستہ ہیں تو جو اس قسم کی قدرت کا مالک ہو کیا اس کے بارے میں اس بات کی کوئی گنجائش ہے کہ اس کے مردوں کو زندہ کرنے کے متعلق اس کی قدرت میں شک کیا جائے؟

یہ بات واضح ہے کہ یہاں امر الہی لفظی امر کے معنی میں نہیں ہے اسی طرح لفظ ”کن“ (ہو جا) بھی ایسا نہیں کہ جسے خدا لفظ کی صورت میں ادا کرے کیونکہ نہ کوئی لفظ بولتا ہے اور نہ ہی وہ الفاظ کا محتاج ہے بلکہ اس سے مراد اس کا کوئی چیز کے ایجاد و تخلیق کرنے کا ارادہ کرنا ہے نیز لفظ ”کن“ اس بنا پر ہے کہ اس سے زیادہ مختصر، زیادہ چھوٹی اور زیادہ سریع تغیر کا تصور نہیں ہو سکتا۔

بعض مفسرین نے ”مثلاً، کی ضمیر کو آسمانوں اور زمین کی طرف پلٹایا ہے اور کہا ہے کہ ذوی العقول کی ضمیر مرجع کا انتخاب اس بنا پر ہے کہ زمین و آسمان میں بہت سے ذوی العقول موجود ہیں۔ بعض دوسرے مفسرین نے ”مثلاً، کی ضمیر کو اس بات پر شاہد بنایا ہے کہ عین اسی جسم اور اسی مواد کا لوٹنا کہ جو دنیا میں تھا، ضروری نہیں ہے کیونکہ انسان کی شخصیت اس کی روح کے ساتھ ہے اور یہ روح جس مادہ کے ساتھ بھی تعلق اختیار کر لے گی وہ انسان کی مثل ہوگی، لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہ بات آیات قرآنی حتیٰ کہ زیر بحث آیات کے ساتھ بھی بالکل ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ مستد آن مراحت کے ساتھ انہیں آیات میں کہتا ہے کہ خدا انہی بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے گا اور انہیں لباس حیات پہنائے گا۔ (غور کیجئے گا)۔

ہیں! جوئی وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے وہ فوراً موجود ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں جس وقت خدا کسی چیز کا ارادہ کرے، تو وہ بلا فاصلہ وجود پاجاتی ہے اس طرح سے کہ اس کے "ارادہ" اور "اشیاء" کے وجود کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ اس بناء پر "امر" "قول اور "کن" کے الفاظ سب کے سب خلق و ایجاد کے مسئلے کی ایک توضیح ہیں اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے بیان امر نقل اور "کاف و نون" کا کوئی لفظ، بات یا قول بیان نہیں ہوتا۔ یہ سب کے سب ارادہ الہی کے بعد اشیاء کے تیزی اور سرعت کے ساتھ وجود پانے کو بیان کرتے ہیں۔ اُسے الفاظ و کلمات کی کیا حاجت ہے۔ اصولی طور پر کسی چیز کو ایجاد کرنے کے لیے اس کی مشیت کے بعد الفاظ کی وساطت بے معنی ہے۔

زیادہ واضح تعبیر میں، خدا کے افعال میں دو مرحلوں سے زیادہ کا وجود نہیں ہے۔ مرحلہ اولہ اور مرحلہ ثانیہ مذکورہ بالا آیت میں دوسرا مرحلہ امر و قول اور لفظ "کن" کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔ بعض قدیم مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں قول اور ایک بات ضرور ہے اور اُسے وہ ایک ناشاختہ لفظ میں سے سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ حقیقت میں الفاظ کے بیچ و خم میں الجھ گئے ہیں اور ان کے مفہوم و مطلب سے بے خبر رہے ہیں اور انہوں نے خدائی کاموں کو اپنے اوپر قیاس کر لیا ہے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے بیخ البلاغہ کے ایک خطبہ میں کیا خوب فرمایا ہے:

يقول لما اراد لما كونه كن فيكون لا بصوت يعرق ولا بسنداء يسمع وانما كلامه سبحانه فعل منه انشاء و مثله لم يكن من قبل ذاك كاشاء و لو كان قديما لكان ثانيا۔

"وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس سے کہتا ہے، ہوا تو وہ بلا تاخیر ہوجاتی ہے لیکن اس کا کلام نہ تو ایسی ندا ہے جو کانوں سے ٹکرائے اور نہ ہی ایسی ندا کہ جو سنی جائے بلکہ خدا کی بات وہی اس کا فعل ہے کہ جسے وہ ایجاد کرتا ہے اور اس سے پہلے کوئی بھی چیز موجود نہیں تھی اور اگر ہوتی تو وہ دوسرا خدا اشار ہوتی ہے۔

اس سے قطع نظر اگر کوئی لفظ درمیان میں ہو تو اس کی دوسروں میں ہوں گی؛ پہلی صورت یہ ہے کہ یہ لفظ خود مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے اور اس کو ایجاد کرنے کے لیے

بیخ البلاغہ کے بعض نسخوں میں مثلاً "منهاج البراءة" میں "لما اراد" کی تعبیر ہے۔ تفسیر نور الثقلین میں بھی بیخ البلاغہ سے اسی طرح نقل ہوا ہے لیکن دوسرے نسخوں میں مثلاً ابن ابی الحدید، ابن بیثم اور صبی صراح کے نسخوں میں "لما اراد" آیا ہے لیکن مناسب وہی پہلا نسخہ ہے۔

بیخ البلاغہ، خطبہ ۱۸۶۔

ایک دوسرے "کن" کی ضرورت ہوگی اور اس بات کی اس دوسرے "کن" کے بارے میں بھی تکرار ہوگی اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ہر خطاب کے لیے ایک مخاطب کی ضرورت ہوتی ہے اور جب ابھی تک کوئی چیز موجود ہی نہیں تو خدا "کن" کہہ کر اُسے کس طرح مخاطب کرے گا۔ کیا معدوم سے خطاب ہو سکتا ہے؟

قرآن کی دوسری آیات میں یہی معنی دوسرے الفاظ میں آیا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۷ میں ہے:

واذا قضی امرًا فانما يقول له كن فيكون

"جس وقت اس کی قضا اور حکم کسی چیز کے بارے میں ہوتا ہے تو وہ اُسے صرف یہ

کہتا ہے کہ ہوجا تو وہ بلا فاصلہ ہوجاتی ہے"

اسی کی مانند سورہ نحل کی آیت ۴۰ میں ہے:

انما قولنا لشيء اذا اردنہ ان نقول له كن فيكون

"جو چیز ہم ایجاد کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ہمارا قول یہی ہے کہ ہم اُسے کہتے ہیں ہوجا

تو وہ بلا فاصلہ ہوجاتی ہے۔"

زیر بحث آخری آیت کہ جو سورہ یسین کی آخری آیت ہے مبداء و معاد کے بارے میں ایک نئی نتیجہ نکالنے کے لیے اس بحث کو ایک خوبصورت طریقے سے ختم کرتی ہے ارشاد ہوتا ہے: "پس منزہ ہے وہ خدا کہ جس کے قبضہ قدرت میں تمام چیزیں ہیں اور تم سب کے سب اُس کی طرف پلٹ کر جاؤ گے" (فینبئ الذی بیدہ ملکوت کل شیء و الیہ ترجعون)۔

"ملکوت" "ملک" (بروزن "حکم") کے مادہ سے حکومت و مالکیت کے معنی میں ہے اور اس کے ساتھ "واو" اور "ت" کا اضافہ تاکید و مبالغہ کے لیے ہے۔ اس لیے آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ ہر چیز کی مالکیت و حاکمیت بلا شرط خدا کے دست قدرت میں ہے اور اس قسم کا خدا ہر طرح کے مجسذ و ناقوانی سے منزہ و مبرا ہے، تو اس صورت میں مُردوں کو زندہ کرنا اور بوسیدہ پڑیوں اور پراگندہ مٹی کو باکس حیات پھانا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے، جب یہ بات ہے تو یقیناً طور پر تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے اور معاد حق ہے۔

چند نکات

اس تفسیر میں ہم نے متعدد بار وعدہ کیا ہے کہ سورہ یسین کے انتقام پر ہم معاد کے مختلف پہلوؤں پر

لیکن فیكون "کے بارے میں جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۷ کے ذیل میں بھی بحث کی گئی ہے۔

کچھ تفصیلی گفتگو کریں گے۔ اس وقت ہم اس عہد کو پورا کرتے ہوئے قارئین محترم کی توجہ ذیل کی چھ بحثوں کی طرف دلانا چاہیں گے۔

۱۔ معاد کا اعتقاد ایک فطری امر ہے: اگر انسان فنا کے لیے پیدا کیا گیا ہوتا تو پھر اُسے "فنا" کا عاشق ہونا چاہیے اور موت سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ چاہے موت برعل اور عمر کے آخری صحت میں ہو۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ موت (یعنی نیستی) کا خیال انسان کے لیے کسی زمانے میں بھی خوش آمد نہیں رہا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ موت سے بھاگ رہا ہے۔

مومیا کر مردوں کے جسوں کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا اور اہرام مصر جیسے دائمی مقبرے بنانا اور آب حیات، اکیبر جوانی اور عمر بڑھانے والی چیزوں کے پیچھے بھاگنا۔ بقا کے ساتھ انسان کے عشق کی ایک واضح دلیل ہے۔

اگر ہم فنا کے لیے پیدا ہوتے ہیں، تو بقا سے اس لگاؤ کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟ اس صورت میں تو یہ ایک فضول اور بے مصرف لگاؤ ہوگا۔

یہ مت بھولیے کہ ہم حکیم و دانا خدا کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد معاد کی بحث کر رہے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اُس نے جو کچھ ہمارے وجود میں پیدا کیا ہے وہ کسی حساب کے ماتحت ہی ہوگا اور وہ اس عالم بقا کے ساتھ عشق بھی کسی حساب کے ماتحت ہی ہوگا اور وہ اس عالم کے بعد کی خلقت اور جہان آخر سے ہم آہنگی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اگر دستگاہ خلقت نے ہمارے اندر پیاس پیدا کی ہے، تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ خارج میں پانی کا وجود ہے۔ اسی طرح اگر جنسی خواہش اور جنس مخالف سے انسانوں میں لگاؤ موجود ہے تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ خارج میں جنس مخالف کا وجود ہے۔ ورنہ کسی چیز کی عدم موجودگی کی صورت میں اس کی خواہش کا ہونا محبت آفرینش سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

دوسری طرف جب ہم تاریخ بشر کا قدیم ترین ایام سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں موت کے بعد زندگی کے بارے میں انسان کے راسخ عقیدے کی بہت سی نشانیاں ملتی ہیں۔

وہ آثار کہ جو گذشتہ انسانوں۔ یہاں تک کہ تاریخ سے پہلے کے انسانوں۔ کے آج ہماری دسترس میں ہیں اُن سے اس اعتقاد کی شہادت ملتی ہے، خصوصاً مردوں کے دفن کرنے کا طریقہ، قبریں بنانے کی کیفیت، حتیٰ کہ مردوں کے ساتھ کچھ چیزیں دفن کرنا، اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کے ناکاہ و جدان میں موت کے بعد کی زندگی کا اعتقاد چھپا ہوا تھا۔

ایک مشہور ماہر نفسیات کہتا ہے:

دقیق تحقیقات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ پہلے نوب بشر کے قبائل ایک قسم کے

مذہب کے حامل تھے۔ کیونکہ وہ اپنے مردوں کو ایک خاص طریقے سے سپرد خاک کرتے تھے اور ان کے کام کاج کے آلات ان کے ساتھ رکھ دیا کرتے تھے اور اس طریقے سے دوسری دنیا کے لوگوں کو اپنے عقیدے کا ثبوت مہیا کرتے تھے۔

یہ تمام باتیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ قومیں حیات بعد از موت کو قبول کرتی تھیں۔ اگرچہ اس کی تفسیر میں غلط راستے پر ملتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ زندگی بعینہ اس زندگی کی طرح ہے۔ بہر حال اس قدیمی بنیادی اعتقاد کو ایک معمولی اور عام خیال یا صرف ایک رواج اور عادت کا نتیجہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

تیسری طرف ایک اندرونی عدالت کا وجود ہے "وعدان" کہتے ہیں، معاد کے فطری ہونے کا ایک اور گواہ ہے۔

ہر انسان نیک کام انجام دے کر اپنے وجدان کے اندر ایک سکون و اطمینان محسوس کرتا ہے ایسا سکون کہ جسے قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔

اس کے برعکس انسان گناہوں، خصوصاً بڑے بڑے جرائم کرنے کے بعد پریشانی اور بے چھونی محسوس کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ خودکشی پر تیار ہو جاتا ہے یا خود کو سزا اور سولی کے حوالے کر دیتا ہے اور اسے وجدان کے شکنجے سے رہائی کا سبب سمجھتا ہے۔

اس حالت میں انسان خود سے پوچھتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھ جیسا ایک چھوٹا سا وجود تو اس قسم کی عدالت کا حامل ہو لیکن یہ عظیم عالم اس قسم کے وجدان اور عدالت سے خالی ہو۔

اس طرح مختلف طریقوں سے مرنے کے بعد کی زندگی اور منسک معاد کا فطری ہونا ہم پر واضح ہو جاتا ہے۔

* انسانوں کے بقا سے عمومی عشق کے حوالے سے۔

* پوری انسانی تاریخ میں اس ایمان کے بڑے حوالے سے اور

* انسان کی روح کے اندر اس کے ایک چھوٹے سے نمونے کی موجودگی کے حوالے سے۔

۲۔ ایمان بالقیامت کا اثر انسانی زندگی پر: مرنے کے بعد کے عالم، انسان کے اعمال کے آثار کی بقا اور اس کے اچھے بُرے کاموں کی بعینہ کی کا اعتقاد انسانوں کی فکر و نظر اور احساسات پر بہت ہی گہرا اثر ڈالتا ہے اور نیکیوں کا شوق پیدا کرنے اور برائیوں سے مبارزہ کرنے کے لیے ایک عامل مؤثر ہو سکتا ہے۔

فاسد و منحرف افراد کی اصلاح اور فداکار و مجاہد اور ایثار کرنے والوں کو شوق دلانے میں حیات

بعد از موت پر ایمان جو اثرات ڈال سکتا ہے وہ عام عدالتوں اور سزاؤں کے اثرات سے کہیں زیادہ ہیں۔ چونکہ قیامت و معاد کی عدالت عام عدالتوں سے بہت ہی مختلف ہے، اس عدالت میں نہ تو تجدید نظر کا کوئی وجود ہے اور نہ ہی اس کے ارکان پر زر و مال اور زور و قوت اثر ڈال سکتے ہیں نہ وہاں جھوٹی باتوں سے کوئی فائدہ ہوگا اور نہ فیصلے کے لیے طویل مدت درکار ہوگی۔

قرآن مجید کہتا ہے:

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةً وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ
 "اس دن سے ڈرو کہ جس میں کسی شخص کو کسی دوسرے کی جگہ بدلہ نہیں دیا جائے گا، اور نہ ہی اس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ ہی کوئی نذیر یا تادان ہوگا اور نہ ہی کوئی شخص اس کی مدد کے لیے آئے گا۔" (بقرہ - ۲۸)

اس کے علاوہ قرآن حکیم میں ہے:

وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَ تِلْكَ الْاَرْضَ لَافْتَدَتْ بِهَا وَاسْتَرَا النَّدَامَةَ لَمَآرَأٍ وَالْعَذَابِ وَقَضَىٰ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يظْلَمُونَ
 "ان میں سے جو ظالم ہیں، اگر تمام روئے زمین بھی ان کے اختیار میں ہو اور اس دن اپنی نجات کے لیے وہ سب کچھ قربان کر ڈالیں (تو بھی ان کی نجات نہیں ہوگی) اور جس وقت وہ عذاب الہی کو دیکھیں گے تو اپنی پیشانی کو چھپائیں گے (کہ کہیں زیادہ رسوا نہ ہوں) اور ان کے درمیان عدالت کے ساتھ فیصلہ ہوگا اور ان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔" (یونس - ۵۴)

اس کے علاوہ قرآن مجید میں یہ بھی بیان ہوا ہے:

لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ

"مقصود یہ ہے کہ خدا ہر شخص کو جو کچھ اُس نے انجام دیا ہے اس کی جزا دے کیونکہ خدا سریع الحساب ہے۔" (ابراہیم - ۵۱)

اس کا حساب اتنا طبعی اور تیزی کے ساتھ ہوگا کہ بعض روایات کے مطابق:

إِنَّ اللَّهَ تَعَالَىٰ يَحْصِبُ الْخَلَائِقَ كُلَّمَا فِي مَقْدَارِ لَمَجِّ الْبَصَرِ

خدا ہر چشم زدن میں سب مخلوق کا حساب چکادے گا۔

اسی بنا پر قرآن مجید میں بہت سے گناہوں کا سرچشمہ روز جزا کو بھول جانا متبرار دیا گیا ہے۔ سورہ التوحیدہ کی آیہ ۱۴ میں ہے:

فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا

"جہنم کی آگ کا مزہ چکھو کیونکہ تم نے آج کے دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا۔"

کچھ تعمیرات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان قیامت کے بارے میں کچھ گمان ہی لگتا ہو تب بھی بہت سے غلط کاموں کو انجام دینے سے رُک جائے گا جیسا کہ کم فسر و دشوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

الْاٰیٰظِنِ اَوْلٰئِكَ اِنَّهُمْ مِیْعُوْثُوْنَ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ

"کیا وہ یہ گمان نہیں کرتے کہ ایک عظیم دن وہ قہروں سے اٹھائے جائیں گے۔" (ملفوظین - ۵۰)

گزشتہ زمانے میں بھی اور آج بھی مجاہدین اسلام میدان جہاد میں رجز خوانی کرتے ہوئے داد و شجاعت دیتے ہیں اور بہت سے لوگ اسلامی ممالک کے دفاع اور محرومین و مستضعفین کی حمایت کے لیے جو عظیم ایثار و فداکاری دکھاتے ہیں یہ سب دوسرے جادو دانی گھر پر اعتقاد کا نتیجہ ہے۔ علماء کے مطالعات اور مختلف تجربات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس قسم کے پسمناہراں عقیدے کے سوا ممکن نہیں۔ وہ مجاہد کہ جس کی منطق یہ ہو کہ:

قل هل تریبصون بنا الا احدی الحنینین

"کہہ دو کہ اے دشمنو! تم ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہو؟ سوائے دو سعادتوں میں سے کسی ایک تک پہنچنے کے (یا تم پر کامیابی یا افتخار شہادت)۔" (توبہ - ۵۲)

یہ مجاہد یقیناً شکست ناپذیر ہے۔

موت کا چہرہ اس جہان کے بہت سے لوگوں کے لیے وحشت انگیز ہے، یہاں تک کہ اس کے نام اور ہر اس چیز سے کہ جو اس کی دامی ہے، اگر بیز کرتے ہیں۔ لیکن موت کے بعد زندگی کا عقیدہ رکھنے والوں کے لیے نہ صرف یہ کہ وہ ناپسندیدہ نہیں ہے بلکہ ایک عظیم جہان کے لیے ایک دریچہ ہے، قفس کا ٹوٹ جانا ہے، انسانی روح کا آزاد ہونا ہے، زندان بدن کے دروازوں کا کھلنا ہے اور آزادی مطلق تک پہنچنا ہے۔ اصولی طور پر مبرار کے بعد مسند معاد خدا پرستوں اور مادہ پرستوں کے علم کی حد فاصل ہے کیونکہ اس مقام پر دو مختلف نظریے پاتے جاتے ہیں۔

ایک نظریہ تو وہ ہے کہ موت کو جس میں فنا اور نابودی مطلق سمجھا جاتا ہے اور اپنے پورے وجود کے ساتھ اس سے گریز کرتا ہے کیونکہ اس نظریے کے مطابق سب چیزیں اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ موت ایک خلقت جدید ہے اس سے انسان ایک کشادہ تر اور روشن عالم میں

قدم دکھتا ہے۔ اس پر کسب و معیشت آسمان کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔

یہ فطری بات ہے کہ اس مکتب کے طرفدار نہ صرف یہ کہ ہفت و مقصد کی راہ میں موت و شہادت سے خوف نہیں کھاتے بلکہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے مکتب سے ہدایت حاصل کر کے انہی کی طرح کہتے ہیں:

”واللہ لابن ابی طالب انس بالموت من الطفل بندی امہ“

”خدا کی قسم! ابو طالب کے بیٹے کی موت سے محبت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ جو ایک

بشر خوار بچے کو اپنی ماں کے پستان سے ہوتی ہے۔“

ایسے لوگ مقصد کی راہ میں موت کا استقبال کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے جب زمانے کے مجرم عبدالرحمن ابن لخم کی تلوار کی ضرب آپ کے سر مبارک پر لگی تو آپ نے فرمایا،

”فزت برب الکعبہ“

”کعبہ کے رب کی قسم! میں کامیاب ہو گیا اور مجھے راحت و سکون مل گیا“

مختصر بات یہ ہے کہ معاد و قیامت پر ایمان، ڈر پوک اور بے مقصد انسان کو شجاع، بہادر اور با مقصد انسان میں تبدیل کر دیتا ہے کہ جس کی زندگی رجز خوانیوں، قربانیوں، پاکیزگی اور تقویٰ سے معمور ہو جاتی ہے۔

۳۔ معاد کے عقلی دلائل: قرآن مجید میں معاد کے بارے میں بہت دلیلیں بیان ہوئی ہیں اور اس سلسلے میں سینکڑوں آیات موجود ہیں۔ ان سے قطع نظر اس امر پر واضح عقلی دلائل بھی موجود ہیں کہ جن میں سے بعض اختصار کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ برہان حکمت: اگر ہم اس جہان کی زندگی کو دوسرے جہان کے بغیر تصور کریں، تو یہ لغو اور بے معنی ہو کر رہ جاتے گی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہوگی جیسے ہم جنین کی زندگی کو اس دنیا کی زندگی کے بغیر فرض کریں۔

اگر قانون خلقت یہ ہوتا کہ تمام جنین پیدائش کے وقت گلا گھٹ کر مر جاتے تو جنین ڈور کس قدر بے مقصد ہو جاتا؟ اسی طرح اگر اس جہان کی زندگی کو دوسرے جہان کی زندگی سے الگ تصور کر لیا جائے تو اس کا وجود ہی ممکن ہو جائے گا کیونکہ کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم ستر سال یا اس سے کم و بیش اس دنیا میں مشکلات میں گھرے رہیں، ایک مدت تک خام اور بے تجربہ رہیں اور جب نا پختگی دور ہو تو عمر تمام ہو جائے۔ ایک مدت تک ہم علم کے حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں اور جس وقت معلومات کے لحاظ سے ہم کسی مقام

تک پہنچتے ہیں تو بڑھاپے کی ہفت ہمارے سروں پر بیٹھ چکی ہوتی ہے۔

آخر ہم یہ زندگی کس لیے بسر کر رہے ہیں؟ کچھ مقدار غذا کھانے، چند گز کپڑے پہننے، بار بار سونے اور بیدار ہونے اور اس تھکا دینے والے طرز عمل کو سالہا سال تک دہرانے اور جاری رکھنے کے لیے؟

کیا واقعات و وسیع آسمان، یہ پھیل ہوئی زمین اور یہ تمام آغاز و انجام، یہ تمام استاد و مرئی، یہ تمام عظیم کتب خانے اور یہ تمام بادیک بینیاں کہ جو ہماری اور تمام موجودات کی خلقت میں کام میں لائی گئی ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور مادی زندگی کے لیے ہیں؟

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر وہ لوگ کہ جو معاد کو قبول نہیں کرتے، اس زندگی کی لغویت اور بیہودگی کا اعتراف کرتے ہیں اور ان میں سے ایک گروہ خودکشی کرنے اور اس فضول اور بے معنی زندگی سے نجات کو جائز یا باعث افتخار سمجھتا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ شخص جو خدا اور اس کی بے پایاں حکمت پر ایمان رکھتا ہے، اس جہان کی زندگی کو دوسرے جہان کی دائمی زندگی کے لیے مقدمہ کچھ بغیر قابل توجہ شمار کرے۔

افصبتم انما خلقناکم عبثاً و انتکم الینا لا ترجعون

”کی تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم فضول اور بے کار پیدا ہوئے ہو اور تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں آؤ گے۔“ (مومنون - ۱۱۵)

یعنی اگر خدا کی طرف بازگشت نہ ہوتی تو پھر اس جہان کی زندگی عبث اور بیہودہ ہوتی۔ ہاں اس دنیا کی زندگی اسی صورت میں منہوم رکھتی ہے اور خدا کی حکمت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے جب اس جہان کو دوسرے جہان کے لیے ایک کھیتی (الدنیا مزرعة الاخرة) اور اُس وسیع عالم کے لیے ایک گزرگاہ (الدنیا قنطرة) اور تیاری کی ایک کلاس اور دوسرے جہان کے لیے ایک یونیورسٹی اور اُس گھر کے لیے ایک تجارت خانہ سمجھیں۔ جیسا کہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے اپنے پُر معنی کلمات میں فرمایا ہے:

ان الدنیا دار صدق لمن صدقها، و دار عاقبة لمن فهم عنها، و دار غنی لمن تزو منها، و دار موعظة لمن اتعظ بها، مسجد احباء الله و مصلی ملائكة الله، و مہبط وحی الله، و متجرا و لیاة الله۔

”یہ دنیا اس شخص کے لیے کہ جو سچائی کے ساتھ اس سے پیش آئے سچائی کی جگہ ہے اور اُس شخص کے لیے کہ جو اس سے کچھ فہم حاصل کرے عاقبت کا گھر ہے اور اس شخص کے لیے کہ جو اس سے زاو راہ حاصل کرے بے نیازی کا گھر ہے اور اس شخص کے لیے کہ جو اس سے

پند و نصیحت حاصل کرے و عطا و نصیحت کا گھر ہے یہ خدا کے دوستوں کی مسجد ہے، پروردگار کے فرشتوں کی جائے نماز ہے، وحی الہی کے نزول کا مقام ہے اور اولیاء حق کا تجارت خانہ ہے یہ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس جہان کی کیفیت کا مطالعہ خوب اچھی طرح سے اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس عالم کے بعد ایک اور عالم بھی ہے:

ولقد علمتم النشأة الاولى فلولا تذکرون

”تم اس دنیا میں نشأة اولیٰ اور خود اپنی پیدائش کو دیکھ چکے ہو تو پھر تم متوجہ کیوں نہیں ہوتے کہ اس کے بعد ایک اور جہان بھی ہے؟“ (واقفہ - ۶۲)

(ب) برہان عدالت: نظام ہستی اور قوانین خلقت میں خود سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اس کی تمام چیزیں حساب شدہ اور چھٹی ٹکی ہیں۔

ہمارے بدن کی ساخت میں اس قسم کا عادلانہ نظام حکم فرما ہے کہ جب بھی کوئی معمولی سی تبدیلی یا غیر موزوں نیت اس میں ظاہر ہوتی ہے تو وہ بیماری یا موت کا سبب بن جاتی ہے۔ ہمارے دل کی حرکت ہمارے خون کی گردش، ہماری آنکھ کے پردے، ہمارے بدن کے نیل اسی دقیق نظام میں شامل ہیں کہ جو سارے جہان پر حکومت کر رہا ہے:

وبالعدل قامت السموات والارض

”تمام آسمان اور زمین عدالت ہی کی وجہ سے قائم ہیں یہ۔“

تو کیا انسان اس وسیع عالم میں ایک نامطلوب چیز ہو سکتا ہے؟

یہ ٹھیک ہے کہ خدا نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی ہے تاکہ وہ اسے آزمانے اور وہ اس کے سامنے میں ارتقائی منزلوں کو طے کرے لیکن اگر انسان آزادی سے غلط فائدہ اٹھائے تو پھر کیا ہوگا؟ اگر ظالم اور سنگڑ لوگ، گمراہ اور گمراہ کرنے والے اس خدائی انعام سے سونے استفادہ کرتے ہوتے گمراہی کا راستہ اختیار کیے رہیں تو پھر عدل الہی کا تقاضا کیا ہوگا؟

یہ ٹھیک ہے کہ بدکاروں کے ایک گروہ کو اس دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے اور وہ اپنے کبیر کردار کو پہنچ جاتے ہیں یا کم از کم اُس کا ایک حصہ بھگت لیتے ہیں لیکن مسلمہ طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ تمام کے تمام مجرم اپنی ساری کی ساری سزا بھگت لیتے ہوں اور سب کے سب پاک اور نیک لوگ اپنے اعمال کا

۱۔ بیچ ابلاغہ، کلمات قصار، جلد ۱، ص ۱۳۱۔

۲۔ تفسیر صافی، سورہ رحمن کی آیہ، کے ذیل میں۔

بدلہ پر سے کا پورا اسی جہان میں پالیتے ہوں۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ یہ دونوں گروہ پروردگار کی عدالت کے پڑوسے میں برابر ہو جائیں؟ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق:

انفجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون

”کیا ان لوگوں کو کہ جو قانون خدا کے پیش نظر حق و عدالت کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوتے ہیں (مجرمین کی طرح قرار دے دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے یہ کس طرح کا فیصلہ کرتے ہو؟“ (قلم - ۳۵، ۳۶)

دوسری جگہ قرآن فرماتا ہے:

ام نجعل المتقین کالفجّار

”کیا یہ ممکن ہے کہ ہم پرہیزگاروں کو فاجروں کے مانند قرار دے دیں؟“ (ص - ۶۸)

بہر حال فرماؤں حق کی اطاعت میں انسانوں کے درمیان تفاوت ہونا کوئی شک کی بات نہیں ہے کیونکہ اس جہان کی مکافات اور عدالت و عدانہ اور گناہوں کے نتائج کا کافی نہ ہونا، عدالت کے قیام کے لیے تنہا کافی نظر نہیں آتا۔ اس بنا پر یہ بات قبول کرنی پڑے گی کہ اجر الہی کے اجراء کے لیے کوئی عدل عام کی عدالت ہو کہ جہاں پر سونے کی نوک کے برابر نیک اور بد کاموں کا حساب ہو۔ درحقیقت عدالت قائم نہ ہوگی۔

لہذا یہ بات قبول کر لینی چاہیے کہ عدل الہی کو قبول کرنا وجود معاود قیامت کے قبول کرنے کے مترادف ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

ونضع الموازين القسط لیوم القیامة

”ہم قیامت کے دن عدل کے ترازو قائم کریں گے“ (انبیاء - ۴۷)

اس کے علاوہ یہ بھی فرماتا ہے:

وقضی بینہم بالقسط وهو لا یظلمون

”قیامت کے دن ان کے درمیان عدالت کے مطابق فیصلہ ہوگا اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔“ (یونس - ۵۴)

(ج) برہان ہدف: ماوراء پرستوں کے نظریے کے برخلاف الہی نظریہ کائنات کے مطابق انسان کی خلقت میں ایک ہدف اور مقصد کارفرما ہے کہ جسے فلسفی تعبیر میں ”کمال و ارتقاء“ کہتے ہیں قرآن حدیث کی زبان میں کبھی ”قرب خداوندی“ اور کبھی ”عبادت و بندگی“ کہتے ہیں:

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون

”میں نے جن و انس کو پیدا نہیں کیا ہے مگر اس مقصد کے لیے کہ وہ میری عبادت

کریں اور عبادت و بندگی کے سائے میں کمال ہوں اور میرے حرم قرب کی طرف راہ پائیں۔ (ذاریات - ۵۶)

اگر موت ہر چیز کا اختتام ہو تو کیا یہ عظیم مقصد پورا ہوگا؟ بلاشبک و شبہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ ضروری ہے کہ اس جہان کے بعد ایک اور جہان ہو اور انسان کا سفر کمال اس میں جاری رہے اور وہ اس جہان کی گھستی کی فصل دہاں کاٹے اور یہاں تک کہ۔۔۔ جیسے ہم کہہ چکے ہیں دوسرے جہان میں بھی یہ سفر کمال جاری رہتی چاہیے تاکہ اصلی اور آخری ہدف پورا ہو جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مقصد خلقت کی تکمیل معاد کو قبول کیے بغیر ممکن نہیں ہے اور اگر ہم اس زندگی کو موت کے بعد دلے جہان سے منقطع کر لیں تو ہر چیز ممد کی شکل اختیار کر لے اور کئی طرح کے۔ کیوں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ رہے۔

(د)۔ برہان لفظی اختلاف: بے شک ہمیں ان اختلافات سے۔ کہ جو اس جہان کے مختلف مکاتب و مذاہب کے درمیان موجود ہیں دکھ ہوتا ہے، اور ہم سب یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ایک دن یہ تمام اختلافات ختم ہو جائیں جبکہ تمام قرآن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ اختلافات اس دنیا کے مزاج میں پوری طرح اتر چکے ہیں۔ یہاں تک کچھ دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ممدی علیہ السلام کو جو ایک عالمی حکومت قائم کرنے والے ہیں۔ ان کے قیام کے بعد بھی اگرچہ بہت سے اختلافات ختم ہو جائیں گے، لیکن ہم بھی کچھ مکاتب کا اختلاف کلی طور پر ختم نہیں ہوگا اور قرآن کے ارشاد کے مطابق یہود و نصاریٰ دائر قیامت تک اپنے اختلاف پر باقی رہیں گے،

فاغرینا بینہم العداۃ والبغضاء الی یوم القیامۃ (مائدہ - ۱۳)

لیکن وہ خدا کو جو ہر چیز کو وحدت کی طرف لے جاتا ہے آخر میں اختلافات کو ختم کرائے گا اور چونکہ عالم مادہ کے گھر سے پردوں کی موجودگی میں یہ بات اس دنیا میں کلی طور پر امکان پذیر نہیں ہے لہذا ہم جانتے ہیں کہ دوسرے جہان میں۔ کہ جو عالم بروز و ظهور ہے۔ آخر کار یہ مسئلہ عملی شکل اختیار کر لے گا اور حقائق اس طرح سے روشن ہو جائیں گے کہ مکتب و عقیدہ کا اختلاف بالکل ختم ہو جائے گا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس مسئلے کا ذکر ہوا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے:

فانلہ یحکم بینہم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ یختلفون

"خدا ان چیزوں کے بارے میں قیامت کے دن۔ کہ جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا" (بقرہ - ۱۱۳)

دوسری جگہ فرماتا ہے:

واقسموا باللہ جہد ایمانہم لا یبعث اللہ من یموت بلی وعدا علیہ حقاً ولکن اکثر الناس لا یعلمون ۵ لیبین لہم الذی یختلفون فیہ ولیعلم الذین کفروا انہم کانوا کاذبین

"انہوں نے زور دار قسم کھا کر کہا کہ خدا ان لوگوں کو کہ جو مر جائیں گے کبھی زندہ نہیں کرے گا لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ خدا کا حتمی وعدہ ہے (کہ ان سب کو زندہ کرے گا) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس چیز میں وہ اختلاف رکھتے تھے اُسے اُن کے لیے واضح کر دے تاکہ جو لوگ منکر ہو گئے تھے وہ یہ جان لیں کہ وہ جھوٹ بولتے تھے" (نحل - ۳۸ و ۳۹)

۳۔ قرآن اور مسئلہ معاد: مسئلہ توحید کہ جو انبیاء کی تعلیمات میں سب سے زیادہ بنیادی مسئلہ ہے اس کے بعد معاد کا مسئلہ اپنی خصوصیات اور اپنے تربیتی و تعلیمی آثار کے ساتھ پہلے درج میں قرار پاتا ہے۔ لہذا قرآنی مباحث میں توحید و خدا شناسی کے بعد بہت سی آیات کو اس نے اپنے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔

معاد کے قرآنی مباحث کبھی تو منطقی استدلال کی صورت میں بیان ہوئے ہیں اور کبھی خطابی مباحث اور مؤثر اور زور دار تعلیم کی صورت میں بعض اوقات تو انہیں سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کلام کا صادقانہ لب دلیر ایسا ہے کہ وہ استدلال کی طرح انسان کی روح اور جان کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔

منطقی استدلال میں قرآن زیادہ تر امکان معاد کے موضوع پر بات کرتا ہے۔ کیونکہ منکرین زیادہ تر اُسے محال خیال کرتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ معاد وہ بھی معاد جہانی کی صورت میں۔ کہ جس میں بوسیدہ اور خاک شدہ اجسام کا نئی حیات کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔ امکان پذیر نہیں۔ اس حصے میں قرآن مختلف طریقوں سے بات کرتا ہے اور یہ سب استدلال جس ایک جگہ جا کر ختم ہو جاتے ہیں وہ معاد کے امکان عقلی کا مسئلہ ہے۔

بھی تو وہ پہلی زندگی کو انسان کی نظر میں مجسم کرتا ہے اور ایک مختصر، منبہ لوتی اور واضح عبارت میں کہتا ہے:

کما بیدأ کو تعودون

"جس طرح سے کہ اُس نے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا ہے اسی طرح سے تم واپس لوٹو گے" (اعراف - ۲۹)

کبھی نباتات کی زندگی اور موت اور...

اپنی آنحو سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کے آخر میں کہتا ہے۔ کہ تمہاری بازگشت بھی اسی طرح ہوگی :

وَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكًا فَابْتِغَا فِيهِ حَيَاتٍ وَحَبَّ الْعَمِيدِ...
وَاحْيَيْنَا بِهِ بَلَدَةً مِيثَاقًا كَذَلِكَ الْخُرُوجُ
ہم نے آسمان سے مبارک پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے سرسبز باغات اگائے اور
کٹے ہوئے دانے... اور اس کے ذریعے ہم نے مژدہ زمین کو زندہ کیا (تمہاری) بازگشت بھی
اسی طرح ہوگی۔ (رق - ۱۱ تا ۱۲)

وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَّاحَ فَتُثِيرُ مَحَابِلَ أَرْضِهَا أَلَى بَلَدٍ مِيثَاقًا حَيِّينَا
بِهِ الْأَرْضِ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذَلِكَ الْفُشُورُ
نقذہا ہی ہے کہ جس نے ہواؤں کو بھیجا تاکہ وہ بادلوں کو چلائیں اور ہم نے انہیں مژدہ
زمین کی طرف دھکیل دیا اور اس کے ذریعے ہم نے زمین کو اس کی موت کے بعد حیات بخشی
قبروں سے اٹھنا بھی اسی طرح ہے۔ (فاطر - ۹)

بھی آسمانوں اور زمین کی خلقت میں خدا کی قدرت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَمْ يَكُنْ لِيَوْمٍ يَخْلُقْ
بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَحْيِيَ الْمَوْتَىٰ بَلَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ
نہ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اس تخلیق
نے اسے تمہکا نہیں دیا، وہ مژدوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ ہاں! وہ ہر
چیز پر قادر ہے۔ (احقاف - ۳۳)

اور بھی تو انہیوں کی بازگشت اور سبز درخت سے اگل نکلنے کو اس کی قدرت کے نونے کے طور پر اور
اگل کو پانی کے اندر قرار دینے کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :

الَّذِي جَعَلَ لِكُلِّ شَيْءٍ مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا
وَهُوَ خَدَّاءٌ مَّرْدُودٌ كَوَّلَا حَيَاتٍ پَنَاتَا هُوَ كَمَا هُوَ يَلِي
اگل پیدا کی۔ (یسین - ۸۰)

بھی جنین کی زندگی کو انسان کی نظر میں مجسم کرتا ہے اور کہتا ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ان كُنْتُمْ رَيْبٌ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّن تَرَابٍ
شَعْرٌ مِّن نُّطْفَةٍ شَعْرٌ مِّن عِلْقَةٍ شَعْرٌ مِّن مَّضْغَةٍ مَّخْلُوقَةٍ وَغَيْرِ مَخْلُوقَةٍ
لنہیں لکھو و نقر فی الارحام ما نشاء الی اجل مسعی شو نخرجکم

طفلاً۔

اسے لوگو اگر تم قیامت کے بارے میں شک رکھتے ہو تو یہ بات مت بھولو کہ ہم نے
تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر لطف سے پھر جے ہوتے خون سے پھر مضغ سے (کہ گوشت
کا ایک ٹکڑا ہے جو چھانے ہوئے گوشت کی طرح کا ہے)۔ اس حالت میں پیخ کر بعض تو
شکل و صورت کے حامل ہوتے ہیں اور بعض بے شکل و صورت۔ مقصد یہ ہے کہ ہم تم پر
یہ واضح کر دیں (کہ ہم ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں) اور جن جن جنینوں کو ہم چاہتے ہیں ایک
میں مدت تک ماؤں کے رحم میں روک رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بچے کی شکل میں تمہیں
عالم دنیا میں بھیجتے ہیں۔ (رج - ۵)۔

وہ نیند کہ جو موت کی بہن ہے بلکہ کئی جہات سے خود موت ہے۔ اس کے لیے اصحاب کہف
کی تین سو سالہ نیند کی مثال پیش کرتا ہے اور ان کی نیند اور بیداری کے سلسلے میں ایک عمدہ اور مناسب
تشریح کرنے کے بعد فرماتا ہے :

وَكذَلِكَ اعْتَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ
لَارِيبٌ فِيهَا

اس طرح سے ہم نے لوگوں کو ان کی حالت کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ جان لیں کہ
خدا کا قیامت کا وعدہ حق ہے اور قیام قیامت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ (کہف - ۲۱)

یہ چھ استدلال ہیں کہ جو قرآن کی آیات میں امکان معاد کے سلسلے میں بیان ہوتے ہیں۔
اس کے علاوہ ابراہیم کے چار پرندوں کی داستان (بقرہ - ۲۶۰)، یزید کی سرگزشت (بقرہ - ۲۵۹)،
بنی اسرائیل کے مقتول کا واقعہ (بقرہ - ۷۲) بھی بیان کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک ایک تاریخی نمونہ ہے
یہ سب اس مسئلے کے لیے دوسرے شواہد و دلائل ہیں کہ جو قرآن نے اس سلسلے میں بیان کیے ہیں۔
مختصر بات یہ ہے کہ وہ تصویر جو قرآن مجید نے معاد، اس کے مختلف پہلوؤں، مقدمات اور نتائج کی
پہنچی ہے اور وہ بولتے ہوئے دلائل کہ جو اس نے اس سلسلے میں بیان کیے ہیں، اس قدر زندہ اور
اطمینان بخش ہیں کہ جو شخص تھوڑا سا بھی بیدار و میدان رکھتا ہے وہ ان کی گہری تاثیر سے ضرور متاثر ہوگا۔

بعض کے قول کے مطابق قرآن کی ایک ہزار دو سو آیات معاد کے سلسلے میں بحث کرتی ہیں کہ اگر
انہیں جمع کیا جائے اور ان کی تفسیر کی جائے تو وہ خود ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی۔ ہم امید رکھتے ہیں
کہ اس تفسیر کی تالیف کے انتقام کے بعد، جس وقت ہم انشاء اللہ تفسیر موضوعی شروع کریں گے تو معاد کے
سلسلے کی آیات کا یہ مجموعہ بھی خواہش مندوں کی دسترس میں ہوگا۔

۵۔ معاد جسمانی : معاد جسمانی سے مراد یہ نہیں ہے کہ صرف جسم دوسرے جہان میں لوٹ آئے گا

بلکہ مقصد یہ ہے کہ روح اور جسم اکٹھے مبعوث ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں روح کی بازگشت تو مسلم ہے۔
بحث جسم کی بازگشت کے بارے میں ہے۔

گزشتہ فلاسفہ کی ایک جماعت صرف معاد روحانی کی معتقد تھی وہ جسم کو ایک سواری سمجھتے تھے کہ جو
صرف اسی جہان میں انسان کے ساتھ ہے اور موت کے بعد وہ اس سے بے نیاز ہو جائے گا اور اسے
چھوڑ کر عالم ارواح میں چلا جائے گا۔

لیکن اسلام کے بزرگ علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ معاد روحانی اور جسمانی دونوں صورتوں میں ہوگی یہاں
پر بعض علماء خصوصیت کے ساتھ سابق جسم کو ضروری نہیں سمجھتے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کسی بھی جسم کو روح
کے اختیار میں دے دے گا اور چونکہ انسان کی شخصیت اس کی روح کے ساتھ ہے تو یہ جسم اسی کا جسم
شمار ہوگا۔ جبکہ صاحبان تحقیق کا عقیدہ یہ ہے کہ وہی جسم کہ جو خاک ہو کر بکھر گیا تھا، خدا کے حکم سے اسی کو
جمع کیا جائے گا اور اسی کو نئی زندگی عطا ہوگی اور یہ وہ عقیدہ ہے کہ جو قرآن مجید کی آیات سے لیا گیا ہے۔
قرآن مجید میں معاد جسمانی کے شواہد اس قدر زیادہ ہیں کہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ
جو معاد کو صرف روحانی سمجھتے ہیں انہوں نے معاد والی فراوان آیات کا تھوڑا سا بھی مطالعہ نہیں کیا ہے
ورنہ معاد کا جسمانی ہونا آیات قرآنی میں اس قدر واضح ہے کہ کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔
یہی آیات کہ جو سورہ یٰسین کے آخر میں بیان ہوئی ہیں اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔
کیونکہ عرب کے بیابانی لوگوں کو تعجب اسی بات کا تھا کہ یہ بوسیدہ ہڈی جو ان کے ہاتھ میں ہے اُسے
کون زندہ کر سکتا ہے؟

قرآن صراحت کے ساتھ اس کے جواب میں کہتا ہے :

قل يحييها الذي انشاها اول مرة

”کیسے کہ وہی خدا اس بوسیدہ ہڈی کو زندہ کرے گا کہ جس نے پہلی دفعہ اسے پیدا کیا تھا“
معاد کے مسئلے میں مشرکین کا سارا تعجب اور ان کی مخالفت اسی امر پر تھی کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے
اور ہماری خاک زمین میں مل جائے گی تو پھر دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے؟

وقالوا اذا ضللنا في الارض انا لفي خلق جديد (التوہیدہ - ۱۰)
وہ کہتے تھے کہ یہ شخص تم سے کیسے وعدہ کرتا ہے کہ جس وقت تم مر جاؤ گے اور خاک ہو
جاؤ گے تو دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے۔

ایعدکم انکم اذا متتم وکنتم متراپنا وعظما انکم مخرجون (مومن - ۳۵)
وہ اس امر پر اس قدر تعجب کرتے تھے کہ اس کے اظہار کو جزوں یا خدا پر جھوٹ
خیال کرتے تھے :

وقال الذين كفروا هل ندلكم على رجل يبئكم اذا منزقتم
كل ممزق انکم لفي خلق جدید

”کافروں نے کہا کہ ہم تمہیں ایسا شخص دکھاتے ہیں کہ جو تمہیں یہ خبر دیتا ہے کہ جس وقت
تم پوری طرح خاک ہو کر بکھر جاؤ گے تو دوبارہ زندگی پاؤ گے۔“ (سبا - ۷)

یہی وجہ ہے کہ عام طور پر امکان معاد کے بارے میں قرآنی استدلال معاد جسمانی کے گرد ہی گھومتے
ہیں اور وہ چھ بیانات کہ جو گزشتہ صفحے میں گزرے ہیں سب کے سب اسی مدعا کے گواہ ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن بار بار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ تم قیامت میں قبروں سے نکلو گے
(یسین - ۵۱، قر - ۷) تو قبریں معاد جسمانی کے ساتھ مربوط ہیں۔

ابراہیم کے چاروں پرندوں کی داستان، اسی طرح عزیز کا واقعہ اور موت کے بعد ان کا زندہ ہونا
اور بنی اسرائیل کے مقتول کا قصہ کہ جس کی طرف ہم نے گزشتہ مباحث میں اشارہ کیا ہے، سب کے سب
صراحت کے ساتھ معاد جسمانی کی ہی بات کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے جنت کی مادی و روحانی نعمتوں کی جتنی بھی تعریف کی ہے سب کی سب اس بات کی
نشاندہی کرتی ہے کہ معاد جسمانی طور پر بھی ہوگا اور روحانی طور پر بھی۔ ورنہ روحانی نعمتوں کے ساتھ ساتھ
حور و قصور اور انواع و اقسام کی بہشتی غذاؤں اور مادی لذائذ کے کیا معنی ہیں؟

بہر حال یہ بات ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص قرآنی منطق اور تعلیمات سے تھوڑی سی بھی آگاہی رکھتا ہو اور
پھر معاد جسمانی کا انکار کرے۔ دوسرے لفظوں میں معاد جسمانی کا انکار قرآن کی نظر میں اصل معاد کے
انکار کے مساوی ہے۔

ان دلائل منقولی کے علاوہ اس بارے میں عقلی شواہد بھی موجود ہیں۔ اگر ہم انہیں بیان کرنا شروع
کریں تو گفتگو لمبی ہو جائے گی۔

البتہ معاد جسمانی کا اعتقاد چند ایک سوالات و اعتراضات کو اجماعاً ہے مثلاً آکل و ماکول کا شبہ
کہ جن کا تحقیق اسلام نے جواب دیا ہے اور ہم اس سلسلے میں ایک مختصر اور جامع تشریح سورہ بقرہ کی آیت ۲۶
کے ذیل میں دوسری جلد میں بیان کر آئے ہیں۔

۶۔ بہشت و دوزخ : بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد کا عالم مکمل طور پر
اسی جہان کے مشابہ ہے البتہ زیادہ کامل اور زیادہ عمدہ شکل میں۔
لیکن ہمارے پاس بہت سے ایسے قرآن موجود ہیں کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس
جہان اور اُس جہان کے درمیان کیفیت و کیفیت کے لحاظ سے بہت زیادہ فاصلہ ہے۔

یہاں تک کہ اگر ہم اس فاصلے کو چھوٹے سے جنین کے عالم کی اس وسیع دنیا کے درمیانی فاصلے سے تشبیہ دیں تو پھر بھی کامل موازنہ نہیں ہوگا۔

بعض روایات کی صراحت کے مطابق وہاں ایسی چیزیں ہیں کہ جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے۔ یہاں تک کہ کسی انسان کے دہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ لہذا قرآن مجید کہتا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ

کوئی انسان نہیں جانتا کہ کسی کیسی چیزیں۔ کہ جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سبب ہیں۔

اس کے لیے پناہ رکھی گئی ہیں (التعمیر: ۱۷)

اس جہان پر حاکم نظام اس عالم پر حاکم نظام سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہاں افراد بطور گواہ عدالت میں جاتے ہیں لیکن وہاں ہاتھ اور پاؤں یہاں تک کہ بدن کی جلد بھی گواہی دے گی:

الْيَوْمَ نَخْتُمُ عَلَىٰ فُؤَادِهِمْ وَنُحَدِّثُ بِهِمْ وَنَشْهَدُ بِأَرْجُلِهِمْ

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (نبین - ۶۵)

وَقَالُوا الْجُلُودُ دُهْمٌ لِّمَنْ شَاءَ نَحْنُ لَمْ نَشْهَدْ لَكَ عَلَيْنَا قَالَ لَوْ لَاطَقْنَا اللَّهَ الَّذِي

انطق كل شيء (حجرتہ: ۲۱)

ہر حال دوسرے جہان کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے وہ صرف دہر کی ایک بات ہے کہ جس قدر ہماری سمجھ میں آتی ہے اور اصولی طور پر ہماری الف باء اور اس جہان میں ہماری فکری صلاحیت اس کی حقیقی تحریر پر قادر نہیں ہے اور اسی سے جنت و دوزخ اور ان کی نعمتوں اور عذابوں کی کیفیت کے بارے میں بھی جواب دیا جاسکے گا۔

ہم تو اسی قدر جانتے ہیں کہ جنت تو انواع و اقسام کی خدائی نعمتوں کا مرکز ہے چاہے وہ مادی ہوں یا روحانی اور دوزخ دو قوں جہات کے شدید ترین عذابوں کا مرکز ہے۔

لیکن ان دونوں کی جزئیات کے بارے میں قرآن مجید نے کچھ اشارے بیان کیے ہیں کہ جن پر ہم ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کی تفصیلات جب تک کوئی نہ دیکھے، نہیں جانتا۔

جنت و دوزخ کے وجود کے بارے میں اور یہ کہ وہ کہاں ہیں، ہم نے نسبتاً تفصیلی بحث سوڑا اہل عمران کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں دوسری جلد میں کی ہے۔

اسی طرح عالم قیامت میں جزا و سزا اور "تجسم اعمال" اور "نامہ اعمال" کے مسئلے کے بارے میں ہم جلد دوم سورہ اہل عمران کی آیہ ۳۰ کے ذیل میں اور جلد ۷ سورہ کہف کی آیہ ۶۹ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

ان تمام باتوں کے علاوہ، دوسری مختلف بحثیں متعلقہ آیات کے ذیل میں خصوصاً قرآن مجید کی آخری سورتوں میں انشاء اللہ قیامت کی خصوصیات کے بارے میں بیان ہوں گی۔

پروردگارا! اس پر خوف و خطر دن میں، اس عظیم قیامت اور عدالت میں ہمیں اپنے لطف و کرم سے امن و سکون بخشنا۔

خداوند! اگر فیصلہ اعمال کے معیار پر ہو تو ہمارا ہاتھ خالی ہے۔ اپنے فضل و کرم کے ترازو سے ہماری ناچیز نیکیوں کو تولنا اور اپنی رحمت و مغفرت سے ہماری برائیوں پر پردہ ڈال دینا۔

بارالہ! ایسا کرنا کہ انجام کار تو بھی ہم سے خوش ہو اور ہم بھی تیری بارگاہ میں کامیاب و دستگاہ ہوں، آمین یا رب العالمین۔

تفسیر نمونہ کی جلد ۱۸ کا اختتام

۸ رمضان المبارک ۲۰۰۴ ہجری

تفسیر نمونہ کی اشعار میں جلد کا ترجمہ از قلم سید صفدر حسین نجفی

فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم

بروز اتوار

بوقت دن کے ۱۲ بج کر ۵۱ منٹ

بتاریخ ۲۲ شوال ۱۴۰۴ھ

بمطابق ۲۹ جون ۱۹۸۶ء

برمکان ولایت خاں صاحب ماچنڈر، یو۔ کے

اختتام پذیر ہوا۔

الحمد لله اولاً و آخراً والصلوة على النبي

وآله ابداً دائماً۔

سید صفدر حسین نجفی

سورہ صافات

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی

اسکی ۱۸۲ آیات ہیں

آغاز

جمعة المبارک

یکم رمضان المبارک ۱۴۰۴ ہجری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورہ صافات کے مطالب

یہ سورہ بھی چونکہ کی سورتوں میں سے ہے لہذا اسکی سورتوں کی تمام صفات اس میں موجود ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ مبرا دعو کے اسلامی عقائد و معارف کو بیان کیا گیا ہے۔ قاطع تعبیرات اور مختصر و زوردار آیات کے ذریعے مشرکین کو سب سے زیادہ کی گئی ہے۔ نیز واضح اور روشن دلائل کے ذریعے ان کے عقائد کا بطلان ظاہر کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر اس سورہ کے مطالب کا پانچ حصوں میں خلاصہ ہوتا ہے :-
پہلا حصہ : خدا کے فرشتوں کے مختلف گروہوں کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور ان کے مقابلے میں شرک شیطانی کے گروہوں اور ان کے انجام کو بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ : کافروں، نبوت و معاد کے بارے میں ان کے انکار اور قیامت میں ان کے انجام کو بیان کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ مربوط قیامت میں ان کی آپس کی بحث اور گناہ کو ایک دوسرے کی گردن میں ڈالنے اور ان سب کے عذاب الہی میں گرفتار ہونے کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں بہشت کی بڑی بڑی نعمتوں اور بہشتیوں کے لیے خوشیوں، لذتوں اور زیباہوں کو بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا حصہ : بزرگ انبیاء مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمعیلؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت ایساؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت یونسؑ کی تانت و تار کے ایک حصے کو مختصر اور مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اسی میں بہت شکر بہادر و ہر دو ابراہیمؑ کے بارے میں بحث اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اصلی مقصد یہ ہے کہ گزشتہ بیانات اور انبیاء کی تاریخ کے ضمنی شواہد کچھ محسوس و محسوس صورت میں بیان کیے جائیں اور کلی عقلی حقائق محسوس قالب میں عمیق ہو جائیں۔

چوتھا حصہ : شرک کی ایک بہترین قسم کا ذکر ہے۔ یعنی جنوں اور ضلایا فرشتوں اور خدا کے درمیان رشتہ داری کا اعتقاد مختصر جملوں میں اس بے ہودہ عقیدے کی اس طرح درج کیا گیا ہے کہ اس کی معمولی سی قدر و قیمت بھی باقی نہیں رہتی۔ پانچواں حصہ : یہ اس سورہ کا آخری حصہ ہے۔ چند مختصر آیات ہیں۔ شرک تہی کی کفر و شرک و نفاق کے لشکر پر فتح و پیروزی کا ذکر ہے۔ اہل شرک و نفاق کے عذاب الہی میں گرفتار ہونے کا تذکرہ ہے۔ ان ناروا نسبتوں سے جو مشرکین پروردگار کے بارے میں دیتے ہیں، تنزیہ و تقدیس بیان کی گئی ہے اور سورہ پروردگار کی حمد و ستائش کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

سورۃ صافات کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے منقول ہے:

من قرأ سورة صافات اعطى من الاجر عشر حسنات، بعدد كل جن وشيطان،
وتباعدت عنه مردة الشياطين وبراء من الشرك، وشهد له حافظه يوم
القيامة انه كان مؤمناً بالمرسلين

جو شخص سورۃ صافات کو پڑھے اسے تمام جنوں اور شیطانوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں ہی
جاتی ہیں اور سرکش شیطان اس سے ڈر رہتے ہیں اور وہ شرک سے پاک رہتا ہے اور وہ دونوں
فرشتے جو اس کی حفاظت پر مامور ہیں قیامت میں اس کے لیے گواہی دیں گے کہ یہ خدا کے
رسولوں پر ایمان رکھتا تھا۔

ایک دوسری حدیث میں امام صادق سے اس طرح منقول ہے:

من قرأ سورة صافات في كل جمعة لم يزل محفوظاً من كل أفة، مدفوعاً عنه
كل بلية في حياته الدنيا، مرضاً وفاقاً في الدنيا باوسع ما يكون من الرزق ولم
يصبه الله في ماله ولا ولده ولا بدنه بسوء من شيطان رجيم، ولا جبار عنيد،
وان مات في يومه او ليلته بعثه الله شهيداً، واماته شهيداً، وادخله الجنة
مع الشهداء في درجة من الجنة

جو شخص سورۃ صافات ہر جمعہ کو پڑھے گا وہ ہر آفت سے محفوظ رہے گا اور دنیا کی زندگی میں
ہر بلا اس سے ڈر رہے گی۔ خداوند تعالیٰ اس کے رزق میں کشادگی کرے گا اور اس کے
مال و اولاد اور بدن پر شیطان رجیم اور جابر دشمن کو مسلط نہیں ہونے دے گا اور اگر اس
دن یا رات کو دنیا سے کوچ کر جائے تو خدا اسے شہید اٹھائے گا اور شہید کی موت دے گا
اور اسے بہشت میں شہداء کے درجے میں جگہ عطا فرمائے گا۔

اس سورہ کے مطالب پر توجہ کرتے ہوئے اس کی تلاوت پر ان تمام عظیم ثوابوں کی وجہ واضح و روشن ہوجاتی ہے

۱۔ صحیح البیان، آغاز سورۃ صافات

۲۔ تفسیر صحیح البیان، آغاز سورۃ صافات۔ تفسیر برہان میں بھی یہ حدیث معترفین کے ساتھ مروجہ مدونہ رحمت اللہ علیہ سے
نقل ہوتی ہے۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تلاوت کا مقصد غور و فکر کرنا ہے۔ اس کے بعد اس پر اعتقاد رکھنا اور پھر اس پر عمل کرنا ہے اور
بلاشبکہ و بشرہ جو شخص اس سورہ کی اس طریقہ سے تلاوت کرے گا وہ شیاطین کے شر سے بھی محفوظ رہے گا اور شرک
سے بھی پاک ہو جائے گا اور صحیح اور حکم اعتقاد رکھنے اور اعمال صالحہ بجالانے اور انبیاء کی سرگزشت اور سابقہ اقوام کے
واقعات سے نصیحت حاصل کرنے سے شہیدوں کے ڈرے میں بھی قرار پائے گا۔
منہجی طور پر یہ بھی کہ دیا جائے کہ اس سورہ کا نام ”صافات“ اس کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ وَالطَّيِّبَاتِ صَفًا

۲۔ فَالزُّجَرِاتِ زَجْرًا

۳۔ فَالطَّلِیٰتِ ذِكْرًا

۴۔ اِنَّ الْهٰکُمْ لَوَاحِدٌ

۵۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ تم بے صف باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی (جو اپنی صفوں کو منظم رکھے ہوئے ہیں)

۲۔ پھر تم بے ان کی جو سختی کے ساتھ منگ کرتے ہیں (اور روک دیتے ہیں)

۳۔ وہی کہ جو پے در پے ذکر (الہی) کی تلاوت کرتے ہیں۔

۴۔ مختار معبود یقیناً یکتا ہے۔

۵۔ وہ آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا بھی اور وہ مشارق کا رب ہے۔

تفسیر

وہ فرشتے جو انجام امور کے لیے آمادہ رہتے ہیں

یہ قرآن مجید کی وہ پہلی سوره ہے جس کا آغاز قسم سے ہوتا ہے۔ اس کی پرستی اور فکری تہذیبیں انسان کی فکر کو اپنے ساتھ اس جہان کے مختلف گوشوں کی طرف پھینچ لے جاتی ہیں اور حقائق قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ خدا سب سے بڑھ کر راست گو ہے اور اسے قسم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں

قسم کو مبین کے لیے ہو تو وہ قسم کے بغیر بھی تسلیم غم کے ہوئے ہیں اور اگر منکرین کے لیے ہے تو وہ خدا کی قسموں پر لائق نہیں رکھتے۔

لیکن قرآن کی تمام آیات میں جن سے اس کے بعد ہمیں کبھی کبھی واسطہ پڑنے کا، دو نکات کی طرف توجہ سے غم کا سکہ واضح ہو جائے گا۔

پہلا یہ کہ قسم ہمیشہ قابل قدر اور اہم امور کے بارے میں کھائی جاتی ہے۔ اس بنا پر قرآنی قسمیں ان امور کی عظمت اور اہمیت کی دلیل ہیں کہ جن کی قسم کھائی گئی ہے اور یہی امر "مقسم بہ" یعنی وہ چیز جس کی قسم کھائی گئی ہے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کا سبب بنتا ہے۔ ایسا غور و فکر جو انسان کو نئے حقائق سے آشنا کرتا ہے۔

دوسرا یہ کہ قسم ہمیشہ تاکید کے لیے ہوتی ہے اور اس امر کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ امور جن کے لیے قسم کھائی جا رہی ہے ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں تاکید شدید ہے۔

اس سے قطع نظر جس وقت کہنے والا اپنی بات کو دو ٹوک طریقے سے بیان کرے تو نفسیاتی طور پر سننے والے کے دل پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ لہذا قرآن کی ہر قسم مومنین کو زیادہ قوی اور منکرین کو زیادہ نرم کر دیتی ہے۔

بہر حال اس سورہ کی ابتدا میں ہمیں تین نام ملتے ہیں جن کی قسم کھائی گئی ہے۔

پہلے فرماتا ہے: قسم ہے ان کی جو صف باندھے ہوئے ہیں اور جنہوں نے اپنی صفوں کو منظم کیا ہوا ہے۔

(والصافات صفا)

وہی جو پوری قوت کے ساتھ روکتے ہیں (فالنزاجرات نازجرا)۔

اور وہ جو پے در پے ذکر الہی کی تلاوت کرتے ہیں (فالتالیات ذکرا)۔

یہ تین گروہ کون ہیں؟ اور یہ کن افراد کی صفات ہیں؟ اور ان کا اصلی ہدف و مقصد کیا ہے؟ مفسرین نے یہاں بہت سی باتیں کی ہیں لیکن معروف و مشہور یہ ہے کہ یہ فرشتوں کے مختلف گروہوں کے اوصاف ہیں۔

ایسے گروہ جو فرمان الہی کو انجام دینے کے لیے عالم سستی میں صف باندھے ہوئے آمادہ تمہیل ہیں۔

فرشتوں کے ایسے گروہ جو انسانوں کو گناہ سے روکتے ہیں اور شیطانوں کے دوسوں کو ان کے دلوں میں بے اثر کرتے ہیں یا آسمان کے بادلوں پر ماوردیں اور انہیں ادھر ادھر دیکھتے ہیں اور انہیں خشک سرزمینوں کی سیرانی کے لیے لے جاتے ہیں۔

اور آخر میں فرشتوں کے وہ گروہ جو آسمانی کتابوں کی آیات نازل ہونے کے وقت پیغمبروں کے سامنے پڑھتے ہیں۔

یہ تین جگہ ایک معنی کے لحاظ سے تین قسمیں ہیں اور ایک معنی کے لحاظ سے ایک قسم ہے تین اوصاف کے ساتھ۔

مذکورہ بالا آیات کی تفسیر کے بارے میں دوسرے تفصیلات بھی بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ میدان جناد میں ماہدین اسلام کی صفوں کی طرف اشارہ ہے اور وہ میدان جنگ میں دشمنوں کے سروں پر پڑھتے ہیں اور وہ انہیں حیرت و اسلام اور قرآن سے تجاؤ کرنے سے روکتے ہیں (بانی ماہدین صوفی)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ "صافات" "صافہ" کی جمع ہے اور خود صافہ بھی اپنی جگہ پر جمع کا مفہوم رکھتا ہے اور اسے کی طرف اشارہ ہے جو صف باند سے ہوئے ہے۔ اس بنا پر "صافات" متعدّد معنوں کے معنی میں ہے۔
"زاجرات" بنیادی طور پر "زجر" کے مادہ سے کسی چیز کو بند آواز کے ساتھ مانکنے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ متعدّد معنی میں استعمال ہونے لگا جو ہر طرح سے دھتکارنے روکنے اور منع کرنے کا مفہوم دیتا ہے۔

اس بنا پر "زاجرات" ان گروہوں کے معنی میں ہے جو دوسروں کو روکنے، دھتکارتے اور جھڑکتے ہیں۔
اور "تالیات" "تلاوت" کے مادہ سے "تالی" کی جمع ہے جو ان گروہوں کے معنی میں ہے جو کسی چیز کی تلاوت کرتے ہیں۔

ان الفاظ کے مفہام کی وسعت اور پھیلاؤ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کوئی تعجب کی بات نہیں گئی کہ ان کے لیے مفسرین نے گونا گوں تفاسیر بیان کی ہیں۔ جو مختلف ہونے کے باوجود متضاد نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ سب کی سب ان آیات کے مفہوم میں جمع ہوں۔ مثلاً "صافات" سے فرشتوں کی وہ تمام صفوں مراد ہوں جو عالم آفرینش میں اوامر الہی کے اجراء کے لیے آمادہ ہیں اور وہ فرشتے بھی مراد ہوں جو عالم تشریح میں پیغمبروں پر زور دل و جی پر مامور ہیں۔ اسی طرح راہ خدا میں لڑنے والے اور مجاہدین کی صفیں یا نماز گزاروں اور عبادت کرنے والوں کی صفیں۔

اگرچہ قرآن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس سے زیادہ تر مراد فرشتے ہی ہیں اور بعض روایات میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

(بقیہ جاہلیہ) اور وہ جو ہمیشہ ذکر تلاوت الہی کرتے ہیں اور اپنے قلب در روح کو اس کے نور سے روشن کرتے ہیں۔

یہ احتمال بھی مذکور کیا گیا ہے کہ ان تین اوصاف کے ایک حصہ کا اشارہ ان فرشتوں کی طرف ہے جو منظم صفوں کی صورت میں ہوتے ہیں اور ایک حصہ قرآنی آیات کی طرف اشارہ ہے جو لوگوں کو براہوں سے روکتی ہیں اور ایک حصہ مومنین کی طرف اشارہ ہے جو نماز میں بلند آواز کے ساتھ ذکر تلاوت کرتے ہیں لیکن ان اوصاف کے درمیان جوڑائی بعینہ نظر آتی ہے۔ کیونکہ "خائف" کے ساتھ ان کا مطابقت اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سب اوصاف ایک ہی گروہ کے ہیں۔

"مقام بلطانی" نے "الیزان" میں یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ تینوں اوصاف ان فرشتوں کے ہوں جو وحی الہی کی تبلیغ پر مامور ہیں، وہ منظم صفوں میں وحی کی حفاظت کرتے ہیں اور شیطانوں کو روکنے کے راستے سے بچا دیتے ہیں اور سرانجام آیات الہی کی پیغمبروں کے لیے تلاوت کرتے ہیں۔

(مشافہ صفتیٰ هذا) اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان اوصاف کا "جمع مؤنث" کی شکل میں ذکر کرنا اس بنا پر ہے کہ ان کا مفرد خود جماعت کا معنی رکھتا ہے جو مؤنث لفظی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض ارباب لغت کے کہنے کے مطابق "تالی" کی جمع "تالیات" ہے اور "تالیہ" کی جمع "توالی" ہے۔

تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۵ الدر المنثور جلد ۵ ص ۲۰۱

اسی طرح اس بات میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے کہ "زاجرات" کے مفہوم میں وہ فرشتے بھی شامل ہوں جو شیطانوں کے دلوں سے دور کرتے ہیں اور ان انسانوں کو بھی جو نبی عن اللہ کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔
نیز جو کتبہ "تالیات" تمام فرشتوں اور مومنین کی تمام جماعتوں کی طرف اشارہ ہو جو آیات الہی اور ذکر خدا کی پندہ تلاوت کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان تینوں لفظوں کے ایک دوسرے پر "فاء" کے ساتھ عطف کی وجہ سے آیات کا ظاہر یہ ہے کہ یہ تینوں گروہ ایک دوسرے کے پیچھے ہیں، تو کیا یہ ترتیب انجام ذمہ داری کے لحاظ سے ہے یا مقام کے لحاظ سے یا دونوں معانی کے لحاظ سے؟

یہ بات واضح ہے کہ صف باند صاف اور تیار ہونا پہلے مرحلہ میں ہوتا ہے، اس کے بعد کا دونوں کو راستے سے ہٹانے کا مرحلہ ہے اور اس کے بعد احکام بیان کرنے اور ان کے اجراء کی نوبت ہے۔

دوسری طرف سے وہ جو فرمان کے اجراء کے لیے تیار ہونے میں ایک مقام رکھتے ہیں اور جو رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں وہ افضل و برتر مقام رکھتے ہیں اور جو فرماؤں کو پڑھتے ہیں اور انہیں جاری کرتے ہیں وہ سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔

بہر حال پروردگار کا ان سب گروہوں کی قسم کھانا اس کی بارگاہ میں ان کے مقام کی عظمت ظاہر کرتا ہے۔ ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے کہ راہ حق کے راہبوں کو مقصود تک پہنچنے کے لیے ان تینوں مراحل سے گزرنا چاہیے۔

پہلے وہ اپنی صفوں کو منظم کریں اور ہر گروہ اپنی صف میں موجود ہو۔ اس کے بعد سب راستے سے رکاوٹوں کو دور کرنے اور بلند آواز کے ساتھ مزامنتوں کو ہٹانے میں مصروف کار ہو جائیں۔ دہی کام جو زجر (جھڑکنے) کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اس کے بعد آیات الہی اور پروردگار کے فرماؤں کی اہل دلوں پر پڑے درپے درپے تلاوت کریں اور ان کے مضامین و مطالب کو روبرو عمل لائیں۔

راہ حق کے مجاہدین کو ان تینوں مرحلوں سے گزرنے کے سوا چارہ کار نہیں ہے۔ سچے علماء اور دانش مندوں کو بھی اپنی اجتماعی مساعی اور کوششوں میں اسی انداز سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین نے ان آیات سے مجاہدین اور بعض نے علماء مراد لیے ہیں لیکن آیات کے مفہوم کو ان دو گروہوں میں محدود کرنا بعینہ نظر آتا ہے، البتہ آیات کی عمومیت بعینہ نہیں ہے اور اگر ہم انہیں فرشتوں کے ساتھ ہی سمجھیں سمجھیں پھر بھی دوسرے لوگ اپنی زندگی میں ان فرشتوں سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام بھی نبی البلاغہ کے پہلے خطبے میں جہاں فرشتوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور انہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

وصافون لایترایلون، ومسبحون لایسأمون، لایفشاہم نوم العیون،
ولاسہوالعقول، ولا فطرة الابدان، ولا غفلة النسیان، ومنہم امتاء
علی وحیہ، والسنة الی رسلہ

ان میں سے ایک گروہ ایسی صفوں میں موجود ہے جو ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں وہ ہمیشہ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور
تسبیح نہیں۔ ان کی آنکھوں میں کبھی نیند طاری نہیں ہوتی۔ سو وہ بیان میں گرفتار نہیں ہوتے۔ بدن کی کسبستی انھیں دامن
نہیں ہوتی اور نسیان کی غفلت انھیں عارض نہیں ہوتی۔ ان کا ایک گروہ وحی کے انعام میں اور وہ پیغمبروں کے لیے خدا کی
زبانیں ہیں۔

ان تینوں آیات کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ بعض یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ان آیات میں خدا کی پاک ذات کی
قسم کھائی گئی ہے اور ان سب میں لفظ ”رب“ مقدر ہے اور حقیقت میں اس طرح تھا،
و رب الصافات صفا ورب الزاجرات زجرا ورب التالیات ذکرا
صف باندھ کر کھڑے ہوئے ان گروہوں کے پروردگار کی قسم جنہوں نے اپنی صفوں کو منظم کیا
ہو اسے اور جھڑک کر روک دینے والوں کے پروردگار کی قسم، اور پے در پے ذکر خدا کی تلاوت
کرنے والوں کے پروردگار کی قسم۔

جن لوگوں نے آیات کی اس طرح تفسیر کی ہے ان کا خیال یہ ہے کہ چونکہ خدا نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ غیر خدا
کی قسم نہ لکھائیں۔ پس خدا بھی اپنی ذات کے علاوہ کسی کی قسم نہیں کھاتا، علاوہ ازیں قسم کسی اہم امر کی کھانا چاہیے اور زیادہ
اہم اس کی پاک ذات ہے۔

لیکن وہ اس نکتے سے غافل ہیں کہ خدا کا حساب اس کے بندوں سے الگ ہے۔ وہ انسانوں کو متوجہ کرنے کے لیے
”آفاق“ اور ”انفسی“ آیات اولہ آسمان و زمین میں اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے ہمیشہ مختلف موجودات کی قسمیں کھاتا
ہے تاکہ وہ انھیں ان آیات میں غور و فکر کرنے پر آمادہ کرے اور وہ اُسے اس راستے سے بچائیں۔

اس سے قطع نظر قرآن مجید کی کئی آیات ہیں۔ جیسے سورۃ الشمس کی آیات میں۔ خدا نے موجودات عالم کی اپنی
پاک ذات کے ساتھ قسم کھائی ہے اور وہ کسی چیز کو مقدر کرنا ممکن نہیں ہے، فرماتا ہے:
والسماء وما بناھا والارض وما طحاھا ونفس وما سواھا
قسم ہے آسمان کی اور جس نے اسے بنایا، قسم ہے زمین کی اور جس نے اسے بچھایا ہے اور قسم ہے
انسان کی جان کی اور جس نے اُسے منظم کیا ہے۔

ہر حال زیر بحث آیات کا ظاہر یہی ہے کہ ان ہی تینوں گروہوں کی قسم کھائی گئی ہے اور کسی چیز کو مقدر ماننا مخالف ظاہر
ہے اور دلیل کے بغیر اُسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ نوح البیان، مخطبہ ۱

۲۔ سورۃ ”الشمس“ (آیت ۵ تا ۷)

آئیے اب یہ دیکھتے ہیں کہ ملائکہ اور انسانوں کی صفوں کی یہ پرستی میں کس مقصد کے لیے کھائی گئی ہیں؟
ہمدولی آیت اس مقصد کو واضح کرتے ہوئے کہتی ہے:
فقطار صمد یقینا یکتا ہے (ان الھکم لو احد)۔

قسم ہے ان مقدمات کی جو بیان کیے گئے ہیں، کہ تمام جنت تباہ و برباد ہیں اور پروردگار کا کوئی کسی قسم کا شریک
شعبہ و نظیر نہیں ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: وہی جو آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا بھی
اور سب مشرقوں کا پروردگار وہی ہے۔ (رب السماوات والارض وما بینھما ورب المشارق)۔
یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں۔

۱۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کا ذکر کرنے کے بعد ”مشارق“ کے ذکر کی کیا ضرورت
تھی، کیونکہ یہ بھی تو انہیں کا ایک جزء ہے۔

اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ”مشارق“ چاہے سال کے
دول میں سورج کے مشارق کی طرف اشارہ ہو یا آسمان کے مختلف ستاروں کے مشارق کی طرف، سب کے سب ایک مخصوص نظم
اور پروگرام رکھتے ہیں کہ جو آسمانوں اور زمین کے نظام کے علاوہ ان کے پیدا کرنے والے اور مدبر کے قدرت و حکم پر دلالت کرتا ہے۔
آسمان کا سورج سال بھر میں روزانہ ایک نئے نقطے سے طلوع کرتا ہے اور ان نقاط کا ایک دوسرے سے فاصلہ
اس قدر منظم اور دقیق ہے کہ ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی کم یا زیادہ نہیں ہوتا اور لاکھوں سال گزر چکے ہیں مگر سورج
کے مشارق کا نظم و ضبط اسی طرح قائم و برقرار ہے۔

دوسرے ستاروں کے طلوع و غروب میں بھی یہی نظام کار فرما ہے۔
علاوہ ازیں اگر سورج سال بھر کے اندر اس تدریجی راستے کو طے نہ کرتا تو چاروں فصلیں اور مختلف برتیں جو اس سے ہیں
حاصل ہوتی ہیں نہ ہو سکتیں اور یہ بات خود اس کی عظمت و تدبیر کی ایک اور نشانی ہے۔

اس کے علاوہ ”مشارق“ کا ایک دوسرا معنی یہ ہے کہ زمین کے گول ہونے کی بنا پر اس کا ہر نقطہ دوسرے نقطے
کی نسبت مشرق یا مغرب شمار ہوتا ہے اور اس طرح سے زیر بحث آیت میں زمین کے گروی ہونے اور اس کی مشرقوں
اور مغربوں کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

(اس آیت سے دونوں معانی مراد ہونے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے)۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ”مشارق“ کے مقابلے میں یہاں ”مغرب“ کے بدلے میں کیوں لکھا نہیں ہوا، جیسا کہ
سورۃ معارج کی آیہ ۲۴ میں آیا ہے۔

فلا اقسمر برب المشارق والمغرب

مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات کلام کے ایک حصے کو دوسرے حصے کے قرینہ کی وجہ سے حذف کر دیتے ہیں دونوں کو اکٹھے آتے ہیں۔ یہاں "مشارق" کا ذکر "مغرب" کے لیے قرینہ ہے اور بیان کا یہ تنوع بھی ایک انداز شمار ہوتا ہے۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "مشارق" کا ذکر طلوع وحی کے ساتھ مناسب رکھا ہے جو "تالیات ذکرًا" فرشتوں کے ذریعے پیغمبر کے قلب پاک پر نازل ہوئی تھی۔

۱- اِنَّا زَيْنَا السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ ۝

۲- وَحِفْظًا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَارِدٍ ۝

۳- لَا يَسْتَمِعُونَ إِلَى الْمَلَأِ الْأَعْلَىٰ وَيُقَذَّفُونَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝

۴- دُحُورًا وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ ۝

۵- إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شَهَابٌ ثَاقِبٌ ۝

ترجمہ

۴- ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کے ساتھ زینت بخشی۔

۵- اور اس کی ہر سرکش شیطانِ نجیث سے حفاظت کی۔

۸- وہ عالم بالا کے فرشتوں کی باتوں کو نہیں سن سکتے (اور جس وقت وہ مننا چاہتے ہیں) تو ہر طرف سے تیروں کا نشانہ بنتے ہیں۔

۹- وہ شدت کے ساتھ پیچھے کی طرف دھکیلے جاتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔

۱۰- مگر جو مختصر سے لمبے کے لیے اچھٹی سی بات سننے کے لیے آسمان کے نزدیک ہوتے ہیں تو وہ شہابِ ثاقب "ان کا تاقب کرتے ہیں۔"

تفسیر

شیاطین کے نفوذ سے آسمان کی حفاظت

گزشتہ آیات میں فرشتوں کی مختلف صفوں کے بارے میں گفتگو تھی جن کی بہت بڑی بڑی ذمہ داریاں ہیں اور یہ بحث آیات میں ان کے مد مقابل یعنی شیاطین کے مختلف گروہوں اور ان کے انجام کے بارے میں گفتگو ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ مشرکین کی اس جماعت کے اعتقاد کو باطل کرنے کے لیے ایک مقدمہ ہو، جو شیاطین اور جنوں کو اپنا معبود قرار دیتے ہیں ضمنی طور پر اس میں توحید کا ایک درس بھی پوشیدہ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: ہم نے نزدیک آسمان (نچلے آسمان) کو ستاروں سے مزین کیا ہے (اننا زیننا السماء

الدنیا بزیتہ الکواکب)۔

پنج بج تک اور ستاروں بھری رات میں صفحہ آسمان پر ایک نگاہ سے اس قسم کا خوبصورت منظر انسان کے سامنے مجسم ہوتا ہے کہ وہ مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔

گویا تاروں بھری رات زبان بے زبانی سے ہم سے گفتگو کر رہی ہے اور خلقت کے راز ہم سے بیان کر رہی ہے۔ گویا سب کے سب تارے شاعر ہیں جو اپنے درپے درپے عشقی و عرفانی ڈرونی ہوتی خوبصورت غزلیں گا رہے ہیں۔ ان کا ٹھکانا اور پلکیں جھپکن ایسے رازوں کو بیان کرتا ہے کہ جو سوائے عاشق و مشوق کے اور کہیں نہیں ہوتے۔

دانشگاہیں کمالیہ نظر اس قدر خوبصورت ہے کہ ہرگز آنکھ اس کے دیکھنے سے نہیں ٹھکتی، بلکہ انسانی وجود سے ساری شئی کو دور کر دیتا ہے (اگرچہ یہ سائل، ہمارے زمانے میں شہروں کے رہنے والوں کے لیے کچھ مفہوم نہیں رکھتے کیونکہ وہ کارخانوں کے دھوئیں میں ڈوبے رہتے ہیں اور ان پر ایک سیاہ و تاریک آسمان ہوتا ہے، لیکن دیہاتوں کے رہنے والے اب بھی قرآن کے اس ارشاد کی عملی صورت یعنی آسمان کا درخشنا ستاروں سے مزین ہونا دیکھ سکتے ہیں)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ ”ہم نے پچھلے آسمان کو ستاروں سے مزین کیا ہے“ حالانکہ جو مفروضہ اس زمانے کے افکار و دانش مندوں میں تسلیم کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ صرف اوپر والا آسمان ثوابت ستاروں کا آسمان ہے (بظلیوس کے مفروضہ کے مطابق آسمان)۔

لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اس مفروضہ کا باطل ہونا ثابت ہو چکا ہے اور قرآن کا اس زمانے کے غیر صحیح مفروضہ کی پیروی نہ کرنا اس آسمانی کتاب کا زندہ مجزہ ہے۔

دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ موجودہ سائنس کی رو سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ستاروں کا خوبصورتی کے ساتھ ٹھکانا اور پلکیں جھپکنا اس گزہ ہوائی کی بنا پر ہے جس نے اطراف زمین کو گھیر رکھا ہے اور اسی کی بنا پر یوں دکھائی دیتا ہے اور یہ بات ”السماء الدنیا“ (پچھلے آسمان) کی تعبیر کے ساتھ بہت ہی مناسب ہے۔ فضائے زمین سے باہر ستارے دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں اور ان میں یہ چمک دھمکتے نہیں ہوتی۔

بعد والی آیت میں آسمان کے منظر کے شیطاں کے نفوذ سے محفوظ رہنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے ہر حیثیت اور خیر و شئی سے ماری شیطان سے محفوظ رکھا ہے (وحفظنا من کل شیطان مارد)۔

۱۰ ترکیب کے لحاظ سے ”الکواکب“ ”زینت“ کا بدل ہے اور یا احتمال بھی ہے کہ عطف بیان ہوا۔ زینت یہاں پر اہم صمدی کا معنی رکھتا ہے کہ صمدی معنی کا۔ ادنیٰ کتب میں ہے کہ جس وقت کچھ معروضے بدل جاتے تو اس کے ساتھ ایک صفت ہوتی چلیے لیکن اس کے برعکس ضروری نہیں ہے (مور کچھ گا)

۱۱ ”حفظاً“ بہت سے مترن کے قول کے مطابق ضل متحد کے لیے ”مفعول مطلق“ ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:

وحفظناھا حفظاً

(یعنی حاشیہ کے معنی پر ملاحظہ فرمائیں)

”مارد“ ”مرد“ ”بروزن“ ”مرد“ کے مادہ سے اصل میں اس بلند سر زمین کے معنی میں ہے جو کسی بھی قوم کے سبز سے خالی ہوا وہ درخت جس کے پتے جھڑ جائیں اسے ”امرد“ کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس نوجوان پر جس کے چہرے پر بال نہ آئے ہوں اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے یہاں ”مارد“ سے مراد وہ شخص ہے جو ہر قسم کی خیر و برکت سے ماری ہو۔ ہماری تعبیر کے مطابق ”جس کے پاس کچھ نہ ہو“ ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ شیطانوں کے اوپر چڑھنے سے آسمانوں کو محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ ستاروں کا ایک گردہ ہے اور انھیں ”شہب“ کہا جاتا ہے۔ جس کی طرف بعد کی آیات میں اشارہ ہوگا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ عالم بالا کے فرشتوں کی باتوں کو نہیں سن سکتے اور غیب کے اسرار ان سے نہیں معلوم کر سکتے اور اگر ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہر طرف سے شہاب کے تیروں کا نشانہ بنتے ہیں۔ (لا یسمعون الی العلاء الاعلیٰ ویقتذفون من کل جانب)۔

ان انھیں شدت کے ساتھ چھپنے کی طرف دیکھ لیا جاتا ہے اور انھیں آسمان کے منظر سے نکال دیا جاتا ہے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے (دحوڑاً ولہم عذاب واصب)۔

”لا یسمعون“ (جو لا یسمعون کے معنی میں ہے) اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ”ملا اعلیٰ“ کی خبریں سن لیں لیکن انھیں اجازت نہیں دی جاتی۔

”ملا اعلیٰ“ عالم بالا کے فرشتوں کے معنی میں ہے کیونکہ ”ملا“ اصل میں اس جماعت اور گردہ کو کہا جاتا ہے جو ایک نظریہ پر اتفاق رکھنے والوں پر مشتمل ہوا اور دوسروں کی آنکھ کو اس ہم آہنگی و وحدت سے بڑھ کر دیکھیں اور سناقتدار کے گرد موجود افراد اور اشراف و اعیان کو بھی ”ملا“ کہتے ہیں کیونکہ ان کی ظاہری وضع قطع آنکھ کو بڑھ کر دیکھتی ہے لیکن جب اس کی ”اعلیٰ“ کے ساتھ توصیف ہو تو پھر حق تعالیٰ کے ملائکہ کرام اور فرشتگان والا مقام کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

”یقتذفون“ ”قتذف“ کے مادہ سے پھینکنے اور دور کی جگہ پر تیر مارنے کے معنی میں ہے اور یہاں مراد ”شہب“ کے ذریعے ”شیاطین“ کو جھگانا اور دور دھکیلنا ہے جس کی تشریح ہم بعد میں بیان کریں گے اور یہاں اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ انھیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ملا اعلیٰ کی طرف کے قریب جا سکیں۔

”دحوڑاً“ ”دحو“ (بروزن و ہر) کے مادہ سے دھکیلنے اور دور کرنے کے معنی میں ہے اور ”واصب“ اصل میں پرانی بیماریوں کے معنی میں ہے لیکن کلی طور پر دائم و مسلسل کے معنی میں ہے اور کبھی یہ لفظ خاص کے معنی میں بھی آیا ہے۔

(یعنی حاشیہ) یعنی نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ ”بزینة“ کے اصل پر عطف ہو جو ”مفعول لہ“ ہے اور تقدیر میں اس طرح ہوگا:

انا خلقنا الکواکب زینة للسماء وحفظنا

لہ ”واصب“ کے معنی کے بارے میں جلد ۱ میں سورۃ نمل کی آیت ۵۲ کے ذیل میں بحث کی گئی ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شیاطین نہ صرف آسمان تک پہنچنے سے روک دیے جاتے اور بھگائے جاتے ہیں بلکہ آخر کار دائمی عذاب میں بھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔

آخری ذریعہ بحث آیت میں سرکشی اور جھارت کرنے والے شیطانوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو آسمان کی بلندی کی طرف جانے کا ارادہ کرتے ہیں، قرآن فرماتا ہے، مگر وہ جو مختصر سے لمحے کے لیے چوری چھپے اپنی سی بات سننے کے لیے آسمان کے نزدیک ہو جائیں تو شہابِ ثاقب ان کا بچھا کرتے ہیں اور انہیں جلا دیتے ہیں۔ (الآمن خطف الخطفۃ فاتبعہ شہابِ ثاقب)۔

”خطفۃ“ یعنی کسی چیز کو جلدی سے اچک لینا۔

”شہاب“ اصل میں اس شے کے معنی میں ہے جو جلتی ہوئی آگ سے بلند ہوتا ہے اور وہ آئین شے جو آسمان میں ایک لمبے خط کی صورت میں ابھرتے ہیں انہیں بھی ”شہاب“ کہتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ ستارے نہیں ہیں بلکہ ستاروں کے مانند پتھروں کے چھوٹے ٹکڑے ٹکڑے ہیں جو فضا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ زمین کی کشش کی حدود میں آجاتے ہیں تو پھر زمین کی طرف دوڑتے ہیں اور زمین کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوا کے ساتھ تیزی اور شدت سے ٹکرانے کی وجہ سے شعلہ اور ہوجاتے ہیں۔

”ثاقب“ نفوذ کرنے والے اور سوراخ کرنے والے کے معنی میں ہے۔ گویا شدید زور کے ذریعہ آسمانوں میں سوراخ کر کے انسان کی آنکھ کے اندر نفوذ کر جاتا ہے اور یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جس چیز سے ٹکراتا ہے اس میں سوراخ کر کے آگ لگا دیتا ہے۔

اس طرح شیاطین کے آسمانوں میں نفوذ کرنے میں دو طرح کی رکاوٹیں موجود ہیں۔

پہلی رکاوٹ تو ہر طرف سے دھتکارا جانا اور بھگا دیا جانا ہے۔ اور وہ بھی ظاہری طور پر شہاب ہی کے ذریعہ صورت پذیر ہوتا ہے۔

دوسری رکاوٹ شہاب کی ایک خاص قسم ہے جس کا نام شہابِ ثاقب ہے اور وہ ان کے انتظار میں رہتے ہیں۔ وقت بے وقت جب بھی وہ چوری چھپے کوئی بات سننے کے لیے آسمان پر صلا اعلیٰ کے نزدیک ہوتے ہیں تو وہ ان سے ٹکراتے ہیں۔

اسی طرح کی بات سورۃ ہجر کی آیت ۱۷ اور ۱۸ میں کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وحفظناہا من کل شیطان رجیم الآمن استرق السمع فاتبعہ شہابِ مبین

ہم آسمانی برجوں کی ہر راوندہ درگاہ شیطان سے حفاظت کرتے ہیں، مگر جو چوری چھپے باتیں

سننے لگے تو شہابِ مبین اس کے پیچھے لگ جاتا ہے (انہیں بھگا دیتا ہے اور جلا دیتا ہے)۔

اس تعبیر کی نظیر سورۃ ملک کی آیت ۱۷ میں بھی آئی ہے۔

ولقد زینا السماء الدنيا بمصابیح وجعلناہا رجوماً للشیاطین ہم نے نچلے آسمان کو چراغوں کے ساتھ مزین کیا ہے اور ان (میں سے ایک حصہ) کو شیطانوں کو دور کرنے اور بھگانے کے لیے قرار دیا ہے۔

توضیح و تکمیل

ان الفاظ کے ظاہری کو پیش نظر رکھنا چاہیے یا ایسے قرآن موجود ہیں کہ جن کی وجہ سے ظاہر کے خلاف تفسیر کرنی چاہیے اور انہیں تکمیل و تشبیہ و کنایہ جانا چاہیے اس بارے میں معسرین کے درمیان مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔

بعض نے ان آیات کے ظاہر کو انہیں معانی پر جو پہلی نظر میں دکھائی دیتے ہیں، قبول کیا ہے اور کہا ہے کہ آسمانوں میں نزدیک اور دور دراز مقامات پر فرشتوں کے کچھ گروہ ساکن ہیں اور وہ اس جہان کے حوادث کی خبریں اس سے پہلے کہ وہ زمین میں صورت پذیر ہوں وہاں منعکس ہوتی ہیں۔

شیاطین کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ آسمانوں پر چڑھ جائے اور چوری چھپے ان خبروں میں سے کوئی بات معلوم کر لے اور کانہوں یعنی انسانوں میں سے اپنے ساتھ مروجہ لوگوں کو منتقل کر دیں۔ اس موقع پر شہابِ جو ستاروں کی طرح متحرک ہیں ان کی طرف دوڑتے ہیں اور انہیں پیچھے کی طرف دھکیل دیتے ہیں یا انہیں نابود کر دیتے ہیں۔

یہ معسرین کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے ہم موجودہ زمانے میں ان تعبیرات کے مفہوم کو صحیح طور پر معلوم نہ کر سکیں، لیکن ہماری ذمہ داری یہی ہے کہ ہم ان ظاہری مطالب کی حفاظت کرتے ہوئے مزید معلومات کو آئندہ پر چھوڑ دیں۔

اس تفسیر کو مرحوم طبری نے ”صحیح البیان“ میں، آلوسی نے ”روح المعانی“ میں، سید قطب نے ”فی ظلال“ میں اور بعض دوسرے معسرین نے استجاب کیا ہے۔

جبکہ بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ ذریعہ بحث آیات ان آیات کے مشابہ ہیں جو ”لوح“ ”قلم“ ”عرش“ اور ”کرسی“ کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اور تمثیل و کنایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان کا عقیدہ ہے کہ یہ آیات ”معتول“ کو ”معموس“ سے تشبیہ دینے کے قبیل سے ہیں اور سورۃ عنکبوت کی آیت ۳۴ کی مصداق ہیں جس میں قرآن فرماتا ہے:-

وتلك الامثال نضرب بها للناس وما يعقلها الا العالمون

یہ وہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور اہل علم کے سوا انہیں کوئی نہیں سمجھتا۔

ان معسرین نے مزید کہا ہے کہ جن آسمانوں میں ملائکہ ساکن ہیں ان سے مراد عوالم ملکوت ہیں جن کا افق اس محسوس عالم سے برتر ہے اور شیاطین کے آسمانوں سے نزدیک ہونے اور ”چوری چھپے“ سننے اور ”شہاب“ کے ذریعہ انہیں بھگانے سے مراد یہ ہے کہ یہ شیاطین جب اس رطلقت اور آئندہ کے حوادث کی خبریں معلوم کرنے کے لیے فرشتوں کے عالم سے نزدیک ہونا چاہیں، تو

ملکوت کے نور کے ذریعے جسے برہانیت کرنے کی ان میں طاقت نہیں ہے، رک جاتے ہیں اور دور ہو جاتے ہیں اور حق کے ذریعے ان کے ہاں کی فنی ہو جاتی ہے۔ یہ مفسرین اس سورہ کے آغاز میں فرشتوں کے گردوں کی بحث کے بعد اس فقرہ کے ذکر کو، اس معنی کا مؤید سمجھتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "ساوا" یہاں آسمان ایمان اور منوریت و روحانیت کے لیے کنایہ ہو۔ کیونکہ ہمیشہ شیاطین اس ملک رلوہانے کی سعی و کوشش کرتے ہیں اور دوسروں کے ذریعے سچے مومنین کے دلوں میں نفوذ پیدا کرتے ہیں۔ لیکن خدائی پیغمبر اور ائمہ مصومین اور ان کے فکری و علمی راستے کے پیرو علم و تقویٰ کے شاہد ثاقب کے ذریعے ان پر حملہ کرتے ہیں اور انہیں اس آسمان کے قریب ہونے سے روک دیتے ہیں۔

ہم اس تفسیر کو صرف ایک احتمال کے طور پر یہاں پیش کر رہے ہیں اور اس کے قرآن و شواہد گیارہوں جلد سورہ بقرہ کی آیت ۱۸ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔ ان قرآن کی مزید وضاحت کے لیے چھٹی جلد ہی کی طرف رجوع فرمائیں۔
قرآن مجید کی ان آیات اور ان سے مشابہ آیات کے معنی کے سلسلہ میں یہ تین مختلف تفاسیر تھیں۔

۱۱۔ قَاسَتْفِيهِمْ أَهْمَ أَشَدُّ خَلْقًا مِّنْ خَلْقِنَا إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِّنْ طِينٍ لَّازِبٍ ۝

۱۲۔ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ۝

۱۳۔ وَإِذَا ذُكِرُوا لِآيْذِكُرُونَ ۝

۱۴۔ وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخَرُونَ ۝

۱۵۔ وَقَالُوا إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

ترجمہ

- ۱۱۔ ان سے پوچھو کیا ان کی خلقت (اور معاد) زیادہ مشکل ہے یا فرشتوں (اور آسمان و زمین) کی خلقت؟ ہم نے انہیں چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا ہے۔
- ۱۲۔ تو ان کے انکار سے تعجب کرتا ہے لیکن وہ تو ٹھٹھا کرتے ہیں۔
- ۱۳۔ اور جس وقت انہیں نصیحت کی جائے تو وہ ہرگز متوجہ نہیں ہوتے۔
- ۱۴۔ اور جب وہ کوئی معجزہ دیکھیں تو دوسروں کو بھی ٹھٹھا کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔
- ۱۵۔ اور کہتے ہیں یہ تو زائل کھلا جادو ہے۔

تفسیر

وہ ہرگز حق کو قبول نہیں کریں گے

یہ آیات بھی مسئلہ قیامت اور ہمت و صبر مٹکین کی مخالفت کو بیان کر رہی ہیں۔
گزشتہ بحث کے بعد اب ان آیات میں قرآن ہر چیز پر خداوند تعالیٰ اور آسمان و زمین کے خالق کی قدرت کے متعلق فرماتا ہے: ان سے پوچھو کیا ان کی خلقت اور معاد زیادہ مشکل اور سخت تر ہے یا فرشتوں اور آسمانوں و زمین کی خلقت (ہستہم اہم اشد خلقا) من خلقنا۔

ہم نے انہیں ایک معمولی سی چیز، چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا: (انا خلقناہم من طین لازب)۔

گو یا مشرکین جو معاد کے منکر تھے انھوں نے گوشتہ آیات سننے کے بعد یہ اظہار کیا کہ ہماری خلقت آسمان و زمین اور فرشتوں کی خلقت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: انسانوں کی خلقت، وسیع زمین و آسمان اور ان فرشتوں کی خلقت کے مقابلے میں جو ان حوالہ میں ہیں کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ انسان کی خلقت کا مبداء مسمیٰ پھر چکنے والی مٹی سے زیادہ نہیں ہے۔

”استقتھم“ ”استقتنا“ کے مادہ سے نئی خبروں کے مطالبہ کے معنی میں ہے اور یہ جو نوجوان کو ”فتی“ کہہانا ہے وہ بھی اس کی صرح و جہم کی توثیق کی بنا پر ہے۔

یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ حقیقتاً اپنی خلقت کو آسمان اور فرشتوں کی خلقت سے زیادہ اہم اور زیادہ مستحکم سمجھتے ہیں تو یہ بالکل ایک نئی بات ہے جس کی سابق میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

”لا زب“ کا لفظ بعض کے قول کے مطابق اصل میں ”لازم“ تھا۔ اس کی ”میم“ ”ب“ سے بدل گئی ہے اور اب اس شکل میں استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ایسی مٹی کے معنی میں ہے جس کے اجزا اور ایک دوسرے کے ساتھ لازم یعنی چپکے ہوئے ہیں۔ کیونکہ انسان کی خلقت کا پہلا مبداء تو مٹی ہی ہے اس کے بعد اس میں پانی ملا یا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے بدبودار گارے کی صورت اختیار کی۔ اس کے بعد وہ چپکنے والا گار بن گیا۔ (اس بیان کے ساتھ قرآن مجید کی آیات کی گونا گوں تعبیرات جمع ہو جاتی ہیں)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: تو ان کے معاد کے بارے میں انکار سے تعجب کرتا ہے، لیکن وہ تو معاد کا مذاق اڑاتے ہیں (بل عجبت و یسخرون)۔

تو تو اپنے پاک دل کے باعث اس مسئلے کو اتنا واضح سمجھتا ہے کہ ان کے انکار سے تعجب میں ڈوب جاتا ہے، لیکن یہ ناپاک دل اسے اس قدر محال سمجھتے ہیں کہ اس کا تمسخر اڑانے لگتے ہیں۔

ان برائیوں کا عامل صرف لامعی اور جہالت نہیں ہے بلکہ ہٹ دھرمی اور عناد ہے۔ اس لیے جب انھیں یاد دہانی کرائی جلتے۔ معاد کے دلائل اور خدائی عقاب کی یاد دہانی۔ تو وہ ہرگز متوجہ نہیں ہوتے اور اسی طرح سے اپنی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔ (واذا ذکروا لا یذکرون)۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جب وہ تیرے معجزات میں سے کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو نہ صرف خود تمسخر اڑاتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی مٹھا کرنے پر آمادہ کرتے ہیں (واذا راوا آیة یتستخرون)۔

۱۱ ”روح المعانی“ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تو کھلم کھلا جادو ہے اور کچھ نہیں (وقالوا ان هذا الاصحاح مبین)۔

ان کا معجزات اور آیات الہی کو ”ہذا“ (یہ) کہنا اس لیے تھا کہ وہ انھیں حقیر اور بے قدر و قیمت ظاہر کریں اور انھیں ”سحر“ کہنا اس بنا پر تھا کہ ایک طرف تو پیغمبر اسلام کے خارق العادہ اعمال و افعال قابل انکار نہیں تھے اور دوسری طرف وہ ایک معجزہ کے طور پر ان کے سامنے تسلیم فرم کر نہیں چاہتے تھے صرف ایک لفظ جو ان کی شیطنیت کا اظہار اور ان کی ہوائے نفس کو پورا کر سکتا تھا وہی لفظ عمر رضا جراس حال میں بھی قرآن اور پیغمبر کے عجیب اور انتہائی زیادہ اثر کے بارے میں دشمن کے اعتراف کی نشاندہی کرتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ ”یتستخرون“ کا مفہوم: مفسرین کی ایک جماعت کے نظریہ کے مطابق لفظ ”یتستخرون“ ”یسخرن“ تمسخر اڑاتے ہیں کے معنی میں آیا ہے اور ان دونوں تعبیروں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے جبکہ بعض دوسرے ان دونوں کے درمیان مختلف معانی کے قائل ہیں وہ ”یتستخرون“ کو اس مفہوم کی بنا پر جو باب استقلال میں پرشیدہ ہے، دوسروں کو تمسخر اڑانے کی دعوت دینے کے معنی میں سمجھتے ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نہ صرف خود آیات الہی کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ یہ کہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسرے بھی یہ کام سرانجام دیں تاکہ یہ امر معاشرے میں مذاق بن کر رہ جائے۔

بعض ان دونوں کے فرق کو زیادہ تاکید کے معنی میں سمجھتے ہیں جو لفظ ”یتستخرون“ سے معلوم ہوتی ہے۔ بعض نے اس لفظ کو ”کسی چیز کے مذاق ہونے کا اعتقاد رکھنے کے معنی میں بیان کیا ہے۔ یعنی وہ شدید انحراف کے نتیجے میں حقیقتاً یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ معجزات ایک مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، لیکن دوسرا معنی صحت سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۲۔ اس آیت کی ایک شان نزول: بعض مفسرین نے زیر بحث آیت کی ایک شان نزول بھی بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم کی ایک مشرک سے جن کا نام ”رکانہ“ تھا اطراف مکہ کے ایک پہاڑ پر تہمانی میں ملاقات ہوئی۔ وہ جو اس کے کہ رکاد مکہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ قوی اور طاقتور تھا، پیغمبر اکرم نے اسے زمین پر بیٹھ دیا تاکہ اس پر ظاہر کر دیں کہ آپ معجزے کی طاقت رکھتے ہیں کیونکہ عام حیثیت کے لحاظ سے عرب کی کامیابی مسلم تھی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے کچھ اور معجزات بھی اسے دکھائے کہ جس کی بابت کے لیے کافی تھے لیکن وہ نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں لایا بلکہ کٹر میں آیا اور چلا کہ کہا:

یا بئی ہاشم ساحروا بصاحکم اهل الارض

اے نبی ہاشم! تمھارا ساتھی جاؤ میں اتنا قوی ہے کہ تم اس کے ذریعہ روئے زمین کے تمام جادو گروں کو مقابلہ کر سکتے ہو۔

زیر نظر آیات اس کے اور اس جیسے افراد کے بارے میں نازل ہوئیں۔

۱۶- عَاذِمَتْنَا وَكُنَّا تَرَابًا وَعِظَامًا ؕ اِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ۝

۱۷- اَوْ اٰبَاؤُنَا الْاَوَّلُونَ ۝

۱۸- قُلْ نَعْمَ وَاَنْتُمْ دَاخِرُونَ ۝

۱۹- فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ؕ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُونَ ۝

۲۰- وَقَالُوا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّينِ ۝

۲۱- هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُونَ ۝

۲۲- اِحْشَرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝

۲۳- مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاَهْدُوْهُمْ اِلَى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝

ترجمہ

۱۶- وہ کہتے ہیں جب ہم مر گئے اور خاک اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟

۱۷- یا ہمارے گوشہ آباؤ اجداد (لوٹائے جائیں گے)؟

۱۸- کہہ دو: ہاں (تم سب زندہ کیے جاؤ گے) جبکہ تم ذلیل و خوار ہو گے۔

۱۹- صرف ایک ہی عظیم صیغہ ہوگی، اچانک سب کے سب (قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے) اور دیکھتے

کے دیکھتے رہ جائیں گے۔

۲۰- اور کہیں گے، واٹے ہو ہم پر یہ جزا کا دن ہے؟

۲۱- (ہاں!) یہ وہی جدائی کا دن ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے (حق کی باطل سے جدائی کا دن)۔

۲۲- (اس وقت فرشتوں کو حکم دیا جائے گا) ظالموں اور ان کے ساتھیوں اور جن جن کی وہ پرستش

کیا کرتے تھے.....

۲۳- (ہاں جن جن کی بھی وہ) خدا کے سوا پرستش کیا کرتے تھے انھیں جمع کرو اور انھیں جہنم کے راستے پر چلتا

کر دو۔

تفسیر

کیا ہم اور ہمارے آباؤ اجداد زندہ ہو جائیں گے؟

یہ آیات بھی اسی طرح منکرینِ مہادی کی گفتگو اور ان کو دینے کے جواب کو ہماری رکھے ہوئے ہیں۔ پہلی آیت منکرین کا مہاد کو بعید جاننا اس طرح بیان کرتی ہے کہ وہ کہتے ہیں: کیا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اذ امتنا وکنا ترابا و عظاما ؕ انا لمبعوثون

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کیا ہمارے گوشہ آباؤ اجداد بھی اٹھائے جائیں گے؟ اور اباؤنا الاؤلون۔ وہی جن کے وجود سے مٹی بھر پوسیدہ ہڈیوں یا بھری ہوئی مٹی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ کون ہے ایسا جو ان بھری ہوئے اجزاء کو اکٹھا کر کے اور انھیں لباسِ حیات پہنا سکے؟

لیکن یہ دل کے اندر سے اس بات کو بھولے ہوئے ہیں کہ پہلے دن وہ سب کے سب خاک ہی تھے، وہ مٹی ہی سے پیدا کیے گئے تھے اگر انھیں خدا کی قدرت میں شک ہے تو انھیں جاننا چاہیے کہ خدا نے انھیں ایک مرتبہ قدرت دکھادی اور اگر انھیں مٹی کی قابلیت میں شک ہے تو اس کا ایک مرتبہ ثبوت مل چکا اس کے علاوہ آسمانوں اور زمین کی ایسی عظیم پیدائش، کسی کے لیے حق تعالیٰ کی بے پایاں قدرت میں شک کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑتی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ انکار کے لیے اپنی گفتگو کو طرح طرح کی تاکیدوں کے ساتھ زور دار بنا رہے ہیں چونکہ جملہ ”اِنَّا لَمَبْعُوثُونَ“ جملہ اسمیہ، بھی ہے اور ”ان“ اور ”لام“ جو دونوں ہی تاکید کے لیے آتے ہیں اس میں استعمال ہونے ہیں اور یہ سب ان کی جہالت اور ہٹ دھرمی کی بنا پر تھا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس آیت میں لفظ ”تراب“ (خاک)، ”عظام“ (ہڈیوں) سے پہلے بیان ہوا ہے۔ ممکن ہے یہ امر ان تین نکتوں میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ ہو۔

۱- یہ کہ اگرچہ انسان مرنے کے بعد پہلے ہڈیوں کی صورت اختیار کرتا ہے اور پھر خاک کی صورت۔ لیکن چونکہ خاک کا دوبارہ زندہ ہونا زیادہ عجیب ہے لہذا پہلے اسے بیان کیا گیا ہے۔

۲- جب مردوں کا جسم بھرتا ہے تو پہلے گوشت مٹی میں تبدیل ہوتا ہے اور ہڈیوں کے پہلوں میں گر پڑتا ہے اس بنا پر وہ خاک بھی ہوتا ہے اور ہڈیاں بھی۔

سے یہ آیت ایک عہدِ شرطیہ کی شکل میں ہے جس کی شرط کو رواذا امتنا، اور اس کی جزا امتنوں ہے۔ ”اِنَّا لَمَبْعُوثُونَ“ اس پر قرینہ ہے کیونکہ یہ جملہ ادنیٰ قواعد کی بنا پر جسندہ واقع نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ممکن ہے "زلزلہ" تو بہت پہلے کے عرصے ہوئے آباؤ اجداد کے عرصوں کی طرف اشارہ ہو اور "عظام" ان آباؤ اجداد کے ہڈیوں کی طرف اشارہ جو ابھی تک کامل طور سے مٹی نہیں ہوئے ہیں۔

اس کے بعد قرآن انہیں مخلوق بنا کر جواب دیتا ہے اور غیر اکریم سے کہتا ہے، انہیں کہہ دو: ہاں! تم سبھی اور تمہارے سارے آباؤ اجداد بھی پھر زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے، اس حالت میں کہ تم سب کے سب ذلیل و خوار اور حقیر ہو گے (قل نعم و انتم دعا خیرون)۔

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تمہارا اور تمہارے سارے گزشتہ آباؤ اجداد کا زندہ کرنا قادر و توانا خدا کے لیے کچھ مشکل کام ہے اور کچھ بہت ہی سخت عمل ہے؟ نہیں، صرف ایک ہی صیغہ عظیم آواز خدا کے مامور کی طرف سے بلند کی جائے گی تو اچانک سب کے سب قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور زندہ ہو جائیں گے اور خود اپنی آنکھوں سے مشترکاً منظر دیکھیں گے جس کی اس دن تک تکذیب کیا کرتے تھے (فانما ہی زجيرة واحدة فاذا هم ينظرون)۔

جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں "زجرۃ" دو زجر کے مادہ سے کبھی نکالنے، دھکا دینے اور بھگانے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی بیدار واز کے ساتھ بکارنے کے معنی میں۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے اور یہ اس آیت کے دوسرے نفع صورا اور دوسری چیز کے معنی میں ہے جس کی تشریح انشاء اللہ سورہ "نمر" کی آیات کے ذیل میں کی جائے گی۔

لفظ "ينظرون" (وہ دیکھیں گے) ان کے میدانِ محشر میں حیران و پریشان ہو کر دیکھنے یا عذاب کا انتظار کرتے ہوئے دیکھنے کی طرف اشارہ ہے اور ہر دو صورت میں مطلب یہ ہے کہ نہ صرف وہ زندہ ہی ہوں گے بلکہ اپنے اداکار اور نصارت کو بھی اس ایک صیغہ کے ساتھ ہی واپس پالیں گے۔

"زجيرة واحدة" کی تعبیر ان دونوں الفاظ کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے، قیامت کے تیزی کے ساتھ اچانک آنے اور اس کے خدا کی قدرت کے سامنے بالکل آسان ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ قیامت کے فرشتے کی ایک ہی جھمک پیچ کے ساتھ ہر چیز اپنے راستے پر چل پڑے گی۔

اس موقع پر ان مغرور و کبرکش مشرکین کی عیج و پیکار بند ہوگی جو ان کی بھالی اور بے چارگی کی نشانی ہے اور وہ کہیں گے: دے دے جو

لے "واخر"؛ "دخدر" (بروزن "فخر") اور "دخور" دونوں ہی ذلت و حقارت کے معنی میں ہیں۔ حقیقت زیر بحث آیت کا ایک جملہ خدا ہے کہ اسی جواب دی تھا اور اس پر کچھ انافیہ تاکہ بات میں کچھ زیادہ ندر پیدا ہو جائے، تقدیر اس طرح تھی۔

نعم انکم مبعوثون حالکو تکم د اخیرین

ہم پر، یہ تو یومِ حسرت ہے" (وقالوا یا ویلنا ہذا ایوم الدین)۔

ہاں! جس وقت ان کی نگاہیں عدالتِ الہی، اس عدالت کے گواہوں اور فیصلہ کرنے والوں اور عذاب کی نشانیوں اور علامت پر پڑیں گی تو بے اختیار نالہ و فریاد کریں گے اور اپنے پورے وجود کے ساتھ قیامت کی حقانیت کا اعتراف کریں گے، لیکن ایسا اعتراف ان کی کسی مشکل کو حل نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کے عذاب و سزا میں معمولی سی کمی ہو سکے گی۔

اس موقع پر خدایا ملائکہ کی طرف سے خطاب ہوگا، ہاں! آج وہی جدائی کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے، رحمت کی باطل سے جدائی، بدکاروں کی صفوں کی نیلوی کاروں سے علیحدگی اور پروردگار بزرگ و برتر کے فیصلہ اور عدالت کا دن۔ (ہذا ایوم الفصل الذی کنتم بہ تکذبون)۔

اس کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتی ہے جن میں قیامت کے دن کو یومِ الفصل یا جدائی کے دن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کئی عجیب منہ بولتی اور وحشت ناک تعبیریں ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جب کفار قیامت میں اس دن کے بارے میں بات کریں گے تو لے روز جزا سے تعبیر کریں گے (یا ویلنا ہذا ایوم السدین) لیکن خدا یومِ الفصل کے نام کے ساتھ اس کا ذکر کرتا ہے (ہذا ایوم الفصل) ممکن ہے تعبیر کا یہ فرق اس لحاظ سے ہو کہ عمرین تو صرف اپنی سزا اور عذاب کے بارے میں سوچتے ہیں لیکن خدا ایک زیادہ وسیع معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی اقسام میں سے ایک سزا اور عذاب کا مسئلہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ قیامت کا دن جہانوں کا دن ہے۔ ہاں! بدکاروں کی صفوں کی نیلوی کاروں سے جدائی جیسا کہ سورہ یس کی آیت ۵۹ میں بیان کیا گیا ہے۔

وامتاز والیوم ایہا العجبر مسون لے عمر جو! تم دوسروں سے الگ ہو جاؤ۔

کیونکہ یہ دایر دنیا نہیں ہے، جس میں بدکار لوگ خود کو بندگانِ خدا کی صف میں قرار دیں اور کتنا دغا تک سب کو وہ یہ مشاہدہ کریں گے کہ ان کے باایمان دوست و احباب، تعلق دار اور آل و اولاد ان سے جدا ہو کر جنت کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ علاوہ ازیں وہ دن حق کی باطل سے جدائی کا دن ہے۔ اس روز سچے اور جھوٹے طرز عمل، مخالف عقیدے اور مختلف حکایتیں فکر عالم دنیا کی طرح ایک دوسرے سے بے ہوش نہیں ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ ملے گی۔

ان سب چیزوں سے قطع نظر وہ دن، روزِ فصل، فیصلے کے دن کے معنی میں ہے یعنی عالم عادل خدا اپنے بندوں کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت انتہائی منصفانہ حکم صادر فرمائے گا اور یہ وہ موقع ہوگا کہ مشرکین کے لیے ہر طرح کی رسوائی فراہم ہوگی۔

المفقر۔ اس دنیا کی طبیعت و مزاج حق و باطل کی آمیزش ہے جبکہ قیامت کی طبیعت و مزاج ان دونوں کی ایک دوسرے سے جدائی ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں قیامت کا ایک نام ہے جس کا بارگاہِ مستحضر جواب ہے۔ "یوم الفصل" ہے اصولی طور پر وہ دن جس میں

تمام بھی برتی باقی ظاہر ہو جائیں گی۔ وہاں عنقت صفوں میں موجود لوگوں کی جہان بینی امر ہے۔

اس کے بعد خدا نے فرشتوں کو جو مجرموں کو دوزخ کی طرف چلانے پر مامور ہیں ہم دے گا: ظالموں اور ان کے مانند کام کرنے والوں اور جن کی وہ پرستش کیا کرتے تھے سب کو جمع کر دو (احشر والذین ظلموا وازواجہم وما كانوا یعبدون)

ہاں! جن کی وہ خدا کے سوا پرستش کیا کرتے تھے انھیں چلانا کرو اور دوزخ کا راستہ دکھاؤ (من دون اللہ فاھدوہم الی صراط الجحیم)۔

”احشروا“ ”حششہ“ کے مادہ سے ہے اور مفردات میں راقب کے قول کے مطابق کسی گروہ کو اس کے مقام سے نکلانے اور انھیں میدان جنگ یا اسی قسم کی جگہ کی طرف روانہ کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ لفظ بہت سے مقامات پر جمع کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔
بہر حال یہ لفظ یا تو خدا کی طرف سے ہے یا فرشتوں کے ایک گروہ کی دوسرے گروہ سے ہے جو اکٹھا کرنے اور مجرموں کو دوزخ کی طرف چلانے پر مامور ہیں اور تیسرا ایک ہی ہے۔

”ازواج“ یہاں یا تو ان کی مجرم و ربت پرست بیویوں کی طرف اشارہ ہے یا ان کے ہم نگر و ہم کار و ہم شکل لوگوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ لفظ دونوں معنی کے لیے آیا ہے، جیسا کہ سورہ واقعہ کی آیت، میں بیان ہوا ہے:

وکنتم ازواجًا ثلاثہ

تم قیامت کے دن تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔

اس بنا پر مشرک مشرکوں کے ساتھ، بدکار و سیاہ دل اپنے جیسے بدکاروں اور سیاہ دلوں کے ساتھ اپنی اپنی صفوں میں جہنم کی طرف دیکھ جائیں گے۔

یا اس سے وہ شبہ ظہین مراد ہیں جو ان کے ہم شکل و ہم عمل تھے۔

اس کے باوجود یہ تینوں معانی ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہر سکتا ہے کہ آیت کے مفہوم میں تینوں جمع ہوں۔

”ما كانوا یعبدون“ مشرکین کے معبودوں کی طرف اشارہ ہے چاہے وہ بت اور شیاطین ہوں یا فرعون و منور جیسے ظالم و جاہل انسان ہوں اور ”ما كانوا یعبدون“ (وہ چیزیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے) کی تعبیر ہو سکتا ہے اس بنا پر کہ ان کے معبود زیادہ تر بے جان اور غیر ذوی العقول موجودات ہی تھے اور یہ تعبیر اصطلاح کے مطابق ”تغذیب“ کے لیے ہے۔

”جحیم“ دوزخ کے معنی ہیں ”جحیم“ (روزانہ منہ) کے مادہ سے آگ بھڑکنے کی شدت کے معنی سے لیا گیا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے: انھیں ”صراط جحیم“ کی طرف ہدایت کر دو کہ کتنی عجیب عبادت ہے؟ ایک دن انھیں ”صراط مستقیم“ کی ہدایت کی گئی۔ لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا تو آج ان کی صراط جحیم کی طرف راہنمائی ہو نا چاہیے اور وہ مجرموں کی طرح لے قبول کریں، یہ ایک ایسی گراں بار سزائیں ہے جو ان کی روح کی گہرائیوں کو جلا دے گی۔

۲۳- وَقَفُوهُمْ اَنْهُمْ مَسْئُولُونَ ۝

۲۴- مَا لَكُمْ لَا تَنْصُرُونَ ۝

۲۵- بَلْ هُمْ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ ۝

۲۶- وَاَقْبَلْ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ تَيْسًا لُّوٰنٌ ۝

۲۷- قَالُوْا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنا عَنِ الْيَمِيْنِ ۝

۲۸- قَالُوْا بَلْ لَمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝

۲۹- وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ۝

۳۰- فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا اِنَّآ لَذٰلِكَ قَوْمٌ ۝

۳۱- فَاَعْوَبْنٰكُمْ اِنَّآ كُنَّا غٰوِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۳- انھیں روکو، ان سے پوچھ گچھ ہوگی۔

۲۴- تم ایک دوسرے سے مدد طلب کیوں نہیں کرتے؟

۲۵- لیکن وہ تو اس دن خدا کی قدرت کے سامنے تسلیم خم کیے ہوں گے۔

۲۶- (اور اس حالت میں) ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔

۲۷- ایک گروہ کہے گا (اے ہمارے گمراہ پیشواؤ!) تم (ہمارے پاس) خیر خواہی اور نیکی کے بہانے سے آتے تھے (حالانکہ) کرو فریب کے سوا تمہارے پاس کچھ نہیں تھا)۔

۲۸- (وہ جواب میں) کہیں گے: تم خود ہی اہل ایمان نہیں تھے (ہمارا کیا قصور ہے)؟

۲۹- ہمارا تم پر کوئی اختیار نہ تھا بلکہ ”تم خود ہی سرکش قوم تھے“۔

۳۰- اب خدا کا فرمان ہم سب پر ستم ہو گیا ہے اب تو ہم سبھی اس کے عذاب کا مزہ چکھیں گے۔

۳۱- ہاں! ہم نے تمہیں گمراہ کیا ہے جیسا کہ ہم خود گمراہ تھے۔

تفسیر

دوزخ میں گمراہ پیشواؤں اور نیر و کاروں کی گفتگو

جیسا کہ ہم گزشتہ آیات میں جان چکے ہیں کہ عذاب کے فرشتے ظالموں اور ان کے ہم خیالوں کو جہنم کے مہموں کے ہمراہ لے چلا کریں گے اور انہیں جہنم کی راہ پر ڈال دیں گے۔ اس بات کو جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اس موقع پر خطاب ہوگا، ”انہیں روکو ابھی ان سے پوچھ لے کہ یہاں (دوقضوہم اشلہم مسئولون)۔

ہاں! انہیں رک کر مختلف سوالات کا جواب دینا ہے۔ لیکن ان سے کس چیز کے بارے میں سوال ہوگا؟

بعض نے تو کہا ہے کہ ان بدعتوں کے بارے میں جو انہوں نے قائم کی تھیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کے بُرے اعمال اور خطاؤں کے بارے میں۔ بعض نے مزید کہا ہے کہ توحید اور لا الہ الا اللہ کے بارے میں۔ بعض نے کہا ہے کہ جوانی، تندرستی، عمر، مال اور اسی قسم کی چیزوں کے بارے میں۔ ایک مشہور و معروف روایت میں جو سنی شیوخ طرق سے منقول ہے، یہ کہا گیا ہے کہ: علیؑ کی ولایت کے بارے میں سوال ہوگا۔

البتہ یہ تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ اس دن ہر چیز کے بارے میں سوال ہوگا عقائد، توحید، ولایت علیؑ گفتار و کردار اور ان نعمتوں کے بارے میں جو خدا نے انسان کو عطا فرمائی ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں پہلے دوزخ کی طرف کیوں چلتا کریں گے اور پھر انہیں پوچھ لے کے لیے کیوں مٹھرائیں گے؟ کیا باز پرس اس کام سے پہلے نہیں ہونی چاہیے؟ اس سوال کا دھڑلے سے جواب دیا جا سکتا ہے: پہلا یہ کہ اس گروہ کا جنہی ہونا تو سب پر واضح ہے یہاں تک کہ خود ان پر بھی۔ اور پوچھ لے گا اس بنا پر ہوگی تاکہ ان کے جرم کی

لے ”وقضوہم“ وقت کے علاوہ سے کبھی ہتھی نہیں سمجھا جاتا ہے (رک لینا اور بند کرنا) اور کبھی لازم کے معنی میں (رکن اور کھڑا ہونا) پہلے کا مصور ”وقت“ اور دوسرے کا ”وقف“ ہے۔

اس روایت کو ”مراحم“ میں ابو سعید خدری کے واسطے سے پیشوا کریمؑ سے اور اسی طرح حاکم ابوانعم کے معنی میں ”شواہد التنزیل“ میں آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے۔ میں اخبار الرضا میں بھی یہ روایت امام علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ سے نقل ہوئی ہے۔

کیفیت و کیفیت ان پر واضح کر دی جائے۔

دوسرا یہ کہ سوالات فیض اور انصاف کرنے کے لیے نہیں ہوں گے بلکہ یہ ایک طرح کی سرزنش اور روحانی سزا ہے۔ البتہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے، سوالات ان سے مربوط ہوں لیکن اگر وہ بعد والی آیت کے ساتھ مربوط ہوں کہ ان سے یہ سوال ہوگا ”تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ تو اس صورت میں اس آیت میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی لیکن یہ تفسیر ان متقدم روایات کے ساتھ جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں، ہم آہنگ نہیں ہے۔ مگر یہ کہ یہ سوال بھی ان جملہ سوالات کا ایک جزو ہو جن سے یہ عورت اختیار کرتا ہے (مذکورہ کیجیے گا)۔

بہر حال جس وقت یہ بے بس دوزخی جہنم کی راہ پر چلتے کیے جائیں گے ان کا ہاتھ ہر طرف سے بے بس ہو جائے گا، انہیں کہا جائے گا، دنیا میں تو تم مشکلات کے وقت ایک دوسرے کی پناہ دیتے تھے اور دوسرے سے مدد طلب کرتے تھے ”اب یہاں ایک دوسرے سے مدد کیوں نہیں مانگتے۔“ (مالکم لا تناصرون)۔

ہاں! تم دنیا میں جتنے سہارے اپنے لیے خیال کرتے تھے یہاں وہ سب ختم ہو گئے۔ تم ایک دوسرے سے مدد لے سکتے ہو نہ ہی تمہارے یہ مددگار مدد کو آسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ تو خود بے بس اور گرفتار ہوں گے۔

نحن جميع منتصر ہم سارے ایک دوسرے کی مدد سے مسلمانوں پر کامیاب ہوں گے۔ قرآن مجید نے اس کی گفتگو سورہ فرقہ کی آیت ۴۴ میں بیان کی ہے۔

ام یقولون نحن جميع منتصر لیکن قیامت میں ابوجہل اور اس کے ہم صفت لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ اب تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ لیکن ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوگا اور رسوا کن سکوت کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے۔

بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: بلکہ وہ تو اس دن خضوع و خشوع کے ساتھ تسلیم فرم کیے ہوں گے اور مخالفت تو کجا ان میں اظہار وجود کی بھی نکت نہ ہوگی (بل هم الیوم مستسلمون)۔

لے ”استسلام“، سلامت کے علاوہ سے باب ”استغفال“ کے تقاضے کے مطابق سلامتی طلب کرنے کے معنی میں ہے جو ہم طور پر ایک عظیم قدرت کے سامنے ہوتے وقت تسلیم فرم کی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس موقع پر وہ ایک دوسرے کو بڑا بھلا کہنا شروع کر دیں گے اور ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن میں ڈالنے کے لیے بے پروا ہو گا۔ پیروی کرنے والے، اپنے پیشواؤں اور سربراہوں کو قصور وار ٹھہرائیں گے اور پیشوا اپنے پیروکاروں کو مہیا کر کے دلی آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ ایک دوسرے کی طرف رخ کریں گے اور ایک دوسرے سے سوال کریں گے (و اقبل بعضهم علی بعض يتساءلون)۔

گمراہ پیروکار اپنے گمراہ کرنے والے پیشواؤں سے کہیں گے، تم شیطان صفت نصیحت، خیر خواہی اور بھروسے کے نام پر اور ہدایت و رہنمائی کے بہانے ہمارے پاس آتے تھے، لیکن تمہارے کام میں مکر و فریب کے سوا اور کچھ نہیں تھا (قالوا انکم کنتم تاوتلوننا عن الیحمین)۔

ہم تو فطرت کے تقاضے کے مطابق نبی، پاکیزگی اور سعادت کے طالب تھے لہذا ہم نے تمہاری دعوت پر لبیک کہا، ہمیں خبر نہ تھی کہ اس خیر خواہی کے چہرے کے پیچھے شیطان صفت چہرہ چھپا ہوا ہے، جو ہمیں بدبختی کے گڑھے میں گرا دے گا۔ ہاں! ہمارے مارے کے مارے گناہ تمہاری ہی گردن پر ہیں۔ ہمارا تو حسن نیت اور پاک دلی کے سوا کوئی جذبہ نہ تھا اور تم شیطان صفت جموں کے پاس بھی مکر و فریب کے سوا کچھ نہ تھا۔

”یحمین“ کا لفظ ہو دیا یا ہاتھ“ یا ”دائیں سمت“ کے معنی میں ہے، عربوں میں بعض اوقات خیر و برکت اور نصیحت کے لیے کنائے کے طور پر بولاجاتا ہے اور اصولی طور پر عربوں کو جو کچھ دائیں طرف سے آتا تھا اسے ”نیگ فال“ سمجھتے تھے۔ اسی لیے بہت سے مفسرین نے ”کنتم تاوتلوننا عن الیحمین“ کا معنی خیر خواہی اور نصیحت کا اظہار لیا ہے۔
بہر حال یہ ایک عمومی رواج ہے کہ دائیں عضو اور دائیں طرف کو محترم اور بائیں کو غیر محترم خیال کرتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ”یحمین“ نیکیوں اور خیرات کے معنی میں بولاجاتا ہے۔

کچھ مفسرین نے یہاں ایک دوسری تفسیر بھی بیان کی ہے، انھوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم طاقت اور اقتدار کے بل بوتے پر ہمارے پاس آتے تھے کیونکہ دائیں سمت عام طور پر زیادہ قوی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر لوگ اہم کام دائیں ہاتھ سے ہی انجام دیتے ہیں اس لیے یہ تعبیر ”طاقت“ کے لیے کنائے کے طور پر آئی ہے۔
دوسری تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں جو مذکورہ بالا دونوں تفسیروں کی طرف ہی مائل ہیں لیکن بلا شک و شبہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

بہر حال ان کے پیشوا بھی خاموش نہیں رہیں گے اور جواب میں کہیں گے تم تو خود ہی اہل ایمان نہیں تھے (قالوا بل لعمرتکونوا مؤمنین)۔

اگر تمہارا راج آمادہ انحراف نہ ہوتا، اگر تم خود ہی شر و شیطنت کے طالب نہ ہوتے تو ہمارے پاس کہاں آتے؟ تم نے انبیاء اور نیک بول لوگوں کی دعوت کو قبول کیوں نہ کیا؟ ہمارے ایک ہی اشارے پر تم سر کے بل کیوں دوڑ پڑے؟ پس معلوم ہوتا

کہ خود تمہیں میں عیب تھا۔ جاؤ اور خود اپنے آپ کو ملامت کرو اور جو من ظن کرنا چاہتے ہو خود کو کر دو۔ ہماری دلیل واضح ہے ”ہم کسی تم کا تسلط تم پر نہیں رکھتے اور ہم تم پر کوئی جبر اور زبردستی نہیں کی تھی (و ما کان علیکم من سلطان)۔

”بلکہ تم خود ہی ایک سرکش اور دوسرے بڑھنے والی قوم تھے اور تمہاری ستم گری کی عادت تمہاری بدبختی کا سبب بنی۔“ کنتم قومًا طاعینین)۔

کتنی دردناک ہے یہ بات کہ انسان یہ دیکھے کہ اس کا وہ روبرو پیشوا جس کا وہ ایک عزیز دل سے عقیدت مند رہا تھا، اس نے اس کی بدبختی کے اسباب فراہم کیے ہیں اس کے بعد اس طرح سے اس سے بیزاری اختیار کر رہا ہے اور تمام گناہ اس کی گردن پر ڈال رہا ہے اور خود کو بالکل بری الذمہ قرار دے رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ ایک جہت سے سچ کہہ رہے ہوں گے نہ تو یہ بے گناہ ہیں اور نہ ہی وہ، ان کی طرف سے گمراہ کرنا اور شیطنت تھی اور ان کی طرف سے گمراہی کو اپنانا اور تسلیم کرنا تھا۔

لہذا ان باتوں کا کوئی فائدہ نہ ہو گا اور آخر کار یہ پیشوا اس حقیقت کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے: ”اسی بنا پر ہمارے پروردگار فرمان ہم سب پر لاگو ہو گیا ہے اور عذاب کا حکم سبھی کے لیے صادر ہو گیا ہے اور ہم سب اس کے مناب کا فرہ چھیں۔“ (فحق علینا قول ربنا اننا لاذنقون)۔

تم سب کے سب سرکش تھے اور سرکشوں کا انجام یہی ہے اور بھی گمراہ اور گمراہ کرنے والے تھے۔

ہم نے تمہیں بھی گمراہ کیا ہے اور تم تو خود گمراہ تھے ہی“ (فاغوینا کم انا کتا غلویں)۔

اس بنا پر اس میں تعجب کی کون سی بات ہے کہ ہم سب کے سب ان مصیبتوں اور مناب میں شریک رہیں؟

چند اہم نکات

۱۔ ولایت علی کے بارے میں بھی سوال ہو گا؛ جیسا کہ ہم نے پہلے ہی اشارہ کیا ہے شیعوں اور اہل سنت کی کتابوں میں آئے ”وقفونہم اقلہم مشعلون“ کی تفسیر کے بارے میں ایسی متعدد روایات وارد ہوئی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس دن مجرموں سے جو سوال پوچھے جائیں گے ان میں سے ایک (اہم سوال) امیر المؤمنین علی علیہ السلام کو ولایت کے بارے میں ہو گا۔

شیخ طوسی اپنی کتاب ”امالی“ میں اس بن مالک کے واسطے سے پیغمبر گرامی اسلام سے نقل کرتے ہیں:-

اذا کان یوم القیامۃ ونصب الصراط علی جہنم لہ یجزع علیہ الامن معہ جواز فیہ ولایۃ علی بن ابی طالب وذلك قوله تعالی: وقفونہم

انہم مسئولون یعنی عن ولایۃ علی بن ابی طالب (ع)

جب روز قیامت ہوگا اور صراطِ جنم کے اوپر نصب کر دی جائے گی تو اس کے اوپر سے کوئی بھی عبور نہ کر سکے گا سوائے اس شخص کے جس کے ہاتھ میں ایسا پروانہ ہو کہ جس میں ولایتِ علیؑ ثبت ہو اور یہی وہ چیز ہے جس کے بارے میں فرمائی فرمایا ہے: وقفوہم انہم مسئولون^۱

اہل سنت کی بھی بہت سی کتابوں میں اس آیت کی یہ تفسیر موجود ہے کہ علی بن ابی طالب کی ولایت کے بارے میں سوال ہوگا ابن عباس اور ابو سعید خدری کے واسطے سے بغیر گرامی اسلام سے یہ روایت نقل ہوئی ہیں۔ اہل سنت کے جن حضرات نے اس حدیث کو نقل کیا ہے ان میں سے کچھ علماء یہ ہیں:-

ابن حجر عسقلانی، صواعق محرقہ میں۔ (ص ۱۳۷)

عبدالرزاق منبلی، کشف الغم، ص ۹۲ پر ان کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔

علاء سبط ابن جوزی، تذکرہ (ص ۲۱) میں۔

آلوسی روح المعانی میں، زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

ابو نعیم اصفہانی (کفایۃ الخصال ص ۳۶۰ کے مطابق) نے

البتہ جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے، اس قسم کی روایات آیت کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کرتیں بلکہ حقیقت میں آیات کے وضع مصداق کو بیان کرتی ہیں۔ اس بنا پر کوئی امر مانع نہیں ہے کہ سوال تو تمام عقائد کے بارے میں ہی ہو لیکن چونکہ عقائد کی بحث میں ولایت کا مسئلہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے لہذا اسے خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ولایت ایک عام دوسری یا شش اعتقاد کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد بغیر گرامی اسلام کے بعد اعتقادی، عملی، اخلاقی اور اجتماعی مسائل میں علیؑ علیہ السلام کی رہبری اور امامت کو قبول کرنا ہے۔ وہ مسائل جن کے نمونے مع ابلاغ کے صریح و بیخ غلطیوں اور آپ سے منقول کلمات و ارشادات میں بیان ہوئے ہیں۔ وہ ایسے مسائل ہیں جن پر ایمان لانا اور ان کے مطابق عمل کرنا، وہ ذمہ داریوں کی صف سے نکلنے اور پروردگار کی صراطِ مستقیم میں قرار پانے کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔

۲۔ گمراہ پیشوا اور پیروکار: ان آیات میں اور قرآن مجید کی دوسری آیات میں قیامت کے دن یا جنم میں گمراہ پیشواؤں اور پیروکاروں کے آپس میں جھگڑنے کے بارے میں کچھ معنی خیز اشارے کیے گئے ہیں۔

بیان تمام لوگوں کے لیے جو اپنی عقل اور دین کو گمراہیوں کے اختیار میں دے دیتے ہیں ایک سبق آموز تمبیہ ہے۔

۱۔ تفسیر نورالتقلین جلد ۳ ص ۴۰۱

۲۔ اس بارے میں مزید معلومات کے لیے، بہترین کتاب "حقائق الحق" جلد ۳ (طبع جدید) ص ۱۰۴ اور المرجعات ص ۵۸۰ درجہ ۱۲ کی طرف رجوع فرمائیں۔

اس دن اگرچہ ہر شخص ہی کو شش کرنے کا ذکر دوسرے سے برات کرے، یہاں تک کہ اپنا گناہ بھی دوسرے ہی کی گردن پر ڈال دے لیکن اس کے باوجود کوئی بھی اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکے گا۔

زیر بحث آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ گمراہ کرنے والے پیشوا اپنے تابعین کو صراحت کے ساتھ کہیں گے کہ تم پر جاسے اثر اصل سبب خود تمہاری سرکشی ہی تھی (بل کنتم قومًا طاعین)

اس سرکشی ہی نے ہماری طرف سے گمراہ کرنے کا میدان ہموار کیا اور اسی سے وہ انحرافات جنم میں پائے جاتے تھے تمہاری طرف منتقل کرنے پر ہم قادر ہوئے۔ (فاغوینا کہم انا کنا کتاغوا وین)

"اغوا" غی کے مادے سے ہے۔ اس کے دقین معنی پر غور کیا جائے تو مطلب اور بھی زیادہ واضح و روشن ہو جاتا ہے کیونکہ "غی" "مفردات" میں "رائب" کے قول کے مطابق اس جہالت کے معنی میں ہے، جس کا سرچشمہ فاسد عقیدہ ہو۔ یہ گمراہ پیشوا عالمِ ہستی اور زندگی کے حقائق سے بے خبر رہ گئے اور اس جہالت اور اعتقادِ فاسد کو اپنے ان پیروکاروں میں منتقل کر دیا جو فرمانِ خدا کے مقابل میں پہلے ہی سرکشی کیے ہوئے تھے۔

اسی بنا پر دناں یہ اعتراف کریں گے کہ وہ خود بھی مذاب کے مستحق ہیں اور ان کے پیروکار بھی (فحق علینا قول ربنا انا لذائقسون) لفظ "ذاب" کا خاص طور پر ذکر کرنا پڑ معنی ہے، یعنی انسان کا معاملہ اس حد تک پختہ جانے لگا کہ وہ خدا جل جلالہ کا مالک و مدنی ہے اور جو اس کی بھلائی اور نجات کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا، اسے اپنے دردناک مذاب کا مستحق قرار دے دیکھا اور یقیناً یہ بھی اس کی ربوبیت کی ایک شان ہے۔

۳۳۔ فَاتَّهَمَ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ۝

۳۴۔ اِنَّكَ كَذٰلِكَ تَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝

۳۵۔ اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

۳۶۔ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّا لَتَارِكُوْا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۝

۳۷۔ بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

۳۸۔ اِنَّكُمْ لَذٰلِقُوْا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ۝

۳۹۔ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

۴۰۔ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلِصِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۳۔ وہ سب کے سب (گمراہ پیشوا اور پیروکار) اس دن عذاب میں مشترک ہوں گے۔

۳۴۔ ہاں! ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں۔

۳۵۔ وہ ایسے تھے کہ جب ان سے ”لا الہ الا اللہ“ کہا جاتا تھا تو وہ تکبر کیا کرتے تھے۔

۳۶۔ اور ہمیشہ ہی کہتے تھے کہ: کیا ہم اپنے خداؤں کو ایک دیوانے شاعر کی خاطر چھوڑ دیں؟

۳۷۔ (جبکہ) ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ تو حق لے کر آیا ہے اور اس نے گوشتہ پیغمبروں کی تصدیق کی ہے۔

۳۸۔ لیکن تم (دل کے اندھے متکبر) یقینی طور پر (خدا کے) دردناک عذاب کا مزہ چکھو گے۔

۳۹۔ اور جو اعمال تم انجام دیا کرتے تھے بدلہ تو تمہیں صرف اسی کا ملے گا۔

۴۰۔ پروردگار کے مخلص بندوں کے سوا (جو اس تمام عذاب اور سزا سے محفوظ رہیں گے)۔

تفسیر

گمراہ پیشواؤں اور ان کے پیروکاروں کا انجام

قیامت کے دن جنم کے پاس گمراہ پیروکاروں اور پیشواؤں کے جھگڑا کرنے کے بیان کے بعد۔ اب زیر بحث آیات میں دوزخ گرد ہوں کا انجام ایک ہی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ نیز ان کی بدبختی کے عوامل کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ ان میں گمراہی کا بیان بھی ہے اور علاج کا ذکر بھی۔

پہلے فرمایا گیا ہے، وہ سب کے سب پیروکار اور پیشوا، اس دن عذاب الہی میں مشترک ہوں گے (فاتحہ یومئذ فی العذاب مشترکون)۔

البتہ ان کا عذاب میں مشترک ہونا، دوزخ اور عذاب الہی میں ان کے مختلف درجات میں مانع نہیں ہے۔ کیونکہ یقینی طور پر ایسا شخص جو ہزار ہا انسانوں کی گمراہی اور انحراف کا سبب بنا ہے ہرگز سزا اور عذاب میں ایک عام گمراہ فرد کے برابر نہیں ہوگا۔ یہ آیت حقیقت میں سورۃ مؤمن کی آیت ۴۸ کے مانند ہے کہ جس کے مطابق متکبرین کو درد عقیدہ لوگوں کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کے بعد کہیں گے:

قال الذین استکبروا انا کل فیہما ان اللّٰہ قد حکم بین العباد

اب تو ہم سب ہی دوزخ میں ہیں کیونکہ خدا نے اپنے بندوں کے درمیان عادلانہ فیصلہ کر دیا ہے۔

اور یہ آیات سورۃ عنکبوت کی آیت ۲۷ سے کوئی اختلاف نہیں رکھتی جس میں فرمایا گیا ہے:

ولیحملن اثقالہم واثقالہم مع اثقالہم

وہ قیامت کے دن اپنا سنگین بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوں گے اور ان کے اپنے سنگین

جو درد سروں کے بار کا بھی اضافہ ہوگا۔

جو درد سروں کو گمراہ کرنے اور گناہ کی طرف مائل کرنے اور بدعت کی بنیاد رکھنے کے نتیجے میں حاصل ہوا ہے۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے قرآن فرماتا ہے: ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں (اِنَّكَ كَذٰلِكَ تَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ)۔

یہ ہماری ہمیشہ کی سنت ہے، وہ سنت جو قانون عدالت سے پیدا ہوئی ہے۔

اس کے بعد ان کی بدبختی کی اصل بنیاد کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے، وہ ایسے تھے کہ جب کلمہ توحید اور لا الہ الا اللہ ان سے کہا جاتا تھا تو وہ تکبر و استغبار کرتے تھے (اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ)۔

ہاں! ان کے تمام اختلافات کی اصل بڑی بنیاد، بجز اور خود کو برتر سمجھنا، حق کو قبول نہ کرنا، غلط نظریوں اور باطل کی پیروی پر اصرار اور مہذب دھرمی کرنا اور اس کے علاوہ تمام چیزوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا تھا۔

روح استکبار کا مذہب انہی کے سامنے اٹھاری اور تسلیم خم کرنا ہی ہے اور حقیقتاً اسلام ہی ہے اور ہیں۔ وہ استکبار پر سختی کا باعث ہے اور یہ ضحویہ و تسلیم، سعادت کا موجب ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات میں، عذاب الہی استکبار کے ساتھ مربوط بیان ہوا ہے، جیسا کہ سورہ اختلاف کی آیت ۲۰ میں ہے :-

فالیوم تجزون عذاب الہون بما کنتم تستکبرون فی الارض بغیر الحق
آج کے دن ذلیل کرنے والا عذاب تمہاری جزا ہے، کیونکہ تم زمین میں ناحق استکبار کیا کرتے تھے۔

جبکہ وہ اپنے اس عظیم گناہ کے لیے بدتر از گناہ عذر پیش کیا کرتے تھے اور ہمیشہ یہی کہتے تھے: کیا ہم اپنے خداؤں اور بتوں کو ایک دیوانے شاعر کے لیے چھوڑ دیں؟ (و یقولون امثالنا رکو الہتنا لثنا عرو مجنون)۔

وہ رسول اللہ کو اس لیے شاعر کہتے تھے کہ آپ کی باتیں اس طرح دلوں پر اثر کرتی تھیں اور انسانوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں کہ جیسے آپ بہترین اشعار پڑھ رہے ہوں۔ حالانکہ آپ کی باتیں بالکل شعر نہیں تھیں اور انہیں مجنون اس لیے کہتے تھے کہ آپ ماحول کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے تھے اور وہ مہذب دھرم متعصب لوگوں کے یہودہ عقائد کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ ایسا کام تھا جو گمراہ عوام کی نگاہ میں ایک قسم کی جنون آمیز خود کشی تھی۔ حالانکہ پیغمبر کا عظیم انتہائی ہی ہے کہ آپ ان حالات کے سامنے نہیں جھکے۔

اس کے بعد قرآن ان بے بنیاد باتوں کی نفی کرنے اور پیغمبر اکرم کی رسالت اور مقام وحی کا دفاع کرنے کے لیے مزید کہتا ہے، ایسا نہیں ہے وہ تو حق ہے اور اس نے گزشتہ پیغمبروں کی تصدیق کی ہے۔ (بل جاء بالحق و صدق المرسلین)۔

ایک طرف تو اس کی گفتگو کے مطالب اور دوسری طرف اس کی انبیاء کی دعوت کے ساتھ ہم آہنگی اس کی گفتگو کی صداقت کی دلیل ہے۔

لیکن اسے دل کے اندر سے مستحکم اور بد زبان مگر اہم! تم یقینی طور پر خدا کا دردناک عذاب چھو گے (انکم لذائقوا العذاب الالیم)

لیکن کہیں یہ گمان نہ کر لینا کہ خدا بھی انتقام بخوبی اور وہ تم سے اپنے پیغمبر کا انتقام لینا چاہتا ہے ایسا نہیں ہے، بلکہ جو تمہارا انتقام دیا کرتے تھے، بلکہ تو تمہیں صرف اسی کاٹے گا (و ما تجزون الا ما کنتم تعملون)۔

حقیقت میں وہ تمہارے اعمال ہی ہوں گے جو تمہارے سامنے مجسم ہو جائیں گے اور تمہارے ساتھ رہیں گے۔ اور تمہیں آزار پہناتے ہو گے۔ تمہارا عمل ہی تمہاری سزا ہے، وہی استکبار و کفر و بے ایمانی، وہی آیات الہی اور اس کے پیغمبر پر شاعری اور جنون کی شہادت دینا، وہی ظلم و زیادتی، یہ انصاف اور پرسہ کام۔

آخری ذریعہ بحث آیت میں آئندہ کے مباحث کے لیے ایک مقدمہ اور تہیہ ہے۔ اس میں ایک گروہ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، ہر دور کار کے مخلص بندوں کے سوا، جو اس تمام تر سزا و عذاب سے (اور محفوظ رہیں گے) (الاعباد اللہ المخلصین)۔ لفظ "عباد اللہ" ایسا ہی اس گروہ کے خدا سے ربط کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن جب "مخلصین" بھی اس کے ساتھ ہو تو اس میں ایک اور ہی گمراہی اور جان ڈال دیتا ہے۔ وہ لفظ "مخلص" اسم مفعول کی صورت میں، وہ شخص جسے خدا نے خاص کر ہے۔ ہر قسم کے شرک دیا سے خاص، اور ہر قسم کے شیطانی دوسروں اور ہوائے نفس کی ملاوٹوں سے خاص۔

ہاں! صرف ہی گروہ ہے کہ جسے اس کے اعمال کی ہی جزا نہیں ملے گی بلکہ خدا اس سے اپنے فضل و کرم کے ساتھ پیش آئے گا۔ وہ بے حجاب اجر حاصل کریں گے۔

مخلصین کا اجر و ثواب

قرآن کریم کی آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "مخلص" زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوا ہے، جب انسان تربیت یافتہ اور خود سازی کے مرحلوں میں ہوتا ہے اور اسی ضروری تکامل و ارتقاء کی منزل تک پہنچا ہوا نہیں ہوتا۔ لیکن "مخلص" اس کے لیے کہا جاتا ہے، جب انسان ایک مدت تک جہاد بالنفس کرنے اور معرفت و ایمان کے مراحل طے کرنے کے بعد اس پر فائز ہو جاتا ہے جہاں شیطان کے دوسروں کے اثر سے محفوظ ہو جاتا ہے جیسا کہ قرآن الہی کے قول کو نقل کرتا ہے۔

فیغن تک لاغویہم اجمعین الاعبادک منهم المخلصین
تیری عزت کی تم! تیرے مخلص بندوں کے سوا۔ میں ان سب کو گمراہ کروں گا (ص ۸۴، ۸۵)
یہ جملہ جہاد یا قرآن کی آیات میں آیا ہے "مخلصین" کے مقام کی عظمت کو واضح کرتا ہے۔ یہ یوسف جیسے صدیق افراد کا مقام ہے۔ عظیم آزمائش کے میدان کو عبور کرتے ہیں :-

کذلک لنصرف عنہ السوء والفحشاء انہ من عبادنا المخلصین
ہم نے یوسف کو اس طرح سے اپنی برائی دکھائی تاکہ برائی اور بدی کو ہم اس سے دور کریں،

یہ جملہ استثناء منقطع کی شکل میں ہے جو "مجنون" کی منبر یا "لذا نقوا" کی منبر سے استثناء ہے۔

کیونکہ وہ ہمارے غلص بندوں میں سے تھا (یوسف - ۲۳)

یہ ان لوگوں کا مقام ہے جو جہادِ اگیش کا میاب ہو جاتے ہیں اور لطفِ پروردگار کا ہاتھ، تمام غیر خاص باتوں کو ان سے پاک کر دیتا ہے اور حوادث کی کبھی میں وہ اس طرح سے پھیل جاتے ہیں کہ معرفتِ خاص کے سونے کے سوا ان میں کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ان کا اجر عمل کے معیار پر نہیں ہوتا بلکہ خدا کے فضل و رحمت کے معیار پر ہوتا ہے۔ علامہ بلطانی نے اس مقام پر ایک بات کہی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

خدا زیر بحث آیت میں فرماتا ہے تمام لوگ اپنے اعمال کا اجر پائیں گے، خدا کے غلص بندوں کے سوا۔ کیونکہ وہ اپنی عبودیت کی بنا پر خود کو کسی چیز کا مالک نہیں سمجھتے اور جو کچھ خدا چاہتا ہے اس کے سوا کسی اور چیز کا ارادہ نہیں اور جس چیز کا وہ مطالبہ کرتا ہے اس کے سوا کسی اور چیز کو انجام نہیں دیتے۔ غلص ہونے کی بنا پر خدا نے انہیں اپنے لیے منتخب کر لیا ہے۔ وہ اس کی پاک ذات کے سوا کسی اور چیز کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے ان کے دل میں اللہ کے سوا کوئی چیز نہیں ہے، نہ زرق و برق دنیا ہے اور نہ ہی آخرت کی نعمتوں کا خیال۔ اب یہ بات واضح ہے کہ جو شخص ان صفات کا مال ہے اس کی لذت و نعمت اور روزی ایسی چیز ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہے۔ جیسا کہ بعد والی آیات میں بیان ہوا ہے:-

اولئک لہم رزق معلوم

ان کی روزی ایسی خاص اور مخصوص ہے کہ جو دوسروں سے جدا ہے۔

یہ بیٹیک ہے کہ وہ بھی دوسرے اہل بہشت کی طرح بہشت میں زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ان کا حصہ دوسروں کے حصے کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتا۔ (وہ خدا کی پاک ذات کے جلووں سے باطنی لذت سے محظوظ ہوتے ہیں اور ان کا دل اس کے ہماؤ شوق سے لبریز ہوتا ہے اور وہ اس کے عشق و وصال میں غرق ہوتے ہیں) علیہ

۱- اُولَئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ۝

۲- فَوَالِکَ وَهُمْ مُکْرَمُونَ ۝

۳- فِی جَنَّتِ النَّعِیْمِ ۝

۴- عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ ۝

۵- یُطَافُ عَلَیْہُمْ بِکَاسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ ۝

۶- بَیضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّرِبِیْنَ ۝

۷- لَا فِیْہَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْہَا یَنْزِفُونَ ۝

۸- وَعِنْدَہُمْ قُصْرٰتُ الظَّرْفِ عِیْنٍ ۝

۹- کَاثَمٰتٍ بَیضٌ مَّکْنُونٌ ۝

ترجمہ

۱- ان (مخلص بندوں) کے لیے ایک خاص اور معین روزی ہے۔

۲- (قسم قسم کے عمدہ عمدہ) پھل اور وہ معزز و محترم ہوں گے۔

۳- (بہشت کے) پُر نعمت باغوں میں۔

۴- تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے (بیٹھے ہوں گے)۔

۵- ان کے گرد شرابِ طہور سے لبریز پیالوں کا دور ہوگا۔

۶- وہ شراب جو سفید چمکدار اور پینے والوں کے لیے لذت بخش ہوگی۔

۷- وہ شراب جس میں نہ عقل کو فاسد کرنے والی کوئی چیز ہوگی اور نہ ہی وہ مست کرنے والی ہوگی۔

۸- ان کی ایسی بیویاں ہوں گی جو اپنے شوہر کے سوا کسی اور سے عشق و محبت نہ کریں گی۔ ان کی آنکھیں

بڑی بڑی (اور سین) ہوں گی۔

۴۹۔ گویا وہ (لطافت اور سفیدی میں) پرندے کے ان انڈوں کے مانند ہیں (جو پرندے کے پروال کے نیچے) چھپے رہے ہوں۔ (اور کسی انسان کے ہاتھ نے انھیں چھوا تک نہ ہو)۔

تفسیر

بہشت کی نعمتوں کا ایک گوشہ

گزشتہ بحث کی آخری آیت میں "عباد اللہ المخلصین" کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ زیر بحث آیات ان بے شمار نعمتوں کو بیان کر رہی ہیں جو خدا ان کو عطا فرمائے گا۔ ان نعمتوں کا نام حصوں میں خواص کیا جاسکتا ہے۔ پہلے قرآن کہتا ہے: ان کے لیے معلوم و معین روزی ہے (اولئک لہم روزق معلوم)۔ کیا یہ انھی نعمتوں کا خواص ہے جنکی بعد والی آیات میں تشریح ہوئی ہے اور وہ انھی نعمتوں کو بیان کر رہی ہیں جو یہاں سرسبتہ اور اجمالی طور پر بیان ہوئی ہیں؟ یا یہ ان نامعلوم اور ناقابل توصیف نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو نعمات بہشت کا سرنامہ بن گئی ہیں؟ بعض مفسرین نے اس کی پہلی صورت میں تفسیر کی ہے جب کہ بعض دوسروں نے اس کی دوسری صورت میں تفسیر کی ہے۔

بحث کی مناسبت اور نعمتوں کی جامعیت دوسرے معنی کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اس طرح سے ان سات نعمتوں میں سے سب سے پہلے زیر بحث آیات میں بیان ہونے والی نعمتیں۔ معنوی نعمتیں، روحانی لذتیں اور حق تعالیٰ کی ذات پاک کے جلوں کا دیدار اور اس کے مشق کے باہر ظہور سے سرمست ہونا ہے۔ وہی لذت جسے دیکھے بغیر کوئی نہیں جانتا۔ رہی یہ بات کہ قرآن کی آیات میں جنت کی نعمات تو تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، لیکن معنوی نعمتوں اور روحانی لذتوں کا بیان سرسبتہ اور اجمالی صورت میں کیا گیا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی نعمات تو قابل توصیف و تعریف ہیں، جبکہ دوسری تعریف و توصیف میں نہیں آسکتیں۔

"روزق معلوم" کے معنی کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ کیا اس کا وقت معلوم ہے؟ کیا وہ باقی اور ہمیشہ رہنے والی ہیں؟ کیا اس کی تمام خصوصیات معلوم ہیں؟ اس ضمن میں ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں اس کی بنا پر کلمہ "معلوم" ایک سرسبتہ تعبیر ہے ان نعمات کی جن کی تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد دوسری نعمتوں کا بیان شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے قرآن بہشت کی نعمتوں کا نام لیتا ہے۔ نعمتیں بھی ایسی جو بہشتیوں کو انتہائی احترام کے ساتھ دی جائیں گی، فرماتا ہے: ان کے لیے طرح طرح کے پھل ہیں (فواکھ)۔

اور وہ محرم و محترم ہیں (وہم مکرمون)۔

ان حیوانوں کی طرح نہیں جن کے سامنے ان کا چارہ ڈال دیا جاتا ہے، بلکہ معزز مہمانوں کی طرح انتہائی احترام کے ساتھ ان کی پذیرائی ہوگی۔

طرح طرح کے پھلوں کی نعمت اور احترام و اکرام کے بیان کے بعد، ان کی رہائش گاہ کا ذکر ہوتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ان کے ٹھکانے کی جگہ بہشت کے سرسبز اور پر نعمت باغات ہیں (فی جنت النعیم)۔

جو نعمت بھی وہ چاہیں گے وہاں موجود ہے اور جو کچھ وہ ارادہ کریں گے ان کے سامنے حاضر ہے۔

چونکہ انسان کے لیے عظیم ترین لذتوں میں سے ایک بے تکلف، مخلص و باصفا دوستوں کی محبت بھری محفل ہے لہذا جو محفل مرحلے میں اس نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، جنتوں کے اوپر آئے سامنے بیٹھے ہوں گے اور انھوں سے انھیں ملی ہوئی ہوں گی (علیٰ سرور متقابلین)۔

وہ ہر مہضوہ پر بات کریں گے۔ کبھی دنیا میں اپنے مافی کے بارے میں اور کبھی آخرت میں پروردگار کی عظیم نعمتوں کے متعلق، کبھی خدا کے صفات، جمال و جلال کی بات کریں گے اور کبھی اولیاء کے مقامات اور ان کی کرامات کی اور دوسرے لیے مسائل کے بارے میں جن سے ہم اس دنیا کے قیدیوں کے لیے آگاہی ممکن نہیں ہے۔

"سرسر" "سرسیر" کی جمع ہے یہ لیے نعمتوں کو کہا جاتا ہے جن پر مجلس سرور و انس میں بیٹھا کرتے تھے۔ بعض اوقات زیادہ وسیع معنی میں بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی میت کے تابوت کو بھی "سرسیر" کہہ دیا جاتا ہے۔ شاید اس امید پر کہ وہ اس کے لیے ہلاک و منفرت اور بہشت جاؤں کی طرف جانے کے لیے، سرور و خوشی کی سواری بن جائے۔

نعمات جنت کے ذکر کے پانچویں مرحلے میں مشروبات اور شراب طہور کی بات ہو رہی ہے، فرمایا گیا ہے: شراب طہور کے لبریز ہونے ان کے گرد گھوم رہے ہیں اور جب بھی وہ ارادہ کرتے ہیں، پیمانے سے سیراب ہوتے ہیں اور نشاط و معنویت کے عالم میں ڈوب جاتے ہیں (یطاف علیہم بکأس من معین)۔

یہ جام کسی گوشے میں پڑے ہوئے نہیں ہوں گے کہ وہ ان میں سے ایک جام کا تقاضا بلکہ "یطاف علیہم" کی تعبیر کے مطابق، ان کے گرد گھومتے جا رہے ہوں گے۔

"کأس" (بروزن راس) اہل لغت کے نزدیک اس ظرف کو کہا جاتا ہے جو پڑا اور لبریز ہو اور اگر وہ خالی ہو تو عام طور پر اسے "قدح" کہتے ہیں۔ راغب مفردات میں کہتا ہے:

الكأس الاثناء بما فيه من الشراب

کاس اس ظرف کو کہتے ہیں جو کسی پینے کی چیز سے بھرا ہوا ہو۔

"معین" "معن" (بروزن صمن) کے مادہ سے، جاری کے معنی میں ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں

شرابِ طہور کے چٹے ہماری ہیں۔ جن سے ہر لمحہ پائے صبر سکتے ہیں اور اہل بہشت کے گروہ دار مغنیں گردش دی جائے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ شرابِ طہور ختم ہو جائے یا اسے نیتا کرنے کے لیے زحمت اٹھانا پڑے یا وہ پرانی، خراب اور نامد ہو جائے۔

اس کے بعد اس شرابِ طہور کے برتنوں کی تعریف کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، وہ سفید چمک دار ہیں اور پیئے والوں کے لیے لذت بخش ہیں۔ (بعضاء لذة للشاربین)۔

بعض مفسرین نے "بعضاء" کو اس شراب کے "ظروف" کی صفت قرار دیا ہے اور بعض نے خود "شرابِ طہور" کی صفت کہا ہے یعنی یہ شراب وینا کی خوش رنگ شرابوں کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی شراب ہے جو پاک ہے اور شیطانی رنگوں سے پاک سفید و شفاف ہے۔
البتہ و دراصل معنی "لذۃ للشاربین" کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

چونکہ شرابِ پیمانہ اور اس قسم کی چیزوں کا نام ممکن ہے کچھ اور مفہیم کو ذہنوں کی طرف دعوت دے اس لیے بعد والی آیت میں بلافاصلہ ایک مختصر اور واضح جملے کے ساتھ ان تمام مفہیم کو سننے والوں کے اذنان سے ہٹاتے ہوئے قرآن کہتا ہے، وہ شرابِ طہور نہ تو فسادِ عقل کا سبب ہے اور نہ ہی مستی کا موجب (لا فیہا عول و لا ہم عنہا یسرفون)۔
اس میں بوشیاری و نشاط اور لذتِ روحانی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

"عول" (بروزن) "قول" اصل میں اس فساد کے معنی میں ہے جو پنہاں طور پر کسی چیز میں اُتر جائے اور یہ جو عربی لہجہ میں معنی اور پوشیدہ مقل کو "غیلۃ" کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی لحاظ سے ہے۔

"یسرفون" اصل میں "سرف" (بروزن "سرف") کے مادہ سے، کسی چیز کو تدریجی صورت میں ختم کرنے کے معنی میں ہے یہ لفظ جس وقت کنوئیش کے پانی کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ پانی کو تدریجاً کنوئیش سے نکالیں یہاں تک کہ وہ ختم ہو جائے۔ تدریجی طور پر خون نکلنے کے موقع پر بھی جو بدن کے ماسے خون کے گرانے پر ختم ہو "سرف" الدم" کی تفسیر استعمال ہوتی ہے۔

بہر حال زیر بحث آیت میں اس سے مراد عقل کا تدریجاً ختم ہونا اور سکرات کی حد تک پہنچ جانا ہے، جو جنت کی شرابِ طہور میں مطلقاً موجود نہیں ہے۔ اس سے عقل میں کمی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی خرابی پیدا کرتی ہے۔

یہ دونوں تفسیریں ضمنی طور پر، دنیا کی شرابوں اور موادِ الکحل کے بارے میں، بہت ہی عمدہ اور دقیق بیان ہے کہ وہ ضمنی طور پر تدریجی صورت میں انسان کے وجود میں اثر کرتی ہیں اور برائی اور خرابی پیدا کرتی ہیں، و صرف عقل اور ماسے اعصاب کو تباہ و برباد کرتی ہیں بلکہ انسان کے بدن کی تمام مشینری کو دل سے لے کر رگوں تک اور معدے سے لے کر جگر اور گردوں تک ایک ناقابلِ انکار تخریبی اور تباہ کن تاثیر رکھتی ہیں۔ گویا انسان کو اندر ہی اندر خراب کر کے تباہ کر دیتی ہیں۔

اس کے علاوہ شرابِ دنیا انسان کے عقل و ہوش کو کنوئیش کے پانی کی طرح تدریجاً کھینچتی ہے تاکہ اسے خشک اور

خالی کر دے۔

لیکن خدائی شرابِ طہور قیامت میں، ان تمام صفات سے پاک ہے بلکہ

آخر کار قرآن چمٹے مرسلے میں جنت کی پاک و پاکیزہ بیویوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ان کے پاس ایسی بیویاں ہوں گی جو اپنے شوہروں کے سوا کسی اور سے جنت نہیں کریں، ان کے غیر کو نگاہ تک اٹھا کر نہیں دیکھیں اور ان کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت ہیں (و عندہم قاصرات الطرف عین)۔

"طرف" اصل میں آنکھوں کی پلکوں کے معنی میں ہے اور چونکہ دیکھتے وقت پلکیں حرکت کرتی ہیں لہذا یہ لفظ دیکھنے کے لیے کنایہ ہے اس بنا پر "قاصرات الطرف" کی تفسیر ان عورتوں کے معنی میں ہے جو نظریں بچی رکھتی ہیں۔ اس کی تفسیر میں کئی ایک استہلال ذکر کیے گئے ہیں جو علیحدہ علیحدہ ہونے کے باوجود سب ملو سکتے ہیں۔

پہلی تفسیر یہ ہے کہ وہ صرف اپنے شوہروں کی طرف ہی دیکھتی ہیں اپنی آنکھوں کو ہر طرف سے چلا کر انہیں کو دیکھتی رہتی ہیں دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ تفسیر اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ وہ صرف اپنے شوہروں سے محبت کرتی ہیں اور ان کی محبت کے علاوہ ان کے دل میں کسی دوسرے کی محبت نہیں ہے یہ امر ایک بیوی کے لیے عظیم ترین امتیاز ہے کہ وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی کو اپنے وہم و خیال میں بھی نہ لائے اور اس کے علاوہ کسی اور سے اسے پیار نہ ہو۔

ایک اور تفسیر یہ ہے کہ ان کی آنکھیں غار آلود ہیں، وہی خاص حالت جو شعرا کے اکثر اشعار میں آنکھ کی ایک خوبصورت توصیف کے طور پر بیان ہوئی ہے مثلاً

البتہ پہلا اور دوسرا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اگرچہ ان معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

لفظ "عین" ("بروزن" میں) جمع ہے "عیناء" کی جو بڑی آنکھ والی عورت کے معنی میں ہے۔

آخر میں آخری زیر بحث آیت، ان بنتی بیویوں کی ایک اور صفت کو بیان کرتے ہوئے ان کی پاکیزگی کو اس عبارت کیساتھ

ملہ "فیہا" اور "عینا" کی تفسیر "خمر" کی طرف لٹتی ہیں، جو کلام میں مذکور نہیں ہے لیکن بیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ لفظ "خمر" مؤنث مذکر ہے اور "عینا" میں "عین" کی صلت کو بیان کرنے کیلئے ہے یعنی وہ اس "ظرف" کی وجہ سے مست اور مہر و عقل و ہوش میں ہوں گے یہ بات عربی میں رہے کہ لفظ "خمر" ایک شکر لفظ ہے جو کبھی تو منہ اگیلا و عقل کو تباہ کرنے والی شراب کے لیے بولا جاتا ہے، مثلاً۔

انصا التمر و العیسو..... (ماتدہ ۹۰)

اور بھی شرابِ طہور پر جو ملا کے غصے بندوں کا جھڑبہ مثلاً

وانظار من خمر لذۃ للشاربین (محمد، ۱۵)

جو جنت کی تعریف میں آئی ہے۔

ع "روح المعانی" جلد ۲۲ ص ۸۱

بیان کرتی ہے: ان کا بدن ہمدت زیادہ پائیزگی، مومگی، سفیدی اور صفائی میں پرندے کے ان انڈوں کی طرح ہے کہ جسے دانسانی ہاتھ نہ چھوا اور نہ ہی اس پر گرد و غبار پڑا ہو، بلکہ وہ پرندے کے پر وال کے نیچے پوشیدہ رہے جن (کا نہنگ بعض ممکنوں)۔
”بعض“ جمع ہے ”بیضہ“ کی جو پرندے کے انڈے کے معنی میں ہے (ہر قسم کا پرندہ) اور ”مکنوں“ کن کن ”پرندوں جن (پوشیدہ اور چھپے ہوئے کے معنی میں ہے۔

قرآن کی تشبیہ اس وقت ٹھیک طرح سے واضح ہوگی جب انسان ان لمحت میں، جب انڈہ پرندے سے جدا ہو اور بھی انسانی ہاتھ لے نہ لگا ہو اور وہ بھی پرندے کے پروں کے نیچے ہی پڑا ہو اسے نزدیک سے دیکھے کہ وہ کیسی عجیب شانیت مغائی رکھتا ہے۔
بعض مفسرین نے ”مکنوں“ کو پرندے کے انڈے کے اندر موجود مواد کے معنی میں لیا ہے جو اس کے چھلکے کے اندر چھپا ہوا ہے اور حقیقتاً مذکورہ تشبیہ اس موقع کی طرف اشارہ ہے جب انڈے کو پکا کر اس کا چھلکا ایک ہی ساتھ جدا کر دیا جائے تو اس حالت میں سفیدی اور چمک کے علاوہ ایک خاص نرمی اور لطافت بھی اس میں ہوتی ہے۔ ہر حال قرآن کی تفسیرات مختلف بیان کرنے میں اس قدر دقیق، گہری اور معنی خیز ہیں کہ ایک مختصر سی تعبیر کے ساتھ بہت سے مطالب کو ایک لطیف انداز میں پیش کر دیتی ہیں۔

نکتہ: گزشتہ آیات پر ایک نظر

اہل بہشت کے لیے جو طرح طرح کی نعمتیں گزشتہ آیات میں بیان ہوئی ہیں وہ مادی و روحانی نعمتوں کا مجموعہ ہیں اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ پہلی نعمت جو ”اولئک لہم درزق معلوم“ کے سربتہ جملہ سے معلوم ہوتی ہے وہ معنوی و روحانی نعمتوں کے ساتھ مربوط ہے جس کی کسی زبان میں بھی تشریح نہیں کی جاسکتی۔

لیکن پھر دوسرے حصے جو جنت کے کھیل، شراب، طور و خوبصورت بیویاں، بہت احترام، پائیزگی اور لائق بہشتی ہیں، جنت کی نعمتوں کے مختلف جہات کو واضح کرتے ہیں جو غالباً مادی و روحانی نعمتوں کا ایک امتزاج ہے۔

لیکن یہ سب کی سب ایسی باتیں ہیں جو ہماری زبان میں پیش کی گئی ہیں اور یہ جنت کی نعمتوں کی تمام خصوصیات کو عکس نہیں کر سکتیں اصولی طور پر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کے لیے ایک دوسری زبان، دوسرے کان دوسرے ادراک اور دوسری نظر کی ضرورت ہے اور اس کے لیے دوسرے ہی الفاظ، جملہ بندیاں اور گفتگو درکار ہے تاکہ اس حقیقت کو تفصیل کے ساتھ بیان کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں جنت کی نعمتوں کی اصل حقیقت دنیا والوں سے وہاں جا کر انہیں دیکھے اور حاصل کیے بغیر پوشیدہ ہے۔

ہر حال ”مخلص بندے“ اور وہ لوگ جو علم و ایمان میں کمال کے مرتب تک پہنچے ہوئے ہیں، بارگاہِ خداوندی میں اس قدر عزیز ہیں کہ ان کے لیے خدا کے الطاف بے کراں کی توصیف ہو ہی نہیں سکتی اور ہم جتنا بھی سوچیں اور تصور میں لائیں وہ اس سے بڑھتا ہوا ہے۔

۵۰۔ فَاقْبَلْ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝

۵۱۔ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۝

۵۲۔ يَقُولُ أَفَتَكَلَّمُونَ ۝

۵۳۔ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَأَنْتَا الْمَدِينُونَ ۝

۵۴۔ قَالَ هَلْ أَنْتُمْ مُّطَّلِعُونَ ۝

۵۵۔ فَاطَّلَعَ فَرَآهُ فِي سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝

۵۶۔ قَالَ تَاللَّهِ إِنْ كِدَتْ لَتُرْدِينَ ۝

۵۷۔ وَلَوْ لَا نِعْمَةٌ رَبِّي لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ۝

۵۸۔ أَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِينَ ۝

۵۹۔ إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝

۶۰۔ إِنَّ هَذَا لَهَوٌ نَّوْزُ الْعَظِيمِ ۝

۶۱۔ لِمِثْلِ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ ۝

ترجمہ

۵۰۔ (اس حال میں جبکہ وہ اپنی باتوں میں مگن ہوں گے تو) بعض لوگ دوسرے بعض لوگوں کی طرف رخ کر کے سوال کریں گے.....

۵۱۔ ان میں سے ایک کہے گا: میرا ایک ساتھی تھا۔

۵۲۔ جو ہمیشہ یہ کہتا تھا: کیا (پچ مچ) تو نے بھی بات کو مان لیا ہے؟.....

۵۳۔ کہ جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو (دوبارہ) زندہ کیے جائیں گے اور ہمیں

جزا و سزا دی جائے گی؟

۵۳۔ (اس کے بعد) کہے گا: کیا تم اس کی کوئی خبر لا سکتے ہو؟

۵۵۔ اس موقع پر وہ تلاش کرنے لگے گا اور ادھر ادھر نظر دوڑائے گا تو اچانک اسے جہنم کے وسط میں دیکھے گا۔

۵۶۔ اسے دیکھ کر وہ کہے گا: خدا کی قسم کوئی کسرباقی نہیں رہ گئی مٹی کہ توجھے بھی جہنم کی طرف کچنچ لے جائے۔

۵۷۔ اور اگر میرے پروردگار کی نعمت اور احسان نہ ہوتا تو میں بھی جہنم میں حاضر کیے جانے والوں میں سے ہوتا۔

۵۸۔ (لے دوستو!) کیا ہم اب کبھی نہیں مریں گے (اور دائمی جنت میں رہیں گے)؟

۵۹۔ اور اس پہلی موت کے سوا اب اور کوئی موت ہمارے پاس نہیں آئے گی اور میں کبھی سزا نہیں دی جائے گی (خدا کی یہ میرے لیے سی نعمت ہے)

۶۰۔ پچ پچ یہ تو بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔

۶۱۔ ہاں! کوشش کرنے والوں کو ایسی جزا کے لیے کوشش اور عمل کرنا چاہیے۔

تفسیر جہنمی دوست کی تلاش

گوشتہ آیات میں پروردگار کے متعلق بندوں کا ذکر تھا جو جنت کی طرح طرح کی نعمتوں میں مفرق ہوں گے انہیں قسم قسم سے پہل میسر ہوں گے، جنت کی حوریں ان کی خدمت میں ہوں گی۔ شراب طہر کے جام ان کے گرد گردش میں ہوں گے اور وہ جنت کے تختوں پر بٹیکے لگائے ہوئے باصفا دوستوں کے ساتھ رازدنیازی باتوں میں مشغول ہوں گے ایسے میں اچانک ان میں سے بعض اپنے ماضی اور دنیا کے دوستوں کی سوچ میں پڑ جائیں گے وہی دوست جنہوں نے اپنی راہ الگ کر لی تھی اور جنت میں جن کی جگہ خالی پڑی ہوگی وہ ان کا انجام جاننے کی کوشش کریں گے۔

ہاں! اس وقت جبکہ وہ گفتگو میں محو ہوں گے اور مختلف موضوعات پر بات کر رہے ہوں گے اور بعض دوسرے بعض کی طرف رخ کر کے سوال کر رہے ہوں گے اور ان کے جواب سن رہے ہوں گے (فابقبل بعضہم علی بعض یتساءلون)۔

اچانک ان میں سے ایک کو کچھ باتیں یاد آئیں گی، وہ دوسروں کی طرف منہ کر کے کہے گا: دنیا میں میرا ایک دوست اور ہمیشہ عار قال قائل منہم اتی کان لی قرین)۔

لیکن انہوں نے انہوں کی راہ پر چل پڑا اور منکرین قیمت کے ساتھ ہو گیا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے کہا کرتا تھا: کیا پچ پچ تو نے بھی اس بات کو یاد کر لیا ہے اور تو بھی اس کی تصدیق کرتا ہے؟ (یقول ۛ انک لمن العصدا قین)۔

”کہ جس وقت ہم مہاشیں گے اور فلک اور پڑیاں ہوجائیں گے تو (دوبارہ) زندہ ہوں گے اور حساب و کتاب کے کثرت میں مگڑے ہوں گے اور اپنے اعلیٰ و کردار کے جواب میں ہمیں ہمازات کردار کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں تو ان باتوں کو یاد نہیں کرتا (ع اذا متنا و کنا ترابا و عظاما ۛ انا لعدینون)۔

لے دوستو! کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اب وہ کہاں ہے اور کن حالات میں ہے؟ انہوں اس کی جگہ ہمارے درمیان خالی پڑی ہے۔!

اس کے بعد وہ مزید کہے گا: لے دوستو! کیا تم ادھر ادھر نظر دوڑا کر دیکھ سکتے ہو اور اس کا پتہ لگا سکتے ہو؟ (فتال هل انتم مطلعون)۔

اس موقع پر وہ خود بھی تلاش کے لیے مگڑا ہوجائے گا اور جہنم کی طرف ایک نگاہ ڈالے گا تو اچانک اپنے دوست کو وسط جہنم میں دیکھے گا (فاطلع حراہ فی سواہ الجحیم)۔

اسے مخاطب کرتے ہوئے ”آواز دے کر کہے گا: خدا کی قسم کوئی کسرباقی نہیں رہ گئی مٹی کہ توجھے بھی گرا دے اور ہلاکت کی طرف کچنچ لے جائے“ (قال تالله ان کدت لتردین)۔

کوئی کسرباقی نہیں رہ گئی مٹی کہ تیرے دوسرے میرے صاف دل پر اثر انداز ہوجائیں اور مجھے بھی اسی کج راستے پر ڈال دیں کہ جس پر تو چل رہا تھا“ اگر لطف الہی میرا مددگار نہ ہوتا اور میرے پروردگار کی نعمت میری نصرت کو نہ پہنچتی، تو میں بھی آج تیرے ہی ساتھ جہنم کی آگ میں موجود ہوتا“ (ولولا نعمۃ ربی لکننت من المحضرمین)۔

یہ توفیق الہی ہی تھی جو میری رخصت راہ بنی اور اسی کی ہدایت کے لطف و کرم کے باعث نے مجھ پر نوازش کی اور میری رہبری کی۔

۱۔ ”مدینوں“ دن کے ماہ سے جسوا کے معنی میں ہے یعنی کیا میں جہادی جائے گی؟

۲۔ ”مطلعون“ اطلاع کے لفظ سے مراد پکارنے، تجر اور تلاش کرنا اور کسی چیز کے لیے جہاں جانا اور اس کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا ہے۔

۳۔ ”سواہ“ وسط اور درمیان کے معنی میں ہے۔

۴۔ ”تردین“ ”ارداہ“ کے لفظ سے جہدی سے لڑنے کے معنی میں ہے جس سے ہم طرز پر ہلاکت واقع ہوجاتی ہے۔

اس موقع پر وہ اپنے جہنی دوست کی طرف رخ کرے گا اور یہ بات مرزئش کے طور پر اسے یاد دلاتے ہوئے کہے گا: کیا تو ہی دنیا میں یہ نہیں کیا کرتا تھا کہ تم کبھی نہیں مریں گے (افغان حن بھیتین)۔
سوائے اس پہلی دنیاوی موت کے اور اس کے بعد نہ کوئی نئی زندگی ہوگی اور نہ ہی میں عذاب دیا جائے گا (الاموتنا الاولیٰ وما نحن بمعذبین)۔

اب تو دیکھو اور سوچو کہ تجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے؟ موت کے بعد اس قسم کی زندگی تھی اور اس طرح کا ثواب و جزا اور سزا و عذاب تھا۔ اب تمام حقائق تیرے سامنے آشکار ہو گئے ہیں۔ لیکن کیا فائدہ کیوں کہ لوٹنے کی اب کوئی راہ نہیں ہے اس تفسیر کے مطابق آخری دو آیات اس جہنی شخص کی اپنے دوزخی ساتھی کے ساتھ گفتگو ہے۔ وہ قیامت کے انکار کے سلسلے میں اس کی کسی ہوتی باتیں اسے یاد دلا رہے۔

لیکن بعض مفسرین نے ان دونوں آیات کی تفسیر میں ایک اور احتمال ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ ہر جہنی شخص کی گفتگو دوزخی دوست کے ساتھ ختم ہو گئی ہے اور ہشتی دوست آپس میں باتیں دوبارہ کرنے لگیں گے۔ ان میں سے ایک فرط مسرت سے پکار کر کہے گا: ”کیا واقعا اب تم نہیں مریں گے“ اور یہاں ہماری حیات جاودانی ہے، کیا پہلی موت کے بعد اب کوئی موت نہیں آئے گی اور یہ لطف الہی تم پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور میں ہرگز عذاب نہیں ہوگا؟

البتہ یہ باتیں شک و شبہ کی بنا پر نہیں ہوں گی۔ بلکہ فرط وجود مسرور سے ہوں گی۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے بعض اوقات انسان طویل آرزو اور انتظار کے بعد کوئی وسیع اور اچھا مکان حاصل کرتا ہے تو تعجب کے ساتھ کہتا ہے کیا یہ میری ملکیت ہے؟ لے میرے خدا! یہ کتنی اچھی نعمت ہے، کیا یہ مجھ سے لے تو نہیں لی جائے گی؟

بہر حال اس گفتگو کو ایک پُرسنی اور بہت ہی احساس انگیز جملے پر ختم کیا گیا ہے، جس میں بہت سی تاکیدات بھی موجود ہیں ارشاد ہوتا ہے:-

”واقتابہ ایک عظیم کامیابی ہے (ان هذا لہو الفوز العظیم)۔“

اس سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہوگی کہ انسان نعمت جاوہل اور حیات اہری میں مستغرق ہو اور انواع و اقسام کے الطاف الہی اس کے شامل حال ہوں۔ اس سے بڑھ کر بالا اور کس چیز کا تصور ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد خداوند عظیم ایک مقرر، بیدار کن اور معنی خیز جملے پر اس بحث کو ختم کرتا ہے۔ اس مثال کے مطابق لوگوں کو عمل کرنا چاہیے (لعش هذا فلیعمل العاملون)۔

یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ آخری آیت بھی جنتیوں کی ہی گفتگو کا حصہ ہے، بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ اس دن اور کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اس دن عمل کا کوئی عمل نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو یہ کہہ کر عمل کرنے کا شوق دلا میں۔ جبکہ آیت کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ یہ کہہ کر تمام گزشتہ آیات سے توجہ اخذ کیا جائے اور لوگوں کو ایمان و عمل کی طرف دعوت دی جائے لہذا مناسب یہی ہے کہ اس بحث کے آخر میں یہ فرمایا ہی کی گفتگو ہو۔

چند نکات

۱۔ جنتیوں کا دوزخیوں کے ساتھ ربط و تعلق زیر بحث آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض اوقات جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک قسم کا رابطہ قائم ہو جائے گا۔ گویا ہشتی جو اوپر رہتے ہوں گے، دوزخیوں کی طرف نگاہ کریں گے اور ان کی حالت و کیفیت کو دیکھ لیں گے (یہ معنی خاطرہ کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے جو اوپر سے جھانکنے کے معنی میں ہے)۔

البتہ یہ اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان فاصلہ محض ہے۔ بلکہ ان حالات میں انہیں دیکھنے کی بہت زیادہ طاقت دے دی جائے گی، جس کے سلسلے فاصلہ اور مکان کا مسئلہ پیش ہی نہیں آئے گا۔ مفسرین کے کلمات میں ہے کہ بہشت میں ایک روشندان ہے جس سے جہنم کو دیکھا جاسکتا ہے۔ سورۃ اعراف کی آیات سے بھی اس قسم کا رابطہ اچھی طرح سے واضح ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

ونادی اصحاب الجنة اصحاب النار ان قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا
فهل وجدتم ما وعد ربکم حقا قالوا نعم فاذن مؤذن بینہم ان
لعنة الله علی الظالمین (اعراف - ۴۳)

جنتی دوزخیوں کو پکار کر کہیں گے، ہمارے پروردگار نے تم سے جس چیز کا وعدہ کیا تھا تم نے اسے برحق پایا، کیا تم نے بھی جس کا وعدہ پروردگار نے تم سے وعدہ کیا تھا اسے برحق پایا ہے؟ وہ کہیں گے: ہاں۔ تو اس وقت کوئی ان کے درمیان میں سے پکار کر کہے گا کہ تم گروں پر خدا کی لعنت ہو۔

اسی سورہ کی آیت ۴۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ”اہل بہشت اور اہل دوزخ کے درمیان ایک حجاب ہے (وبینہما حجاب)۔“

”نادی“ کی تفسیر جو عام طور پر دور سے بات کرنے کے موقعوں پر استعمال ہوتی ہے، یہ ان دونوں گروہوں کی مکافی یا مقامی دوری کی نشانی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے بار بار بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن کے حالات و شرائط اس جہان کے حالات سے بہت مختلف ہیں اور ہم اس جہان کے معیاروں پر ان کا ادراک نہیں کر سکتے۔

۲۔ یہ آیات کس شخص کے بارے میں نازل ہوئیں؟ بعض مفسرین نے ان آیات کے بارے میں کئی شان نزول نقل کیے ہیں ان کے مطابق یہ آیات ان دو افراد کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جن کا ذکر سورۃ کہف میں ایک مثال کے طور پر کیا گیا ہے جہاں قرآن فرماتا ہے:-

واضرب لہم مثلاً رجلین جعلنا لہما لاحد ہما جنتین من اعتاب وحففتہما
بنخل وجعلنا بینہما زرعاً.....

ان کے لیے ایک مثال بیان کر: ان دونوں کی داستان، جن میں سے ایک کے لیے ہم نے انواع و اقسام کے گھول کا باغ قرار دیا تھا جس کے گرد اگر گھول کے درخت تھے اور دونوں کے درمیان پر برکت و زراعت ہوتی تھی (کہف — ۲۲ تا ۲۳)

ان آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ ان دونوں آدمیوں میں سے ایک شخص بہت ہی خود خواہ، مغرور، کم ظرف اور منکر مذاق و دوسرا مومن اور قیامت کا مستحق تھا۔ بالآخر وہ بے ایمان مغرور شخص اس جہان میں بھی قذافی خطاب میں گرفتار ہوا اور اس کا سارا مال سرمایہ تباہ و برباد ہو گیا۔ لیکن زیر بحث آیات کا لب و لہجہ سورہ کہف کی ان آیات کے ساتھ ہرگز ہم آہنگ نہیں ہے اور یہ آیات کوئی عین داستان بیان کر رہی ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین اسے دو شریک کاری دوستوں سے متعلق جانتے ہیں۔ وہ دونوں ہی دولت مند تھے۔ ایک نے راہ خدا میں بہت زیادہ خرچ کیا اور دوسرے نے بخل کیا۔ وہ ان باتوں کا مستحق نہیں تھا۔ کچھ مدت کے بعد خرچ کرنے والا آدمی بے پروا ہو گیا تو اس کے دوست نے اسے سرزنش کی اور بڑا بھلا کہا اور مذاق کے طور پر کہا:

۱. انك لمن المصدقين

کیا تو راہ خدا میں انفاق کرتا ہے بلکہ

لیکن یہ شان نزول اس بات پر موقوف ہے کہ ہم زیر بحث آیات میں ”مصدقین“ کے معنی کو تفسیر کے ساتھ پڑھیں تاکہ اس کا تعلق انفاق اور صدقہ دینے سے ہو جائے۔

جبکہ ”مصدقین“ کی مشہور قرابت ”صاد“ کی تفسیر کے بغیر ہے۔ اس بنا پر مذکورہ شان نزول مشہور قراءت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

۲۔ اس قسم کی نعمات کے لیے کوشش کرنا چاہیے: کیا انسان کے لیے یہ بات مناسب ہے کہ انسان عمر کے گراں بہا سرمائے اور خداداد تعمیری صلاحیتوں کو ایسے امور میں صرف کرے جو پانی کے بلبوں کی طرح تباہی خیز ہوں اور ایسی متاع ہے جو بے قدر و قیمت اور فنا ہونے والی ہے۔ ایسی متاع ہے جس میں آفتیں ہی آفتیں ہیں اور دوسری دوسری ہے۔

یا ان قیمتی صلاحیتوں اور وسائل کو ایسی راہ میں استعمال کرے جس کا نتیجہ حیات جاوداں، بے پایاں نعمتیں اور پروردگار کی خوشنودی ہے۔

قرآن زیر نظر آیات میں کتنی خوب صورت تفسیر پیش کرتا ہے، کہتا ہے، اسی دوشش کرنے والوں کو اس طرح کے مقصد کے لیے اسی دوشش کرنی چاہیے۔ لذت دنیوی سے محرومیت کے لیے اور جہانی نعمتوں سے بھری بہشت کے لیے اس کی شراب طہور انسان کو ملوٹی نیشے میں غرق کرنے کی اور اس کے باصفا دوستوں کی ہم نشینی دل پر کوئی غم نہ رہنے دے گی۔ جس میں نہ کوئی چیز معدوم ہے نہ کسی چیز کی کوئی کمانند۔ نہ اس میں زوال کا غم ہوگا اور نہ ہی حفاظت نگہداری کا دوسرا۔

ایسی جنت کے لیے اسی دوشش کرنا چاہیے۔

- ۶۲۔ اَذَلِكْ خَيْرٌ نَزْلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقْوَمِ ۝
 ۶۳۔ اِنَّا جَعَلْنَهَا فِتْنَةً لِلظَّالِمِيْنَ ۝
 ۶۴۔ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝
 ۶۵۔ طَلْعَهَا كَاَنَّ رَعْوَسَ الشَّيْطٰنِ ۝
 ۶۶۔ فَاِنَّهُمْ لَا يَكُوْنُوْنَ مِنْهَا فَمَا لَكُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝
 ۶۷۔ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ۝
 ۶۸۔ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَا اِلٰى الْجَحِيْمِ ۝
 ۶۹۔ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَاءَهُمْ صٰلِحِيْنَ ۝
 ۷۰۔ فَهُمْ عَلٰى اٰثَرِهِمْ يَهْرَعُوْنَ ۝

ترجمہ

- ۶۲۔ کیا یہ (جنت کی جاوداں نعمتیں) یا زقوم کا (نفرت انگیز) درخت۔
 ۶۳۔ ہم نے اسے ظالموں کے لیے درد فرخ کا سبب قرار دیا ہے۔
 ۶۴۔ وہ ایسا درخت ہے جو قعر جہنم سے اگتا ہے۔
 ۶۵۔ اس کا شکوہ شیطانوں کے سروں کے مانند ہے۔
 ۶۶۔ وہ (مجرم) اس میں سے کھائیں گے اور اسی سے اپنا پیٹ بھریں گے۔
 ۶۷۔ پھر اس کے اوپر گرم بدبودار پانی پینیں گے۔
 ۶۸۔ پھر ان کی بازگشت جہنم کی طرف ہے۔
 ۶۹۔ کیونکہ انھوں نے اپنے آباؤ اجداد کو گمراہ پایا۔
 ۷۰۔ اس کے باوجود وہ تیزی کے ساتھ انھیں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔

دوزخ کے لیے کچھ جاننا کا عذاب

جنت کی قیمتی اور روح بخش نعمتوں کے بیان کے بعد زبور بحث آیات میں دوزخ کے عذاب اور عزم و ہمت کے بیان کی گئی
 ان کی اس طرح سے تصویر کشی کی گئی ہے جو مذکورہ نعمتوں کا ملالہ کرنے میں بیدار نفوس پر گہرا اثر مرتب کرتی ہیں اور انھیں ہر قسم
 پرانی اور ناپاک سے باز رکھتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا یہ جاودانی اور لذت بخش نعمتیں، جن کے ساتھ جنتیوں کی پذیرائی کی جائے گی بہتر ہیں یا زقوم کا نفرت انگیز
 درخت۔ (اَذَلِكْ خَيْرٌ نَزْلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقْوَمِ)۔

”نزل“ کی تفسیر اس لیے کہی گئی ہے جو سماں کی پذیرائی کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ وہ پہلی چیز
 ہے کہ جس کے ساتھ تازہ وارد شدہ سماں کی پذیرائی کرتے ہیں۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہستی لوگوں کی عزیز و محترم ممانوں کی
 طرح پذیرائی کی جائے گی۔

قرآن کہتا ہے: کہ کیا یہ بہتر ہے یا ”زقوم“ کا درخت۔

”بہتر“ کی تفسیر اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ درخت زقوم کوئی اچھی چیز ہے۔ لیکن جنت کی نعمتیں اس سے بہتر ہیں کیونکہ ایسی
 تصویریں عربی زبان میں بعض اوقات ایسے موقعوں پر استعمال ہوتی ہیں جہاں ایک طرف اصل کسی قسم کی خوبی نہیں ہوتی لیکن یہ احتمال بھی ہے
 کہ ایک قسم کا کتا ہو۔ اس کی مثال بالکل اس طرح ہے کہ ایک شخص طرح طرح کے گناہوں سے آلودگی کی بنا پر لوگوں میں بہت زیادہ
 برا ہو گیا ہو اور ہم اس سے کہیں کہ کیا یہ رسوائی بہتر ہے یا عزت و آبرو دہندی؟

”زقوم“ اہل لغت کے قول کے مطابق ایک کڑوی بدبودار اور بد ذائقہ پودا ہے۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ ایک ایسے پودے کا نام ہے جس کے چھوٹے چھوٹے ٹوکے اور بدبودار پتے ہوتے ہیں اور وہ
 ”تھام“ کے علاقے میں اگتا ہے اور مشرق میں اس سے آگاہ تھے۔

تفسیر ”روح المعانی“ میں یہ اضافہ بھی کیا گیا ہے کہ اس پودے سے ایک شیرہ نکلتا ہے جو انسان کے بدن پر لگ جائے تو
 درم ہو جاتا ہے۔

”راغب“ ”مفردات“ میں کہتا ہے ”زقوم“ دوزخوں کی ہر قسم کی خطرناک چیز ہے۔

۱۔ مجمع البحرین - ماہ ”زقوم“۔

۲۔ تفسیر روح المعانی جلد ۴ ص ۲۶۲

۳۔ روح المعانی ج ۲۳ ص ۸۵

”لسان العرب“ کا مؤلف کہتا ہے :
یہ لفظ اصل میں نکل جانے کے معنی میں ہے۔
اس کے بعد مزید کہتا ہے :

جس وقت ”آیہ زقوم“ نازل ہوئی تو ابو جہل نے کہا کہ اس قسم کا درخت ہماری زمین میں نہیں آگیا تم میں سے
کون شخص ”زقوم“ کے معنی جانتا ہے ؟
وہاں ایک شخص افریقہ کا رہنے والا موجود تھا اس نے کہا زقوم افریقی زبان میں ”کھن“ اور ”خرما“
کے معنی میں ہے۔

ابو جہل نے مستعزلاً جاتے ہوئے پکار کر کہا ،
”اے کینز ! کچھ خرے اور کھن لے آؤ تاکہ ہم زقوم کھائیں :“
وہ کھاتے جاتے تھے اور مستعزلاً جاتے تھے اور کہتے تھے :
”محمد (ص) آخرت میں ہیں اس سے ڈراتا ہے۔“

اس پر وہی نازل ہوئی اور انھیں یہ زمانہ شکن جواب دیا جو بعد والی آیات میں آیا ہے۔
بہر حال لفظ ”شجرۃ“ ہمیشہ درخت کے معنی میں نہیں ہوتا۔ بعض اوقات گھاس پھوس اور پودوں کے معنی میں بھی آتا
اور قرآن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہاں اس سے مراد گھاس پھوس ہی ہے۔

اس کے بعد قرآن اس گھاس کی بعض خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے ، ہم نے اسے ظالموں کے لیے رنج اور فذاب
موجب قرار دیا ہے (انا جعلنا حافقتہ للظالمین)۔
”حفتتہ“ ممکن ہے رنج و فذاب کے معنی میں ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنا معنی کے معنی میں ہو۔ جیسا کہ قرآن میں اکثر
موتوں پر اسی معنی کیلئے آیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے جب ”زقوم“ کا نام سنا تو مستعزلاً اور استعزلاً شروع کر دیا
اس بنا پر وہ ان قسم گروں کی آزمائش کا ذریعہ ہو گیا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : وہ ایسا درخت ہے جو قہر جہنم سے آگیا ہے۔ (اشلہ شجرۃ تخرج فی
اصل الجحیم)۔

لیکن ان ظالموں نے اپنا مستعزلاً اور استعزلاً جاری رکھا اور یہ کہنا : کیا یہ ممکن ہے کہ پودے یا کوئی درخت قہر جہنم سے آگے
آگ کہاں اور درخت اور گھاس کہاں ؟ اس بنا پر اس گھاس اور اس کے اوصاف کا سنا اس دنیا میں ان کے لیے آزمائش ہے اور
وہ خود ان کے لیے آخرت میں درد و رنج کا سبب ہے۔

گویا وہ اس جہنم سے نازل تھے کہ وہ اصول جو اس جہان آخرت کی زندگی پر لاگو ہیں ، وہ اس جہان سے بہت مختلف ہیں۔ وہ
درخت اور پودا جو قہر جہنم سے آگیا ہے ، جہنم کے رنگ کا ہے اور اس نے جہنم کے ماحول میں چر درش پائی ہے نہ کہ وہ اس جہان کے

کی مانند ہے جو اس جہان کے باغوں میں آگے میں اور شاہد وہ اس جہنم کے لیے ہے جہنم میں تھے بلکہ ان کا مقصد تو صرف مستعزلاً کرنا
ہو کر رکھنا تھا۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے ، اس کا شگ و ذیاطین کے سروں کی طرح ہے (طلعهما کاتقہ رءوس الشیاطین)۔
”طلع“ عام طور پر پھول کے شگونے کو کہا جاتا ہے جس کی چھال سبز رنگ کی ہوتی ہے اور اس کے اندر سفید رنگ کے دھاگے سے
تھے ہیں جو بعد میں کجور کے خوشے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

لفظ ”طلع“ کے ماد سے ہے اس کی مناسبت یہ ہے کہ یہ پہلا پھل ہے جو درخت کے اوپر ظاہر ہوتا ہے
اور طلوع کرتا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا لوگوں نے شیاطین کے سروں کو دیکھا ہو ہے کہ قرآن ”زقوم“ کے شگ و ذیاطین سے
شبہ دیتا ہے۔

مفسرین نے اس سوال کے متعدد جواب دیئے ہیں۔

بعض نے تو کہا ہے کہ شیطان کا ایک معنی ایک قسم کا بد منظر مانپ ہے جس کے ساتھ زقوم کے شگ و ذیاطین کو تشبیہ
دیا گیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ایک بد صورت قسم کی گھاس ہے ، جیسا کہ کتاب ”منتھی الادب“ میں آیا ہے ”رأس الشیطان“ یا
”رأس الشیاطین“ ایک گھاس ہے۔

لیکن جو بات زیادہ صحیح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ تشبیہ انتہائی قباحت اور اس کے مستعزلاً نیز شکل کے اظہار کے لیے ہے۔ کیونکہ
جہنم میں جہنم سے مستعزلاً ہوا اس کے لیے اپنے ذہن میں ایک قبیح اور وحشت ناک تصویر کشی کرتا ہے اور جس چیز سے لگاؤ ہو اس کے لیے
بہتر صورت اور پیارا سا تصور رکھتا ہے۔

اس لیے لوگ جو تصویریں فرشتوں کی بناتے ہیں ، ان میں انتہائی خوب صورت اور زیبا ترین چہروں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔
اس کے برعکس شیطانوں اور دیوؤں کے لیے بدترین چہرے بناتے ہیں حالانکہ تو انھوں نے فرشتوں کو دیکھا ہے اور نہ ہی شیطانوں
دیوؤں کو۔

روزہ کے الفاظ میں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کتے ہیں ، فلاں آدمی دیو کے مانند ہے یا دیو کی شکل رکھتا ہے۔
یہ سب تشبیہات ، انسانوں کے ذہنی تصورات کی بنیاد پر ، مختلف مفاہیم کے اعتبار سے لطیف اور مستعزلاً ہوتی ہیں۔

قرآن مزید کہتا ہے ، یہ معرود ظالم یقیناً ہی گھاس کھائیں گے اور اسی سے شکم پڑ کریں گے (فاتھم لاکلون
منھا فمعا الشون منها البطون)۔

یہ وہی قنہ و فذاب ہے جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ اس دوزخ کی گھاس جو بہت ہی بدبودار ہے ،

جس کا ذائقہ کڑوا ہے اور جس کے شیرہ سے بدن میں درم پیدا ہو جاتا ہے اور لے کھا نا بھی زیادہ مقدار میں ہو تو انسانہ کیا ہوگا
یہ کس قدر دردناک عذاب ہے لے

یہ بات ظاہر ہے کہ اس ناگوار اور کڑوی غذا میں سے کھانا پیاس لگائے گا، لیکن جس وقت وہ پیاس ہوں گے تو
پیش گے،؟ قرآن کہتا ہے: ان دوزخیوں کے لیے اس زقوم کے بعد کھولتا ہوا، کیف اور گندہ پانی ہوگا (شعر ان لہم
لشویبا من حمیم)۔
”شویب“ اس چیز کے معنی میں ہے جو کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جائے اور ”حمیم“ کھولتے ہوئے اور جلانے والے
کو کہتے ہیں، اس بنا پر وہ گرم کھولتا ہوا پانی جو وہ پیش گے، وہ بھی خاص نہیں ہوگا بلکہ آلودہ اور گندہ ہوگا۔

وہ تو دوزخیوں کی غذا ہے اور یہ ان کے پینے کی چیز، لیکن اس پذیرائی کے بعد وہ کہاں جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے: پھر ان کی
بازگشت جہنم کی طرف ہے۔ (شعر ان مرجعہم لآلی الجحیم)۔

بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ گرم اور آلودہ پانی جہنم سے باہر کے ایک چشمہ کا ہے۔ دوزخیوں کو پہلے
ان جانوروں کی طرح جہنم پانی کے گھاٹ پر لے جایا جاتا ہے اسے پینے کے لیے دیا جاتا ہے اور اسے پینے کے بعد دوبارہ جہنم
کی طرف لوٹ جائیں گے۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ یہ دوزخ کے مختلف مقامات کی طرف اشارہ ہے کہ ظالموں کو ایک علاقہ سے دوسرے علاقے
کی طرف لے جایا جائے گا، تاکہ وہ یہ جلائے والا پانی پئیں۔ پھر انھیں اہلی جگہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ
مناسبت نظر آتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ جنت کی نعمتوں کی حقیقی تصویر کشی اس دنیا میں ہمارے لیے ممکن نہیں
ہے اور نہ ہی دوزخیوں کے عذاب کی۔ صرف دوزخ سے ایک دھندلی سی تصویر محقری جہالتوں کے ساتھ ہمارے ذہن
میں پیدا ہوتی ہے۔

(پروردگارا! ہمیں ان عذابوں سے اپنے لطف و کرم کی پناہ میں محفوظ رکھ)

قرآن زیر بحث آخری آیت میں دوزخیوں کی ان دردناک سزاؤں اور عذاب کے جنگل میں گرفتاری کی اصل وجہ کو درمختصر اور
پرستی جملوں میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: انھوں نے اپنے آباء و اجداد کو گمراہ پایا (انھم الفوا اباہم ضالین)۔

لے ”منہا“ کی ضمیر ”شجرۃ“ کی طرف لٹی ہے اور یہ خود اس بات کے لیے قرینہ ہے کہ یہاں ”شجرۃ“ سے مراد گھاس ہے نہ کہ درخت
یہ کہ گھاس کو ترکھانے میں درخت کو نہیں۔

وعون)۔

لیکن اس حال میں بھی وہ بے اختیار تیزی کے ساتھ ارضی کے پیچھے دوڑنے لگے (فہم علی اشارہم

قابل تجربہ بات یہ ہے کہ یہاں ”یہرعون“ ”اھراع“ کے لادہ کے ساتھ درخت میں آیا ہے اور سرعت اور
تیزی کے ساتھ دوڑنے کے معنی میں ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے اپنے بڑوں کی تقلید پر اپنے دل اور دین
اس طرح سے لگا دیا ہے کہ وہ انھیں بے اختیار تیزی کے ساتھ اپنے پیچھے دوڑا رہے ہیں۔ گویا وہ خود سے ان کا کوئی ارادہ ہی نہیں
ان کے انتہائی تعصب اور اپنے بڑوں کے عزائمات کے ساتھ شیطانی کی طرف اشارہ ہے۔

- ۴۱- وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ الْأُولِينَ ۝
 ۴۲- وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُنْذِرِينَ ۝
 ۴۳- فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذِرِينَ ۝
 ۴۴- الْإِعْبَادِ لِلَّهِ الْمُخْلِصِينَ ۝

ترجمہ

- ۴۱- ان سے پہلے اکثر گزشتہ لوگ (بھی) گمراہ تھے۔
 ۴۲- ہم نے ان میں ڈرانے والے بھیجے تھے۔
 ۴۳- دیکھو! جنہیں ڈرایا گیا تھا ان کا انجام کیا ہوا؟
 ۴۴- ہمارے مخلص بندوں کے سوا۔

تفسیر
گزشتہ گمراہ اقوام

کیونکہ مجرموں اور ظالموں سے مربوط گزشتہ مسائل کسی خاص زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں لہذا قرآن زیر بحث آیات میں ان کی عمومیّت اور وسعت کو بیان کرتا ہے۔
 ان چند آیات میں گزشتہ بہت سی امتوں کے حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے مطلع ہونا گزشتہ مباحث کے لیے ایک اچھی سند ہے۔ مثلاً قوم نوح و ابراہیم، قوم موسیٰ و ہارون، قوم لوط، قوم یونس وغیرہ۔
 پہلے فرمایا گیا ہے، ان سے پہلے بہت سے گزشتہ لوگ گمراہ ہو گئے (وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ الْأُولِينَ)۔
 صرف مشرکین مکہ ہی نہیں جو اپنے بڑوں کی تقلید میں امتیاز گمراہی میں جا کر رہے ہیں بلکہ ان سے پہلے بھی اکثر گزشتہ اقوام اس قسم کے انجام سے دوچار ہوئی تھیں اور ان کے مومنین بھی ان کے گمراہوں کے مقابل میں بہت ہی مختصرے تھے اور یہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اور ان پہلے مومنین کے لیے جو اس زمانے میں مکہ میں تھے اور ہر طرف سے دشمن کے محاصروں میں تھے، ایک تسلی خاطر ہے۔

- اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: اس لیے ہم نے ان میں ڈرانے والے بھیجے تھے (وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُنْذِرِينَ)۔
 ایسے پیغمبر جو انہیں شرک و کفر، ظلم و ستم، انہیں ان کی ذمہ داریوں سے آشنا کرتے تھے۔
 یہ ٹھیک ہے کہ انبیاء کے اکابر اور دوسرے ہاتھ میں بشارت کا پروانہ ہوتا تھا لیکن چونکہ ان کی تبلیغ کارکن اعظم خصوصاً اس قسم کی گمراہ اور سرکش اقوام کے لیے تھا لہذا یہاں صرف اسی کو بیان کیا گیا ہے۔
 اس کے بعد ایک مختصر اور پر معنی جملے میں فرمایا گیا ہے: اب دیکھو ڈرانے والوں اور ہٹ دھرم اور گمراہ اقوام کا انجام کیا ہوا (فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذِرِينَ)۔
 ”فانظر“ (اب دیکھو) میں ہو سکتا ہے کہ مخاطب پیغمبر اکرم کی ذات ہو یا ہر مائل و دبیدار فرد ہو۔
 حقیقت میں یہ جملہ ان اقوام کے انجام کار کی طرف اشارہ ہے، جن کی حالت کی تشریح بعد والی آیات میں آئے گی۔

آخری آیت میں ایک استثناء کے بعد فرمایا گیا ہے: مگر خدا کے مخلص بندے (الْإِعْبَادِ لِلَّهِ الْمُخْلِصِينَ)۔
 حقیقت میں یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان اقوام کی عاقبت اور انجام کو دیکھو کہ ہم نے انہیں کیسے زندگانی مذاب میں گرفتار کیا ہے اور ہلاک کیا ہے، سوائے صاحبان ایمان اور مخلص بندوں کے کہ جو اس ہلاکت سے بچے رہے اور نجات پا گئے۔
 قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس سورہ میں مختلف آیات میں پانچ مرتبہ خدا کے مخلص بندوں کا ذکر آیا ہے اور یہ ان کے مرتبہ و مقام کی عظمت کی نشانی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، وہ ایسے لوگ ہیں جو معرفت، ایمان اور جہاد بانٹن میں اس طرح کا ایجاب ہوئے ہیں کہ خدا نے انہیں منتخب کر کے مخلص کر لیا ہے اور اسی وجہ سے وہ انحرافات اور نشوونما سے بچے رہے۔
 شیطان ان میں نفوذ پیدا کرنے سے عاجز اور مایوس ہے اور پہلے دن سے ان کے مقابلے میں سپردال کراہی عاجزی کا اظہار کر چکا ہے۔
 ماحول کا شور و غوغا، گمراہ کرنے والوں کے دوسے، آباؤ اجداد کی تقلید، غلط اور طاغوتی تعلیمات انہیں ہرگز

۱۔ یہ جو ایک نوزد سے استثناء ہے جو مذکور میں لکھا ہے اور جو تقدیر میں اس طرح ہے:۔
 فَاَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذِرِينَ فَاَنَا اِهْلِكَ نَاهُمْ جَمِيعًا اِلَّا الْعِبَادِ لِلَّهِ الْمُخْلِصِينَ

پڑھتے سے مخوف نہیں کر سکتیں۔

حقیقت میں یہ اس زمانے میں مکہ میں پامردی دکھانے والے مومنین کے لیے اور آج کی طور و موافقہ سے
میں رہنے والے ہم جیسے مسلمانوں کے لیے ایک الہام بخش پیام ہے کہ ہم دشمنوں کی کثرت سے ڈریں اور کوشش
کو خدا کے قلم بندوں کی صف میں جگہ پالیں۔

- ۷۵۔ وَلَقَدْ نَادَيْنَا نُوْحًا فَلْيَعْمِرِ الْمَجِيْئَۃَ
۷۶۔ وَنَجِيْئَهُ وَاَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ
۷۷۔ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبٰقِيْنَ
۷۸۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ
۷۹۔ سَلَمًا عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعَلَمِيْنَ
۸۰۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ
۸۱۔ اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ
۸۲۔ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخِرِيْنَ

ترجمہ

- ۷۵۔ نوح نے ہمیں پکارا (اور ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا) اور ہم کیسے اچھے قبول کرنے والے ہیں۔
۷۶۔ اور ہم نے اسے اور اس کے اہل خاندان کو اندوہ عظیم سے نجات بخشی۔
۷۷۔ اور اس کی اولاد کو (روئے زمین پر) باقی رہنے والا قرار دیا۔
۷۸۔ اور ہم نے اس کا نیک نام بعد کی امتوں میں باقی رکھا۔
۷۹۔ سارے جہان کے لوگوں میں نوح پر سلام ہو۔
۸۰۔ ہم نیک لوگوں کو اسی طرح سے اجر دیتے ہیں۔
۸۱۔ بے شک وہ ہمارے صاحب ایمان بندوں میں سے تھا۔
۸۲۔ پھر دوسروں (اس کے دشمنوں) کو ہم نے غرق کر دیا۔

تفسیر

نوح کی داستان کا ایک گوشہ

یہاں سے خدا کے توہین پیغمبروں کی داستان کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس کی طرف گزشتہ آیات میں اجمالی طور پر ذکر ہوا تھا۔

سب سے پہلے شیخ الانبیاء اور پہلے اولوالعزم پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے، پہلے ان کی اس پروردگار کی طرف جو انہوں نے اس وقت کی تھی جب وہ اپنی قوم سے مایوس ہو گئے تھے۔ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: نوح نے ہمیں پکارا تو ہم نے بھی ان کی دعا قبول کر لی اور ہم کیسے اچھے قبل کسے والے ہیں (ولقد نادانا نوح فلنعم المجیبون)۔

یہ دعا ممکن ہے اسی دعا کی طرف اشارہ ہو جو سورہ نوح میں آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

وقال نوح رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیاراً ذک ان تذرہم یرضلوا
عبادک ولا یلدوا الا فاجراً کفاراً

نوح نے کہا: پروردگارا! کافروں میں سے کسی کو زمین پر نہ رہنے دے کیونکہ اگر تو انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور ان سے ناجروں اور کافروں کے سوا اور کوئی پیدا نہیں ہوگا۔ (وہ خود بھی فاسد ہیں اور ان کی آئندہ نسل بھی فاسد ہوگی)

(نوح — ۲۶، ۲۷)

یاد رہے دعا جو آپ نے نکستی پر ہوا کرتے وقت بارگاہِ خدا میں کی تھی۔

رب انزلنی منزلاً مبارکاً وانت خیر المنزلین

پروردگارا! تو ہمیں کسی پُر بَرَکت منزل پر اتارنا اور تو بہترین منزل عطا کرنے والا ہے

(مؤمنون — ۲۹)

یاد رہے دعا جو سورہ قمر کی آیت ۱۰ میں آئی ہے۔

فدعار بہ انی مغلوب فانتصر

نوح نے اپنے پروردگار سے اس طرح دعا کی: (پروردگارا! میں اس قوم کے جنگل میں

لے "مجیبون" صیغہ ہے مالا کہ اس سے مراد خدا ہے کہ جس نے نوح کی دعا قبول کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات جمع کا صیغہ اظہارِ عظمت کے لیے آتا ہے۔ جیسا کہ "نادانا" میں جمع مشکم کی منبر میں اسی معنی کے لیے ہے۔

مغلوب میری مدد فرما۔

البتہ اس بارے میں امر مانع نہیں ہے کہ زیر بحث آیت ان تمام دعاؤں کی طرف اشارہ ہو اور مراد یہ ہو کہ خدا نے بہترین طریقے سے دعا قبول فرمایا۔

لہذا یہ دعا میں بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے اور اس کے خاندان کو عظیم غم سے نجات بخشی (وینجیتاہ
واہلہ من کل غم)۔

یہ غم وہ تھا جس سے نوح کو تارکھا تھا؟

ممکن ہے یہ کافر و مغرور قوم کی طرف سے مذاق اڑانے اور زبانی آزار پہنچانے اور آپ کی اور آپ کے پیروکاروں کی توہین کرنے کی طرف اشارہ ہو یا اس ہت دہرم قوم کی طرف سے پے درپے ہتھلانے کی طرف اشارہ ہو۔ کبھی وہ کہتے تھے:۔

وامانراک اتبعک الالذین ہم ارادنا

ہم نہیں دیکھتے کہ کسی نے تیری پیروی کی ہو سوائے ہمارے چند حقیر لوگوں کے۔ (ہود — ۲۷)
کبھی کہتے تھے:۔

یانوح قد جادلتنا فاکثرت جدالتنا فانتما بما تعدنا ان کنت من الصادقین
لے نوح! تو نے ہم سے بہت باتیں کیں (اور تو خوب جھگڑ چکا ہے) اگر تو سچ کہتا ہے تو وہ
مذابح کا تو وعدہ کیا کرتا ہے لے آ۔ (ہود — ۲۲)

اور کبھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ویصنع الفلک وکلما مر علیہ ملاء من قومہ منحروا منہ

وہ تو کشتی کے بنانے میں مشغول تھا مگر جس وقت اس کی قوم کا کوئی گروہ اس کے قریب سے گزرتا

تو اس کا مذاق اڑاتا (وہ کہتے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے)۔ (ہود — ۲۸)

حضرت نوح جیسے باحوصلہ پیغمبر کو انہوں نے اس قدر پریشان کیا اور آپ کی اتنی بے ادبی کی کہ آپ کو دیوانہ تک کہا۔ آپ نے عرض کیا:۔

رب انصر فی بما کذبون

پروردگارا! ان کی تکذیب کے مقابلے میں میری مدد فرما۔ (مؤمنون — ۲۶)

لے "کوب" معذرت میں رتب کے قول کے مطابق "اندو شہدہ کے معنی میں ہے اور "عظیم" اس معنی میں ہے کہ یہ بتاؤں گا کہ یہ ہے۔

بہر حال مجموعی طور پر ان سب ناگوار حوادث اور زبان کے شدید زخموں نے ان کے پاکیزہ دل کو سخت پریشان کر دیا تھا یہاں تک کہ طوفان پہنچا اور غلغلے انہیں اس سنگرم قوم کے جنگل سے اس کرب عظیم اور اندرہ کبیر سے نجات بخشی۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ ”کرب عظیم“ سے مراد وہی طوفان تھا، جس سے حضرت نوح اور ان کے انصار اصحاب کے علاوہ کسی نے نجات نہیں پائی، لیکن یہی بعید نظر آتا ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: ہم نے نوح کی اولاد کو (زمین پر) باقی رکھانے والا قرار دیا۔ (وجعلنا ذریتہ ہم الباقین)۔

کیا واقعا تمام انسان جو اس وقت روئے زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں حضرت نوح کی اولاد ہیں؟ اور کیا مذکورہ بالا آیت یہی کچھ کہتی ہے یا انبیاء و اولیاء و صلحاء کا ایک عظیم گروہ ان کی اولاد میں سے باقی رہا۔ اگرچہ تمام لوگ ان کی اولاد میں سے نہیں ہیں؟ ہم اس سلسلے میں ان آیات کی تفسیر کے بعد ایک بحث پیش کریں گے۔

اس کے علاوہ ہم نے بعد میں آنے والی امتوں میں نوح کے لیے ذکر خیر، ثنا و جلیل اور نیک نام جاری رکھا (وترکنا علیہ فی الآخرین)۔

وہ انہیں ایک ثابت قدم قیام کرنے والا، شجاع، بہت زیادہ صبر کرنے والا، دلسوز و مہربان پیغمبر کے عنوان سے یاد کرتے ہیں اور انہیں ریح الانبیاء کہتے ہیں۔

ان کی تاریخ ثبات قدم، پامردی اور استقامت کا ایک نمونہ ہے اور دشمنوں اور بے عقلوں کی سختیوں کے مقابلے میں ان کا طرز عمل راہ حق کے تمام راہیوں کے لیے الہام بخشنے ہے۔

مالئین کے لوگوں میں نوح پر سلام (سلام علی نوح فی العالمین)۔

اس سے برتر وبالاً تر اور کون سا عزاز و افتخار ہوگا کہ خداوند عالم ان پر سلام بھیجتا ہے۔ ایسا سلام جو جہان اور جہان والوں کے درمیان باقی رہتا ہے اور دائن قیامت تک پھیلا دیا جاتا ہے۔ خدا کا سلام جو اس کے بندوں کی طرف سے سننا و جلیل اور ذکر خیر کے ساتھ تلا ہوا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں اس وصیت کے ساتھ بہت کم سلام کس کے لیے نظر آتا ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہ ”العالمین“ (اس بنا پر کہ جمع ہے اور الف لام اس کے ساتھ ہے)۔ ایسا وسیع معنی رکھتا ہے، جو نہ صرف انسانوں بلکہ ممکن ہے کہ فرشتوں اور ملکوت کے عالم پر بھی محیط ہو۔

اور اس غرض سے کہ یہ دوسروں کے لیے الہام بخش ہو، مزید فرمایا گیا ہے: ہم اسی قسم کی جزائیکو کاروں کو دیتے ہیں۔ (اناکذالک نجزی المحسنین)۔

جو کہ وہ ہمارے صاحب ایمان بندوں کے لئے ہے۔ (انہ من عبادنا المقومین)۔
درحقیقت مقام بندگی اور اسی طرح ایمان جو احسان و نیکی کے ساتھ ہو، جس کا بیان آخری دو آیات میں ہے حضرت نوح کے لیے خدا کے لطف اور اندوہ عظیم سے ان کی نجات اور ان پر خدا کے درود و سلام کی اصل وجہ تھی کیونکہ اگر یہی طرز عمل دوسروں کا بھی ہو تو وہ بھی اسی رحمت اور لطف کے حق دار ہوں گے کہ جن کے نوح تھے، کیونکہ پروردگار کے الطاف کا معیار مختلف ناپذیر ہے اور وہ کسی خاص شخص کے لیے نہیں ہوتا۔

آخری زیر بحث آیت میں ایک مختصر اور تیز جملے کے ساتھ اس ظالم شریر اور کینہ پرور قوم کا انجام بیان کرتے ہوئے قرآن لکھا ہے، پھر ہم نے دوسروں کو عزق کر دیا (ثغر اغرقنا الاخرین)۔

آسمان سے بارش کا طوفان ٹوٹ پڑا اور زمین سے پانی اپنے لگا اور سارے کا سارا کرہ ارض تھپیر میں مارتے ہوئے سمندر میں بدل گیا، اس نے ظالموں کے محل درجہ برہم کر دیئے اور ان کے بے جان جسم مغموم آب پر باقی رہ گئے قابل توجہ بات یہ ہے کہ حضرت نوح کے ساتھ اپنے الطاف و اکرام کی بات تو اٹھتالی نے کئی آیات میں بیان کی ہے لیکن اس سرگش قوم کے مذاب کا بیان تھپیر و بے اعتنائی کے ساتھ ایک مختصر سے جملے میں تمام کر دیا ہے، کیونکہ مؤمنین کے امتیازات اور کامیابیوں اور ان کے لیے خدا کی مدد و نصرت کا بیان تو بیخ کا حق دار ہے اور کسرتوں کی حالت بے اعتنائی بے پرواہی سے بیان ہونا چاہیے۔

ایک نکتہ

کیا روئے زمین کے تمام لوگ نوح کی اولاد ہیں؟

بزرگ مفسرین کی ایک جماعت نے ”وجعلنا ذریتہ ہم الباقین“ ”ہم نے نوح کی اولاد کو زمین میں باقی رکھانے والا قرار دیا“ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نوح کے بعد تمام نسل بشر انہی کی اولاد میں سے وجود میں آئی ہے اور اس وقت کے تمام انسان انہی کی اولاد ہیں۔

اس بات کو بہت سے مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ نوح کے تین بیٹے باقی رہ گئے تھے۔ سام، حام اور یافث۔ اور اس وقت کے لوگوں میں پر موجود تمام نسلیں انہی پر مشتملی ہوتی ہیں۔ یہ حضرات عرب، فارس اور روم کے لوگوں کو سام کی نسل سمجھتے ہیں اور ترکی نسل اور کچھ دوسرے گروہوں کو ”یافث“ کی اولاد سے اور سوزان، سندھ، ہند، نوب، حبشہ، قبط اور بربر کے لوگوں کو حام کی اولاد میں سے شمار کرتے ہیں۔

اب بحث اس مسئلہ میں نہیں ہے کہ فلاں نسل نوح کے کس بیٹے کی اولاد ہے کیونکہ اس مسئلے میں مؤرخین و مفسرین کے درمیان مختلف نظریات ہیں۔ بحث اس بارے میں ہے کہ کیا یہ سب انسانی نسلیں انہی تینوں کی طرف لوتی ہیں؟

۸۸۔ (پھر) اس نے ستاروں کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔

۸۹۔ اور کہا میں تو بیمار ہوں (اور تمھارے ساتھ مشن میں نہیں جاسکتا)۔

۹۰۔ انھوں نے اس سے منہ پھیر لیا (اور تیزی کے ساتھ اس سے دُور ہو گئے)۔

۹۱۔ (وہ بُت خانہ میں داخل ہوا) چپکے سے ان کے معبودوں پر ایک نظر ڈالی اور مستحقر کے طور پر کہا:

میں سے کھاتے کیوں نہیں ہو؟

۹۲۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم بولتے کیوں نہیں؟

۹۳۔ اس کے بعد اپنے دائیں ہاتھ سے ایک پوری توجہ کے ساتھ ان کے جسم پر ایک زہر دار ضرب لگا

(اور بڑے بُت کے سوا سب کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا)۔

۹۴۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آئے۔

ہم جانتے ہیں کہ کئی رشتے میں زلزلے کی حیثیت نہیں ہے بلکہ

یہ اہمالی بیان کے بعد اس کی تفصیل پیش کی گئی ہے: یاد رکھو اس وقت کو جبکہ ابراہیم قلب سلیم کے ساتھ

مکہ کی بارگاہ میں آیا (اذ جاء رقبہ بسلامتہ سلیم)۔

عربین نے "قلب سلیم" کی متعدد تفسیریں دی ہیں، جن میں سے ہر ایک اس مسئلے کی جہت کی طرف اشارہ

۱۔ وہ دل جو شرک سے پاک ہو۔

۲۔ وہ دل جو گناہوں، کینہ اور نفرت سے پاک ہو۔

۳۔ وہ دل جو شیخ دینا سے خالی ہو۔

۴۔ وہ دل جس میں خدا کے سوا اور

حقیقت یہ ہے کہ "سلیم" سلامت کے مادہ سے ہے اور جب مطلق طور سے سلامت کہا جائے تو اس سے مراد ہر قسم کی

راہنمادی بیماری سے سلامتی ہوگی۔

قرآن مجید منافقین کے بارے میں کہتا ہے :-

فی قلوبہم مرضی فخرادھم اللہ مرضًا

ان کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری ہے اور خدا بھی (ان کی ہڈ ڈھری اور گناہ کی وجہ سے)

اس بیماری میں اضافہ کرتا ہے۔ (بقرہ ۱۰۰)

"قلب سلیم" کی عمدہ ترین تفسیر ابراہیم صادق نے فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں :-

القلب السلیع الذی یلتقی ربہ ولیس فیہ احد سواہ

قلب سلیم ایک ایسا دل ہوتا ہے جو خدا سے اس حالت میں ملاقات کرے کہ اس میں

بعض مفسرین نے "شیعتہ" کی ضمیر بظہیر اسلام کی طرف پڑائی ہے حالانکہ قرآن کی آیات یہ کہتی ہیں کہ بظہیر اسلام، دین ابراہیم کے پیروں سے۔ اس کے علاوہ اس قسم کی ضمیر کا مرجح قبل و بعد کی آیات میں موجود نہیں ہے۔ شاید انھوں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ شیعوں کی ضمیر حضرت نوح کی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اخصیت کی دلیل ہے، جبکہ قرآن ابراہیم کے لیے دلائل شہادتیت کا قائل ہے بلکہ یہ ضمیر اس مسئلے پر کوئی دلیل نہیں کہتی بلکہ اس سے مراد وہ مگر وہی کا حاکم ہے، جیسا کہ بظہیر اسلام کا تمام انبیاء سے افضل ہونا، ابراہیم کے لقب توحیدی کی پیروی مافیہ قرآن کہتا ہے :-

فیہد اھم اقتدہ

اے پیغمبر! گزشتہ انبیاء کی ہدایت کی پیروی کر۔ (انعام ۹۰)

تفسیر ابراہیم کی بُت شکنی کا زبردست منظر

حضرت نوح کی بھر پور تاریخ کے کئی گوشوں کو بیان کرنے کے بعد اب ان آیات میں بُت شکنی کے میرے حضرت ابراہیم

زندگی کے ایک اہم حصے کو بیان کیا گیا ہے۔

یہاں پر پہلے حضرت ابراہیم کی بُت شکنی کے واقعات اور ان سے بُت پرستوں کی شدید ٹھٹھ بھڑکے بارے میں گفتگو کی

گئی۔ دوسرے حصے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم فداکاری اور ان کے فرزند کی قربانی کے مسئلہ کا ذکر کیا گیا ہے اور حضرت ابراہیم

زندگی کا یہ حصہ قرآن مجید میں صرف اسی مقام پر بیان کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں حضرت ابراہیم کو فقہ نوح کے ساتھ اس طرح سے منسلک کیا گیا ہے: اور ابراہیم نوح کے بیروکاروں میں سے

تھا (وان من شیعثہ لابرہیم)۔

وہ اسی راہ توحید و عدل اور اسی راہ توحیدی و اخلاص پر گامزن تھا جو نوح کی سنت تھی، کیونکہ انبیاء و سارے کے سارے ایک

ہی مکتب کے مبلغ اور ایک ہی یونیورسٹی کے استاذ ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے پروردگار کو دوام بخشا، اسے آگے

بڑھاتا اور اس کی تکمیل کرتا ہے۔

کسی عمدہ تعبیر ہے کہ ابراہیم نوح کے شیعوں میں سے تھے حالانکہ ان دونوں کے زلزلے میں بہت فاصلہ تھا (بعض مفسرین

کے قول کے مطابق تقریباً ۲۶۰۰ سال)۔

”انہوں نے رُخ پھیرا اور عیسیٰ سے اس سے دور ہو گئے اور اپنے رسم و رواج کی طرف روانہ ہو گئے (رفعتہ عنہ مدبرین)۔

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں :-
پہلا یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی طرف کیوں دیکھا، اس دیکھنے سے ان کا مقصد کیا تھا؟
دوسرا یہ کہ کیا واقعا وہ بیمار تھے کہ انہوں نے کہا میں بیمار ہوں؟ انہیں کیا بیماری تھی؟
پہلے سوال کا جواب بابل کے لوگوں کے اعتقادات اور رسوم و عادات کو دیکھتے ہوئے واضح درخشاں ہے۔ وہ علم بہت ماہر تھے۔ یہاں تک کہتے ہیں کہ ان کے بُت بھی ستاروں کے ہیٹھوں اور شکلوں میں تھے اور اسی بنا پر ان کا احترام تھے کہ وہ ستاروں کے مثل تھے۔

البتہ علم نجوم میں ہمارے کے ساتھ ساتھ بہت سی خرافات بھی ان کے درمیان موجود تھیں بلکہ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ستاروں کو اپنی منزلت میں موثر سمجھتے تھے اور ان سے خیر و برکت طلب کرتے تھے اور ان کی وضع و کیفیت سے آنے والی واقعات پر استدلال کرتے تھے۔

ابراہیمؑ نے اس مرض سے کہ انہیں مطمئن کر دیں، ان کی رسوم کے مطابق آسمان کے ستاروں پر ایک نظر ڈالی تاکہ وہ وہاں سے کہیں نہ آئیں اور اپنی بیماری کی پیش گوئی ستاروں کے اوضاع کے مطالعے سے کی جائے اور وہ مطمئن ہو جائیں۔
بعض بزرگ معشرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ ستاروں کی حرکت سے اپنی بیماری کا وقت ٹھیک سے معلوم کر لیں کیونکہ ایک قسم کی بیماری انہیں تھی وہ یہ کہ بخارا انہیں ایک خاص وقت کے ساتھ آتا تھا لیکن بابل کے لوگوں نے افکار و نظریات کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ان کا آسمان کی طرف دیکھنا درحقیقت اسرار آفرینش میں مطالعہ کے لیے تھا اگرچہ آپ کی نگاہ کو ایک نجم کی نگاہ سمجھ رہے تھے جو یہ چاہتا ہے کہ ستاروں کے اوضاع سے آئندہ کے واقعات کی پیش بینی کرے دوسرے سوال کے معشرین نے مقتد جواب دیئے ہیں۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ وہ واقعا بیمار تھے، اگرچہ وہ صحیح و سالم بھی ہوتے تب بھی بتوں کے جن کے پر و گرام میں ہرگز شریک نہ کرتے، لیکن ان کی بیماری ان مراسم میں شرکت نہ کرنے اور بتوں کو توڑنے کے لیے ایک سہری موقع اور اچھا ہانہ بھی تھا اور اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ انہوں نے یہاں ”تورہ“ کیا تھا، کیونکہ انبیاء کے لیے ”تورہ“ کو مناسب نہیں ہے۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ ابراہیمؑ کو واقعی طور پر کوئی جسمانی بیماری نہیں تھی لیکن ان کی روح ان لوگوں کے غیر منصفی اعمال اور ان کے کفر و شرک اور ظلم و گناہ کی بنا پر بیمار تھی۔ اس بنا پر انہوں نے حقیقت کو بیان کیا اگرچہ انہوں نے دوسری طرح سرچا اور حضرت ابراہیمؑ کو جسمانی طور پر بیمار سمجھا۔
یہ احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس گفتگو میں تورہ کہا ہو گا۔

”یہاں سے ان کی مراد گھر کے سامنے کے پیچھے ہوتی ہے نہ کہ مارا گھر۔ جبکہ سننے والا اس طرح نہیں سمجھتا (اسی تفسیرات کو ماننا نہیں ہے لیکن ان کا ظاہر کہ کتاب ہے، فقہ میں ”تورہ“ کہتے ہیں)۔

اس بات سے حضرت ابراہیمؑ مراد یہ تھی کہ ہو سکتا ہے میں آئندہ بیمار ہو جاؤں، تاکہ وہ ان سے الگ ہو کر رہ سکے۔
لیکن یہی اور دوسری تفسیر زیادہ سبب نظر آتی ہے۔

اس طرح ابراہیمؑ کی شہر میں رہنے پرست شہر خانی کر کے باہر چلے گئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اصرار و دھرم دیکھا، اور ان کی بجلی ان کی آنکھوں میں بجی، وہ لوگوں سے انتظار کر رہے تھے آن پہنچے، انہوں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں سے جنگ کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے پکیوں پر لگا۔ اسی منہب جو بُت پرستوں کے سونے ہوئے مٹاؤں کو دکھانے اور انہیں بیدار کر دے۔

قرآن کہتا ہے: وہ ان کے خدائوں کے پاس آیا، ایک نگاہ ان پر اور کھانے کے ان بتوں پر جو ان کے اطراف میں موجود تھے اور انہیں اس طرح پر کہا: تم یہ کھانے کھاتے کیوں نہیں؟ (فراخ الی الہتمہم فقال الا تاتکلون)۔
یہ کھانے تو تمہاری عبادت کرنے والوں نے فراہم کیے ہیں۔ مرغن و شیریں، طرح طرح کی رنگین غذا میں ہیں، کھاتے کیوں نہیں ہو؟

اس کے بعد مزید کہتا ہے: تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم بات کیوں نہیں کرتے؟ تم گوٹے کیوں بن گئے ہو؟ تمہارا منہ کیوں بند ہے؟ (مالکہ لا تنطقون)۔

اس طرح ان کے تمام ہیودہ اور گمراہ عقائد کا مذاق اڑایا۔ بلاشبہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ نہ کھاتا کھاتے ہیں اور ان بات کرتے ہیں اور بے جان موجودات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، لیکن حقیقت میں وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنی بُت شکنی کے حکم کی دلیل اس عمدہ اور خوبصورت طریقے سے پیش کریں۔

پھر انہوں نے اپنی آستین بڑھالی، کھانا کھاتا تھا میں اٹھایا اور پوری طاقت کے ساتھ لے گیا اور جبر پور ”توجہ کے ساتھ“ زبردست ضرب ان کے پیکر پر لگائی (فراخ علیہم ضربت بما بالیہمین)۔

”یہمین“ سے مراد یا تو واقعی دایاں ہاتھ ہے جس سے انسان اپنے زیادہ تر کام کرتا ہے اور یا یہ قدرت و قوت کیلئے ”دماغ“ ”دماغ“ ”دماغ“ سے کسی چیز کی طرف توجہ اور میلان کے سنی میں ہے، جو پوشیدہ اور غیبی طور سے ہونا یا اس اور تخریب کی صورت میں۔

کتاب ہے (دونوں معنی بھی ہو سکتے ہیں)۔

بہر حال تھوڑی سی دیر میں وہ آباد اور خوبصورت بیت خانہ ایک وحشت ناک ویرانہ بن گیا۔ تمام بت ٹوٹ بھوٹ اور ایک ٹاٹھ یا ڈنڈے کے ہونے لگے اور پتھر سے بنے بت پرستوں کے لیے ایک دلخراش، افسوسناک اور منظر حقاب۔

ابراہیم اپنا کام کر چکے اور پورے اطمینان و سکون کے ساتھ بتخانہ سے باہر آئے اور اپنے گھر چلے گئے۔ اب وہ اپنے آئندہ کے حوادث کے لیے تیار کر رہے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ انھوں نے شہر میں لکھ پورے ملک بابل میں ایک بہت بڑا دھماکا کیا ہے جس کی صدا بعد میں بلند ہوئی۔ غصہ اور غضب کا ایک ایسا طوفان اٹھے گا اور وہ اس طوفان میں اکیلے ہوں گے۔ لیکن ان کا خدا موجود ہے اور وہی ان کے لیے کافی ہے۔

بت پرست شہر میں واپس لوٹے اور بت خانے کی طرف آئے، کتنا وحشت ناک اور بے ہوش کن منظر تھا؟ جہاں کے بت بے حس و حرکت ہو گئے؟ کافی دیر تک ان کے اوساں خطا رہے۔ انتہائی حیرانی اور پریشانی کے عالم میں اس دریلے پر نگاہ ڈالی اور ان بتوں کو جنہیں وہ اپنی بے پناہی کے دن کے لیے پناہ گاہ خیال کیا کرتے تھے وہاں بے پناہ دیکھا۔

اس کے بعد سکوت ٹوٹا اور چیخ و پکار اور نالہ و فریاد کی صدا بلند ہوئی۔ کس نے کیا ہے یہ کام؟ کون وہ ستمگر؟

دیر نہ گزری تھی کہ انھیں یاد آگیا۔ اس شہر میں ایک خدا پرست جوان رہتا ہے۔ اس کا نام ابراہیم ہے۔ وہ بتوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اور اس نے یہ دھکی دی تھی کہ میں نے تمھارے بتوں کے لیے ایک خطرناک منصوبہ بنالیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کام اسی نے کیا ہے۔

پھر وہ اس کی طرف پل پڑے۔ وہ بڑی تیزی سے (اور غصہ کے عالم میں) پل رہے تھے (فابقبلو الیہ یزقون)۔

”یزقون“ ”خاف“ (بروزن ”کف“) کے مادہ سے دراصل ہوا کے پھلنے اور شتر مرغ کے تیز دوڑنے کے معنی میں ہے جبکہ شتر مرغ دوڑتے ہوئے پھر پھڑا بھی رہا ہوتا ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ بطور کنایہ ”زفاف عروس“ یعنی دلہن کو دھکے لگنے کے معنی پر استعمال ہونے لگا۔

بہر حال مراد یہ ہے کہ بت پرست تیزی کے ساتھ ابراہیم کی طرف آئے اس قفسے کا باقی حصہ بعد کی آیات میں بیان ہوگا۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا انبیاء بھی تورہ کرتے ہیں؟ یہ پہلے ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ”تورہ“ کیا ہوتا ہے؟

”تورہ“ (برہنہ) کو بعض اوقات ”معاویض“ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد ہے ایسی بات جس کا ایک ظاہری مفہوم ہو اور دوسرا مفہوم ہو، اگرچہ اس کے منظر ظاہری مفہوم کی طرف ہی جاتی ہو۔ مثلاً کوئی شخص کوئی سوال کرتا ہے، غصہ سے کہنے لگے ہو؟ وہ کہتا ہے، غصہ سے پہلے۔ حالانکہ وہ غصہ سے پہلے آیا ہے، سننے والا اس کا نام سے غصہ سے پہلے بھتا ہے، جبکہ کہنے والے کا ارادہ زوال سے پہلے ہے، کیونکہ وہ بھی غصہ سے پہلے ہے۔

یا کوئی شخص کہتا ہے، ”کیا تو نے کھانا کھایا ہے؟“ وہ کہتا ہے، ہاں! سناخ اس بات سے یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کھانا کھایا ہے۔ اس کی مراد یہ ہے کہ اس نے کل کھانا کھایا ہے۔

یہ نکتہ فقہاء نے بھی بیان کیا ہے کہ کیا تورہ بھوٹ شام ہوتا ہے یا نہیں؟ بعض بزرگ فقہاء جن میں شیخ انصاری (رضوان اللہ علیہ) بھی شامل ہیں داخل نہیں ہے۔ مگر اس پر بھوٹ صادق آتا ہے اور نہ ہی اسلامی روایات کے اس کا بھوٹ سے تعلق معلوم ہوتا ہے، بلکہ چند روایات میں باقاعدہ اس کے بھوٹ ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

امام صادق سے ایک حدیث منقول ہے۔

الرجل یستأذن علیہ فیقول للجاریۃ قولی لیس ہوہیہنا، فقال (ع) لا بأس لیس بکذب

کوئی شخص دروازے پر آتا ہے اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہتا ہے، صاحب خانہ کو اس کی پذیرائی میں کوئی امر مانع ہے (اپنی کینز سے کہتا ہے کہ دے کہ وہ یہاں نہیں ہے۔) اور اس سے مراد شام گھر کے دروازے کے پیچھے ہے۔ امام نے فرمایا، یہ بھوٹ نہیں ہے بلکہ

حق یہ ہے کہ یہاں کچھ تفصیل کی ضرورت ہے اور ایک ضابطہ کلی کے طور پر کہنا چاہیے کہ جہاں لفظ لغوی و عرفی مفہوم کے لحاظ سے دو معانی کی قابلیت رکھتا ہے لیکن مخاطب کا ذہن اس سے ایک معنی مراد لیتا ہے جبکہ کہنے والے کی نظر میں دوسرا معنی ہے، اس قسم کا تورہ بھوٹ نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ مشرک لفظ استعمال کریں۔ سننے والے کا ذہن ایک معنی کی طرف متوجہ ہو جبکہ کہنے والے کی نظر دوسرے معنی کی طرف ہو۔

مثلاً سعید بن جبیر کے حالات میں منقول ہے کہ حجاج نے ان سے پوچھا کہ تمھارا نظریہ میرے متعلق کیسا ہے؟ انھوں نے کہا، میرے نظریہ کے مطابق ”تو عادل ہے، حجاج کے مصاحبین اور عامی خوش ہو گئے۔ حجاج نے کہا، اس نے اس بات سے میرے کفر کا حکم صادر کیا ہے۔ کیونکہ عادل کا ایک معنی حق کے باطل کی طرف مدول کرنے والا اور منہ پھیر لینے والا ہے۔

لیکن اگر لفظ لغوی و عرفی مفہوم کے لحاظ سے ایک ہی معنی رکھتا ہے اور کہنے والا اسے بھوڑ کر، قرینہ مجاز ذکر کیے بغیر مجازی معنی مراد لے تو اس قسم کا تورہ بلاشک و شبہ حرام ہے اور ممکن ہے۔ اس تفصیل کے ذریعے فقہاء کے مختلف نظریات کی اصلاح کیے

ہا سکیں۔

البتہ اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ ایسے مواقع پر بھی، جہاں توریہ جھوٹ کا مصداق نہیں ہے بعض اوقات اس کے ساتھ ساتھ اصل جھوٹ بھی ہوتی ہے اور جہالت میں پڑنے اور لوگوں کو غلطی میں ڈالنے کا سبب بنتا ہے اور اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ وہ بعض اوقات مرحلہ تک پہنچ جاتے لیکن جب اس میں نہ تو اس قسم کا کوئی مضدہ ہو اور نہ ہی وہ جھوٹ کا مصداق ہو تو اس کی حرمت پر ہمارے کوئی دلیل نہیں ہے اور امام صادق کی روایت اسی پہلو سے ہے۔ اس بنا پر صرف جھوٹ نہ ہونا توریہ کرنے کے لیے کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ دوسرے مفاسد بھی اس میں نہ ہوں۔

البتہ وہ مواقع جہاں ضرورت کا تقاضا ہو کہ انسان جھوٹ بولے وہاں یقیناً جب تک توریہ ممکن ہے اسے توریہ کرنا چاہیے اس کی بات جھوٹ کا مصداق نہ بنے۔

باقی رہی یہ بات کہ انبیاء کے لیے توریہ جائز ہے یا نہیں؟ تو کہنا چاہیے کہ وہ صورت جس میں توریہ عام لوگوں کے امتیاز سے تیز دل کا موجب بنتا ہے، وہاں جائز نہیں ہے کیونکہ تبلیغ کی راہ میں انبیاء کا سرمایہ عام لوگوں کا اعتماد ہی تو ہے۔ لیکن ایسے مواقع جس کی مثال مذکورہ بالا آیات میں حضرت ابراہیم کی داستان ہے میں کوئی اشکال نہیں۔ اس میں حضرت ابراہیم نے بیماری کا اظہار کیا مبینگیں کی طرح آسمان کی طرف دیکھا۔ البتہ خیال ہے کہ ایسے کام میں ایک ایسا مقصد پیش نظر ہو اور اس سے حق طلب لوگوں کا اعتماد بھی ڈالنا ڈول نہ ہوتا ہو۔

۲۔ ابراہیم اور "قلب سلیم" :- ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی اصطلاح میں "قلب" روح اور عقل کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "قلب سلیم" اس پاک اور سالم روح کے لیے بولا جاتا ہے جو ہر قسم کے شرک، شک اور گناہ سے پاک ہو۔

قرآن مجید نے بعض قلوب کو "قاسیۃ" (قساوت مند) قرار دیا ہے۔ (مائتہ — ۱۳)

بعض قلوب کا "ناپاک" کے عنوان سے تعارف کرایا ہے۔ (مائتہ — ۳۱)

کچھ دلوں کو "بیار" کہا ہے۔ (بقرہ — ۶)

بعض دلوں کو "مہرزہ" اور بند کہا ہے۔ (توبہ — ۸۷)

ان کے مقابل میں قرآن "قلب سلیم" کو پیش کرتا ہے کہ جس میں ان عیوب میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ پاک بھی ہے اور نرم و مہربان بھی، سالم بھی ہے اور حق کو قبول کرنے والا بھی۔

یہ وہی قلب ہے کہ روایات میں جس کی "حرم خدا" کہہ کر تعریف کی گئی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے

القلب حرم الله فلا تسکن حرم الله غیر الله

قلب حرم خدا ہے، خدا کے حرم میں خدا کے غیر کو نہ بساؤ سیکھ

یہی وہ قلب ہے جو غیب سے کچھ سیکھ سکتا ہے اور عالم بالا کے ملکوت کا نظارہ کر سکتا ہے جیسا کہ خیر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث میں منقول ہے

لو لان الشیاطین یحیی

قلوب بنی آدم لنظروا الی الملکوت

اگر شیاطین اولاد کی

ہر حال قیامت میں نجات

دردگار کی بارگاہ کی طرف چلے

یہ بیان ہم ایک اور حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، ایک روایت میں آیا ہے:

ان الله فی عبادہ أنبیة وهو القلب فاحبها الیہ "اصفاها" و

"اصلبها" و "اسقها" اصلبها فی دین امہ، واصفاها من الذنوب،

وارقها علی الاخوان

خدا کا اس کے بندوں میں ایک ظرف اور پیمانہ ہے جس کا نام "دل" ہے۔ ان میں سے سب سے

بہتر وہی ہے جو زیادہ صاف و شفاف، زیادہ محکم اور زیادہ لطیف ہو۔ خدا کے دین میں سب سے زیادہ

محکم ہو، گناہوں سے سب سے زیادہ پاک ہو اور وہی بھائیوں کے لیے زیادہ لطیف اور مہربان ہو سیکھ

- ۹۵۔ قَالَ اتَّعَبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ ۝
 ۹۶۔ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ۝
 ۹۷۔ قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْفُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝
 ۹۸۔ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ۝
 ۹۹۔ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝
 ۱۰۰۔ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ۝

ترجمہ

- ۹۵۔ اس (ابراہیم) نے کہا: کیا تم ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جسے اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو؟
 ۹۶۔ حالانکہ خدا نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور (ان بتوں کو بھی) جنہیں تم بناتے ہو۔
 ۹۷۔ انہوں نے کہا: اس کے لیے ایک اونچی سی جگہ بناؤ اور اسے آگ کے جہنم میں پھینک دو۔
 ۹۸۔ انہوں نے تو ابراہیم کو ختم کرنے کی تدبیر کر لی تھی لیکن ہم نے ان سب کو پست اور مغلوب کر دیا۔
 ۹۹۔ (وہ اس ہلاکت خیزی میں سلامتی کے ساتھ نکل آیا) اور اس نے کہا: میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں وہ میری راہنمائی کرے گا۔
 ۱۰۰۔ پروردگار! مجھے صالح (اولاد) عطا فرما۔

تفسیر

مشرکین کے منصوبے خاک میں مل گئے

آخر بت شکنی کے واقعے کے بعد حضرت ابراہیم کو اسی الزام میں عدالت میں لے گئے۔
 وہ انہیں مزہم ٹھہراتے ہوئے ان سے پوچھنے لگے کہ:-
 "اس بات کی وضاحت کر دو کہ بت خانے کا وحشت ناک حادثہ کس کے ہاتھ سے انجام پایا ہے؟"

قرآن نے اس واقعے کی تفصیل سورہ انبیاء میں بیان کی ہے اور زیر بحث آیت میں اس کے صرف ایک حصے کا ذکر ہے اور وہ ہے بت پرستی کے باطل ہونے کے بارے میں حضرت ابراہیم کی ان سے آخری گفتگو۔ ابراہیم نے کہا: کیا تم ایسی بت پرستی کرتے ہو جسے تم اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو (قال اتعبدون ما تنحتون)۔
 کیا کوئی بھی مثل خدا انسان اپنی بنائی ہوئی چیز کی عبادت کرتا ہے؟ کیا کوئی ذی شعور اپنی مخلوق کے سامنے زمین پر زانو ٹکاتا ہے؟ کون سی عقل و منطق تمہیں ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہے؟

مہم تو وہ ہونا چاہیے جو انسان کا خالق ہو زندہ کہ جو خود انسان کا تراشیدہ ہو۔ اب اچھی طرح سے غور کرو اور مہم تو حقیقی کو تلاش کرو۔ "خدا نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور ان بتوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو" (واللہ خلقکم و ما تعملون)۔
 آسمان و زمین سب اسی کی مخلوق ہیں اور زمان و مکان سب اسی کے بنائے ہوئے ہیں ایسے خالق کے آستانے پر سر رکھنا چاہیے اور اس کی پرستش و عبادت کرنا چاہیے۔

یہ ایک بہت ہی قوی اور دندان شکن دلیل ہے، جس کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔
 "ما تعملون" میں "ما" اصطلاح کے مطابق "بامصولہ" ہے (نہ کہ ماصدریہ) حضرت ابراہیم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خدا تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تمہاری مصنوعات کو بھی۔ اگر بتوں پر انسان کے "مصنوع" یا "معمول" کے لفظ کا اطلاق ہو تو یہ اس صورت کی بنا پر ہے جو انسان سے دیتا ہے، ورنہ اس کا مادہ تو خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔ یہ بات بالکل اس طرح ہے کہ کہتے ہیں یہ فرشتے، یہ گھڑ اور یہ گاڑی اور بس انسان کی بنائی ہوئی ہے۔ یقیناً اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان نے اس کے مواد کو بنایا ہے بلکہ ان کی شکل و صورت انسان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہے۔

لیکن اگر "ما" کو مصدری معنی میں لیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو بھی۔ البتہ یہ معنی بھی غلط نہیں ہے اور بعض کے نظریہ کے برخلاف جبر پر بھی دلالت نہیں کرتا، کیونکہ ہمارے اعمال اگرچہ ہمارے ارادہ و اختیار سے انجام پاتے ہیں لیکن کسی کام کے کرنے کے لیے ارادہ و قدرت اور دوسری قوتیں جن کے ساتھ انسان اپنے افعال انجام دیتا ہے خدایا کی طرف سے ہیں لیکن اس کے باوجود آیت اس معنی پر دلالت نہیں کرتی بلکہ یہ بتوں پر دلالت کرتی ہے۔ آیت یہ کہتی ہے کہ "خدا تمہارا بھی خالق ہے اور ان بتوں کا بھی جنہیں تم نے تراشا ہے اور بات کا لطف بھی اسی میں ہے، کیونکہ بحث بتوں کے بارے میں معنی ذکر انسانی اعمال کے بارے میں۔

درحقیقت یہ آیت اس بات کے مشابہ ہے جو حضرت موسیٰ اور جادو گروں کی داستان میں آئی ہے، جہاں قرآن بیان کرتا ہے۔

فاذا ہی تلقف ما یا فکون

موسیٰ نے عصا پھینکا، تو وہ بہت بڑا اثر دیا بن گیا اور جو کچھ انہوں نے جھوٹ موٹ بنا رکھا تھا انہیں نکل گیا۔ (اس سے مراد جادو گروں کے بنائے ہوئے سانپ ہیں)۔ (اعراف ۱۱۷)

لیکن ہم جانتے ہیں کہ جھوٹے اور سرکش لوگ کبھی بھی منطقی راستہ لال سے آشنا نہیں رہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کی طاقت اور عمدہ دلیل کا بابل کے جابر نظام کے سرداروں کے دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ہوسکتا ہے متعنت عوام کے ایک گروہ کو اس سے بیدار بھی کیا ہو۔ لیکن وہ مستعجبین جو اس توحید کی منطق کو اپنے مفادات کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے، طاقت، نیزے کی نوک اور آگ کی منطق کے ساتھ میدان میں آگئے۔ یہ وہ منطقی جس کے سوا اور کوئی بات انھیں سمجھانی نہ دیتی تھی۔ انھوں نے اپنی طاقت کا سہارا لیا اور چلا کر کہا: اس کے لیے ایک اونچی سی جگہ بناؤ اور اس کے اندر آگ روشن کرو اور اسے اس جگہ سے دالی جنہم میں پھینک دو (قالوا ابنوا لہ بنیانا فالتوہ فی الجحیم)۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ حکم دیا گیا کہ ایک بہت بڑی چار دیواری بنانی جائے اور پھر اس کے اندر آگ جلائی جائے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک تو آگ کو پھینچنے اور آگ کی خطرات سے روکا جائے۔ دوسرے وہ دوزخ جس کی ابراہیمؑ بت پرستوں کو دھمکی دیتے تھے عملی طور پر تیار کر دی جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ابراہیمؑ جیسے ایک انسان کو جلانے کے لیے لکڑیوں کا ایک چھوٹا سا گٹھا ہی کافی تھا۔ لیکن بتوں کے ٹوٹنے سے ان کے دل میں جو آگ جھڑک رہی تھی وہ اسے ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے اور جہاں تک انتقام لیا جاسکتا تھا لینا چاہتے تھے اور ضمنی طور پر وہ بتوں کی شوکت و عظمت بھی ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ شاید ان کی برباد ہونے والی آبرو ٹوٹ آئے۔ نیز اپنے تمام مخالفین کو وہ درس عبرت دینا چاہتے تھے کہ یہ عبادت بھرا بھال کی تاریخ میں نہ دہرایا جائے۔ اس لیے وہ آگ کو تیار کرنا چاہتے تھے (اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ ”جیم“ لفظ میں اس آگ کے معنی میں ہے جو ایک دوسرے کے اوپر تہہ نہ رکھی گئی ہو)۔

بعض نے ”بنیان“ سے ”سببیت“ مراد لی ہے جس سے دور سے بھاری چیزیں پھینکی جاتی تھیں۔ لیکن اکثر مفسرین نے پہلی تفسیر کو اختیار کیا ہے کہ ”بنیان“ سے مراد عمارت اور بڑی چار دیواری ہے۔

یہاں قرآن اس سلسلے کے جزئیات کی طرف جو سورہ انبیاء میں آچکے ہیں، اشارہ نہیں کرتا۔ صرف یکجا کی طور پر ایک مختصر اور عمدہ پیرائے میں اس قصے کا آخری حصے کو اس طرح بیان کرتا ہے: انھوں نے ابراہیمؑ کو ختم کرنے کے لیے ایک زبردست منصوبہ تیار کیا تھا لیکن ہم نے انھیں ہست اور مغلوب کر دیا (فارد وا بہ کیداً فجعلناہم الاسفلین)۔

”کید“ اصل میں ہر قسم کی ”تدبیر سوچنے“ کے معنی میں ہے۔ چاہے وہ صبح راستے کے لیے ہو یا غلط کے لیے، اگرچہ عام طور پر یہ لفظ مذموم موقعوں کے بارے ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ لفظ نکرہ کی صورت میں آیا ہے۔ جبکہ نکرہ عظمت و اہمیت پر دلالت کرتا ہے، لہذا یہ ایک وسیع و درمیان منصوبے کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو ختم کرنے اور ان کی قوی و ملی تبلیغ کے اثرات ختم کرنے کے لیے بنایا تھا۔

ہاں خدائے انھیں اسفل اور پھلے در پھلے میں قرار دیا اور ابراہیمؑ کو اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔ جیسا کہ ان کی منطق میں بھی برتری تھی نیز آگ میں جلانے کے واقعے میں بھی خدائے انھیں برتر رکھا اور ان کے طاقتور دشمنوں کو ہست کر دیا۔ آگ کو ابراہیمؑ کے لیے سرد اور سلامتی والا بنا دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک بال تک بھی نہ جلائی اور وہ اس آگ کے دریا سے صحیح و سالم باہر نکل آئے۔ ایک دن میں تو وہ نوحؑ کو غرق ہونے سے نجات دیتا ہے اور دوسرے دن ابراہیمؑ کو ”حوق“ (جہنم) سے نجات دیتا ہے۔

واضح کر دے کہ پانی اور آگ اس سے تابح عنوان میں اور جو کچھ خدا حکم دیتا ہے وہ وہی کرتے ہیں۔

ابراہیمؑ اس ہولناک حادثہ اور خطرناک سازش سے جو دشمن نے ان کے خلاف کی تھی صحیح و سالم اور سر بلند باہر نکل آئے، اور چونکہ بابل میں آپ نے اپنی پیغام رسانی کی ذمہ داری کو ادا کر دیا تھا لہذا شام کی مقدس سرزمین کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا اور کہا ”میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں وہ مجھے ہدایت کرے گا“ (وقال انی ذاہب الی ربی سیہدین)۔ یہ بات واضح ہے کہ خدا کوئی مکان نہیں رکھتا، لیکن آلودہ اور گندے ماحول سے پاک ماحول کی طرف ہجرت کرنا، خدا کی طرف ہجرت کرنا ہے۔

سرزمین انبیاء و اولیاء کی طرف ہجرت اور وحی الہی کے مراکز کی طرف ہجرت خدا کی طرف ہجرت ہے۔ جیسا کہ نکرہ کی طرف سفر کرنے کو ”سفر الی اللہ“ کہا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں انجام فریضہ عالمی کی طرف ہجرت دوست کی طرف سفر کرنا ہے اور اس سفر میں ہر جگہ ہادی رہنا خالص ہے

یہاں خدا سے ان کا پہلا تقاضا اور درخواست جو مذکورہ بالا آیات میں مذکور ہے، صالح اور نیک فرزند کی درخواست ہے۔ ایسا فرزند جو ان کے راستے کو دوام بخشنے اور ان کے ادھرے کاموں کی تکمیل کرے۔ یہ وہ منزل تھی کہ انھوں نے عرض کیا: ”پروردگار! مجھے ایک فرزند صالح عطا فرما“۔ (رب ہب لی من الصالحین)۔

کتنی عمدہ تعبیر ہے ”صالح اور نیک فرزند“ اعتقاد و ایمان کے لحاظ سے صالح، گفتار و عمل کے لحاظ سے صالح اور تمام اہمیت سے صالح۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک جگہ تو ابراہیمؑ اپنے لیے درخواست کرتے ہیں کہ وہ صالحین میں سے ہوں، جیسا کہ قرآن ان کے قول کو نقل کرتا ہے:-

رب ہب لی حکماً والحقنی بالصالحین

پروردگار! مجھے علم و دانش مرحمت فرما اور مجھے صالحین سے ملتی کر دے۔ (شعرا ۸۲)

جبکہ یہاں یہ تقاضا کرتے ہیں کہ مجھے اولاد و صالح مرحمت فرما کیونکہ صالح ایک جامع صفت ہے جس میں ایک کامل انسان کی تمام خوبیاں جمع ہوتی ہیں۔

خدائے بھی اس کو قبول کر لیا اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے صالح بیٹے انھیں مرحمت فرمائے۔ چنانچہ اسی سورہ کی بعد والی آیات میں یہ بیان ہوا ہے۔

و بشرناہ باسحاق نبیاً من الصالحین

ہم نے اے اسحاق کی پیدائش کی بشارت دی جو صالحین میں سے نبی ہے۔

نیز اسماعیل کے بارے میں کہتا ہے:-

واسما حیل و اد ریس و ذالکفل کل من الصابرين و ادخلناهم فی رحمتنا
انهم من الصالحين
اور اسماعیل، اور ذالکفل کو یاد کرو، وہ سب صابریں میں سے تھے اور ہم نے انہیں اپنی
رحمت میں داخل کیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے۔ (انبیاء—۸۵، ۸۶)

چند اہم نکات

۱۔ ہر چیز کا خالق وہی ہے؛ زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے واللہ خلقکم و ما تعلمون ابراہیمؑ
بُت پرستوں سے کہتے ہیں: ”تم بھی خدا کی مخلوق ہو اور تمہارے بنائے ہوئے بت بھی“
بعض نے اس آیت کو اپنے فاسد مذہب جبر کے لیے توجیہ خیال کیا ہے (اس طرح سے کہ ”ما تعلمون“ میں ”ماکو
انہوں نے“ ماصدقہ“ لیا ہے اور کہا ہے کہ جملے کا مفہوم یہ ہو گا کہ خدا نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو خلق کیا ہے اور جب ہمارے اعمال
مخلوق خدا ہیں تو پھر اپنی طرف سے ہیں کچھ اختیار نہیں۔
یہ بات کئی جہات سے بے بنیاد ہے۔

اولاً جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ”ما تعلمون“ سے مراد یہاں بُت ہیں، جنہیں انہوں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا
نہ کہ اعمال انسانی، اور اس میں شک نہیں کہ وہ ان کے ہاتھ سے بنائے گئے تھے (اس بنا پر
مادہ موصول ہے)
ثانیاً؛ اگر آیت کا مفہوم وہ ہو جو انہوں نے خیال کیا ہے تو یہ تو بُت پرستوں کے ہاتھ سے بنائے گئے ہیں۔
بر خلاف۔ کیونکہ وہ کہہ سکتے تھے کہ ہماری بُت سازی اور بُت پرستی کا عمل چونکہ خدا نے خلق کیا ہے لہذا ہم تو اس سماٹے میں بالکل
بے قصور ہیں۔

ثالثاً؛ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ آیت کا مفہوم اور معنی اسی طرح ہو (جس طرح وہ کہتے ہیں) تو پھر بھی یہ جبر کی دلیل نہیں
ہے کیونکہ ارادہ و اختیار کی آزادی کی صورت میں ایک معنی کے لحاظ سے خدا ہی ہمارے اعمال کا خالق ہے، کیونکہ خدا کے سوا
ارادے کی یہ آزادی اور ارادہ کرنے کی طاقت اور روحانی، فکری، مادی اور روحانی قوتیں ہمیں کس نے دی ہیں؟ پس خالق وہی ہے
باوجودیکہ فضل ہمارا اختیاری ہے۔

۲۔ ابراہیمؑ کی ہجرت؛ بہت سے پیغمبروں نے اپنی زندگی میں اپنے فریضہ رسالت کی ادائیگی کے لیے ہجرت کی ہے ان میں
ایک ابراہیمؑ ہیں۔ ان کی ہجرت کے بارے میں قرآن کی مختلف آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔
سورہ تکوین کی آیت ۲۶ میں بیان ہے:-

وقال انی مهاجر الی ربی انہ ہوالعزیز
اس نے کہا: میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں وہ عزیز و رحیم ہے۔
اس مقام پر قرآن نے یہ بات ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کے مسئلے کے بعد بیان کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدائی رہبر جب اپنا فریضہ رسالت ایک جگہ مکمل کر لیتے تھے یا ماحول کو اپنی دعوت کے پھیلنے کے لیے سازگار
نہیں پاتے تھے تو اس عرض سے کہ ہمیں ان کی ذمہ داری اور پیام رسانی میں رکاوٹ نہ پڑ جائے ہجرت کر جاتے تھے۔ ادیان کی تاریخ
میں یہ ہجرتیں بہت زیادہ برکتوں کا سرچشمہ بنیں۔ یہاں تک کہ تاریخ اسلام ظاہری و معنوی لحاظ سے پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کے محور کے
گرد ہی گھومتی ہے اور اگر ہجرت نہ ہوتی تو اسلام مکہ کے بُت پرستوں کی چال بازیوں کے سامنے ہمیشہ کے لیے دب جاتا۔ یہ ہجرت ہی
معی جس نے اسلام اور مسلمانوں کو نئی روح عطا کی اور ہر چیز کو ان کے فائدے میں بدل کر رکھا دیا اور انسانیت کو ایک نئی راہ پر ڈالنا
بلکہ ایک لحاظ سے ہجرت ہر فرد مومن کے لیے ایک عمومی حکمتِ الہی ہے کہ وہ جب بھی اپنی زندگی کے دوران میں ماحول کو اپنے
مقدس مقاصد کے لیے غیر مناسب دیکھے اور اسے ایسی مشقتوں میں پائے جس میں ہر چیز خراب ہو جاتی ہے تو اس کے لیے
ضروری ہے کہ ہجرت کر جائے۔ اسے چاہیے کہ سامان سفر باندھ کر زیادہ مناسب سرزمین کی طرف کوچ کر جائے کیونکہ خدا کا ملک محدود نہیں
ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ذات سے باہر کی طرف ہجرت کرے، اپنی ذات کے اندر ہجرت کا اہتمام کرے۔ پہلے داخلی ہجرت کی
ضرورت ہے۔ آلودگیوں سے پاکیزگی کی طرف ہجرت، شرک سے ایمان کی طرف ہجرت، گناہ سے پروردگار بزرگ کی اطاعت
کی طرف ہجرت۔

یہ اندرونی ہجرت فزادہ معاشرہ کے لیے تبدیلی اور انقلاب کی ابتدا ہوگی اور بیرونی ہجرت کے لیے ایک مقدمہ اور تہیہ
بنے گی۔ ہم تفسیر نمونہ کی دوسری جلد سورہ نساء کی آیت ۱۰۰ کے ذیل میں ”اسلام و ہجرت“ کے عنوان کے تحت اس ضمن میں مفصل بحث
کر چکے ہیں۔

- ۱۰۱- فَبَشِّرْنَهُ بِنِعْمَةٍ مِنْ رَبِّهِ ۝
 ۱۰۲- فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَبْنَئُ إِنِّي آتِي فِي الْمَنَامِ إِنِّي أَذْبَحُكَ
 فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۖ قَالَ يَا بَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمِرُ ۖ سَتَجِدُنِي
 إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝
 ۱۰۳- فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝
 ۱۰۴- وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا بُرْهِيمُ ۝
 ۱۰۵- قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَبُكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝
 ۱۰۶- إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ۝
 ۱۰۷- وَفَدَيْنَاهُ بِذَبْحٍ عَظِيمٍ ۝
 ۱۰۸- وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝
 ۱۰۹- سَلَّمَ عَلَيْنَا يَا بُرْهِيمُ ۝
 ۱۱۰- كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝

ترجمہ

- ۱۰۱- ہم نے اسے (ابراہیم کو) ایک بردبار اور با استقامت لڑکے کی بشارت دی۔
 ۱۰۲- جس وقت وہ اس کے ساتھ سعی و کوشش کے قابل ہو گیا تو اس نے کہا: بیٹا! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ تم دیکھو، تمھاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا، ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کیجیے، انشاء اللہ آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔
 ۱۰۳- جب دونوں آمادہ و تیار ہو گئے اور ابراہیم نے اسے پیشانی کے بل لٹایا۔

- ۱۰۴- ابراہیم نے ذبح عظیم کو اس کا فدیہ بنایا۔
 ۱۰۵- اور اس کے نیک نام کو بعد والی امتوں میں باقی رکھا۔
 ۱۰۶- ابراہیم پر سلام ہو۔
 ۱۰۷- ہم نیکو کاروں کو اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں۔

تفسیر

ابراہیم قربان گاہ میں

- گزشتہ آیات میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ ابراہیم نے بابل میں اپنی رسالت کی اداگی کے بعد وہاں سے ہجرت کی اور اپنے پروردگار سے ان کا پہلا تقاضا یہ تھا کہ انھیں فرزند صالح عطا فرمائے کیونکہ ابھی تک وہ صاحب اولاد نہ تھے۔
 زیر بحث پہلی آیت حضرت ابراہیم کی اس دعا کی قبولیت کو بیان کر رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اسے ایک حلیم و بردبار اور با استقامت نوجوان کی بشارت دی (فبشیرناہ بغلام رحیم)۔
 حقیقت میں اس جملے میں تین بشارتیں جمع ہیں، ایک بیٹے کی، دوسری اس کے نوجوانی کے سن تک پہنچنے کی اور تیسری اس کے علم جیسی صفت کا حامل ہونے کی۔
 ”حلیم“ کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو توانائی ہوتے ہوئے کسی کام میں اس کے وقت سے پہلے جلدی نہیں کرتا اور محروموں کو سزا دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا، جو ایک عظیم روح کا مالک ہوتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات پر کنٹرول رکھتا ہے۔
 ”راغب“ مفردات میں کہتا ہے:-
 ”علم زیادہ شے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھنے کے معنی میں ہے اور چونکہ ایسی حالت عقل و غرور سے پیدا ہوتی ہے لہذا بعض اوقات یہ لفظ عقل و غرور کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
 البتہ علم کا حقیقی معنی وہ ہے جو پہلے بتایا گیا ہے۔ ضمنی طور پر اس توصیف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس فرزند کے بقا کی بشارت اس زمانہ تک کے لیے دی ہے جب وہ ایسے سن تک پہنچ جائے کہ علم کے ساتھ متصف ہو جائے اور جیسا کہ ہم

بعد والی آیات میں دیکھیں گے، اس نے اپنے سلیم ہونے کا "ذبح" کے موقع پر مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اپنے سلیم ہونے کا مظاہرہ اس وقت بھی اور آگ میں ڈلے جانے کے موقع پر بھی کیا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ لفظ "سلیم" قرآن مجید میں پندرہ بار آیا ہے یہ لفظ زیادہ تر خدا کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ سوائے دو موقعوں کے، جن میں یہ ابراہیمؑ اور ان کے فرزند کی صفت کے طور پر آیا ہے اور ایک موقع پر دوسروں کی زبان سے حضرت شعیب کی صفت میں بیان ہوا ہے۔

لفظ "غلام" بعض کے نظریہ کے مطابق سن جوانی تک پہنچنے سے پہلے ہر بچے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض نے اس پر اس کا اطلاق کیا ہے جو دس سال سے اوپر ہو لیکن ابھی سن بلوغ کو نہ پہنچا ہو۔

عربی لغت میں جو مختلف تعبیریں بیان ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ "غلام" دراصل "طفل" (بچہ) اور "شاب" (جوان) کے درمیان حوالہ فاصل ہے، جسے ہم فارسی زبان میں "نوجوان" سے تعبیر کرتے ہیں۔

آخر حضرت ابراہیمؑ کا فرزند مومو و خدانی بشارت کے مطابق پیدا ہوا اور باپ کا دل تو سالہا سال سے فرزند صالح کی انتظار میں تھا۔ فرزند کی پیدائش سے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملی پھر وہ فرزند بچپن کے دور کو گزار کر جوانی کے سن میں داخل ہوا۔

قرآن اس موقع پر کہتا ہے: جس وقت وہ اس کے ساتھ سعی و کوشش کے قابل ہوا (فلما بلغ معه السعی)۔ یعنی وہ ایسے موافق بن گیا کہ زندگی کے مختلف مسائل میں باپ کے ہمراہ سعی و کوشش کر کے اور اس کی مدد کر کے۔

بعض نے یہاں "سعی" کو عبادت اور خدا کے لیے کام کرنے کے معنی میں سمجھا ہے۔ البتہ "سعی" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں یہ معنی بھی شامل ہے لیکن اس میں منحصر نہیں ہے اور "معہ" باپ کے ساتھ کا معنی دیتا ہے۔ اس سے مراد ابراہیمؑ میں باپ کی معاونت و مدد ہے۔

بہر حال مفسرین کے قول کے مطابق بیٹا ۱۲ سال کا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک عجیب اور حیرت انگیز خواب دیکھا۔ یہ خواب اس عظیم الشان پیغمبر کے لیے ایک اور آزمائش شروع ہونے کو بیان کرتا تھا۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ انھیں خدا کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے قربانی کریں اور اسے ذبح کر دیں۔

ابراہیمؑ وحشت زدہ خواب سے بیدار ہوئے، وہ جانتے تھے کہ پیغمبروں کے خواب حقیقت ہوتے ہیں اور شیطانی وسوسوں دور ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اور راتوں میں بھی یہی خواب دیکھا جو اس امر کے لازم ہونے اور اسے جلد انجام دینے کے لیے تاکید تھی۔

کتے ہیں کہ پسی مرتبہ "شب تردیہ" (آٹھ ذی الحجہ کی رات) یہ خواب دیکھا اور "عرق" اور "مید قرآن" (نور سوری ذی الحجہ) کی راتوں میں خواب کا تکرار ہوا۔ لہذا اب ان کے لیے ذرا سا بھی شک باقی نہ رہا کہ یہ خدا کا فرمان ہے۔

ابراہیمؑ جو بارہا امتحان خداوندی کی گرم جوشی سے سرفراز ہو کر باہر آئے تھے اس دفعہ بھی چاہیے کہ بھروسہ میں کوئی حق تعالیٰ کے فرمان کے سامنے سر ہٹکا دیں اور اس فرزند کو جس کے انتظار میں مگر ایک حصہ گزار دیا تھا اور اب وہ ایک امر

اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کر دیں۔

لیکن ضروری ہے کہ ہر چیز سے پہلے اپنے فرزند کو اس کام کے لیے آمادہ کریں، لہذا اس کی طرف رخ کر کے فرمایا: میرے بیٹے! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کروں، اب تم دیکھو! تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ (قال یا بنی انی اری فی العنایم انی اذبحک فانظر ماذا تقرری)۔

بیٹا بھی تو ایسا شہید باپ کے وجود کا ایک حصہ تھا اور جس نے صبر و استقامت اور ایمان کا درس اپنی چھوٹی سی عمر میں اسی کے شب میں پڑھا تھا، اس نے خوشی خوشی غصوں دل کے ساتھ اس فرمان الہی کا استقبال کیا اور صراحت اور قاطعیت کے ساتھ کہا: جان! جو حکم آپ کو دیا گیا ہے اس کی تعمیل کیجیے (قال یا ابت افعل ما تقو مس)۔

میری طرف سے ہاں ملے گا۔ "انشاء اللہ آپ مجھے صابریں میں سے پائیں گے (ستجد فان شاء اللہ بن الصابریں)۔

باپ اور بیٹے کی یہ باتیں کس قدر معنی خیز ہیں اور کتنی باریکیاں ان میں چھپی ہوئی ہیں۔

ایک طرف تو باپ ۱۲ سالہ بیٹے کے سامنے اسے ذبح کرنے کی بات بڑی صراحت کے ساتھ کرتا ہے اور اس سے اس کی رائے معلوم کرتا ہے۔ اس کے لیے مستقل شخصیت اور ارادے کی آزادی کا قائل ہوتا ہے، وہ ہرگز اپنے بیٹے کو دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا اور اسے اندھیرے میں رکھتے ہوئے امتحان کے اس عظیم میدان میں آنے کی دعوت نہیں دیتا۔ وہ چاہتا ہے کہ بیٹا بھی اس عظیم امتحان پورے دل کے ساتھ شرکت کرے اور باپ کی طرح تسلیم و رضا کا مزہ چکھے۔

دوسری طرف بیٹا بھی یہ چاہتا ہے کہ باپ اپنے عزم و ارادہ میں بیجا اور مضبوط رہے۔ یہ نہیں کہتا کہ مجھے ذبح کر دیں۔ بلکہ کہتا ہے: جو آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے بجالائیں میں اس کے امر و فرمان کے سامنے تسلیم خم ہوں، خصوصاً باپ کو "یا ابت" جان! کہہ کر مخاطب کرتا ہے، تاکہ اس بات کی نشاندہی کر دے کہ اس مسئلے پر جذبات فرزند و پدر کا سوئی کی نوک کے برابر بھی نہیں، کیونکہ فرمان خدا ہر چیز پر حاکم ہے۔

اور تیسری طرف سے ہر درد و کار کی بارگاہ میں مراتب ادب کی اعلیٰ ترین طریقے سے پاسداری کرتا ہے، ہرگز اپنے ایمان اور ارادہ کی قوت پر بھروسہ نہیں کرتا، بلکہ خدا کی مشیت اور اس کے ارادے پر بھروسہ کرتا ہے اور اس جبارت کے ساتھ اس سے اور استقامت کی توفیق چاہتا ہے۔

اس طرح سے باپ بھی اور بیٹا بھی اس عظیم آزمائش کے پہلے حصے کو گل کا سیاہی کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔

اس دوران کیا کیا حالات پیش آئے، قرآن نے انھیں تشریح کے ساتھ بیان نہیں کیا اور صرف اس عجیب ماجرے کے اس پہلو ذکر کیے ہیں۔

اس نے لکھا ہے کہ خدا کا بیٹے نے اس بنا پر کہ باپ کی اس ماموریت کی انجام دہی میں مدد کرے اور ماں کے رنج و اندوہ سے۔ جس وقت وہ لے مرزبان "منیٰ" کے خشک اور جلا ڈالنے والے گرم پہاڑوں کے درمیان، قربان گاہ میں لائے گئے کہا: ابا جان! رسی کو مضبوطی کے ساتھ باندھ دیجئے، تاکہ میں فرمان خداوندی کے اجراء کے وقت ہاتھ پاؤں ہلا سوں

یا اس لحاظ سے کہ خدا کی راہ میں اور خدا کے لیے تھی یا اس لحاظ سے کہ یہ قربانی خدا کی طرف سے براہیم کے لیے بھی گئی تھی یا نہ
مفسرین نے اس سلسلے میں بہت کچھ کہا، لیکن کوئی مالم نہیں کہ یہ تمام حجات ذبح عظیم میں جمع ہوں اور وہ مختلف جہاں
سے عظمت کی حامل ہو۔

اس ذبح کی عظمت کی ایک نشانی یہ ہے کہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ ہر سال زیادہ وسعت پا رہی ہے۔
اس وقت ہر سال اس ذبح عظیم کی یاد میں دس لاکھ سے زیادہ جانور ذبح کیے جاتے ہیں اور اس یاد کو زندہ کیا جاتا ہے۔
”خدینا“ ”خدیہ“ کے مادہ سے اصل میں کسی شخص یا چیز کی یاد دہ کرنے یا دفع ضرر کے لیے کسی دوسری چیز کو مدد قرار دینے
کے معنی میں ہے۔ اسی لیے وہ مال جو قیدی کو آزاد کرنے کے لیے دیتے ہیں اسے ”خدیہ“ کہتے ہیں۔ نیز اس لفظ کو بھی خدیہ کہتے ہیں
جو بعض بیمار روزہ کے بجائے دیتے ہیں۔

وہ بہت بڑا مینڈا براہیم کو کس طرح دیا گیا اس بارے میں زیادہ تر اس بات کے معتقد ہیں کہ اسے جبرئیل لائے تھے، بعض یہ بھی
کہتے ہیں کہ وہ ”منیٰ“ کے پہاڑوں کے دامن سے پٹھے اُترا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا خدا کے علم اور اس کے ارادے سے تھا۔

خدا نے صرف اس دن کے عظیم استمان میں حضرت ابراہیم کی کامیابی کی تعریف و توصیف کی۔ بلکہ اس کی یاد کو جاودانی بنا دیا
جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے ابراہیم کے نیک نام کو بعد کی امتوں میں باقی رہنے والا بنایا (و ترکنا علیہ
فی الٰخذین)۔

وہ آنے والی سب نسلوں اور لوگوں کے لیے نمونہ اور تمام پاکباز اور کونے دوست کے ولداہ عاشقوں کے لیے راہنما بن گئے
اور ہم نے ان کے طرز عمل کو رہنما بنا کر دیا تاکہ ان کے لیے حج کی سنت کے طور پر جاودانی بنا دیا۔ وہ عظیم پیغمبروں کے باپ تھے وہ امت اسلامی
اور پیغمبر اسلام کے باپ تھے۔

ابراہیم پر سلام (جو مخلص اور پاکباز تھا)۔ (مسلا مر علی ابراہیم)۔
ہاں ہم اسی طرح سے نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں (کذا لک نجوی المحسنین)۔
عظمت دینا کا صلہ، تمام زمانوں میں ہمیشگی کا صلہ، خدا نے بزرگ کے لائق درود و سلام کا صلہ۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”کذا لک نجوی المحسنین“ کا جملہ ایک دفعہ تو یہاں آیا ہے اور اس سے پہلے کی چند

ظاہر ہے کہ ہاؤنڈ کتا ہی با عظمت کیوں نہ ہو وہ کسی عام انسان کے مقابلے میں بھی عظیم نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ وہ ایک نبی و رسول اور وہ بھی ذبح اللہ
جیسے نبی کے مقابلے میں، لہذا ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، ورنہ مسکو واضح ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ نہیں
توجہ ذبح عظیم سے کون مراد ہے؟ اس سلسلے میں شام مشرق کہتے ہیں۔

سہ اللہ اللہ اللہ بسم اللہ پر معنی ”ذبح عظیم“ آملیہ
جیکہ شیعہ ذبحی طرق سے کئی ایک روایات بھی اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ذبح عظیم سے مراد امام حسین کی قربانی ہے (مسک مج)

آیات میں بھی آیا ہے۔ اس تکرار میں شاکہ کوئی نکتہ ہے۔

ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے مرتبے میں تو خدا تعالیٰ حضرت ابراہیم کی ان کامیابیوں میں کامیابی کی تصدیق کرتا ہے
اور ان کی کامیابی پر ہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ یہ خود ایک عظیم جزا ہے، یہ ایک اہم خوشخبری ہے۔ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو دی تھی
اس کے بعد ذبح عظیم کے فدیہ کرنے، ان کے نام اور سنت کے جاوہل رہنے اور ان کے کامیابیوں کا ذکر ہے جو عین دوسری
بڑی نعمتیں ہیں اور سب سے نیکو کاروں کے اجر کے عنوان سے بیان کرتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ ذبح اللہ کون ہے؟ اس بارے میں کہ حضرت ابراہیم کے دونوں فرزندوں (اسماعیل اور اسحاق) میں سے کون قرآن
میں لایا گیا اور کس نے ذبح اللہ کا لقب پایا؟ مفسرین کے درمیان شدید بحث ہے۔ ایک گروہ حضرت اسحاق کو ”ذبح“ جانتا
ہے اور ایک جماعت حضرت اسماعیل کو۔ پہلے نظریے کو بہت سے مفسرین اہل سنت اور دوسرے نظریے کو مفسرین شیعہ نے
انتخاب کیا ہے۔

لیکن جو کچھ قرآن کی مختلف آیات کے ظاہر سے ہم آہنگ ہے وہ یہی ہے کہ ”ذبح“ اسماعیل تھے کیونکہ:
اولاً: ایک جگہ بیان ہوا ہے:-

و بشرناہ باسحاق نبیاً من الصالحین

ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی جو صالحین میں سے ایک پیغمبر تھا۔ (صافات — ۱۱۲)

یہ تعبیر بخوبی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا نے اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت اس واقعے کے بعد دی ہے اور حضرت ابراہیم کی
قربانیوں کی وجہ سے انھیں یہ بشارت دی گئی۔ اس بنا پر ذبح کا واقعہ ان کے ساتھ مربوط نہیں تھا۔

علاوہ ازیں جب خدا کسی کی نبوت کی بشارت دیتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ زندہ رہے گا اور یہ بات بچپن میں نبی
کے منہ سے نکلتی ہے۔

ثانیاً سورۃ ہود کی آیت ۱۱ میں بیان ہوا ہے:-

فبشرناہا باسحاق ومن وراء اسحاق یعقوب

ہم نے اسے اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کے پیدا ہونے کی بھی۔

یہ آیت اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ حضرت ابراہیم مطمئن تھے کہ اسحاق زندہ رہیں گے اور ان سے یعقوب جیسا فرزند
پیدا ہوگا اس بنا پر ان کے ذبح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو لوگ حضرت اسحاق کو ذبح جانتے ہیں، حقیقت میں انھوں نے
ان آیات کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ثالثاً، منابع اسلامی میں بہت سی روایات ایسی آئی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ”ذبح“ اسماعیل تھے

نہونہ کے طور پر۔

ایک معتبر حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے منقول ہے:

انا ابن الذبیحین
میں دو بیٹوں کا بیٹا ہوں

اور دو بیٹوں سے مراد ایک آپ کے والد گرامی حضرت عبدالمنذر ہیں، کیونکہ پیغمبر اکرم کے ہمدرد حضرت عبدالمنذر نے نذر مانگی تھی کہ وہ انھیں خدا کے لیے قربان کر دیں گے۔ اس کے بعد مکہ خداسے ایک سوانت ان کے فدویہ کے طور پر دینے گئے اور ان کی وارث مشہور ہے۔ دوسرے حضرت اسماعیل تھے کیونکہ یہ بات سلم سے کہیںب اسلام جناب اسماعیل کی اولاد میں سے تھے نہ کہ حضرت اسماعیل کی ریلہ

اس دوامیں جو علی علیہ السلام نے پیغمبر گرامی سے نقل کی ہے، یہ بیان ہوا ہے:

یا من فدا اسماعیل من الذبیح
لے وہ جس نے اسماعیل کے لیے فدیہ قرار دیا ریلہ

ان احادیث میں جوامام باقر اور امام صادق سے نقل ہوئی ہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت لوگوں نے سوال کیا کہ ذبیح کون تھا؟ تو آپ نے فرمایا: "اسماعیل"

اس حدیث میں جوامام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، یہ بیان ہوا ہے۔

لوعلم الله عز وجل شيئاً اكرم من الضأن لعدا به اسماعیل
اگر کوئی جانور (خدا کے نزدیک) دوسے سے بہتر ہوتا تو لے اسماعیل کا فدیہ قرار دیتا ریلہ

خلاصہ یہ کہ اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں اگر ہم ان سب کو نقل کرنا چاہیں تو گفتگو لمبی ہو جائے گی ریلہ

ان فزاوا روایات کے مقابلے میں جو قرآن کی آیات کے ظاہری مفہوم سے بھی ہم آہنگ ہیں ایک شاذ روایت بھی ہے، جو حضرت اسماعیل کے ذبیح ہونے پر دلالت کرتی ہے جو پہلی روایات کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی ظاہر آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ مسئلہ مسلم ہے کہ وہ پھر جے ابراہیم ہم خداسے اس کی ماں کے ساتھ نکلے اور وہاں پر

لے تفسیر "جمع البیان" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

لے تفسیر جلد ۳ ص ۲۲۱

لے تفسیر جلد ۳ ص ۲۲۲

لے ان روایات کے بارے میں مزید اطلاع کے لیے تفسیر "برهان" (جلد ۲، ص ۲۸) اور تفسیر ذرا تعلقین جلد ۳ ص ۲۲۰، ۲۲۱ اس کے بعد کی طرت رجوع کریں۔

لے چھوڑا۔

چھوڑا کہ اس کی مدد کے ساتھ بنایا اور اس کے ساتھ طواف وحی بجلائے وہ اسماعیل تھے۔ یہ اور اس بات کی نشاندہی تھی کہ ذبیح بھی اسماعیل ہی تھے کیونکہ ذبیح کا مل مذکورہ بالا پروگرام کی تکمیل کرتا ہے۔

ابنہ جو کچھ کتب حدیث (موجودہ تورات) سے معلوم ہوتا ہے یہ سب کہ ذبیح اسماعیل تھے ریلہ

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں کے ماں بعض غیر معروف روایات جن میں حضرت اسماعیل کو ذبیح قرار دیا گیا ہے، اسروا روایات سے متاثر ہیں اور اسماعیل کی اولاد میں سے ہیں۔ یہودی جو کہ حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے تھے لہذا وہ چاہتے تھے کہ یہ افتخار و اعزاز اپنے لیے جنت کر لیں اور کسانوں کہ جن کے رسول نسل اسماعیل سے ہیں ان سے یہ اعزاز چھین لیں چاہے اس کے لیے حقائق کا انکار ہی کیوں نہ ہو۔

بہر حال ہمارے لیے جو کچھ سب سے زیادہ محکم ہے وہ آیات قرآن کے ظاہر میں جو بخوبی نشاندہی کرتے ہیں کہ ذبیح اسماعیل تھے اگرچہ ہمارے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ذبیح اسماعیل ہیں یا اسماعیل، دونوں ابراہیم کے فرزند تھے اور دونوں ہی خدا کے عظیم پیغمبر تھے۔ مقصد تو اس تاریخی واقعے کا واضح درویش ہونا ہے۔

۲۔ کیا ابراہیم فرزند کو ذبیح کرنے پر مامور تھے؟ ایک اور سوال جو یہاں مفسرین کو درپیش ہے یہ ہے کہ کیا ابراہیم واقعتاً بیٹے کو ذبیح کرنے پر مامور تھے یا انھیں اس کے مقدمات کا علم تھا؟ اگر وہ ذبیح پر مامور تھے تو پھر یہ حکم الہی انجام پانے سے پہلے ہی کس طرح منسوخ ہو گیا؟ جب کہ عمل سے پہلے منسوخ ہونا جائز نہیں ہے اور یہی حکم اصول فقہ میں ثابت ہو چکا ہے۔

اگر وہ ذبیح کے لیے اقدامات کرنے پر مامور تھے تو یہ انتہار کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس مسئلے کی اہمیت اس امر سے پیدا ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم کا خیال تھا کہ مقدمات فراہم کرنے اور بتائی امور انجام دینے کے بعد شاید ذبیح کا مل محکم دیا جائے اور یہی ان کا عظیم استمان تھا۔ ہمارے نزدیک اس نظریے میں کوئی خاص جاذب نظر بات نہیں ہے ہماری رائے میں یہ سب باتیں اس لیے پیدا ہوئی ہیں کہ اسماعیلی اور غیر اسماعیلی اور اسماعیلیوں میں فرق نہیں رکھا گیا۔ ابراہیم کو جو امر ہوا تھا وہ ایک اسماعیلی امر تھا اور ہم یہ جانتے ہیں کہ اسماعیلی اور اسماعیلیوں میں فرق نہیں رکھا گیا۔ ایسے اور اسماعیلیوں میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ مورد آزمائش شخص کمال تک فزان کی طاقت پر آمادگی رکھتا ہے اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ مورد آزمائش شخص پشت پر وہ اسرار سے آگاہ نہیں ہوتا۔

لہذا یہاں نسخ واقع نہیں ہوا کہ عمل سے پہلے اس کی صحت کے بارے میں بحث و گفتگو ہو۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس واقعے کے بعد حضرت ابراہیم سے کہتا ہے۔

قد صدقت الرعایا

لے ابراہیم! تم نے جو خوب دیکھا تھا سچ کر دکھایا۔

شیطان نے اپنے دوسرے کو جاری رکھتے ہوئے کہا: اس کا دعویٰ ہے کہ خدا نے اسے حکم دیا ہے۔
 ہامو نے کہا: اگر خدا نے اسے حکم دیا ہے تو پھر اسے اطاعت کرنا چاہیے، اور سوائے رضائے تسلیم کے کوئی دوسری
 چیز نہیں ہے۔

پھر شیطان ان کے بیٹے اسماعیل کے پاس آیا، اور انہیں درخشاں لگا۔ ان سے بھی اسے کچھ حاصل نہ ہوسکا، کیونکہ اس نے
 اسماعیل کو تسلیم و رضا کا پیکر پایا۔

آخر میں حضرت ابراہیمؑ کے پاس آیا اور ان سے کہا: ابراہیم! جو خواب تم نے دیکھا ہے وہ شیطانی خواب ہے، تم شیطان
 کی اطاعت نہ کرو۔

ابراہیمؑ نے نور ایمان اور نبوت کے پر تو میں اسے پہچان لیا، چلا کر کہا: ”دور ہوجائے دشمن خدا“
 ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پہلے مشرکوں میں آئے تاکہ بیٹے کی قربانی دیں، تو شیطان ان کے پیچھے دوڑا۔ وہ
 جبرہ اولیٰ کے پاس آئے۔ شیطان وہاں بھی ان کے پیچھے لگ گیا۔ ابراہیمؑ نے سات تھپڑاٹھا کر اسے مارے۔ جس وقت دوسرے جبرہ
 پاس پہنچے تو پھر شیطان کو دیکھا، دوبارہ سات تھپڑے مارے یہاں تک کہ ”جبرہ عقبہ“ میں آئے تو سات اور تھپڑے مارے۔
 اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنے سے مایوس کر دیا۔

یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ شیطانی دوسرے امتحان کے عظیم میدانوں میں ایک طرف سے ہی نہیں بلکہ مختلف
 سمتوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔

ہر زمانے میں ایک نئے رنگ میں اور ایک نئے طریقے سے۔ موان خدا کو چاہیے کہ وہ ابراہیمؑ کی طرح شیاطین کو تمام چوں ہیں
 پہچانیں اور وہ جس طریقے سے بھی وارد ہوں، ان کے راستے بند کر دیں اور انہیں سٹنگار کریں اور کیا ہی عظیم درس ہے یہ۔

۵۔ ”منیٰ“ میں تکبیرات کا فلسفہ، ہم جانتے ہیں کہ اسلامی روایات میں میدانا منیٰ کے بارے میں جو احکام آئے ہیں ان
 میں کچھ مخصوص تکبیریں ہیں۔ جو تمام مسلمان پڑھتے ہیں چاہے وہ مراہم حج میں شریک ہوں اور منیٰ میں موجود ہوں اور چاہے دوسرے
 مقامات پر ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ جو منیٰ میں ہیں وہ ۱۵ نمازوں کے بعد پڑھتے ہیں جن میں سے پہلی حید کے دن کی نماز ظہر ہے اور
 جو منیٰ میں نہیں ہوتے وہ ۱۰ نمازوں کے بعد تکرار کرتے ہیں اور ان تکبیرات کی صورت اس طرح ہے۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، و اللہ اکبر، اللہ اکبر، واللہ الحمد،
 اللہ اکبر علی ما ھدانا
 جس وقت ہم اس حکم کا اس حدیث کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھتے ہیں۔ جسے ہم پہلے نقل کر چکے

۱۔ تفسیر ابو الفتوح رازی جلد ۹ ص ۲۲۶، زیر بحث آیت کے ذیل ہیں۔

۲۔ ایضاً

قرآن کی وجہ یہ ہے کہ فرزند ولایت کو ذبح کرنے کے سلسلے میں جو کچھ ان کے بس میں تھا انہوں نے انجام دیا اور ان
 میں اپنی روحانی آمدنی کی ہر بہت سے درجہ ثبوت تک پہنچا دی اور آزمائش کی اس ذمہ داری کو خوب اچھی طرح سے پورا کر دیا۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ کا خواب کس طرح محنت ہو سکتا ہے؟ خواب اور خواب دیکھنے کے بارے میں بہت سی باتیں
 جس کی ایک مبسوط تفسیر ہم سورتہ یوسف کی آیہ ۶ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

یہاں پر جو بات مندرجی ہے کہ جس کی طرف توجہ کی جائے یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب کو کس طرح محنت سمجھا اور
 کیوں اپنے عمل کا معیار قرار دیا؟ اس سوال کے جواب میں بھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ انبیاء کے خواب ہرگز شیطانی خواب نہیں ہوتے اور
 وہ قوتِ دہم کی مخالفت کی پیداوار ہوتے ہیں، بلکہ وہ ان کی نبوت اور وحی کا ایک گوشہ ہوتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں انبیاء کا مصدر وحی کے ساتھ ارتباط کبھی تو دل میں انعقاد کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی فرشتہ صوری کو دیکھنے کی
 صورت میں ہوتا ہے اور کبھی صوتی امواج کی راہ سے جو خدا کے فرمان سے پیدا ہوتی ہیں اور بھی خواب کے طریقے سے۔ لہذا ان کے
 خوابوں میں کسی قسم کی خطا یا غلطی پیدا نہیں ہوتی، اور جو چیز وہ خواب میں دیکھتے ہیں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ بیداری
 میں دیکھتے ہیں۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے بیداری کی حالت میں وحی کے ذریعے آگاہی حاصل کی تھی کہ وہ ”ذبح“ کے بارے
 میں جو خواب دیکھیں اس پر عمل کریں۔

نیز کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس خواب میں مختلف قرائن تھے۔ ایک یہ کہ تین شب پے درپے بعینہ اس کا تکرار ہوا کہ جس نے اُنکے
 لیے یہ علم و یقین پیدا کر دیا کہ یہ ایک خدائی ماہوریت ہے کوئی اور چیز نہیں ہے۔

ہر حال ممکن ہے کہ یہ تمام ہی تفاسیر صحیح ہوں اور آپس میں کوئی تضاد بھی نہیں رکھتیں اور خواہر آیات کے خلاف بھی نہیں ہیں۔

۳۔ شیطانی دوسرے ابراہیمؑ کی عظیم روح پر اثر نہ کر سکے، ابراہیمؑ کا امتحان پوری تاریخ میں ایک عظیم امتحان تھا۔ ایسا
 امتحان جس کا مقصد یہ تھا کہ ان کے دل کو طغیر مذاکی ہر وجہت اور مشق سے پاک رکھنا اور مشق الہی کو ان کے سارے کے سارے دل پر
 سایہ نکل کرنا تھا۔ بعض روایات کے مطابق شیطان نے بہت طاقتور پاؤں مارے کہ کوئی ایسا کام کرے کہ حضرت ابراہیمؑ اس میدان سے
 کامیاب ہو کر نہ نکلے، کبھی وہ (انہیں کی) ماں ہاجرہ کے پاس آیا اور ان سے کہا تمہیں معلوم ہے کہ ابراہیمؑ نے کیا ارادہ کیا ہے؟
 وہ چاہتا ہے کہ آج اپنے بیٹے کو ذبح کر دے۔

ہاجرہ نے کہا: دور ہوجا، مجال اور نہ ہونے والی بات نہ کہ، کیونکہ وہ تو بہت ہریان ہے اپنے بیٹے کو کیسے ذبح کر سکتا ہے؟
 اصولاً کیا دنیا میں کوئی ایسا انسان پیدا ہو سکتا ہے جو اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر دے؟

۱۔ جلد ۵ میں ملاحظہ کیجئے۔

جس وقت حمرات (پتھر کے تین مخصوص ستون جنہیں جان کرام مزاج میں منگھا کرتے ہیں اور ہر دفعہ سات پتھر مزاج مخصوص کے ساتھ انہیں ملدے ہیں) کے پاس جائیں تو یہ مٹا ہاری نظر میں واضح ہوتا ہے کہ یہ سب پتھر ایک بے روح ستون کی طرف پھینکے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے اور اس سے کون سا مسئلہ ملتا ہے؟ لیکن اس وقت اس کا مفہوم کھل کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے جب ہم دل میں یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تو کتب توحید کے بہرہ اور ابراہیم کے شیطان کے دوسروں سے مقابلے اور جہاد کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہے کہ جب شیطان تین مرتبہ ان کے راستے میں حائل ہونے کے لیے آیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ انہیں اس "جہاد اکبر" کے میدان میں سستی اور شک و شبہ میں مبتلا کر دے لیکن ابراہیمؑ بیٹے ہمارے ہر دے تینوں مرتبہ پتھر مار کر اسے اپنے سے دور کر دیا۔

ان مراسم کا مفہوم یہ ہے کہ تم سب کو بھی اپنی پوری زندگی میں جہاد اکبر کے میدان میں شیاطین کے دوسروں کا سامنا ہے اور جب تک تم انہیں منگھا کر نہ کر دو گے اور اپنے سے دور نہ بھگا دو گے، کامیاب نہ ہو گے۔

اگر تم یہ چاہتے ہو کہ جس طرح خداوند تعالیٰ نے ابراہیمؑ پر سلام بھیجا ہے اور ان کے مکتب اور یاد کو جاودانی بنا دیا ہے تم پر بھی لطف و رحمت کی نظر کرے، تو ضروری ہے کہ ان کے راستے پر ہمیشہ چلو۔

یاجس وقت ہم صفا اور مردہ کی طرف آتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ گردہ در گردہ ایک چھوٹی سی پہاڑی سے اس سے بھی زیادہ چھوٹی پہاڑی کی طرف جاتے ہیں اور وہاں سے پھر اسی کی طرف پلٹ آتے ہیں اور بلا کچھ حاصل کیے اس ٹل کو دہراتے ہیں، کبھی دوڑتے ہیں اور کبھی چلتے ہیں، یقیناً ہم تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیا کام ہے اور اس کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟

لیکن پھر ہم پیچھے کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور اس بلایمان خاتون (ہاجرہ) کی اپنے شیر خوار بچے اسماعیلؑ کی جان بچانے کے لیے، اس خشک اور گرمی سے جلتے ہوئے بیابان میں سعی و کوشش کو یاد کرتے ہیں کہ کسی طرح اس سعی و کوشش کے بعد خدا نے اسے اس کے مقصد تک پہنچایا۔ زرم کا پتھر اس کے نوزائیدہ بچے کے پاؤں کے پٹھے سے پھوٹا۔ اچانک زمانے کی گردش پیچھے کی طرف لڑتی ہے ہر دے ہٹ جاتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو اس لے ہاجرہ کے پاس پاتے ہیں اور اس کے ساتھ سعی و تلاش میں ہم گام ہو جاتے ہیں کیونکہ راہ ظہن کوئی بھی شخص سعی و تلاش کے بغیر منزل تک نہیں پہنچتا۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، اس سے انسان آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ حاصل کر سکتا ہے کہ حج کے ان روز کی تعلیم دینا چاہیے۔ اور ابراہیمؑ، ان کے فرزند اور ان کی زوجہ کی یادوں کی قدم بہ قدم پیروی کرنی چاہیے تاکہ حج کے نفع کا بھی ادراک ہو اور حج کے اخلاقی، عینی اور گہرے اثرات بھی حجاج کے دلوں پر سایہ لگن ہوں کیونکہ ان آثار کے بغیر ظاہری پھلکے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تکبیر حقیقت میں جبرئیل اور اسماعیلؑ اور ان کے باپ ابراہیمؑ کی تکبیروں کا مجموعہ ہیں اور کچھ پر اٹھانہ ہے۔

دوسرے نظروں میں یہ الفاظ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی اس عظیم آزمائش میں کامیابی کی یاد لوگوں کی منظروں میں زندہ کرتے ہیں، اور تمام مسلمانوں کو ایک پیغام الہی دیتے ہیں۔ چاہے وہ منیٰ میں ہوں یا منیٰ کے علاوہ دوسرے مقامات پر۔

ضمنی طور پر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "منیٰ" کا نام اس بنا پر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جب اس زمین پر پہنچے اور اپنے امتحان سے گزر چکے تو جبرئیلؑ نے ان سے کہا: جو کچھ آپ چاہتے ہیں، اپنے پروردگار سے کہیں انہوں نے خدا سے تمنا کی کہ خدا یہ حکم دے کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے ذریعے طور پر ذبح کریں اور ان کی یہ تمنا پوری ہو گئی۔

۶۔ حج ایک اہم انسان ساز عبادت ہے؛ سفر حج حقیقت میں ایک عظیم ہجرت ہے، ایک خدائی سفر ہے، خود سازی اور جہاد اکبر کا ایک وسیع میدان ہے۔

مزاج حج حقیقت میں ایک ایسی عبادت کی نشاندہی کرتے ہیں جو ابراہیمؑ، ان کے فرزند اسماعیلؑ اور ان کی زوجہ ہاجرہ کی جہاد اور جہاد کی گہری یاد کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہم اگر اس راہ کے مطالعے میں اس نکتہ سے غفلت برتیں تو اس کے بہت سے مراسم متاثر کھائی دیں۔ ہاں اس معام کے حل کی چابی اس گہرے تعلق کی طرف توجہ کرنے میں ہے۔

جب ہم منیٰ کی قربان گاہ میں آتے ہیں تو ہم تعجب کرتے ہیں کہ یہ سب قربانیاں کس لیے ہیں؟ اصولی طور پر یہ کیا جانور ذبح کرنا بھی عبادتوں میں سے ایک عبادت ہو سکتی ہے؟

لیکن جب ہم حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کو یاد کرتے ہیں، جنہوں نے اپنے عزیز ترین اور اپنی عمر کے شیریں ترین شرک و راہ خدا میں قربان کیا تھا اور اس کے بعد ایک سنت قربانی کے عنوان سے منیٰ میں وجود میں آئی، تو ہمیں اس کام کا فلسفہ معلوم ہو جاتا ہے۔

یہ قربانی مجبوری کی راہ میں ہر چیز کو چھوڑ دینے کی دلیل ہے۔ یہ قربانی غیر خدا کی یاد سے دل کو خالی کرنے کا منظر ہے۔ ان مناسک سے اسی وقت پورا پورا تربیتی فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ حضرت اسماعیلؑ کے ذبح ہونے کا منظر اور قربانی کے وقت اس باپ اور بیٹے کی روحانی حالت اور جذبات کا منظر آنکھوں میں پھر جائے، اور وہ حالت و جذبات انسان کے وجود پر اپنا پورا ثبوت لگائے۔

۱۔ تفسیر نورالتئین جلد ۲ ص ۲۲۰ (مریث ۶۸)

۲۔ انہوں نے اس کے ساتھ کتبائے کرام سے منظر مطلوب شکل اختیار کر لی ہے جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے علماء اسلام کو کوشش کرنی چاہیے ہاں اس سلسلے میں واقع کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جلد ۷ سورہ حج کی آیات ۲۶ تا ۲۸ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

یا ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے لیے خدا کی ایک اور نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی
 کے مقرر میں تھا کہ پیغمبر ہوا اور صالحین میں سے ہوا (و بشرناہ باسحاق نبیاً من الصالحین)۔

”بشرناہ بغلام حلیم“ کی آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم اس واقعے کے آغاز میں ذکر ہوئی ہے، بخوبی
 درو روشن ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں بشارتیں دو بیٹوں کے ساتھ مربوط ہیں۔ اگر آخری بشارت زیر بحث آیت کی صراحت کے
 ”اسحاق“ سے مربوط ہے تو پھر ”غلام حلیم“ (برو بارو صابر) کی بشارت یقیناً ”اسحاق“ سے ربط رکھتی ہے اور جن لوگوں کا یہ
 مراد ہے کہ اسحاق ہی ذریعہ ہیں انھوں نے دونوں آیات کا ایک ہی مطلب کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلی
 آیت کو خود بیٹے کی اصل بشارت سمجھا ہے اور دوسری آیت کو نبوت کی بشارت۔ لیکن یہ معنی بہت سیدھے ہیں۔

زیر بحث آیات و صراحت کے ساتھ کہتی ہیں کہ یہ دونوں بشارتیں دو الگ الگ بیٹوں کے ساتھ مربوط ہیں۔

(خود پیچھے گا)

اس سے قطعاً نظر بشارت نبوت بتاتی ہے کہ اسحاق زندہ رہے اور فرائض نبوت انجام دیں گے، لیکن یہ بات ذریعہ کے
 سلسلے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں ہم ایک مرتبہ پھر صالحین کے مقام و مرتبہ کی عظمت ملاحظہ کر رہے ہیں۔ حضرت اسحاقؑ کی
 توصیف و تعریف میں فرمایا گیا ہے، کہ وہ پیغمبر ہوں گے اور صالحین میں سے ہوں گے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قبلے بزرگ بزرگ
 کی بارگاہ میں صالحین کا مقام کتنا بلند و بالا ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں اس برکت کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو خدا نے ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسحاقؑ کو عطا
 فرمائی، فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے اور اسحاق کو برکت سے نوازا (و بارکنا علیہ و علی اسحاق)۔

لیکن کس چیز میں برکت دی گئی؟ اس کی وضاحت نہیں کی گئی اور ہم جانتے ہیں کہ عام طور پر جس وقت کوئی فعل مطلق آنے اور
 اس میں کوئی قيد شرط نہ ہو تو وہ ہمہ گیری کے معنی ویتا ہے اس بنا پر برکت سب چیزوں پر محیط ہو گئی یعنی عمر اور زندگی میں آئندہ کی
 نسلوں میں تازیح و کتب میں گویا ہر ایک چیز میں صوملی طور پر ”برکت“ ”اصل میں“ ”برک“ ”بروزن“ ”درک“ ”اونٹ کے
 سینے کے معنی میں ہے۔ جس وقت اونٹ اپنا سینہ زمین پر رکھتا ہے تو یہی مادہ اس کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔

”برک البعیر“

رفتہ رفتہ یہ مادہ کسی چیز کے بشارت و دوام کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ ”برک آب“ کو بھی اسی بنا پر ”برک“ کہتے ہیں کہ
 اس میں پانی ثابت و برقرار رہتا ہے اور مبارک کو بھی اس لحاظ سے مبارک کہتے ہیں کہ اس کی خیر و خوبی باقی اور برقرار رہتی ہے۔
 اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زیر بحث آیت ابراہیمؑ واسحقؑ (اور ان کے خاندان پر) نعمت الہی کے ثابت و برقرار رہنے اور

۱۱۱۔ اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝

۱۱۲۔ وَبَشَرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝

۱۱۳۔ وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ
 لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ ۝

ترجمہ

۱۱۱۔ بیشک وہ (ابراہیم) ہمارے با ایمان بندوں میں سے ہے۔

۱۱۲۔ ہم نے اسے صالح پیغمبر اسحاق کی بشارت دی۔

۱۱۳۔ ہم نے اسے اور اسحاق کو برکت دی اور ان دونوں کی اولاد میں کچھ تو نیک ہیں اور کچھ کھلم کھلا اپنے
 اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔

تفسیر

ابراہیمؑ خدا کا مومن بندہ

زیر نظر تین آیات حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزندوں کے بارے میں جاری گفتگو کے اعتبار سے آخری آیات ہیں۔ ان میں
 درحقیقت جو کچھ گذر چکا ہے اس کی ایک دلیل بھی بیان کی گئی ہے اور ایک نتیجہ بھی۔ پہلے فرمایا گیا ہے: وہ (ابراہیم) ہمارے
 با ایمان بندوں میں سے ہے (اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ)۔

دراصل یہ جملہ ایک دلیل ہے اس چیز کی جو گذر چکی ہے اس میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنی ماری سستی
 اور وجود کو یہاں تک کہ اپنے عزیز فرزند کو بھی پورے انحصار کے ساتھ اپنے مسموم کردار میں قربان کر دیا، تو یہ اپنے حقیق اور طاقت ور
 ایمان کی وجہ سے کیا تھا۔

ہاں! یہ تمام چیزیں ایمان کے جلوے ہیں اور یہ ایمان کے کیا ہی عجیب و غریب جلوے ہوتے ہیں۔

یہ تعبیر لاکر قرآن ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے کے واقعے کو وسعت اور ہمہ گیری دے رہا ہے اور اسے ایک شخصی اور انفرادی واقعے
 سے متاثر کر رہا ہے مگر یا قرآن اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ جہاں کہیں ایمان ہے وہاں ایثار، عشق، فداکاری اور
 قربانی ہے۔ ابراہیمؑ اسی چیز کو پسند کرتے تھے جسے خدا پسند کرتا تھا اور وہی چاہتے تھے جو خدا چاہتا تھا اور ہر

دعائے کی طرف اشارہ ہے اور ایک برکت جو خدا نے ابراہیمؑ کو دی یہ تھی کہ نبی اسرائیل کے تمام انبیاء و حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں سے جبکہ اسلام کے عظیم پیغمبر حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ہیں۔

لیکن اس بنا پر کہ یہ تو ہم نہ ہو کہ یہ برکت ابراہیمؑ کے خاندان میں منسب اور قبیلے کے طور پر سب سے بگڑی تو مذہب و مکتب ایمان کے ساتھ رابطہ رکھنے کی بنا پر ہے۔ آیت کے آخر میں مزید ارشاد ہوتا ہے: ان دونوں کی اولاد میں سے نیک بھی تھے اور نیک افراد بھی جنہوں نے عدم ایمان کی بنا پر اپنے اور پر ظلم کیا (و من ذریتہما محسن و ظالم لنفسہ مبین)۔

”محسن“ یہاں مومن اور فرمان خدا کے مطیع کے معنی میں ہے اور کون سا احسان اور نیکی اس سے برتر و افضل تصور ہو سکتا ہے جبکہ ”ظالم“ کا مفرد و گنہگار کے معنی میں ہے اور ”لنفسہ“ کی تفسیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کفر و گناہ پہلے درجے میں خود اپنے اور پر ظلم ہے اور وہ بھی واضح و آشکارا ظلم۔

اس طرح سے مذکورہ بالا آیت ہو دو نصاریٰ کے ان لوگوں کو جو اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں جو اس وقت ہی ہے کہ صرف رشتہ باوہ امتحان نہیں ہے جبکہ اس کے ساتھ فکری و مکتبی رشتہ برقرار نہ ہو۔ اس بات پر شاہد پیغمبر اکرمؐ کی وہ حدیث ہے جو بنی اسرائیل کے اسلام سے نقل ہوئی ہے کہ آپ نے بنی ہاشم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

لَا يَا تَدِينِي النَّاسُ بِأَعْمَالِهِمْ وَتَأْتُونِي بِأَنْسَابِكُمْ
اے بنی ہاشم! کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن باقی لوگ تو میرے پاس اپنے اعمال کے ساتھ
آئیں اور تم اپنے نسب اور رشتہ داری کا تعلق جتاتے ہوئے آؤ رشتہ

- ۱۱۳۔ وَلَقَدْ مَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ
۱۱۵۔ وَنَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكُرْبِ الْعَظِيمِ ۚ
۱۱۶۔ وَنَصَرْنَاهُمْ فَمَا كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ۚ
۱۱۷۔ وَأَتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ۚ
۱۱۸۔ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۚ
۱۱۹۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْأَخْرَبِ ۚ
۱۲۰۔ سَلَّمَ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ
۱۲۱۔ إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۚ
۱۲۲۔ إِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۚ

ترجمہ

- ۱۱۳۔ ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا
۱۱۵۔ ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم کو عظیم کرب سے نجات بخشی۔
۱۱۶۔ اور ہم نے ان کی مدد کی یہاں تک کہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آگئے۔
۱۱۷۔ ہم نے انہیں آسمانی کتاب عطا کی۔
۱۱۸۔ ہم نے انہیں راہِ راست کی ہدایت کی۔
۱۱۹۔ اور ان کا ذکر خیر ہم نے بعد والی اقوام میں باقی رکھا۔
۱۲۰۔ موسیٰ اور ہارون پر سلام۔
۱۲۱۔ ہم اسی طرح سے نیکو کاروں کو جزا دیا کرتے ہیں۔
۱۲۲۔ وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

تفسیر

موسیٰ و ہارون پر خدائی نعمتیں

ان آیات میں ”موسیٰ“ اور ان کے بھائی ”ہارون“ کے بارے میں اطلاق الہی کے ایک گوشے کی طرف اشارہ ہوا ہے اور جو کچھ گذشتہ آیت میں حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں بیان ہوا ہے اس سے ہم آہنگ نہیں آتی ہیں۔ ان کے معانی بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور کئی لحاظ سے الفاظ بھی مشابہت رکھتے ہیں، تاکہ نمونین کے لیے ایک نظم ترویج پر وگرام پیش کیا جائے۔

ان آیات میں پھر بیان واقعات کے متعلق اجمال و تفصیل کی مخصوص قرآنی روش سے استفادہ کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ”ہم نے موسیٰ پر اور ہارون پر احسان کیا اور انہیں اپنی نعمتوں کا مہربان منت بنا یا (ولقد مننا علی موسیٰ و ہارون)۔“

”منت“ جیسا کہ ہم نے پہلے ہی بیان کیا ہے، اصل میں ”من“ سے ہے جو اس پتھر کے معنی میں ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے، رفتہ رفتہ بڑی اور بھاری نعمتوں کے لیے بولا جانے لگا، اگر وہ ملی پہلو رکھتی ہوں تو زبیا اور پسندیدہ ہیں اور اگر افاق اور باتیں ہی ہوں تو قبیح اور بدنام ہیں۔ اگرچہ ”منت“ روزمرہ کے استعمال میں زیادہ تر دوسرے معنی میں بولا جاتا ہے اور یہی امر زبیر حبت آیات میں آیات کے مطالعے کے وقت نامطلوب امور کی طرف توجہ مندل کرنے کا سبب بنتا ہے، لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ لفظ ”منت“ لغت اور قرآنی استعمال کے اعتبار سے ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو مذکورہ پہلے مفہوم (بڑی بڑی نعمتیں بخشنے) کو بھی اپنے دامن میں سموتے ہوئے ہے۔

پھر حال خلاص آیت میں ہر ستمہ اور اجمالی طور پر ان بڑی اور گراں قدر نعمتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ان دونوں صحابیوں کو عطا کی گئیں اور بعد والی آیات میں ان نعمتوں کے سات مواقع بیان کرتا ہے۔ ان نعمتوں میں سے ہر ایک دوسری سے زیادہ گراں قدر ہے۔

پہلے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے ان دونوں بھائیوں اور ان کی قوم کو عظیم کرب سے نجات بخشی (ونجینا ہما وقومہما من الکرب العظیم)۔

اس سے بڑا کرب اور کیا ہو گا کہ بنی اسرائیل جا برد و خوزار فرعونوں کے چنگل میں گرفتار تھے جو ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے، ان کی عورتوں کو خدمت گاری اور مردوں کو فلاحی اور بیگار کے لیے زندہ رہنے دیتے تھے۔

ہاں! حریت و آزادی کھو بیٹھا اور ایسے بے رحم بادشاہ کے چنگل میں گرفتار ہونا کہ جو نہ چھوڑوں برہم کرنا تھا اور نہ بڑوں پر، یہاں تک کہ وہ قوم و ملت کی آبرو و رسل کو پامال کرتا تھا جو ایک بہت ہی بڑا دکھ اور عظیم کرب تھا اور یہ پہلا احسان تھا جو

نے بنی اسرائیل پر کیا۔

دوسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے ان (موسیٰ، ہارون اور بنی اسرائیل) کی مدد کی یہاں تک کہ وہ اپنے طاقتور دشمنوں کا لقب آگئے: (ونصرنا ہم فکانوا ہمد الغالبین)۔

جس دن فرعونؑ نے خود فرعون تھا۔ بنی اسرائیل ایک ضعیف اور ناتوان قوم تھی۔ ان کے پاس نہ جھجھکیا ہی تھی اور نہ ہی ہتھیار۔ لیکن خدا نے اپنے لطف و کرم سے ان کی مدد کی۔ فرعونوں کو پانی کی لہروں میں غرق کر دیا اور ان (بنی اسرائیل) کو ڈوبنے سے بچا لیا اور فرعونوں کے عمارت، مال و دولت، باغات اور تمام خزانے ان کے پیرو کر دیئے۔

تیسرے مرحلے میں اس نعمت کی طرف جو خدا نے قیدِ غلامی سے رہائی پانے والی اس قوم کو عنایت فرمائی، اشارہ کرتے ہوئے کتاب ہے: ہم نے ان دونوں کو آشکار و واضح کتاب دی (وأتینا ہما الکتاب المستبین)۔

ہاں: تورات کتاب ”مستبین“ یعنی واضح و روشن کرنے والی کتاب تھی اور اس زمانے میں بنی اسرائیل کی تمام دینی و دنیاوی ضروریات کی کفیل تھی۔ جیسا کہ سورۃ مائدہ کی آیہ ۴۴ میں بھی بیان ہوا ہے۔

اتانزلنا التوراة فیہا ہدی و نور

ہم نے تورات کو نازل کیا جس میں ہدایت بھی ہے اور نور و روشنی بھی۔

چوتھے مرحلے میں پھر ایک اور روحانی نعمت۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ان دونوں کو راہِ راست کی ہدایت کی (وہدینا ہما الصراطِ المستقیم)۔

وہی راہِ راست جو ہر قسم کی کجی سے خالی، انبیاء و اولیاء کی راہ ہے اور اس میں انحراف، گمراہی اور تباہی کا خطرہ موجود نہیں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورۃ حمد میں، جسے ہم تمام نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ ہم خدا سے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کی درخواست کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں: ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے نعمتیں نازل کی ہیں ذکرِ مفضولین اور گمراہوں کی راہ۔ تو یہ دلیل

انبیاء و اولیاء ہی کی راہ ہے۔

پانچویں مرحلے میں کتب کی پیشگی اور نیک نامی کی بقاء کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے ان دونوں کا ذکر خیر بعد والی اقوام میں باقی اور برقرار رکھا (تاکہ وہ دونوں کے نمونوں کے نمونوں سے بچانے جائیں اور پورے جہاں کے لوگ ان کی روش اور تازگی سے ہدایت اور راہنمائی حاصل کریں) (وترکتنا علیہما فی الآخرین)۔

یہی تعبیر گذشتہ آیات میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ کے بارے میں آئی تھی، اصولی طور پر سب ہی مردانِ خدا اور راہِ حق کے عظیم راہبوں کی تاریخ اور نام ہمیشہ ہمیشہ باقی رہتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ یہ لوگ کسی خاص قوم و ملت کے ساتھ

متعلق نہیں، بلکہ تمام عالم انسانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

پچھلے مرحلے میں موسیٰ اور ہارون پر خدا کے سلام کا ذکر ہے، فرمایا گیا ہے: موسیٰ اور ہارون پر سلام ہو (س) علیٰ موسیٰ و ہارون)۔

ایسا سلام جو بزرگ و مہربان خدا کی طرف سے ہے۔

ایسا سلام، جو دین، ایمان، اعتقاد و کعبہ اور مذہب میں سلامتی کی طرف اشارہ ہے۔

ایسا سلام، جو اس جہان اور اس جہان کی سزاؤں اور عذاب سے نجات بیان کرنے والا ہے۔

ساتویں اور آخری مرحلے میں ان کے لیے اپنی عظیم جزا کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ہم نیکو کاروں کو اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں (اِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ)۔

اگر انہوں نے یہ اختیارات اور اعزازات حاصل کیے ہیں تو یہ بلا وجہ نہیں تھے وہ مومن تھے وہ مومن، مخلص، خدا کا اور نیکو کار تھے اور اس قسم کے لوگوں کو ایسا ہی صلہ اور بدلہ ملنا چاہیے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ عینہ ہی جہاد " اِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ "

اسی سورہ میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور حضرت ایساؑ کے بارے میں آئی ہے۔

نیز اسی سے ملتی جلتی ایک تعبیر سورۃ یوسف کی آیہ ۲۲ میں حضرت یوسفؑ کے بارے میں اور سورۃ الانعام کی آیہ ۸۴ میں بعض انبیاء کے بارے میں بھی نظر آتی ہے یہ سب تعبیریں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اللطاف الہی سے بہرہ مند ہونے کے لیے پہلے محسنین کے ذمے میں قرار پانا چاہیے، جس کے بعد برکات الہی کا ہونا قطعی ہے (غور کیجیے گا)

انجام کار آخری زیر بحث آیت میں اسی دلیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس سے پہلے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ کی داستان میں آچکی ہے، ارشاد ہوتا ہے: وہ دونوں (موسیٰ و ہارون) ہمارے مومن بندوں میں سے تھے (اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ)۔

یہ ایمان ہی ہے جو انسان کی روح کو اس طرح سے روشن اور قوی کر دیتا ہے کہ وہ احسان، نیکی، پاکیزگی اور تقویٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ایسا احسان جو رحمت الہی کے دروازے انسان کے سامنے کھول دیتا ہے اور پھر اس کی انواع و اقسام کی نعمتیں انسان پر نازل ہوتی ہیں۔

۱۱۰- وَ اِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

۱۱۱- اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اَلَا تَتَّقُونَ ۝

۱۱۲- اَتَدْعُونَ بَعْدًا وَ تَذَرُونَ اَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ۝

۱۱۳- اَللّٰهُ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَائِكُمْ اَلَا وٰلِيْنَ ۝

۱۱۴- فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضِرُوْنَ ۝

۱۱۵- اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلِصِيْنَ ۝

۱۱۶- وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝

۱۱۷- سَلَّمَ عَلٰى اِلٰ يٰسِيْنَ ۝

۱۱۸- اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝

۱۱۹- اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۱۰- اور بے شک ایسا ہمارے رسولوں میں سے تھا۔

۱۱۱- اس وقت کو یاد کرو، جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟

۱۱۲- کیا تم بعل بت کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑے ہوئے ہو؟

۱۱۳- وہ خدا جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے گزشتہ آباؤ اجداد کا بھی پروردگار ہے۔

۱۱۴- لیکن انہوں نے اسے جھٹلایا، مگر یقینی طور پر وہ سب کے سب خدائی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے۔

۱۱۵- سوائے خدا کے مخلص بندوں کے۔

۱۱۶- ہم نے اس (ایسا) کا نیک نام بعد کی امتوں میں باقی و برقرار رکھا۔

۱۲۰۔ ایسا میں پر سلام ہو۔

۱۲۱۔ ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔

۱۲۲۔ وہ ہمارے دشمن بندوں میں سے ہے۔

تفسیر

پیغمبر خدا ایسا مشرکین کے مقابلے میں

زیر نظر آیات میں گزشتہ انبیاء میں سے ایک اور نبی کی سرگزشت بیان کی جا رہی ہے یہ اس سُوہ میں آنے والی پونہمی سرگزشت ہے۔ یہ حضرت ایسا کی ایک مختصر سرگزشت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ایسا خدا کے رسولوں میں سے تھا (وان ایسا لمن المرسلین)۔

حضرت ایسا ان کے نسب اور ان کی زندگی کی خصوصیات کے بارے میں انشاء اللہ کچھ گفتگو ان آیات کے کائنات نکات کے ضمن میں آئے گی۔ اس کے بعد اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب اس نے اپنی قوم کو خبردار کر دیا اور کہا: "کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے (اذ قال لقومہ الاتقون)۔

تقوٰئے الہی۔ شرک و بت پرستی سے پرہیز، ظلم و گناہ سے پرہیز اور انسانیت کے لیے تباہ کن سب باتوں سے پرہیز

بدوالی آیت میں اس سئلہ کے بارے میں، اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بات کی گئی ہے: کیا تم بعل بت پرست پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑ رہے ہو (اتدعون بعلگم و تذرون احسن الخالقین)۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا ایک معروف بت تھا، جس کا نام "بعل" تھا اور وہ اس کے سامنے سمجھ کیا کرتے حضرت ایسا نے انہیں اس صریح عمل سے روکا اور عظیم آفریدگار عالم اور توحید خاص کی طرف دعوت دی۔

اسی وجہ سے ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ حضرت ایسا کی فعالیتت کا مرکز شامات کے شہروں میں سے تھا "بعلبک" تھا۔

کیونکہ "بعل" اس مخصوص بت کا نام تھا اور "بک" کا معنی ہے شہر۔ ان دونوں کی آپس میں ترکیب سے "بعلبک" ہو گیا۔ کئی تیس کے سونے کا اثنا ببت تھا کہ اس کا طول ہمیں پانچ تھا۔ اس کے چار چہرے تھے اور اس بت کے چار گوشے

سہ بعلبک موجودہ زمانے میں لبنان کا حصہ ہے اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔

۱۲۰۔ ایسا میں پر سلام ہو۔

۱۲۱۔ ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔

۱۲۲۔ وہ ہمارے دشمن بندوں میں سے ہے۔

تفسیر
پیغمبر خدا ایسا مشرکین کے مقابلے میں

بہر حال ایسا نے اس بت پرست قوم کی سخت مذمت کی اور مزید کہا: اس خدا کو چھوڑ رہے ہو جو تمہارا اور تمہارے گزشتہ آباء اجداد کا پروردگار ہے (اللہ ربکم ورب اباکم الاولین)۔

تم سب کا مالک و مرنی دہی تھا اور ہے۔ جو نعمت بھی تمہارے پاس ہے وہ اسی کی طرف سے ہے اور ہر مشکل کا حل اسی کے دست قدرت سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نہ تو خیر و برکت کا کوئی اور سرچشمہ موجود ہے اور نہ ہی شر و آفت کا کوئی اور دفع کرنے والا ہے۔

گو یا حضرت ایسا کے زمانے کے بت پرست بھی پیغمبر اسلام کے زمانے کے بت پرستوں کی طرح اپنے کام کی توجیہ کے لیے اپنے آباؤ اجداد اور بڑوں کے طریقے ہی کا سہارا لیتے تھے کیونکہ حضرت ایسا ان کے جواب میں کہتے ہیں: اللہ ہی تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا رب ہے۔

"رب" (مالک و مرنی) کی تعبیر ضرور ذکر کے لیے بہترین محرک ہے کیونکہ انسانی زندگی میں اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ وہ یہ جانے کرے کس نے پیدا کیا ہے، اور آج اس کا مرنی، ولی نعمت اور صاحب اختیار کون ہے؟

لیکن اس سرچشمی اور خود پسند قوم نے خدا کے اس عظیم پیغمبر کے استدلالی پند و نصائح اور واضح ہدایات پر کان نہ دھری اور اس کی تکذیب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے (فکذبوہ)۔

خدا نے بھی ان کی سزا کو ایک مختصر سے جملے میں بیان کرتے ہوئے کہہ دیا: وہ باگاہ و مدلل الہی اور اس کی دوزخ کے نذاب میں حاضر کیے جائیں گے (فانہم لمحضرون)۔

اور اپنے بیخ اور برا عمل کی سزا کا مزہ چکھیں گے۔

لیکن ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹا سانیک، پاک اور مخلص گروہ حضرت الیاس پر ایمان لے آیا تھا لہذا ان کا حق فراموش
بلا ناصحہ فرمایا گیا ہے، مگر خدا کے مخلص بندے (الاعباد اللہ المخلصین)۔

چند اہم نکات

۱۔ الیاس کون ہیں؟ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حضرت الیاس خدا کے عظیم انبیاء میں سے ایک ہیں اور یہ بحث
نے یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ "ان الیاس لعن المرسلین"

اس پیغمبر کا نام قرآن مجید کی دو آیات میں آیا ہے ایک تو اسی سورہ صافات میں اور دوسرا سورہ انعام میں چند انبیاء کے
ذکر کے ساتھ فرمایا گیا ہے:-

وذكر يا ويحيى وعيسى والياس كل من الصالحين (انعام: ۸۵)

لیکن اس بارے میں کہ قرآن میں جن انبیاء کا نام آیا ہے انہی میں سے ایک پیغمبر کا نام الیاس ہے یا یہ کسی پیغمبر کا مستقل نام
ہے نیز اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس ضمن میں مفسرین میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے:-

الف:- بعض کہتے ہیں کہ "الیاس" اور "یس" کا دوسرا نام ہے کیونکہ ادریس کا اور اس کا بھی تلفظ ہوا ہے اور وہ مختصر
کی تبدیلی کے ساتھ الیاس ہو گیا۔

ب:- بعض کا کہنا ہے کہ الیاس بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے ہیں۔ "یاسین" کے فرزند ہیں اور موسیٰ کے بھائی
اور ان کے نواسوں میں سے ہیں۔

ج:- کچھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ الیاس خضر کا دوسرا نام ہے جبکہ بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ الیاس خضر کے دوستوں میں
سے ہیں اور دونوں زندہ ہیں اس فرق کے ساتھ کہ الیاس تو خشکی پر مامور ہیں لیکن خضر جزیروں اور دریاؤں پر مامور ہیں، بعض دوسرے
الیاس کی ماموریت بیابانوں میں اور خضر کی ماموریت پہاڑوں پر خیال کرتے ہیں اور دونوں کے لیے عجاوونہی کے قائل ہیں۔ بعض
الیاس کو "ایسح" کا فرزند سمجھتے ہیں۔

د:- بعض کہتے ہیں کہ الیاس بنی اسرائیل کے وہی "ایلیا" پیغمبر ہیں جو "آجاب" بادشاہ بنی اسرائیل کے مبعصر تھے
جنہیں خدا نے اس ظالم بادشاہ کو ڈرانے اور ہدایت کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

بعض نے انہیں "یحییٰ" بھی جانا ہے جو یسح کے تمہید و ہندہ تھے۔

لیکن قرآن کی آیات کے ظاہر کے ساتھ جو بات ہم آہنگ ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ مستقلاً ایک پیغمبر کا نام ہے اور قرآن
میں جن دیگر پیغمبروں کے نام آئے ہیں یہ ان کے علاوہ ہیں جو ایک امت پرست قوم کی ہدایت کے لیے مامور ہوئے تھے اور اس
قوم کی اکثریت ان کی تکذیب کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن مخلص مومنین کے ایک گروہ نے ان کی پیروی کی۔

اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں اور بعض اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ اس قوم کے بڑے بت کا نام "بلع" تھا
یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ پیغمبر سرزمین شامات میں مبعوث ہوئے تھے اور ان کی فعالیت کا مرکز شہر "بلع" تھا جو اس وقت
لبنان کا حصہ ہے اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔

بہر حال اس پیغمبر کے بارے میں مختلف داستانیں کتابوں میں بیان کی گئی ہیں اور چونکہ وہ قابل امتداد و اطمینان نہیں لہذا

اس داستان کی آخری آیات میں وہی چار مسائل جو دوسرے انبیاء (موسیٰ اور بلعم و نوح) کے واقعات
آئے تھے، ان کی اہمیت کے پیش نظر پھر دہرائے گئے ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے الیاس کا نیک نام بعد الی اسموں میں جاواں کر دیا (و تروكنا عليه في الاخرين)۔
دوسری امتیں ان بزرگ انبیاء کی انتہائی زحمتوں کو جو انہوں نے راہِ توحید کی پاسداری اور حق ایمان کی آبیاری کے
اٹھائی ہیں، کبھی فراموش نہیں کریں گی اور جب تک دنیا قائم ہے کان مردان بزرگ اور فداکاروں کا کلمت اور یاد
جاوید رہے گی۔

دوسرے مرحلے میں قرآن مزید کہتا ہے: الیاسین پر سلام و درود ہو (سلام علی الیاسین)۔
"الیاس" کی بجائے "الیاسین" کی تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ "الیاسین" لفظ "الیاس" کی ایک نسبت
اور دونوں ایک ہی معنی میں ہیں اور یا الیاس اور ان کے پیروکاروں کی طرف اشارہ ہے اور معنی کی شکل میں آیا ہے۔

تیسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: ہم نیکوکاروں کو اسی طرح سے بل و یاد کرتے ہیں (انا كذلك نجزي
المحسنين)۔

نیکی اور احسان سے اس لفظ کا وسیع معنی مراد ہے، جس میں دین اور اس کے تمام احکام پر عمل کرنا شامل ہے۔ اس کے
ساتھ ساتھ شرک، انحراف، گناہ اور فساد سے مقابلہ کرنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

چوتھے مرحلے میں ان تمام باتوں کی اصل بنیاد یعنی ایمان کا ذکر ہے، یقیناً وہ (الیاس) ہمارے مومن بندوں میں سے
ہے (انہ من عبادنا المؤمنین)۔

"ایمان" و "موریت" "احسان" کا سرچشمہ ہے اور احسان مخلصین کی صف میں شامل ہونے اور خدا کے سلام کا حقدار
ہونے کا سبب ہے۔

۱۔ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کے مطابق یہ استثناء استثناء محض ہے "کذوبہ" کی داڑھی یعنی تمام قوم نے تکذیب کی اور وہ سب
مذابحی میں گرفتار ہوئے سوائے خدا کے مخلص بندوں کے۔

۲۔ پہلے الیاس ضرب ہوا اور "الیسی" ہوا پھر معنی کی شکل میں آکر "الیاسین" ہو گیا اور اس کے بعد منفجر "الیاسین"
ہو گیا ہے (خود بیچے گا)۔

ہم نے انہیں نقل نہیں کیا۔

۲۔ ”الیاسین“ کون ہیں؟ مفسرین اور مؤرخین کے ”الیاسین“ کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ الف: بعض اسے الیاس کی ایک لغت سمجھتے ہیں یعنی جس طرح ”میکان“ و ”میکائل“ ایک مخصوص فرشتے دو لفظ ہیں، اور ”سینا“ اور ”سینین“ دونوں ایک معروف سرزمین کے نام ہیں۔ اسی طرح ”الیاس“ اور ”الیاسین“ عظیم پیغمبر کے نام ہیں۔

ب: بعض دوسرے اسے جمع سمجھتے ہیں۔ اس طرح سے کہ ”الیاس“ کے ساتھ یا نسبتی کا اضافہ ہوا تو ”الیاسین“ ہو گیا اور اس کے بعد یا اور نون کے ساتھ اس کی جمع بنائی گئی اور ”الیاسین“ ہو گیا اور تخفیف کے بعد ”الیاسین“ رہ گیا۔ اس بنا پر اس کا مفہوم وہ تمام اشخاص ہیں جو الیاس کے ساتھ مروجہ طقے اور ان کے مکتب کے پیرو بن گئے تھے۔

ج: بعض کا خیال ہے کہ ”الیاسین“ الف ممدودہ کے ساتھ ہے جو لفظ ”آل“ اور ”یاسین“ کا مرکب ہے۔ ایک روایت کے مطابق ”یاسین“ حضرت الیاس کے باپ کا نام ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق پیغمبر گرامی اسلام کا نام ہے۔ اس بنا پر ”آل یاسین“ پیغمبر گرامی اسلام کی آل و اولاد کے معنی میں ہے یا الیاس کے باپ یا یاسین خاندان مراد ہے۔

د: واضح قرآن خود قرآن میں موجود نہیں جو اسی پہلے معنی کی تائید کرتے ہیں۔ یعنی ”الیاسین“ سے مراد الیاس ہی ہیں کیونکہ ”سلام علی الیاسین“ کی آیت سے ایک آیت کے حاصل کے بعد فرمایا گیا ہے:-

انہ من عبادنا المؤمنین
وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

تفسیر مفرد کا ”الیاسین“ کی طرف لوٹنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک شخص سے زیادہ نہیں یعنی وہی جناب الیاس۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ چار آیات جو حضرت الیاس کی داستان کے آخر میں ہیں یعنی وہی آیات ہیں جو نوح، ابراہیم، موسیٰ اور ہارون کی داستان کے آخر میں آئی ہیں اور جب ہم ان آیات کو ایک دوسرے کے پہلو میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جو سلام خدا کی طرف سے ان آیات میں آیا ہے وہ اسی پیغمبر کے لیے ہے جس کا بیان ابتدا لغت گوین ہے (سلام علی نوح فی العالمین۔ سلام علی ابراہیم۔ سلام علی موسیٰ و ہارون) اس بنا پر یہاں بھی سلام علی الیاسین، الیاس پر سلام ہوگا۔ (غور کیجیے گا)

۱۔ تفسیر مجمع البیان۔ تفسیر المیزان، روح المعانی، تفسیر فرزدی فی عمل، اعلام القرآن اور دائرة المعارف دہخدا۔

۲۔ ”البیان“ فی غریب اعراب القرآن جلد ۲ ص ۲۰۸

۳۔ البیان

وہ نکتہ جس پر یہاں خاص طور پر توجہ کی ضرورت ہے یہ ہے کہ بہت سی تفاسیر میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ جس کی سند اس کی طرف لوٹتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ”آل یاسین“ سے مراد آل محمد ہیں۔ کیونکہ ”یاسین“ پیغمبر اسلام کے اسامہ میں سے ایک ہے۔

معانی الاخبار میں صدوق نے ایک باب جو ”آل یاسین“ کی تفسیر کے لیے ذکر کیا ہے، اس میں پانچ احادیث اس ضمن میں نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث کے سوا کوئی بھی ائمہ اہل بیت تک نہیں پہنچتی اور اس حدیث کا راوی ایک شخص ”کادح“ کا نام ہے۔ نامی ہے۔ جس کے بارے میں کتب رجال میں کوئی خبر نہیں ہے۔

چونکہ یہ اخبار اس مفروضہ کی بنا پر ہیں کہ ہم اور پر ولی آیت کی قرأت کو سلام علی آل یاسین کی صورت میں پڑھیں اور آیات کی ہم آہنگی کو نظر انداز کر دیں اور ان روایات کی اسناد بھی جیسا کہ ہم نے دیکھی لی ہے قابل بحث ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان روایات کے بارے میں فیصلہ کرنے سے باز رہیں اور ان کا علم ان کے اہل کے سپرد کر دیں۔

اور پر اس مخرف قوم کا انجام، ایک واضح اور روشن صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ (شعراء ۱۶۶ تا ۱۶۲، اور ہود ۷۰ تا ۸۲، ۵۸ تا ۵۹، اور دوسرے مقامات)
ارشاد ہوتا ہے، لوط ہمارے رسولوں میں سے تھا (واق لوطا لمن المرسلین)۔

اس اجال کو بیان کرنے کے بعد قرآن اجال و تفصیل کی اپنی روش کے مطابق، اس ماجرے کے ایک حصے کی وضاحت کرنے کے لئے کتاب ہے، وہ وقت یاد کرو جب ہم نے لوط اور اس کے سارے خاندان کو نجات دی۔ (اذن جنیتنا و اہلہ جمعین)۔

سوائے اس کی بڑھیا ہیوی کے جو اس قوم کے درمیان باقی رہ گئی (الاعجوزا فی الغابریین)۔
پھر باقی لوگوں کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا (ثعد دمرنا الاخرین)۔

یہ مختصر جملے اس قوم کی عجیب تاریخ کی طرف اشارے ہیں۔ اس کی تفصیل سورۃ ہود، شعراء اور مکتوبات میں گزر چکی ہے۔

حضرت لوطؑ نے تمام انبیاء کی طرح سب سے پہلے اپنی دعوت توحید سے شروع کی۔ اس کے بعد ماحول کے مفاسد اور فحشوں کے خلاف شدید جنگ میں مصروف ہو گئے، خصوصاً وہ لوگ معروف اخلاقی انحراف یعنی ہم جنس بازی کا شکار تھے جس کی رسوائی تمام تواریخ میں منکس ہے۔

اس عظیم پیغمبر نے بہت سی سختیاں بھلیں، خون جگر پیا اور ان سے جتنا ہو سکا اس قبیح سیرت اور قبیح صورت مخرف قوم کی اصلاح اور انہیں شرناک اعمال سے روکنے کی کوشش کی، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور اگر کچھ تھوڑے سے افراد ان پر ایمان لائے بھی تو بہت جلد وہ اس گندے ماحول سے نجات پا گئے۔

آخر کار حضرت لوطؑ ان سے ناامید ہو گئے اور دعا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھوں نے خدا سے اپنی اور اپنے خاندان کی نجات کے لیے درخواست کی، خدا نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور اس جھوٹے سے گروہ کو نجات بخشی، سوائے ان کی بیوی کے، وہی بڑھیا جو صرف آپ کی تعلیمات کی پیروی نہیں کرتی تھی بلکہ بعض اوقات آپ کے دشمنوں کی مدد بھی کیا کرتی تھی۔

خدا نے بھی اس قوم پر نہایت سخت عذاب نازل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ سب سے پہلے ان کے شہروں کو تہ و بالا کیا۔ پھر مسلسل اور پے در پے چھروں کی بارش ان پر برساتی۔ یہاں تک کہ سب کے سب نابود ہو گئے اور ان کے جسموں کا بھی نام و نشان

سے "غابری" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں "غبنور" کے مادہ سے ("مبور" کے وزن پر) کسی چیز کے باقی ماندہ حصے کے معنی میں ہے اور جس وقت کوئی جمیت کسی جگہ سے حرکت کرنے اور کوئی اس جگہ سے رہ جائے تو اس کو "غابری" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر باقی ماندہ خاک کو "غبار" کہتے ہیں اور پستان میں باقی رہ جانے والے دروہ کو "غبنور" (بروزن "لقمہ") کہتے ہیں۔

۱۳۳- وَإِنَّ لُوطًا لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

۱۳۴- إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ۝

۱۳۵- إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ۝

۱۳۶- ثُمَّ دَمَرْنَا الْأَخْرِينَ ۝

۱۳۷- وَإِتَّكُمُ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِمْ مُصْبِحِينَ ۝

۱۳۸- وَبِالْبَيْلِ أَفْلًا تَعْقِلُونَ ۝

ترجمہ

۱۳۳- لوط ہمارے رسولوں میں سے تھا۔

۱۳۴- وہ وقت یاد کرو جب ہم نے اسے اور اس کے سارے خاندان کو نجات دی۔

۱۳۵- سوائے ایک بڑھیا کے جو اس قوم کے درمیان باقی رہ گئی (اور ان کے سے انجام میں گرفتار ہوئی)

۱۳۶- پھر باقی لوگوں کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا۔

۱۳۷- اور تم ہمیشہ (ان کے شہروں کے ویرانوں کے قریب سے) صبح کے وقت بھی عبور کرتے ہو...

۱۳۸- اور رات کے وقت بھی، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

تفسیر

اس قوم کی تباہ سرزمین تمہارے سامنے ہے

پانچویں پیغمبر جن کا اس سورہ میں اور آیات کے اس سلسلے میں نام آیا ہے اور ان کی تاریخ کا ایک مختصر حصہ، تزیینی اور اصلاحی درس کے طور پر بیان ہوا ہے وہ حضرت لوطؑ ہیں۔ قرآن کی صراحت کے مطابق وہ حضرت ابراہیمؑ کے مبعوث ہونے سے پہلے پیغمبروں میں سے ہیں (مکتوبات ۲۶، ہود ۶۳)
حضرت لوطؑ کا نام قرآن میں بہت سی آیات میں آیا ہے اور ہر بار ان کے اور ان کی قوم کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

باقی نرہا۔

۱۱- وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

۱۲- إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلِ الْمَشْحُونِ ۝

۱۳- فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ ۝

۱۴- فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ ۝

۱۵- فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ۝

۱۶- لَلْبِثِّ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝

۱۷- فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ ۝

۱۸- وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَقْطِينٍ ۝

۱۹- وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَى مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ ۝

۲۰- فَأَمَنُوا فَمَتَّعْنَاهُمُ إِلَىٰ حِينٍ ۝

ترجمہ

۱۱- اور یونس ہمارے رسولوں میں سے تھا۔

۱۲- وہ وقت یاد کرو جب وہ (لوگوں اور وزن سے) لدی کشتی کی طرف نکل گیا۔

۱۳- اور ان کے ساتھ قرعہ ڈالا اور (قرعہ انھیں کے نام کا نکلا اور وہ) مغلوب ہو گیا۔

۱۴- (انھوں نے اسے دریا میں پھینک دیا) اور ایک بہت بڑی مچھلی نے اسے نگل لیا، اس حال میں کہ وہ

ملا مت کا مستحق تھا۔

۱۵- اور اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا.....

۱۶- تو قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتا۔

۱۷- (بہر حال ہم نے اسے ربانی بخشش اور) اسے ایک خشک زمین میں جو گھاس اور سبزے سے خالی تھی پھینک دیا

چونکہ یہ سب ذکر غافل اور مغرور لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے ایک مقدمہ اور تہیہ کے طور پر ہے لہذا اس گفتگو کے آخر میں ہوتا ہے، تم ہمیشہ صبح کے وقت ان کے شہروں کے دیوانوں کے قریب سے گزرتے ہو (و انکم لتعدون علیہم مصبحین)۔

اور ان کو بھی وہاں سے گزرتے ہو، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ (و باللیل افلا تعقلون)۔ یہ تعبیر اس وجہ سے بیان ہوئی ہے کیونکہ قوم لوط کے شہر حجاز کے لوگوں کے قافلوں کو شام کی طرف راستے میں پڑتے اور وہ اپنے دونوں اور راتوں کے سفر میں ان کے قریب سے گزرتے تھے۔ اگر وہ دل و جان کے کان رکھتے تو اس گناہ گار تباہ شدہ قوم کی دخلداری اور جانکاہ آواز سنتے، کیونکہ ان کے شہروں کے ویرانے اپنی زبان بے زبانی سے تمام گزرنے والوں کو درس عبرت دیتے ہیں اور ان جیسے حوادث کے پتھل میں گرفتار ہونے سے ڈراتے ہیں۔

ہاں :-

ما اکثر العیبر و اقل الاعتبار لہ

عبرت کے درس تو بہت ہیں لیکن عبرت حاصل کرنے والے محروم ہیں۔

اسی معنی و مفہوم کی نظر سورۃ حجر کی آیہ ۶، میں قوم لوط کی داستان کے بیان کے بعد آئی ہے :-

و اتھا لبسبیل مقیم

یہ آثار پیاس سے گزرنے والوں کے راستہ میں پڑتے ہیں۔

ایک روایت میں امام صادق سے اس جملے کی ایک اور طرح سے تفسیر کی گئی ہے۔ ایک صحابی نے ”و انکم لتعدون علیہم مصبحین وباللیل افلا تعقلون“ کی آیات کی تفسیر کے بارے میں آپ سے سوال کیا تو فرمایا:-

تعدون علیہم فی القرآن اذا قرأتم فی القرآن فاقروا ما قص

اللہ علیکم من خیرہم

تم قرآن میں جب قرآن کی آیات کی تلاوت کرتے ہو تو ان کے پاس سے گزرتے ہو، قرآن ان اخبار کو جو خدا نے بیان کی ہیں تمہارے لیے واضح کرتا ہے۔

مگر بس یہ تفسیر آیت کے دوسرے معنی اور اس کے بطون کی طرف اشارہ ہو بہر حال دونوں تفسیروں کے جمع ہونے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے، کیونکہ قوم لوط کے آثار بھی خارج ہیں ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھے اور قرآن مجید میں ان کے اخبار بھی ملتے ہیں۔

۱- صحیح ابواب ذکوات تفسیر، جلد ۱، صفحہ ۲۹۷

۲- یہ روایت روضہ کافی سے نزائتین جلد ۲ ص ۲۲۲ پر نقل کی گئی ہے۔

اس حالت میں کہ وہ بیمار تھا۔

۱۳۶۔ اور ہم نے کہہ دی ہیں اس کے اوپر اگادی (تاکہ وہ اس کے چوڑے اور مرطوب پتوں کے سایے آرام پائے)۔

۱۳۷۔ اور ہم نے اسے ایک لاکھ افراد یا اس سے زیادہ جمعیت کی طرف بھیجا۔

۱۳۸۔ تو وہ ایمان لے آئے اور ہم نے انھیں ایک مدت معلوم تک زندگی کی نعمت سے بہرہ مند کیا۔

تفسیر یونس امتحان کی مہی میں

اس سورہ میں یہ گزشتہ آیتوں کا کچھ اور آخری سرگزشت ہے۔ ان آیات میں یونس اور ان کی توبہ کرنے والی قوم کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ پانچ سرگزشتیں بنو نوح، ابراہیم، موسیٰ و ہارون، الیاس اور لوط کا ذکر تھا وہ سب کی سب یہاں آخر ختم ہوئیں کہ وہ قومیں ہرگز بیدار نہ ہوئیں اور عذاب الہی میں گرفتار ہو گئیں اور خدا نے ان میں سے ان ظالم انبیاء کو نجات بخشی۔

لیکن اس داستان میں معاملے کا انتقام ان کے برعکس ہے۔ یونس کی کافر قوم عذاب الہی کی ایک نشانی کو دیکھتے ہی بیدار ہو گئی اور اس نے توبہ کر لی اور خدا نے اس پر اپنا لطف و کرم فرمایا۔ اور اے مادی و روحانی برکات سے بہرہ مند کیا۔ یہاں تک کہ یونس کو اس ترک ادنیٰ کی بنا پر جو اس قوم کے درمیان سے ہجرت کرنے میں جلدی کرنے کی وجہ سے ان سے سرزد ہوا تھا، معاصیہ مشکلات میں پھنسا دیا، یہاں تک کہ ان کے بارے میں لفظ ”اجت“ استعمال کیا کہ جو عام طور پر بھاگ جانے والے غلاموں کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہ داستانیں اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ لے مشرکین عرب اور لے دیگر انسانوں؛ کیا تم ان پانچ قوموں کی طرح بننا چاہتے ہو یا تو یونس کی طرح؟ کیا تم اس بڑی اور درناک عاقبت اور انجام کے طالب ہو یا اس خیر و صلوات کے بہیہات خود مختارے اپنے ارادے کے ساتھ وابستہ ہے۔

بہر حال قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں (مغلہ سورۃ انبیاء، یونس، قلم اور زمر بحث سورۃ صافات میں) اس عظیم پیغمبر کی داستان بیان ہوئی ہے اور ہر ایک میں ان کے حالات کا ایک حصہ ذکر ہوا ہے۔ سورۃ صافات میں زیادہ تر یونس کے فزار، ان کی گرفتاری اور پھر نجات کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔

پچھلے گزشتہ داستانوں کی طرح ان کے مقام رسالت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے: یونس خدا کے رسولوں میں سے تھا (وان یونس لعن العسلیین)۔

یونس نے بھی دیگر انبیاء کی طرح اپنی دعوت کی ابتداء توحید اور جنت پرستی کے خلاف قیام سے شروع کی۔ اس کے بعد پڑائیوں کے خلاف نبوہ آزادی کی جو اس ماحول میں رائج تھے۔ لیکن وہ متعصب قوم، جو آنکھیں اور کان بند کر کے، اپنے بڑے پڑھوں کی تقلید کر رہی تھی، ان کی دعوت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

حضرت یونس اسی طرح ایک مہربان باپ کے مانند دل سوزی اور نیر خواہی کے ساتھ اس گمراہ قوم کو مدظ و نصیحت کرتے رہے، لیکن اس عظیمنا منق کے مقابلے میں دشمنوں کے پاس منغلے اور دھٹائی کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔

صرف ایک چھوٹا سا گروہ جو شاہید و دوا افراد (ایک عابد اور ایک عالم) پر مشتمل تھا ان پر ایمان لایا۔ حضرت یونس نے اس قدر تبلیغ کی کہ ان سے تقریباً بائیس ہو گئے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ عابد کے کہنے پر (اور گمراہ قوم کی کیفیت اور حالات کو دیکھتے ہوئے) آپ نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ان کے خلاف بددعا کریں۔

یہ بددعا پورا ہو گیا اور حضرت یونس نے ان پر نفرین کی اور انھیں بددعا دی۔ جو آپ پر وحی آئی کہ غلاماں وقت مذاب الہی منزل ہو گا۔ جب مذاب کے وعدے کا وقت قریب آیا تو حضرت یونس اس عابد کے ساتھ اس قوم کے درمیان سے باہر چلے گئے، اس حالت میں کہ آپ نہایت غمگین تھے یہاں تک کہ دریا کے کنارے پہنچ گئے وہاں لوگوں اور وزن سے بھری ایک کشتی دیکھی۔ آپ نے ان سے خواہش کی کہ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلیں۔

اسی واقعے کی طرف قرآن بعد والی آیت میں اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، اس وقت کو یاد کرو جب اس نے وزن اور لوگوں سے بھری ہوئی کشتی کی طرف فرار کیا (اذا بق الی الفلک المشحون)۔

”ابق“ کے مادہ سے غلام کے اپنے آقا و مولائے پاس سے بھاگ جانے کے معنی میں ہے اس مقام پر یہ ایک عجیب و غریب تیسرے ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہت ہی چھوٹا سا ترک ادنیٰ کہ جو عالی مقام پیغمبروں سے سرزد ہوا ہے، خدا کی طرف سے کس قدر سخت گیری اور عقاب کا باعث بنتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے پیغمبر کو بھاگ جانے والے غلام کا نام دیتا ہے۔

بلاتشک و چشمہ یونس مصوم پیغمبر تھے اور وہ کبھی بھی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے، لیکن پھر بھی بہتر یہی تھا کہ وہ تحمل سے کام لیتے اور نزول مذاب سے قبل کے آخری لمحات تک اپنی قوم میں رہتے کہ شاید وہ بیدار ہو جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض روایات کے مطابق آپ نے چالیس سال تک تبلیغ کی تھی، لیکن پھر بھی بہتر یہی تھا کہ چند روز یا چند گھنٹے اور ٹھہر جاتے۔ آپ نے چونکہ ایسا نہیں کیا لہذا آپ کو بھاگ جانے والے غلام سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بہر حال یونس کشتی پر سوار ہو گئے۔ روایات کے مطابق ایک بہت بڑی مچھلی نے کشتی کی راہ روک لی اور نہ کھول دیا گو یا وہ

کچھ کھانے کو مانگ رہی ہو۔ کشتی میں بیٹھے والوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گنہگار ہمارے درمیان ہے (کہ جسے اس جھلی) بنا چاہیے اور قرعہ اندازی سے کام لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس موقع پر انھوں نے قرعہ ڈالا تو قرعہ حضرت یونس نام نکل آیا۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے تین مرتبہ قرعہ ڈالا اور ہر دفعہ حضرت یونس ہی کا نام نکلا۔ ناچار انھوں نے یونس پھینک دیا۔

قرآن زیر بحث آیات میں ایک مختصر سے جملے کے ذریعے اس ماجرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: یونس ان کے ساتھ قرعہ ڈالا اور مغلوب ہو گیا (فساهم فکان من المدحضین)۔
 ”ساہم“ ”سہم“ کے مادہ سے دراصل تیر کے معنی میں ہے اور ”ساہمہ“ قرعہ اندازی کے معنی میں ہے، کیونکہ گزشتہ زمانے میں قرعہ اندازی کے وقت تیری کٹڑیوں پر نام لکھا کرتے تھے اور انھیں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیتے تھے پھر ان میں سے ایک تیری کٹڑی باہر نکالتے تھے، جس کے نام کا ہوتا اسی کا قرعہ کہلاتا۔
 ”مدحض“ ”احاض“ کے مادہ سے باطل کرنے، زائل کرنے اور مغلوب کرنے کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ قرعہ ان کے نام نکلا۔

تفسیر یہی بیان کی جاتی ہے کہ دریا میں طوفان آگیا تھا اور کشتی پر ذرا بہت زیادہ تھا اور کشتی میں بیٹھے والوں کو ہر لمبے فرق ہونے کا خطرہ ہونے لگا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ کشتی کو ہلکا کرنے کے لیے کچھ لوگوں کو دریا میں چھینک دیا جائے اور قرعہ یونس کے نام نکل آیا۔ انھوں نے آپ کو دریا میں چھینک دیا اور ٹھیک اسی وقت ایک گرجھ دیاں آن پہنچا اور اس نے آپ کو نکل لیا۔

بہر حال قرآن کہتا ہے کہ ایک بہت بڑی جھلی نے اُسے نکل لیا جب کہ وہ مستحقِ ملامت تھا (فالتقمہ الحوت وهو ملیح)۔

”التقمہ“ ”التقام“ کے مادہ سے نکل جانے کے معنی میں ہے۔
 ”ملیح“ ”وراصل“ ”لوم“ کے مادہ سے ہے جو ملامت کے معنی میں ہے (اور جب یہ بابِ افعال میں چلا جائے تو استحقاقِ ملامت کے معنی دیتا ہے)۔

یہ بات مسلم ہے کہ یہ ملامت و سزائش کسی کبیرہ یا صغیرہ گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ اس کا سبب صرف ترکِ اولیٰ تھا جو ان سے سزا ہوا اور وہ تھا اپنی قوم کو چھوڑ جانے اور ان سے ہجرت کرنے میں جلدی کرنا۔

لیکن وہ خدا جو آگ کو پانی کے اندر اور شیشے کو پتھر کی آغوش میں محفوظ رکھتا ہے، اس نے اس عظیم جانور کو حکم عیوبی دیا کہ اس کے بندے یونس کو معمولی سی تکلیف بھی نہ پہنچائے۔ حضرت یونس کو ایک بے نظیر اور عجیب قیدی میں رہنا تھا تاکہ وہ اپنے ترکِ اولیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی تلافی کریں۔

ایک روایت میں آیا ہے:-

اوحی اللہ الی الحوت لا تکسر منہ عظماً ولا تقطع له وصلاً
 خدا نے اس جھلی کی طرف وحی کی کہ اس کی کوئی بڑی نہ توڑنا اور اس کے کسی جوڑ کو نہ کاٹنا سیکھ

یونس بہت ہی جلد اصل قیفے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپ نے پوری توجہ کے ساتھ بارگاہِ خداوندی کی طرف رخ کیا اپنے ترکِ اولیٰ پر استغفار کی اور اس کی مقدس بارگاہ سے غفوکا تقاضا کیا۔
 اس مقام پر ایک نہایت پر معانی اور معروف ذکر حضرت یونس کی زبانی نقل ہوا ہے جو سورہ انبیاء کی آیہ ۸۷ میں آیا ہے اور ان حرفان کے درمیان ذکر ”یونس“ کے نام سے مشہور ہے۔

فنادی فی الظلمات ان لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین
 اس نے تہہ بہ تہہ تارکیوں میں پکارا کہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو پاک و منزہ ہے میں ہی ظالموں میں سے تھا۔

میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور تیری بارگاہ سے دور ہو گیا ہوں اور تیرے عقاب و سزائش میں، جو میرے لیے جہنم سوزاں کے مانند ہے، گرفتار ہو گیا ہوں۔

اس مخلصانہ اعتراف اور ندامت سے ملی ہوئی تسبیح نے اپنا کام کیا اور جیسا کہ سورہ انبیاء میں بیان ہوا ہے:-
 فاستجبنا له و نجیناه من الغم و كذلك ننجی المؤمنین
 ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور اسے غم و اندوہ سے نجات دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح سے نجات دیا کرتے ہیں۔ (انبیاء - ۸۸)

اب دیکھیں زیر بحث آیات اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں، ایک مختصر سے جملے میں فرمایا گیا ہے: اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا..... (فلولا انہ کان من المسبوحین)۔

توقیفنا وہ قیامت کے دن تک جھلی کے پیٹ میں ہی رہتا (للبت فی بطنہ الی یوم یبعثون)۔
 اور یہ وقتی قید خانہ دائمی زنداں میں بدل جاتا اور وہ دائمی زنداں اس کے لیے قبرستان میں بدل جاتا۔
 حضرت یونس کا جھلی کے پیٹ میں قیامت تک رہنا (بالفرض اگر وہ درگاہِ الہی میں تسبیح اور توبہ نہ کرتے) زندہ صورت میں ہونا یا مردہ صورت میں۔ اس ضمن میں بعض مفسرین نے کئی احتمال بیان کیے ہیں۔

پہلا احتمال تو یہ ہے کہ وہ دونوں ہی زندہ رہتے اور یونس ایک قیدی کی صورت میں قیامت کے دن تک جھلی کے پیٹ میں قید رہتے۔

۱۔ تفسیر رازی جلد ۲ ص ۱۶۵۔ نیز یہی بات مفسر سے فرق کے ساتھ تفسیر برهان جلد ۴ ص ۲۰ پر بیان کی گئی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یونسؑ تو مر جاتے اور پھلی پھلتی پھرتی قبر کی صورت میں زندہ رہتی۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ یونسؑ اور پھلی دونوں ہی مر جاتے اور پھلی کا پیٹ یونسؑ کی قبر میں جاتا اور زمین پھلی کی قبر۔ وہ پھلی اور پھلی زمین کے اندر قیامت کے دن تک دفن ہو جاتے۔

زیر بحث آیت ان اقوال میں سے کسی کے لیے بھی دلیل نہیں بن سکتی۔ لیکن متعدد آیات جو یہ کہتی ہیں کہ استقامت و نجات مر جائیں گے اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قیامت کے دن تک یونسؑ کا زندہ رہنا یا پھلی کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے اس لیے یہ قول تفاسیر میں سے تیسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تیسرا طوفانی مدت کے لیے کنا یہ ہو یعنی وہ ایک طوفانی مدت تک اسی زنداں میں رہتے۔ جب تیسرا اس سے ملتے جلتے موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے کہ تجھے فلاں کام کے انتظار میں قیامت تک رہنا ہو گا۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہوتا جب وہ تیسرا اور توبہ نہ کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ تیسرا پروردگار کی ادراس کی خاص بخشش اور صفوان کے شامل حال ہوئی۔

پھر جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے اسے ایک خشک اور درخت اور درختوں سے خالی سرزمین میں پھینک دیا، اس حالت میں کہ وہ بیمار تھا (فخذناہ بالعماء و هو سقیم)۔

وہ بہت بڑی پھلی خشک دبے گیاہ مائل کے نزدیک آئی اور ہم خدا سے اس لقمے کو جو اس سے زائد تھا باہر پھینک دیا۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس عجیب و غریب زنداں نے یونسؑ کے جسم کی سلامتی کو درہم برہم کر دیا تھا۔ لہذا وہ بیمار و ناتواں اس زنداں سے آزاد ہوئے۔

ہمیں صحیح طور پر معلوم نہیں ہے کہ حضرت یونسؑ کتنی مدت تک پھلی کے پیٹ میں رہے۔ لیکن یقینی طور پر متنازعہ بھی ہے اس کے حواشی سے پتہ نہیں چلتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فرنان الہی صادر ہوا تھا کہ یونسؑ پھلی کے بدن میں مضن اور جذب نہ ہوں۔ لیکن یہ اس معنی میں نہیں تھا کہ اس زنداں کے کچھ آثار بھی وہ اپنے ساتھ نہ لائیں لہذا مفسرین کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ وہ ایک نومولود، ضعیف و ناتواں اور بے پروا بال، بربندے کے بچے کی طرح پھلی کے پیٹ سے باہر آئے۔ اس طرح سے کہ ان میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔

۱۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ مفسر عظیم طبری مرحوم جو عام طور پر مختلف اقوال آیات کے ذیل میں جمع کرتے ہیں۔ یہاں انھوں نے صرف اسی احتمال پر قیامت کی ہے اور کہتے ہیں:-

لصاربطن الحوت قبیل له الی یوم القیامۃ
پھلی کا پیٹ قیامت تک کے لیے ان کی قبر میں جاتا۔

پھر لطف الہی ان کے شامل حال ہوا، کہہ کر ان کا بدن بیمار آخرستہ حال تھا اور ان کا جسم کمزور و ناتواں تھا۔ سال کی دھوپ کی تکلیف پہنچانی تھی۔ لہذا ان کے لیے ایک نرم و گداز اور لطیف قسم کے لباس کی ضرورت تھی تاکہ ان کے بدن کو اس کے پٹھے کلم مل ہو۔ اس مقام پر قرآن کہتا ہے: "ہم نے ایک کدو کی بیل اس کے اوپر لگا دی" تاکہ وہ اس کے چوڑے اور مرطوب پتوں کے آرام کرے۔ (و ائکتنا علیہ شجرة من یقطین)۔

"یقطین" کا معنی بہت سے ارباب لغت اور مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ یہ اس پودے کو کہتے ہیں جس کی شاخ اور پتے پور اور جس کے پتے چوڑے ہوں۔ مثلاً خرہوہ، کدو، کھیرا اور تر بوذو فیروہ۔ البتہ بہت سے مفسرین اور راویان حدیث نے تصریح کی ہے کہ اس مقام پر اس سے مراد کدو کی بیل ہے۔ توجہ رہے کہ "شجرة" عربی زبان میں ان نباتات کو بھی کہا جاتا ہے جن کا تنا اور شاخ ہوا اور ان کو بھی جو تنا اور شاخ نہ رکھتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ درخت اور پودے کے لیے عام ہے۔ یہاں تک کہ اس ضمن میں پیغمبر گرامی اسلام سے ایک حدیث بھی نقل کی گئی ہے کہ ایک شخص نے آپ سے عرض کیا:-

انک تحب القرع

آپ کدو کو پسند کرتے ہیں؟

آپ نے فرمایا:-

اجل ہی شجرة انھی یونس

ماں یہ میرے بھائی یونسؑ کی مبری ہے۔

کہتے ہیں کہ کدو کی بیل میں اس کے علاوہ کہ اس کے پتے چوڑے اور پانی سے پڑھتے ہیں اور اس سے اچھلنا صاف سانا بنا جا سکتا ہے، کبھی بھی اس کے پتوں پر نہیں بیٹھی اور یونسؑ کے بدن کی جلد پھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے اس قدر نازک اور حساس ہو گئی تھی کہ اس پر حشرات کے بیٹھنے سے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے بدن کو اس کدو کی بیل کے ساتھ چھپا لیا تاکہ سورج کی تپش سے بھی مامون رہیں اور حشرات الارض سے بھی۔

شاید خدا کو یہ مطلوب ہے کہ وہ سبق جو حضرت یونسؑ کو پھلی کے پیٹ میں دیا تھا اس کی اس مرحلہ میں تکمیل کرے۔ وہ سورج کی تپش اور اس کی حرارت کو اپنے بدن کی نازک جلد پر محسوس کریں۔ تاکہ آئندہ رہبر ہوتے ہوئے اپنی امت کی جہنم کی جلانے والی آگ سے نجات کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ یہی معنوں بعض روایات میں بھی آیا ہے۔

اب ہم حضرت یونسؑ کا ذکر چھوڑتے ہیں اور ان کی قوم کا حال بیان کرتے ہیں۔

جب حضرت یونسؑ نے غیض و غضب کی حالت میں اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور خدا کے غضب کے آثار بھی اس پر ظاہر ہو گئے،

۱۔ روح البیان جلد ۱ ص ۲۰۹

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۲۲۶ حدیث ۱۱۶

تو وہ لوگ شدت کے ساتھ لرز اٹھے۔ اب انہیں ہوش آیا۔ ایک عالم کہ جو ان کے درمیان رہتا تھا وہ اس کے گرد جمع اس کی سبیری اور ہدایت سے توبہ پر آمادہ ہو گئے۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ سب مل کر بیابان کی طرف چل پڑے اور عورتوں اور بچوں نیز جانوروں اور ان کے درمیان جدائی ڈال دی۔ پھر گریہ و زاری میں مشغول ہو گئے اور نالہ و فریاد کی صدا بلند کی۔ اور خلوص کے ساتھ اپنے گنہگاروں پر توبہ کی کہ جو انہوں نے خدا کے پیغمبر حضرت یونسؑ کے ساتھ رو رکھی تھیں۔

اس موقع پر مذاب کے پردے مہٹ گئے اور وہ حادثہ پہاڑوں پر جا کر۔ اور توبہ کرنے والے اہل ایمان نے اس کے باعث نجات پائی۔

حضرت یونسؑ اس ماجرے کے بعد اپنی قوم کے یاس آئے تاکہ دیکھیں کہ مذاب سے ان پر کیا گزری؟

جب وہ آئے تو بہت متعجب ہوئے کہ گویا دنیا بدل گئی۔ وہ تو ان کی ہجرت کے وقت سب کے سب بت پرست تھے لیکن اب وہ سب کے سب خدا پرست مومنین بن گئے۔

قرآن اس موقع پر کہتا ہے: ہم نے اسے ایک لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ افراد کی طرف بھیجا (اور اسلٹناہ الیٰ ومانہ الیٰ)

او یزیدون۔)

وہ ایمان لے آئے اور ہم نے انہیں ایک معین مدت تک دنیاوی نعمتوں اور زندگی سے بہرہ مند کیا (فأمنوا)

فمتعناہم الٰی حین۔)

البتہ ان کا اجمالی ایمان اور توبہ تو پہلے ہو چکی تھی لیکن خدا اور اس کے پیغمبر حضرت یونسؑ اور ان کی تعلیمات و احکام پر ایمان اس وقت صورت پذیر ہوا جب جناب یونسؑ ان کے درمیان پٹ کر آئے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیات قرآنی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ماموریت نئے سرے سے اسی قوم کی طرف ہوئی۔ یہ جو بعض نے ان کی جدید ماموریت کو ایک نئی قوم کے لیے سمجھا ہے وہ ظاہر آیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اس طرف تو یہ بیان ہوا ہے کہ:

فأمنوا فمتعناہم الٰی حین

یعنی یہ قوم جس کی ہدایت کے لیے یونسؑ مامور ہوئے تھے وہ ایمان لے آئی اور ہم نے انہیں ایک معین زمانے تک بہرہ مند کیا۔

اور دوسری طرف یہی تفسیر سورہ یونسؑ میں اسی سابق قوم کے بارے میں آئی ہے۔

فلولا كانت قرية آمنات فنفعنا إياها لنفوسنا لئلا آمنوا

تفسیر برہان جلد ۴ ص ۲۵ پر یہ حدیث امام صادقؑ سے منقول ہے۔

کشفنا عنهم عذاب الخیر فی الحیوة الدنیاء و متعناہم الٰی حین (دوسری) قوموں میں سے کوئی قوم بروقت ایمان کیوں نہ لائی تاکہ وہ ان کے حال کے لیے مفید ہوتا۔ سوائے قوم یونسؑ کے کہ جس وقت وہ ایمان لے آئی تو ہم نے دنیاوی زندگی میں غوار کئے والا مذاب ان سے برطرف کر دیا اور ہم نے انہیں ایک مدت معین تک بہرہ مند کیا۔

(یونسؑ — ۹۸)

معنی طور پر یہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ”الٰی حین“ (معین مدت تک) سے مراد وہی ان کی زندگی اور اجل کا اختتام ہے۔

زیر بحث آیات میں ”ایک لاکھ یا اس سے زیادہ“ کیوں فرمایا گیا ہے اور زیادہ سے مراد کتنی تعداد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے طرح طرح کی تفسیریں بیان کی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعبیریں کسی چیز کی عظمت اور تاکید کے لیے ہوتی ہیں تاکہ کئے والے کے شک و شبہ کے لیے صلہ

چند اہم نکات

۱۔ حضرت یونسؑ کی زندگی کی مختصر تاریخ: ”یونسؑ“ ”مسیحی“ کے فرزند ہیں ”ذوالنون“ (مچھلی والا) کا لقب ہے اور یہ لقب اس بنا پر ہے کہ چونکہ ان کی سرگزشت۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ ایک مچھلی کے ساتھ تعلق ہے۔ آپ ان مشہورہ پیغمبروں میں سے ہیں جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت مارونؑ کے بعد اس دنیا میں آئے۔

بعض نے انہیں حضرت ہودؑ کی اولاد میں سے قرار دیا ہے اور ان کی ماموریت قوم ثمود کے باقی ماندہ لوگوں کی طرف قرار دیا ہے۔

ان کے ظہور کا مقام عراق کا ایک علاقہ تھا جس کا نام نینوا تھا۔ بعض نے ان کا ظہور ۸۲۵ قبل مسیح لکھا ہے اور اب بھی کوئٹہ کے نزدیک شطوط فرات کے کنارے ”یونسؑ“ کے نام ایک معروف قبر موجود ہے۔

بعض کتابوں نے لکھا ہے کہ آپ نبی اسرائیل کے ایک پیغمبر تھے جو حضرت سلیمانؑ کے بعد اہل نینوا کی طرف مبعوث ہوئے۔

اس بنا پر یہاں ”اد“ ”بل“ (یعنی بکو) کے معنی میں ہے۔

”نینوا“ کئی مقامات کا نام ہے پہلا مومل کے نزدیک شہر ہے (واقفہ مومل) اور دوسرا اطراف کوئٹہ میں کربلا کی سمت کا ایک علاقہ ہے اور تیسرا ہے کوئٹہ میں ایک شہر ہے جو بکو کے کنارے واقع مملکت آشور کا پایہ تخت ہے (مراۃ العارف دھندا بعض دوسروں نے لکھا ہے کہ ”نینوا“ ایک آشور کا ایک بہت بڑا شہر ہے جو مومل کے بالکل سامنے و بکو کے مشرقی کنارے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ (فرنگ قصص قرآن)

کتاب ”یوناہ“ میں جو عمدتاً (تورات) کی کتابوں میں سے ہے۔ ”یونس“ کے بارے میں تفصیلی ذکر ”یوناہ بن مתי“ کیا گیا ہے۔

اس کے مطابق وہ اس بات کے لیے ماہر ہوئے تھے کہ عظیم شہر نینوا میں اور لوگوں کی شرارت کے خلاف قیام کر رہے ہیں۔ بعد کچھ اذیتاقت بھی بیان کیے گئے ہیں جو قرآن کے بیان سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسلامی روایات مطابق تو حضرت یونس نے اپنی قوم کو دعوت دینے کے لیے قیام کیا اور اس سلسلے میں اپنے فریضے اور ذمہ داری کو انجام دیا اور جب قوم نے ان کی دعوت کو رد کیا تو انھوں نے انھیں نعرین کی اور برد مادی پھران کے درمیان سے چلے گئے اور کشتی اور مچلی کو انھیں پیش آیا۔ لیکن تورات کی عبادت بہت نامزدوں سے اور تضرع کے ساتھ کہتی ہے کہ وہ انجام ذمہ داری سے پہلے ہی تھے کہ استغفار سے دیں۔ لہذا وہ صھاگ کھڑے ہوئے اور کشتی اور مچلی والا واقعہ پیش آیا۔ اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ ”تورات“ کہتی ہے۔

جب تھلنے اس قوم سے ان کی توبہ کی وجہ سے عذاب اٹھا لیا، تو یونس کو بہت دکھ ہوا اور وہ بھڑک اٹھے۔

تورات کی فصول سے معلوم ہوتا ہے کہ یونس کو وہ شہر مامور کیا گیا پہلی ماموریت کے موقع پر انکار کر دیا اور اس دردناک انجام پر مبتلا ہوئے۔ دوبارہ انھیں مامور کیا گیا کہ اسی شہر ”نینوا“ کی طرف جائیں کہ نینوا کے لوگ بیدار ہو چکے ہیں اور خدا پر ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہے۔ اور وہ عفو الہی ان کے شامل حال ہو گیا ہے۔ لیکن یہ عفو بخشش یونس ابھی نہیں لگی۔

قرآن اور اسلامی روایات کے بیانات کا موجودہ تورات کے بیانات سے موازنہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ ”تورات“ میں کتنی تعریف ہو گئی ہے کہ اس نے اس عظیم پیغمبر کے مقام کو اس قدر گرا دیا ہے۔ کبھی ان کی طرف ماموریت اور ذمہ داری قبول نہ کرنے کی نسبت دیتی ہے اور کبھی ایک توبہ کرنے والی قوم پر پروردگار کے عفو و رحمت کو دیکھ کر خفا ہونے کی نسبت دیتی ہے۔ یہی چیزیں ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ موجودہ تورات کسی لحاظ سے بھی قابل اعتماد کتاب نہیں ہے بہر حال وہ ایک عظیم پیغمبر بن کر قرآن نے عظمت کے ساتھ یاد کیا ہے۔

۲۔ یونس مچلی کے پیٹ میں کیسے زندہ رہے؟ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں ہے کہ یونس مچلی کے پیٹ میں کتنی مدت رہے؟ چند گھنٹے یا چند دن یا چند ہفتے؟ بعض روایات میں تو گھنٹے، بعض میں تین دن اور بعض میں اس سے زیادہ، یہاں تک کہ چالیس دن تک کی مدت بیان کی گئی ہے، لیکن ان اقوال کا کوئی یقینی ثبوت موجود نہیں ہے۔ صرف تفسیر علی بن ابراہیم میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں حضرت یونس علیہ السلام کا مچلی کے پیٹ میں

و تھنئے بیان ہوا ہے۔

معن مقررین اہل سنت نے اس کی مدت ایک گھنٹہ بھی بیان کی ہے۔

لیکن جو کچھ بھی بولنا شک و شبہ یہ توقف ایک غیر معمولی امر ہے انسان ایسے ماحول میں جہاں ہوائی چوہند منٹ سے زیادہ زندہ نہ سکتا۔ اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پھر ماں کے پیٹ میں کئی ماہ تک زندہ رہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اس کے تنفس کی بجائے اپنا کام کرنا شروع نہیں کیا ہوتا اور وہ ضروری آکسیجن صرف ماں کے خون کے راستے سے حاصل کرتا ہے۔

اس بنا پر حضرت یونس کا ماجرا بلاشبہ ایک اعجاز ہے اور یہ پہلا اعجاز نہیں ہے جو ہمیں قرآن سے معلوم ہوا ہے۔ وہی خدا جس نے ہم کو آگ کے درمیان صبح و شام رکھا اور موسیٰ و بنی اسرائیل کو دریا کے وسط میں خشک راستے بنا کر غرق ہونے سے بچا یا اور نوح کو نجات دہا اور عاصم کشتی کے ذریعے اس عظیم اور وسیع طوفان سے نجات بخشی اور صبح و شام زمین پر اتارا۔ وہی خدا یہ قدرت بھی رکھتا ہے اپنے مخصوص بندوں میں سے ایک بندے کو ایک بہت بڑی مچلی کے پیٹ میں صبح و شام رکھے۔

ابنہ گزشتہ اور موجودہ زمانے میں اس قسم کی بڑی مچلیوں کا موجود ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اس وقت بھی بڑی بڑی مچلیاں وہیل نام کی موجود ہیں۔ جن کی لمبائی ۲۰ میٹر سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور یہ اس زمین کا سب سے بڑا جانور ہے اور اس کا ایک ٹن تک ہوتا ہے۔

ہم نے اسی سورہ میں گزشتہ انبیاء کی داستانیں پڑھی ہیں جنہوں نے اعجازاً مینر طریقے سے بلاؤں اور مصائب کے پختے سے نجات پائی اور حضرت یونس اس سلسلہ میں ان کے آخری نبی ہیں۔

۳۔ چھوٹی سی داستان میں بہت سے سبق :- ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں ان قصوں کا بیان تزیینی مقاصد کے لیے ہے کہ جو قرآن کوئی قصہ کہانیوں کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ انسان مادی اور تربیت کی کتاب ہے۔ اس عجیب داستان سے بہت سے ہندو نصائح حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ الف : مختلف چابے ایک بزرگ غیر ہے، ایک ”فرک اولیٰ“ کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو خدا کی بارگاہ میں بہت اہم ہے اور موجب نرا ہے۔

البتہ جو کہ پیغمبروں کا مقام بہت اونچا ہوتا ہے لہذا ان کی ایک چھوٹی سی غفلت بھی کبھی دوسروں کے گناہ کبیرہ کے برابر بھی جاتی ہے۔ اسی بنا پر ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اس داستان میں خدا نے انھیں صھاگ جانے والا غلام کہا ہے۔ روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ کشتی میں بیٹھے والوں نے کہا تھا کہ کوئی گنہ گار آدمی ہمارے درمیان ہے اور انجام کار خدا نے انھیں ایک وحشت ناک ناس میں گرفتار کیا۔ اور توبہ اور خدا کی طرف بازگشت کے بعد اس زندان سے خستہ حال اور بیمار بدن کے ساتھ آزاد ہوئے تھے۔

تاکہ سب لوگ جان لیں کہ مختلف اور گناہ کی شخص سے بھی قابل قبول نہیں ہے۔ انبیاء و اولیاء خدا کے مقام کی عظمت بھی اس میں ہے کہ وہ اس کے فرمان کے مطیع ہوتے ہیں۔ ورنہ کوئی بھی خدا کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں رکھتا البتہ یہ اس عظیم پیغمبر کی عظمت نشانی ہے کہ خدا اس کے بارے میں اس قسم کی سخت گیری کر رہا ہے۔

ب: ہاں داستان (کے اس حصے میں جو سورہ انبیاء کی آیت ۸۰ میں آیا ہے) میں عظیمین کے ہم واندوہ اور شکلات سے جملہ بھی وہی راستہ بتایا گیا ہے جو خود حضرت یونس نے طے کیا تھا اور وہ ہے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں خطا اور غلطی کا اعتراف، توبہ و تضرع اور اس کی بارگاہ میں توبہ و انابت و بازگشت۔

ج: یہ واقعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ایک گنہگار اور مستحق عذاب قوم، کس طرح سے آخری لمحات میں اپنی تاریخ راستہ بدل سکتی ہے اور خدا کی رحمت و محبت بھری آغوش کی طرف پلٹ کر نجات پا سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ موقع ہاتھ سے نکلنے سے پہلے متوجہ ہو جائے اور اگر ہو سکے تو کسی عالم کو اپنی رہبری کے لیے منتخب کرے۔

د: یہ امر اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ خدا پر ایمان اور گناہ سے توبہ انوار و برکات کے علاوہ دنیا کی ظاہری نعمتوں کا رُخ بھی انسان کی طرف موڑ دیتی ہے، آبادی بڑھاتی ہے نیز طول عمر اور زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا سبب بنتی ہے، اس مطلب کی نظیر حضرت نوح کی داستان میں بھی آئی ہے۔ اس کی تفصیل و تشریح انشاء اللہ سورہ نوح کی تفسیر میں بیان کی جائے گی۔

ہ: خدا کی قدرت اس قدر وسیع و عظیم ہے کہ اس کے سامنے کوئی بھی چیز مشکل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک انسان کو ایک عظیم اور وحشت ناک جانور کے مندر پید میں سالم و محفوظ رکھ سکتا ہے اور سالم ہی باہر نکال سکتا ہے یہ امور اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس عالم کے تمام اسباب اس کے ارادے کے تحت اور اس کے فرمان کے سامنے سرنگوں ہیں۔

۴۔ ایک سوال کا جواب: یہاں ایک سوال پڑا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسری اقوام کی سرگزشتوں کے بیان میں آیات قرآنی میں آیا ہے کہ نزول عذاب کے وقت (عذاب استیصال جو سرکش اقوام کی نابودی کے لیے نازل ہوتا ہے) توبہ و انابت سے اثر ہوتی ہے تو پھر قوم یونس کے لیے اس مسئلے میں استناد کیسے ہوا۔ اس سوال کے دو جواب دیئے جا سکتے ہیں:-

پہلا جواب تو یہ ہے کہ عذاب ابھی نازل نہیں ہوا تھا ابھی کچھ ملامت ہی جو تنبیہ اور توبہ وار کرنے کے لیے تھیں نظر آئی تھیں کہ انھوں نے ان تنبیہوں سے برحمل استفادہ کیا اور نزول عذاب سے پہلے ہی توبہ کر لی اور ایمان لے آئے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ عذاب "عذاب استیصال" نہیں تھا بلکہ گوشمالی کے طور پر تھا۔ ایسی گوشمالی قوموں پر عذاب نازل کرنے سے پہلے کی جاتی تھی، تاکہ وہ موقع ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے بیدار ہو جائیں اور توبہ کی کارستہ اختیار کریں۔ جیسا کہ فرقہ جوڑنے سے پہلے فرعون کی قوم پر مختلف عذاب بھیجے گئے تھے۔

۵۔ اسلام میں قرعہ اندازی کی مشروعیت: قرعہ اور اس کی مشروعیت سے مراد روایات میں امام صادق سے منقول ہے:

اسی قضیۃ اعدل من القرعۃ اذا فوض الامر الی اللہ عزوجل، یقول: فساہم فکان من المعد حصین

قرعہ سے بڑھ کر علاء فیصلہ اور کون سا ہو سکتا ہے (کہ جب معاملہ مشکل ہو جائے) تو موضوع کو خدا کے سپرد کر دیا جائے، کیا خدا (قرآن مجید میں یونس کے بارے میں) نہیں کہتا: "فساہم فکان من المعد حصین" (یونس نے کشتی میں بیٹھے والوں کے ساتھ قرعہ اندازی کی اور قرعہ یونس کے نام نکلا اور وہ مطلوب ہو گئے)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب معاملہ مشکل ہو جائے اور اس کے حل کی اور کوئی دوسری راہ موجود نہ ہو اور کام کو خدا کے سپرد کر دیا جائے تو واقعاً قرعہ راہ کثا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یونس کی داستان میں حقیقت پر ٹھیک منطبق ہوا۔ یہی مطلب ایک دوسری حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

لیس من قوم تنازعوا (تقارعوا) ثم فوضوا امرهم الی اللہ الا خرج سهم المحق

کسی قوم نے (جب مسئلہ کے حل کی تمام راہیں مسدود ہو گئی ہوں) قرعہ پر اقدام نہیں کیا جبکہ انھوں نے اپنے کام کو خدا کے سپرد کر دیا ہو۔ مگر یہ کہ قرعہ حقیقت کے مطابق نکلا اور حق آشکار و واضح ہو گیا۔ اس مسئلے کی مزید تشریح و تفصیل ہم نے کتاب "القواعد الفقہیہ" میں بیان کی ہے۔

۱۔ تفسیر برہان جلد ۴ ص ۲۶ (حدیث ۶)

۲۔ وسائل کتاب القضاء جلد ۱ باب حکم بالقرعۃ فی القضا یا المصلحۃ از ابوب کثیرہ الحکم و احکام الدعوی (باب ۱۲) حدیث ۵

۱۴۹۔ فَاسْتَفْتِهِمُ الرَّبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ۝

۱۵۰۔ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ اِنَاثًا وَهُمْ شٰهِدُونَ ۝

۱۵۱۔ اَلَا اِنَّهُمْ مِّنْ اٰفِكِهِمْ لَيَقُولُونَ ۝

۱۵۲۔ وَكَذٰلِكَ نَكْذِبُ بَنُونَ ۝

۱۵۳۔ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلٰى الْبَنِيْنَ ۝

۱۵۴۔ مَا لَكُمْ تَفٰكُرًا كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝

۱۵۵۔ اَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝

۱۵۶۔ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝

۱۵۷۔ فَاتُوا بِكُتُبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

۱۵۸۔ وَجَعَلُوْا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ نَسْبًا ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتِ الْجِنَّةُ

اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ۝

۱۵۹۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُصِفُونَ ۝

۱۶۰۔ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلِصِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۴۹۔ ان سے پوچھ؛ کیا تیرے پروردگار کیلئے توڑکیاں ہیں اور ان کے لیے لڑکے؟

۱۵۰۔ کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیوں کی صورت میں پیدا کیا ہے اور وہ مشاہدہ کر رہے تھے؟

۱۵۱۔ جان لو کہ وہ اپنی بڑی تمہمت باندھتے ہوئے کہتے ہیں؛

۱۵۲۔ خدا صاحب اولاد ہے، لیکن یقیناً وہ قطعی جھوٹ بولتے ہیں۔

۱۵۱۔ کیا اس نے بیٹیوں کو بیٹیوں پر ترجیح دی ہے؟

۱۵۲۔ تمہیں کیا ہو گیا، تم یہ کیسا فیصلہ کر رہے ہو (کچھ سمجھتے بھی ہو کہ یہ کیا کہہ رہے ہو)؟

۱۵۳۔ کیا تم متوجہ نہیں ہوتے؟

۱۵۴۔ کیا تمہارے پاس اس بارے میں کوئی واضح دلیل ہے؟

۱۵۵۔ اگر تم پر سچ کہتے ہو تو اپنی کتاب لے آؤ!

۱۵۸۔ وہ اس کے اور جنوں کے درمیان (رشتہ داری اور) نسبت کے قائل ہو گئے ہیں، حالانکہ جن اچھی طرح سے

جاننے ہیں کہ یہ بت پرست عدالت الہی میں حاضر کیے جائیں گے۔

۱۵۹۔ خدا اس توصیف سے جو وہ کرتے ہیں، منزہ ہے۔

۱۶۰۔ مگر خدا کے مخلص بندے۔

تفسیر

میں تہمتیں

گذشتہ انبیاء کی چھ داستانوں اور ان میں سے ہر ایک میں جو اصلاحی و ترمیمی درس پوشیدہ تھا، اسے ذکر کرنے کے بعد مضمون سخن تبدیل کرتے ہوئے ایک اور مطلب شروع کیا جاتا ہے کہ جو مشرکین عرب کے ساتھ شدیدارتباط رکھتے ہیں، ان کے شرک کی مختلف شکلوں کو پیش کر کے ان سے سخت اور شدید باز پرس کی جا رہی ہے۔ اور مختلف دلائل کے ذریعے ان کے بے ہودہ اور خرافاتی انکار کی سرکوبی کی جا رہی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ مشرکین عرب کی ایک جملہ امت اعطاط فکری اور کسی قسم کا علم و دانش نہ ہونے کی بنا پر خدا کو اپنے جیسا قیاس کرتے تھے اور اس کے لیے اولاد اور بھی بوری کے بھی قائل تھے۔

ان میں سے حسین، سلیم، خزیمہ اور بنی مرثد وغیرہ قبیلے یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور بہت سارے مشرکین عرب جنوں کو بھی خدا کی اولاد سمجھتے تھے یا معنی پروردگار کہہ کر بے جنات میں سے بیوی کے قائل تھے۔

اس قسم کے بے بنیاد، بے ہودہ اور خرافاتی خیالات و تصورات۔ نسل مائل راہ حق سے منحرف کر دیا تھا۔ اس طرح سے کہ توحید اور خدا کی یگانگی کے آثار ان کے ماں سے ختم ہو گئے تھے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو بیٹی یہ خیال کرتی ہے کہ اس کا پروردگار اس کی طرح دو ڈنگ رکھتا ہے۔

ماں، کوتاہ نظری، انسان کو موازنہ کرنے کی طرف مائل ہونے والی ہے، غالباً کائنات کے کرامات سے مراد ان کے خرافات اور مشرکیت کے

سلسلے میں یہ قیاس گمراہی کا بہترین سبب ہے۔

بہر حال قرآن پڑھنے کی طرف توجہ کرتا ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے اور انھیں تجرباتی، عقلی اور منطقی طریقوں سے جواب دیتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ان سے پوچھو، کیا تیرے پروردگار کی تو بیٹیاں ہیں اور ان کے بیٹے ہیں (فاستفتحتم البنات و لھم البنون)۔

جس چیز کو خود اپنے لیے پسند نہیں کرتے ہو، اسے خدا کے لیے قرار دیتے ہو (یگنثکون کے باطل عقیدہ کے مطابق) کیونکہ وہ لڑکی سے سخت متنفر تھے اور لڑکے سے شدید لگاؤ رکھتے تھے کیونکہ لڑکے ان کی جنگوں اور فطرت گریں میں نمایاں اور اگرتے تھے جبکہ لڑکیاں ان کی کچھ مدد نہیں کر پاتی تھیں۔

بلاشبہ لڑکے اور لڑکیاں انسانی فطرت نظر سے اور خدا کی بارگاہ میں قدر و قیمت کے لحاظ سے، یکساں اور برابر ہیں، دونوں شخصیت کا معیار پاکیزگی اور تقویٰ ہے لیکن یہاں پر قرآن کا استدلال اصطلاح کے مطابق "مسلمات خصم" کو بیان کرنے کے طور پر ہے۔

کطرف مقابل کے مطالب کو لے کر خود اسی کی طرف پلٹانے جائیں۔

اس معنی کی نظیر قرآن کی دوسری صورتوں میں بھی آئی ہے مثلاً سورہ نجم کی آیت ۲۲ میں بیان ہوا ہے:

الکمر الذکر ولہ الاثنی تلتک اذ اقسمة ضیعی

کیا تمھارے لیے تو بیٹا ہے اور اس کے لیے بیٹی، یہ تو ایک غیر عادلانہ تقسیم ہے۔

اس کے بعد اس سلسلے کی حسی دلیل پیش کی گئی ہے۔ پھر استغناء انکاری کی صورت میں قرآن کہتا ہے، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیوں کی صورت میں پیدا کیا ہے اور وہ اس کے شاہد و ناظر تھے؟ (ما خلقنا الملائکة اناثاً و ہم شاہدون)۔

بلاشبہ دشمن اس سلسلے میں ان کا جواب منفی تھا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی خلقتِ ملائکہ کے وقت اپنے حضور و شہود کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔

بارگیزدلیل عقلی کے جو ان کے مسلماتِ ذہنی سے لی گئی ہے کی طرف رجوع کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، جان لو کہ وہ اپنی اس قبیح اور بہت بڑی تہمت کے ساتھ کہتے ہیں..... (الا انھم من افکھم لیتقولون)۔

خدا صاحب اولاد ہے (جبکہ) وہ قطعاً جھوٹے ہیں (ولدا للہ و انھم لکاذبون)۔

لفظ "استفتحتم" ماہ "استفتاؤ" سے اصل میں "فتویٰ سے یا لگا ہے جو شکل مسائل کا جواب دینے کے معنی میں ہے۔

سے مخالف کی تسلیم شدہ بات سے استدلال کرنا مراد ہے۔

کیا اس نے بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دی ہے؟ (اصطفیٰ البنات علی البنین)۔

تھیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیسے فیصلے کر رہے ہو؟! کچھ سمجھتے بھی ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟ (مالکم کیف کمون)۔

کیا ابھی اس بات کا وقت نہیں آیا کہ تم ان عقل، فضول اور قبیح و رسوا خرافات سے دستبردار ہو جاؤ؟ کیا تم متوجہ نہیں تھے؟ (افلا تذکرون)۔

یہ باتیں اس قدر باطل اور بے بنیاد ہیں کہ اگر انسان تھوڑی سی بھی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتا ہو اور اس بارے میں غور کرے تو ان کے ناپا پایے کی پختا ہے پاس اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود ہے؟ (ما لکم سلطان مبین)۔

ایک حسی اور ایک عقلی دلیل کے ساتھ ان کے یہودہ اور خرافاتی دعوے کو باطل کرنے کے بعد قرآن تیسری دلیل پیش کرتا ہے جو مسلمات سے متعلق ہے۔ کتاب ہے، اگر اس قسم کی کوئی بات جو تم کہتے ہو صحیح ہوتی تو اس کا کوئی اثر و نشان گزشتہ کتابوں میں نہ پاتا ہے کیا تمھارے پاس اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود ہے؟ (ما لکم سلطان مبین)۔

"اگر تمھارے پاس کوئی ایسی دلیل موجود ہے تو اپنی کتاب لے آؤ، اگر تم سچ کہتے ہو" (فأتوا بکتابکم ان کنتم صادقین)۔

کس کتاب میں؟ کس تحریر میں؟ اور کس دجی آسمانی میں اس قسم کی چیز آئی ہے اور کس پیغمبر پر نازل ہوئی ہے؟ ایسی ہی بات قرآن میں بہت پرستوں کے لیے موجود ہے۔ اس ضمن میں قرآن کہتا ہے کہ انھوں نے فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں بیٹیاں قرار دے دیا ہے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر خدا نہ چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔ قرآن مزید کہتا ہے،

ما اتیناھم کتاباً من قبلہ فھم بہ مستمسکون

کیا ہم نے اس سے پہلے ان کے پاس کوئی ایسی کتاب بھیجی ہے جس سے وہ اپنے دعوے میں

سہارا لیتے ہیں۔ (زخرف ۲۱)

نہیں! یہ باتیں کتبِ آسمانی سے اخذ نہیں کی گئیں۔ یہ تو وہ خرافات ہیں جو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف اور کچھ جاہلوں سے دوسرے جاہلوں کی طرف منتقل ہوئی ہیں اور اس کی عقل کے اعتبار سے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ جیسا کہ سورہ زخرف کی اسی آیت کے ذیل میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

بعد االی آیت میں مشرکین عرب کی خرافات میں سے ایک اور بے ہودگی بیان کی گئی ہے اور وہ نسبت ہے جوہ "خدا" اور جن کے درمیان سمجھتے تھے۔ اس موقع پر گفتگو خطاب کی صورت سے نکل کر غائب کی صورت میں آگئی ہے۔ گو یا وہ اس قدر

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: خدا اس تعریف و توصیف سے جو یہ (عاجل و گمراہ) گروہ کرتے ہیں، پاک و خیر ہے (یعنی عموماً ایصقون)۔

اس توصیف کے سوا جو خدا کے مخلص بندے (از روئے آگاہی و معرفت اس کے بارے میں کہتے ہیں: نسیحاً توصیف میں اس ذات کے لیے نمایاں نہیں ہے (الاعباد اللہ المخلصین)۔

اس طرح ہر قسم کی توصیف جو لوگ خدا کے بارے میں کرتے ہیں درست نہیں ہے اور خدا اس سے پاک و مقرب ہونے کے لیے اسے تو صیغہ کے جو مخلص بندے اس کی کرتے ہیں۔ وہ بندے ہر قسم کے شرک، ہوائے نفس، جہالت، لغویت سے تیز ہیں اور خدا کی سوا جس کی اس نے خود اجازت دی ہے تو صیغہ نہیں کرتے بلکہ

”عباد اللہ المخلصین“ کے بارے میں ہم نے اسی سورہ کی آیہ ۱۲۸ کے ذیل میں بحث کی ہے۔

ہاں! خدا کی شناخت اور معرفت کے لیے ان خرافات کے پیچھے نہیں جانا چاہیے جو زمانہ جاہلیت میں اقوام سے بقی رہ گئی ہیں اور انسان کو انھیں بیان کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے بلکہ مخلص بندوں کی پیروی کرنا چاہیے جن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انہوں کی بندگی کی طرف سے جاتی ہے اور اس کے نور و جلالت میں محو کر دیتی ہے۔ شرک کے ہر طرے سے شک و جہالت کو اس کے دل سے دھو دیتی ہے اور ہر قسم کے تشبیہ و تشبیہ کو ذہن سے مٹا دیتی ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات علی علیہ السلام کے صحیح الہامانہ کے خطبات اور صحیفہ صحیحہ میں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان بندگان خدا کی توصیغوں سے خدا کو پہچاننا چاہیے۔ میرا جوش عرس اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:-

لم یطلع العقول علی تحدید صفتہ، ولم یحجبہا عن واجب معرفتہ،

فہو الذی تشہد لہ اعدام الوجود علی اقرار قلب ذی الجحود علی تصحیح

یقولہ المشبہون بہ والجاحدون لہ علواً کبیراً

نہ تو اس نے عقول کو اپنی صفات کی کند و حقیقت سے آگاہ کیا ہے اور نہ ہی انھیں اپنے معرفت

شناخت سے باز رکھا ہے۔ وہ وہی ہے جس کے وجود کے اقرار پر عالم سستی کی نشانیاں شریعت کے

دلوں کو ابھارتی ہیں اور وہ ان لوگوں کی بات سے برتر و بالا ہے جو اسے اس کی مخلوقات کے ساتھ

تشبیہ دیتے ہیں یا اس کے انکار کا راستہ اختیار کرتے ہیں بلکہ

ایک دوسری جگہ پر وہ گار کی تعریف و توصیف میں اس طرح فرماتے ہیں:-

اس تفسیر کی بنا پر (الاعباد اللہ) کا مبد (بصقون) کی خبر سے استدہا ہے لیکن میں نے ”محضرون“ کی خبر سے مستدہا کیجیے اور اس کی

مختلف تفسیر کرتے ہیں۔ البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اور ہر حالت میں استثناء منقطع ہے۔

صحیح الہامانہ خطبہ ۳۹

سبے قدر و قیمت ہیں کہ آسنے ماننے بات کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ فرمایا گیا ہے، وہ اس کے اور جن کے درمیان اور نسبت کے قائل ہو گئے ہیں (و جعلوا بینہ و بین الجنة نسباً)۔

یہ کون سی نسبت تھی جس کے وہ خدا اور جن کے درمیان قائل تھے؟ اس سوال کے جواب میں کئی تفاسیر بیان کی گئی ہیں بعض نے تو یہ کہا ہے کہ وہ دو گانہ پرست تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ (نعمذ باللہ) خدا اور شیطان جہانی جہانی بیکیوں کا خالق ہے اور شیطان برائیوں کا خالق ہے۔

یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے کیونکہ دو گانہ پرست اور ثنویین دینائے عرب میں مشہور نہیں تھے۔ البتہ سامانیوں کے دور میں ایسا ماننے والے علاقوں میں بیسے ہودہ عقیدہ موجود تھا۔

بعض دوسرے مفسرین نے جن اور ملک کو ایک ہی معنی میں سمجھا ہے۔ کیونکہ جن اصل میں اس موجود کے معنی میں ہے جسے پرستیدہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ فرشتے جو کہ آنکھ سے نظر نہیں آتے لہذا یہ لفظ انھی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ یہ کہتے ہیں کہ مراد وہی نسبت ہے جس کی زمانہ جاہلیت کے عرب ان کے لیے قائل تھے اور انھیں خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

مشکل ہے کہ یہ تفسیر بھی صحیح ہو چونکہ زیر بحث آیات ظاہری اعتبار سے دو الگ الگ مطالب بیان کر رہی ہیں۔ علاوہ اس لفظ ”جن“ کا ”ملاک“ پر اطلاق معمول و مانوس نہیں ہے، خصوصاً قرآن مجید میں۔

تیسری تفسیر جو بعض نے اس آیت کے بارے میں بیان کی ہے یہ ہے کہ وہ جنوں کو خدا کی بیویاں خیال کرتے تھے اور انہیں خدا کی بیٹیاں۔

یہ تفسیر بھی بعید نظر آتی ہے چونکہ لفظ ”نسب“ کا ”زوجیت“ پر اطلاق بھی بعید ہے۔

وہ تفسیر جو سب سے زیادہ مناسب ہے یہ ہے کہ ”نسب“ سے مراد ہر قسم کی نسبت و رابطہ ہے۔ چاہے رشتہ داروں کوئی پہلو اس میں نہ ہو اور ہم مانتے ہیں کہ بعض مشرکین عرب جنوں کی پرستش کرتے تھے اور انھیں خدا کا شریک سمجھتے تھے اور اس سے وہ ان کے اور خدا کے درمیان ایک نسبت اور رابطے کے قائل تھے۔

ہر حال قرآن مجید اس بے ہودہ اور خرافاتی عقیدے کا شدت کے ساتھ انکار کرتا ہے اور کہتا ہے، وہ جن جنھیں خسران بڑت پرست اپنا محبوب خیال کرتے تھے یا انھیں خدا کا رشتہ دار سمجھتے تھے، ہاں! وہی جن اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بے ہودہ بت پرست خدا کی عدالت میں حساب و کتاب اور مذاب و منزل کے لیے ضرور حاضر ہوں گے (و لقد علمت الجنة انہم لمحضرون)۔

بعض نے اس آیت کی تفسیر میں ایک احتمال بھی ذکر کیا ہے وہ یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ گمراہ کرنے والے جنات جانتے ہیں کہ وہ عدالتِ خداوندی میں حساب و کتاب اور مذاب کے لیے حاضر کیے جائیں گے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب لگتی ہے بلکہ

سہ پہلی صورت میں ”ہم“ کی تفسیر مشرکین کی طرف لٹھی ہے اور دوسری صورت میں ”جن“ کی طرف۔

لاتناله الاوہام فتقدرہ، ولا تتوہمہ الفطن فتصورہ، ولا تدسکہ
الحواس فتعسہ، ولا تلمسہ الایدی فتعسہ، ولا یتغیر بہ حال، ولا یتبدل فی
الاحوال، ولا تبلیہ الیالی والایام، ولا یغیرہ الضیاء والظلم، ولا یوصف بشیء
من الاجزاء، ولا بالجوارح والاعضاء، ولا بعرض من الاعراض، ولا بالغیریۃ
والابعاض، ولا یقال لہ حد ولا نہایۃ، ولا انقطاع ولا غایۃ

بتدو نام اور اندیشوں کے ہاتھ اس کی دامن کبریائی تک نہیں پہنچ سکتے کہ اسے کسی حد میں محدود
کردیں اور صاحبان ہوش و خرد اس کے نقش کی اپنے خیال میں تصویر کشی نہیں کر سکتے۔ حواس اس کے
ادراک سے عاجز ہیں اور ہاتھ اسے چھونے سے قاصر ہیں۔ تغیر و تبدل اس کے لیے نہیں ہے۔ زمانہ
گزرنے سے اس کے وجود میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ راتوں اور دنوں کا آنا جانا اسے کمزور اور
پرانا نہیں کرتا۔ روشنی اور تاریکی اس میں تغیر پیدا نہیں کرتے۔ اس کی نہ توازن اور اعضا و جوارح
کے ساتھ توصیف ہو سکتی ہے اور نہ ہی عوارض و ابعاض کے ساتھ۔ اور اس کے لیے کوئی حد بندی اور
انتہا نہیں ہے۔ اور وہ کوئی انقطاع و انتہا نہیں رکھتا۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

ومن قال فیما؛ فقد ضمنہ، ومن قال علام؛ فقد اخلی منہ، کاشن
لا عن حدث، موجود لاجن عدم مع کل شیء لا بمقارنہ و غیر کل
شیء لا بمعزایلہ

جو شخص یہ کہے کہ خدا کہاں ہے؟ اس نے اس کا کسی چیز میں تصور کیا ہے اور جو کوئی یہ پوچھے
کہ وہ کس چیز پر برقرار ہے، اس نے کسی جگہ کو اس سے خالی سمجھا ہے، وہ ہمیشہ سے تھا اور کسی چیز
سے وجود میں نہیں آیا۔ وہ ایسا وجود ہے جس سے پہلے دم ہے ہی نہیں، اور وہ ہر چیز کے
ساتھ ہے لیکن اس کا قرین ہو کر نہیں اور ہر چیز سے الگ اور غیر ہے، لیکن اس سے بیگانہ اور جدا
ہو کر نہیں رہتا۔

امام علی بن الحسین سید الساجدین علیہ السلام صحیفہ سجادہ میں فرماتے ہیں:-

الحمد لله الاول بلا اول كان قبله، والاخر بلا اخر يكون بعدہ الذي قصرت
عن رؤيته ابصار الناظرين وعجزت عن نعتہ اوہام الواصفين

حدود سائنس مخصوص ہے اس خدا کے لیے جس کی ہستی مبدأ آفرینش ہے بغیر اس کے کہ اس کی ذات
ازلی کی کوئی ابتدا ہو اور وہ ہمیں آخری ہے بغیر اس کے کہ اس حقیقت ابدی کے لیے آخر و انتہا کا
کوئی تصور ہو سکے۔ کوئی موجود اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسی ذات ہے کہ جو کچھ
دلوں کی نگاہیں اسے دیکھنے سے قاصر ہیں اور توصیف کرنے والوں کی عقل و فہم اس کی حد و شنا
سے عاجز ہے۔

ہاں خدا کی معرفت اور شناخت ان "عباد اللہ الصالحین" کے مکتب سے حاصل کرنا چاہیے۔ اور اس
سے خواہش اس کا سبق پڑھنا چاہیے۔

- ۱۶۱- فَإِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ ۝
 ۱۶۲- مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفِتْنِينَ ۝
 ۱۶۳- الْآمَنُ هُوَ صَالِ الْجَحِيمِ ۝
 ۱۶۴- وَمَا مِتْنَا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَعْلُومٌ ۝
 ۱۶۵- وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُونَ ۝
 ۱۶۶- وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ ۝
 ۱۶۷- وَإِن كَانُوا لَيَقُولُونَ ۝
 ۱۶۸- لَوَ أَنَّا عِنْدَنَا ذِكْرًا مِنَ الْوَالِيْنَ ۝
 ۱۶۹- لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلِصِينَ ۝
 ۱۷۰- فَكْفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ

- ۱۶۱- تم اور جن کی تم پرستش کرتے ہو۔
 ۱۶۲- تم ہرگز کسی کو (اس سے) دھوکا نہیں دے سکتے۔
 ۱۶۳- مگر وہ، جو خود ہی پرچاہتے ہیں کہ جہنم کی آگ میں ملیں۔
 ۱۶۴- ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک معلوم مقام ہے۔
 ۱۶۵- اور ہم سب کے سب (خدا کے حکم کی اطاعت کے لیے) صف باندھے کھڑے ہیں۔
 ۱۶۶- اور ہم سب کے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں۔
 ۱۶۷- اور وہ تو ہمیشہ یہی کہتے تھے۔
 ۱۶۸- اگر پہلے لوگوں کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ہمارے پاس ہوتی۔

ہم خدا کے مخلص بنوں میں سے ہوتے۔

لیکن جس وقت عظیم آسمانی کتاب ان کے لیے نازل ہوئی (تو وہ اس سے کافر ہو گئے، لیکن منقریب وہ اپنے کام کا نتیجہ دیکھ لیں گے۔

سیر
کے دعوے

گذشتہ آیات میں مشرکین کے مختلف مبودوں کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں بھی وہی مسئلہ جاری ہے اور اس سلسلے میں
 ت میں ایک ایک مطلب بیان ہو رہا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ تم بت پرستوں کے دوسرے کانیک اور پاک لوگوں کے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ صرف آلودہ دل اور کھٹاری
 کی طرف مائل ہونے والی دوزخی رویوں ہی ان دوسروں کو قبول کرتی ہیں۔ فرمایا گیا ہے: تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو.....
 انکم وما تعبدون)۔

”تم ہرگز کسی کو (اس سے) فریب نہیں دے سکتے، اور فتنہ و فساد کے ذریعے خدا سے منحرف نہیں کر سکتے (ما انتم
 له بغاۃن)۔“

مگر وہی جو خود ہی پرچاہتے ہیں کہ جہنم کی آگ میں ملیں (الآمن هو صال الجحیم)۔

مسلم جبر کے طرفداروں نے ان آیات سے جو کچھ سمجھا ہے اس کے برخلاف یہ آیات اس مکتب کے برخلاف ایک دلیل ہے
 حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہے کہ کوئی بھی شخص انحرافات کے مقابلے میں اپنے آپ کو معذور نہیں جان سکتا اور یہ دعویٰ نہیں
 کر سکتے دھوکہ دے کر بت پرستی کی طرف لے جایا گیا ہے۔ قرآن کتاب ہے، تم بت پرست لوگوں کو ”فتنہ اور فریب دینے کی طاقت

یہ آیت اور اس سے پہلی آیت اور بعد والی آیت مشورہ ہمارے قول کے مطابق ترکیب نوی کے لحاظ سے اس طرح ہے ”ما انتم بغاۃن“ کے جو
 میں ما موصول ہے اور اس کا مطلق ”ان تکم پر ہے اور ”ما انتم علیہ بغاۃن“ اس کی خبر ہے اس قیصر کے ساتھ کہ ”ما انتم
 علیہ“ کا ”ما“ تانیفہ اور علیہ کی خبر خدا کی طرف لوتی ہے اور اس کا مجموعی نتیجہ یہ بنتا ہے۔

انکم والہتکم التی تعبدون والہا لا تقدر و علی اضلال احد علی اللہ بسببہا الامن یعتق
 بنار الجحیم بسوء اختیارہ

میں دوسرے ہمارے ”انکم وما تعبدون“ کی آیت کو مستقل بنا دیا ہے جن کا مضموم یہ ہوگا کہ تم اپنے مبودوں کے ساتھ رہو، اس کے بعد والی آیت میں کتاب
 ہے کہ تم اس کے ذریعے کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے مگر اسکی کو جو خود دوزخی ہونا چاہیں۔

نہیں رکھتے، مگر انھی کو جو خود اپنے ارادے کے ساتھ دوزخ کی راہ اختیار کریں۔

اس بات کا شاہد "صالح الجحیم" کی تعبیر ہے، کیونکہ دراصل "صالحی" اہم فاعل کی شکل میں تھا اور ماضی اہم فاعل کے صیغے کو کسی موجود ماضی کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوم کسی کام کو ارادہ و اختیار سے انجام دینا ہے۔ "جاس" و "ضارب" اس بنا پر "صالح الجحیم" یعنی وہ شخص جو اپنے آپ کو جہنم کی آگ میں جلانے کے لیے آمادہ ہوا اور اسے تمام انحراف کرنے والوں کے لیے مذک کی راہ بند ہو جاتی ہے۔

بعض مشہور مفسرین کے بارے میں تعجب ہے کہ انھوں نے آیہ کا اس طرح معنی کیا ہے: "مسیحی کو دھوکا اور فریب نہیں سوائے ان لوگوں کے جن کا معنی ہونا مقدر ہو چکا ہے۔"

واقعاً اگر آیت کا معنی یہ ہے تو پھر پتھر کیسے بولے آتے ہیں؟ آسمانی کتابیں کس مقصد کے لیے نازل ہوئی ہیں؟ حساب اور قرآن کی آیات میں بت پرستوں کو لعنت و لعنت کا کیا مفہوم ہے؟ اور خدا کی عدالت کہاں جائے گی؟ ہاں! بکتب جبر کا اعتراف کرنے سے اس حقیقت کو قبول کر لینا چاہیے کہ یہ بکتب انبیاء کی اصالت کو کلی طور پر مخدوش کر رہے، اس کے تمام مفادیم کو مٹ کر دیتا ہے اور تمام الہی اور انسانی قدروں کو برباد کر دیتا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ "صالحی" "صلی" "بروزن" "سرد" کے مادہ سے آگ جلائے، آگ میں دام بونے یا آگ میں بھونے جانے کے معنی میں ہے اور "فاتن" "فتنہ" کے مادہ سے "اہم فاعل" فتنہ گر اور گمراہ کرنے والے کے معنی میں ہے۔

یہ تین آیات جو بت پرستوں کی فتنہ جوئی اور گمراہ کن حرکتوں کے مقابلہ میں انسانوں کے سزا اختیار کو واضح کرتی ہیں۔ ان کے بعد تین آیات میں فرشتوں کے بندہ والا مقام کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ وہی فرشتے جنھیں بت پرست خدا کی بیٹیاں خیال کرتے ہیں اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ گفتگو کو خود انھی کے زبان سے بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ہم میں سے ہر ایک کا ایک معلوم مقام ہے (وَمَا مِمَّا آتَاكُم مِّن مَّوَدِّعٍ مِّن مَّا كَانَتْ تَأْتِيكُم بِالْبَاطِلِ أَعْيُنُكُمْ إِن كُمْ فَاعِلِينَ)۔

اور ہم سب فرمان خدا کی اطاعت کے لیے صف بستہ کھڑے ہیں اور اس کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار رہتے ہیں (وَأَتَاكُم مِّن مَّوَدِّعٍ مِّن مَّا كَانَتْ تَأْتِيكُم بِالْبَاطِلِ أَعْيُنُكُمْ إِن كُمْ فَاعِلِينَ)۔

اور ہم سب کے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کو ان چیزوں سے جو اس کی پاک ذات کے لائق نہیں ہیں، منزه کرتے ہیں (وَأَتَاكُم مِّن مَّوَدِّعٍ مِّن مَّا كَانَتْ تَأْتِيكُم بِالْبَاطِلِ أَعْيُنُكُمْ إِن كُمْ فَاعِلِينَ)۔

ہاں! ہم تو وہ بندے ہیں جو دل و جان کو پھیلنے پر رکھے ہوئے ہیں۔ ہماری آنکھیں اور کان اس کے فرمان پر لگے ہوئے ہیں۔

بعض روایات جہاں بت پرستوں کے طریقے سے وارد ہوئی ہیں، میں یہ تفسیر بیان کی گئی ہے کہ اس سے مراد انہی موصوفین ہیں لیکن یہ تفسیر ان کے مقام کی نشوونما کے لیے تشبیہ کے عنوان سے ہر موصوفین کی طرح وہ معین و معلوم مقامات اور فضائل اور ذمہ داریاں رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہم بھی ہیں۔

انہاں اور خدا کا بیٹا ہونا کہاں؟ ہم سے ان بیچ اور جہوئی نسبتوں سے پاک اور منزه سمجھتے ہیں اور ہم مشرکین کے ان خرافات اور دام سے متفرق اور بیزار ہیں۔

حقیقت میں یہ تین آیات فرشتوں کی صفات کے تین حصوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

پہلا یہ کہ ان میں سے ہر ایک، ایک مرتبہ و منزلت رکھتا ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتا۔

دوسرا یہ کہ فرشتے عرصۂ آفرینش میں اور وسیع عالم ہستی میں ادا فرمادندہ کے اجراء کے سلسلے میں ہمیشہ فرمان خدا کی اطاعت کے لیے آمادہ و تیار رہتے ہیں۔ یہ بات اس چیز سے مشابہ ہے جو سورہ انبیاء کی آیت ۲۹، ۲۷ میں آئی ہے کہ:

بَلِ عِبَادٍ مَّكْرَمُونَ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يُعْطُونَ
وہ خدا کے اچھے بندے ہیں جو بات کرنے میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور اس کے فرمان پر عمل کرتے ہیں۔

تیسرا یہ کہ وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کو اس چیز سے جو اس کے مقام کے لائق نہیں ہے، منزه شمار کرتے ہیں۔

چونکہ ان دونوں جملوں (إِنَّا لَنَحْنُ الصَّٰقِقُونَ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْعَسِيْبُونَ) کا عربی ادب کے لحاظ سے مفہوم "حصہ" ہے، لہذا بعض مفسرین نے اس سے یہ مطلب لیا ہے کہ فرشتے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صرف ہم خدا کے حکم کے مطیع ہیں اور اس کی تسبیح کرنے والے بھی ہم ہی ہیں۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی آدم کی اطاعت و تسبیح فرشتوں کے کام کے مقابلے میں کوئی اہم چیز نہیں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے ان آیات کے ذیل میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا:-

مَا فِي السَّمَاوَاتِ مَوْضِعَ شِبْرٍ إِلَّا وَعَلَيْهِ مَلِكٌ يُّصَلِّي وَيُسَبِّحُ
تمام آسمانوں میں ایک بالشت جبر جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں پر کوئی فرشتہ نماز اور خدا کی تسبیح میں مصروف نہ ہو۔

ایک دوسری روایت میں بھی معنی ایک دوسری صورت میں بیان ہوا ہے:-

مَا فِي السَّمَاءِ مَوْضِعَ قَدَمٍ إِلَّا عَلَيْهِ مَلِكٌ سَاجِدٌ أَوْ قَائِمٌ
تمام آسمانوں میں ایک قدم رکھنے کی جگہ بھی ایسی نہیں ہے کہ جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ حالت سجدہ یا قیام میں نہ ہو۔

ایک اور روایت میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے ایک دن اپنے اصحاب سے جو آپ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا:-

لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يُعْطُونَ
وہ خدا کے اچھے بندے ہیں جو بات کرنے میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور اس کے فرمان پر عمل کرتے ہیں۔

اطلت السماء وحق لها ان تآط اليه فيها موضع قدم الاعليه مدك
 راجع او ساجد، ثم قرأ وانا لنحن الصافون وانا لنحن
 المستبحون
 آسمان نے (اپنے باری سنیگی سے) فریاد کی، اور وہ حق رکھتا ہے کہ نالود فریاد کرے کیونکہ
 اس میں ایک قدم رکھنے کی بھی جگہ ایسی نہیں جس پر کوئی نہ کوئی فرشتہ حالت رکوع میں یا حالت
 سجود میں نہ ہو۔ پھر آپ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی وانا لنحن الصافون...
 یہ گونا گوں تعبیریں اس بات کی طرف ایک لطیف کنایہ ہیں کہ عالم ہستی پروردگار کے فرماں برداروں اور اس کی
 کرنے والوں سے معور ہے۔

اس کے بعد زیر بحث آخری چار آیتوں میں اسی جنت پرستی سے مراد اور کچھ دوسرے مطالب کے لیے ان
 مشرکین کے ایک عذر تک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن جواب دیتا ہے اور فرماتا ہے: وہ ہمیشہ کہتے تھے...
 (وان كانوا ليقولون)۔

اگر ہمارے پاس پہلے لوگوں کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ہوتی (لوات عندنا ذكرا
 من الاولين)۔

تو ہم خدا کے مخلص بندوں میں سے ہوتے (لكننا عباد الله المخلصين)۔
 ان سب مخلص بندوں اور جنہیں خدا نے خالص کیسے، ان کے بارے میں گفتگو نہ کر۔ نوح، ابراہیم اور موسیٰ جیسے
 بزرگ پیغمبروں کو ہمارے سامنے پیش نہ کر۔ اگر ہمارے اوپر بھی لطف خدا ہوتا اور ہم پر بھی کوئی آسمانی کتاب نازل ہوئی ہوتی
 تو ہم بھی ان ہی مخلص بندوں کے زمرے میں ہوتے۔
 یہ بعینہ بیچیدہ جاننے والے اور ٹیل ہوجانے والے طالب علموں کی مانند گفتگو ہے، جو اپنی مستحق پر پردہ ڈالنے کے لیے کہتے
 ہیں کہ اگر ہمارا بھی کوئی اچھا استاد ہوتا تو ہم بھی اول آنے والے طالب علموں میں سے ہوتے۔

بعد والی آیت کہتی ہے کہ ان کی یہ آرزو بھی اب عملی جامہ پہن چکی ہے اور خدا کی عظیم ترین آسمانی کتاب قرآن مجید
 ان کے لیے نازل ہوئی ہے، لیکن یہ غلط دعوے کرنے والے جوڑے اس سے کانٹے ہو گئے ہیں اور اس کی مخالفت انکار اور دشمنی پر

لئے ہیں لیکن وہ جلد ہی اپنے کام کا تیسرہ جان لیں گے (فكفروا به فسوف يعلمون)۔
 یہ لاف و گزاف کی باتیں نہ کرو اور اپنے آپ کو خدا کے مخلص بندوں کی صف میں شامل ہونے کے لائق شمار نہ کرو۔ تمہارا
 بروٹ واضح ہو چکا ہے اور تمہارے دعوے کھوکھلے نکلے ہیں۔ قرآن سے بہتر کسی کتاب کا تصور نہیں ہو سکتا اور کوئی مکتب اسلام
 جیسے ترقیاتی مکتب سے بہتر نہیں ہے۔ لیکن اب تم خود ہی دیکھ لو کہ تم نے اس آسمانی کتاب کا کس طرح استقبال کیا ہے۔ لہذا
 اپنے کفر و بے ایمانی کے دردناک انجام کے منتظر رہو۔

یہ جسد حقیقت میں ایک مخدوف کتاب ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: فلما اتاهم الكتاب وهو القرآن كفروا
 به فسوف يعلمون عاقبتہ کفر ہر۔ جب قرآن ایسی کتاب ان کے پاس آئی تو انہوں نے اس کا انکار کیا اور کافر
 ہو گئے۔ منقریب انہیں اپنے کفر کا انجام معلوم ہوجائے گا۔

۱۔ در المنثور سے میزان جلد ۱، ص ۱۸۸ پر نقل کیا گیا ہے۔
 ۲۔ ان "یاں پر مشکل سے مخفف ہے یہ تقریر میں اس طرح تھا "وانهم كانوا ليقولون"

۱۴۱- وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۝

۱۴۲- اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ۝

۱۴۳- وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ۝

۱۴۴- قَتَلَوْا عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ۝

۱۴۵- وَاَبْصَرَهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ۝

۱۴۶- اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ۝

۱۴۷- فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ ۝

ترجمہ

۱۴۱- ہمارے مرسل بندوں کے لیے ہمارا قطعی وعدہ پہلے سے مسلم ہو چکا ہے۔

۱۴۲- کہ ان کی مدد کی جائے گی۔

۱۴۳- اور ہمارا لشکر (تمام میدانوں میں) کامیاب ہوگا۔

۱۴۴- ان سے ایک معین وقت تک منہ پھیرے (جب تک جہاد کا فرمان صادر نہیں ہوتا)۔

۱۴۵- اور ان کی حالت کی طرف دیکھ (کتنی بے معنی ہے) لیکن وہ عنقریب (اپنے لیے کاتھیر) دیکھ لیں گے۔

۱۴۶- کیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں؟

۱۴۷- لیکن جب ہمارا عذاب ان کے گھروں کے صحن میں نازل ہوگا تو (ان لوگوں کے لیے) جنھیں ڈرایا

گیا ہے، وہ بڑی بے رحم ہوگی۔

تفسیر

اللہ کا گروہ کامیاب ہے

عظیم انبیاء کی جہاد اور بے ایمان مشرکین کی کارشکنیوں کے سلسلے میں ان گوناگوں مباحث کے بعد، جو اس سورہ کی آیات میں

بیان ہوئی ہیں۔ اب جبکہ ہم اس سورہ کی آخری آیات کے قریب ہو رہے ہیں تو اس سے مربوط اہم ترین سطور بیان کیا جا رہا ہے اور خاتمہ بالآخر کو اعلیٰ ترین صورت میں پیش کیا جا رہا ہے اور وہ خدا کے لشکر کی شیطان اور دشمنان حق کے لشکر پر مکمل فتح کی خبر ہے تاکہ وہ غمخوارے سے مومنین جو ان آیات کے نزول کے وقت مکہ میں دشمنان اسلام کی سختی اور دباؤ کا شکار تھے اور اسی طرح ہر عصر اور سر زمانہ کے تمام محروم مومنین، خدا کے اس عظیم وعدے سے مطمئن ہو جائیں اور یاس و ناامیدی کا گرد و غبار اپنے قلب و روح سے صاف ہو جائے اور باطل کے لشکر کے ساتھ مقابلہ جاری رکھنے کے لیے آمادہ رہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: ہمارے مرسل بندوں کے ساتھ ہمارا قطعی وعدہ پہلے سے مسلم ہو چکا ہے (و لقد سبقنا کلمتنا لعیبادنا المرسلین)۔

کہ ان کی مدد و نصرت کی جائے گی (اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ)۔

اور ہمارے لشکر تمام میدانوں میں کامیاب ہوں گے (وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ)۔

کتنی صریح اور منہ پھرتی عبارت ہے اور کتنا روح پرور اور امید بخش وعدہ ہے۔

ہاں! حق کے لشکر کی باطل پر کامیابی اور اللہ کے لشکر کا غلبہ اور مرسل اور مخلص بندوں کے لیے خدا کی مدد و نصرت ہمارے مسلم اور یقینی وعدوں اور قطعی سنتوں میں سے ہے، جو ان آیات میں "سبقنا کلمتنا" (ہمارا یہ وعدہ اور یہ سنت ابتدا سے سچی) کے انداز میں پیش ہوئی ہے۔

قرآن مجید کی دوسری بہت سی آیات میں بھی ان مطالب کی نظیر موجود ہے۔ سورہ روم کی آیت ۴۷ میں بیان ہوا ہے۔

وكان حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرَ الْمُؤْمِنِينَ

مومنین کی مدد کرنا ایسا حق ہے جو ہم پر مسلم ہے۔

یٰٰرَسُولُ رَجِّحْ كَيْ آتِيَهُ ۳۰ میں بیان ہوا ہے۔

وَلِيَنْصُرَكَ اللَّهُ مَنِ الْمُنْصَرِفِ

خدا ہر اس شخص کی ضرورت مدد کرے گا جو اس کے دین و آئین کے لیے اٹھے گا۔

اور سورہ مؤمن کی آیت ۵۱ میں یہ بیان ہوا ہے:-

اَتَا لِنَنْصُرَكَ مَنَّا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي اَذْ حُلُوَّةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْاَشْهَادُ

ہم اپنے رسولوں کی اور صاحب ایمان کی، دنیا کی زندگی میں بھی مدد کریں گے اور اقامت کے

دن (جب حق کی گواہی دینے والے قیام کریں گے اس دن بھی مدد و نصرت کریں گے۔

سورہ مجادلہ کی آیت ۲۱ میں تو پوری طاہلیت اور دونوں فیصلے کے طور پر اس غلبے اور کامیابی کے بارے میں ایک قطعی سنت کے طور پر گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب اللہ لا غلبت انا ورسلی

خدا نے مقرر کر دیا ہے اور کھ دیا ہے) کہ میں اور میرے رسول قطعی طور پر غالب ہو کر رہیں گے۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ خدا جو ہر چیز پر قادر ہے اور جس کے دعووں میں نہ مختلف تھا اور نہ ہے، وہ اپنے اس عظیم ہوش کو اپنی پناہ لکنا ہے اور عالم سستی کی دوسری مختلف ناپذیر سنتوں کی طرح مردان حق کو بے کم و کاست کامیاب کر سکتا ہے۔

یہ خدائی وعدہ ان اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے جس کی وجہ سے راتوں کے راہِ مطلق اور دل گرم رہتے ہیں۔ اور اس طرح تازہ حاصل کرتے ہیں، جس وقت ٹھک جاتے ہیں تو اس کے ذریعے تازہ دم ہو جاتے ہیں اور نیا خون ان کی رگوں میں جاری ہونے لگتا ہے۔

ایک اہم سوال

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر خدا کی مشیت و ارادہ میں پیغمبروں کی مدد و نصرت اور مؤمنین کی کامیابی مقرر ہو چکی ہے تو ہم بشر کی بھرپور تاریخ میں کئی پیغمبروں کو بشارت پر ناز ہوتے ہوئے مشاہدہ کیوں کرتے ہیں اور مؤمنین کے کئی گروہ شکست سے دوچار کیوں ہوتے؟ اگر یہ مختلف ناپذیر سنت الہی ہے تو پھر یہ استنادت کس بنا پر ہیں؟

ہمارا جواب

اولاً: کامیابی ایک وسیع معنی رکھتی ہے اور ہمیشہ دشمن پر ظاہری اور جہانی غلبہ کے معنی میں نہیں ہوتی۔ بعض اوقات کتبت اور نظریے کی کامیابی کو بھی کامیابی ہی کہتے ہیں اور اہم ترین کامیابی یہی ہے۔ فرض کریں کہ پیغمبر اسلام کسی جنگ میں شہید ہو جاتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا دین ساری دنیا میں پھیل گیا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس شہادت کو شکست سے تعبیر کریں؟ اس سے بھی واضح روشن مثال یہ ہے کہ امام حسینؑ اور آپ کے انصاف نے کربلا کے میدان میں واقعاً شہرت شہادت نوش کیا، لیکن ان کا ہدف و مقصد یہ تھا کہ نبی امیرؐ کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کر دیں کہ جو ظاہر میں تو پیغمبر اکرمؐ کی خلافت کے مدعی تھے لیکن حقیقت میں اسلامی معاشرے کو زامہ جالینت کی طرف واپس لوٹانا چاہتے تھے اور وہ اس عظیم ہدف و مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ آپ نے مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا اور اسلام کو بٹھنے سے بچایا۔ تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کربلا میں مغلوب ہو گئے؟

اہم بات یہ ہے کہ انبیاء اور جنود الہی یعنی مؤمنین، حق کے دشمنوں کی تمام سزائوں و مظالم کو ششوں کے باوجود، اس بات پر قادر ہو سکے کہ اپنے اہداف و مقاصد کو دنیا میں آگے بڑھائیں اور زیادہ سے زیادہ پیروکار پیدا کر سکیں اور اپنے کبھی راستے کو دوام دے سکیں اور ان تمام طرفانوں کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں، یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں دنیا کے اکثر لوگوں کے افکار کو اپنی طرف متوجہ کر لیں۔

کامیابی کی ایک اور قسم بھی ہے جو دشمن کے مقابلہ میں صدیوں کے دوران میں تدریجی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ کبھی ایک نسل میدان سے اور کامیاب نہیں ہوتی لیکن آئندہ آنے والی نسلیں ان کے کام کو آگے بڑھاتی ہیں اور کامیابی سے ہم کنار ہو جاتی ہیں (مثلاً آل کے بعد لشکر اسلام کی جلیبیوں کے لشکر پر کامیابی) یہ کامیابی بھی سب کی کامیابی سمجھی جائے گی۔

ثانیاً اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خدا کا مؤمنین کے لیے غلبہ کا وعدہ ایک مشروط وعدہ ہے نہ کہ مطلق اور اس حقیقت کی توجیہ نہ کرنے سے ہی بہت سے اشتباہات پیدا ہوتے ہیں۔

کیونکہ زبردست آیات میں لفظ "عبادنا" (ہمارے بندے) اور "جندنا" (ہمارا لشکر) یا اسی قسم کی دوسری تعبیریں ملتے ہیں قرآن کی دوسری آیات میں آئی ہیں مثلاً "حزب اللہ" "والذین جاہدوا فینا" "ولینصرت من ینصرہ" اور اسی قسم کی دوسری تعبیریں سب کی سب کامیابی کی شرائط کے لیے ایک واضح دلیل ہیں۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ نہ تو ہم مجاہد مؤمن نہیں اور نہ ہی مخلص لشکر، اور اس حال میں حق و عدالت کے دشمنوں پر غالب ہائیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ خدا کی راہ میں شیطانی انکار اور پروگراموں کے ساتھ پیش رفت کریں۔ اس کے بعد تعجب کرتے ہیں کہ ہم دشمنوں سے کربلا کیوں ہو گئے۔ تو کیا ہم نے اپنے دعووں پر عمل کیا ہے کہ خدا سے اس کے دعووں کے ایفا کا مطالبہ کر رہے ہیں؟

جنگ اُحد میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں سے کامیابی کا وعدہ کیا تھا اور جنگ کے پندرہ روز قبل کامیاب ہونے کا یقین ایک گروہ جنگ کا مال غنیمت جمع کرنے، تفرقہ و نفاق پیدا کرنے اور فرمان رسولؐ کو چھوڑ دینے کی فکر میں پڑ گیا۔

جنگ کے آغاز میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اس کی اور ذرہ اُحد کی حفاظت میں کوتاہی کی اور یہی امر اس جنگ میں انکی شکست کا سبب بن گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گروہ جو اپنے آپ کو کامیابی کا طلب گار سمجھتا تھا، پیغمبر اسلام کی خدمت میں آیا اور مخصوص لب و ہجرت لیا کی کہ کامیابی کا وہ وعدہ کیا ہوا؟

قرآن نے انھیں بہت ہی عمدہ جواب دیا جو ہماری گفتگو کا گواہ ہے۔ فرمایا:

ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسبونہم باذنبہ حتیٰ اذا فشلتم و تنازعتم فی الامر و عصیتم من بعدھا اراکم ما تحبون منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الآخرة ثم صرفکم عنہم لیتلیکم و لقد عفا عنکم واللہ ذو فضل علی المؤمنین

خدا نے (اُحد میں دشمن پر کامیابی کا) تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا۔ اس وقت (جب تباہ جنگ میں) تم دشمنوں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے اور یہ کامیابی اسی صبر و قرار ہی، یہاں تک کہ کبھی شکست پڑ گئے اور اپنے کام میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے۔ اور جب تم نے اپنے مطلوب کے پالیا اور جو کچھ تم پسند کرتے تھے وہ خدا نے تمہیں دکھا دیا، تو تم نے نافرمانی کی۔ تم میں سے بعض تو دنیا کے طالب تھے اور بعض آخرت کے چاہنے والے تھے (اس کے باوجود اس نے تمہیں کمال شکست سے

نجات دی) اور انھیں تم سے منحرف کرو یا تاکہ تمھاری آزمائش کرے اور تمہیں اپنے معوضے نوازادے
غلاموں کے لیے صاحب فضل بخشش ہے۔ (آل عمران ۱۵۷)

”فخشلتم“ (تم کمزور پڑ گئے)
”متنازعتہ“ (ایک دوسرے سے جھگڑنے اور نزاع و اختلاف کرنے لگے)
”عصیتہ“ (تم نے نافرمانی کی)

یہ ایسی تعبیریں ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انھوں نے خدا کی مدد اور دشمن پر کامیابی کی شرائط کو چھوڑ دیا تھا۔
نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل نہ کر سکے۔

ہاں! خدا نے ہرگز یہ وعدہ نہیں کیا کہ جس شخص نے اپنا نام مسلمان اور عبادتِ اسلام رکھ لیا اور ”جدا نڈ“ اور ”حزب انڈ“ کے
بھرنے لگا وہ ہر میدان میں دشمن پر غلبہ حاصل کرنے لگا۔ بلکہ یہ خدا کا وعدہ تو ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو دل و جان سے
رضائے خدا کے خواہاں ہیں اور علی لحاظ سے اس کے فرمان پر چلتے ہیں اور تقویٰ و امانت کو نہیں بھولتے۔

اس سوال و جواب کی نظیر ہم نے ”دعا“ اور ”خدا“ کے وعدہ ”اجابت“ کے بارے میں بھی بیان کی ہے۔
اس کے بعد ان آیات کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اکرم اور مومنین کی دلجوئی اور کامیابی کی تاکید کے لیے بھی اور بے خبر مشرکوں
کی تہدید و تہدید کے لیے بھی فرمایا گیا ہے: ان سے نہ بھیرے، اور انھیں ایک معین وقت تک کے لیے ان کی حالت پر چھوڑو۔
(فتنوں عنہم حتیٰ حین۔)

یہ ایک پرمغنی اور بول انگریز تہدید ہے جس کا سرچشمہ مکمل کامیابی کا اطمینان ہے، خصوصاً ”حتیٰ حسین“ (ایک نڈ
تک کی تعبیر اجمالی اور سب سے صحت میں ادا ہوتی ہے، لیکن کتنی مدت تک؟ ہجرت کے زمانے تک؟ جنگ بدر کے موقع تک؟
یا اس زمانے تک کہ ان دل کے انھوں کے خلاف، مسلمانوں کے لیے مکمل اور عمومی قیام کے حالات فراہم ہوں۔ یہ
بات دقیقاً معلوم نہیں ہے۔

اس تعبیر کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتی ہے، کبھی کتاب ہے:
فَاعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ
ان سے رخ پھیرے اور خدا پر توکل کر (نساء ۸۱)
دوسری جگہ کتاب ہے:

قُلْ اللَّهُ شَرُّ رُحَمَاءِ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ
کہو اللہ، پھر انھیں چھوڑ دو کہ اپنے جھوٹ کے ساتھ کھیلے رہیں (انعام ۹۱)
اس کے بعد اس جگہ کی ایک دوسری تہدید کے ساتھ تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کی حالت کی طرف دیکھ (ان کی

دوسریاں، ان کے جھوٹ، ان کی خرافات اور سرکشیاں کتنی بے کار اور فضول ہیں! لیکن وہ جلد ہی اپنے کاربند کا انجام دیکھ لیں
(والصبر هم فسوف يبصرون)۔

تہذیبِ جلدی و نیایش تیری اور مومنین کی کامیابی اور اپنی ذلت آمیز شکست اور دوسرے جہان میں خدا کا عذاب دیکھیں گے۔
اور چونکہ یہ بے شرم سرکش بھی کہتے رہتے تھے، کہ عذابِ الہی کا وہ وعدہ کیا ہوا، اور اگر توحیح کتاب سے تو چھوڑ دیر کیوں کر رہا
؟ تو قرآن تمہیں آمیزے میں ان کے جواب میں کہتا ہے: کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں؟ کبھی کہتے ہیں معنی
لذا الوعد (یہ وعدہ الہی کب پورا ہوگا) اور کبھی یہ کہتے ہیں ”حتیٰ هذا الفتح“ (یہ کامیابی کب حاصل ہوگی)۔
فبعذابنا ليستعجلون)۔

لیکن جب ہمارا عذاب ان کے گھر کے صحن میں اترے گا اور ان کے دن تیرہ دن تاریک ہو جائیں گے تو اس دن انھیں سمجھ آئے
گی کہ انھیں ڈرایا گیا تھا ان کی صبح کتنی بُری اور خطرناک ہے (فاذا نزل بساحتهم فساء صباح المنتذرين)۔
”ساحۃ“ (گھر کا صحن اور گھروں کے اندر کی فضا) کی تعبیر اس لیے ہے تاکہ نزولِ عذاب کو ان کی زندگی کے اندر گم کر دیا جائے
اور ان کے آرام و سکون کے مرکز کے وحشت و اضطراب کے مرکز میں بدل جانے کی نشان دہی کر دی جائے۔

”صباح المنتذرين“ (ڈرائے گئے لوگوں کی صبح) کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس صبح و صرم
یا یہ اس صبح میں ہے کہ سارے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی صبح خیر و خوشی کے ساتھ شروع ہو، لیکن ان کے سامنے بُری اور تیرہ دن
صبح ہے۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح بیداری کا وقت ہوتا ہے یہ بھی اس وقت بیدار ہوں گے کہ جب نجات کی کوئی راہ باقی نہیں
رہے گی اور باقی سروسے اوجھا ہوگی ہوگا۔

- ۱۷۸- وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ۝
 ۱۷۹- وَابْصُرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ۝
 ۱۸۰- سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝
 ۱۸۱- وَسَلٰمٌ عَلٰی الْمُرْسَلِيْنَ ۝
 ۱۸۲- وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمہ

- ۱۷۸- ایک معین وقت تک ان سے منہ پھیرے۔
 ۱۷۹- اور ان کے کام کی حالت کو دیکھ، وہ بھی جلد ہی (اپنے اعمال کا نتیجہ) دیکھ لیں گے۔
 ۱۸۰- تیرا پروردگار، پروردگار عزت و قدرت ان توصیفوں سے جو وہ کرتے ہیں، پاک و منزہ ہے۔
 ۱۸۱- اور سلام ہے رسولوں پر
 ۱۸۲- اور حمد و ستائش مخصوص ہے اس خدا کے لیے جو عالمین کا پروردگار ہے

تفسیر

ان کا اعتناء نہ کر!

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی آخری آیات پیغمبر اکرم اور مومنین کی دلجوئی کے لیے ایک وسیلہ و ذریعہ ہیں۔ کفار کے لیے ایک تہدید ہیں۔ زیر بحث دو آیتیں تو وہی ہیں جو پہلے بھی آچکی ہیں اور یہاں پر تاکید کے لیے دہرائی گئی ہیں۔ تہدید آمیز لہجے میں ان سے منہ پھیر لے اور انھیں ایک مدت معین تک ان کی حالت پر چھوڑو۔ (وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ)۔

ان کی ہٹ دھرمی، انحراف اور گنہ گری و انکسار کو دیکھ، وہ بھی جلد ہی اپنے کام کے نتیجہ کو دیکھ لیں گے (وَابْصُرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ)۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ تکرار تاکید کے لیے ہے تاکہ وہ یہ بات جان لیں کہ یہ ایک قطعی مسئلہ ہے کہ وہ جو

سکتے اور ناکامی کو دیکھ لیں گے اور اپنے اعمال کے تلخ نتائج میں گرفتار ہوں گے اور مومنین کی کامیابی قطعی بن جائے گی۔ پہلے تو انھیں دنیاوی سزا اور نقاب کی تہدید کی گئی ہے اور دوسری مرتبہ آخرت میں خدائی سزا و نقاب کی تہدید کی گئی ہے۔

کے بعد سورہ کو ”خداوند تعالیٰ“، ”پیغمبروں“ اور ”عالمین“ کے بارے میں تین پر مبنی جملوں کے ساتھ ختم کیا گیا ہے: تیرا پروردگار، پروردگار عزت و قدرت ان بے بنیاد توصیفوں سے، جو جاہل و مشرک لوگ کرتے ہیں، پاک (سبحان ربك رب العزة عتقا یصفون)۔
 ان فرشتوں کو اس کی بیٹیاں کہتے ہیں، کبھی اس کے اور جنوں کے درمیان رشتہ داری جوڑتے ہیں اور کبھی پتھروں اور لکڑی پر قیمت موجودات کو اس کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔
 (مطلق شکست ناپذیر قدرت) حقیقت میں ان تمام خیالی معبودوں پر خطِ نبطان کھینچنے کے معنی میں ہے۔
 سورہ کی آیات میں بھی ”عباد اللہ المخلصین“ کی تسبیح و تهنیت کا ذکر ہے اور کبھی فرشتوں کی تسبیح کا تذکرہ خدائی ذات پاک کے بارے میں خدائی تسبیح و تهنیت کا ذکر ہے۔

جسے جملے میں اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں کے لیے اپنے بے پایاں لطف و کرم کا اظہار فرماتے ہوئے کتاب ہے، تمام رسولوں (سلا مر علی المرسلین)۔
 ان جو قیامت کے دن ہر قسم کے نقاب و منازعہ سلامتی و عافیت کی نشانی ہے۔ وہ سلام جو شکستوں کے مقابلہ میں ان پر کامیابی کی دلیل ہے۔
 اور بات یہ ہے کہ اس سورہ کی آیات میں بہت سے پیغمبروں پر الگ الگ سلام بھیجا گیا ہے۔ آیت ۷۹ میں ہے:-

- ۱۱۷- وَرَعَىٰ نُوْحًا فِي الْعَالَمِيْنَ
 ۱۱۸- اِمْۡرًاۙۤ اٰمِنًاۙۤ اٰتٰہُ
 ۱۱۹- وَرَعَىٰ اِبْرٰہِیْمَ
 ۱۲۰- اِمْۡرًاۙۤ اٰمِنًاۙۤ اٰتٰہُ
 ۱۲۱- وَرَعَىٰ اِسْحٰقَ
 ۱۲۲- اِمْۡرًاۙۤ اٰمِنًاۙۤ اٰتٰہُ
 ۱۲۳- وَرَعَىٰ یٰحٰقَۙۤ اٰتٰہُ
 ۱۲۴- اِمْۡرًاۙۤ اٰمِنًاۙۤ اٰتٰہُ
 ۱۲۵- وَرَعَىٰ یٰحٰقَۙۤ اٰتٰہُ
 ۱۲۶- اِمْۡرًاۙۤ اٰمِنًاۙۤ اٰتٰہُ
 ۱۲۷- وَرَعَىٰ یٰحٰقَۙۤ اٰتٰہُ
 ۱۲۸- اِمْۡرًاۙۤ اٰمِنًاۙۤ اٰتٰہُ
 ۱۲۹- وَرَعَىٰ یٰحٰقَۙۤ اٰتٰہُ
 ۱۳۰- اِمْۡرًاۙۤ اٰمِنًاۙۤ اٰتٰہُ

سلام علیہ الیاسین

لیکن یہاں پر ان تمام سلاموں اور ان کے علاوہ دوسروں کو ایک ہی جملے میں غلط کر کے اور یکجا طور پر ہے: سب رسولوں پر سلام۔

ہر کام کے آخر میں سوچنے کی بات

اور بالآخر گفتگو کے آخری جملے کو خدا الہی پر ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے، حمد و ستائش مخصوص ہے اس خدا کے لیے کا پروردگار ہے (والحمد لله رب العالمین)۔

آخری تین آیات ہو سکتا ہے اس سورہ کے تمام مسائل پر ایک اجمالی نظر اور اشارہ ہو۔ کیونکہ اس سورہ کا اہم حصہ توحید مختلف اقسام سے مقابلے کے سلسلہ میں تھا اور پہلی آیت سب مشرکین کی تمام تہمیدوں سے خدا کی تسبیح و تہنیر کر رہی ہے اس سورہ کا دوسرا حصہ سات عظیم پیغمبروں کے حالات کے کچھ گوشوں کا بیان تھا۔ دوسری آیت انھیں کی طرف اشارہ ہے اور آخر میں تیسرا حصہ خدا کی نعمتوں، خصوصاً بہشت کی طرح طرح کی نعمتوں اور خدا کے کثرتوں کی کفر کے لشکر پر کامیابی کے میں تھا۔ لہذا آخر میں خدا کی حمد و ستائش ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔

بعض مفسرین نے اس سورہ کی ان آخری تین آیات کی ایک اور تخیل کی ہے، جو یہ ہے: اہم ترین مسائل جو انسان کو اپنی طرف متوجہ رکھتے ہیں، وہ تین چیزوں کی معرفت ہے۔ پہلی چیز بشر کی طاقت کے مطابق کی معرفت اور آخری کام جو انسان اس سلسلے میں انجام دے سکتا ہے، وہ تین امر ہیں:

لے ان چیزوں سے پاک و منزہ جانا جو اس کے مقام کے لائق نہیں ہیں، یہ مفہوم "سبحان" کے لفظ میں موجود اور اس کی تمام صفات کمال کے ساتھ توصیف، جس کی طرف لفظ "رب" میں اشارہ ہوا ہے، جو خدا کی حکمت اور موجودت کی مالکیت و پرورش کی دلیل ہے۔

اور ہر قسم کے شریک و نظیر سے منزہ ہونا، اس کا مفہوم "عقبا یصفون" کے جملہ میں آیا ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ انسانوں کی زندگی میں نقائص کو دور کرنا ہے جو خدائی رہبروں اور آسمانی ماہدوں کے بغیر ممکن نہیں "سلام علی المرسلین" کا جملہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

تیسرا اہم مسئلہ انسانی زندگی کا یہ ہے کہ وہ یہ جانے کہ مرنے کے بعد اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہاں پر "رب العالمین نعمتوں کی طرف توجہ اور اس کا مقام ثنا اور رحمت و لطف، انسان کو آرام و سکون بخشتا ہے۔ والحمد لله العالمین" لے

مقدور روایات میں جو پیغمبر گرامی اسلام، امیر المؤمنین اور امام باقرؑ سے منقول ہوئی ہیں، یہ آیا ہے:

من اراد ان یکتال بالمکیال الا و فی (من الاجریوم القیامۃ) فلیکن آخر کلامہ فی مجلسہ سبحان ربک رب العزۃ عقبا یصفون و سلام علی المرسلین والحمد لله رب العالمین

جو شخص یہ چاہتا ہے کہ قیامت کے دن اس کو اجر بڑے اور کامل پانے سے دیا جائے گا تو وہ جس مجلس میں بھی بیٹھے اس کی آخری گفتگو یہ ہونی چاہیے "سبحان ربک رب العزۃ عقبا یصفون و سلام علی المرسلین والحمد لله رب العالمین" لے

نہ! اپنی مجلس کو ذات خدا کی تہنیر اور اس کے پیغمبروں پر درود بھیجنے اور پروردگار کی نعمتوں پر حمد و شکر کے ساتھ کرنا چاہیے، تاکہ اگر اس مجلس میں اس سے کوئی غلط کام یا ناروا گفتگو سرزد ہوگئی ہو تو اس کی تلافی ہو جائے۔ کتاب توحید صدوق میں اس طرح آیا ہے کہ:

شام کا ایک عالم امام باقرؑ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں آپ سے ایک مسئلے کے بارے میں سوال کرنے آیا ہوں، جس کے متعلق اب تک کسی نے میرے لیے درست وضاحت نہیں کی۔ میں نے تین گروہوں سے سوال کیا ہے اور ہر کسی نے دوسرے کے برخلاف جواب دیا ہے:

امام باقرؑ نے فرمایا: "تیرا مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے عرض کیا: میرا سوال یہ ہے کہ پہلی چیز جو خداوند تعالیٰ نے خلق فرمائی تھی وہ کیا تھی؟ بعض نے تو مجھے یہ جواب دیا کہ وہ "قدرت" تھی اور بعض نے کہا "علم" تھا اور بعض نے کہا "روح" تھی۔ آپ نے فرمایا:

کسی نے بھی مجھے صحیح جواب نہیں دیا۔ اب میں تجھے بتاتا ہوں کہ ابتداء میں خدا تھا اور اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی لیکن کے اور جو وہ قادر و عزیز تھا اور ابھی عزت پریدہ نہیں ہوئی تھی (وہ اپنی ذات پاک میں قدرت بھی رکھتا تھا اور علم بھی بے پیر کے کہ علم و قدرت کی آفرینش کا محتاج ہو) پھر مزید فرمایا: یہ وہی چیز ہے کہ جو خدا فرماتا ہے "سبحان ربک رب العزۃ عقبا یصفون" لے

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ادھر ادھر لوگوں نے جو تجھ سے باتیں کی ہیں وہ شرک آلود باتیں ہیں کہ جن کا ہول
میں موجود ہے۔ یعنی خدا نزل سے ہی قادر عالم و عزیز ہے۔
پروردگارا! تو نے خود وعدہ کیا ہے کہ اپنے رسولوں کی مدد اور اپنے لشکروں کو کامیاب کرے گا۔ جسیں رسولوں کا پیرو
لشکروں میں قرار دے اور ہمیں ان خود بخوار دشمنوں پر کامیاب فرما کہ جو عالم کے مشرق و مغرب سے قرآن کے نور کو خاموش کر
لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

بارالہا! ہمیں ہر قسم کے شرک میں آلودہ ہونے سے اور توحید کے رستے سے انحراف کرنے سے محفوظ فرما۔
خداوند! جو مشکلات انبیاء مرسل کو تاریخ میں شرک و کفر کے لشکر کے مقابلے میں درپیش تھیں وہی اس وقت ہمارے
اسلامی معاشرے کے سامنے پیدا ہو چکی ہیں۔ وہی سلام جو پیغمبران مرسل کی سلامتی کا باعث تھا ان مسرکوں میں بہت
شامل حال فرما۔

۱۔ میں یاد تبت العالمین
سورۃ صافات کا اختتام
جمعہ ۲۲ ماہ مبارک رمضان ۱۳۰۴ھ
(اول تیرماہ ۱۲۶۲ھ)

سُورَةُ ص

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی
اس کی ۸۸ آیات ہیں

سورہ ص کے مضامین

یہ سورہ حقیقت میں سورہ "صافات" کے مضامین ہی تسلسل اور متحدہ ہے اور اس کے مطالب کی بندش سورہ صافات جملہ بندی سے بہت زیادہ متاثر ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ سورہ کئی ہے۔ اس لیے ان سورتوں کی تمام خصوصیات یعنی مبادی اور پیغمبر اسلام کی رسالت کے بارے میں بحث کی حامل ہے۔ بعض دیگر مطالب کا اضافہ کر کے راہ حق کے تمام مستانہ سببوں کے لیے یہ سورہ راہنمائی مہیا کرتی ہے۔

اس سورہ کے مطالب و مضامین کا پانچ حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

پہلا حصہ: اس میں مسئلہ توحید کے لیے اور شرک کے خلاف جدوجہد کا ذکر ہے اور پیغمبر اسلام کی نبوت کا مسئلہ بیان ہے اور ان دونوں امور کے مقابلے میں مشرک دشمنوں کی سختی اور ہٹ دھرمی سے متعلق گفتگو ہے۔

دوسرا حصہ: اس میں خدا کے نو پیغمبروں کی تاریخ کے کچھ گوشوں کو منعکس کیا گیا ہے، خصوصیت سے حضرت داؤد اور سلیمان اور حضرت ایوب کے بارے میں زیادہ گفتگو ہے۔ ان کی زندگی اور خدا کی طرف دعوت کے سلسلے میں ان کی مشکلات بیان کیا گیا ہے تاکہ شروع شروع میں ایمان لانے والے لوگوں کے لیے ایک اصلاحی اور تربیتی درس ہو جو اس وقت اتنا شدید باؤں میں تھے۔

تیسرا حصہ: اس میں قیامت میں سرکش کفار کی سزائیں اور دوزخ میں ان کے آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کے بارے میں گفتگو ہے اور مشرکین اور بے ایمان افراد کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔

چوتھا حصہ: اس میں انسان کی خلقت، اس کے بلند مقام اور آدم کے لیے ملائکہ کے بندے کے بارے میں گفتگو ہے اور اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ انسان کی بلندی اور پستی کے درمیان کتنا عظیم فاصلہ ہے تاکہ یہ بے خبر دل کے اندر اپنی حقیقت اور قدر قیمت کو پہچانیں اور اپنے اخلاقی طرز عمل پر نظر ثانی کریں اور شیطانوں کے زمرے سے باہر نکل آئیں۔

پانچواں حصہ: اس میں تمام ہٹ دھرم دشمنوں کے لیے ایک تہدید ہے اور پیغمبر اسلام کے لیے تسلی خاطر ہے۔ نیز اس حقیقت کا بیان ہے کہ آپ اپنی موت میں بھی کسی قسم کی اجرت اور ضروری طلب نہیں کرتے، اور کسی کے لیے کوئی درد نہیں چاہتے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

یہ سورہ جو اپنی ابتداء کی وجہ سے سورہ "ص" کے نام سے موسوم ہے، پیغمبر گرامی اسلام سے اس کی فضیلت

بارے میں ایک روایت میں آیا ہے:-

من قرء سورة "ص" اعطى من الاجر بوزن كل جبل سعى الله لداود حنات وعصمه الله ان يصير على ذنب صغيرا او كبيرا
جو شخص سورہ "ص" پڑھے گا، ہر اس پہاڑ کے مطابق کہ جو خدا نے داؤد کے لیے سخر کیا تھا، اسے ایسی ہی مبارکے گا اور صغیرہ و کبیرہ گناہ سے آلودہ ہونے اور اس پر اصرار کرنے سے اسے محفوظ رکھیگا
ایک اور حدیث میں امام باقر سے مروی ہے:-

من قرء سورة "ص" في ليلة الجمعة اعطى من خير الدنيا والاخرة ما لم يعط احد من الناس الا نبي مرسل او ملك مقرب، وادخله الله الجنة وكل من احب من اهل بيته حتى خادمه الذي يخدمه
جو شخص سورہ "ص" شب جمعہ میں پڑھے گا (خدا کی طرف سے) خیر دنیا و آخرت میں سے اس قدر ملے دیا جائے گا کہ پیغمبران مرسل اور مقرب فرشتوں کے سوا اور کسی کو نہیں دیا جائے گا اور خدا اے اور ان تمام افراد کو جو اس کے گھر والوں میں سے اس سے تعلق رکھتے تھے، جنت میں داخل کرے گا۔ یہاں تک کہ اس خدمت کار کو بھی جو اس کی خدمت کرتا تھا۔

جس وقت ہم اس سورہ کے مضامین و مطالب کو اس اجر کے ساتھ رکھتے ہیں تو اس اجر کا ان تعلیمات کے ساتھ رابطہ و تعلق صحیح ہو جاتا ہے۔ البتہ پھر اس حقیقت پر ایک تاکید ہے کہ اس سے مراد خشک و بے روح تلاوت نہیں ہے بلکہ وہ تلاوت ہے جو فکر و تخیل پر اُبھارے اور سورہ کے مضامین و مطالب کو انسان کی زندگی میں عملی شکل دے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

- ۱۔ ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ
- ۲۔ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ
- ۳۔ كَمَا أَهْلَكْنَا مَنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قُرُونٍ فَسَادُوا وَآلَاتٍ حِينٍ مِّنَاصٍ

ترجمہ شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱۔ ص۔ قسم ہے اس قرآن کی جس میں ذکر ہے (کہ یہ کتاب خدائی معجزہ ہے)۔
- ۲۔ لیکن کافر ضرور اور اختلاف میں گرفتار ہیں۔
- ۳۔ ہم نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے وہ (لوگ) نازل عذاب کے وقت داد و فرمایا کرتے تھے لیکن نجات کا وقت گزر چکا تھا۔

شان نزول

تفسیر و حدیث کی کتابوں میں اس سورہ کی ابتدائی آیات کے بارے میں کئی ایک علمی بحثی شان نزول بیان ہوئی ہیں۔ ہم ان میں سے ایک جو زیادہ شرح اور جامع ہے، یہاں پر پیش کرتے ہیں اور یہ وہ حدیث ہے جو مرحوم عینی نے امام باقر سے نقل کی ہے۔

ابو جہل اور قریش کی ایک جماعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابوطالب کے پاس آئی اور کہا: تمہارے بھتیجے نے ہمیں بہت تکلیف پہنچائی ہے اور ہمارے خدائوں کو بھی ناراض کیا ہے۔ اسے ہلاؤ اور حکم دو کہ وہ ہمارے خداؤں کو کچھ نہ کہا کرے تاکہ ہم بھی اس کے خدا کو برا نہ کہیں۔

جناب ابوطالب نے کسی کو پیغمبر اکرم کی خدمت میں بھیجا۔ جب پیغمبر گرامی گھر میں داخل ہوئے اور کمرے کے اطراف میں نگاہ کی تو دیکھ کر مشرکین کے علاوہ ابوطالب کے پاس اور کوئی نہیں ہے، تو آپ نے فرمایا: السلام علی من اتبع الهدی (سلام ان پر جو ہدایت کے پیرو ہیں)۔

پھر آپ بیٹھ گئے تو پیغمبر اکرم سے حضرت ابوطالب نے ان کی باتیں بیان کیں۔ پیغمبر اکرم نے جواب میں فرمایا: اوهل لہم فی کلمۃ خیر لہم یسودون بہا العرب و یطاون اعناقہم کیا یہ اس بات کے لیے تیار ہیں کہ ایک جملے میں مجھ سے موافقت کریں اور اس کے لیے میں تمام

عرب پر سبقت حاصل کر لیں اور ان پر حکومت کریں۔

ابو جہل (اس بات سے دہش میں آگیا، اس نے سوچا کہ عربوں پر حکومت کرنے کی چابی پیغمبر کے ہاتھ سے لے لے۔ کہنے لگا، تم موافق ہیں، آپ کی مراد کون سا جملہ ہے؟ جناب پیغمبر نے فرمایا:

تقولون لا الہ الا اللہ

تم یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے (اور ان بتوں کو جو بتھاری بدبختی، تنگ و عار اور پس ماندگی کا سبب ہیں دور پھینک دو)۔

جس وقت حاضرین نے یہ جملہ سنا تو اتنے دہشت زدہ ہوئے کہ انکھیاں کانوں میں ٹھونس لیں، اور تیزی کے ساتھ جھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ وہ کتے جاتے تھے، ایسی بات تو ہم نے اب تک نہیں سنی تھی، یہ تو ایک جھوٹ ہے۔ اس موقع پر سورہ "ص" کے آغاز کی آیات نازل ہوئیں۔

تفسیر

تھاری نجات کا وقت گزر چکا ہے

اس سورہ کی پہلی آیت میں پھر ایک مرتبہ حروف مقطعات میں سے ایک حرف "ص" سے ہمارا سامنا ہے اور یہاں بھی وہی ارتقہ یافتہ پیش آئیں گی کہ کیا یہ قرآن مجید کی عظمت کی طرف اشارہ ہے کہ جو "الف" "د" "با" جیسے سادہ حروف سے تشکیل پایا ہے اور اس کے مضامین و مطالب ایسے ہیں جو عالم انسانیت کو متقلب کر دیتے ہیں اور یہ خدا کی عجیب و غریب قدرت نمائی ہے کہ اس نے ان سادہ سے مواد سے ایسی عجیب و غریب ترکیب کو جو دہن نشا۔

یاد رہے ان کے اسرار و رموز کی طرف اشارہ ہے جو خدا اور اس کے پیغمبر گرامی کے درمیان تھے اور ایک آشنا اور دوست کا دوسرے انسانی طرف کوئی پیغام ہے۔

یا پھر دوسری تفسیر۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں خصوصیت کے ساتھ "ص" کو "اسما الہی" یا دوسری باتوں کے لیے ایک اختصاری علامت دیا ہے۔ کیونکہ بہت سے اسماء الہی "ص" سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً صادق، صمد، صالح یا یہ "صدق اللہ" کے جملہ کی طرف اشارہ ہے جسے ایک ہی حرف میں بطور خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

حروف مقطعات کی تفسیر کے سلسلے میں مزید تشریح سورہ بقرہ، آل عمران اور اعراف کی ابتدائیں (پہلی، دوسری اور چوتھی

جلد میں) ملاحظہ فرمائیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: قسم ہے اس قرآن کی جو ذکر کا حامل ہے کہ تو حق پر ہے اور یہ کتاب خدا کی معجزہ (والقرآن ذی الذکر)۔

قرآن خود بھی ذکر ہے اور ذکر کا حامل بھی ہے۔ ذکر کا معنی ہے یاد آوری اور مغزول سے غفلت کے زنگ کی یاد۔ اس کی نعمتوں کی یاد، قیامت کی عظیم عدالت کی یاد، اور غفلت انسان کے مقصد کی یاد۔ ہاں! انسانوں کی بڑبڑتی کا اہم سبب غفلت ہے اور قرآن مجید لے زائل کرتا ہے۔ قرآن منافقین کے بارے میں کہتا ہے:

نسوا اللہ فنسیہم

انہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے بھی انہیں فراموش کر دیا۔ (اور اپنی رحمت ان سے منقطع کر لی)

(توبہ — ۶۷)

اسی سورہ (ص) کی آیہ ۲۶ میں گراہوں کے بارے میں بیان ہوا ہے۔

ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لہم عذاب شدید بئنا وایوم الحساب
جو لوگ خدا کی راہ سے گمراہ ہو جاتے ہیں چونکہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا ہے لہذا وہ عذاب شدید میں مبتلا ہوں گے۔

ہاں! گمراہوں اور گنہگاروں کے لیے سب سے بڑی مصیبت فراموشی ہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود کو اور اپنی ہستی کی قدر قیمت کو بھی بھول جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ولا تکنوا کالذین نسوا اللہ فانساہم انفسہم اولہمک ہم الفاسقون
تم ان لوگوں کے مانند نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا ہے، خدا نے انہیں خود اپنے آپ کو ہی بھلا دیا ہے۔ وہ فاسق ہیں۔ (حشر — ۱۹)

اور قرآن انہی نسیان کے پردوں کو چاک کرنے کا وسیلہ اور غفلت کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے نور اور روشنی ہے۔ اس کی آیات انسان کو خدا اور قیامت کی یاد دلاتی ہیں۔ اور اس کے جملے انسان کو اپنے وجود کی قدر و منزلت سے آشنا کرتے ہیں۔

لہ "والقرآن ذی الذکر" کا جبر، بڑبڑتی ہے جس کا جواب محدود ہے اور اس کی قدر انہوں نے اس طرح ذکر کی ہے۔

والقرآن ذی الذکر انک صادق وان ہذا الکلام معجز

تو سچا ہے اور یہ کلام معجزہ ہے

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: اگر تو یہ دیکھتا ہے کہ وہ ان میں خوش آیات اور بیدار کرنے والے قرآن کے سامنے سرسیم خم کر کے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کلام حق پر کوئی پردہ پڑا ہو یا ہے بلکہ یہ کفار تکبر و غرور میں گرفتار ہیں۔ جس نے انہیں حق کو کرنے سے باز رکھا ہو اسے اور عنادات و عصیان انہیں تیری دعوت قبول کرنے سے روکے ہوئے ہے (بل الذین کفروا عترة و شقاق)۔

"عترة" "سفرات" میں "راغب" کے قول کے مطابق ایک حالت ہے بر انسان کو مغلوب ہونے سے روکتی ہے، شکست ناپذیری کی حالت (اور اصل میں یہ لفظ "عزاز" سے لیا گیا ہے جو سخت حکم اور نفوذ ناپذیر سرزمین کے معنی میں ہے) یہ دو قسم کی ہوتی ہے کبھی "عزت ممدوح" اور پندیرہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم ذات پاک الہی کی "عزیز" کے ساتھ توصیف کرتے ہیں اور کبھی "عزت مذموم" ہوتی ہے، اور وہ حق کے مقابلے میں نفوذ ناپذیری اور حقیقتوں کو قبول کرنے سے بجز کرنا ہوتا ہے اور عزت در حقیقت ذلت ہے۔

"شقاق" "واصل" شق کے مادہ سے "شگاف" کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں اختلاف کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا کیونکہ اختلاف اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ ہرگز وہ ایک "شق" میں قرار پائے۔

قرآن نے یہاں نفوذ پذیریری، کبر و غرور، جہائی اور اختلاف و تفرقہ کو کفار کی بڑبڑتی کا عامل شمار کیا ہے۔ ہاں یہ تفسیر صفات کی ہیں جو انسان کی آنکھ اور کان پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور جس تشبیہی انسان سے ہمیں لیتی ہیں اور کتنی دردناک بات ہے کہ انسان کی آنکھیں بھی کھلی ہوں اور کان بھی کھلے ہوں لیکن پھر بھی وہ اندھا اور بہرہ ہو۔

سورہ بقرہ کی آیہ ۲۰۶ میں ہے :-

واذا قیل لہ اتق اللہ اخذتہ العترة بالانتم فحسبہ جہنم و لبئس المہماد
جس وقت اس (منافق) کو کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو تو مہٹ و دھرمی تقصیب اور غرور اس کو پکڑ لیتے ہیں اور گناہ کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ جہنم کی آگ اس کے لیے کافی ہے اور کتنی بری جگہ ہے وہ؟

اس کے بعد قرآن ان فاضل مغزوں کو بیدار کرنے کے لیے ان کا ناتھ پکڑ کر بشر کی گزشتہ تاریخ کی طرف لے جاتا ہے اور مغزوں کو بیدار کر دیتا ہے کہ شاید وہ عبرت حاصل کر لیں۔ کہتا ہے: ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنہیں ہم نے (تعمیر و تہذیب کو بھلائے، آیات الہی کا انکار کرتے اور ظلم و گناہ کی بنا پر) ہلاک کر دیا (کہ اھل کنا من قبلہم من قرون)۔ اور نزول مذاب کے وقت ان کی فریاد بلند ہوئی لیکن کیا فائدہ؟ کیونکہ اب دیر ہو چکی تھی اور نجات کا وقت گزر چکا تھا (فنادوا ولات حین مناص)۔

وہ دن جس کے لیے خدا کے پیغمبروں اور اولیاء حق نے انہیں وعظ و نصیحت کی تھی اور ان کے اعمال کے بڑے انجام سے انہیں ڈرایا تھا، نہ صرف یہ کہ وہ سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے بلکہ توہین کا مذاق اڑاتے، انہیں آزار پہنچاتے، یہاں تک کہ انہیں قتل

وَعَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ وَقَالَ الْكُفْرُونَ هَذَا
سِحْرٌ كَذَابٌ ۝

أَجْعَلُ الْأَلَهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا ۗ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝

وَأَنْطَلِقُ الْمَلَائِكَةُ مِنْهُمُ أَنْ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَى إِلِهَتِكُمْ ۗ إِنَّ هَذَا
لَشَيْءٌ يُرَادُ ۝

مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمَلَأَةِ الْأَخْرَىٰ ۗ إِنَّ هَذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝

ترجمہ

۴۔ وہ تعجب کرنے لگے کہ ان میں سے ایک ڈرانے والا پیغمبر کیسے آگیا اور کافروں نے کہا یہ تو جھوٹا
جادوگر ہے۔

۵۔ کیا اس نے اتنے خداؤں کے بجائے ایک ہی خدا قرار دے لیا ہے، یہ تو واقعا ایک عجیب چیز ہے۔

۶۔ ان کے سردار باہر آئے اور کہا: جاؤ اور اپنے خداؤں کے ساتھ مضبوطی سے جم جاؤ۔ یہ تو ہمیں بدعتی کی طرف
کھینچ لے جانا چاہتے ہیں۔

۷۔ ہم نے ہرگز ایسی کوئی چیز اپنے آباؤ اجداد سے نہیں سنی ہے، یہ تو بس جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔

شان نزول

ان آیات کے بارے میں بھی، گزشتہ آیات کے لیے بیان کردہ شان نزول سے ملتی جلتی ایک شان نزول بیان کی گئی ہے۔
میں لکھتا ہوں کہ ان ساری آیات کے لیے عمومی طور پر ایک ہی شان نزول ہو۔

لیکن چونکہ اس شان نزول میں کچھ نئے مطالب بیان ہوئے ہیں لہذا ہم اے تفسیر علی بن ابراہیم سے یہاں پر پیش کرتے ہیں
اور یہ ہے کہ :-

جس وقت رسول خدا نے اپنی دعوت کو آشکار فرمایا تو قریش کے سردار حضرت ابوطالب کے پاس آئے اور کہا: اے ابوطالب
اب کا بیٹا جانیس ہے عقل کتابے اور ہمارے خداؤں کو بڑا کہتا ہے۔ اس نے ہمارے جوانوں کو خراب کر دیا ہے اور ہماری اجتماعیت میں

کردیتے تھے۔ مہلت ہاتھ سے نکل گئی اور وہی کے راستے تباہ ہو گئے اور مذاہب امتیصال ان کی نابودی کے لیے نکلے
تو ہر بازگشت کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے لہذا ان کی فریادیں کسی جگہ تک نہ پہنچیں۔

لفظ "لا" یعنی کے لیے ہے اور اس میں "لا" نافیہ تھا اور تاء تانیث "بڑھایا گیا ہے" سے

"مناص" "نوص" کے مادہ سے پناہ گاہ اور فریادوں کے معنی میں ہے۔ کہتے ہیں کہ جب کبھی عربوں کو کوئی سخت
حادثہ پیش آجاتا تھا، خصوصاً جنگوں میں تو وہ بار بار یہ کلمہ دہراتے تھے "مناص، مناص" یعنی پناہ گاہ کہاں ہے اور پناہ
ہے؟ اور چونکہ یہ مفہوم فرار کے ہم معنی ہے لہذا کبھی جانے فرار کے معنی میں آتا ہے

بہر حال ان مخدور غافلوں کے پاس جب تک مہلت تھی کہ لطف خدا کی محنت بھری آغوش میں پناہ لیں، اس وقت
انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ لیکن جب ساری مہلتیں ہاتھ سے نکل گئیں اور مذاہب امتیصال نازل ہو گئی تو پھر یہ فریادیں
راہ فرار اور پناہ گاہ ڈھونڈنے کی کوشش کوئی فائدہ نہیں دیتی۔

گزشتہ تمام اقوام کے لیے پروردگار کی ہی سنت رہی ہے اور آئندہ بھی ہی سنت جاری رہے گی کیونکہ اس کی سنت
پے کوئی تغیر نہیں ہے۔

انہوں کو بہت سے لوگ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے وہ تلخ تجربوں کو
آزمانا چاہتے ہیں۔ وہ تجربات جو انسان کی تمام عمر میں صرف ایک جیسے پیش آتے ہیں اور دوسری مرتبہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی
یعنی جن کا اول و آخر ایک ہی ہوتا ہے۔

۱۔ بعض نے "تاء" کو "ناثہ" اور بالذکر کے لیے بھی جانا ہے (مثلاً طارطاطائی) جیسا کہ بعض نے بیان "لا" کو "نفعی جنس" کے لیے کہا ہے
یعنی نے "مشبہ بہ لیس" بہر حال "تاء" کے اس کے ساتھ اضافی وجہ سے مخصوص احکام پیدا کرتا ہے۔ منہ ان کے یہ ہے کہ
جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمیشہ اس کا اسم یا خبر صنف ہوتی ہے اور ان میں سے صرف ایک کا کام میں ذکر ہوتا ہے۔ اس لیے
"ولات حنین مناص" کا جملہ تقدیر میں "ولات الحنین حنین مناص" تھا۔
۲۔ مفردات لغت، تفسیر فرہارزی، روح المعانی اور کنز اللغین البصرین مادہ "نوص"۔

تفرقہ ڈال دیا ہے اگر یہ کام مال کی کمی کی وجہ سے کرنا ہے تو ہم اس کے لیے اس قدر مال اکٹھا کر دیتے ہیں کہ وہ قریش میں زیادہ مالدار بن جائے یہاں تک کہ ہم اسے اپنا سردار و حاکم بنانے کے لیے بھی تیار ہیں۔ ابوطالب نے یہ پیغام بغیر خدا کی خدمت میں پہنچایا۔ بغیر گرامی نے فرمایا:

لو وضعوا الشمس فی میمنی والقمر فی یساری ما اردتہ، ولکن کلمۃ یعطونی یملکون بہا العرب و تدین بہا العجم و یكونون ملوکا فی الجنة

”اگر وہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو مجھی میں اس کی طرف نائل نہیں ہوں گا۔ لیکن (ان تمام وعدوں کے بجائے) ایک جملہ میں میری ہوائت کریں تو وہ اس کے سایے میں عرب پر بھی حکومت کریں گے اور غیر عرب بھی ان کے دین میں داخل ہو جائیں گے اور وہ جنت کے بادشاہ بن جائیں گے۔

ابوطالب نے یہ پیغام انھیں پہنچایا تو انھوں نے کہا:

”اُس کے لیے تو ہم ایک جملے کی بجائے دس جملے قبول کرنے کو تیار ہیں۔ (تم کون سا جملہ کہنا چاہتے ہو؟“

پیغمبر اکرم نے ان سے فرمایا:

تکشہدون ان لا الہ الا اللہ و انی رسول اللہ

تم یہ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں خدا کا رسول ہوں۔

(وہ اس گفتگو سے بہت وحشت زدہ ہو گئے اور) انھوں نے کہا:

”کیا ہم ۲۶۰ خداؤں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کو مان لیں، یہ کتنی عجیب بات ہے؟ (وہ بھی ایسا خدا جو دکھائی نہیں دیتا)“

اس موقع پر ذیل کی آیات نازل ہوئیں:

وعجبوا ان جاءہم منذر منہم وقال الکافرون ہذا ساحر کذاب۔۔۔

۔۔۔۔۔ ان ہذا الا اختلاف لہ

یہی معنی مجمع البیان میں خٹوڑے سے فرق کے ساتھ نقل ہوا ہے اور اس کے آخر میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم نے روتے ہوئے فرمایا:۔

لے چچا! اگر یہ سورج میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند بائیں ہاتھ پر رکھ دیں تا کہ میں اپنی اس بات سے

دست بردار ہو جاؤں، تو بھی میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ میں اس بات کو معاشرے میں نافذ رائج کر کے رہوں گا یا اس کی راہ میں قتل ہو جاؤں گا۔ جس وقت حضرت ابوطالب نے یہ بات سنی تو فرمایا:

”آپ اپنے پردگرم کو ہماری رکھیں، خدا کی قسم میں ہرگز آپ کی نصرت سے دستبردار نہیں ہوں گا“

تفسیر

بہت سے خداؤں کے بجائے ایک خدا

مغزور سرکش لوگ نہ تو کوئی اثر قبول کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے مؤقف سے ہٹتے ہیں۔ جس چیز کو انھوں نے اپنے محدود اور ناقص انکار کے ذریعے اپنا لیا ہے، اس کے سوا کسی چیز کو تسلیم نہیں سمجھتے، اور تمام قدروں کے ناپ تول کا معیار اس کو قرار دیتے ہیں۔

لہذا جب بغیر اسلام نے مکہ میں توحید کا پرچم بلند کیا اور چھوٹے بڑے سارے بتوں کے خلاف کربن کی تعداد ۲۶۰ تھی، قیام کیا تو کبھی تو وہ اس بات پر تعجب کرتے کہ انھیں کے درمیان سے ایک انذار کرنے والا پیغمبر کیوں مبعوث کیا گیا؟“ (وعجبوا ان جاءہم منذر منہم)۔

ان کا تعجب اس بات پر تھا کہ محمد اٹھی میں سے ایک فرمیں۔

کوئی فرشتہ آسمان سے کیوں نازل نہیں ہوا؟ وہ اس عظیم نقطہ قوت کو، نقطہ ضعف خیال کرتے تھے جو شخص عوام الناس میں سے مبعوث کیا گیا ہے وہ ان کی حاجات، ضروریات اور دکھ درد سے واقف تھا اور ان کی مشکلات اور مسائل سے آشنا تھا۔ وہ تمام باتوں میں نونہ اور مثال بن سکتا تھا۔ وہ اس عظیم امتیاز کو بغیر کی دعوت میں ایک تارک خیال کرتے تھے اور اس پر تعجب کرتے تھے۔

کبھی اس مرحلے سے بھی آگے بڑھ جاتے، یہاں تک کہ کافروں نے کہا: یہ تو ایک جھوٹا جادو گر ہے (وقال الکافرون ہذا ساحر کذاب)۔

ہم نے بار بار بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرم کی طرف جادو کی نسبت دینا اس وجہ سے تھا کیونکہ وہ آپ کے ناقابل انکار معجزات اور افکار میں غیر معمولی نفوذ کا مشاہدہ کرتے تھے اور آپ کی طرف جھوٹ کی نسبت اس بنا پر دیتے تھے کیونکہ آپ نے اس ماحول میں ستم شمار ہونے والی بے ہودہ رسوم اور پست افکار کے خلاف قیام کیا تھا اور اس کے خلاف بات کہتے تھے۔

اور خدا کی طرف سے رسالت کا دعویٰ رکھتے تھے۔

جس وقت پیغمبر اکرم نے اپنی توحیدی دعوت کو آشکار کیا تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہتے تھے: "آؤ! ان ہی سنیوں" کیا اس نے ان سب خداؤں کے بھائے ایک ہی خدا قرار دے لیا ہے؟ واقفایہ تو ایک عجیب بات ہے (اجعلنا اللہا واحداً ان هذا المشی عجاب)۔

میں! بعض اوقات غرور، خودخواہی، بطلان انسانی اور ماحول کی خرابی انسان کی عقل اور قوت فیصلہ کو اتنا بدل دیتی ہے کہ وہ روشن حقیقتوں پر تعجب کرنے لگتا ہے، جبکہ وہ خرافات اور بے ہودہ خیالات کی سختی کے ساتھ پابندی کرتا ہے۔

لفظ "عجباب" طویل "بروزن" "تراب" کی طرح جاننا کا معنی دیتا ہے اور بہت زیادہ عجیب باتوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہ کم عقل خیال کرتے تھے کہ ان کے مہبودوں کی تعداد واقعی زیادہ ہوگی، ان کے نفوذ کی قدرت و اعتبار بھی زیادہ ہوگی۔ اس بنا پر ایک ایسا خدا ان کی نگاہ میں حقیر دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ فلسفی نقطہ نظر سے متعدد چیزیں محدود ہوتی ہیں اور غیر محدود وجود ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر خدا شناسی کے سلسلے میں تمام تحقیقات راہ توحید پر آکر تمام ہوتی ہیں۔

ان کے سردار جب حضرت ابوطالب کی طرف رجوع کرنے اور ان کی وساطت سے پالیس ہو گئے تو ان کے پاس سے آگے اور کہا: جاؤ اور اپنے خداؤں کے ساتھ مضبوطی سے جم جاؤ، اور استقامت اور پابندی سے کام لو کیونکہ محمدؐ کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کو تباہی اور بربادی کی طرف کھینچ لے جائے اور بتوں کی طرف پشت کرنے کی وجہ سے خدا کی نعمتوں کو ہم سے منقطع کر دے اور وہ خورم پر حکومت کرے (وانطلق الملائمہ ان امشوا و اصابوا علی الہمتکم ان هذا المشی یراد)۔ "انطلق" انطلاق کے مادہ سے، تیزی سے باہر نکلنے اور پہلے کام کو چھوڑ دینے کے معنی میں ہے۔ یہاں غصہ کی حالت میں ابوطالب کی مجلس کو چھوڑ کر چلے جانے کے معنی میں ہے۔

"ملا" قریش کے اشراف اور سرداروں کی طرف اشارہ ہے، جو ابوطالب کے پاس آئے تھے اور ان کی مجلس سے باہر نکلنے کے بعد ایک دوسرے سے یا اپنے پیروکاروں سے کہتے تھے کہ اپنے بتوں سے دست بردار نہ ہونا اور اپنے مہبودوں کے ساتھ مضبوطی سے چمپے رہنا۔

"الشی یراد" کا مفہوم یہ ہے کہ "یہ مسئلہ ایک ایسی چیز ہے جو چاہی گئی ہے اور چونکہ یہ جلد سرسبز ہے، لہذا مسترین اس کی بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں۔ منجد ان کے یہ ہیں:

سے یہاں "جعل" سے مراد مجموعی طور پر قرار دینا نہیں، بلکہ اعتقاد کے مطابق قرار دینا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ پیغمبر گرامی اسلام کی طرف اشارہ ہے اور اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ دعوت ایک سازش ہے، جس کا برف و مقصد ہم ہیں۔ اس کا ظاہر تو اس کی طرف دعوت دینا ہے لیکن اس کا باطن ہم پر حکومت کرنا اور عربوں کی دولت و ریاست سے۔ اور یہ سب اسی مطلب کے حصول کے لیے بہانے ہیں۔ تم لوگ جاؤ اور اپنے دین پر مضبوطی سے ڈٹ جاؤ اور اس سازش کا کھوج لگانا ہم سرداران قوم پر چھوڑ دو۔

یہ وہی چیز ہے جسے سرداران باطل ہمیشہ راہ حق کے راہرو افراد کی آواز خاموش کرنے کے لیے پیش کیا کرتے تھے۔ اسے دشمن کا نام دیتے تھے، اسی سازش جس کا ان کے نزدیک ریاست و ان افراد کو بی بڑے غور کے ساتھ تیر لگانا ہوتا ہے اور اس کا ہارنہ کے لیے پروگرام بنانا ہوتا ہے اور عام لوگوں کو بے اعتنائی کے ساتھ اس کے قریب سے گزر جانا چاہیے اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس سے سختی کے ساتھ چھٹے رہنا چاہیے۔

اس گفتگو کی نظیر حضرت نوحؑ کی داستان میں بھی آئی ہے۔ جس میں اشراف اور بڑے لوگوں نے عوام الناس سے کہا تھا۔

ما هذا الا بشر مثکم یرید ان یتفصل علیکم

یہ شخص صرف تمہاری مانند ہی ایک انسان ہے۔ یہ تم برابر تری حاصل کرنا چاہتا ہے۔

(نومنون — ۲۴)

بعض دوسروں نے اس جملہ کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم بہت پرست اپنے خداؤں کے باسے میں مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہو یہی وہ چیز ہے جو تم سے چاہی گئی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ محمدؐ کا برف و مقصد ہم ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ہمارے معاشرے کو خسرابی کی طرف کھینچ لے جائے۔ اور ہم اپنے خداؤں کی طرف پشت کریں۔ جس کے نتیجے میں ہم سے نعمتیں منقطع ہو جائیں اور ہم پر ملامت نازل ہو۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ محمدؐ اپنے کام سے دست بردار ہونے والا نہیں ہے۔ اس نے تمہارا ارادہ کر لیا ہے اور اس کا ارادہ تخلف ناپذیر ہے لہذا اس سے مذاکرات کرنا فضول ہی بات ہے، اس لیے جاؤ اور اپنے عقائد کی مضبوطی سے حفاظت کرو۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی مراد یہ تھی کہ یہ ایک مصیبت ہے جو ہمیں پیش آئی ہے لہذا اسی حالت کے ساتھ گزارا کرو اور دکھ چھیلیں اور اپنے دین کی محکم طریقہ سے حفاظت کریں۔

البتہ اس جملہ کے مفہوم کے کئی ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے ممکن ہے ان میں سے اکثر تفسیریں اس میں جمع ہوں، اگرچہ ان کا معنی مناسب تر نظر آتا ہے۔

بہر حال بت پرستوں کے سردار یہ چاہتے تھے کہ اس گفتگو کے ذریعے اپنے پیروکاروں کے متزلزل ایمان اور جذبہ کو تقویت پہنچائیں۔ لہذا ان سے زیادہ ان کے اعتقاد کو بدلنے سے روکیں، لیکن یہ کتنی فضول کوشش تھی؟

اس کے بعد لوگوں کو قائل رکھنے یا اپنے آپ کو قائل کرنے کے لیے انھوں نے کہا: ”ہم نے تو ایسی چیز پائے آباؤ اجداد اور ہمیں نہیں مٹی۔ یہ تو زرا جھوٹ ہی جھوٹ ہے (ما سمعنا بهذا في الملة الاخرة ان هذا لا اختلاق)۔“

اگر توحید اور بتوں کی نفی کا دعویٰ کوئی حقیقت رکھتا ہوتا تو ہمارے آباؤ اجداد کو اپنی عظمت کی وجہ سے اسے درک کرنا چاہیے تھا۔ اور ہمیں بھی ان سے سنے ہوئے ہونا چاہیے تھا لیکن یہ ایک جھوٹی بات ہے جس کا سابق میں کوئی نشان نہیں۔ ”الملة الاخرة“ کی تفسیر مگر ہے ان کے آباؤ اجداد کی جہیت کی طرف اشارہ ہو جو ان کی نسبت آخری ملت سے جیسا کہ ہم سطور بالا میں بیان کر آئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اہل کتاب خصوصاً نصاریٰ کی طرف اشارہ ہو جو غیر اسلام کے ظہور سے پہلے آخری دین و ملت شمار ہوتے تھے یعنی نصاریٰ کی کتابوں میں بھی محمدؐ کی باتوں کا کوئی نام و نشان نہیں کیونکہ وہ ”تشکیث“ (تین خداؤں) کے قائل ہیں۔ محمدؐ کی توحید تو ایک نئی ظاہر ہونے والی بات ہے۔

لیکن جیسا کہ قرآن کاتب و لہجہ دوسری مختلف آیات میں نشان دہی کرتا ہے، زمانہ جاہلیت کے عرب یہود و نصاریٰ کی کتب پر اعتماد نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کا سب کچھ ان کے بڑوں اور آباؤ اجداد کا طریقہ اور دین تھا اور پہلی تفسیر کے لیے یہ ایک اچھا شاہد ہے۔

”اختلاق“ ”خلق“ کے مادہ سے اصل میں کسی چیز کو سابقہ کے بغیر ابداع و اظہار کرتا ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ ”جھوٹ“ کے معنی میں بھی بولا گیا ہے، کیونکہ جھوٹ بولنے والا بہت سے مواقع پر بے سابقہ مطالب بیان کرتا ہے۔ اس بنا پر زبیر بیٹھ آیت میں ”اختلاق“ سے مراد یہ ہے کہ توحید کا دعویٰ ایک نئی چیز اور بے سابقہ دعویٰ ہے جو محمدؐ نے پیش کیا ہے اور یہ ہمارے اور ہم سے پہلے لوگوں کے درمیان ناشائستہ ہے اور یہ عوداں کے بطلان کی دلیل ہے۔

آئین نوسے ڈرنا، تاریخ میں گمراہ اقوام کے اپنے انحرافات پر اصرار کرنے اور خدا کے پیغمبروں کی دعوت کے سامنے سر نہ جھکانے کے ملل و اسباب میں سے ایک تازہ اور نئے ظاہر ہونے والے مسائل کا خوف ہی رہا ہے۔ وہ برائی چیز سے وحشت رکھتے تھے اور اسی بنا پر انبیاء کے دین کو بہت بُری نظر سے دیکھتے تھے، اب بھی بہت سی قوموں میں ایسی جاہلانہ سوچ کے اثرات پائے جاتے ہیں حالانکہ تو بغیروں کی توحید کی طرف کوئی نئی چیز تھی اور نہ ہی اس کا نئی چیز ہونا اس کے باطل ہونے کی دلیل جو متعلق اور دلیل کی پیروی کرنی چاہیے اور جن بات کو تسلیم کرنا چاہیے وہ جہاں کہیں بھی ہو اور جس کی طرف سے بھی ہو۔

تاہم تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات نئی بات اور نئی تحقیق سے بعض علماء بھی وحشت کرنے لگتے ہیں اور نئے علمی نظریات کے مقابلے میں مخالفت کا علم بلند کر دیتے ہیں اور ”ان هذا لا اختلاق“ کہنے لگتے ہیں۔

خصوصاً ارباب کلیسا (عیسائی پادریوں) کی تاریخ میں یہ مسئلہ بہت زیادہ نظر آتا ہے کہ وہ علماء معلوم طبعی کے سائنسی انکشافات کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے تھے اور گلیلیو جیسے (علماء طبیعیات) کو زمین کے سورج کے گرد چکر لگانے اور خود اپنے گرد گردش کرنے کے انکشاف کرنے کی وجہ سے سخت ترین حملوں کا نشانہ بناتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ باتیں بدعت ہیں بے سابقہ ہیں اور جھوٹ ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ بعض بڑے علماء بھی جب نئی علمی تحقیقات پر دسترس حاصل کرتے ہیں تو اس خوف سے کہ کمپین ان لوگوں کے حملوں کا نشانہ نہ بن جائیں جو ان کے ہم عصر ہیں اور وہ اس نئی تحقیق پر تنقید کرنے لگیں، وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں کہ قرطاد اور نوزائیدہ لوگوں میں سے چند افراد کو اپنے نئے نظریات سے ہم آہنگ ظاہر کریں اور اس طریقے سے اپنے نظریے کو ایک پرانا اور قدیمی عقیدہ بیان کریں تاکہ امن و امان میں رہ سکیں اور یہ بات بہت ہی المہناک ہے۔

اس بات کا ایک نمونہ معروف ”حرکت جوہری“ کے نظریے کے بارے میں صدائے لٹلین شیزازی کے اسفار میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

بہر حال نئے مسائل اور جدید تحقیقات کے ساتھ یہ طرز سلوک، انسانی معاشرہ اور جہان علم و دانش کے لیے پہلے ہی نقصان دہ تھا اور آج بھی ہے اور ہمدردی اور غلو رکھنے والوں کو اس کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا چاہیے اور زمانہ جاہلیت کی ان رسومات کو انکار انسانی سے دور کر دینا چاہیے۔

لیکن یہ گفتگو اس معنی میں بھی نہیں ہے کہ ہر نئے مطلب کو اس کے تازہ اور نیا ہونے کی وجہ سے قبول کر لیں۔ چاہے وہ بالکل بے بنیاد اور بے اساس کیوں نہ ہو، کیونکہ تازہ پسندی بھی قدامت پرستی کی طرح ہی خود ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔

اعتدال اسلامی کا تقاضا یہ ہے کہ نہ اس معاملے میں یا فراطر ہو اور نہ ہی تغریظ۔

۸- اَنْزَلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِنْ ذِكْرِي بَلْ لَمَّا يَدُوُّ قَوَاعِدَابٍ ۝

۹- اَمْرَعْتَهُمْ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيزِ الْوَهَّابِ ۝

۱۰- اَمْرَلَهُمْ مَلِكَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَلَئِنْ تَقُوۡۤا فِي الْاَسْبَابِ ۝

۱۱- جُنْدًا مَّاهُنَا لِكَ مَهْزُومٍ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝

ترجمہ

۸۔ کیا ہم سب میں سے صرف اس (محمدؐ) پر قرآن نازل ہوا ہے؟ وہ درحقیقت میری اصل وحی کے بارے میں ہی شک کر رہے ہیں، بلکہ انہوں نے ابھی تک غلابِ الہی نہیں چکھا (بھی اس طرح کی گستاخانہ باتیں کر رہے ہیں)

۹۔ کیا تیرے قہر اور عطا کرنے والے پروردگار کی رحمت کے خزانے ان کے پاس ہیں (کہ جسے ان کا دل چاہے دے دیں)؟

۱۰۔ یا یہ بات ہے کہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کی مالکیت ان ہی کے لیے ہے (اگر ایسا ہے) تو آسمان پر چڑھ جائیں (اور محمدؐ کے پاک دل پر وحی کے نزول کو روک دیں)۔

۱۱۔ ہاں! بیشکست خوردہ احزاب کا ایک چھوٹا سا لشکر ہیں۔

تفسیر

یہ چھوٹا سا لشکر خوردہ لشکر

گزشتہ آیات میں راہِ توحید اور پیغمبرِ اسلام کی رسالت کی مخالفت میں مخالفین کی منفی عقیدہ اور کلمہ چینی کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں بھی اسی گفتگو کو جاری رکھا گیا ہے۔

مشرکین کرنے جب اپنے ناجائز مفادات خطرے میں دیکھے اور کینہ و حسد کی آگ ان کے دل میں بھڑکنے لگی تو پیغمبرِ اسلامؐ کی مخالفت کے سلسلے میں خود کو قانع کرنے اور لوگوں کو غافل رکھنے کے لیے طرح طرح کی کمزوریوں کا سہارا لینے لگے۔ جب اور انکار کے طور پر کہتے: کیا ہم سب میں سے صرف محمدؐ پر قرآن نازل ہوا ہے؟ (اور انزل علیہ الذکر من بیننا)۔

کیا ان تمام بڑے بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں اور ان تمام مالدار، ثروت مند سرداروں میں سے کوئی نہ مل سکا کہ خدا اپنا قرآن اس پر نازل کرتا، سوائے تھی دست محمدؐ کے؟!

یہ منطقی اس ننانے کے ساتھ ہی منحصر نہ تھی بلکہ ہر زمانے میں جب کوئی اہم ذمہ داری کسی کو سپرد کی جاتی ہے، تو حسد کی آگ بھڑکنے لگتی ہے، آنکھیں خیرہ اور کان تیز ہو جاتے ہیں۔ بڑ بڑاٹ اور دندڑ تراشیاں شروع ہو جاتی ہیں کہ کیا کوئی اور آدمی نہیں مل سکتا تھا کہ یہ کام فلاں شخص کو جو گناہ اور فقیہ خاندان سے بے سپرد کر دیا گیا ہے؟

ہاں! ایک طرف تو دنیا پرستی اور دوسری طرف سے حسد ان بات کا سبب ہوا کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) جو مشرکین کے ساتھ ایک قدر مشرک کے باعث اسلام اور قرآن سے دُور ہو گئے اور بت پرستوں کے پاس چلے گئے اور یہ کہنے لگے کہ تمہاری راہ ان کی راہ سے بہتر ہے۔

المر ترالی الذی او قوا نصیبًا من الکتاب یؤمنون باللحبت والطاغوت و

یقولون لذلین کفر و اھو لاء ما ھدی من الذین امنوا سبیلًا

کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا کہ جنہیں کتابِ خدا سے کچھ حصہ ملا تھا۔ جنت و طاغوت

(جنت اور بت پرستوں) پر ایمان لائے ہیں اور مشرکین سے کہتے ہیں کہ وہ محمدؐ پر ایمان لانے والوں سے

زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ (نساء — ۵۱)

یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ سب تعجب اور انکار میں حسد اور حسرتِ دنیا کے علاوہ ایک اور سرچشمہ یعنی قدر و قیمت کی پہچان کا غلط معیار بھی شامل تھا جو فیصلہ کیلئے ہرگز منطقی معیار نہیں بن سکتا۔ کیا انسان کی شخصیت نام و نود، شہرت، مال و دولت، ثروت و مقام اور کن و سال میں ہے؟ کیا خدا کی رحمت ان معیاروں پر تقسیم ہوتی ہے؟

اسی لیے اس آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ان کا مسئلہ کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ: وہ حقیقت میں میری اصل وحی اور میرے لوگوں میں شک رکھتے ہیں۔ (بل ہم فی شک من ذکر ی)۔

محمدؐ کی ذات پر اعتراض کرنا تو ہانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور ان کا یہ شک کسی مسئلے میں اس بنا پر نہیں ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ایہام ہے بلکہ اس کا سرچشمہ ہوا جو اس، حب دنیا اور حسد و کینہ ہے۔

اور آخر میں انہیں اس جملہ کے ساتھ تہدیک کی گئی ہے: انہوں نے ابھی تک غلابِ الہی کو نہیں چکھا جو اس طرح سے دلیری کے ساتھ خدا کے پیغمبر ہونے کے سامنے اڑے ہوئے ہیں اور ان فضول باتوں کے ساتھ وحیِ الہی کے مقابلے میں جنگ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں (بل لعمایذو قواعذاب)۔

ہاں ہمیشہ ایسا گروہ موجود رہا ہے کہ جن کے کان منطقی اور درست بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور انہیں غلابِ الہی کے سارے لوگوں کے

سوا کوئی چیز غرور کے گھوڑے سے بچے نہیں آتارہی، ان پر غلاب ہونا چاہیے چونکہ ان کا علاج عذاب الہی ہی ہے۔

اس کے بعد ان کے جواب میں مزید فرمایا گیا ہے: واقعاً! کیا تیرے قادر اور نیشنے والے پروردگار کی رحمت کے غرور انھی کے پاس ہیں کہ جس کسی کو وہ چاہیں نبوت کا پر دانہ دے دیں اور جس کو نہ چاہیں محروم کر دیں (۱۱) عندہم عذاب من وجہ ربك العزیز الوہاب)۔

خدا اس بنا پر کہ وہ "رب" ہے (اور عالم ہستی اور جہان انسانیت کا مالک و مربی اور پروردگار ہے) اپنی رسالت کے لیے ایسے شخص کو منتخب کرتا ہے جو لوگوں کو ارتقا و تکامل کی راہ اور پرورش و تربیت میں رہبری کر سکے اور اس کے "عقوبت" ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کی خواہش کا مغلوب نہیں ہے کہ وہ مقام رسالت کو کسی نالائق آدمی کے سپرد کر دے اور اصلی طور پر مقام نبوت اتنا عظیم مقام ہے کہ صرف خدا ہی اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ کس کو دے اور اس کے "وہاب" ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جو کچھ چاہے اور جس کو چاہے بخش دے۔

قابل تجربہ بات یہ ہے کہ "وہاب" ماننے کا صیغہ ہے اور بہت نیشنے والے کے معنی میں ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبوت ایک ایسی نعمت نہیں ہے بلکہ متعدد نعمتوں کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے اکٹھی ہوتی ہیں، پھر ہمیں وہ اس منصب کا اندہ دار ہو سکتا ہے۔ یہ نعمتیں علم، تقویٰ، عصمت، شجاعت اور شہامت ہیں۔ اس گفتگو کی نظیر سورۃ زخرف کی آیت ۲۲ میں بھی ہے:-

اھم یقسمون رحمۃ ربك

وہ تجھ پر قرآن نازل ہونے کی وجہ سے اعتراض کر رہے ہیں تو کیا تیرے پروردگار کی رحمت

ان کے ہاتھوں سے تقسیم ہوتی ہے؟

صناعت و نعمت کی تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ نبوت جہان انسانیت پر خدا کی رحمت اور لطف ہے اور واقعاً ایسا ہی ہے کیونکہ اگر انبیاء نہ ہوتے تو انسان آخرت اور روحانیت کی راہ بھی گم کر بیٹھتے اور دنیا کی راہ بھی جیسا کہ کتب انبیاء سے دور لوگ دونوں راستے گم کیے ہوتے ہیں۔

پھر بعد والی آیت میں اسی مطلب کو ایک دوسرے طریقے سے بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کی مالکیت و حاکمیت ان کے لیے ہے؟ اگر ایسا ہے تو آسمانوں پر چڑھ جائیں اور وحی الہی محمدؐ کے پاک قلب پر نازل ہونے سے روک دیں (۱۱) لہم ملک السموات والارض وما بینہما فلیرتقوا فی الاسباب)۔

یہ گفتگو حقیقت میں گزشتہ بحث کی تکمیل کرتی ہے۔ وہاں پر یہ کہا گیا ہے کہ "پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں نہیں ہیں کہ تمہاری جوں آلود خواہشات جس شخص کے ساتھ تم آہنگ میں اسے بخش دو" اب فرمایا گیا ہے کہ اب جب کہ

یہ خزانے تمہارے ہاتھ میں نہیں ہیں اور صرف خدا کے ہاتھ میں ہیں تو صرف ایک ہی راہ ہے جو تمہارے لیے کھلی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم آسمانوں پر چڑھ جاؤ اور وحی کو نازل ہونے سے روک دو اور تم خود جانتے ہو کہ تم اس کام سے بھی بالکل عاجز ہو۔

اس بنا پر نہ تو "جس بات کا اقتضاء ہو" وہ تمہارے اختیار میں ہے اور نہ ہی تم کسی کام کو روکنے کی قدرت رکھتے ہو۔ ان حالات میں تم سے کیا ہو سکتا ہے؟ حمد سے مراد اور جو کام تم کر سکتے ہو کر لو۔

اس ترتیب سے یہ دونوں آیتیں ایک ہی مطلب کا کھرا نہیں کرتیں۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک مسئلے کی ایک جہت کو بیان کر رہی ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں ان کم عقل مغروروں سے تحقیر کے طور پر ارشاد ہوتا ہے: یہ شکست خوردہ احزاب کا ایک چھوٹا سا لشکر ہیں (جند ما هنا لك مہزوم من الاحزاب)۔

"ہنا لك" کا معنی ہے "اُس جگہ" اور یہ بعید کے لیے اہم اشارہ ہے۔ اس بنا پر کچھ لوگ اسے جنگ بدر میں مشرکین کی شکست کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو مکہ سے کافی دور واقع ہوئی تھی۔

"احزاب کی تعبیر ظاہراً ان تمام گروہوں کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبروں کی مخالفت کیا کرتے تھے اور خزانے انھیں تباہ و برباد کر دیا مشرکین کی یہ چھوٹی سی جمیعت ان ہی گروہوں میں سے ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو انھیں کے سے انجام میں گرفتار ہوگا (اس بات کی گواہ آئندہ والی آیات میں جو اس مسئلے کی تصریح کرتی ہیں)۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ سورہ کی سورتوں میں سے ہے اور قرآن یہ گفتگو اس وقت کر رہا ہے جب مسلمان شدید اقلیت میں تھے:-

تخافون ان یتحطفکم الناس

اس طرح سے کہ ممکن تھا مشرکین انھیں ایک لقمہ کی طرح اچک لیں (انفال — ۲۶)

اس وقت مسلمانوں کی کامیابی کی کوئی نشانی نظر نہیں آتی تھی، اس وقت بدر، احزاب اور حنین کی کامیابی سامنے نہیں آئی تھی۔ لیکن قرآن کا طعنت اور دو لقمہ فیصلے کے طور پر کہہ رہا ہے کہ "یہ سخت دشمن ایک چھوٹا سا ایسا لشکر ہیں جو شکست سے دوچار ہو کر رہے گا۔

آج بھی قرآن دنیا کے سارے مسلمانوں کو جو ہر طرف سے ستاؤ اور ظالم طاقتوں کے محاصرے میں ہیں، یہی بشارت کے ساتھ کہتا ہے کہ اگر وہ بھی اپنے مسلمانوں کی طرح خدا کے حمد و بیان پر ڈٹ جائیں تو خدا بھی جنوذا احزاب کی شکست کے بارے میں اپنے دوسرے کو پورا کرے گا۔

۱۰ "ما" اور پورے جہنم زائد ہے جو تقییل کے لیے آیا ہے اور "جند" مبتدأ محذوف کی خبر ہے اور "مہزوم" خبر کے خبر ہے اور اس میں "ہم جند ما مہزوم من الاحزاب" ہمارے ہیں کا نظریہ ہے کہ اس جے میں کوئی چیز محذوف نہیں ہے اور "جند" مبتدأ اور "مہزوم" خبر ہے۔ لیکن یہاں نظر یہ زیادہ مناسب ہے۔

- ۳- كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ ۝
 ۱۳- وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ لَيْكَةِ ۚ أُولَٰئِكَ الْأَحْزَابُ ۝
 ۱۴- إِنَّ كُلَّ إِلَّا كَذَّبَ الرَّسُلَ فَحَقَّ عِقَابٌ ۝
 ۱۵- وَمَا يَنْظُرُ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ۝
 ۱۶- وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْنَآ قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ۝

ترجمہ

- ۱۲۔ ان سے پہلے قوم نوح و عاد اور صاحب اقتدار فرعون نے (ہمارے انبیاء کی) تکذیب کی۔
 ۱۳۔ نیز ثمود، قوم لوط اور اصحاب لیکہ (قوم شعیب) یہ وہ جماعتیں تھیں (کہ جو انبیاء کی تکذیب کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں)
 ۱۴۔ ان جماعتوں میں سے ہر ایک نے رسولوں کی تکذیب کی اور ان کے لیے عذاب الہی رُو بہ عمل آیا۔
 ۱۵۔ (اپنے ان اعمال کے سبب) ان لوگوں کو اس کے علاوہ کوئی توقع نہ تھی کہ ایک آسمانی صیغہ نازل ہو۔ ایسی صیغہ جس کے باعث لوٹنے کا کوئی راستہ نہ رہے (اور وہ سب کو نابود کر دے)
 ۱۶۔ انھوں نے (سرکشی کی بنا پر) کہا: پروردگار! اپنے عذاب میں سے روزِ حساب سے پہلے ہی ہمارا حصہ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں دے دے۔

تفسیر

صرف ایک آسمانی صیغہ کافی ہے

مذمتہ آیات میں سے سہری میں مشرکین کی شکست کی خبر دی گئی تھی۔ اس میں انھیں احزاب میں سے چھوٹا سا لشکر قرار دیا گیا ہے۔ اب زیر بحث آیات میں چند ایسے گروہوں کا ذکر ہے جو انبیاء کی تکذیب کرتے تھے اور ان میں ان کے بڑے انجام کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان سے پہلے قوم نوح و عاد اور صاحب اقتدار فرعون نے اللہ کی آیات اور ان کے رسولوں کو جھٹلایا (کذبت قبلہم قوم نوح و عاد و فرعون ذوالاوتاد)۔

اسی طرح قوم ثمود، قوم لوط اور اصحاب لیکہ (قوم شعیب بھی ایسے گروہ تھے جو اللہ کے رسولوں کی تکذیب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے) و ثمود و قوم لوط و اصحاب لایکہ (اولئک الاحزاب) یہ
 ہی ٹاں! یہ چھ گروہ زمانہ جاہلیت کی جماعتوں اور بت پرستوں کے سے تھے۔ انھوں نے اپنے عظیم انبیاء کے خلاف قیام کیا۔

- قوم نوح نے حضرت نوحؑ جیسے عظیم پیغمبر کے خلاف قیام کیا۔
 قوم عاد نے حضرت ہودؑ کے خلاف قیام کیا۔
 فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون کے مقابلے میں قیام کیا۔
 قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کے خلاف قیام کیا۔
 قوم لوط نے حضرت لوطؑ کے مقابلے میں قیام کیا۔
 اور اصحاب لایکہ نے حضرت شعیبؑ کے خلاف قیام کیا۔

ان قوموں نے جو کچھ ان کے بس میں تھا انبیاء اور اہل ایمان کے خلاف کیا ان کی تکذیب کی اور انھیں اذیتیں دیں لیکن انجام کار عذاب الہی انھیں دامن گیر ہوا اور خشک فصلوں کی طرح انھیں کاٹ کر رکھ دیا۔
 قوم نوح طوفان اور تباہ کن بارشوں سے نابود ہوئی۔
 قوم عاد زبردست اور چونک آندھی سے تباہ ہوئی۔
 فرعون اور اس کے ساتھی نیل کی موجوں میں غرق ہوئے۔
 قوم ثمود آسمانی بجلی کا شکار ہوئی۔

قوم لوط پر دھشت ناک زلزلہ آیا اور آسمانوں سے پتھروں کی بارش نازل ہوئی۔

قوم شعیب بھی موت آفریں بجلی کا شکار ہوئی کہ جو بادل سے ان کے سروں پر پڑی۔

گو یادہ لوگ پانی، ہوا، مٹی اور آگ جیسی چیزوں سے تباہ ہوئے کہ جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ ان سرکش ہانسیوں کا دفتر حیات یوں لپیٹ دیا گیا کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ لہذا ان مشرکین کو کبھی سوچ بچار کر لینا چاہیے کیونکہ ان قوموں کے مقابلے میں تو یہ ایک چھوٹے سے گروہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے لہذا یہ خوابِ غفلت سے بیدار کیوں نہیں ہوتے؟
 فرعون کے لیے ”ذوالاوتاد“ (مضبوط کٹے والے) کا لفظ آیا ہے۔ یہ ان آیات میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے مضبوط اقتدار کے لیے ایک طرح کی صراحت ہے۔ اسی طرح سورہ فجر کی آیہ ۱۰ میں بھی اس امر کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان قوموں سے ذریعہ نظر تعبیر دھڑلہ میں بھی استحکام اور مضبوطی کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: فلاں شخص کے کٹے مضبوط ہیں کیونکہ خیر اور خیر کی مضبوطی

۱۔ ”اولئک الاحزاب جملہ اور فرعون“ اولئک” ان چھ قوموں کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا ذکر ان دو آیتوں میں مذکور ہے ”احزاب“ انھی دو قبیل کی آیتوں میں مذکور احزاب کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں سے مشرکین کو چھوٹا سا گروہ شمار کیا گیا ہے۔

کے لیے مختلف طرح کے ٹکڑوں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

بعض نے اسے فرعون کی عظیم افواج کی طرف اشارہ سمجھا ہے کیونکہ فرج عام طور پر شیعوں سے کام لیتی ہے اور شیعوں کی منجورگی کے لیے ٹکڑوں اور ٹیوں وغیرہ سے استفادہ کرتی ہے۔

بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ فرعون نے لوگ اپنے مخالفوں کے خلاف بہت ہتھیار بھرتا تھا۔ ہتھیاروں سے قتل کرتے تھے۔ تختہ دار یا دیوار پر ان کے ماتھے پاؤں میں نیچیں ٹھونک دیتے تھے اور اسی عالم میں انہیں چھوڑ دیتے تھے یہاں تک کہ ان کی جان نکل جائے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "اقتاد" سے مراد "ابراہ" مصری ہیں کہ جو شیخ کی طرح زمین میں گڑے ہوئے ہیں اور چونکہ ابراہ فرعونوں کی خصوصیات میں سے ہیں اس لیے یہ صفت قرآن میں صرف انھی کے لیے آئی ہے۔

ابیر تمام احتمالات ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کے مفہوم میں سب معنی جمع ہوں۔

اصحاب الایکہ میں "ایک" کا معنی ہے درخت اور اصحاب الایکہ سے مراد حضرت شیخ کی قوم ہے۔ ان کا علاقہ حجاز و شام کے درمیان تھا اور اس میں پانی اور درختوں کی فراوانی تھی۔ اس ضمن میں ہم سورہ ہجر کی آیت ۸ کی تفسیر میں حسب ضرورت تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں (اس سلسلے میں قارئین جلد ۱ کی طرف رجوع کریں)۔

جی ہاں! ان میں سے ہر گروہ نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی اور اللہ کا غضب ان کے لیے رُعب عمل آگیا (ان کی کلی الاکذاب الرسول فحق عقاب)۔

تاریخ نشاندہی کرتی ہے کہ کس طرح ان میں سے ہر گروہ گرفتار ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے شہر و دیاروں اور کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے اور ان شہر کے باسی بے روح جم ہو گئے۔

مشرکین کو جو کام انجام دیتے ہیں ان کے ہوتے ہوئے کیا ان کا ان لوگوں سے بہتر انجام ہو سکتا ہے جبکہ ان کے اعمال بھی ویسے ہی ہیں اور اللہ کی سنت بھی وہی ہے۔

اس کے بعد ولی آیت میں قرآن ایک قاطع اور تہدید آمیز انداز میں کہتا ہے: یہ لوگ ان اعمال کے ہوتے ہوئے اس کے سوا کوئی توقع نہیں رکھ سکے کہ ایک آسمانی میجر آچینے، ایسا صبحہ کچھ لوٹنے کی گنجائش نرسے (و ما یبظنر ھو لاء الا صیحة واحدة ما لھامن فواق)۔

مکن ہے یہ صبحہ ویسی ہی جو صبحی گزشتہ اقوام پر نازل ہوتی رہی یعنی وحشت ناک صاعقہ یا زبردست آواز کے ساتھ زمین پر نازل ہوا زلزلہ ہو کہ جس کے ذریعے ان کی زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

نیز ممکن ہے یہ اس دنیا کے اختتام پر جو عظیم صبحہ ہوگی اس کی طرف اشارہ ہو کہ جس کے لیے پہلا صبحہ چھوٹے جانے کی

تفسیر استعمال ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے پہلی تفسیر پر تنقید کی ہے اور اسے سورہ انفال کی آیت ۲۲ کے مخالف قرار دیا ہے کہ جس میں فرمایا گیا ہے۔

وما کان اللہ لیعذب بہم و انت فیہم

جب تک کہ تو ان کے درمیان ہے اللہ ان پر عذاب نہیں کرے گا۔

لیکن اس امر کی طرف توجہ کی جائے تو یہ تفسیر درست معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین کا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس میں یہ استفادہ تھا اور ان کے اعمال بھی انھی قوموں کے سے تھے کہ جو صبحہ آسمانی کا شکار ہوئے لہذا ہو سکتا ہے کہ وہ ہر گروہ اسی قسم کے انجام کے انتظار میں رہیں کیونکہ آیت میں انتظار کے بارے میں گفتگو ہے (مخبر کیجئے گا)۔

بعض نے دوسری تفسیر پر بھی اعتراض کیا ہے کہ مشرکین عرب اس جہان کے اختتام کے وقت زندہ نہیں ہوں گے کہ وہ عظیم صبحہ ان کے دامن گیر ہو۔

لیکن یہ اعتراض بھی درست نہیں، اسی دلیل کے مطابق کہ جو بیان ہو چکی ہے کیونکہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ دنیا کب ختم ہو جائے گی اور قیامت کب آئے گی؟ لہذا ہو سکتا ہے کہ مشرکین ہر لحظہ اس عظیم صبحہ کے انتظار میں ہوں کہ جس کے لوٹ جانے کا امکان نہیں ملتا۔

ہر حال یہ جاہل لوگ آیات الہی کی تکذیب و انکار کے باعث، رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ناروا تہمتیں لگانے کی وجہ سے اور بت پرستی پر اپنی مہٹ دھرمی اور اصرار کے سبب اور ظلم و فساد کی وجہ سے گویا عذاب الہی کے انتظار میں ہیں۔ ایسا غضب کہ جو ان کے خرمین جہات کو جلا کر رکھ دے گا یا ایسے صبحہ کے انتظار میں ہیں کہ جو اس دنیا ہی کو ختم کر دے گی اور انہیں ایسے راستے پر لے جائے گی کہ جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔

"فواق" (بروزن "رواق") بہت سے اہل لغت اور اہل تفسیر کے نزدیک پستان سے دوسرے دودھ دہنے کے درمیانی فاصلے کو کہتے ہیں کیونکہ ایک مرتبہ اگر دودھ دوہ لیا جائے تو پھر دودھ دہنے کے لیے کچھ صبر کرنا ہوگا تاکہ پھر سے دودھ پستان میں جمع ہو جائے۔

بعض اسے دودھ دہنے وقت انگلیاں کھولتے اور بند کرتے ہوئے ان میں جو فاصلہ پیدا ہوتا ہے اس کے معنی میں لیتے ہیں۔ نیز دودھ جب دوہ لیا جاتا ہے تو پستان کو ایک طرح سے آرام آجاتا ہے۔ لہذا یہ لفظ آرام و راحت کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔

نیز جو کہ یہ فاصلہ پستان میں دودھ پھر سے آجانے کا باعث بنتا ہے، لہذا یہ لفظ بازگشت، واپسی اور رجوع کے معنی میں بھی

ملے۔ یہ بات مفسرین نے اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ اس سے ٹراد صبحہ ثانی کہ جو مردوں کے زندہ ہونے اور حالت الہی میں ان کے پیش ہونے کے لیے ہوگی، تو بہت بعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ بات تو بہت بعد والی آیت سے ہم آہنگ ہے اور یہی آیت کی آیات سے (مخبر کیجئے گا)۔

۱۰ "فحق عقاب" دراصل رسول کے مطابق "فحق عقابی" تھا۔ یاد رکھو کہ اس پر دلالت کرنے والی زیر باقی رہ گئی۔ "حق" اصل ہے اور عقاب اس کا نامل ہے۔ یعنی "میرا عقاب ان کے بارے میں ثابت ہو گیا ہے"۔

استعمال ہوتا ہے۔ اسی بنا پر بیماری کی صحت اور ٹھیک ہو جانے کو "افاقہ" کہتے ہیں۔ کیونکہ سلامتی اور تندرستی اس کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ نیز بے ہوشی کے ہوش میں آ جانے اور یوں لے کے مائل ہو جانے کو بھی "افاقہ" کہتے ہیں۔ کیونکہ ہوش اور عقل ان کی طرف لوٹ آتی ہے۔

بہر حال اس وحشت ناک صیر میں کسی قسم کی بازگشت، راحت و آرام اور سکون نہیں ہے اور جب وہ رُوبہ عمل آئی تو پھر فرسادی کے لیے سب دروازے بند ہو جائیں گے۔ پھر نہ پشیمانی فائدہ دے گی، نہ تلافی کا کوئی امکان ہوگا اور نہ ہی داد و نسیب یاد کی گیسو رسائی ہوگی۔

آخری زیر بحث آیت میں کافروں اور منکروں کی کچھ اور باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو وہ تفسیر کے طور پر کرتے تھے ارشاد ہوتا ہے: انھوں نے کہا پروردگار! روزِ حساب سے پہلے ہی اپنے مذاب میں سے ہمارا حصہ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں دے دے (و قالوا ربنا عجل لنا قسطنا قبل یوم الحساب)۔

یہ دل کے اندر مغرور اسی طرح باوہ غرور میں برست تھے حتیٰ کہ مذابِ الہی اور اس کی عدالت کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ مذاب کے ہمارے حصے میں کیوں تاخیر ہو گئی ہے؟ کیوں خدا ہمارے حصے میں جلدی نہیں کرتا؟

گزشتہ قوموں میں بھی ایسے بکے ذہن والے اور خود غرض کم نہ تھے لیکن جب وہ مذابِ الہی میں پھنستے تو جانوروں کی طرح چلاتے اور بلبلا تے مگر پھر کوئی ان کی فریاد کو نہ پہنچتا۔

"رظ" (بروزن "جن") دراصل ایسی چیز کے معنی میں ہے جو عرض میں کاٹی جائے جبکہ "تد" (اسی وزن پر) اس چیز کے معنی میں ہے جو طول میں کاٹی جائے۔ چونکہ ہر شخص کا معین حصہ گویا قطع شدہ اور کاٹی ہوئی چیز ہے لہذا یہ لفظ حصے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

کبھی یہ لفظ اس کا مذکے معنی میں بھی آتا ہے جس پر کچھ لکھتے ہیں یا اس میں لوگوں کے نام اور ان کے انعامات لکھتے ہیں۔

اسی لیے زیر بحث آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا ہے، کہ مراد یہ ہے:

"خداوند! ہمارا نامہ اعمال روزِ جزا سے پہلے ہمارے ہاتھ میں دے دے"

یہ بات انھوں نے اس وقت کی جب آیاتِ قرآنی نے خبر دی کہ قیامت کے دن ایک گروہ کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور دوسرے گروہ کا اعمال نامہ ان کے بائیں ہاتھ میں ہوگا۔

۱۵ بعض اہل لغت نے "فسواق" اور "فسواق" میں فرق کیا ہے۔ جب کہ بعض دونوں کا ایک ہی معنی سمجھتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے مغزاتِ رافضی، تفسیر روح المعانی، تفسیر فراتین رازی، تفسیر ابو الفرج اور تفسیر قرطبی اور دیگر منابع لغت کی طرف رجوع کریں۔

انھوں نے گویا تفسیر کے طور پر کہا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اسی وقت ہمارا نامہ اعمال ہمیں دے دیا جاتا تاکہ ہم پڑھ کر دیکھتے کہ ہم کس کھاتے میں ہیں؟

بہر حال جمالت اور غرور دونوں ہی نہایت قبیح اور مذموم صفات ہیں کہ جو عام طور پر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔ جاہل مغرور ہوتے ہیں اور مغرور جاہل ہوتے ہیں اور ان دونوں صفات کے آثار زمانہ جاہلیت کے مشرکین میں بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔

۱۷- اِصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدًا نَادَاوُدَ ذَا الْاٰیٰتِ اِنَّهٗ
اَوَابٌ ۝

۱۸- اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاشْرَاقِ ۝

۱۹- وَالطَّيْرَ مُحْشُوْرَةً كُلٌّ لَّهٗ اَوَابٌ ۝

۲۰- وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَاٰتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ الْخِطَابِ ۝

ترجمہ

۱۷- وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کر اور ہمارے با اقتدار بندے داؤد کو یاد کر کہ جو توبہ کرنے والا ہے۔

۱۸- ہم نے پہاڑ اس کے لیے مسخر کر دیئے کہ جو صبح و شام اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔

۱۹- تمام پرندے بھی ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیئے (تاکہ وہ اس کے ہمراہ خدا کی تسبیح کریں) اور یہ سب اس کی طرف بازگشت کرنے والے ہیں۔

۲۰- اور اس کی حکومت کو ہم نے استحکام بخشا ہے ہم نے علم عطا کیا اور عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا بھی۔

تفسیر

داؤد کی زندگی سے درس حاصل کریں

حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے بزرگ انبیاء میں سے تھے انھیں اللہ نے ایک عظیم حکومت عطا کی تھی۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں ان کے بلند مقام کی تعریف کی گئی ہے۔ گزشتہ آیات میں مشرکین اور بت پرستوں کی زیادتیوں کا ذکر تھا۔ یہ سننا ناروا تہمتوں کا بیان تھا جن کی نسبت وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد اب قرآن رسول اکرم اور آپ کے زمانے کے مومنین کی دل جوئی کے لیے حضرت داؤد کی داستان بیان کر رہا ہے۔ وہ داؤد کو جنھیں اللہ نے اس قدر اقتدار بخشا یہاں تک کہ پہاڑوں اور پرندوں کو ان کے لیے مسخر کر دیا تاکہ اس امر کی نشاندہی کرے کہ جب اس کا لطف و کرم کسی شخص کے شامل حال ہو تو پھر دشمنوں کی کثرت کچھ نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ عظیم نبی بھی اس ظاہری اقتدار کے باوجود لوگوں کی زبان کے چرکوں سے محفوظ رہے تھے لہذا یہ صورت حال رسول اسلام کے لیے تسلی و تسخنی کا باعث ہونا چاہیے کہ جس کیفیت سے وہ دو چار ہیں یا انھی میں خصوصیت ہے

یہ کہ اس دنیا کے عظیم لوگ اس امر میں ان کے شریک رہے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر اختیار کر اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کر جو با اقتدار بھی تھا اور بہت زیادہ توبہ کرنے والا بھی (اصبر علی ما یقولون واذکر عبدنا داؤد ذالایات اِنَّہ اواب)۔

”اید“ قدرت کے معنی میں بھی آیا ہے اور نعمت کے معنی میں بھی اور حضرت داؤد دونوں معانی کے لحاظ سے ”ذالاید“ تھے۔ ان کی جہانی طاقت کا یہ عالم تھا کہ جب بنی اسرائیل کا ایک ظالم حکمران جاہلوت میدان جنگ میں آپ کے مقابل آیا تو آپ نے آرزنگ اندازی سے اس قوت سے پتھر پھینکا کہ جاہلوت گھوڑے کی پشت سے زمین پر آرا اور اپنے خون میں ٹوٹنے لگا۔ بعض نے لکھا ہے کہ پتھر نے اس کا سینہ چیر دیا اور دوسری طرف نکل گیا۔

”دوسری طرف آپ کے سیاسی اقتدار کا یہ حال تھا کہ ایک طاقتور حکومت آپ کے ماتھے میں تھی اور آپ پوری طاقت دشمنوں کے مقابلے میں کھڑے ہوتے تھے۔ ملہا نے یہاں تک کہا ہے کہ آپ کے عہد عبادت کے چاروں طرف ہزار افراد شام سے صبح تک تیار کھڑے رہتے تھے۔

نیز آپ کی روحانی، اخلاقی اور عبادی طاقت کا یہ عالم تھا کہ رات کا ایک بڑا حصہ بیدار رہتے اور پروردگار کی عبادت میں مشغول رہتے اور سال بھر کے آدھے ایام روزے میں گزارتے۔

نعمتوں کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو طرح طرح کی ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا کر رکھی تھیں۔

خاصہ یہ کہ حضرت داؤد ایک ایسی شخصیت تھے کہ جنگ میں، عبادت میں، علم میں اور حکومت میں بہت قوی تھے اور انھیں فراوان نعمتیں حاصل تھیں یہ

”اواب“، ”اوب“ (بروزن ”قول“) کے مادہ سے کسی چیز کی طرف اختیاری طور پر لوٹنے کے معنی میں ہے ”اواب“ چونکہ مہلنے کا صیغہ ہے لہذا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ پروردگار کی طرف بہت زیادہ لوٹنے والے اور بازگشت کرنے والے تھے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی غفلت اور ترک اولیٰ پر توبہ کرتے تھے۔

قرآن مجید اجمال کے بعد تفصیل کی اپنی خاص روش کے مطابق اب حضرت داؤد پر نعمت الہی کی کچھ تفصیل بیان کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اس کے لیے پہاڑ مسخر کر دیئے، اس طرح سے کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح خدا کرتے تھے (انما سخننا الجبال معہ یسبحن بالعشی والاشراق)۔

ملہ ”اید“ کی جگہ ہے کہ جو ”نہت“ کے معنی میں ہے۔ ماتھے پر جو کہ طاقت، عطائے نعمت اور اقتدار و حکومت کا مظہر ہے اس لیے یہ لفظ ان تمام معانی میں مستعمل ہوتا ہے۔ ”معہ“ ہو سکتا ہے ”یسبحن“ کے متعلق ہو۔ اس لحاظ سے یہ لفظ حضرت داؤد کے ساتھ پہاڑوں کے ہم آواز ہونے کو بیان کرتا ہے۔ سورہ سبا کی آیت ۱۰ میں بھی ہے۔

یا جبال اقبی معہ

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ”سخننا“ سے متعلق ہو اس صحت میں غلطی کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کیا۔ لیکن ”لہ“ کے بجائے ”معہ“ کا آنا بہت بیان کرنے کے لیے ہے کہ یہ تسبیح میں ہم آواز ہونے کے بارے میں تھی۔

صرف پہاڑ بیکر سب پرندے بھی اس کے لیے مسخر کر دیئے تاکہ ہمیشہ اس کے ہمراہ اللہ کی تسبیح کریں (والطیر محشور)
یہ سب پرندے اور پہاڑ حکیم داؤد کے مطیع تھے، اس کے ساتھ ہم آواز تھے اور اس کی طرف بازگشت کرنے والے تھے
(کل لہ اواب)۔
”لہ“ کی ضمیر ممکن ہے داؤد کی طرف لوٹی ہو۔ اگر یوں ہو تو جملے کا مفہوم دی ہوگا جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ البتہ
احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ ضمیر اللہ کی ذات پاک کی طرف لوٹی ہو یعنی تمام ذرات عالم اس کی طرف لوٹتے ہیں اور اس کے
کے سامنے سرنگوں ہیں۔

مفسرین کی اس سلسلے میں مختلف آراء ہیں کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داؤد کے ساتھ کس طرح ہم آواز تھے اور اس کی کیفیت
کیا تھی؟ ان آراء کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی دلکش، جاذب اور دل گداز آواز تھی کہ جو پہاڑوں پر اثر انداز ہوتی تھی اور پرندوں
اپنی طرف کھینچ لیتی تھی (لیکن کوئی ایسی اہم فضیلت نہیں کہ قرآن لے اس اہمیت کے ساتھ ذکر کرے)
۲۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تسبیح ظاہری آواز کے ساتھ ساتھ ایک طرح کے ارکاد و شور کے ہمراہ تھی کہ جو ذرات عالم کے باطن میں
ہے۔ اس نظریے کے مطابق تمام موجودات عالم ایک قسم کی عقل اور شور کے حامل ہیں اور جب یہ موجودات اس عظیم پیغمبر کی مناجات
وقت دل ایگزٹاؤڈ سننے تھے تو ان کے ساتھ ہم آواز ہوجاتے اور یوں سب باہم مل کر تسبیح کرتے۔

۳۔ بعض نے اس احتمال کا ذکر بھی کیا ہے کہ یہ تسبیح کوئی قسم کی عقل اور شور کے حامل ہیں اور جب یہ موجودات اس عظیم پیغمبر کی مناجات
اس امر کی بخوبی حکایت کرتا ہے کہ اللہ ہر عیب سے پاک و منزہ ہے اور علم و قدرت اور ہر قسم کی صفات کمال کا حامل ہے۔
لیکن یہ بات حضرت داؤد کے ساتھ مخصوص نہیں کہ اسے ان کی خصوصیات میں سے شمار کیا جائے۔ اس لحاظ سے مناسب تر
دوسری تفسیر ہے اور یہ امر قدرت الہی سے بعید نہیں ہے۔ یہ ایک ذمہ تھا کہ جو ان موجودات عالم کے اندر اور ان کے باطن میں ہمیشہ
سے جاری تھا لیکن خدا نے قوت اعجاز سے اسے حضرت داؤد کے لیے ظاہر کیا جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسبیح
سنگریزوں کا تسبیح کرنا مشہور ہے۔

اگلی آیت میں بھی حضرت داؤد پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر جاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اس کے نظام حکومت کا
بجٹا (وشددنا مملکہ)۔ اس طرح سے کردہ ہر باطنی و سرگوش دشمن کا حساب چمکتے۔ اس کے علاوہ ”ہم نے اسے علم
حکمت عطا کی (واتیناہ الحکمة)۔“

وہی حکمت کہ جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا

جس شخص کو حکمت مل گئی اُسے خیر کثیر مل گئی۔ (البقرہ — ۲۶۹)

اس مقام پر ”حکمت“ علم و دانش اور حکومت چلانے کی صلاحیت یا مقام نبوت کے معنی میں ہے یا پھر ان تمام مفاد میں
جامع ہے۔ ”حکمت“ کبھی علمی پہلو کی حامل ہوتی ہے کہ جب اسے ”معارف عالیہ“ کہا جاتا ہے۔ کبھی یہ عملی پہلو کی حامل ہوتی ہے کہ

صورت میں اسے ”اخلاق اور عمل صالح“ سے تعبیر کرتے ہیں اور حضرت داؤد علیہ السلام ان سب سے خوب بہرہ مند تھے۔
حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی آخری عظیم نعمت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے علم قضاوت اور صحیح دلائل
رہنے کا علم عطا کیا (وفصل الخطاب)۔

قضاوت و عدالت کو ”فصل الخطاب“ سے اس بنا پر تعبیر کیا گیا ہے کہ ”خطاب“ سے مراد طرفین مقدمہ کی گفتگو ہے
فصل“ قطع کرنے اور عدالتی کے معنی میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فریقین کی گفتگو بھی متقطع ہوگی جب ان کے درمیان صحیح فیصلہ ہو
لے لہذا یہ تعبیر عادلانہ فیصلے کے معنی میں آئی ہے۔

احتمالاً اس سے مراد بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے حضرت داؤد کو قوی منطق عطا فرمائی ہو کہ جو بلند فکر اور گہری فکر کی ترجمان تھی۔
لہذا صرف یہ کہ فیصلہ کرتے ہوئے بلکہ ہر مقام پر آپ کی بات آخری اور حتمی ہوتی تھی۔

واقعاً جب اللہ تعالیٰ یہ قدرت رکھتا ہے کہ ایک اہل انسان کو اس قدر قوت و توانائی عطا فرمادے تو پھر اس بات کی گنجائش
ہے کہ کوئی شخص اس کے لطف و کرم سے مایوس ہو جائے۔ لہذا یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے ان مومنین ہی کے
لئے نسلی اور دل جوئی کا باعث نہیں کہ جو کرم میں سخت دباؤ میں تھے بلکہ ان تمام مومنین کے لیے تسلی خاطر کا پیغام ہے کہ جو مختلف نعمتوں میں
بیخون اور مشکلات کا شکار ہوں۔

حضرت داؤد کی اہم صفات

بعض مفسرین نے مذکورہ بالا چند آیات سے حضرت داؤد کو حاصل دس عظیم نعمتیں اخذ کی ہیں کہ جو اللہ کے اس نبی کو خدا تعالیٰ نے
اس سے حاصل کیں۔ یہ نعمت آپ کے بلند مرتبہ کی ترجمان ہیں۔ یہ دراصل ایک کامل انسان کی خصوصیات کو بھی واضح
تی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلام کہ جو اس قدر عظیم مقام رکھتے تھے اس کے باوجود آپ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ صبر و شکیبائی میں حضرت داؤد کی
راہ کریں اور ان کی تاریخ حیات سے ملگ حاصل کریں (اصبر علی ما یقولون واذکر)۔

۲۔ حضرت داؤد کے مقام عبودیت کی توصیف کی گئی ہے۔ دراصل یہ ان کی پہلی خصوصیت کے طور پر شمار کی گئی ہے
عبدنا داؤد)۔

پیغمبر اسلام کے واقعہ معراج کے ذکر میں آپ کے لیے بھی یہ تعبیر آئی ہے۔

سبحان الذی اسرّی بعبدہ۔۔۔۔۔

پاک و منزہ ہے وہ ذات کہ جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا۔ (بنی اسرائیل — ۱)

۳۔ اطاعت الہی، گناہ سے پرہیز اور امور مملکت چلانے میں وہ بہت قوی تھے (ذا الایمان)۔ جیسا کہ پیغمبر اسلام
اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بھی ہے۔

هو الذی ایتدک بنصرہ و بالمومنین

وہ وہی جس نے اپنی مدد اور مومنین کے ذریعے تیری تقویت کی۔ (انفال — ۶۲)

۴۔ انھیں "اواب" کہہ کر ان کی توصیف کی گئی ہے۔ جس کا معنی ہے بار بار لوٹنے والا اور پے درپے درپے رجوع کرنے یعنی خداوند عالم کی ساحت قدس کی طرف رجوع کرنے والا (انہ اواب)۔

۵۔ صبح و شام تسبیح کرنے میں پہاڑ بھی ان کے لیے سخر ہیں۔ اس بات کو بھی قرآن ان کا اعزاز و افتخار شمار کرتا ہے (اننا سخرنا الجبال معہ یسبحن بالعشی والاشراق)۔

۶۔ پرندے بھی اللہ کی عبادت و تسبیح میں ان کے ہم آواز ہیں اور یہ بھی ان کے لیے خدا داد نعمتوں میں سے ہے (والطیر محشورۃ)۔

۷۔ آغاز ہی میں ان کے ہم آواز نہ تھے بلکہ جب بھی وہ تسبیح خدا کی طرف پلٹے وہ ان کے ساتھ ہم صدا ہوجاتے (کل لہ اواب)۔

۸۔ اللہ نے انھیں ایک حکومت دی کہ جس کی بنیاد اس نے مستحکم کی ہوئی تھی اور اس مقصد کے لیے مادی و روحانی وسائل ان کے اختیار میں دے رکھے تھے (و شد دنا ملکہ)۔

۹۔ ایک اور ہم خدا داد سرمایہ ان کے پاس بہت زیادہ علم و دانش کی صورت میں تھا۔ ایسا علم و دانش کہ جہاں بھی جو خیر کثیر کا سرچہ ہوتا ہے اور برکت و برکت کا منبع ہوتا ہے (و اتیناہ الحکمۃ)۔

۱۰۔ قوی منطق، اثر آفرین کلام اور قاطع و عادلانہ فیصلے کی طاقت بھی انھیں عطا کی گئی تھی (وفصل الخطاب)۔

واقعاً کسی حکومت کی بنیادیں علم، طاقت، منطق، تقوائے الہی، ضبط نفس اور عبودیت پروردگار کے بغیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔

۲۱۔ وَهَلْ أَمَّاكَ نَبُؤُا الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۝

۲۲۔ إِذْ دَخَلُوا عَلٰی دَاوُدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَخَفْ خَصْمِینَ بَغِي بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ فَا حُكْمٌ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تَشْطَطْ وَاهْدِنَا اِلٰی سَوَآءِ الصِّرَاطِ ۝

۲۳۔ اِنَّ هٰذَا اَنْحٰی لَهٗ تَسْعَ وَتَسْعُوْنَ نَعَجَةً وَّلٰی نَعَجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ الْفَلْنِیْہَا وَعَزَّنٰی فِی الْخِطَابِ ۝

۲۴۔ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعَجَتِكَ اِلٰی نِعَاجِہٖ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ وَاقِلْ لِّمَا هُمْ وَّظَلْنَ دَاوُدَ اَنْتَ مَا فَتْنٰہُ فَاَسْتَغْفِرْ رَبَّہٗ وَحَرِّرَا الْعَا وَاَنَا ۝

۲۵۔ فَغَفَرْنَا لَہٗ ذٰلِکَ وَاِنَّ لَہٗ عِنْدَنَا لَ لُزْفٰی وَحَسْنَ مَا یٰ ۝

ترجمہ

کیا تجھے تک شکایت کرنے والوں کی داستان پہنچی ہے کہ جو (داؤد کے) محراب سے اوپر گئے تھے؟

جس وقت (بغیر کسی اطلاع کے) وہ اس کے پاس آ پہنچے اور وہ انھیں دیکھ کر گھبرا گیا تو انھوں نے کہا:

ڈر نہیں ہم دونوں شکایت لے کر آئے ہیں کہ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ اب تو ہمارے درمیان حق فیصلہ کر دے اور کوئی زیادتی نہ ہونے دے اور راہِ راست کی طرف ہماری ہدایت کر۔

یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے بھیڑیل ہیں اور میرے پاس ایک سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس کا اصل ہے کہ وہ بھی مجھے دے ڈال اور گفتگو میں مجھے دباتا ہے۔

۲۲۔ (داؤد نے) کہا: تیری ایک بھیڑ کا تقاضا کرنے کے لیے اس نے ظلم کیا ہے اور بہت سے دوست ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں سو ان کے کہ جو ایمان لائے نیک اعمال کرتے ہیں مگر ان کی تعداد تھوڑی ہے۔ داؤد نے خیال کیا کہ ہم نے اسے (اس واقعے سے) پس اس نے اپنے رب سے بخشش چاہی اور سجدے میں گر پڑا اور اس نے توبہ کی۔

۲۵۔ ہم نے اس کا یہ کام بخش دیا اور وہ ہمارے مابین مقام بند اور نیک انجام کا حامل ہے۔

تفسیر

حضرت داؤد کی ایک آزمائش

ان آیات میں حضرت داؤد کے فیصلہ کرنے کے بارے میں سادہ اور واضح گفتگو کی گئی ہے۔ اس ضمن میں جو تحریفات اور تعبیرات کی گئی ہیں ان کے باعث لا شعوری طور پر مستشرقین کے درمیان ایک بڑا نزاع پیدا ہوا ہے اس پر اس قدر شور و غوغا ہے کہ بعض مسلمان مستشرقین بھی اس کی زد میں آگئے ہیں اور انھوں نے اس عظیم نبی کے بارے میں غلط اور نہیں کہیں بہت ناروا فیصلے کیے ہیں۔

ہم سب سے پہلے بغیر کسی تشریح کے آیت قرآنی کا متن پیش کرتے ہیں۔ تاکہ قارئین غالی ذہن کے ساتھ آیات کو سمجھ سکیں۔

گذشتہ آیات میں حضرت داؤد علیہ السلام کو خاص صفات بیان کی گئی تھیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا ذکر تھا اس کے اب دادری اور قضاوت کے سلسلے میں حضرت داؤد کو پیش آنے والے ایک واقعے کا تذکرہ ہے۔

پہلے بغیر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: کیا داؤد کی دیوار اطراف سے اوپر جانے لگی تھی؟

شکایت کنندگان کا واقعہ یہ تھا کہ (وہل اتاک نبوا الخصم اذ تسوموا المحراب)۔

”خصم“ کا اصل مصدری معنی ہے اس کا معنی ہے نزاع اور جھگڑا کرنا لیکن ایسا بہت ہوتا ہے کہ جھگڑنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں مقام ہم کے لیے بولا جاتا ہے اور کبھی اس کی جمع ”خصوم“ بھی آتی ہے۔

”تسودوا“ ”سود“ کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے ایسی دیوار جو گھر یا شہر کے اطراف پر محیط ہو۔ لیکن توجہ سے مادہ واصل چھلانگ لگانے اور اوپر جانے کے معنی میں ہے۔

”محراب“ ”صدر مجلس“ (مجلس کے نمایاں ترین مقام) یا اوپر والی منزل کے کمروں کے معنی میں ہے اور چونکہ ”مقام“ اس میں بنایا جاتا تھا۔ لہذا آہستہ آہستہ یہ لفظ ”معد“ (عبادت خانہ) کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ روزمرہ میں یہ لفظ سے اس مقام کے لیے استعمال ہونے لگا جہاں امام جماعت قیام نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ مفردات میں منقول ہے کہ ”محراب“

یہ ”محراب“ کہا جاتا ہے جو کہ شیطان اور ہوائے نفس سے جنگ کی جگہ ہے۔

ہر حال حضرت داؤد علیہ السلام کے ارد گرد اگرچہ بہت سے محافظین موجود تھے تاہم دو آدمی ایک جھگڑنے کے سلسلے میں امام سے بہت کر محراب اور دیوار قصر سے اوپر آئے اور چائیک آپ کے سامنے آدھکے۔ جیسا کہ قرآن حکیم اس گت کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: وہ چائیک داؤد کے سامنے آنکھلے (بغیر کسی اطلاع کے اور بغیر کسی اجازت کے) لہذا ان پر نظر پڑی تو داؤد وحشت زدہ ہوئے اور گھبرائے کیونکہ انھیں خیال ہوا کہ ہوسکتا ہے ان لوگوں کا ان کے بارے میں غلط ارادہ ہو (اذ دخلوا علی داؤد فھزع منهم)۔

لیکن انھوں نے بہت جلد آپ کی پریشانی دُور کرتے ہوئے کہا: ڈریں نہیں، ہم دونوں ایک شکایت لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے اور ہم آپ کے پاس داورسی کے لیے آئے ہیں (قالوا لا تخف خصمان بغی بعضنا علی بعض)۔

اب آپ ہارے ہارے میں حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور ظلم روا نہ رکھیں اور راوراست کی طرف ہماری ہدایت کریں (فاحکم بیننا بالحق ولا تشطط واهدنا الی سوا الصراط)۔

”شطط“ ”شطط“ (بروزن ”فقط“) کے مادے سے دراصل زیادہ دُوری کے معنی میں ہے۔ ظلم چونکہ انسان کو حق سے بہت دُور کر دیتا ہے اس لیے لفظ ”شطط“ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح جو بات حقیقت سے دُور ہو یہ لفظ اس کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ اس مقام پر حضرت داؤد کی پریشانی اور وحشت کم ہو گئی لیکن شاید ایک سوال ان کے ذہن میں ابھی باقی تھا، بہت اچھا، تمہارا کوئی غلط ارادہ نہیں ہے، تم صرف قاضی کے پاس شکایت لے کر آئے ہو لیکن اس خلاف معمول رستے سے آنے کا مقصد؟

لیکن انھوں نے حضرت داؤد کو زیادہ موقع نہ دیا۔ ایک نے شکایت کرنے میں پہل کی، کہنے لگا: یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس تنازعے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک سے زیادہ نہیں، لیکن یہ اصرار کرتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دے دے، گفتگو میں یہ

بھرا بھاری ہے اور مجھ سے زیادہ باتونی ہے (ان ھذا اخیلہ تسع وتسعون نعجة ولی نعجة واحدة فقال

الکلبیہا وعزنی فی الخطاب)۔

”نعجة“ ”بھیڑ“ کے معنی میں ہے۔ جنگلی گائے اور پہاڑی بھیڑ کو بھی ”نعجة“ کہتے ہیں۔

”الکلبیہا“ ”کفالت“ کے مادے سے ہے۔ یہاں دے دینے کے مفہوم میں ہے (معنی یہ ہے کہ اس کی کفالت میرے پر کرنے) ”عزنی“ ”عزت“ کے مادہ سے ”غلبہ“ کے معنی میں ہے۔ یہاں اس لفظ کا معنی ہے ”اس نے مجھ پر غلبہ کیا ہے“۔

آیات قرآنی سے ظاہری طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد نے دوسرے فریق کی بات سنے بغیر شکایت کرنے والے سے کہا: ”اپنی بھیڑوں میں تیری بھیڑ کا اضافہ کرنے کے لیے اس نے تقاضا کر کے ظلم روا رکھا ہے“ (قال لقد ظلمک بسؤال

لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں " بہت سے دوست اور ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں (وان کثیرا من الخلقاء لیبعی بعضہم علی بعض) لہذا ان کے کہ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے عمل کیے ہیں (آل الذین آمنوا وعملوا الصالحات) " لیکن وہ بہت بخیر ہیں " (وقلیل ما ہم)۔

جی ہاں! معاشرت اور دوستی میں دوسروں کے حق کا لحاظ رکھنے والے اور اپنے دوستوں پر ذرہ بھر بھی زیادتی نہ کرنے والے افراد بہت کم ہیں۔ اپنے دوستوں اور جاننے والوں کا حق پورے عمل و انصاف سے وہی ادا کر سکتے ہیں جو ایمان اور عمل صالح خوب برہ مند ہیں۔

بہر حال یوں لگتا ہے کہ طرفین یہ بات سن کر مطمئن ہو گئے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ماں سے پچھلے گئے۔ لیکن داؤد دوسروں میں پڑ گئے۔ انہوں نے فیصلہ تو عدل کی بنیاد پر کیا تھا کیونکہ اگر فریق ثانی کو مدعی کا دعویٰ قبول نہ ہوتا تو یقیناً وہ اعتراض کرتا۔ اس سکوت اس امر کے لیے بہترین دلیل تھا کہ معاملہ وہی ہے جو شکایت کرنے والے نے پیش کیا ہے لیکن ان سب امور کے باوجود عدلیہ اقدار کا تقاضا تھا کہ داؤد اپنی بات میں جلدی نہ کرتے بلکہ فریق ثانی سے بھی شخصاً سوال کرتے اور پھر فیصلہ سنانے۔ لہذا اس کام پر وہ پشیمان ہوئے اور داؤد نے گمان کیا کہ اس واقعے کے ذریعے ہم نے اس کا امتحان لیا ہے (وظن داؤد انما افتتھا)۔

اس نے استغفار کی، اپنے رب سے طلب بخشش کی، سجدے میں گر گیا اور توبہ کی سزا مستغفر ربہ و عنقہ را کعاً وانا ب)۔

"حق" "خیر" کے مادے سے آواز کے ساتھ ہندی سے گننے کے معنی میں ہے جیسے آواز کی آواز ہوتی ہے۔ ہمہ کرنے والے افراد چونکہ ہندی سے بچنے آتے ہیں اور سجدہ کرتے ہوئے سجدہ کرتے ہیں لہذا یہ تعبیر سجدہ کرنے کے لیے کنائے کے طور پر آئی ہے۔

"راکعاً" اس آیت میں یا تو اس بنا پر ہے کہ "رکوع" بھی ٹہنت میں سجدے کے معنی میں آیا ہے یا پھر اس لیے کہ رکوع سجدے کے لیے مقدمہ ہے۔

بہر حال اللہ نے ان پر اپنا لطف و کرم کیا اور اس ترک اولیٰ میں ان کی لغزش کو معاف کر دیا۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے: ہم نے اس کے عمل کو بخش دیا (فغفرنا لہ خالک)۔

اور وہ ہمارے نزدیک عالی مقام اور نیک مستقبل کا حامل ہے (وانا لہ عندنا لزل لقی وحسن مآب)۔
"زلقی" کا معنی ہے "مقام" (اور بارگاہ الہی میں قرب) اور "حسن مآب" بہشت کی اور اخروی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے۔

۱۔ "خلطاء" "خلیطہ" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ایسے اشخاص یا ایسے امور جو ایک دوسرے سے مخلوط ہیں۔ نیز وہ صفت، شریک اور ہمایہ پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ ظلم زیادتی اگرچہ صوف ان ہی سے نہیں ہوتی لیکن ان کا خصوصی ذکر بلا اس بنا پر ہے کہ ایک دوسرے سے مل جوں رکھنے سے لین دین کے بہت سے معاملات پیدا آتے رہتے ہیں یا اس بنا پر ہے کہ انہوں، دوستوں، عزیزوں اور ہمسایوں سے ظلم کی توقع نہیں ہوتی۔

۲۔ جملہ ترکیب یوں ہے "م" مبتداء "قیل" اس کی خبر "ما" مآذہ ہے کہ جوہاں کی اور وقت کے بائیں کے لیے آیا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ داؤد کو پیش آمدہ واقعے کی حقیقت، قرآن مجید سے جو کچھ معلوم ہوتا وہ اس سے زیادہ نہیں کہ کچھ افراد دعا دعویٰ کے لیے حضرت داؤد کی محراب سے ادر چڑھ کر آپ کی خدمت میں پہنچے۔ پہلے تو آپ گھبرا گئے۔ پھر شکایت کرنے والے کی بات سنی۔ ان میں سے ایک کے پاس ننانوے بیڑوں تھیں، دوسرے کے پاس صرف ایک بھیر تھی۔ ننانوے بیڑوں والا اپنے بھائی پر زور دے رہا تھا کہ وہ ایک بھیر بھی لے دے۔ آپ نے شکایت کرنے والے کو پتہ چلا دیا اور دوسرے کے اصرار کو ظلم قرار دیا۔ پھر اپنے کام پر پشیمان ہوئے اور اللہ سے حلفی کا تقاضا کیا۔ خدا نے آپ کو بخش دیا۔

یہاں دو تعبیر زیادہ طور طلب ہیں۔ ایک آزمائش اور دوسری استغفار اور توبہ۔ اس سلسلے میں قرآن نے کسی واضح امر کی نشاندہی نہیں کی۔ لیکن زیر نظر آیات اور ان آیات کی تفسیر کے سلسلے میں منقول روایات میں موجود قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد تقاضات میں بہت زیادہ علم و مہارت رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ آپ کو آزمائے لہذا آپ کو ایسے غیر معمولی حالات پیش آئے (مثلاً ان آدمیوں کا عام راستے سے بہت کر محراب کے اوپر سے آپ کے پاس آپہنچا) آپ نے جلد بازی کی اور اس سے پہلے کہ فریق ثانی سے وضاحت طلب کرتے آپ نے فیصلہ سنا دیا اگرچہ فیصلہ عادلانہ تھا۔

اگرچہ آپ بہت جلد اپنی اس لغزش کی طرف متوجہ ہو گئے اور وقت گزرنے سے پہلے اس کی تلافی کی۔ لیکن بہر حال جو کام آپ سے سرزد ہوا تھا وہ عزت کے مقام بلند کے شایان نہ تھا۔ اس لیے آپ نے اس ترک اولیٰ پر استغفار کی اور اللہ نے بھی انہیں مغفرت بخشش سے نوازا۔

مذکورہ تفسیر کی شاہدہ آیت ہے جو زیر بحث آیات کے فوراً بعد آئی ہے۔ اس میں حضرت داؤد سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تجھے زمین پر اپنا غلیظہ قرار دیا ہے، لہذا لوگوں کے درمیان حق و عدالت کے مطابق فیصلہ کر اور ہوا دوسرے کی پیروی نہ کر۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کی لغزش فیصلے کے طریقے میں تھی۔ لہذا مذکورہ بالا آیات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس عظیم نبی کی شان اور مقام کے خلاف ہو۔

۲۔ موجودہ تورات کی خرافاتی داستان: اب ہم تورات کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتی ہے: نیز بعض ناگاہ اور بے خبر افراد نے جو تفسیریں کی ہیں، ان کی اصل خبر بھی تلاش کرتے ہیں۔

تورات کی دوسری کتاب اشموئیل کی فصل ۱۱ میں جملہ ۲۷ تا ۲۸ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

ہوایہ کہ وقت غروب داؤد اپنے بستر سے اٹھا اور بادشاہ کے گھر کی چھت پر گردش کی۔ پشت بہام سے ایک عورت کو دیکھا کہ جو غسل کر رہی ہے۔ وہ عورت بہت ہی خوبصورت اور جذاب نظر تھی۔ داؤد نے کسی کو بھیجا اور اس عورت کے ہارے میں استعمار کیا۔ کسی نے کہا کہ کیا وہ اور یاہوہ تھی کی یہی

۱۔ "اور یاہوہ" حضرت داؤد کی فرج کے ہم انصافوں میں سے تھے۔ اور "تھی" "تھی" "تھی" کی طرف نسبت ہے کہ جس کے قبیلہ کو ہی حمت کہتے ہیں۔

بت شیعہ نسبت الیعام تو نہیں۔

داؤد نے ایچی میج کر لے منگو لیا۔ وہ اس کے پاس آئی۔ داؤد اس کے ساتھ سو یا۔ وہ اس کی نجاست سے پاک ہونے کے بعد اپنے گھر واپس چلی گئی۔ وہ عورت حاملہ ہو گئی۔ اس نے کسی کو بیچ کر داؤد کو خبر کی کہ میں حاملہ ہوں۔ داؤد نے یوآب کو کہلا بھیجا کہ اور یاہ جتنی کو میرے پاس بھیج دے۔ یوآب نے اور یاہ جتنی کو اس کے پاس بھیجا۔ اور یاہ جتنی اس کے پاس آیا۔ داؤد نے یوآب کی سلامتی اور جنگ میں اچھا وقت گزارنے کے بارے میں پوچھا۔ پھر داؤد نے اور یاہ سے کہا: اپنے گھر میں جا اور اپنے پاؤں دھو۔ اور یاہ بادشاہ کے گھر سے باہر آیا۔ اس کے پیچھے بادشاہ کی طرف سے کچھ کھانا باہر گیا لیکن اور یاہ بادشاہ کے گھر کے آگے اپنے آقا کے سارے بندوں کے ہمراہ سو گیا اور اپنے گھر میں نہ گیا۔ جب داؤد کو خبر دی گئی کہ اور یاہ اپنے گھر میں نہیں گیا تو داؤد نے اور یاہ سے کہا: کیا تو سفر سے نہیں لوٹا؟ اپنے گھر میں کیوں نہیں گیا؟

اور یاہ نے داؤد سے عرض کی: صندوق، اسرائیل اور ہیودا سائبانوں میں قیام پذیر ہیں۔ میرا آقا یوآب اور میرے آقا کے تمام صحرا میں خیمہ نشین ہیں، کیا سو سکتا ہے کہ میں کھانے پینے اور اپنی بیوی کے ساتھ سونے کے لیے اپنے گھر جاؤں؟ آپ کی جان کی قسم میں یہ کام نہیں کروں گا.....

ہوایہ کہ داؤد نے صبح ایک خط یوآب کو لکھا اور اور یاہ کے ہاتھ بھیجا۔ خط میں لکھا تھا کہ اور یاہ کو شہر جنگ میں دھکیں ددا اور خود اس کے پیچھے سے مہٹ جاؤ تاکہ یہ مارا جائے اور مر جائے۔ اسی طرح ہوا۔ یوآب نے شہر کا جائزہ لینے کے بعد اور یاہ کو ایسی جگہ پر رکھا جہاں سے علم تھا کہ جباروں کی ضرورت ہے۔

شہر کے مردوں نے باہر آکر یوآب سے جنگ کی۔ داؤد کے غلاموں کی قوم میں سے بعض گئے۔ اور یاہ جتنی بھی مر گیا۔ اور یاہ کی بیوی نے اپنے شوہر کی موت کا سنا تو خصوصیت سے اپنے شوہر کا سوگ منایا۔ جب یہ سوگ ختم ہوا تو داؤد نے اسے بوا بھیجا اور اسے اپنے گھر لایا کہ وہ اس کی بیوی ہو گئی.....

لیکن جو کام داؤد نے کیا تھا خدا کو پسند نہیں آیا۔

۱۔ بت شیعہ اس عورت کا نام ہے (تورات کے بقول حضرت داؤد نے چھت سے لے کر ہر ہر دیکھا اور اس کے پیش کی آگ آپ کے دل میں جھوک اٹھی۔ یہ حضرت

ایک صاحب منصب مرانی شخص الیعام کی بیٹی تھی۔

۲۔ ”یوآب“ حضرت داؤد کی زوج کا کمانڈر تھا۔

۳۔ کتاب اشوتیل، فصل ۱۱، جلد ۲۷۳۲

اس داستان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز داؤد اپنے محل کی چھت پر جاتے ہیں۔ ساتھ والے گھر میں ان کی نظر پڑتی ہے تو انہیں ایک عورت مل کر رہتی ہوئی دیکھتی ہیں۔ وہ اس کے پیش میں جینا ہوجاتی ہیں۔ پھر جیسے بن پڑتا ہے اسے اپنے گھر لے آتے ہیں اور وہ داؤد سے حاملہ ہوجاتی ہے۔ اس عورت کا شوہر شکر داؤد کا ایک اہم افسر تھا۔ وہ ایک پاک طینت اور باصفا شخص تھا۔ داؤد (نوعہ بالئد) ایک بزدلانہ سازش کے ذریعے اسے ایک خطرناک جنگ میں بھجوا کر قتل کروادیتے ہیں اور پھر اس کی بیوی کو قانونی طور پر اپنے نکاح میں لے آتے ہیں۔

اب آپ داستان کا باقی حصہ موجودہ تورات کی زبانی سنیں۔ اسی کتاب دوم اشوتیل کی ۱۲ ویں فصل میں ہے۔ خداوند نے نامان کو داؤد کے پاس بھیجا اور کہا:

ایک شہر میں دو آدمی رہتے تھے۔ ایک امیر تھا اور دوسرا غریب۔ امیر آدمی کے پاس بہت سی بھیریں اور گائیں تھیں۔ غریب کے پاس بھیر کے ایک بچے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک روز ایک مسافر امیر آدمی کے ہاں آیا۔ اس نے اپنی بھیروں میں سے مہمان کے لیے غذا تیار کرنے میں پس پیش کیا۔ غریب کا بھیر کا بچہ لے کر اسے ذبح کر دیا۔

اب کیا ہونا تھا، داؤد انتہائی غصے ہوئے۔ نامان سے کہنے لگے: بخدا جس نے یہ کام کیا وہ قتل کا مستحق ہے۔ اسے ایک بھیر کی جگہ پر چار بھیریں دینی چاہئیں۔ لیکن نامان نے داؤد سے کہا: ”وہ شخص تو ہے“

داؤد اپنے غلط کام کی طرف متوجہ ہوئے اور توبہ کی اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کی لیکن اس کا باوجود ان پر بھاری عیب تھیں۔

اس مقام پر تورات میں ایسی عبارت ہے جس کے ذکر سے قلم کو شرم آتی ہے لہذا ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ تورات کی داستان کے اس حصے میں بعض نکات خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں، مثلاً:

۱۔ حضرت داؤد کے پاس کوئی شخص تھنات کے لیے نہیں آیا، بلکہ ان کے ایک مشیر جو بنی تھے انہوں نے نصیحت کے طور پر ان سے ایک داستان بیان کی۔ اس میں دو بھائیوں کا واقعہ اور ان میں سے ایک کا دوسرے سے تقاضا کرنا مذکور نہیں ہے بلکہ ایک امیر اور ایک غریب آدمی کا ذکر ہے جن میں سے ایک کے پاس بہت سی بھیریں اور گائیں تھیں جبکہ دوسرے کے پاس بھیر کا صرف ایک بچہ تھا لیکن امیر آدمی نے اپنے مہمان کے لیے غریب آدمی کا بھیر کا بچہ ذبح کر دیا۔ اس واقعے میں مہربان کی دیوار سے اوپر جانے کا ذکر ہے نہ آپ کے وحشت زدہ ہوجانے کی بات ہے، نہ دو بھائیوں کے دعوے کا معاملہ ہے اور نہ ہی توبہ و بخشش کی درخواست کا بیان ہے۔

۲۔ داؤد نے اس ظالم امیر شخص کو قتل کا مستحق سمجھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بھیر کے لیے آخر قتل کیوں؟

۳۔ بنی اسرائیل کے ایک نبی اور حضرت داؤد کے مشیر

۲۔ اسلامی روایات اور قصہ داؤد؛ اسلامی روایات میں تورات کی بیان کردہ قیامت اور بے ہودہ داستان کی ہدایت سختی سے تکذیب کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:-

لا اوتی برجل یزعم داؤد تزوج امرئۃ اوریا الا جلدتہ حدین حدًا للنبوة
وحدًا للاسلام

اگر کسی ایسے شخص کو میرے پاس لایا جائے کہ جو یہ کہے کہ داؤد نے اوریاہ کی بیوی سے شادی کی، تو میں اس پر دو حدیں جاری کروں گا ایک حد نبوت کے لیے اور دوسری اسلام کے لیے۔
کیونکہ اس میں ایک طرف تو ایک مرد مؤمن کی طرف ایک غیر شرعی امر کی نسبت ہے اور دوسری طرف مقام نبوت کی ہتک محنت ہے۔ لہذا ایسی بات کرنے والے پر دو مرتبہ حد قذف جاری ہونی چاہیے اور اسے دو مرتبہ اتنی کوڑے لگائے جائیں۔
امام بزرگوار حضرت علیؑ سے یہی مفہوم ایک اور انداز سے منقول ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

من حد تکلم محمدیث داؤد علی ما یرویہ القصاص جلدتہ ماۃ ستین
جو شخص تم سے قصہ داؤد اس طرح بیان کرے کہ جیسے انسانہ گو کہتے ہیں تو میں اسے ایک سو ساٹھ
کوڑے لگاؤں گا۔

ایک اور حدیث شیخ صدوق نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے امالی میں درج کی ہے، آپ فرماتے ہیں:-
ان رضا الناس لا یملك، والسنتھم لا تضبط، المرینسبوا داؤد
الی انہ تبع الطیر حتی نظر الی امرئۃ اوریا فھواھا، وانہ قدم زوجھا
امام التابوت حتی قتل تزوج بیھا

سب لوگوں کو راضی نہیں کیا جاسکتا اور نہ سب کی زبانیں بند کی جاسکتی ہیں۔ کیا انھوں نے یہ راہنمائی
قیامت (تممت داؤد پر نہیں باندھی کہ وہ ایک پرندے کے پیچھے اپنے عمل کی چھت پر گئے تو ان کی نظر
اوریاہ کی بیوی پر پڑی اور وہ اس پر فریفتہ ہو گئے۔ پھر اس کے شوہر کو میدان جنگ میں تابوت کے آگے
آگے بھیج دیا (جس میں انبیاء بنی اسرائیل کی یادگاریں رکھی جاتی تھیں اور برکت کے طور پر اسے نوح کے آگے
آگے رکھا جاتا تھا)۔ یہاں تک کہ وہ مارا گیا اور پھر انھوں نے اس کی بیوی سے شادی کر لی (جب اللہ کا
عظیم نبی لوگوں کی زبان سے مومن نہ رہا ہو تو دوسروں کو ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے)۔

ایک حدیث بیہون الاخبار میں امام علی بن موسیٰ الرضا علیہم السلام سے منقول ہے۔ آپ مختلف مذاہب کے ارباب مذہب سے

۲۔ ساتھ ہی انھوں نے اس حکم کے خلاف حکم صلا رکھا اور کہا کہ ایک بھیڑ کے بدلے اُسے چار بھیڑیں دینی چاہیے
آخر کس بنا پر؟

۴۔ داؤد نے اوریاہ کی بیوی کے بارے میں خیانت سے متعلق اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔

۵۔ خدانے انھیں معاف کر دیا (اتنی آسانی سے، کس بنا پر؟)۔

۶۔ اللہ نے داؤد کے بارے میں عجیب و غریب سزا کا فیصلہ کیا کہ جسے نقل نہ کرنا بہتر ہے۔

۷۔ یہی عورت ایسے روشن ماضی کے باوجود سلیمان کی مال بنی۔

ان داستانوں کا ذکر واقعاً تکلیف دہ ہے لیکن کیا کیا جاسکتا ہے کہ بعض جاہل افراد نے نادانی سے ان اسرائیلی روایات کے
ذریعہ قرآن مجید کی پاک و پاکیزہ آیات کا چہرہ بھی سیاہ کر دیا ہے اور ایسی باتیں کہی ہیں کہ حق کو واضح کرنے کے لیے اس رسوا داستان کو
کچھ حصہ ذکر کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

اب ہم سوال کرتے ہیں:-

۱۔ وہ بھی کہ گزشتہ آیات میں اللہ نے جس کے دل عظیم اوصاف بیان کیے ہیں اور بغیر اسلام کو جس کی سرگزشت سے ہدایت
ماصل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے، کیا ممکن ہے کہ ان آیتوں کے ہزاروں حصے کی بھی اس کی طرف نسبت دی جاسکے؟

۲۔ قرآن مجید بعد کی آیات میں کہتا ہے،

یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض

اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں اپنا خلیفہ اور نمائندہ بنایا

کیا یہ آیت مذکورہ خرافات سے ہم آہنگ ہے؟

۳۔ اگر کوئی امام شخص ہو، خدا کا نبی نہ ہو اور وہ اس قسم کے جرم کا مرتکب ہو، اپنے وفادار پاک طینت با ایمان انہر کی بیوی کو
ایسے گھٹیا طریقے سے اس کے ہاتھوں سے کھسکالے تو لوگ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گے اور اس کی سزا کیا ہوگی؟ یہاں تک کہ
اگر یہ کام اہل حق و انصاف سے سرزد ہو تب بھی جائز نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تورات نے حضرت داؤد کو بغیر قرار نہیں دیا تاہم ان کا ذکر ایک بلند مرتبہ عادل حکمران کے طور پر کیا ہے، کہ جو
بنی اسرائیل کے عظیم عبادت خانے کا مؤسس تھا۔

۴۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ تورات کی مشہور کتب میں سے ایک "ملاہیر داؤد" ہے جس میں حضرت داؤد کی مناجات میں لکھا
ہے کہ میں نے اپنے شخص کی مناجات اور باتیں کتب آسمانی کا حصہ قرار دی جاسکتی ہیں؟

۵۔ جو شخص بتوڑی سی عقل بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ موجودہ تحریف شدہ تورات کی داستانیں خرافات کا ایسا مجموعہ
ہیں جو کتب انبیاء کے دشمنوں یا ہمت ہی بے شہور اور جاہل افراد کی ساختہ وپرداختہ ہیں۔ لہذا انھیں کس طرح بحث کی بنیاد
قرار دیا جاسکتا ہے؟

جی ہاں! قرآن کی یہ عظمت ہے کہ وہ ایسی خرافات سے بالکل پاک ہے۔

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر فراہین راوی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۳۔ نور الثقلین جلد ۲ ص ۳۳۶، بحوالہ امام صدوق۔

عصمت انبیاء کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس دوران میں آپ نے حاضرین میں سے علی بن جهم سے فرمایا: تم دو بار کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

اس نے کہا: کہتے ہیں کہ داؤد اپنی محراب میں مشغول عبادت تھے کہ شیطان ایک خوبصورت پرندے کی صورت میں ان کے سامنے آیا۔ داؤد نے نماز توڑ دی اور اس پرندے کے پیچھے ہو لیے..... پھر انھوں نے اور یاہ کی بیوی کو غسل کرتے ہوئے دیکھا تو اس پر عاشق ہو گئے۔ پھر انھوں نے اس کے شوہر کو تابوت کے آگے آگے میدان جنگ میں مجبور کیا، وہ مارا گیا تو داؤد نے اس کی بیوی سے شادی کر لی۔

اس نے یہ افسانہ بیان کیا تو امام علی بن موسیٰ الرضا بہت ندامت منہ ہوئے، آپ کو بہت دکھ ہوا، آپ نے اپنا نام پیشانی پر ملا اور فرمایا:-

اِنَّ اللّٰهَ وَاَنَا لِمِہٖ رَاجِعُونَ

لقد نسبتہم نبیًّا من انبیاء اللہ الی التہاون بصلواتہ حتی خرج فی اشر الطیر، ثم بالفاحشة ثم بالقتل

اِنَّ اللّٰهَ وَاَنَا لِمِہٖ رَاجِعُونَ

تم نے انبیاء الہی میں سے ایک نبی کی طرف اپنی نماز میں سستی کرنے اور اسے معمولی سمجھنے کی نسبت دی۔ یہاں تک کہ (تھکاری نسبت کے مطابق وہ بچوں کی طرح) پرندے کے پیچھے گیا پھر تم نے اس کی طرف فحشاء اور بڑائی کی نسبت دی اور اس کے بعد ایک بے گناہ انسان کے قتل سے متہم کیا۔

علی بن جهم نے پوچھا: پھر داؤد کی لغزش کیا تھی جو کہ میں پر انھوں نے استغفار کی اور قرآن میں جس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ امام نے مسئلہ قنات میں حضرت داؤد کی جلد بازی کا ذکر کیا اور بعد الی آیت کو بطور شاہد پیش فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

يَا دَاوُدَ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِی الْاَرْضِ

لے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔

امام فرماتے ہیں:-

حضرت داؤد کے زمانے میں جن عورتوں کے شوہر مر جاتے یا قتل ہو جاتے وہ پھر کبھی شادی نہ کرتی تھیں (اور یہ امر بہت ہی برا ہے اور قباحتوں کی بنیاد تھا) حضرت داؤد وہ پہلے شخص تھے جن پر اللہ نے اس کام کو مباح قرار دیا (تا کہ یہ رحم ختم ہو جائے اور یہ عورتیں اس مصیبت سے نجات پائیں) لہذا جب اور یاہ (انسان) سے ایک جنگ میں مارے گئے تو داؤد نے ان کی بیوی سے شادی کر لی، اور یہ امر اس زمانے کے لوگوں پر بہت گراں گزرا (اور بعد ازاں اس پر انھوں نے افسانے گھڑ لیے) صلہ

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسند اور یاہ کی ایک سادہ سی حقیقت پر بنیاد تھی۔ حضرت داؤد نے ایک کام الہی و ذمہ داری کے طور پر انجام دیا تھا۔ لیکن دانا دشمنوں، نادان دوستوں اور افسانہ پردازوں نے کہ جنہیں عجیب و غریب باتیں بنانے اور جھوٹ گھڑنے کی عادت تھی اس واقعے پر خوب حاشیہ آرائی کی اور ایسی ایسی باتیں بنائیں کہ انسان کو وحشت ہوتی ہے۔

کسی نے کہا: اس شادی کی کچھ نہ کچھ بنیاد تو ضرور ہے۔

دوسرے نے کہا: ضروری بات ہے کہ اور یاہ کا گھر داؤد کی ہمسایگی میں ہو گا۔

آخر کسی نے داؤد کی نظریں اور یاہ کی بیوی پر ڈھلوائیں، پرندے کا قصہ گھڑا۔

آخر کار اس عظیم پیغمبر کو طرح طرح کے شرمناک گناہان کبیرہ سے متہم کیا گیا۔ پھر بے وقوف جاہلوں نے ایک زبان سے دوسری زبان تک بیچنا یا اور اگر اس افسانے کا ذکر مشہور کتب میں نہ ہوتا تو ہم بھی اسے نقل کرنا غلط سمجھتے۔

البتہ حضرت امام رضا علیہ السلام کی مذکورہ روایت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی روایت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ حضرت علی علیہ السلام سے منقول حدیث میں اس مشہور جھوٹی داستان کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں (نعوذ باللہ) اس عظیم نبی کی طرف زنا وغیرہ کی نسبت دی گئی ہے۔

مفسرین کی توجیہات

بعض مفسرین نے قصہ داؤد سے متعلق کچھ اور توجیہات کی ہیں۔ وہ توجیہات اگرچہ آیات کے ظاہری مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہیں تاہم تکمیل بحث کے لیے ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرنا ہم غیر مناسب نہیں سمجھتے۔

۱۔ ایک یہ ہے کہ حضرت داؤد نے اپنے اوقات کو ایک پروگرام کے تحت منظم کیا ہوا تھا اور مخصوص اوقات کے علاوہ آنے والوں سے نہیں ملتے تھے۔ ایک روز دو افراد کہ جو آپ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے وہ محراب کی دیوار سے اوپر چڑھ آئے۔ جبکہ آپ محراب میں عبادت الہی میں مشغول تھے۔ جب انھوں نے آپ کے گرد ملاحظہ کیا تو ڈر گئے لہذا انھوں نے فوراً ایک جھوٹ گھڑا کہنے لگے ہم دونوں ایک شکایت کے پاس فیصلے کے لیے آئے ہیں اور پھر وہ ماجرا بیان کیا کہ جو قرآن میں آیا ہے۔ حضرت داؤد نے ان کے درمیان فیصلہ تو کر دیا لیکن چونکہ جانتے تھے کہ یہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مجھے قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہیں لہذا غصے سے بھرے اور ان سے انتقام لینے کا ارادہ کیا لیکن زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ آپ اپنے اس ارادے پر پشیمان ہوئے اور استغفار کی صلہ

۲۔ المیزان کے عظیم مفسر نے اس سلسلے میں جو بات کہی ہے وہ بنیادی طور پر اس سے ہم آہنگ ہے جو عظیم مفسرین اسلام نے قصہ داؤد کی تفسیر میں کہی ہے۔ ہم بھی سطور بالا میں اسے بیان کرتے ہیں۔ لیکن صاحب المیزان کا بیان چند ایک جہات سے مختلف ہے۔ لہذا ہم اسے یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ حضرت داؤد کے پاس شکایت کے لیے آنے والے دو فرشتے تھے۔

صلہ "فخر رازی" اور روح المعانی کی تفسیر میں یہ بحث ایک ہی مضمون کے تحت ذکر کی گئی ہے۔ ارد "مراعی" نے بھی اپنی تفسیر میں اسی بات کو قبول تسلیم کیا ہے۔

جنہیں اللہ نے داؤدؑ کی آزمائش کی غرض سے بھیجا تھا لیکن داستان کی خصوصیات مثلاً عہد سے اوپر جانا اور خلاف معمول طریقے سے داؤدؑ کے پاس جانا اور ان کا گھبرا جانا، نیز یہ کہ یہ واقعہ ایک الہی آزمائش تھا یہ سب چیزیں نشان دہی کرتی ہیں کہ فرشتوں کے تشل کی صورت میں دو آدمیوں کے لباس میں رد و نما ہوا تھا (تشل سے مراد یہ ہے کہ خارجی جو وہیں کوئی بھی نہیں لکھا تھا بلکہ حضرت داؤدؑ کی قوت اور پاک میں یوں ہوا کہ دو فرشتے تھے جو انسانوں کی صورت میں آئے تھے)۔

لہذا اس دعویٰ میں انھوں نے جو حکم صادر کیا وہ ظرف تشل میں تھا جیسے انھوں نے خواب دیکھا ہو، تو جیسے عالم خواب میں رد و نما ہونے والے واقعات میں انسان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، ظرف تشل میں بھی اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، ذمہ داری کا تعلق تو عالم شہود سے ہے یعنی عالم مادہ سے، اور اگر کوئی خطا حضرت داؤد سے سرزد ہوئی بھی ہے تو اس کا تعلق اسی ظرف تشل سے ہے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو مقام عصمت کے منافی ہو، بہشت میں آدمؑ کی خطا کی طرح، زمین پر اترنے سے پہلے کہ جو تکلیف شرعی اور ذمہ داری کا مقام ہے، اس لحاظ سے حضرت داؤدؑ نے جو استغفار کی وہ ایک حقیقی گناہ سے استغفار نہ تھی۔

لیکن آیات کا ظاہری مفہوم یقیناً یہ ہے کہ شکایت اور دعویٰ دائر کرنے والے افراد خارجی وجود رکھتے ہیں، تاہم مذکورہ فیصلہ نہ تھا، کیونکہ یہ فیصلہ شکایت کنندہ کی گفتگو سن کر علم و یقین حاصل کرنے کے بعد تھا۔ اگرچہ قصاصت کے مستحب آداب کا تقاضا تھا کہ فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیا جاتا اور ان کی استغفار بھی اسی ترک اولیٰ پر تھی۔

بہر حال اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس واقعے کو ہم ظرف تشل سے متعلق سمجھیں یا اسے بعض کے بقول خدا تعالیٰ کی طرف سے حضرت داؤد کو متنبہ کرنے کے لیے ایک آزمائش قرار دیں، بہتر یہی ہے کہ آیات کے ظاہری مفہوم کی حفاظت کی جائے اور جیسا کہ کہا گیا ہے اسی تفسیر کی جائے کہ جس سے آیت کے الفاظ کا ظہور بھی محفوظ رہتا ہو اور انبیاء کے مقام عصمت پر بھی کوئی حرف نہ آئے۔

۲۶- يٰۤاٰوَدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاَحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝

۲۷- وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝

۲۸- اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝

۲۹- كَتَبْنَا اٰنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبْرَكًا لِّيَذَّبُرُوْا اَيْتِهٖٓ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُو الْاَلْبَابِ ۝

ترجمہ

۲۶- اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں (اپنا) خلیفہ (اور نمائندہ) قرار دیا ہے۔ لوگوں کے درمیان کے حق کے مطابق فیصلہ کر اور ہولے نفس کی پیروی نہ کر کیونکہ یہ تجھے راہ حق سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ راہ خدا سے منحرف ہو جائیں، روز حساب کو فراموش کرنے کی بنا پر ان کے لیے شدید عذاب ہے۔

۲۷- ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے فضول پیدا نہیں کیا، یہ کافروں کا گمان ہے، وائے ہے کافروں کے لیے، (جہنم کی) آگ سے۔

۲۸- جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انھوں نے عمل صالح انجام دیئے ہیں، کیا ہم انھیں زمین میں فساد پر پانے والوں کی طرح قرار دے دیں یا پرہیزگاروں کو فاجروں کی طرح قرار دے دیں؟

۲۹- یہ بابرکت کتاب ہے کہ جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور اہل فکر و نظر متوجہ ہوں۔

تفسیر

عدل کرو اور ہوائے نفس سے بچو

گزشتہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اب آخر میں حضرت داؤد سے خطاب فرماتے ہوئے ان کے بلند کردار کا ذکر کیا جا رہا ہے اور ساتھ ساتھ ان کی سنگین ذمہ داریوں کا ذکر و دو ٹوک انداز میں اور معنی خیز مہارت کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: لے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں (اپنا) خلیفہ (اور نمائندہ) قرار دیا ہے۔ لہذا لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کر اور ہوائے نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے راہِ خدا سے ہٹا دے گی۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے منحرف ہو جائیں ان کے لیے روزِ حساب کو فراموش کرنے کی وجہ سے شدید عذاب ہے (یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الہوی فیضلک عن سبیل اللہ ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لہم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب)۔

اس آیت میں حضرت داؤد کے بلند مرتبے کا ذکر ہے اور ان کے اہم منصب کی بات کی گئی ہے۔ اس آیت کا مضمون نشانہ دہی کرتا ہے کہ درجہ اور رتبہ کے ساتھ ان کی شادی کے لوگوں نے جو جھوٹے انسانے تراشے ہیں وہ کس قدر بے بنیاد ہیں۔ کیسے ممکن ہے کہ اللہ ایسے شخص کو زمین کی خلافت سونپ دے اور مقامِ قنات اس کے پیروں کو جو زمین اور اپنے بار و انصاف کی ناموس پر خیانت بھری نظریں گاڑے ہوئے ہو اور اس کا ہاتھ بے گناہوں کے خون سے آلودہ ہو؟ اس آیت میں پانچ جملے ہیں اور ہر جملہ ایک حقیقت کا ترجمان ہے۔

پہلی حقیقت زمین میں داؤد کا مقامِ خلافت ہے۔ اس سے مراد گزشتہ انبیاء کی خلافت و جانشینی ہے یا خلافتِ الہی؟ ہماری نظریں دراصل زیادہ مناسب ہے اور یہی معنی سورہ بقرہ کی آیت ۲۰ سے ہم آہنگ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

واذ قال ربک للملائکۃ اتی جاعل فی الارض خلیفۃ

اس وقت کو یاد کر جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں خلیفہ بنا رہا ہوں۔

ابنہ فقط خلافت کے حقیقی معنی کے لحاظ سے تو اللہ کی خلافت کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ یہ تو ان کے لیے ہوتی ہے جن کے لیے وفات یا غیرت کا معنی صادق آتا ہو۔ یہاں اس سے مراد بندوں میں اس کی نمائندگی اور زمین میں اس کے فرائض کا اہل ہے یہ جملہ نشانہ دہی کرتا ہے کہ زمین میں حکومت کا منشاء و مصدر حکومت الہی ہونا چاہیے اور جو حکومت اس راستے کے علاوہ ہو وہ ظالمانہ اور فاجیانہ حکومت ہے۔

دوسرے جملے میں حکم دیا جا رہا ہے کہ اب جبکہ تجھے یہ عظیم نعمت دی جا چکی ہے، تیری ذمہ داری ہے کہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کر۔ درحقیقت خلافتِ الہیہ کا نتیجہ حق کی حکومت ہے۔ اس جملے سے یہ استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ حق کی حکومت مجھ سے زیادہ صرف خلافتِ الہیہ سے پیدا ہوتی ہے اور براہِ راست اسی کا نتیجہ ہے۔

تیسرے جملے میں ایک حاکم عادل کو درپیش اہم ترین خطرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہوائے نفس کی

برگزیری نہ کرنا۔

جی ہاں! ہوائے نفس حقیقت میں انسان کی آنکھوں کے سامنے ایک ضخیم پردہ ڈال دیتی ہے اور اس کے اور عدالت کے درمیان جبرائی ڈال دیتی ہے۔

لہذا چوستے جملے میں فرمایا گیا ہے، اگر تو نے ہوائے نفس کی پیروی کی تو وہ تجھے راہِ خدا سے جو راہِ حق ہے ہٹا دے گی۔ لہذا جہاں کہیں بھی مگر ای ہے اس میں ہوائے نفس کا ہاتھ ہے اور جہاں بھی ہوائے نفس ہے اس کا نتیجہ مگر ای ہے، جو حاکم ہوائے نفس کا پیرو ہو وہ لوگوں کے مفادات و حقوق کو اپنی اغراض پر قربان کر دے گا۔ اسی لیے اس کی حکومت ناپائیدار ہوگی اور شکست کا سامنا کرے گی۔

یہ کہتا ہے اس مقام پر ہوائے نفس کا ایک وسیع معنی ہو کہ جس میں انسان کی اپنی خواہش نفس بھی شامل ہے اور لوگوں کی خواہشات بھی۔ اس طرح قرآن ان تمام مکاتب کی نفی کرتا ہے کہ جو عوامی افکار کی پیروی کو حکومتوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کا نتیجہ طریقِ الہی اور صراطِ حق سے گمراہی ہے۔

موجودہ زمانے میں ہم اس طرزِ فکر کے ذلت باز نتائج کے شاہد ہیں جو زعم خود متمدن دنیا میں رُو نما ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات لوگوں کی خواہشات کے باعث تیز ترین اعمال بھی قانونی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرزِ عمل نے ذلت در سوائی کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ قلم کو بیان کرتے ہوئے شرم دامن گیر ہے۔

یہ درست ہے کہ حکومت کی اساس دو شہ عوام ہی کو ہونا چاہیے اور ان کی شرکت ہی سے حکومت تشکیل پانا چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حق و باطل کا معیار ہر جگہ اور مسئلے میں اکثریت کی خواہشات قرار پا جائیں۔ حکومت کے ستون حق پر استوار ہونے چاہئیں اور ان کی تعمیر و استحکام کے لیے عوامی قوت سے مدد لینا چاہیے اور "اسلامی جمہوریہ" کا یہی معنی ہے۔ یہ اصطلاح "اسلامی" اور "جمہوریہ" دونوں سے مرکب ہے اور اس کے ہم قائل ہیں۔ بانفاظ دیگر اصول مکتبہ دین سے لیے جائیں اور ان کے اجراء کے لیے لوگوں کو شریک کیا جائے (غور کیجئے گا)۔

آخر میں پانچویں جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ راہِ حق سے گمراہی کا سرچشمہ "یوم الحساب" کی فراموشی ہے اور اس کا نتیجہ شدید عذابِ الہی ہے۔

اصولی طور پر روزِ قیامت کی فراموشی ہمیشہ گمراہیوں کا سرچشمہ ہے اور ہر گمراہی میں اس فراموشی کا حصہ ہے اور یہ اصول معاد کی صحت و توجہ، انسانی زندگی میں اس کے ترویجی اثر کو واضح کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی کتب میں منقول روایات بہت ضرور طلب ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور حدیث بیہیہ گراہی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ انھوں نے فرمایا:

ایہا الناس ان اخوف ما اخاف علیکم افئنان اتباع الہوی وطول الامل فاما اتباع الہوی فیصد عن الحق واما طول الامل فیفسد الاخرة

لے لوگو! وحشت ناک ترین چیزیں وہ ہیں کہ جن کی جانب سے میں تمہارے بارے میں ڈرتا ہوں،

ایک ہے ہوا ہوس کی پیروی اور دوسری ہے لمبی چوڑی امیدیں۔ ہوا ہوس کی پیروی تو تھیں حق سے

مخرف کر دے گی اور لمبی چوڑی امیدیں یقیناً قیامت بھلا دیں گی۔

حق ہے کہ اس جگہ کو آبِ زرد سے لکھا جائے اور یہ ہر دیکھنے والے بالخصوص حکمرانوں، قاضیوں اور اہل منصب کے سامنے رہے۔ ایک اور روایت کہ جو امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے، اس میں آپ فرماتے ہیں:

ثلاث مو بقات: شیخ مطاع و هو ی متبع ہوا عجب المرء بنفسه

تین چیزیں آدمی کو ہلاک کر دیتی ہیں:

۱۔ اطاعت کے موقع پر عمل،

۲۔ ہوائے نفس کو جس کی پیروی کی جائے اور

۳۔ انسان کا اپنے آپ سے خوش ہونا۔

حضرت داؤد کی زندگی اور زمین میں ان کے لیے خلافتِ الہی کا ذکر کرنے کے بعد جہاں ہستی کے باہر ہوا مقصد ہونے کا ذکر آیا ہے تاکہ زمین پر حکومت کی جہت واضح ہو جائے کہ جو اس تمام نظامِ ہستی کا ایک حصہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آسمان زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اسے ہم نے باطل اور فضول پیدا نہیں کیا، یہ تو کافروں کا گمان ہے، افسوس کافروں پر آتش و فرخ سے (و ما خلقتنا السماء والارض وما بینہما باطلاً ذالک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار)۔

اہم ترین مسئلہ کہ جو تمام حقوق کا سرچشمہ ہے وہ خلقت کا باہر ہوا مقصد ہونا ہے۔ جب ہم نے تخلیق کائنات کے بارے میں اپنے عقیدے میں یہ بات قبول کر لی کہ یہ عالم وسیع خداوند بزرگ نے فضول پیدا نہیں کیا تو فوراً ہمیں اس کے باہر ہوا مقصد ہوتی ہے۔ اس باہر ہوا مقصد کے معنی غیر الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حکومتوں کو بھی اسی راستے پر گامزن ہونا چاہیے۔ انھیں تعلیم و تربیت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہئیں اور انھیں انسانوں کے روحانی کمال کا ذریعہ ہونا چاہیے۔

دوسرے الفاظ میں عالمِ ہستی حق و عدالت کی بنیاد پر قائم ہے اور حکومتوں کو بھی پوری کائنات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ یعنی انھیں حق و عدالت کے اصولوں پر استوار ہونا چاہیے۔

ضمنی طور پر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اگر شہادتِ آیت کا آخری جملہ کہ جس میں روز جزا کی فراموشی کا ذکر ہے، زیر بحث آیت کے مضمون سے پوری طرح ہم آہنگ ہے کیونکہ مقصد تخلیق کائنات کا تقاضا ہے کہ روز جزا موجود ہے اور جیسا کہ ہم سورۃ یس کی تفسیر کے

اختتام پر معاد سے متعلق بحث میں کہہ چکے ہیں اگر روز حساب موجود نہ ہو تو اس جہاں کی تخلیق بے معنی ہے مقصد، فضول اور مہمل ہوگی۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس آیت کے اختتام پر ایک واضح خط کی جانب اشارہ موجود ہے جو مکتبِ ایمان کو کفر سے جدا کرتا

ہے اور وہ ہے اجماعی مکتب میں عالم کا بے مقصد ہونا کہ جس کے بعض نمونوں میں ہم آج بھی گرفتار ہیں۔ وہ صراحت سے اعلان

کرتے ہیں کہ یہ جہاں بے مقصد اور بے ہدف ہے ایسے تصور کائنات کی موجودگی میں وہ لوگ اپنی حکومتوں میں حق و عدالت کو کیسے جاری

کر سکتے ہیں یہ فقط الہی نظریہ کائنات ہے کہ جس کی بنیاد پر جوہیں آنے والی حکومت حق و عدالت کو جاری کر سکتی ہے کیونکہ اس نظریے کے مطابق تخلیق نام

کا کوئی ہدف و مقصد ہے اور اس جہاں کا کوئی حساب شدہ نظام موجود ہے کہ عدالت کو بھی اس کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اجماعی حکومتیں آج جنگ کے

مصلح اور اقتصاد و ثقافت کے جن مسائل میں پھنس چکی ہیں ان کی اصلی وجہ اس میں تلاش کرنا چاہیے۔ ان کے اسی نظریے کی وجہ سے ان کی

گہرا نگاہ کی اصل بنیاد زور، زبردستی اور اقتدار ہے اور ہر کسی کے لیے وہ اسی کے قائل ہیں کہ جو وہ طاقت اور ظلم سے حاصل کر لیتا ہے اور ایسی

دنیائے قدر و شہرت ناک ہے کہ جو اس طرز فکر کی بنیاد پر عمل پیرا ہوا جس کا نظام اس نظریے کے مطابق چلتا ہے۔

بہر حال خدا تعالیٰ حکیم ہے اور ممکن نہیں کہ وہ اس عظیم کائنات کو بے ہدف پیدا کرے اور یہ ہدف بھی پورا ہو گا کہ یہ عالم ایک وسیع تر ادارہ

عظیم تر جہاں کے لیے مقدر ہو وہ جہاں کو جاہلیت سے وابستہ ہوا اور جو عالم دنیا کا جواز فراہم کرے۔

بعد کی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے، کیا ممکن ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک کام انجام دیئے ہیں، انھیں

ہم ان جیسا قرار دے دیں کہ جو زمین میں فساد پر پراکرنے والے ہیں (ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصالحات کالغفصین

فی الارض)۔ اور کیا ممکن ہے کہ ہم پر ہرگز گاروں کو فاجروں کی طرح قرار دیں (ام نجعل المتقین کالغفار)۔

تخلیق بے ہدف ممکن ہے اور نہ نیک اور بد میں مساوت ممکن ہے کیونکہ نیک لوگ اہلِ نیکیت کے مطابق قدم اٹھاتے ہیں اور مقصد

کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں جب کہ برے لوگ مخالف سمت پر گامزن ہیں۔

درحقیقت مہادی کی بحث اس آیت میں اور قبل کی آیت میں مستقل طور پر تمام پہلوؤں کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

ایک طرف تو یہ فرمایا گیا ہے کہ حکمتِ خالق کا تقاضا ہے کہ تخلیق کائنات کا کوئی ہدف ہو اور ہدف دوسرے جہاں کے بغیر حاصل

نہیں ہو سکتا کیونکہ اس دنیا کی چند روزہ زندگی اتنی اہم نہیں ہے کہ اس عظیم کائنات کا ہدف ہو سکے۔

دوسری طرف حکمت و عدل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد اور عادل و ظالم کیسا نہ ہوں اور یہی امر قیامت، جزا و سزا اور جنت و

جہنم کا مقصد ہے۔

اس انسانی معاشرے میں فاجر، مومنین کے برابر اور برے عیالوں کے ساتھ نظر آتے ہیں بلکہ جہت سے مواقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ

سلف بعض مفسرین نے تفسیر کی ہے کہ یہاں "تم" بن کے معنی میں اعراب کے لیے ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ "ام" استفہامی معذوف پر معلق ہو

اور تقدیر میں اس طرح ہے،

اخلقتنا السماوات والارض باطلاً ام نجعل المتقین کالغفار

یہ کہ زعفران لوگ زیادہ پیش و آگام میں ہیں سا اگر اس جہان کے بعد کوئی جہان نہ ہو کہ جس میں عدالت حکم فرما ہو تو اس جہان کی وضع خلاف حکمت اور خلاف عدل بھی اور یہ غور شدہ مواد کے لیے ایک دلیل ہے۔
دوسرے الفاظ بھی اثباتِ معاوہ کے لیے برہانِ حکمت سے استدلال کیا جاتا ہے اور کبھی برہانِ عدالت سے۔ گزشتہ آیت میں پہلی استدلال ہے اور دوسری آیت میں دوسری طرح کا۔

زیر بحث آخری آیت میں ایسے مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ جو درحقیقت ہدف کا نکتہ کو پورا کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: **الیک مبارک لیدتہم و آیتہ و لیت ذکرا و لولوا الألباب**۔
اس کی تعلیمات جاوداں ہیں اور اس کے احکام گہرے اور عمیق ہیں اور اس کے پردہ گام حیات بخش اور ہدایت کنہہ ہیں کہ ہر انسان کو ہدف تخلیق کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس عظیم کتاب کے نزول کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ اس کی تلاوت کی جائے اور اسے زبان پر جاری کر لیا جائے اور بس۔ بلکہ مقصد یہ تھا کہ اس کی آیات فکر و نظر اور سوچ، پکار کا سرچشمہ بنیں۔ اور ضمیر و وجدان کی بیداری کا سبب بنیں اور پھر یہ بیداری حرکتِ عمل کا باعث بنے۔

”مبارک“ جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایسی چیز کے معنی میں ہے کہ جو دائمی خیر کی حامل ہو اور قرآن کے بارے میں یہ قہر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی معاشرہ اس کی تعلیمات سے دائمی استفادہ کر سکتا ہے اور چونکہ یہ لفظ بطور مطلق استعمال ہوا ہے اس لیے دنیا و آخرت کی ہر طرح کی خیر و سعادت پر محیط ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر تم خیر و برکت کے طلب گار ہو تو تمھاری خواہش اس میں موجود ہے بشرطیکہ تم اس میں تدبیر کرو اور اس سے ہدایت حاصل کرو اور حرکت میں آؤ۔

چند اہم نکات

۱۔ تقویٰ اور فحور ایک دوسرے کی ضد؛ زیر بحث آیات میں ”فساد فی الارض“ کو ”ایمان و عمل صالح“ کے مقابل قرار دیا گیا ہے نیز ”فحور“ (دین کا پردہ چاک کرنا) تقویٰ و پرہیزگاری کی ضد قرار دیا گیا ہے کیا ان دونوں عبارتوں میں ایک ہی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے یا دو مطالب کو بیان کیا گیا ہے؟
بمید نہیں ہے کہ دونوں عبارتوں میں ایک ہی حقیقت کو بیان کیا گیا ہو۔ کیونکہ ”متیقن“ نیک عمل کرنے والے مومنین ہی ہیں اور ”فجّار“ مفسدین فی الارض ہی ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پہلا جملہ اعتقادی اور عملی دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ ہو اور صحیح عقیدے کے ساتھ نیک عمل کرنے والوں کا مفاد اور نیکو اور ناسد اعمال لوگوں سے کیا جا رہا ہو، جبکہ دوسرا جملہ صرف عملی پہلو کی طرف اشارہ ہو۔
یہ فرق بھی ممکن ہے کہ ”تقویٰ“ انسان کے انفرادی کمال اور ”فحور“ انسان کے انفرادی تنزل کی طرف اشارہ ہو جبکہ عمل صالح اور

فساد فی الارض معاشرتی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہو۔

لیکن ان میں سے تاکید والی پہلی تفسیری زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ یہ آیات کس کے بارے میں ہیں؟ ایک روایت میں ان آیات کی تفسیر کے بارے میں ہے کہ ”الذین آمنوا و عملوا الصالحات“ سے امیر المؤمنین حضرت علیؑ اور ان کے یار و انصار کی طرف اشارہ ہے جبکہ ”المفسدین فی الارض“ اشارہ ان کے مخالفین کی طرف ہے بلکہ

ایک اور حدیث جو ابن عباسؓ سے نقل کی ہے اس میں ہے کہ ”الذین آمنوا“ سے مراد حضرت علیؑ اور حضرت ابو بکرؓ اور جناب حمیدہ ہیں کہ جو میدانِ بدر میں مقتدہ، ولید اور شیبہ کے مقابلے میں نکلے تھے کہ چوشکر شرک میں سے تھے اور ان سے ہمت پرست رانی کی اور ان پر غالب آئے۔ المفسدین فی الارض“ سے مراد تین مذکورہ افراد ہیں کہ چوشکر کفر و شرک میں سے ہیں بلکہ واضح ہے کہ ان روایات کا مفہوم یہ نہیں کہ آیت کو خاص افراد میں منحصر کر دیا جائے بلکہ اس سے شانِ نزول مراد ہے یا روشن و واضح مصداق۔

۳۰۔ وَوَهَبْنَا لِذَاوُدَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝

۳۱۔ اِذْ عَرَضَ عَلَيْهِ بِالْعِشِيِّ الصَّغِيْرَةَ الْجِيَادُ ۝

۳۲۔ فَقَالَ اِنِّي اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَن ذِكْرِ سَاطِحِي حَتَّىٰ تَوَارَتْ

بِالْحِجَابِ ۝

۳۳۔ رُدُّوْهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْاَعْنَاقِ ۝

ترجمہ

۲۰۔ ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا، کیا ہی اچھا بندہ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ اللہ کی طرف بازگشت کرتا تھا۔ (اور اس کی یاد میں رہتا تھا)۔

۲۱۔ وہ وقت یاد کر جب وقت عصر انھوں نے چابک اور تیز رفتار گھوڑے اس کے سامنے پیش کیے۔

۲۲۔ تو اس نے کہا: ان گھوڑوں کو میں اپنے رب کی خاطر پسند کرتا ہوں (میں چاہتا ہوں کہ جہاد میں ان کام لوں اور وہ اسی طرح انھیں دیکھتا رہا)۔ یہاں تک کہ وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

۲۳۔ (وہ اس قدر جازبِ نظر تھے کہ اس نے کہا کہ) انھیں دوبارہ لاؤ اور پھر اس نے ان کی پٹلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرا (اور ان پر نوازش کی)۔

تفسیر

سلیمان اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں

ان آیات میں بھی حضرت داؤد کے بارے میں گفتگو چلی ہے۔ پہلی آیت میں انھیں سلیمان جیسا ہارشر بیٹا ملا فرمانے کی خبر دی گئی ہے کہ جو ان کی حکومت و رسالت کو باقی و جاری رکھنے والے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا، کیا ہی اچھا بندہ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ دامنِ خدا کی طرف اور آغوشِ حق کی طرف لوٹتا تھا (و وہبنا لداؤد سلیمان نعم العبد انہ اواب)۔

یہ تعبیر حضرت سلیمان کے عظیم مرتبے کی ترجمان ہے۔ شاید یہ ان بے بنیاد اور قبیح تہمتوں کی تردید کے لیے ہے کہ جو زور دیا گیا

حضرت سلیمان کے تولد کے بارے میں تحریف شدہ روایات میں آئی ہیں اور نزولِ قرآن کے زمانے میں وہ تہمتیں ہی طرح عام تھیں۔

ایک تو "وہبنا" (ہم نے عطا کیا) فرمایا پھر "نعم العبد" (کیا ہی اچھا بندہ ہے) کہہ کر تعریف کی تیز "انہ اواب" (وہ شخص جو ہمیشہ فرمان و اطاعتِ الہی کی طرف لپکتا ہے اور ذرہ بھر بھی لغزش جو جائے تو توبہ کرتا ہے) کہہ کر تائید کی گئی۔ یہ سب باتیں اس عظیم نبی کے بند مرتبے کی غماض ہیں۔

"انہ اواب" بالکل وہی تعبیر ہے جو اسی سورہ کی آیت، امیں ان کے باپ حضرت داؤد کے لیے آئی ہے۔ "اواب" مہانے کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے "بہت زیادہ بازگشت کرنے والا" اور اس میں کوئی شرط بھی نہیں ہے اگر اس مفہوم کی طرف توجہ کی جائے تو اطاعتِ فرمانِ الہی کی طرف بازگشت، حق و عدالت کی طرف بازگشت اور نفی و ترکِ اولیٰ سے بازگشت سب معانی اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

اگلی آیت میں حضرت سلیمان کے گھوڑوں کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس کے متعلق مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔ بعض جاہل اور بے خبر لوگوں کی طرف سے بھی ہیں کہ جو بنا پر تکلیف دہ ہیں اور عقلی معیار کے خلاف ہیں۔ ان لوگوں نے اسی اسی باتیں کی ہیں کہ جو ایک عام انسان کے بھی شایانِ شان نہیں ہیں چہ جائیکہ ان کی نسبت حضرت سلیمان جیسے عظیم المرتبت نبی کی طرف دی جائے تاہم محققین نے عقلی و نقلی دلائل سے اسی تفسیروں کا راستہ بند کر دیا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم مختلف احتمالات کا جائزہ لیں آیات کی تفسیر اس کے ظاہر کے مطابق یا ظاہر ترین احتمالات کے مطابق پیش کرتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ جو ناروا نسبتیں دی جاتی ہیں ان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ لوگوں نے پہلے فیصلے کیے پھر لاکر اعلیٰ قرآن پر ٹھونس دیا۔

قرآن کہتا ہے: وہ وقت یاد کر جب وقت عصر چابک اور تیز رفتار گھوڑے اس (سلیمان) کے حضور پیش کیے گئے (اذ عرض علیہ بالعشوی الصافنات الجیاد)۔

"صافنات" "صافنۃ" کی جمع ہے۔ جیسا کہ بہت سے مفسرین اور باب لغت نے لکھا ہے "صافنات" ایسے گھوڑوں کو کہا جاتا ہے کہ جو کھڑے ہوتے وقت دو اگلے اور ایک پچھلے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک پچھلا پاؤں کچھ بلند کیے رہتے ہیں اور صرف ٹم کی نوک زمین پر رکھتے ہیں اور یہ چابک اور تیز رفتار گھوڑوں کی خاص حالت ہے کہ جو ہر وقت چلنے کو تیار ہوتے ہیں۔

"جیاد" "جواد" کی جمع ہے یہاں یہ لفظ سریع الحركت اور تیز رفتار گھوڑوں کے معنی میں ہے۔ دراصل یہ لفظ "جود" (بخشش) کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ البتہ یہ لفظ انسان کے لیے ہو تو مال بخشنے کے معنی میں ہے اور گھوڑے کے لیے ہو تو تیز رفتاری کے معنی میں ہے۔ گویا مذکورہ گھوڑے جب کھڑے بھی ہوتے تھے تو چلنے کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کرتے تھے اور جب چلنے لگتے تھے تو تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے تھے۔

اس آیت میں موجود مختلف قرآن سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک روز حضرت سلیمان اپنے تیز رفتار گھوڑوں کا معائنہ

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ "صافنات" نر اور مانت دونوں معانی رکھتا ہے لہذا یہ گھوڑوں کے لیے مضموم نہیں ہے۔

ان آیات کی تفسیر کے بارے میں جو کچھ سطور بالا میں کہا گیا ہے یہ بعض مفسرین سے ہم آہنگ ہے۔ بزرگانِ شیعہ میں سے عالمِ نامدار و بزرگوار سید مرتضیٰ کے کلمات سے بھی اس تفسیر کے ایک حصے کا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ”تشریح الانبیاء“ میں بعض مفسرین اور اہل بابِ حدیث کی جانب سے حضرت سلیمان کی طرف دی جانے والی نادر و نامتوں کی نفی کرتے ہوئے لکھا ہے:

کیسے ممکن ہے کہ اللہ پہلے تو اس پیغمبر کی مدح و ثنا کرے اور پھر ساتھ ہی اس کی طرف اس بڑے کام کی نسبت دے کہ وہ گھوڑوں کا نظارہ کرنے میں یوں محو ہوئے کہ نماز بھول گئے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ گھوڑوں سے بھی ان کا لگاؤ و محکم پروردگار سے تھا کیونکہ اللہ میں بھی حکم دیتا ہے کہ گھوڑے پالیں اور دشمنوں کے خلاف جنگ کے لیے انھیں آمادہ رکھیں۔ لہذا کیا مانع ہے کہ اللہ کا نبی بھی ایسا ہی ہو سیکے

علامہ مجلسی مرحوم نے ہمارا افوار کی کتاب نبوت میں مذکورہ بالا آیات کی تفسیر کے بارے میں مختلف باتیں کی ہیں جن میں بعض ہماری عمرہ بالا تفسیر کے نزدیک ہیں۔
بہر حال اس تفسیر کے مطابق سلیمان سے نہ تو کوئی گناہ سرزد ہوا ہے اور نہ ہی آیات میں عدم ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی ایسی مشکل پیش آتی ہے کہ جس کی توجیہ کرنا پڑے۔
بعض مفسرین نے ایک اور تفسیر کی ہے اب ہم اسے پیش کرتے ہیں۔

زیادہ مشہور یہ ہے کہ ”تواریت“ اور ”ردوھا“ کی تفسیر ”شمس“ (سورج) کی طرف لٹی ہے جو عبارت میں مذکور نہیں ہے لیکن زیر بحث آیت میں لفظ ”عششی“ (وقتِ عصر) آیا ہے اس سے یہ استفادہ کیا جا سکتا ہے اس طرح سے آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ سلیمان گھوڑوں کو دیکھنے میں منہمک تھے کہ سورج نے اپنا سرافق مغرب میں رکھ دیا اور جاب مغرب میں پہناں ہو گیا۔ سلیمان اپنی نمازِ عصر کھوجانے سے بہت پریشان ہو گئے۔ وہ پکارے: اے پروردگار کے فرشتو! سورج کو میرے لیے ٹٹا دو۔ سلیمان کا یہ تقاضا پورا ہوا اور سورج پٹا آیا۔ حضرت سلیمان نے دنوکیا (پٹلی اور گردن پر ٹاٹھ پھیرنے سے مراد دنو کے دوران میں سرخ کرنا ہے کہ جو حضرت سلیمان کے مذہب میں تھا، البتہ کبھی لفظ مسح عربی زبان میں دھونے کے معنی میں بھی آتا ہے) پھر انھوں نے اپنی نماز ادا کی۔ بعض ناگاہ اور بے شعور اس سے بھی تجاوز کر گئے ہیں۔ انھوں نے ایک اور توجیہ تہمت اس عظیم نبی پر لگائی ہے وہ کہتے ہیں کہ ”طفق مسحا بالسوق والاعناق“ سے مراد یہ ہے کہ سلیمان نے حکم دیا کہ تواریت کے ساتھ گھوڑوں کی پٹلیاں اور گردن کاٹ دی جائیں یا خود یہ کام انجام دیا کیونکہ وہ گھوڑے یا دوا سے غفلت اور نمازی فراموشی کا سبب بنے تھے۔

۱۔ تشریح الانبیاء، ص ۹۲

۲۔ کمال افوار، ج ۱۳، ص ۱۰۴

۳۔ اس تفسیر کے مطابق ”تواریت“ اور ”ردوھا“ کی تفسیر تیز رد گھوڑوں یعنی ”الصفات الجیاد“ کی طرف لٹی ہے۔

کر رہے تھے کہ جنھیں میدانِ جہاد کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ عصرِ کا وقت تھا۔ ماورین مذکورہ گھوڑوں کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے سامنے سے گزر رہے تھے۔

ایک عادل اور بااثر حکمران کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس طاقتور فوج ہو اور اس زمانے میں لشکر کے اہم ترین وسائل تیز رفتار گھوڑے تھے لہذا حضرت سلیمان کا مقام ذکر کرنے کے بعد نونے کے طور پر گھوڑوں کا ذکر آیا ہے۔

اس موقع پر یہ واضح کرنے کیلئے کہ طاقتور گھوڑوں سے ان کا لگاؤ دنیابہدستی کی وجہ سے نہیں جناب سلیمان نے کہا: ان گھوڑوں میں اپنے رب کی یاد اور اس کے حکم کی بنا پر پسند کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سے دشمنوں کے خلاف جہاد میں کام لوں (فقال انی احببت حب النخیر عن ذکر ما فی)۔

عربوں کا معمول ہے کہ وہ ”خیل“ (گھوڑا) کو ”خیر“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے:

النخیر معقود بنواصی الخیل الی یوم القیامۃ

خیر اور بھلائی قیامت تک کے لیے گھوڑے کی پیشانی کے ساتھ باندھ دی گئی ہے۔

سلیمان کہ جو دشمن کے خلاف جہاد کے لیے آمادہ ان تیز رفتار گھوڑوں کا معائنہ کر رہے تھے بہت عرش ہوئے۔ آپ انھیں یوں دیکھ رہے تھے کہ نظریں ان پر جم کر رہ گئیں یہاں تک کہ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے (حتی تواریت بالحجاب)۔ یہ منظر نہایت دلکش اور عمدہ تھا اور حضرت سلیمان جیسے عظیم فرماں روا کے لیے نشاط انگیز تھا۔ آپ نے حکم دیا ”ان گھوڑوں واپس میرے پاس لاؤ“ (ردوھا علی)۔

جب ماورین نے اس حکم کی اطاعت کی اور گھوڑوں کو واپس لانے تو سلیمان نے خود ذاتی طور پر ان پر نوازش اور ان کی پٹلیوں اور گردنوں کو چھپتیا اور ہاتھ پھیرا (فطفق مسحا بالسوق والاعناق)۔

یوں آپ نے ان کی پرورش کرنے والوں کی بھی تشویق اور قدر دانی کی۔ معمول ہے کہ جب کسی سواری کی قدر دانی کی جاتی ہے تو اس کے سر، چہرے، گردن یا اس کی ٹانگ پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے اور یہ دلچسپی اور پسندیدگی کے اظہار کا اہم ذریعہ ہے کہ جس سے انسان اپنے بلند مقام میں مدد لیتا ہے لہذا حضرت سلیمان جیسے عظیم نبی کا ایسا کرنا کوئی تعجب انگیز نہیں۔

”طفق“ کہ جو عربوں کی اصطلاح کے مطابق انعالِ مقاربہ میں سے ہے کسی کام کو شروع کرنے کے معنی میں ہے۔ ”سوق“ جمع ہے ”ساق“ کی (پٹلی کے معنی میں) اور ”اعناق“ جمع ہے ”عنق“ کی (گردن کے معنی میں) پورے جملے کا معنی یہ ہے:

سلیمان نے ان کی پٹلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرا اور ان سے نوازش کرنا شروع کیا۔

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں

بعض نے زیر بحث آیت میں ”خیر سے مال یا بلبل خیر مراد لیا ہے۔ ممکن ہے یہ سابقہ تفسیر پر منطبق ہو سکے کیونکہ یہاں مال کا معنی گھوڑے ہی ہیں۔

اس آخری گفتگو کا بطلان تو کسی سے مخفی نہیں کیونکہ اس میں گھوڑوں کا تو کوئی قصور نہ تھا۔ انہیں تزیین کیا جاتا اگر گناہ تھا تو نور سلیمان کا تھا جو گھوڑوں کا نظارہ کرتے کرتے ان میں منکب ہو گئے اور باقی سب کچھ بھول گئے۔ علاوہ ازیں گھوڑوں کو مار ڈالنا ان ظلم بھی ہے اور اسراف بھی۔ لہذا اس کی ممکن ہے کہ ایسا ناروا عمل ایک نبی سے سرزد ہو۔ لہذا اسلامی کتب میں اس ضمن میں آنے والی روایات میں حضرت سلیمان کی طرف اس نسبت کی شدت سے نفی کی گئی ہے۔

رہی دوسری تفسیر کہ جس میں نماز عصر سے غفلت کی بات کی گئی ہے اس سے بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک معصوم نبی اپنی واجب ذمہ داری کو بھول جائے؟ اگرچہ گھوڑوں کا معائنہ بھی ان کی ایک ذمہ داری تھی۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ مستحب نماز تھی کہ جسے چھوڑ دینے میں کوئی عوج نہ تھا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ نماز نافلہ کے لیے عوج پٹانے کی ضرورت نہ تھی۔ علاوہ ازیں اس تفسیر میں کچھ دیگر اشکالات اور اعتراضات بھی ہیں، مثلاً:

۱۔ لفظ "میں" آیات میں صراحت کے ساتھ نہیں آیا جبکہ "الصافات الجیاد" (تیز رفتار گھوڑے) صراحت کے ساتھ مذکور ہے لہذا زیادہ مناسب یہی ہے کہ میری اسی چیز کی طرف لوٹیں جو صراحت کے ساتھ آیات میں موجود ہے۔

۲۔ "عن ذکر سہمی" کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ان گھوڑوں کی جنت یا عوض اور اس کے فنان کے باعث ہے جبکہ آخری تفسیر کے مطابق لفظ "عن" علی کے معنی میں ہے۔ یعنی میں نے گھوڑوں کی جنت کو اپنے رب کی محبت پر ترجیح دی اور یہ معنی خلاف ظاہر (غور کیجئے گا)۔

۳۔ سب سے زیادہ توجہ خیر ہے کہ "رد و ہا حلی" (انہیں میری طرف لوٹادو) اس میں ٹھیکہ لب و لہجہ ہے۔ کیا ممکن ہے کہ سلیمان اللہ تعالیٰ یا اس کے فرشتوں سے اس لیے میں خطاب کرتے ہوئے کہیں کہ سورج میری طرف پٹا دیں۔

۴۔ سورج پٹنے کا مسئلہ اگرچہ قدرت خدا کے لیے محال نہیں ہے تاہم واضح طور پر بہت سے مسائل اس سے وابستہ ہیں اور جب تک واضح دلیل موجود نہ ہو اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ زیر بحث آیات کا آغاز حضرت سلیمان کی مدح و تجلیل سے ہوتا ہے جبکہ زیر نظر تفسیر کے مطابق ان آیات کا اختتام آپ کی مذمت پر ہوتا ہے۔

۶۔ اگر واجب نماز ترک ہوئی ہے تو اس کی توجیہ مشکل ہے اور اگر نافلہ نماز ترک ہوئی ہے تو پھر سورج پٹانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہاں ایک سوال باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ تفسیر کتبنا حدیث میں مستند روایات میں نظر آتی ہے لیکن اگر ان روایات کی اسناد کا ہم پتہ جائزہ

لیں اور ان کی تحقیق کریں تو ہم تصدیق کریں گے کہ ان میں سے کسی ایک کی سند بھی مستحکم نہیں۔ زیادہ تر روایات مُردہ ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ان غیر مستند روایات سے صرف نظر کیا جائے اور اس کا علم ہم اس کے اہل کے ذمہ رہنے دیں اور پہلے سے فیصلہ کیے بغیر آیات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اسی کو انتخاب کریں اور یوں مختلف اشکالات سے آسودہ خاطر بھی رہیں۔

۳۳۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَالْقَيْنَ ابْنِي كُرْسِيِّ جَدًّا ثُمَّ أَنَابَ ۝

۳۵۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُبَلَّغًا لَا يَتَّبِعُنِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي إِنَّكَ

أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

۳۶۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ۝

۳۷۔ وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَتَاءٍ وَعَوَّاصٍ ۝

۳۸۔ وَأَخْرَيْنَ مُقْتَرِنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝

۳۹۔ هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

۴۰۔ وَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَّآبٍ ۝

ترجمہ

۳۳۔ ہم نے سلیمان کا امتحان لیا اور ایک دھڑان کے تحت پھینک دیا پھر اس نے بارگاہ خدا کی طرف رجوع کیا۔

۳۵۔ اس نے کہا: پروردگار! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت عطا کر کہ جو میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو، کیونکہ تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔

۳۶۔ ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تاکہ وہ اس کے حکم کے مطابق آرام کے ساتھ چلے اور وہ جہاں چاہے جائے۔

۳۷۔ اور شیطانوں کو بھی ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیا اور ان میں سے ہر سمار اور غوطہ خور کو۔

۳۸۔ (اور شیطانوں میں سے) ایک اور گروہ کو بھی جو (اس کے اختیار میں تھے اور) زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

۳۹۔ (اور ہم نے اس سے کہا) یہ ہماری عطا ہے جسے بھی تو چاہتا ہے (اور مصلحت دیکھتا ہے) تو نے بخش دے اور جس سے تو چاہتا ہے روک لے اور تیرے کوئی حساب نہیں ہے۔

۴۰۔ اور اس (سلیمان) کے لیے ہمارے پاس بلند مقام اور نیک سزا انجام ہے۔

سلیمان کا سخت امتحان اور وسیع حکومت

یہ آیات حضرت سلیمان کی زندگی کے واقعات کا کچھ حصہ بیان کرتی ہیں۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انسان قدرت کے جس بندے کو چاہے اس کے پاس کچھ بھی خود اس کی طرف سے نہیں ہوتا اور جو کچھ بھی خود اس کی طرف سے ہے۔ یہ وہ بات ہے کہ اگر اس کی طرف توجہ ہو تو غرور و غفلت کے پردے انسان کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور کائنات میں وہ اپنی حیثیت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ ان آیات کا پہلا حصہ ایک آزمائش کے بارے میں ہے۔ اللہ نے حضرت سلیمان کو آزمایا۔ اس میں ایک ”ترک ادبی“ پیش آیا۔ اس کے بعد جناب سلیمان نے بلاگاہ خداوندی کا رخ کیا اور اس ترک ادبی پر توبہ کی۔ یہ آیات بھی چونکہ اجالی ہیں لہذا افسانہ پردازوں اور خیال پردازوں نے فائدہ اٹھایا اور بے بنیاد خیالی داستانیں بنا ڈالیں۔ انھوں نے اس عظیم نبی کی طرف بعض ایسی چیزیں منسوب کیں جو یا تو اس میں نہ تھیں اور نہ ہی اس کا مقام سمجھنے کے منافی ہیں یا اصولاً عقل و منطق ہی کے خلاف ہیں۔ یہ باتیں تمام محققین قرآن کے لیے خود ایک آزمائش میں جگانے قرآن کے متن میں جو کچھ کہا گیا ہے اگر اسی پر تامل کر لی جاتی تو ان بے ہودہ افسانوں کی گنجائش باقی نہ رہتی۔

پہلی ذریعہ آیت میں قرآن لکھا ہے: ہم نے سلیمان کا امتحان لیا اور اس کی کرسی پر ایک دھڑ ڈال دیا، پھر اس نے بارگاہ خداوندی کی طرف رجوع کیا اور اس کی طرف ٹوٹا (و لقد فتنا سلیمان والقیثا علیٰ کرسیہ جسداً اناب)۔ ”کرسی“ کا معنی ہے ”چھوٹے پاؤں والا تخت“ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے پاس دو طرح کے تخت ہوتے تھے۔ ایک تخت عام استعمال کے لیے ہوتا تھا جس کے پاؤں چھوٹے ہوتے تھے اور دوسرا تخت خصوصی پروگراموں کے لیے ہوتا تھا جس کے پائے بلند ہوتے تھے۔ پہلی قسم کے تخت کو ”کرسی“ کہا جاتا تھا اور دوسری قسم کے تخت کو ”عرش“ کہتے تھے۔

”جسد“ کا معنی ہے ”بے جان دھڑ“۔ مفردات میں راجب کے بقول اس کا مفہوم ”جسم“ کے مفہوم سے محدود تر ہے کیونکہ ”جسد“ کا مطلقاً غیر انسان پر نہیں ہوتا (سوائے شاذ و نادر مواقع کے) لیکن جسم کا مفہوم عام ہے۔ اس آیت سے اجالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان کی آزمائش بے جان دھڑ کے ذریعے ہوئی تھی وہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے تخت پر رکھ دیا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں قرآن میں کوئی وضاحت نہیں ہے۔ محققین و مفسرین نے اس سلسلے میں روایات و تفاسیر بیان کی ہیں ان میں سے زیادہ قابل توجہ اور واضح یہ ہے کہ:

سلیمان کی آزمائش کے اطمینان یا شرف اور شجاع اولاد نصیب ہو جو ملک کا نظام چلا لے اور خاص طور پر دشمنوں کے خلاف جہاد میں ان کی مدد کرے حضرت سلیمان کی متعدد دیوانی ہمتیں۔ انھوں نے دل میں ارادہ کیا کہ میں ان سے ہم بستر ہوتا ہوں تاکہ مجھے متعدد بیٹے نصیب ہوں کہ جو میرے مقام میں میری مدد کریں لیکن اس مقام پر ان سے غفلت ہوئی اور آپ نے ”انشاء اللہ“ نہ کہا کہ جو انسان کے ہر حالت میں اللہ پر تکیہ کا غماز ہے لہذا اس زمانے میں ان کی بیویوں سے کوئی اولاد نہ ہوئی سوائے ایک ناقص الخلقیت بچے کے۔ وہ بے جان دھڑ کے مانند تھا کہ جو لاکران کے تخت پر ڈال دیا گیا۔

سلیمان سخت پریشان اور فکر مند ہوئے کہ انھوں نے ایک لمحے کے لیے اللہ سے غفلت کیوں کی اور کیوں اپنی طاقت پر مجبور نہ کیا اس لیے انھوں نے توبہ کی اور بارگاہ الہی کی طرف رجوع کیا۔

ایک اور تفسیر بھی لائق توجہ معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ:

اللہ نے حضرت سلیمان کو ایک شدید بیماری کے ذریعے آزمایا۔ آپ کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا ایک بے جان دھڑ کے مانند اپنے تخت پر پڑے تھے اور عربی زبان میں معمول ہے کہ بہت کمزور اور نہایت بیمار انسان کو ”جسد بلا روح“ کہا جاتا ہے۔ آخر کار انھوں نے توبہ کی اور اللہ نے انھیں پہلی کی سی حالت میں ٹوٹا دیا (”اناب“ کا معنی ہے سلامتی کے ساتھ ٹوٹنا اور واپسی)۔

البتہ اس تفسیر پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس صورت میں ”والقیثا“ ہونا چاہیے تھا۔ یعنی ہم نے سلیمان کو اس کے تخت پر بے روح جسم کے مانند ڈال دیا جبکہ آیت میں یوں نہیں ہے اور اسے تقدیراً قرار دینا بھی خلاف ظاہر ہے۔

اس تفسیر کے مطابق لفظ ”اناب“ ”صحیح کے ساتھ ٹوٹنا“ کے معنی میں ہے اور یہ بھی خلاف ظاہر ہے لیکن اگر ”اناب“ کو خدا کی طرف توبہ اور رجوع کے معنی میں لیں تو اس تفسیر کو کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس صورت میں خلاف ظاہر بات صرف یہ رہ جائے گی کہ ”القیثا“ کی تفسیر حذف کر دی گئی ہے۔

باقی رہے چھوٹے اور قریح افسانے کہ جن کا ذکر بعض کتب میں بڑی آب و تاب سے کیا گیا ہے۔ ظاہراً ان کی جڑ عمود کے بودیوں کی فطرت جاتی ہے اور یہ سب اسرائیلیات اور خرافات ہیں کوئی عقل و منطق انھیں قبول نہیں کرتی۔ ان جمیع افسانوں میں کہا گیا ہے سلیمان کی انگوٹھی کھو گئی تھی یا وہ کسی شیطان نے چھین لی تھی اور خود ان کی جگہ تخت پر آ بیٹھا تھا وغیرہ وغیرہ۔

یہ افسانے ہر چیز سے قبل انھیں گھرنے والوں کے غلط فکری کی دلیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین اسلام نے جہاں کہیں ان کا نام لیا ہے ان کے بے بنیاد ہونے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ نہ تو مقام نبوت اور حکومت الہی انگوٹھی سے وابستہ ہے اور نہ کبھی یہ مقام اللہ اپنے کسی نبی سے چھینتا ہے اور نہ کبھی وہ شیطان کو نبی کی شکل میں لاتا ہے، چرچا کیونکہ افسانہ پردازوں کے مطابق وہ چالیس دن تک نبی کی جگہ پر بیٹھے اور لوگوں کے درمیان حکومت و قضاوت کرے گا۔

اگلی آیت میں حضرت سلیمان کی توبہ کا مسئلہ گزشتہ آیت کی نسبت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، اس نے کہا: پروردگارا! مجھے بخش دے (و قال سب اغفر لی) اور اللہ بھلی ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کے شایان نہ ہو کہ توبہ بہت عطا کرنے والا ہے (وہب لی ملکاً لا ینبغی لآحد من بعدی انک انت الوهاب)۔

دو سوال اور ان کے جواب

۱۔ کیا سلیمان کے اس تقاضے سے نخل کی بو نہیں آتی؟ اس سوال کے جواب میں مفسرین نے بہت سی باتیں کی ہیں جن کا زیادہ حصہ ظاہر آیات سے ہم آہنگ نہیں ہے جو جواب زیادہ مناسب اور زیادہ منطقی نظر آتا ہے وہ یہ ہے:

وہ بواضع کے وقت بھی ایک ماہ کا فاصلہ طے کرتی اور پھر کے وقت بھی ایک ماہ کا فاصلہ طے کرتی نیز اللہ تعالیٰ نے شیطانوں کو لہن کے تابع فرمان کر دیا وہ ان کے لیے مکانات تعمیر کرتے اور خواصی و پیراکی کا کام کرتے ملاوہ ازین انھیں پھندوں کی زبان کھانی گئی اور اللہ نے زمین پر ان کی حکومت قائم کی۔ لہذا اس زلزلے کے اور بعد کے لوگ سمجھ گئے کہ سلیمان کی حکومت نہ لوگوں کی بنائی گئی تھی اور نہ قہر و غلبہ اور ظلم و ستم سے حاصل ہوئی تھی۔

علی بن یقین کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: پھر بغیر اسلام سے منقول اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ آپ نے فرمایا: رحم اللہ انھی سلیمان بن داؤد ماکان ابلخلہ اندر دم کرے میرے بھائی سلیمان بن داؤد پر وہ کیسے بخیل تھے؟ امام نے فرمایا:

اس کے دو معانی ہیں۔

پہلا یہ کہ وہ اپنی ناکوس اور حرمت کے بارے میں بخیل تھے کہ کوئی ان کے بارے میں غیر مناسب بات کرے۔

دوسرا یہ کہ رسول اللہ کی ملاوہ تھی کہ اگر آیت قرآن کی یوں تفسیر کی جائے کہ جیسے معن جاہل کرتے ہیں کہ سلیمان نے اپنے لیے بے مطلب اور منحصر حکومت کا تقاضا کیا تو پھر انھیں ایک بخیل شخص مانا پڑے گا (اور یہ دراصل ان لوگوں کے لیے طنز ہے)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بعد والی آیات میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ نے سلیمان کی درخواست قبول کر لی اور انھیں خصوصی امتیازات اور عظیم نعمات والی حکومت عطا کی۔ ان امتیازات و نعمات کا پانچ حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ہواؤں کا ایک دہوار اور سواری کی طرح تابع ہونا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے، ہم نے ہوا کو اس کے تابع کر دیا تاکہ اس کے حکم کے مطابق آرام سے چلے اور جہاں کا وہ ارادہ کرے جائے (فسخ حور نالہ الریح تجردی یا مہرہ رخاء حدیث اصحاب)۔ واضح ہے کہ ایک وسیع و عریض حکومت میں تیز رفتار راہنوں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بوقت ضرورت سربراہ حکومت تیزی کے ساتھ ملک کے تمام علاقوں میں آجائے۔ اللہ نے یہ امتیاز حضرت سلیمان کو دے رکھا تھا۔

سوا کیسے ان کے تابع فرمان تھی؟ کتنی تیزی سے پہنچی تھی؟ حضرت سلیمان اور ان کے ساتھ ہوا کے ذریعے سفر کرتے ہوئے کس حسیہ پر سوار ہوتے تھے؟ اور کون سے عوامل انھیں گرنے سے بچاتے تھے اور ہوا کے دباؤ کی کمی بیشی اور دیگر مشکلات کے موقع پر ان کی حفاظت کرتے تھے؟ خلاصہ یہ کہ وہ کیسا اسرار آمیز وسیلہ تھا کہ جو اس زلزلے میں حضرت سلیمان کے قبضے میں تھا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کی جزئیات اور خصوصیات کے بارے میں جو اب ہمارے سامنے واضح نہیں ہے ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ ایک معجزہ تھا کہ جیسے معجزے نبی کے امتیاز میں دینے

حضرت سلیمان اللہ تعالیٰ سے اس قسم کی حکومت چاہتے تھے جس میں خاص معجزات ہوں اور وہ ان کی حکومت کو باقی حکومتوں سے ممتاز کریں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر نبی کا ایک خاص معجزہ تھا حضرت موسیٰ کے لیے عصا اور ید بیضہ کا معجزہ تھا حضرت ابراہیم کے لیے آگ سرد ہونے کا معجزہ تھا حضرت ماریچ کے لیے ایک خاص قسم کی اوشنی کا معجزہ تھا اور غیر اسلام کا معجزہ قرآن مجید ہے۔ حضرت سلیمان کی ایک حکومت تھی جو معجزات سے بہرہ ور تھی۔ مثلاً ہواؤں پر حکومت، شیطانوں پر حکومت اور اسی طرح دیگر بہت سی خصوصیات۔

یہ چیز انبیاء کے لیے کوئی نقص شمار نہیں ہوتی کہ وہ اپنے لیے کسی مخصوص معجزے کا تقاضا کریں کہ جو ان کی کیفیت کو پوری طرح واضح کرے لہذا اس میں کوئی مانع نہیں کہ دوسرے لوگوں کی سلیمان سے وسیع تر حکومت ہو لیکن اس میں حضرت سلیمان کی حکومت کے امتیازات نہیں ہوتے اس بات کی شاہد بعد والی آیت ہے کہ جس میں درحقیقت جناب سلیمان کی اس دعا کی اجابت ظاہر ہوتی ہے اس میں ہواؤں اور شیطانوں کے معجز ہونے کا ذکر ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ بات حضرت سلیمان کی حکومت کے امتیازات میں سے تھی۔

۲۔ کیا امام مہدی کی حکومت وسیع تر نہ ہوگی؟ گزشتہ جلد ہی سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام (ارواحنا لله الفداء) کی حکومت ایک عالمی حکومت ہوگی جو یقیناً حکومت سلیمان سے بہت وسیع ہوگی۔ البتہ حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت اپنی تمام تر وسعت اور دیگر حکومتوں سے اپنی خصوصیات و امتیازات سے باوجود جناب سلیمان کی حکومت سے مختلف ہوگی اور حضرت سلیمان کی حکومت اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت سلیمان کی گفتگو کی پیشی، افزوں طلبی اور انحصار جوئی کے لیے نہ تھی گفتگو تو نبوت کے اس کمال کے بارے میں تھی کہ وہ معجزات کے لحاظ سے ایسی خصوصیات رکھتی ہو جو کسی نبی کو دیگر انبیاء سے مشخص کرے اور حضرت سلیمان اسی کے طالب تھے۔

بعض روایات جو اہل بیت علیہم السلام کے طریق سے حضرت امام موسیٰ بن جعفر سے منقول ہیں میں بخیل کے بارے میں سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ جو بہت جاذب توجہ ہے۔ حدیث اس طرح ہے:

آپ کے ایک محب علی بن یقین نے امام سے سوال کیا: کیا جائز ہے کہ اللہ کا نبی بخیل ہو؟ امام نے فرمایا: نہیں

علی بن یقین نے عرض کی: پھر حضرت سلیمان نے یہ کیوں کہا

رب اغفر لی و ہب لی ملکاً لا ینبغی لآحد من بعدی پروردگار! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت عطا کر کہ جو میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو۔

اس آیت کا مفہوم اور تفسیر کیا ہے؟ امام نے فرمایا:

حکومت دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو ظلم، تسلط اور لوگوں کو مجبور کر کے حاصل کی جائے اور دوسری حکومت وہ کہ جو اللہ کی طرف سے ہو، جیسے ابراہیم کے خاندان کی، طاہوت کی اور ذوالقرنین کی حکومت۔ سلیمان خدا سے چاہتے تھے کہ وہ انھیں ایسی حکومت دے کہ ان کے بعد کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ یہ حکومت لوگوں پر ظلم اور قہر و جبر سے حاصل کی گئی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہوا کو ان کے تابع فرمان کر دیا تاکہ جو ہر وہ چاہیں وہ آرام سے چل سکیں

جاتے تھے۔ یہ ایک امام اور معمول کے مطابق بات نہ تھی۔ یہ ایک عظیم نعمت اور اعجاز تھا اور ایسا کہ ناقدرت الہی کے لیے ملوہ اور آسان مانا ہے۔ تیز لیے ہمت سے مسائل ہیں کہ اصلی طور پر تو ہم انھیں جانتے ہیں لیکن ان کی جزئیات سے ہم واقف نہیں ہیں۔ اس موقع پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ لفظ ”دخاء“ (نرم اور ملائم) جو اس آیت میں آیا ہے وہ سورۃ انبیاء کی آیت ۸۱ میں آئے والے لفظ ”عاصفہ“ (آندھی) سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے:

ولسليمان الريح عاصفة تجرى بامرہ الى الارض التي باركنا فيها
ہم نے تیز ہوا کو سلیمان کے لیے سخر کر دیا کہ جو اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جسے ہم نے
برکت دے رکھی تھی۔

اس سوال کا جواب دو طریقوں سے دیا جا سکتا ہے۔

پہلا یہ کہ ”عاصفہ“ (تیز ہوا) اس کی سرعت رفتار کے لیے ہے اور ”دخاء“ اس کے منظم اور آرام دہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ہوا کے تیز رفتار ہونے کے باوجود انھیں پلنے میں پریشانی کا احساس نہیں ہوتا تھا، بالکل ہارے زلنے کے ترقی یافتہ تیز رفتار ذرات اور آیت کی طرح۔ ان میں بھی بعض وسائل ایسے ہیں کہ انسان جب ان کے ذریعے سفر کرتا ہے تو یوں محسوس کرتا ہے جیسے اپنے گھر کے کمرے میں بیٹا ہے۔ حالانکہ وہ چیز انتہائی تیز رفتاری سے چل رہی ہوتی ہے۔

دوسرا یہ کہ بعض مفسرین نے ان دو آیات کو دو قسم کی ہواؤں کا ذکر سمجھا ہے اور دونوں کو اللہ نے حضرت سلیمان کے اختیار میں رکھا تھا۔ ایک تیز رفتار ہوا تھی اور دوسری آہستہ رو۔

۲۔ دوسری نعمت اللہ تعالیٰ نے جناب سلیمان کو یہ عطیہ بھی کر سخرش موجودات ان کے لیے سخر کر دیئے گئے تھے اور ان کے اختیار میں دے دیئے گئے تھے تاکہ آپ ان سے مثبت کام لے سکیں۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے، ”اور ہم نے شیطانوں کو اس کے لیے سخر کر دیا اور ان میں سے ہر صمد اور خواص کو اس کا تابع فرمان بنا دیا، تاکہ ان میں سے کچھ شعلہ کی میں اس کے کئے کے مطابق تیز رفتاری کریں اور کچھ دریا میں خواص اور غوطہ زنی کے کام لیں (والشیاطین کل بقاء وغواص)۔“

اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے مثبت کاموں کے لیے موجود قوت ان کے اختیار میں دے دی۔ شیطان کہ جن کے مزاج ہی میں سخرش ہے وہ ان کے لیے اس طرح سے سخر ہو گئے کہ ان سے تعمیری اور اصلاحی کام لیا جانے لگا اور گراں بہا منابع سے استفادہ کے لیے وہ استعمال ہونے لگے۔

صرف اس آیت میں نہیں بلکہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ شیطان حضرت سلیمان کے تابع فرمان تھے اور ان کے حکم کے مطابق مثبت کام کرتے تھے۔ البتہ بعض آیات مثلاً ذریعہ آیت اور سورۃ انبیاء کی آیت ۸۲ میں ”شیاطین“ کا لفظ ہے جبکہ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۲ میں ”جن“ کا لفظ ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ جن ”ایک ایسا موجود ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن عقل و شعور اور طاقت کا حامل ہے۔ نیز جنوں

لے ”شیاطین“ کا ”الریح“ پر صفت ہے کہ ”سبحونا“ کا مفعول ہے اور ”کل بقاء وغواص“ ”شیاطین“ کا مفعول ہے۔

جنوں بھی ہیں اور کافر بھی اور اس میں کوئی مانع نہیں کہ حکم خدا سے وہ ایک نبی کے تابع فرمان ہو جائیں اور مفید کام انجام دیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ لفظ ”شیاطین“ کا ایک وسیع تر معنی ہو کہ جس میں سخرش انسان بھی شامل ہوں اور ان کے علاوہ بھی۔ لفظ ”شیطان“ کا اطلاق قرآن مجید میں اس وسیع مفہوم پر ہوا ہے (مثلاً سورۃ انعام کی آیت ۱۱۲)۔

ہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو یہ طاقت دی تھی کہ وہ تمام سخرشوں کو اپنے سامنے جھکا سکیں۔

۳۔ تیسری نعمت اللہ نے حضرت سلیمان کو یہ عنایت کی تھی کہ انھوں نے تخریب کار اور فسادی قوتوں پر قابو پارکھا تھا، کیونکہ ہر حال بعض شیطان لیے بھی تھے کہ جن سے ایک مفید اور اصلاحی قوت کے طور پر کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ قید و بند میں رہیں تاکہ معاشرہ ان کی مزاحمت سے پیدا ہونے والے شر سے محفوظ رہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں قرآن کہتا ہے: ”اور شیطانوں کا ایک اور گروہ اس کے قانون زنجیروں میں پکڑا ہوا تھا (وآخر من مسقرین فی الاصفاد)۔“

”مقرنین“، ”قسن“ کے مادے سے مقارنت اور زنجی کے معنی میں ہے۔ یہاں یہ لفظ ہاتھ پاؤں یا گردن کو زنجیر میں جک کر کے معنی میں ہے۔

”اصفاد“، ”صفد“ (بروزن ”مذ“) کی جمع ہے جو قید و بند کے وسیلے کے معنی میں ہے، مثلاً ہتھکڑیاں اور بیڑیاں جو قیدیوں کو پہنائی جاتی ہیں۔ بعض نے مقرنین فی الاصفاد سے ایسی زنجیر مراد لی ہے کہ جس سے ہاتھوں کو گردن کے ساتھ بانڈھ دیا جاتا تھا اور یہ مضموم ”مقرنین“ کے معنی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ ان کے الگ الگ گروپ تھے اور ہر گروپ کے لیے الگ قید اور بندش تھی۔

البتہ یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ”شیاطین“ سے مراد شیاطین جن ہیں کہ جو فطری طور پر جہم لطیف رکھتے ہیں تو پھر زنجیر اور ہتھکڑیاں ان کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتیں۔ اس لیے بعض نے کہا ہے کہ یہ تعبیر انھیں تخریبی کاروں یا انہوں سے باز رکھنے کے معنی کے لیے کن ہے۔

۴۔ چوتھی نعمت اللہ تعالیٰ نے جناب سلیمان کو یہ دی تھی کہ انھیں ہمت سے اختیارات دے رکھے تھے کہ جن کی وجہ سے کسی کو کھڑا کرنے اور یا نہ کرنے میں وہ صاحب اختیار تھے۔ جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے: ”ہم نے اس سے کہا: یہ ہماری عطا و بخشش ہے جسے تو (صلحت کے مطابق) چاہتا ہے عطا کر اور جس سے تو (صلحت کے مطابق) روکنا چاہتا ہے روک لے۔“ (اور صحت دیکھے) آزاد کر دے اور جس کے (ہذا عطا و تافامن اوامسک بغیر حساب)۔

”بغیر حساب“ یا تو اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے تیرے مقام عدالت کی بنا پر تجھے وسیع اختیارات دیئے ہیں اور تجھ سے روکنا کچھ نہ ہوگی، یا اس کا معنی یہ ہے کہ عطیہ الہی تجھ پر اس قدر ہے کہ جس قدر بھی تو بخش دے اس میں حساب نہیں ہوگا۔

بعض مفسرین نے اس تعبیر کو صرف گرفتار شیاطین سے مراد لیا ہے کہ جسے تو چاہے (اور صحت دیکھے) آزاد کر دے اور جس کے لیے قید میں صحت کجھے اسے قید کر دے۔

لے ”آخرین“ کا مفعول ”کل بقاء وغواص“ پر ہے اور ”سبحونا“ کے مفعول کے حکم میں ہے اور ”مقرنین“ ”آخرین“ کی صفت ہے۔

لیکن یہ سنی بعید نظر آتا ہے کیونکہ یہ ”عطاؤنا“ کے ظاہری مضموم سے ہم آہنگ نہیں ہے۔
۵۔ پانچویں نعمت جو اللہ نے حضرت سلیمان کو دی وہ ان کا روحانی مقام تھا کہ جو اللہ نے ان کی اہمیت و عظمت کی بنا پر مرحمت فرمایا تھا۔ جیسا کہ زیر بحث آئیت میں فرمایا گیا ہے: اس کے لیے ہمارے پاس بندہ مقام اور نیک انجام ہے (و ان عندنا لنزلن وحسن مآب)۔

یہ جملہ درحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے اس عظیم نبی کے مقام مقدس پر طرح طرح کی ناروا اور بے پورہ تمقینوں میں موجود تورات کی پیروی کی۔ اس آیت میں قرآن حضرت سلیمان کو تمام نعمتوں سے سزا قرار دے رہا ہے اور خدا کے ان انہی کے مقام کی خبر دے رہا ہے۔ یہاں تک کہ ”حسن مآب“ کہہ کر ان کے انجام بخیر کی خبر بھی دی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ قہر میں آنے والی اس ناروا نسبت کی نفی ہو کہ حضرت سلیمان نے بت پرستوں میں شادی کی تھی، جس وجہ سے ان کا مہمان بت پرستی کی طرف ہو گیا تھا۔ موجودہ تورات یہاں تک کہتی ہے کہ انہوں نے بت خانہ بنایا تھا، لیکن قرآن ”حسن مآب“ کہہ کر ان تمام اوہام و ظن کو خط بطلان کچھن رہا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ داستان سلیمان سے حاصل ہونے والی درس؛ شک نہیں کہ تاریخ انبیاء ذکر کرنے سے قرآن کا مقصد یہ ہے کہ ان زندہ واقعات میں سے مینی حقائق منفس کیے جائیں تاکہ تربیتی پروگرام کی تکمیل ہو سکے۔ حضرت سلیمان کی داستان سے جو حقائق ملتے آتے ہیں ان میں یہ امور بھی شامل ہیں:

۱۔ ایک طاقت ور حکومت، فراوان مادی وسائل اور وسیع اقتصادی وسائل وغیر شمالی اور درختان تمدن ان سب کی موجودگی روحانی مقامات اور الہی و انسانی اقدار کے مٹاؤ نہیں ہے۔ جیسا کہ زیر بحث آیات میں حضرت سلیمان کے پاس موجود تمام مادی نعمات کے ذکر کے بعد آخر میں بارگاہ الہی میں ان کے بندہ مقام اور نیک انجام کا ذکر کرتی ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ارشاد فرماتے ہیں:

اربع یتیم ما اعطی سلیمان بن داؤد من ملکہ؛ فان ذلک لمریزہ الانتعشا،

ماکان یرفع بصرہ الی السماء تخشعاً لربہ

تمہ نے دیکھا کہ اللہ نے سلیمان کو کیسی عظیم حکومت دی اس کے باوجود ان میں خشوع و خضوع کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا یہاں تک کہ شہرت و شہو کے باعث وہ آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف نہیں دیکھتے تھے۔

۲۔ ایک آباد ملک کا نظام چلانے کے لیے تیز رفتار رابطے کی بھی ضرورت ہے۔ مختلف قوتوں سے کام لینے کی بھی اور

۴۱- وَادْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ
بِنُصَبٍ وَعَذَابٍ ۝

۴۲- أَرْكُضُ بِرَجْلِكَ هَذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ ۝

۴۳- وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرًا
لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝

۴۴- وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْتًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنُتْ إِنَّا وَجَدْنَاهُ
صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝

ترجمہ

۴۱- ہمارے بندے ایوب کو یاد کر، جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے رنج اور اذیت دی ہے
۴۲- (ہم نے اس سے کہا) اپنے پاؤں سے زمین پر ٹھوکر مار، یہ ٹھنڈے پانی کا چشمہ نہانے اور پینے کے لیے ہے۔
۴۳- اور ہم نے اسے اس کا خاندان عطا کیا اور ان کی طرح اور بھی ان کے ساتھ قرار دیئے تاکہ ہماری طرف سے
رحمت ہو اور صاحبانِ فکر کے لیے ایک نصیحت ہے۔

۴۴- اور ہم نے اس سے کہا مٹھی بھر گندم کی (یا اس جیسی) سبکیں لے اور اسے (اپنی بیوی کو) مار اور اپنی
قسم نہ توڑ، ہم نے اسے صابر پایا، کیا اچھا بندہ تھا کہ خدا کی طرف بہت رجوع کرنے والا تھا۔

تفسیر

حضرت ایوب کی حیران کن زندگی اور ان کا صبر

گزشتہ آیات میں حضرت سلیمان کی حثمت اور دہبے کے بارے میں گفتگو تھی کہ جو خدا داد قدرت کی مظہر تھی اور حضرت سلیمان
داستانِ رسولِ اکرمؐ اور مکہ میں موجود ان مسلمانوں کے لیے ایک نوید کے مانند تھی کہ جو سخت دباؤ میں تھے۔
زیر بحث آیات حضرت ایوب کے بارے میں ہیں کہ جو صبر و استقامت کا نمونہ تھے، ان کا ذکر اس لیے ہے تاکہ اس وقت

اور پھر آج کے اور آئندہ کے مسلمانوں کے لیے مشکوں اور بریشانیوں میں استقامت، قیام اور جدوجہد کا درس ہو اور انھیں ہامردی کی
حوت دی جائے اور اس صبر و استقامت کا حسن انجام واضح کیا جائے۔

ایوب تیسرے نبی ہیں کہ جن کی زندگی کا کچھ حصہ اس سورہ میں بیان کیا گیا ہے اور ہمارے عظیم نبی پر فرض کیا گیا ہے کہ ان کی
سرگزشت کو یاد رکھیں اور ان مسلمانوں کے سامنے بیان کریں تاکہ وہ طاقت فرسا مشکلات سے ہر اسال تہ ہوں اور اللہ کے لطف و
رحمت سے کبھی بھی مایوس نہ ہوں۔

حضرت ایوب کا نام اور ان کی زندگی کا ذکر قرآن کریم کی کئی ایک سورتوں میں آیا ہے۔ سورہ نساء کی آیت ۱۶۲ اور سورہ انفام
کی آیت ۸۴ میں دیگر انبیاء کے ساتھ ان کے صرف نام پر اتنا کیا گیا ہے کہ جس سے ان کا مقام نبوت ثابت اور واضح ہوتا ہے
پر خلاف موجودہ تواریخ کے کہ جو انھیں انبیاء کے زمرے میں شمار نہیں کرتی بلکہ انھیں ایک نیک اور صالح انسان سمجھتی ہے کہ جسکی بہت سی
اولاد تھی اور جو صاحبِ مال شخص تھے۔

سورہ انبیاء کی آیت ۸۲ اور ۸۴ میں ان کی زندگی کے کچھ حالات بیان ہوئے ہیں اور سورہ ص کی زیر بحث آیات میں دیگر مقامات سے
مفصل تر حالات بیان ہوئے ہیں اور یہاں اس ضمن میں چار آیات آئی ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہمارے بندے ایوب کو یاد کر کہ جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کی: شیطان نے مجھے بہت
تکلیف اور اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے (واذکر عبدنا ایوب اذ نادى ربه انى مسنى للشيطان بنصب وعذاب)۔
”نصب“ (”عسر“ کے وزن پر) اور ”نصب“ (”حسد“ کے وزن پر) دونوں بلا ومصیبت کے معنی
میں ہیں۔ اس آیت میں۔

اذلاً: بلاگواہی میں حضرت ایوب کا بندہ مقام ”عبدنا“ (ہمارا بندہ) سے معلوم ہوتا ہے۔
ثانیاً، اشارتاً حضرت ایوب کی شدید اور طاقت فرسا تکلیف اور فزاواں مصیبت کا ذکر ہے، اس ماجرے کی تفصیل قرآن میں
میں آئی لیکن حدیث و تفسیر کی مشورکت میں اس کی تفصیل نقل ہوئی ہے۔

کسی شخص نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا:
وہ مصیبت جو حضرت ایوب کو دامن گیر ہوئی، کس بنا پر تھی پھر شاید مسائل کا خیال تھا کہ ان سے کوئی
غلط کام سرزد ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اللہ نے انھیں مصیبت میں مبتلا کر دیا۔

امام نے اس سوال کا تفصیلی جواب دیا جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:
ایوب کفرانِ نعمت کی وجہ سے ان عظیم مصائب میں گرفتار نہیں ہوئے بلکہ اس کے برعکس شکرِ نعمت
کی وجہ سے ہوئے کیونکہ شیطان نے بارگاہِ خدا میں عرض کی کہ یہ جو ایوب تیرا شکر گزار ہے وہ فزاواں
نعمتوں کی وجہ سے کہ جو تو نے اسے دی ہیں، اگر یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو یقیناً وہ کبھی
شکر گزار بندہ نہیں ہوگا۔

اس بنا پر کہ ساری دنیا پر ایوب کا خلوص واضح ہو جائے اور انھیں عاملین کے لیے نمونہ قرار دیا جائے تاکہ

لوگ نعمت اور مصیبت ہر دو عالم میں مٹا کر صابر رہیں۔ اللہ نے شیطان کو اجازت دی کہ وہ حضرت ایوب کی دنیا پر قبضہ کرے۔ شیطان نے اللہ سے خواہش کی ایوب کا فراوان مال و دولت، ان کی کھیتیاں، بھیر بگیاں اور آل و اولاد سب ختم ہو جائے۔ آفتیں اور مصیبتیں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا لیکن نہ صرف یہ کہ ایوب کے شکر میں کمی نہ آئی بلکہ اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ خدا سے شیطان نے خواہش کی کہ اب اسے ایوب کے ہرن پر بھی مسلط کر دے اور وہ اس طرح بیمار ہو جائے کہ ان کا بدن شدت درد کی لپیٹ میں آجائے اور وہ بیماری کے بستر کا امیر ہو جائے لیکن اس چیز نے بھی ان کے مقام شکر میں کمی نہ کی۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے ایوب کا دل توڑ دیا اور ان کی روح کو سخت مجروح کیا۔ وہ یہ کہ بنی اسرائیل کے راجہوں کی ایک جماعت انھیں دیکھنے آئی اور انھوں نے کہا کہ تو نے کون سا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے اس دردناک مناب میں مبتلا ہے؟ ایوب نے جواباً کہا: میرے پردرد دکھار کی قسم کبھی سے کوئی غلط کام نہیں ہوا میں ہمیشہ اللہ کی اطاعت میں کوشاں رہا ہوں اور میں نے جب بھی کوئی لغتہ خدا کا لکھا ہے کوئی نذوقی تیم و بے فواید میرے دسترخوان پر ہوتا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ایوب دوستوں کی اس شامت پر ہر دوسری مصیبت سے زیادہ دکھی ہوئے پھر بھی صبر کا دامن نہ چھوڑا اور شکر کے صفاق و شیریں پانی کو کفران سے آلودہ نہ کیا، صرف بارگاہ خدا کی طرف رخ کیا اور مذکورہ مقلد عرض کیا اور چونکہ آپ اللہ کے امتحانوں سے خوب عمدہ ہر آہوئے لہذا اللہ نے اپنے اس شاگرد صابر بندے پر پھر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیئے اور کھوئی ہوئی نعمتیں یکے بعد دیگرے پہلے سے بھی زیادہ انھیں عطا کیں تاکہ سب لوگ مہر و شکر کا نیک انجام دیکھ لیں۔

بعض بزرگ معشرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ شیطان نے حضرت ایوب کو مختلف و سوسوں کے ذریعے اذیت دی تھی۔ کبھی کتا تھا، بھاری بیماری بہت طویل ہو گئی ہے اللہ نے تمہیں مجھلا دیا ہے۔

کبھی کتا تھا، بھارے پاس کیا عظیم نعمتیں تھیں؟ کسی صحت و طاقت تھی؟ سب خدانے تم سے چھین لی ہیں اور تم پھر بھی اس کا شکر ادا کر رہے ہو؟

شاید یہ تفسیر اس بنا پر ہو کہ ان معشرین نے ایوب جیسے پیغمبر، ان کی جان، مال اور اولاد پر شیطان کا تسلط بعد کجا ہے

۱۔ یہ روایت تفسیر نور العین میں تفسیر علی بن ابراہیم کے حملے سے نقل کی گئی ہے۔ یہی معنی تفسیر قرطبی، تفسیر فخر رازی اور تفسیر صافی وغیرہ میں اور اسلام القرآن میں کچھ فرق کے ساتھ آیا ہے۔ عمدتہ کی کتب میں کتاب ایوب میں اس سے ملنے جلتے مطالب نظر آتے ہیں اگرچہ یہ مطالب اسلامی کتب میں آنے والی تفصیلات سے مختلف ہیں۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اولاً تو یہ تسلط فرمان خدا سے تھا، ثانیاً وقتی طور پر تھا اور ثالثاً اس عظیم نبی کی آزمائش اور بندگی تھا کے لیے تھا، اس لیے اس سے کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔

ہر حال کہتے ہیں کہ ان کی بیماری اور ناراحتی سات سال تک رہی اور ایک روایت کے مطابق سترہ برس تک رہی، یہاں تک کہ آپ کے نزدیک ترین ساتھی بھی ساتھ چھوڑ گئے، صرف ایک بھوی نے وف میں استقامت کی اور یہ چیز خود ایک شاہد ہے بعض یوں کی وفاداری پر۔ لیکن ایوب کو جس چیز سے زیادہ دکھ ہوتا تھا وہ دشمنوں کی شامت تھی۔ اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت ایوب کو کوئی بونی صحت و سلامتی پھر مل گئی اور رحمت الہی کے دروازے ان کے لیے کھل گئے تو لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ سب سے شدید درد آپ کو کون سا تھا تو آپ نے کہا: دشمنوں کی شامت۔

انجام کار حضرت ایوب آزمائش الہی کی اس گرم جھٹی سے صحیح و سالم باہر نکل آئے اور پھر رحمت خدا کا آغا ہوا۔ انھیں حکم دیا گیا کہ "اپنا پاؤں زمین پر مارو" تو پانی کا چشمہ اُبل پڑے گا کہ جو تیرے نہانے کے لیے ٹھنڈا بھی ہوگا اور تیرے پینے کے لیے عمدہ بھی (ارکض بر جملک هذا مغتسل بار د و شراب)۔

"ارکض" "رکض" (بروزن "مکت") کے مادہ سے زمین پر پاؤں مارنے کے معنی میں ہے اور کبھی یہ لفظ دوڑنے کے معنی میں بھی آتا ہے، لیکن یہاں پہلے والا معنی ہے۔

وہی خدا جس نے خشک اور پتے بیابان میں شیر خوار اسمائیل کی اڑیوں کے پٹھے چشمہ پیدا کر دیا، وہی خدا کہ ہر حرکت و سکون اور ہر نعمت و عنایت جس کی طرف سے ہے، اس نے یہ فرمان ایوب کے لیے بھی صادر فرمایا، پانی کا چشمہ اُبلنے لگا، ٹھنڈا اور میٹھا چشمہ جو اندرونی و بیرونی سب بیماریوں کے لیے شفا بخش تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ اس چشمے میں ایک طرح کا معدنی پانی تھا جو پینے کے لیے بھی اچھا تھا اور بیماریوں کو دور کرنے کے لیے بھی موثر تھا۔ ہر حال کچھ بھی تھا ایک صابر و شاکر نبی کے نیلے اللہ کا لطف و کرم تھا۔

"مغتسل" نہانے والے پانی کو کہتے ہیں۔ بعض نے اسے نہانے کی جگہ کے معنی میں سمجھا ہے لیکن یہاں معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ہر حال ٹھنڈا ہونے کے لحاظ سے پانی کی تعریف شاید اس طرف اشارہ ہو کہ ٹھنڈے پانی سے نہانا بدن کی صحت و سلامتی کے لیے خصوصی تاثیر رکھتا ہے جیسا کہ موجودہ طب میں بھی ثابت ہو گیا ہے۔

تیز یہ اس امر کی طرف لطف اشارہ ہے کہ نہانے کے لیے بہترین پانی وہ ہے جو پاکیزگی اور لطافت کے لحاظ سے پینے کے پانی جیسا ہو۔ اس امر کا شاہد یہ ہے کہ اسلامی احکام میں بھی آیا ہے کہ:

اس سے پہلے کہ پانی سے غسل کرو اس میں سے ایک گھونٹ پی لو۔

پہلی اور اہم ترین خدائی نعمت صحت تھی، جب وہ ایوب کی طرف لوٹ آئی تو دوسری نعمتوں کے کوٹنے کی نوبت آئی، اس مسئلے میں قرآن کتاب ہے: ہم نے اسے اس کے گھروا لے بخش دیئے (و وہبنا لہ اھلہ)۔ اور ان کے ساتھ ان کے

ماند بھی قرار دینے (و مثلہم معہم) تاکہ ہماری طرف سے رحمت ہوا اور صاحبان فکر و نظر کے لیے نصیحت بھی (یعنی) متا و ذکر ہی لا ولی الا لیاہب)۔

ان کا گھرانہ ان کے پاس کیسے واپس آیا، اس سلسلے میں مختلف تفسیریں موجود ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ وہ مرچکے تھے اور انہوں نے انہیں پھر زندگی دی۔

لیکن بعض نے لکھا ہے کہ حضرت ایوبؑ کی طویل بیماری کے باعث وہ ادھر ادھر بکھر چکے تھے جب حضرت ایوبؑ صحت یاب ہو گئے تو وہ پھر آب کے گرد گرجے ہوئے۔

کچھ لوگوں نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ وہ سب یا ان میں سے بعض افراد بھی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے رحمت الہی کے شال حال ہوئی وہ سب رو بصحت ہو گئے اور پروانوں کی طرح وجود پر کی شمع کے گرد جمع ہو گئے۔

اور ان کے ساتھ ان کے ماند بھی قرار دینے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے ان کے گھر کو پہلے سے بھی زیادہ آباد اور پُر رونق کیا اور ایوبؑ کو مزید بیٹے عطا کیے۔

ان آیات میں اگرچہ حضرت ایوبؑ کی مال و دولت کے بارے میں بات نہیں کی گئی لیکن موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے پھر آپ کو مال و دولت بھی فراوان تر عطا فرمایا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں حضرت ایوبؑ کی طرف نعمات الہی کے لوٹ آنے کا مقصد دو چیزیں شمار کی گئی ہیں؛ ایک ان پر اللہ کی رحمت کہ جو انفرادی پہلو رکھتی ہے اور دوسری حقیقت صابر و شاکر بندے کے لیے اجر و انعام ہے اور دوسری

تمام تاریخ انسانی میں صاحبانِ نقل و خرد کے لیے درسِ ہدایت، تاکہ وہ مشکلوں اور تنگیوں میں صبر و شکیبائی کا راستہ نہ چھوڑیں اور ہمیشہ رحمت الہی کا میدوار رہیں۔

اب صرف ایک مشکل ایوبؑ کے لیے باقی تھی وہ تھی وہ قوم جو انہوں نے اپنی بیوی کے بارے میں کھائی تھی اور وہ یہ تھی کہ انہوں نے ان سے کوئی غلافِ مرضی کام دکھایا تھا لہذا انہوں نے اس بیماری کی حالت میں تم کھائی کہ جس وقت ان میں طاقت پیدا ہوگی تو وہ اسے

ایک سو یا اس سے کچھ کھڑے کریں گے، لیکن صحت یابی کے بعد وہ چاہتے تھے کہ اس کی نعمات اور فواد ازلوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے مان کر دیں لیکن تم اور خدا کے نام کا سنو درمیان میں تھا۔ خدا نے یہ مشکل بھی ان کے لیے حل کر دی۔ جیسا کہ قرآن کتاب ہے کہ ان سے

فرمایا گیا:۔ گندم کی شاخوں (یا اسی قسم کی کسی چیز) کی ایک مٹی بھرو اور اس کے ساتھ مارو اور اپنی قسم نہ توڑو (وخذ بیدک صغفًا فاضرب بہ ولا تحنث)۔

”صغف“ (بروزن ”حرس“) گندم یا جو کی نرم و نازک شاخوں کی ایک مٹی یا خرما کے خوشے کے تار یا پھولوں کی طرح

کی چیزوں کی ایک مٹی کے معنی میں ہے۔ حضرت ایوبؑ کی بیوی کا نام ایک روایت کے مطابق لیا بنت یعقوب تھا۔ اس بارے میں کہ اس سے کون سی غلطی ہوئی تھی پتھرین کے درمیان بحث ہے۔

مشہور مفسر ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ شیطان یا کوئی شیطان صفت) ایک طیب کی صورت میں ایوبؑ کی بیوی کے پاس آیا

اس نے کہا: میں تیرے شوہر کا ملاج کتابوں میں صرف اس شرط پر کہ جس وقت وہ ٹھیک ہو جائے تو وہ مجھ سے یہ کتبِ حسنیٰ لے لے شغلیاب کیا ہے، اس کے علاوہ میں اور کوئی اجرت نہیں چاہتا۔

ان کی بیوی نے جو ان کی سلسلِ بیماری کی وجہ سے سخت پریشان تھی اس شرط کو قبول کر لیا اور حضرت ایوبؑ نے یہ جو یہ پیش کی۔ حضرت ایوبؑ جو شیطان کے جال کو بکھتے تھے، بہت ناراض ہوئے اور قسم کھائی کہ وہ اپنی بیوی کو سزا دے گا۔

بعض نے کہا ہے کہ جناب ایوبؑ نے اسے کسی کام کے لیے بھیجا تھا تو اس نے دیر کر دی، حضرت ایوبؑ جو کج حدت سے تھے، بہت پریشان ہوئے اور اس طرح کی قسم کھائی۔

بہر حال اگر وہ ایک طرف سے اس قسم کی سزا کی تھی تو دوسری طرف اس طویل بیماری میں اس کی وفاداری و سختِ بخاری اس قسم کے عنود و گزر کا استحقاق بھی رکھتی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ گندم کی شاخوں کے ایک دستہ یا خوشہ خرما کی لکڑیوں سے مارنا ان کی قسم کا واقعی مصداق نہیں تھا جس کے نام کے احترام کی حفاظت اور قانون شکنی پھینکنے سے روکنے کے لیے انہوں نے یہ کام کیا اور یہ بات صرف اس صورت میں ہی مستحق عنود و گزر ہو، اور انسان چاہے کہ عنود و گزر کے باوجود قانون کے ظاہر کو بھی محفوظ رکھے ورنہ ایسے مواقع پر جو مستحقِ بخشش

ذہب و مال ہرگز اس کام کی اجازت نہیں ہے۔

آخر میں زیر بحث آیات کے آخری جملے میں جو اس داستان کی ابتدا و انتہا کا پتہ دے، فرمایا گیا ہے: ہم نے وہ

شکیبا پایا، ایوب کتنا اچھا بندہ تھا جو ہماری طرف بہت زیادہ بازگشت کرنے والا تھا (انا وجدناہ صابریٰ حاد)۔

یہ بات کے بغیر یہ ظاہر ہے کہ ان کا خدا کی بارگاہ میں دعا کرنا اور شیطان کے دوسوں اور درد، تکلیف اور عجز سے نکلنے کا تقاضا کرنا، مقام صبر و شکیبائی کے نمانی نہیں اور وہ بھی سات سال اور ایک روایت کے مطابق اٹھارہ سال تک یہ سختی کے ساتھ نبھانے اور شاکر رہنے کے بعد۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس جملے میں حضرت ایوبؑ کی تین اہم صفات کے ساتھ توصیف کی گئی ہے کہ جو جس قسم کی تین جہتیں وہ ایک انسان کا مل ہوتا ہے۔

۱۔ مقامِ عبودیت ۲۔ صبر و استقامت ۳۔ پے در پے خدا کی طرف بازگشت

چند اہم نکات

ایوبؑ کی داستان کے اہم درس: اس کے باوجود کہ اس صابر و پتھر کی ساری سرگزشت اس سورہ کی صفحہ تین میں آئی ہے لیکن یہی مقدار جو قرآن نے بیان کی ہے بہت سے اہم حقائق کے لیے ہدایت بخش ہے۔

۱۔ اس معنی کی نظیر حدود اسلامی اور ان کے اجراء کے باب میں خطا کار تیاروں کے بارے میں بھی آئی ہے (کتب العودہ ابواب ص ۱۰۰)

الف: خدا کی طرف سے آزمائش کا میدان اتنا وسیع اور کشادہ ہے کہ عظیم پیغمبر تک بھی شدید ترین اور سخت ترین آزمائشوں کو گرا سے جلتے ہیں کیونکہ اس جہان کی زندگی کا مزاج اسی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔ اصولی طور پر انسانوں کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں سخت قوت کی آزمائشوں کے بغیر ظاہر نہیں ہوتیں۔

ب: شدت اور سختی کے بعد فرخ و کشائش، یہ دو سرانگہ ہے جو اس داستان میں چھپا ہوا ہے۔ جب امواج مشکلات و بلاں ہر طرف سے انسان کو دباتی ہیں تو اسے نہ صرف مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے رحمت الہی کے دروازے کھلنے کی نشانی اور ایک تہیہ بچنا چاہیے جیسا کہ امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں:-

عندتنا ہی الشدة تكون الفرجة ، وعند تضایق حلق البلاء يكون الرخاء

جب سختیاں اپنی بندگی کو پہنچ جاتی ہیں تو فرج و کشائش نزدیک ہوجاتی ہے اور جس وقت بلا و مصیبت کے حلقے زیادہ تنگ ہوجاتے ہیں تو راحت و آسودگی ان پہنچتی ہے۔

ج: اس داستان سے زندگی کی سخت مشکلات اور مصائب کے بعض فلسفے اچھی طرح سے واضح ہوجاتے ہیں، جو لوگ توحید کی بحث میں آفات اور بلاؤں کو برہانِ نظم کے برخلاف مادہ نقص سمجھتے ہیں انھیں یہ داستان یہ جلاب دیتی ہے کہ ان سخت حوادث کا وجود بعض اوقات انسانوں کی زندگی میں، عظیم انبیاء سے لے کر عام انسانوں تک ایک ضرورت ہوتا ہے، امتحان و آزمائش کی ضرورت، چھپی ہوئی صلاحیتوں کے ظاہر ہونے کی ضرورت اور انسان کے وجود کے ارتقاء و تکامل کی ضرورت۔

لہذا بعض روایات میں حضرت صادقؑ سے منقول ہوا ہے:

ان اشد الناس بلاء الانبياء ثم الذي يليهم الا مثل فالامثل

سب لوگوں سے زیادہ خدا کے پیغمبر سخت آفتوں اور مشکلات میں گرفتار ہوتے ہیں پھر وہ لوگ جو ان پیغمبر کے برابر ہوتے ہیں اپنی شخصیت و مقام کے لحاظ اور مناسبت سے۔

اسی امام بزرگوار سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان في الجنة منزلة لا يبلغها عبد الا بالابتلاء

جنت میں ایک مقام ایسا ہے جس تک کوئی شخص نہیں پہنچ سکتا مگر ابتلاوات اور مشکلات سے گزر کر۔

د: یہ داستان تمام بچے مومنین کو تمام زندگی میں صبر و شکیبائی کا درس دیتی ہے، وہی صبر جس کا انجام ہر میدان میں کامیابی و کامرانی ہے اور جس کا نتیجہ پروردگار کی بارگاہ میں "مقام محمود" اور "بلند منزلت" کا حصول ہے۔

ہ: جو آزمائش کسی انسان کو پیش آتی ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دوستوں اور ساتھیوں کی بھی آزمائش ہوتی ہے تاکہ ان کی صداقت اور دوستی کا وزن بھی جانچ لیا جائے کہ وہ کس حد تک وفادار ہیں۔ حضرت ایوبؑ جس وقت اپنا مال و ثروت اور صحت ساقی

کھو بیٹھے، تو ان کے دوست و احباب بھی تنگ کر منتشر ہو گئے اور دوستوں اور دشمنوں نے مل کر شامت و علامت کے لیے زبان کھولی، اور ہرزہ زنی سے بہتر انھوں نے اپنی اصلیت ظاہر کر دی اور ہم نے دیکھ لیا کہ ان کی زبان سے ایوبؑ کو جو دکھ پہنچا تھا وہ دوسرے ہر رنج سے زیادہ تھا۔ کیونکہ مشہور ضرب المثل کے مطابق نیزہ و تلوار کے زخم تو مل جلتے ہیں لیکن جو زخم زبان دل پر لگاتی ہے وہ مہربنے والا نہیں ہوتا۔

و: خدا کے دوست وہ نہیں ہوتے جو صرف نعمتوں کے ان کی طرف رخ کرنے کے وقت اس کی یاد میں رہتے ہیں، بلکہ واقعی دوست وہ ہوتے ہیں جو فراخی، تنگی، مصیبت و نعمت، بیماری و صحت اور فقر و غنا ہر حالت میں اس کی یاد میں رہیں اور مادی زندگی کی دگرگوئیاں ان کے ایمان و افکار میں دگرگوئی پیدا نہ کریں۔

امیر المؤمنین علیؑ السلام نے اس مغز و پرشور خطبہ میں جو آپ نے اپنے باصفا دوست "ہام" کے لیے پر ہنر گاروں کے اوصاف میں بیان فرمایا تھا اور ایک سو سے زیادہ صفات متقین کی بیان کی تھیں اس کے اہم اوصاف میں سے ایک یہ بھی ہے:-

نزلت انفسهم منہم في البلاء ، كالتى نزلت في الرخاء

ان کی روح بلا و مصیبت کے وقت ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ راحت و آرام کی حالت میں (اور زندگی کی تبدیلیاں انھیں دگرگوئی نہیں کرتی)۔

ز: یہ ماجرا ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ نہ تو امکانات و وسائل مادی کا ہاتھ سے نکل جانا اور مصائب و مشکلات اور فقر وفاقہ کا رخ کرنا، انسان کے لیے خدا کی بے لطفی کی دلیل ہے، اور نہ ہی امکانات مادی کا فراہم ہونا، پروردگار کے قریب سے درمی کی دلیل ہے، بلکہ انسان ان تمام وسائل و امکانات کے ہوتے ہوئے خدا کا خاص بندہ ہو سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ مال مقام فخر کا امیر نہ ہوجائے، اور ان کے ہاتھ سے نکل جانے سے صبر کی زمام ہاتھ سے نہ چھوڑ دے۔

۲۔ ایوبؑ — قرآن و تورات میں: اس عظیم پیغمبر کا پاک چہرہ جو صبر و شکیبائی کا مظہر ہے، یہاں تک کہ صبر ایوبؑ رب کے لیے ضرب المثل ہو گیا ہے، قرآن مجید میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ خدا نے کس طرح سے اس داستان کی ابتدا اور انتہا میں ان کی تعریف کی ہے۔

لیکن انھوں نے ساتھ ساتھ کتنا بڑا ہے کما اس عظیم پیغمبر کی سرگزشت بھی جان لو یا دانا دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہی اور ایسے ایسے خرافات ان پر باندھے گئے جن سے ان کی مقدس و پاک شخصیت منزہ ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بیماری کے وقت حضرت ایوبؑ کے بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے اور ان میں اتنی بڑی پیدا ہو گئی تھی کہ سستی والوں نے انھیں آبادی سے باہر نکال دیا۔

بلا شگ و شہد اس قسم کی روایت صحیحی اور سن گھڑت ہے، چاہے وہ حدیث کی کتابوں کے اندر ہی کیوں نہ ذکر ہوئی ہو۔ کیونکہ پیغمبروں کی رسالت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ ہر وقت اور ہرزہ زنی میں میل و رغبت کے ساتھ ان سے مل سکیں اور جو بات لوگوں کے متغیر دے زاری اور افراد کے ان سے دور رہنے کا موجب بنے، چاہے وہ متغیر آئین بیماریاں ہوں یا میوب جمانی یا اخلاقی تشوشت و سختی، ان میں نہیں ہوں گی، کیونکہ یہ چیزیں ان کے فلسفہ رسالت سے تضاد رکھتی ہیں۔

قرآن مجید پیغمبر اسلام کے بارے میں کہتا ہے:

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظًا غليظ القلب لا نقصوا

من حولك

رحمتِ الہی کے سایے میں تو ان کے لیے نرم و مہربان ہو گیا کیونکہ اگر تو سخت اور تنگ دل ہوتا تو وہ تیرے گرد و پیش سے منتشر ہو جاتے۔

(آل عمران — ۱۵۹)

یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ پیغمبر کو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اس کے اطراف سے منتشر ہو جائیں۔

لیکن تورات میں ایک مفصل قصہ "ایوب" کے بارے میں نظر آتا ہے جو "مزامیر داؤد" سے پہلے موجود ہے۔ یہ کتاب ۲۲ فصل پر مشتمل ہے اور ہر فصل میں تفصیلی بحث موجود ہے۔ بعض فصول میں تو انتہائی حکیمانہ مطالب نظر آتے ہیں، ان میں سے تیسری فصل میں ہے کہ:

"ایوب نے شکایت کے لیے زبان کھولی اور بہت زیادہ شکوہ کیا، جب کہ قرآن نے انکی صبر و شکیبائی کی تعریف کی ہے۔"

۳۔ عظیم پیغمبروں کی "آداب" کہہ کر توصیف: اسی سورہ "ص" میں تین پیغمبروں کی "آداب" کے لفظ کے ساتھ توصیف کی گئی ہے اور وہ ہیں: داؤد، سلیمان اور ایوب۔ سورہ شی کی آیہ ۲۲ میں یہ صفت تمام جنتیوں کے لیے بیان کی گئی ہے۔

هَذَا مَا تَوْعَدُونَ لِكُلِّ آوَابٍ حَفِيظٍ

یہ تعبیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ "آدابین" کا ایک بلند و بالا مقام ہے۔ جب ہم لغت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ "آداب" "آوب" (بروزن "قول") کے مادہ سے رجوع کرنے اور بازگشت کے معنی میں ہے۔ یہ رجوع اور بازگشت خصوصاً آداب کے صیغہ مبالغہ کی طرف دیکھیں تو تکرار اور کثرت پر دلالت کرتا ہے۔

گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "آدابین" ان عوامل کے مقابلے میں بہت حساس ہیں جو انھیں خدا سے دور کرتے ہیں، خواہ وہ عالم مادہ کی دل فریبیاں ہوں یا نفس اور شیاطین کے وسوسے، اگر وہ ایک لمحے کے لیے دور ہو جاتے ہیں تو فوراً متوجہ ہو کر اس کی طرف لوٹتے ہیں اور اگر ایک لحظے کے لیے غافل ہو جاتے ہیں تو اس کی یاد رکھنے سمائی کرتے ہیں۔

یہ بازگشت ممکن ہے خدائی اوامر و نواہی کی طرف بازگشت ہو، یعنی ان کا لگاؤ ہر جگہ اس کے فرمان ہی سے ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔

سورہ سبأ کی آیہ ۱۰ میں ہے:

يا جبال اوبي معه والطير

یہ حضرت داؤد کے بارے میں ہے۔ اس سے آداب کا ایک اور معنی بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ ہم آواز ہونا ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے۔

لے پہاڑ اور اے پرندو! داؤد کے ساتھ ہم صدا ہو جاؤ۔

اس بنا پر آداب "وہ شخص ہے جو قوانین، خلقت، اوامر الہی اور موجوداتِ عالم کی عمومی حدود و سرحدوں کے ساتھ ہم صدا اور ہم آہنگ ہو اور اتفاق کی بات ہے کہ "ایوب" کے معانی میں سے ایک "آداب" بھی ہے۔

۴۵۔ وَادْكُرْ عَبْدَنَا اِبْرَاهِيْمَ وَاسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِيَ الْاَيْدِي وَالْاَبْصَارِ ۝

۴۶۔ اِنَّا اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةِ ذِكْرِي الدَّارِ ۝
 ۴۷۔ وَ اِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنِ الْاَخْيَارِ ۝
 ۴۸۔ وَادْكُرْ اِسْمِعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِنْفِ وَكُلًّا مِّنَ الْاَخْيَارِ ۝

ترجمہ

۴۵۔ اور ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو جو (طاقت ور) ہاتھوں والے اور (بنا) آنکھوں والے تھے۔
 ۴۶۔ ہم نے انہیں خاص خاص خلوص کے ساتھ خالص کیا تھا اور وہ آخرت کی یاد آوری تھی۔
 ۴۷۔ اور وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور نیک افراد میں سے ہیں۔
 ۴۸۔ اور اسماعیل، یسع اور ذوالکفل کو بھی یاد کرو، وہ سب نیک لوگوں میں سے ہیں۔

تفسیر
چھ اور عظیم پیغمبر

گزشتہ آیات میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی زندگی کے بارے میں شرح و بسط کے ساتھ گفتگو تھی نیز حضرت ایوب سے عظیم پیغمبر کی زندگی کے اہم نقاط کے سلسلے میں مختصراً ذکر تھا۔ زیر بحث آیات میں خدا کے عظیم ترین پیغمبروں میں سے چھ دیگر پیغمبروں کا نام ذکر کیا جا رہا ہے۔ نیز ان کی وہ عمدہ صفات جو تمام انسانوں کے لیے نمونہ اور اسوہ بن سکتی ہیں اختصار کے ساتھ بیان کی جا رہی ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان چھ عظیم پیغمبروں کے لیے چھ ایسے مختلف اوصاف ذکر کیے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک خاص معنی مفہوم رکھتا ہے۔
 پہلے تو یسے سخن پیغمبر اسلام کی طرف کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: یاد کرو ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کو (واذکر عبادنا ابراہیم واسحاق و یعقوب)۔
 مقام عبودیت و بندگی پہلی صفت ہے جو ان کے لیے بیان ہوئی ہے اور واقعاً ہر چیز اسی میں جمع ہے۔ خدا کی بندگی یعنی اس کے

ساتھ مطلق وابستگی، یعنی اس کے ارادے کے سامنے اپنا کوئی ارادہ نہ رکھنا۔ اور ہر حالت میں اس کے سامنے تسلیم خم کرنا۔ خدا کی بندگی یعنی اس کے غیر سے بے نیازی اور ماسوی اللہ سے بے اقتنائی اور صرف اسی کے لطف و کرم پر نظر رکھنا، یہی انسان کے ارتقاء کی بنیادی اور اس کا برترین شرف و امتیاز ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ طاقت ور ہاتھوں والے اور بنا آنکھوں کے مالک تھے۔ (اولی الایدی والابصار)۔
 کتنی عجیب تعبیر ہے؛ ہاتھوں اور آنکھوں والے!
 ”ایدی“ ”ید“ کی جمع ہے اور ”ابصار“ ”بصر“ کی جمع ہے اور آنکھ اور بینائی کے معنی میں ہے۔
 انسان اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دو قوتوں کا محتاج ہے۔

۱۔ ادراک اور پہچان کی قوت۔ ۲۔ کام اور عمل کی قوت۔ دوسرے لفظوں میں ”علم“ اور ”قدرت“ سے مدد لینا چاہیے تاکہ اپنے مقصد کو حاصل کر سکے۔

خدا نے ان پیغمبروں کی یہ توصیف کی ہے کہ کاموں کو انجام دینے کے لیے ان کے پاس درک اور پہچان کی کافی طاقت اور قوی بصارت موجود تھی۔

وہ کم خیر افراد نہیں تھے، ان کی سطح معرفت اونچی تھی۔ دین خدا، اسرارِ آفرینش اور رموز زندگی کے بارے میں ان کی آگاہی بہت تھی۔

ارادہ اور قوت عمل کے لحاظ سے وہ سست اور ضعیف دنیاوی افراد نہیں تھے، بلکہ بارادہ، قوی اور آہنی و قاطع ارادے کے مالک تھے۔

یہ تمام راجحی کے راہروں کے لیے ایک نمونہ ہے کہ وہ مقام عبودیت اور خدا کی بندگی کے بعد، ان دو تیز و صابر ہتھیاروں سے مسلح ہوں۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ یہاں ہاتھ اور آنکھ سے مراد دو مخصوص اعضاء نہیں ہیں، کیونکہ بہت سے ایسے افراد میں جو یہ دونوں اعضاء تو رکھتے ہیں لیکن نہ تو کافی ادراک و شعور رکھتے ہیں اور نہ ہی قوت ارادہ اور نہ عمل کرنے پر قدرت۔ بلکہ یہ دو صفات ”علم اور طاقت“ کے لیے کئی ہیں۔

ان کی چوتھی صفت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے انہیں خاص قسم کے خلوص کے ساتھ خالص کیا ہے (اِنَّا اَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةِ) اور وہ تھی دارِ آخرت کی یاد آوری (ذکرى الدار)۔

۱۔ ”ذکرى الدار“ ممکن ہے مبدائے حذف کی خبر اور تعلقہ ”میں“ ہی ”ذکرى الدار“ تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”خالصۃ“ سے ”دل“ ہو۔

ہاں وہ ہمیشہ دوسرے جہان کی یاد میں رہتے تھے۔ ان کی نگاہ اس دنیا کی چند روزہ زندگی اور اس کی لذت تک محدود نہ رہی۔ وہ اس زود گزر زندگی کے علاوہ بنے پایاں نعمتوں سے معمور ایک جاودانی گھر کو دیکھتے تھے اور ہمیشہ اس کے لیے سی دی کرتے رہتے تھے۔

اس بنا پر ”المداد“ جو مطلق طور پر ذکر ہو اسے مراد آخرت کا گھر ہے۔ گویا اس کے علاوہ کوئی اور گھر وجودی رکھتا اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ اس کی طرف جانے والی ایک گزرگاہ ہے۔ بعض معترضین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں ”دار“ سے مراد داریا ہے اور ”ذکر“ کی تفسیر اس نیک نامی کی طرف اشارہ ہے جو ان پیغمبروں کے لیے اس دنیا میں باقی رہ گئی لیکن یہ احتمال خصوصاً ”المداد“ کے مطلق ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت ہی بعید نظر آتا ہے اور لفظ ”ذکر“ کے ساتھ بھی چنداں ہم آہنگ نہیں ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد دار آخرت میں نیک نامی اور ذکر جمیل ہے، جب کہ یہ بھی بعید نظر آتا ہے۔

بہر حال دوسرے لوگوں کے لیے بھی ممکن ہے کہ کبھی کبھی آخرت کے گھر کو یاد کر لیں۔ خصوصاً جب ان کے دوستوں میں سے کوئی دنیا سے چلا جاتا ہے یا جب کسی عزیز کے جنازے کے ساتھ یا اس کی یاد ماننے کے لیے وہ حاضر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ یاد خاص نہیں ہوتی بلکہ دنیا کی یاد کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے لیکن مردانِ خدا خاص، عینی، دائمی اور مسلسل توجہ دوسرے جہان کی طرف رکھتے ہیں۔ گویا وہ ہمیشہ ان کی آنکھوں کے سامنے حاضر ہے اور آیت میں ”مخالصۃ“ کی تعبیر اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

ان کی پانچویں اور چھٹی صفت بعد والی آیت میں آئی ہے، فرمایا گیا ہے، وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور نیک افراد میں سے ہیں (و انہم عندنا لمن المعصومین الاخيار)۔ ان کا ایمان اور عمل صالح اس بات کا سبب بنا کہ خدا انہیں اپنے بندوں میں سے چن لے اور منصب نبوت و رسالت کے ساتھ مفضل و معزز بنائے اور ان کی نیکو کاری اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ بطور مطلق ”اخيار“ (نیکو کار) کہلانے کے حق وار ہو گئے۔ ان کے افکار نیک، ان کے اخلاق نیک، ان کے اعمال اور ساری کی ساری زندگی نیک ہے اور ”آپنجہ خوبان ہمدردند آہنا تنہا دارند“۔

اسی بنا پر بعض معترضین نے اس تعبیر سے کہ خدا بغیر کسی شرط کے انہیں ”اخيار“ کے لفظ سے پکارا ہے، انبیاء کے لیے مقام عصمت کا مفہوم لیا ہے بلکہ ”عندنا“ (ہمارے نزدیک) کی تعبیر بہت ہی معنی خیز ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا برگزیدہ اور نیک ہونا

لے معصومین (ناکی زبکے ساتھ) ”مصلیٰ“ کی جگہ ہے اور اصل میں ”معصومین“ ”تھا بیلی“ یا ”صرف ہو گئی تو“ ”معصومین“ ہو گیا۔

لوگوں کے نزدیک نہیں ہے، جو بعض اوقات اپنی ذاتی باجیج کے لیے شہم پوشی کو جائز سمجھ لیتے ہیں، بلکہ ان کا ان دھقتات سے مستغف ہونا ہمارے نزدیک ثابت شدہ ہے، جو دیکھ بھال کے ادا کران کے ظاہر و باطن کو باجیج کرنا چاہیے۔

ذکرہ تین پیغمبروں کے اہم مقام کی طرف اشارہ کرنے کے بعد دیگر تین انبیاء کی باری آتی ہے۔ فرمایا گیا ہے: اور یاد کر اسماعیل، ایسح اور داؤد الکفل کو، جو سب کے سب اختیار اور نیک لوگوں میں سے تھے (واذکر اسماعیل و ایسح و داؤد الکفل کل من الاخيار)۔

ان میں سے ہر ایک صبر و استقامت اور فرمانِ خدا کی اطاعت میں ایک اسوہ اور نمونہ تھا۔ خصوصاً اسماعیل جو اپنی جان کو اس کی راہ میں فدا کرنے پر تیار ہو گئے اور اسی بنا پر ان کا نام ذریعہ اللہ ہو گیا۔ اپنے باپ کے ساتھ خانہ کعبہ کی تعمیر میں اور اس عظیم مرکز کو رونق بخشنے اور بہت سی دوسری ذمہ داریوں میں بہت زیادہ ماحقہ ٹٹاتے تھے۔ ان کی زندگی کی طرف توجہ کرنا پیغمبر اسلام اور تمام مسلمانوں کے لیے تقویت بخش ہے۔ ایسے عظیم مردانِ خدا کی زندگی کا مطالعہ انسانوں کی زندگی میں راہنمائی کرتا ہے اور ان میں تقویٰ، فداکاری اور ایثار و قربانی کی روح زندہ کرتا ہے، اور سخت مشکلات میں انہیں ثابت قدم رکھتا ہے۔

”کل من الاخيار“ کی تعبیر اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہی توصیف (الاخيار) بعینہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کے بارے میں آخری صفت کے طور پر آئی ہے، ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ تین پیغمبر بھی گزشتہ تین پیغمبروں کی تمام صفات کے حامل ہیں۔ کیونکہ تیسرے مطلق کا ایک وسیع معنی ہے جس میں نبوت بھی آخرت کے گھر کی طرف توجہ بھی اور مقامِ مہودیت و علم و قدرت بھی شامل ہو جاتی ہے۔

ان تینوں پیغمبروں میں سے حضرت اسماعیل سب سے زیادہ مشہور اور زیادہ جانے پہچانے میں ہیں لیکن ”ایسح“ جن کا نام صرف دو مرتبہ قرآن میں آیا ہے (یہاں اور سورۃ النعام کی آیہ ۸۶ میں) کے بارے میں قرآن کی تفسیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ بھی خدا کے بزرگ پیغمبروں میں سے تھے اور ان بزرگوں میں سے تھے جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے،

و کلاً فضلنا علی العالمین

ہم نے ان میں سے ہر ایک کو عالمین پر برتری و فضیلت بخشی۔ (انعام ۸۶)

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر یوشع بن نون ہیں جن پر ”الف دلام“ داخل ہوا ہے اور اس کی ”مشین“ میں سے بدل گئی ہے اور کسی غیر عربی کے نام پر (جیکہ یہ عبرانی ہے) الف دلام کا داخل ہونا کوئی نئی چیز نہیں ہے، جس طرح سے کہ عرب ”اسکندر“ کو ”الاسکندر“ کے نام سے پہچانتے ہیں۔

جبکہ بعض دوسرے ایک عربی لفظ سمجھتے ہیں جو ”یسح“ ”مادہ“ ”دعت“ ”فعل مضارع“ سے لیا گیا ہے اور اسی پہلو اختیار کرنے کے بعد الف دلام جو شخصیات اہم میں سے ہے اس پر لیا گیا ہے۔

سورۃ النعام کی آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اولادِ ابراہیم میں سے تھے لیکن یہ واضح نہیں کرتی کہ آیا وہ بنی اسرائیل میں سے تھے یا نہیں؟

تورات کی کتاب ”بادشمان“ میں ان کا نام ”الشیع“ بن ”شلفات“ لکھا ہوا ہے اور عبرانی زبان میں الشیع کا معنی ”ناجی“ ”شلفات“ کا معنی ”عامنی“ ہے۔

بعض اسے اور ”نضیر“ کو ایک ہی سمجھتے ہیں لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور یہ جو بعض نے ”ذوالکفل“ سمجھے ہیں تو یہ زیر بحث آیت کے صریح برخلاف ہے کیونکہ آیت نے ذوالکفل کا ”الشیع“ پر عطف کیا ہے۔ بہر حال وہ ایک غیر اور پر استقامت پیغمبر ہیں اور ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنے کے لیے ہمارے لیے یہی کافی ہے۔

باقی رہے ”ذوالکفل“ تو مشہور ہی ہے کہ وہ پیغمبروں میں سے تھے اور ان کے نام کا سورہ انبیاء کی آیہ ۸۵ میں پیغمبروں کے ناموں کے ساتھ اسمائیل اور ابراہیم کے بعد ذرا اس معنی پر گواہ ہے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے تھے، وہ انھیں الیوب کا فرزند سمجھتے ہیں جس کا اصلی نام ”بشر“ یا ”بشیر“ یا ”شرف“ تھا۔ بعض انھیں ”زوقیل“ سمجھتے ہیں کہ ذوالکفل ان کے لقب کے طور پر مشہور ہو گیا ہے۔

انھیں ذوالکفل کا نام کیوں دیا گیا؟ اس بارے میں اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”کفل“ نصیب اور حصہ کے معنی میں بھی آیا ہے اور کفالت و مدد داری کے معنی میں بھی لگتا ہے، انھوں نے مختلف احوال ذکر کیے ہیں۔

کبھی تو یہ لکھا ہے کہ چونکہ خدا نے اپنے ثواب و رحمت کا دافر حصہ انھیں مرحمت فرمایا ہے۔ لہذا ”ذوالکفل“ یعنی (صاحب ہونواری) کے نام سے موسوم ہوئے۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ انھوں نے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ راتوں کو عبادت کے لیے اٹھیں گے اور دن میں روزہ رکھ کریں گے اور تقاضات اور فیصلہ کرتے وقت ہرگز غصے میں نہ آئیں گے اور وہ اپنے اس عہد و پیمانہ پر قائم رہے لہذا انھیں یہ لقب دیا گیا۔

کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ انھوں نے بنی اسرائیل کے انبیاء کے ایک گروہ کی کفالت کی تھی اور وقت کے ظالم بارشاہ سے انکی جان بچائی تھی اس لیے انھیں یہ نام دیا گیا ہے۔

بہر حال ان کی زندگی کے حالات کی اتنی ہی مقدار جو آج ہماری دسترس میں ہے، خدا کی اطاعت و بندگی اور ظالموں کے مقابلے میں ان کی استقامت پامردی کی دلیل ہے اور ہمارے آج اور گل کے لیے ایک سبق ہے۔ اگرچہ ان کی زندگی کی تفصیلات کے بارے میں زلزلے کی دوری کے سبب دقیق طور پر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

۴۹۔ هَذَا ذِكْرٌ وَإِنَّا لِلْمُتَّقِينَ لَحَسَنٌ مَّابٍ ۝

۵۰۔ جَنَّاتٍ عَدْنٍ مَّفْتَحَةٌ لَهُمُ الْأَبْوَابُ ۝

۵۱۔ مُتَّكِنِينَ فِيهَا يُدْعَوْنَ فِيهَا بِأَفْئَالِهِمْ كَثِيرَةً مِّنْ شَرَابٍ ۝

۵۲۔ وَعِنْدَهُمْ قَصْرٌ مِّنَ الظَّرْفِ أَمْثَلِ السَّيِّدِ ۝

۵۳۔ هَذَا مَا تُوَعَّدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝

۵۴۔ إِنَّ هَذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِنْ نَفَادٍ ۝

ترجمہ

۴۹۔ یہ تو ایک یاد آوری ہے اور پرہیزگاروں کے لیے اچھا مقام ہے۔

۵۰۔ بہشت کے جاودانی باغات، جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

۵۱۔ وہ اس میں تختوں پر تکیہ کیے ہوئے (بیٹھے ہوں گے) اور انواع و اقسام کے پھل اور طرح طرح کے شراب ان کی رسائی میں ہوں گے۔

۵۲۔ اور ان کے پاس ایسی بیاباں ہوں گی جو اپنے شوہروں کی طرف ہی کھیتی رہتی ہیں اور وہ سب کی سب ہم عمر ہوں گی۔

۵۳۔ یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے قیامت کے دن کے لیے وعدہ کیا جاتا ہے (نا قابل شکن وعدہ)۔

۵۴۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

تفسیر

پرہیزگاروں کے لیے وعدہ

یہاں سے اس سورہ کی آیات کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں پرہیزگاروں کا سرکش باغیوں کے ساتھ موازد کرتے ہوئے قیامت کے دنوں کی خبروں کے انہام کی وضاحت کی گئی ہے اور مجموعی حیثیت سے گزشتہ آیات کے جملہ کی تکمیل ہو رہی ہے۔

پہلے تو گزشتہ انبیاء کی سرگزشت اور ان کی زندگی کے اسلامی و تریقی نکات کے بارے میں کئی طور پر فرمایا گیا ہے، یہ ایک اور یاد آوری ہے (ہذا ذکر)۔

ان کی پرشکوہ تاریخ کے نشیب و فراز کو بیان کرنے کا مقصد اسٹان سرائی نہیں بلکہ ذکر و تذکرہ تھا۔ جیسا کہ اس سورہ کی ہی اسی سلسلے سے لگتی ہے "حق والقرآن ذی الذکر"

اصل مقصد ان مسلمانوں میں جن کے لیے یہ آیات نازل ہوئی ہیں، فکر و نظر کو میدار کرنا، معرفت و آگاہی کی سطح بلند کرنا اور استفادہ پامروسی کی قوت و طاقت کا اظہار کرنا ہے۔

اس کے بعد اس سرگواں انفرادی اور انبیاء کی زندگی سے نکال کر کئی شکل دی گئی ہے۔ متعین کی سر نوشت کو عمومی طور پر عمل بہت قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پر ہر گاہوں کے لیے اچھا مقام اور جائے بازگشت ہے (وان للمتعین لحسن مآب)۔

اس مختصر سے سربستہ جملے کے بعد جو ان کے مال کی خوبی اور اچھائی کی اجالی طور پر تصویر کشی کرتا ہے، اجمال سے تفصیل کی قرآنی روش سے استفادہ کرتے ہوئے اس کی تشریح و تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کی بازگشت اس جنت کے جاودانی باغات کی طرف ہے جس کے دروازے ان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں (جنت عدن مفتحة لهم الابواب)۔

"جنت عدن" بہشت کے باغات کی طرف اشارہ ہے اور "مدن" (بروزن عدن) استقرار و ثبات کے معنی میں ہے اور "مدن" کو اس بنا پر "مدن" کہا گیا ہے، کیونکہ مختلف دھاتیں اور گران قیمت مواد وہاں مستقر ہوتا ہے۔ بہر حال یہ تعبیر یہاں جنت کے باغوں کے جاودانی اور ابدی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

"مفتحة لهم الابواب" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہشتوں کے لیے دروازے کھولنے تک کی بھی زحمت نہیں ہوگی، گویا بہشت ان کے انتظار میں ہے اور جس وقت اس کی نگاہ ان پر پڑے گی تو انوش پھیلا دے گی اور انھیں اندر آنے کی دعوت دے گی۔

اس کے بعد بہشتیوں کے خصوصی احترام اور ان کے آرام و سکون کو اس صورت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کی حالت یہ ہوگی کہ وہیں میں تختوں پر تکیہ لگائے (بیٹھے) ہوں گے اور انواع و اقسام کے فراواں چیل اور مشروبات ان کی مدد میں ہوں گے۔ جس وقت وہ طلب کیا

۱۔ بعض مترجمین نے اس جملے کی تعبیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد گزشتہ انبیاء کا ذکر جمیل ہے۔

۲۔ مترجمین کی ایک جماعت نے "ہذا ذکر" کو اس بات کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو کچھ گزشتہ انبیاء کے بارے میں بیان ہوا ہے وہ تو ان کا ذکر خیر اور ثنا چیل معنی اور بعد والی آیات آخرت میں ان کے مقامات کو بیان کر رہی ہیں لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے، لہذا یہاں تک ظاہر لگتی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

۳۔ "مآب" کا معنی ہے مقام بازگشت اور "حسن" کی "مآب" کی طرف امانت و صفت کی معصوم کی طرف امانت ہے۔

۴۔ "جنت عدن" "مآب" سے بل یا مطلق بیان ہے۔

ان کے پاس پہنچ جائیں گے (متكئين فيهما يدعون فيها بافاكهة كثيرة وشراب)۔ کیا یہ سب کچھ جنت کے خدمت گاروں کے ذریعے فوراً ان کے سامنے حاضر ہو جائے گا یا ان کے حاضر ہونے کے لیے ان کا ادھ ہی کافی ہوگا، اس کے لیے دو فہم احتمال موجود ہیں۔

"فاكهة" اور "شراب" ("چیل" اور "مشروبات") کا ذکر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ بہشتیوں کی زیادہ تر فراہم ہوگی، اگرچہ قرآنی آیات کی صراحت کے مطابق دوسری فضا میں اور کھانے بھی وہاں موجود ہوں گے۔

جیسا کہ اس دنیا میں بھی انسان کے لیے بہترین اور مکمل ترین غذا چیل ہی ہے۔ "کثيرة" کی تعبیر مختلف ہنسی چیلوں کی انواع و اقسام کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ اس کے مشروبات اور شراب طور بھی کئی قسم کی ہوگی جس کی طرف قرآن کی مختلف آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد بہشت کی پاکیزہ بیویوں کے بارے میں بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: بہشتیوں کے پاس ایسی بیویاں ہوں گی کہ جن کی آنکھیں فقط اپنے شوہروں پر جمی ہوں گی وہ سب کی سب جوان اور اپنے شوہروں کی ہم عمر و ہم سن ہوں گی (وعدندھن قاصرات الطرف اتراب)۔

"طرف" (بروزن برف) پلک کے معنی میں ہے اور کبھی نگاہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جنت کی عورتوں کی "قاصرات الطرف" (جو تنگ نگاہ رکھتی ہیں) سے تو صیغہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے صرف اپنے شوہروں پر نظریں جانی ہوئی ہیں۔ صرف انھیں سے مشغول و محبت کرتی ہیں اور ان کے علاوہ کسی کو بھی تصور میں نہیں لاتیں۔ یہ بات بیویوں کی خوبی میں سے عظیم ترین خوبی ہے۔ بعض مترجمین نے اسے آنکھوں کے خمور ہونے کے معنی میں سمجھا ہے جو ایک نہایت جاذب و پرکشش حالت ہے۔ ان دونوں معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

"اتراب" ہم سن و سال اور ہم عمر ہونے کے معنی میں ہے یہ جنت کی عورتوں کی اپنے شوہروں کے لیے ایک اور صفت کا بیان ہے، کیونکہ شوہر اور بیوی کے درمیان عمر کی موافقت کشش کو بڑھاتی ہے یا یہ خود انھیں عورتوں کی صفت ہے کہ وہ سب کی سب ہم سن و سال اور جوان ہیں۔

آخری ذریعہ بحث آیت میں بہشت کی ان تمام ساتوں کی ساتوں مذکورہ نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے روز حساب کے لیے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ (ہذا ما توعدون لیسوم الحساب)۔

۱۔ دونوں جگہ "فیہا" کی "منیر" جنت عدن کی طرف لٹکتی ہے اور فاکہہ کی توصیف "کثيرة" کے ساتھ اس وصف سے "شراب" کی توصیف بھی دلیل ہے اور متکئين "لہذا" کی تفسیر کے لیے محال ہے۔ یعنی وہ بہشت جاؤں جس کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے اور وہ صاف ہیں، غیر لگنے ہوئے ہوں گے اور مختلف چیلوں اور انواع و اقسام کے مشروبات لانے کا حکم دے رہے ہوں گے۔

۲۔ "اتراب" صحیح ہے "ترب" (بروزن شر) کی۔

نشاط انگیز و مدہ ، خداوند عظیم کی طرف سے وعدہ۔

ان نعمات کے جادوئی اور ابدی ہونے کی تاکید کے طور پر مزید اشارہ ہوتا ہے : یہ ہزار رزق اور ہاری دی ہوئی روزی ہے یہ ایسی عطا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی اور اس کے لیے فنا کا تصور ہی نہیں ہے (ان ہذا الرزقنا مالہ من نفاذہ)۔

اس بنا پر زوال و نابودی کا نام۔ جو ایک غمناک صورت اس جہان کی نعمتوں پر پڑا ہے۔ وہاں موجود نہیں اور وہ خدا کے پُر بار خزانوں کی برکت سے ہمیشہ درویشا رہتا ہے اور اس کے لیے محدودیت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کسی قسم کی کمی اس میں ظاہر نہیں ہوگی کیونکہ خدا کا ارادہ یہی ہے۔

۵۵۔ هَذَا وَإِنَّ لِلظَّغِينِ كَثْرَ مَا بٍ ۞

۵۶۔ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا فَيَنسُ الْمِهَادُ ۞

۵۷۔ هَذَا قَلِيدٌ وَقُوهُ حَمِيمٌ وَعَسَاقُ ۞

۵۸۔ وَأَخْرَمُ مِنْ شَكْلِهِ أَرْوَاحُ ۞

۵۹۔ هَذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَعَكُمْ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ إِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ۞

۶۰۔ قَالُوا بَلْ أَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ أَنْتُمْ قَدْ مُتَّمَوْتُمْ لَنَا فَيَنسُ الْقَرَارُ ۞

۶۱۔ قَالُوا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هَذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ۞

ترجمہ

۵۵۔ یہ (تو پرہیزگاروں کا اجر ہے) اور ظغین گروں کے لیے بدترین جائے بازگشت ہے۔

۵۶۔ دوزخ ہے، جس میں وہ داخل ہوں گے اور کیا ہی بڑا بستر ہے؟

۵۷۔ یہ حمیم و عساق (جلائے دل لے اور سیاہ رنگ کے مشروبات) ہیں جن کا مزہ کچھنا ہوگا۔

۵۸۔ اور ان کے علاوہ ان کے لیے ان کی ہم شکل دوسری سزائیں جوں گی۔

۵۹۔ (ان سے کہا جائے گا) یہ وہ فوج ہے جو تمہارے ساتھ جہنم میں داخل ہوگی (یہ وہی گمراہ سردار ہیں) ان کے

لیے مرجا اور خوشحال نہ بنیں گے۔ وہ سب کے سب آگ میں جلیں گے۔

۶۰۔ وہ (اپنے سرداروں سے) کہیں گے، بلکہ خوش آمدید تمہارے لیے نہ ہو کیونکہ تم نے یہ عذاب ہمارے لیے فراہم کیا

ہے، یہ کتنا بڑا ٹھکانا ہے؟

۶۱۔ (اس کے بعد) وہ کہیں گے: پروردگارا! جس نے یہ عذاب ہمارے لیے فراہم کیا ہے، اس کے لیے آگ میں کئی

گنا عذاب کا اضافہ فرما۔

تفسیر
سرکشوں کی سزا

گزشتہ آیات میں پرہیزگاروں کے لیے سات نعمتوں اور بے ہمانیایں کو شمار کیا گیا تھا اور زیر بحث آیات میں سرسازان کی مولانے کی روش کے مطابق خدا کے سرکشوں اور طاعنیوں کی محوس سرنوشٹ اور مختلف سزاؤں کو شمار کیا گیا ہے۔
پہلے ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ اب تک بیان کیا گیا ہے وہ تو مستقیوں کی جزا ہے اور طغیان گروں کے لیے بدترین جائے بازگشت ہے (ہذا اوان للطاغین لشر ماب)۔

متقین "حسن ماب" رکھتے تھے اور یہ "شر ماب" بری جائے بازگشت اور بڑا انجام۔
اس کے بعد اجمال کی تفصیل کے انداز سے سرسبتہ جگہ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ محسوس جائے بازگشت اور بڑا ٹھکانا دی دوزخ ہے جس میں وہ داخل ہوں گے اور اس کی آگ میں جلیں گے اور کیا ہی بڑا بستر ہے جہنم کی آگ! (جہنمہ یصلونہا فبئس المہاد)۔
گویا "یصلونہا" (جہنم میں داخل ہوں گے اور اس کی آگ میں جلیں گے) اس چیز کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ وہ صرف جہنم کو دوسرے دیکھیں گے یا اس کے کہیں آس پاس ہوں گے۔ نہیں! بلکہ وہ اس کے اندر داخل ہوں گے اور کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ جہنم کی آگ کے مادی سوجائش کے اور اس سے مانوس ہو جائیں گے نہ ہوں گے! بلکہ وہ ہمیشہ اس میں جلا کریں گے۔

"مہاد"۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ اس بستر کے معنی میں ہے جو سونے اور آرام کرنے کے لیے بچھا یا جاتا ہے، بچے کے گوارے کو بھی "مہاد" کہا جاتا ہے۔
بستر چونکہ آرام کرنے کی جگہ ہوتا ہے اس لیے اسے ہر لحاظ سے مناسب حال اور نرم ہونا چاہیے لیکن کیا حال ہوگا ان لوگوں کا جن کا بستر جہنم کی آگ ہوگی؟

اس کے بعد ان کے لیے دوسرے عذاب بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ جیم و غساق مشروب ہے جسے انہیں چکھنا ہوگا (ہذا فلیذوقوہ حمیم و غساق)۔

لے "ہذا" مبتدأ ہے اور اس کی خبر موصوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔

ہذا الذی ذکرناہ للمتقین

لے "جہنم" عطف بیان ہے یا "شر ماب" سے بدل ہے اور "یصلونہا" اس کا حال ہوگا۔

لے یہ جملہ اصل میں "ہذا حمیم و غساق فلیذوقوہ" تھا۔ لیکن تاکید کے لیے فلیذوقوہ کا جو مبتدأ خبر کے درمیان بطور نام لایا گیا ہے (بقرہ مدثرہ کے ص ۶۵۵)

"حمیم" گرم اور جلا ڈالنے والے پانی کے معنی میں ہے جو دوزخیوں کے مشروبات میں سے ایک ہے۔ یہ کئی قسم کی شراب طہور کے مقابلے میں ہے جو گزشتہ آیات میں بشتیوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔

"غساق" "غساق" (بروزن "مقی") کے مادہ سے، رات کی تاریکی کی شدت کے معنی میں ہے۔ ابن عباس نے اسے ایک بہت ہی سرد مشروب سے (جو ٹھنڈک کی شدت سے انسان کے اندر کو جلا کر زخمی کر دے گا) تفسیر کی ہے۔ لیکن اس لفظ کے مفہوم کی اصل بنیاد میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو اس معنی پر دلالت کرے، سوائے اس کے کہ اس کا مقابلہ "حمیم" سے کیا جائے جو گرم اور جلانے والا پانی ہے۔ ممکن ہے یہی امر اس قسم کے استنباط کا سبب بنا ہو۔

راغب نے مفردات میں اس کی ان تطرات اور پیپ سے تفسیر کی ہے جو دوزخیوں کی جلد سے (اور ان کے بدن کے غروں سے) باہر آئیں گے۔

ضروری طور پر اس کا سیاہ رنگ ہونا، اس لفظ کے اس پر اطلاق ہونے کا سبب بنا ہے۔ چونکہ اس جلا ڈالنے والی آگ کا نتیجہ ایک سٹی بھر جلتے ہوئے بدن سے سیاہ لاکھ کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

ہر حال کچھ کلمات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "غساق" کی بڑی بڑی اور تکلیف دہ ہوگی کہ سب کو پریشان کر دے گی۔ بعض دوسرے مفسرین نے اسے غلاب کی ایک ایسی قسم قرار دیا ہے جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کیونکہ وہ ایسے گنہگاروں اور سخت مظالم کے مرتکب ہوئے ہیں جن سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں تھا لہذا ان کی سزا بھی ایسی ہی ہونی چاہیے۔
جیسا کہ پرہیزگار جنتی ایسے نیک اعمال بجالاتے تھے جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا اس لیے ان سے ایسی جزا کا وعدہ کیا گیا جس سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں۔

فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین

(الم - سجدہ - ۱۷)

پھر ان کے دوسری قسم کے دردناک عذابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اور ان کے علاوہ انہی کی ہم شکل دوسری سزائیں بھی ان کے لیے ہیں (وآخر من شکله ازواج)۔

"شکل" (شیں کی فتح کے ساتھ) مثل و مانند کے معنی میں ہے اور "ازواج" انواع و اقسام کے معنی میں ہے اور یہ گزشتہ عذابوں کے مانند

(بقیہ ص ۶۷۲) یعنی مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "ہذا" مبتدأ کی خبر ہے جیسا کہ "حمیم و غساق" بھی اسی طرح ہیں اور تقدیر میں اس طرح تھا "العذاب ہذا فلیذوقوہ"۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ بہتر ہے۔

لے " " ایک ممدوف کی صفت ہے، جو مبتدأ ہے اور "ازواج" دوسرا مبتدأ ہے اور "من شکله" اس کی خبر ہے، اور مجہول پر پہلے مبتدأ کا جو سبب ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا۔

"وعذاب آخر ازواج من شکله"

دوسری قسم کے مذاہب کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے جو یہاں پر برہنہ طور پر بیان ہوئے ہیں اور شاید اس جہان مادہ کے اسیروں کے لیے قابل توصیف وادراک نہ ہوں۔

یہ حقیقت میں گذشتہ آیات میں ذکر شدہ "فاکھتہ کشیرۃ" کے مقابلے میں ہیں، جو جنت کی مختلف قسم کی نعمتوں اور پھولوں کی طرف اشارہ تھا۔

بہر حال ممکن ہے یہ مشابہت شدت اور ناراحتی کے اعتبار سے ہو یا تمام حیات کے لحاظ سے ہو۔

اس کے بعد ان کی آخری سزا بیان کی گئی ہے اور وہ ہے بڑے جہنم نشین اور یہ بھی ایک طرح کی سزائش ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس وقت گمراہ سردار اور جہنم ہوں گے اور اپنی آنکھ سے دیکھیں گے کہ ان کے پیروکاروں کو بھی دوزخ کی طرف لایا جا رہا ہے تو ان کے سر سے کیسے کہیں گے: یہ وہ فوج ہے جو تمہارے ساتھ دوزخ میں داخل ہوگی (ہذا فوج مقتحم معکم)۔

ان کے لیے خوش آمدید نہیں ہے (لا مرحبا بھم)۔

وہ سب کے سب آگ میں جلیں گے (انہم صالوا النار)۔

بعد کے جملوں اور آیات کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے "ہذا فوج مقتحم معکم" کا مگر گمراہی کے پیشواؤں کی گفتگو ہے، جس وقت وہ اپنے پیروکاروں کو جہنم میں داخل ہونے کے لیے تیار دیکھیں گے تو ایک دوسرے سے کہیں گے کہ یہ بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔ بعض مترجمین اسے کفر و عصیان کے سرداروں سے ناگرم کا خطاب سمجھتے ہیں لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

"مرحبا" وہ لفظ ہے جو مہمان کو خوش آمدید کہتے وقت کہا جاتا ہے اور "لامرحبا" اس کی ضد ہے۔ یہ لفظ مصدر ہے "رحب" (بروزن "مو") کے مادہ سے وسعت مکان کے معنی میں۔ یعنی آئیے، تشریف لائیے، آپ ایک مناسب اور وسیع مکان میں وارد ہو رہے ہیں اور فارسی میں اس کا متبادل خوش آمدید ہے۔

"مقتحم" "۱۳ قتحام" کے مادہ سے شدت اور سخت خوفناک کام میں داخل ہونے کے معنی میں ہے اور اکثر پہلے سے خوردنکر اور مطاعہ کیے بغیر کاموں میں وارد ہونے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہ تیسرا اس کام کی نشاندہی کرتی ہے کہ گمراہی کے پیروکار مطاعہ اور خوردنکر کے بغیر صرف ہوا و ہوس اور اندھی تقلید کی بنا پر جہنم کی شدید اور خوفناک آگ میں داخل ہوں گے۔

بہر حال یہ آواز پیروکاروں کے کانوں تک پہنچنے کی اور وہ سردارانِ مصلحت کے ناخوش آمدید کہنے سے سخت ناراض ہوں گے۔ ان کی طرف رخ کر کے وہ کہیں گے، بلکہ تمہارے لیے مہمان ہو کیونکہ تمہاری جنتی نے ہمارے لیے اس دردناک عذاب کی راہ ہموار کی تھی اور ہمارے لیے اسے فراہم کیا تھا کیا ہی بڑا ٹھکانا ہے جہنم (قالوا بل انتم لامرحبا بکم انتم قد متموہ لنا فبئس القرار)۔

۱۳۔ اس جلیں کچھ مذہب سے اور معتدیر میں اس طرح ہے (يقولون ووساء الضلال بعضهم لبعض هذا فوج مقتحم معكم) مگر ان کے سردار ایک دوسرے سے کہیں گے یہ فوج بھی تمہارے ساتھ داخل ہونے والی ہے۔

"فبئس القرار" حقیقت میں "جنات عدن" کا لفظ مقابل ہے، جو پرہیزگاروں کے لیے آیا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ دوزخ ایک مراضی اور وقتی جگہ نہیں ہے بلکہ دائمی اور ثابت ٹھکانا ہے۔

اس تیسرے پیروکاروں کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کچھ ہوا ہے اس میں یہ غویبی تو ہے کہ تم سردارانِ مصلحت بھی اس امر میں ہمارے ساتھ شریک ہو اور یہ چیز ہماری دلی تسلی کا باعث ہے یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم پیشواؤں کا جہنم ہمارے نزدیک بہت ہی عظیم ہے کیونکہ جہنم کوئی وقتی ٹھکانا نہیں ہے بلکہ ہمارا دائمی ٹھکانا ہے۔

لیکن اس کے باوجود پیروکار صرف اسی بات پر راضی نہیں ہوں گے جبکہ وہ گمراہی کے سرداروں کو جو اس جہنم کے اصلی عامل تھے اپنے سے زیادہ سختی جانتے ہیں لہذا باگواہ خداوندی کی طرف رخ کر کے "کہیں گے: پروردگارا! جس شخص نے ہمارے لیے یہ عذاب فراہم کیا ہے جہنم کی آگ میں اس کے لیے کئی گنا امان فرما، قالوا دینا من قدم لنا هذا فزده عذابا ضعفاً فی النار)۔

ایک عذاب خود ان کی اپنی گمراہی کی بنا پر اور ایک عذاب میں گمراہ کرنے کی وجہ سے۔

یہ آیت اسی مطلب کے مشابہ ہے جو سورۃ اعراف کی آیہ ۲۸ میں آیا ہے:

دینا ہولاء اضلونا فاضلنا عذابا ضعفاً من النار

پروردگارا! انھوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے لہذا آگ کا کئی گنا عذاب ان کے لیے قرار دے۔

اگرچہ سورۃ اعراف کی اس آیت کا آخری حصہ یہ بتاتا ہے کہ دونوں کے لیے کئی گنا عذاب ہے (کیونکہ یہ وہاں بھی تو پیشواؤں کے لیے اہرائی قوت تھی اور گمراہی و ضلالت کی راہ انھیں کے ذریعے ہموار ہوئی کیونکہ اگر مومنانہ اس ظالموں کے ظلم کی معافی کر م نہ کریں تو ان میں کسی کام کو انجام دینے کی ہمت نہیں ہوتی) لیکن بہر حال اس میں شک نہیں ہے کہ پیشواؤں کا عذاب کئی درجے سے زیادہ سخت ہے اگرچہ وہ لوگ عذاب و گناہ سے۔

ماں یہ ہے انجام ان لوگوں کا، جنہوں نے آپس میں دوستی کا مدد و بیان بانڈھا اور راہِ انحراف و مصلحت میں جیت کی جس وقت وہ اپنے اعمال کے بڑے نتائج دیکھیں گے تو ایک دوسرے کے خلاف دشمنی اور نفرت کا اظہار کریں گے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ان آیات میں پرہیزگاروں کی نعمتوں کا ذکر طیفان گروں کی سزاؤں اور مذاہبوں سے زیادہ تفریح رکھتا ہے (پہلے حصے میں سات نعمتوں اور دوسرے حصے میں پانچ مذاہبوں کی طرف اشارہ ہوا ہے) اور یہ شاید خدا کی رحمت کے اس کے غضب پر سبقت کرنے اور زیادہ ہونے کی بنا پر ہے۔

یا من سبقت رحمتہ غضبہ

اے وہ کہ جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

۶۲- وَقَالُوا مَا لَنَا لَنْزِي رِجَالًا كَمَا نَعُدُّهُمْ مِنَ الْأَشْرَارِ ۖ
 ۶۳- اتَّخَذْنَاهُمْ سِخْرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمْ الْأَبْصَارُ ۚ
 ۶۴- إِنَّ ذَلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُّمُ أَهْلِ النَّارِ ۗ

ترجمہ

۶۲- وہ کہیں گے، ہم ان لوگوں کو جنہیں ہم اشرار میں شمار کرتے تھے (یہاں جہنم کی آگ میں) کیوں نہیں دیکھتے؟
 ۶۳- کیا ہم نے ان کے ساتھ تسخر کیا تھا یا (وہ اس قدر حقیر تھے کہ) آنکھیں انہیں دیکھتی ہی نہیں؟
 ۶۴- بے شک یہ بات حق اور ایک واقعیت ہے کہ دوزخی خاصانہ باتیں کریں گے۔

تفسیر

اصحاب دوزخ کی دشمنی

یہ آیات دوزخیوں کی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے ان کی ایک گفتگو بیان کرتی ہیں جس سے ان کے گہرے اور جانکاہ تأسف اور ایک روحانی وجہان فرساحت کی ترجمانی ہوتی ہے۔

قرآن کہتا ہے: خلافت کے سوا جب دوزخ میں اپنے اطراف میں دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ہم ان لوگوں کو جنہیں ہم اشرار میں شمار کرتے تھے یہاں کیوں نہیں دیکھتے (وقالوا ما لنا لانزیری رجالا كما نعدُّهم من الاشرار)۔
 ہاں! ابوہل اور ابولہب جیسے افراد جب یہ دیکھیں گے کہ دوزخ میں عاریا سر، خباب، صہیب اور بلال جیسے افراد کا کوئی نام نشان نہیں ہے، تو وہ اپنے دل میں سوچیں گے اور ایک دوسرے سے سوال کریں گے کہ یہ لوگ کہاں چلے گئے؟

ہم تو ان لوگوں کو غل ڈالنے والے، زمین میں خدا کو سزا دینے والے، اشرار اور ادا باش سمجھتے تھے جو معاشرے کے آرام و سکون کو تباہ و برباد کرنے اور ہمارے بزرگوں کے احتمالات کو ختم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہماری راہ ہی بالکل غلط تھی۔

کیا ہم نے ان کا مذاق اڑایا تھا یا وہ اس قدر حقیر تھے کہ ہماری آنکھیں انہیں نہیں دیکھتیں (اتخذناہم سخریًّا ام زاغت عنہم الابصار)۔

۱۰ قابل توجہ بات یہ ہے کہ زناغت "جو" زینح کے مادہ سے ہے اور زنی وصاغت سے انحراف کے معنی میں آتا ہے یہاں اس کی آنکھ کی طرف نسبت (عاریہ صخر) سے

ہاں! ہم ان عظیم المرتبہ انسانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور اشرار ہونے کا لیل ان پر لگاتے تھے اور بعض اوقات تو ہم انہیں اس سے بھی پست تر سمجھتے تھے۔ انہیں ایسے حقیر اور ذلیل جانتے تھے جو بالکل آنکھوں میں چھتے ہی نہیں تھے لیکن مذہب معلوم ہوا کہ وہی اور جہالت و ضرور نے ہماری آنکھ پر پردہ ڈال رکھا تھا، وہ تو مقربانِ بارگاہِ خدا تھے اور اس وقت بہشت بریں ان کا مسکن ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تسخر تو دنیا کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور "ام زاغت عنہم الابصار" کا جملہ دوزخ کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے یعنی یہاں ہماری نزدیک میں آنکھ اس دھوئیں اور آگ کے شعلوں کے درمیان انہیں نہیں دیکھ سکتی، البتہ یہاں معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ حقائق کا ادراک نہ کرنے کے حوالے میں سے ایک مسائل کو سمجھنے کے ساتھ دلہیت اور حقائق کا مذاق اڑانا ہے۔ ہمیشہ بعینہ ارادے کے ساتھ مسائل کی تحقیق کرنا چاہیے تاکہ حقیقت واضح اور روشن ہو جائے۔

اس کے بعد دوزخیوں کے درمیان جو باتیں ہوں گی انہیں غلامی کے طور پر اور جو کچھ گزر چکا ہے اس پر تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: بے شک یہ بات حق اور ایک حقیقت ہے کہ دوزخی خاصانہ گفتگو کریں گے (ان ذلک لحق تخاصم اهل النار)۔

دوزخی اس جہان میں بھی دشمنی اور نزاع میں گرفتار ہیں اور پُرفاش، نزاع اور جہال کی روح ان پر حاکم ہے، اور ہر روز کسی نہ کسی سے دست و گریباں اور گلوگیر ہوتے رہتے ہیں، اور قیامت میں جو چھپی ہوئی چیزوں کے ظاہر ہو جانے کا دن ہے جو کچھ ان کے اندر ہو گا وہ ظاہر ہو جائے گا اور جہنم میں ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جائیں گے، کل کے دوست آج کے دشمن ہو جائیں گے اور کل کے مرید آج کے مخالف ہو جائیں گے، صرف ایمان و توحید کا راستہ اس جہان میں بھی اور اس جہان میں بھی وحدت و پاکیزگی کا راستہ ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ہمیشگی تو تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے دوستانہ گفتگو میں مشغول ہوں گے۔ جیسا کہ قرآن کی مختلف آیات میں بیان ہوا ہے۔ جب کہ دوزخی جنگ و جدال میں مشغول ہوں گے جبکہ وہ تو خود ایک نعمت اور عظیم انعام ہے اور یہ ایک دردناک مذاہب ہے۔

ایک نکتہ

ایک حدیث میں امام ملاق سے منقول ہے کہ آپ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

(عاریہ صخر کا) وہی گئی ہے، ذکر آئمہ والوں کی طرف اور یہ مطالب میں ماہانہ کے لیے ہے۔

۱۰ (عاریہ صخر ہذا) "تخاصم اهل النار" ذالکے "کایان ہے۔

”خدا نے تم تکتب اہل بیت کے پیروکاروں کو قرآن میں یاد کیا ہے جبکہ تمہارے دشمن جہنم کی آگ میں کیسے گئے کہ ہم یہاں ان لوگوں کو جنہیں ہم اشرار میں شمار کرتے تھے کیوں نہیں دیکھتے؟ کیا ہم نے ان کا مذاق اڑایا تھا یا سخت حقارت کی وجہ سے ہماری آنکھ میں نہیں پختے تھے؟ خدا کی قسم ان افراد سے مراد تم ہو جنہیں ایک گروہ اشرار سمجھا جاتا ہے، لیکن خدا کی قسم! جنت میں تم شادمان اور سرور ہو گے جبکہ وہ ذبحی جہنم میں تمہارے خیال میں سرگرم ہوں گے۔“

۶۵۔ قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنذِرٌ وَمَا مِّنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝

۶۶۔ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ۝

۶۷۔ قُلْ هُوَ نَبَوُّ عَظِيمٌ ۝

۶۸۔ أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ۝

۶۹۔ مَا كَانَ لِي مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَأِ الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝

۷۰۔ إِنْ يُؤْخَىٰ إِلَىٰ آلِ إِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝

ترجمہ

۶۵۔ کہہ دو میں تو صرف ایک ڈرانے والا ہوں اور خدا نے یگانہ و قہار کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔

۶۶۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کا پروردگار عزیز و غفار ہے۔

۶۷۔ کہہ دو! یہ ایک بہت بڑی خبر ہے۔

۶۸۔ کہ جس سے تم ڈو گروان ہو۔

۶۹۔ مجھے ملا اعلیٰ (اور عالم بالا کے فرشتوں) کے بارے میں۔ جبکہ وہ (آدم کی خلقت کے بارے میں) جھگڑ رہے تھے کچھ خبر نہیں ہے۔

۷۰۔ مجھے تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ میں ایک واضح انداز کنندہ ہوں۔

تفسیر

میں ایک نذیر ہوں

چونکہ تمام گزشتہ بحث، چاہے ان میں دوزخیوں کے دردناک عذاب سے متعلق گفتگو تھی یا گزشتہ گہوار اتوام کے دنیاوی عذاب سے متعلق بحث تھی، سب کی سب مشرکین، سرکشوں اور ظالموں کے لیے انداز و ہتدیر کا پہلو رکھتی تھی۔ زیر بحث آیات میں اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کہہ دو کہ میں تو صرف ایک انداز کنندہ (ڈرانے والا) ہوں۔ (قل انما انا منذر)۔

یہ ٹیک سب کے بغیر بشارت دینے والا بھی ہوتا ہے اور قرآن مجید کی آیات دونوں معانی پر ناطق ہیں لیکن چونکہ بشارت تو مومنین کے لیے ہوتی ہے اور اندازہ مشرکین و کفار کے لیے اور یہاں روئے سخن دوسرے گروہ کی طرف ہے، لہذا صرف اندازہ کا ذکر ہوا ہے اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کوئی موجود خداوند یگانہ وقت کے علاوہ نہیں ہے۔ (و ما من الہ الا اللہ الواحد القہار)۔

اس کے قہر کا ذکر بھی اسی بنا پر ہے تاکہ کوئی اس کے لطف و کرم سے مغرور نہ ہو جائے اور خود کو اس کے قہر سے مامون نہ سمجھے اور کفر و گناہ کے گرداب میں غوطہ زن نہ ہو جائے۔

اور ہاں فاصلہ پروردگار کی توحید الہیت و عبادت کی دلیل کے طور پر مزید فرمایا گیا ہے: وہی تو ہے جو آسمانوں، زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کا پروردگار ہے۔ وہی خدا جو عزیز و فقار ہے (رب السماوات والارض وما بینہما العزیز الغفار)۔

درحقیقت اس آیت میں خدا کی صفات میں سے تین اوصاف کو بیان کیا گیا ہے۔ جن میں سے ہر ایک، ایک مقصد کو ثابت کرنے کے لیے ہے۔

پہلا مفہوم تمام عالم ہستی کے لیے اس کی ”ربوبیت“ کا مسئلہ ہے وہ اس سارے جہان کا مالک ہے۔ ایسا مالک جو ان کی تہذیب و تربیت کرتا ہے۔ ایسی ہستی ہی عبادت کے لائق ہے نہ کہ وہ بت جن کے پاس سوئی کی ٹوک کے برابر بھی اپنا کچھ نہیں۔

دوسرا مفہوم اس کی ”عزیزت“ کا مسئلہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ”عزیز“ لغوی معنی کے لحاظ سے اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جس پر کوئی غالب نہ آسکے اور جس چیز کا وہ ارادہ کرے وہ ہو جائے، دوسرے لفظوں میں وہ ہمیشہ غالب ہے اور کبھی بھی مغلوب نہیں ہوتا۔

جو ایسا جو اس کی قدرت کے پنپنے سے نکل جھاگتا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اور اس کے مذاب سے کیسے نجات مل سکتی ہے؟

یسری صفت مقام ”خفا ریت“ اور اس کی بکثرت بخشش سے جو باگشت اور اس کی طرف لوٹنے کے دروازے کو نگاروں کے سامنے کھولے رکھتا ہے اور اپنی رحمت کی بارش ان پر برساتا رہتا ہے تاکہ وہ یہ تصور نہ کر بیٹھیں کہ اگر وہ قہار و عزیز ہے تو پھر اس کا مفہوم بندوں کے سامنے رحمت و توبہ کے دروازے بند کرنا ہے۔

حقیقت میں ایک صفت بیان خوف ہے اور دوسری صفت بیان رجاء ہے کیونکہ ان دونوں حالتوں کے موازنے کے بغیر انسان کا ارتقاء و تکامل ممکن نہیں۔ یا انسان ضرور و غفلت میں گرفتار ہو جاتا ہے یا ناامیدی کے گرداب میں مرق ہو جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس کی عزیز و فقار کے ساتھ توصیف اس کی الہیت کی ایک اور دلیل ہے کیونکہ صرف وہی ہستی پرستش و عبادت کے لائق ہے جو ربوبیت کے علاوہ نہرا دینے پر بھی قدرت رکھتا ہو اور نہرا دینے پر قدرت کے علاوہ اس کی رحمت و مغفرت کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہوں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم سے خطاب ہے اور ایک مختصر مگر ہلادینے والے انداز میں فرمایا گیا ہے: کہہ دے کہ یہ ایک بہت بڑی

خبر ہے۔ (قل ہونبوا عظیم)۔

کہ جس سے تم منہ پھیرے ہوئے ہو (انتسوعنہ معروضون)۔

یہ کون سی خبر ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اسے عظیم قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید؟ پیغمبر کی رسالت؟ قیامت اور مومنین و کفار کا انجام؟ توحید و یگانگی خدا؟ یا یہ سب کی سب؟

چونکہ قرآن ان سب امور پر مشتمل ہے اور ان سب کا جامع ہے اور مشرکین کی روگردانی بھی اسی سے تھی، اس لیے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی یعنی قرآن ہے۔

ہاں یہ عظیم آسمانی کتاب ایک بڑی خبر ہے جو تمام عالم ہستی جتنی عظمت رکھتی ہے، کیونکہ یہ اس جہان کے خالق، خالق عزیز و غفار اور واحد و قہار کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ وہ خبر جس کی عظمت کو ایک بہت بڑے گروہ نے اس کے نزول کے وقت نہیں سمجھا،

بعض نے اس کا مذاق اڑایا اور بعض نے اسے جاؤ کہا اور ایک گروہ نے اسے شاعری قرار دیا۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزری کہ اس ”عظیم“ نے اپنے باطن کو ظاہر کیا اور تاریخ بشریت کی راہ کو بدل کر رکھ دیا۔ وسیع عالم ہستی پر اپنا سایہ بگن ہو گئی اور اس نے اپنے عظیم اور درخشاں تمدن کو ہر میدان میں پھیلا دیا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس ”عظیم“ کا اعلان اس کی سورہ میں ہوا ہے، ایسے زمانے میں جبکہ مسلمان ظاہراً

انتہائی ضعف و ناتوانی میں تھے اور کامیابی و نجات کے راستے ان کے سامنے بند تھے۔

یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں بھی یہ عظیم خبر دنیا والوں پر — بلکہ خود مسلمانوں پر بھی — کامل طور پر واضح نہیں ہے، اور مستقبل ہی اس کی نشاندہی کرے گا۔

قرآن کی گفتگو کو ”تم اس سے منہ پھیرے ہوئے ہو“ ابھی تک صادق اور سچی ہے اور مسلمانوں کا یہی اعراض اس بات کا سبب بنائے کہ انھیں الہی کے اس جوش مارنے والے چشمے سے پورے طور پر سیراب نہیں ہو سکے اور صحیح طور پر اس کے انوار کے پرتوں آگے نہیں

برہے سکے اور فقر و شرف کی چوٹیوں کو سر نہیں کر سکے۔

اس کے بعد حضرت آدم کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں انسان کے مرتبے کی اس حد تک بندی کا ذکر ہے کہ فرشتوں نے اس کے سامنے سجدہ کیا — تمہید کے طور پر فرمایا گیا ہے: بھئی اعلیٰ اور عالم بالا کے فرشتوں کے بارے میں کچھ خبر نہیں

رہے کہ وہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے (ماکان لی من علمہ بالعلم الا علی ذیہن متصمون)۔

میری آگاہی صرف وحی کے ذریعے سے ہے اور مجھے تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ میں ایک واضح انداز کنندہ ہوں (ان یوحی الی اللہ انما انانذ میں مبین)۔

اگرچہ فرشتے پروردگار کے ساتھ کوئی جھگڑا اور نزاع نہیں کر رہے تھے، صرف اتنی سی بات تھی کہ جب خدا نے ان سے یہ ہمارا ”میں زمین میں ایک غلیظہ بنانا چاہتا ہوں“ تو انھوں نے باقی شروع کر دیں اور عرض کیا: ”کیا تو ایسے کو بنانا چاہتا ہے جو

خدا و غوریزی کئے گا تو ان کے جواب میں فرمایا: ”جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے“ (بقرہ — ۲۰)۔ تو ان کی انہیں باتوں پر ”مخاصمہ“ کا اطلاق ہوا ہے، جو ایک مجازی اطلاق ہے اور جیسا کہ ہم نے اشارتاً بیان کیا ہے کہ یہ حقیقت میں بعد والی آیات کے لیے جو آدم کی خلقت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں ایک مقدرہ اور تہید ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ”ملا اعلیٰ“ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں شیطان تک بھی شامل ہے، کیونکہ اس وقت شیطان فرشتوں کے زمرے میں تھا اور خدا کے ساتھ مخاصمت کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا، اور امتزاجن کرنے لگا اور اس بنا پر ہمیشہ کے لیے رازدگ درگا و خاضی ہو گیا، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

مقدمہ روایات میں جو شیعہ اور اہل سنت کے ذرائع سے نقل ہوئی ہیں، یہ بیان کیا گیا ہے کہ بغیر اکرم نے اپنے اسکا میں سے ایک سے پوچھا:

اتدری فیما یختصموا الملأ الاعلیٰ؟

کیا تو جانتا ہے کہ عالم بالا کے فرشتے کس چیز کے بارے میں بحث و گفتگو کرتے ہیں؟

اس نے عرض کیا: نہیں۔

تو آپ نے فرمایا:

اختصموا فی الکفارات والدرجات، فاما الکفارات فاصباح الوضوء فی السبرات، و نقل الاقدام الی الجماعات، و انتظار الصلوة بعد الصلوة، و اما الدرجات فافشاء السلام، و اطعام الطعام، و الصلوة فی اللیل والناس نیام

وہ کفارات (وہ کام جو گناہوں کی تلافی کرتے ہیں) اور درجات (وہ چیزیں جو انسان کے درجات میں اضافے کا باعث بنتی ہیں) کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ رہے کفارات تو وہ موسم سرما کی سردی میں بھرے پانی کے ساتھ وضو کرنا اور نماز باجماعت کے لیے قدم بڑھانا، اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا ہے اور ”درجات“ بہت زیادہ سلام کرنا، دوسروں کو کھانا کھلانا اور رات کو اس وقت نماز پڑھنا جبکہ لوگ سو رہے ہوں۔

لیکن اس حدیث میں صراحت کے ساتھ یہ بیان نہیں ہوا ہے کہ زیر بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں وارد ہوئی ہے، اگرچہ اس کی تفسیرات زیر بحث آیت کی تفسیر کی طرح ہیں۔ بہر حال اس حدیث سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ”مخاصمہ“ سے مراد صرف گفتگو ہے نہ کہ جدال و کشمکش۔ گفتگو آدمیوں کے اعمال کے بارے میں ہے اور ان کاموں کے بارے میں جو گناہوں

کفارہ بنتے ہیں اور انسان کے درجات میں اضافہ کرتے ہیں۔ شاید ان کی گفتگو ان اعمال کی تعداد کے بارے میں ہے جو ان فضائل کا سرچشمہ بنتے ہیں یا ان درجات کی صدا و میار کا تعین کرتے ہیں جو ان اعمال سے حاصل ہوتے ہیں اور اس طرح سے آیت کی ایک تیسری تفسیر سامنے آتی ہے جو کئی لحاظ سے مناسب ہے لیکن یہ آئندہ والی آیات کے ساتھ کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ ممکن ہے یہ حدیث فرشتوں کی کسی دوسری گفتگو کے بارے میں ہو نہ کہ اس گفتگو کے بارے میں جو ان آیات کے ساتھ مربوط ہے۔

یہ بحث بھی قابل توجہ ہے کہ بغیر اکرم کا عدم علم اس معنی میں ہے کہ میں اس سلسلے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں جانتا، صرف وہی کچھ جانتا ہوں جو وحی کے ذریعے مجھ پر نازل ہوتا ہے۔

سلفہ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ یہی حدیث تفسیر در المنثور میں بھی ایک جگہ سے متعدد اسباب رسول سے کچھ اختلاف کے ساتھ منقول ہوئی ہے۔

۴۱۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝
۴۲۔ فَاِذَا اسْتَوٰیۡتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ سُرُوۡحِیْ فَقَعُوۡا لَهٗ

سَجِدٰیۡنِ ۝

۴۳۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُۥمْ اَجْمَعُوۡنَ ۝

۴۴۔ اِلَّا اِبْلِیۡسَ ۙ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیۡنَ ۝

۴۵۔ قَالَ یٰۤاِبْلِیۡسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیْ اَسْتَكْبَرْتَ

اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعٰلِیۡنَ ۝

۴۶۔ قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیۡ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیۡنٍ ۝

۴۷۔ قَالَ فَاخْرِجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَٰجِۡمٌ ۙ

۴۸۔ وَاِنَّ عَلَیۡكَ لَعَنَتِیۡۤ اِلٰی یَوْمِ الدِّیۡنِ ۝

۴۹۔ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیۡۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوۡنَ ۝

۵۰۔ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنۡظَرِیۡنَ ۝

۵۱۔ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوۡمِ ۝

۵۲۔ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَا اُغْوِیۡتَهُمۡ اَجْمَعِیۡنَ ۝

۵۳۔ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخَلَصِیۡنَ ۝

ترجمہ

۴۱۔ اس وقت کو یاد کر جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں گیلی مٹی سے ایک بشر پیدا کروں گا۔

۴۲۔ جس وقت میں اے درست اور منظم کرلوں اور اپنی روح میں سے اس میں پھونک دوں تو تم سب کے سب اس کے لیے سجدہ کرنا۔

۴۳۔ پس اس وقت تمام فرشتوں نے توجہ کیا۔

۴۴۔ مگر ابلیس نے (سجدہ نہ کیا اس نے) تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

۴۵۔ کہا اے ابلیس! تجھے کس نے اس مخلوق کو سجدہ کرنے سے روکا، جسے میں نے اپنی قدرت سے خلق کیا ہے؟

۴۶۔ کیا تو نے تکبر کیا ہے یا تو عاقلین میں سے تھا؟ (اس سے بالا تر کہ تجھے سجدے کا حکم دیا جائے)

۴۷۔ اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اے گیلی مٹی سے۔

۴۸۔ فرمایا: آسمانوں (اور ملائکہ کی صفوں) سے نکل جا تو میرا زندہ درگاہ ہے۔

۴۹۔ اور یقیناً تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت ہوگی۔

۵۰۔ کہنے لگا: میرے پروردگار! مجھے اس دن تک کی مہلت دے دے، جس دن انسان قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔

۵۱۔ فرمایا: تجھے مہلت دے دی گئی ہے۔

۵۲۔ لیکن ایک مہین دن تک کے لیے۔

۵۳۔ اس نے کہا: تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔

۵۴۔ سوائے تیرے ان بندوں کے جو ان میں سے تیرے مخلص ہوں گے۔

تفسیر

تکبر کیا اور زندہ درگاہ ہو گیا

یہ آیات جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ۱۰۰ اعلیٰ کے بارے میں اور ابلیس کی گفتگو سے متعلق ہے۔ اور عمومی طور پر اس واقعے کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پہلے تو انسانوں کو یاد دلایا جائے کہ ان کا وجود کتنا قیمتی ہے کہ تمام فرشتے ان کے جدا جدا آدم کے لیے سجدہ میں گر پڑے۔ ایسی بڑی حیثیت کا مالک انسان کس طرح شیطان اور جوئے نفس کے جنگل میں اسیر ہو جاتا ہے؟ کس طرح اپنی قدر و قیمت کو نظر انداز کر کے پتھر اور کھڑکی کے سامنے سجدہ کرنے لگتا ہے؟

اصولی طور پر ترتیب کے مؤثر طریقوں میں سے ایک، زیر ترتیب افراد کو ان کی عظمت کا احساس دلانا ہے یا زیادہ صحیح لفظوں میں اس طرح سے ان کی بلند حیثیت اور ان کے وجود کی قدر قیمت انھیں یاد دلانا کہ انسان خود بخود محسوس کرنے لگے کہ اعظما اور سچائی اس کی شان کے لائق نہیں اور خود بخود ان سے کنارہ کشی کر لے۔

ثانیاً شیطان کی ہٹ دھرمی اور اس کا تکبر اور حسد سب ہٹ دھرم اور غرور افراد کے لیے ایک تنبیہ اور عبرت ہے کیونکہ یہاں بات کا سبب بن گیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے امتحان کی بندی سے بچنے لگے اور لذت کی گنگنی میں جا گئے۔

ثالثاً ایک ایسے بڑے دشمن کی خبر دی گئی ہے جس نے تمام انسانوں کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی ہے تاکہ سب ہوش میں رہیں اور اس کے دام شریب میں نہ پھنسیں۔

یہ امور مجموعی طور پر گوشہ بحث کا تسلسل ہیں۔

بہر حال زیر بحث پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کر جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں گیلی مٹی سے ایک بشر پیدا کروں گا۔ (اذ قال ربك للملائكة اني خالق بشرا من طين)۔

لیکن اس بنا پر کہ یہ تصور نہ ہو کہ انسانی وجود کا صرف وہی خاکی پہلو ہے۔ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جس وقت میں اُسے منظم کر لوں اور درست بنا لوں اور اپنی روح میں سے (باشرف اور ممتاز روح جسے میں نے خلق کیا ہے) اس میں بھونک دوں تو تم سب کے سب اس کے لیے سجدہ میں گر پڑنا (فاذا اسویتہ و نفخت فیہ من روحي فقعوا له ساجدين)۔

اس طرح سے انسان کی خلقت مکمل ہوگئی اور خدا کی خاص روح اور سیاہیلی مٹی آپس میں مل گئے اور ایک عجیب و غریب بالکل نیا وجود جس کی ہندی پستی دونوں بے انتہائی پیدا ہو گیا اور ایک انتہائی زیادہ استعداد رکھنے والا وجود جو "خلیفۃ اللہ" ہونے کے لائق ہو عرصہ وجود میں وارد ہوا۔ "اور اس وقت بغیر کسی استثناء کے تمام فرشتوں نے سجدہ کیا" (فسجد الملائكة کلہم اجمعون)۔

اور اس خالق کو حمد و ستائش کے لائق بنانا۔ ع

گارد چینی دل آویز نقشی زما و طینی

جس نے اس قسم کا دل آویز نقشش پانی اور مٹی سے بنایا ہے

لیکن "صرف ایک جس نے سجدہ نہیں کیا ابلیس تھا، اس نے تکبر کی اور سرکشی کی اور اسی بنا پر اپنے ہا عظمت مقام سے بچنے لگا اور وہ کافروں میں سے تھا (الابلیس استکبر وکان من الکافرین)۔

ہاں! انسان کے لیے بدترین بلائے جان بھی یہی کبر و غرور ہے جو جہالت کے تاریک پردے اس کی چشم بینا پر ڈال دیتا ہے اور اسے حقائق کے ادراک سے محروم کر دیتا ہے اسے سرکشی پر اٹھاتا ہے اور مومن کی صف سے نکال دیتا ہے کہ جو خدا کے مطیع بندوں کی صف ہے اور اسے کافروں کی صف میں پہنچا دیتا ہے کہ جو باغیوں اور سرکشوں کی صف ہے جیسا کہ ابلیس کے ساتھ ہوا۔ اس موقع پر

خدا نے ابلیس سے مواخذہ کیا اور باز پرس کی۔ "ذریا لے ابلیس! اس مخلوق کو سجدہ کرنے سے تعین کس نے روکا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا تھا (قال یا ابلیس ما منعک ان تسجد لہما خلقت بیدتی)۔

یہ بات ظاہر ہے کہ "یدی" (دونوں ہاتھ) کی تعبیر جتنی ہاتھوں کے معنوں میں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہر قسم کے جسم و جانیت سے پاک و منفرد ہے، بلکہ یہاں پر ہاتھ قدرت کے معنی کے لیے کنایہ ہے کیونکہ عام طور پر انسان اپنی طاقت کو ہاتھ سے عمل میں لاتا ہے۔ اس لیے روزمرہ کی گفتگو میں یہ لفظ قدرت کے معنی میں فراوانی سے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں ملک فلاں گروہ کے ہاتھ میں ہے، یا فلاں عبادت خانہ یا عمارت فلاں شخص کے ہاتھ سے بنی ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ میرا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچتا یا تیرا ہاتھ پُر ہے تو ان میں کہیں بھی لفظ ہاتھ مخصوص عضو کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ سب کے سب قدرت و تسلط کے مفہوم کے لیے کنایہ ہیں۔

چونکہ انسان اہم کاموں کو دونوں ہاتھوں سے انجام دیتا ہے اور دونوں ہاتھوں کو کام میں لگانا انسان کی کسی چیز کے لیے انتہائی توجہ اور لگاؤ کی نشانی ہے، لہذا زیر بحث آیت میں اس تعبیر کا بیان، انسان کی خلقت میں پروردگار کی خصوصی عنایت اور اس کی قدرت مطلقہ کو عمل میں لانے کے لیے کنایہ ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: کیا تو نے تکبر کیا، یا تو اس سے بالاتر تھا کہ تجھے سجدے کا حکم دیا جائے (استکبرت ام کنت من العالین)۔

بلا تھک و شبہ کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی قدر و منزلت اس سے بالاتر ہے کہ وہ خدا کے لیے سجدہ کئے (یا خدا کے حکم سے آدم کے لیے سجدہ کرے) اس بنا پر آخری راہ جو باقی رہ جاتی ہے وہی دوسرا احتمال یعنی تکبر ہے۔

معنی "عسرتین" "عالمین" کو یہاں ایسے افراد کے معنی میں سمجھتے ہیں جو ہمیشہ کبر و غرور میں رہیں۔ اس بنا پر اس جملے کا معنی یہ ہوگا: کیا تو نے اب اس وقت تکبر کیا ہے یا تو ہمیشہ سے ہی ایسا تھا؟

لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

البتہ انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ابلیس نے دوسری شق کو انتخاب کیا اور وہ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ وہ اس سے بڑے کسے اس قسم کا حکم دیا جائے لہذا انتہائی جسارت کے ساتھ فرمان خدا کی مخالفت کرنے کے لیے نہیں دینے لگا اور کہا: میں اس (آدم) سے بہتر ہوں، کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو گیلی مٹی سے (قال انا خیر منہ خلقتنی من ناس و خلقتہ من طین)۔

وہ حقیقت میں اپنے خیال کے مطابق تین حوالوں سے فرمان خدا کی نفی کرنا چاہتا تھا۔

پہلا یہ کہ میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور وہ مٹی سے جو ایک حقیقت بھی تھی، جیسا کہ قرآن مجید نے خود کہا ہے۔

خلق الانسان من صلصال کالفخار وخلق الجن من مار ج من نار

خدا نے انسان کو خشک شدہ (کھنکی) مٹی سے پیدا کیا جو اینٹ یا پیلے کی مانند تھی اور جنوں کو (جن میں سے ابلیس بھی تھا) آگ کے شعلے سے خلق کیا۔

دوسرا یہ کہ جو آگ سے پیدا کیا گیا ہے وہ اس نے برتر و افضل ہے جسے مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، کیونکہ آگ مٹی سے افضل درجہ تر ہے۔
تیسرا یہ کہ اشرف و افضل موجود کو ہرگز یہ حکم نہیں دینا چاہیے کہ وہ غیر اشرف کے سامنے سجدہ کرے۔
ابیس کا سارا اشتباہ اور غلطی ان دو آخری پہلوؤں میں تھی۔

کیونکہ اول تو آدم صرف مٹی سے پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی خلقت اس روح الہی کی وجہ سے تھی جو ان میں پھونکی گئی تھی۔
ورنہ مٹی کہاں اور یہ سارے اختصار، استعدا اور نکال کہاں؟

دوسرے مٹی صرف یہ کہ آگ سے کتر نہیں ہے بلکہ اس سے کئی درجے برتر ہے، کیونکہ ساری زندگی اور منابع حیاتی مٹی سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ تمام تر نباتات، پھول پھل اور تمام زندہ موجودات مٹی سے ہی وجود پاتے ہیں۔ تمام گراں بہا معدنیات مٹی کے اندر چھپی ہوئی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مٹی انواع و اقسام کی برکات کا منبع ہے۔ جبکہ آگ اپنی پوری اہمیت کے باوجود جو اسے زندگی میں حاصل ہے ہرگز اس کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتی، اور وہ صرف مٹی کے منابع سے استفادہ کرنے کا ایک آگے اور وہ بھی خطرناک آلہ، اور پھر آگ پیدا کرنے والے مواد میں زیادہ تر زمین کی برکت سے وجود میں آتے ہیں (ایڈھن، کوئلہ، تیل اور پٹرول وغیرہ)۔

تیسرا مسئلہ اطاعت حکم الہی کا ہے۔ سب کے سب اسی کی مخلوق اور بندے ہیں، لہذا انھیں اس کے فرمان کے سامنے تسلیم و سربسود کرنا چاہیے۔

ہر حال اگر ہم ابیس کے استدلال کا تجزیہ و تحلیل کریں تو وہ ایک عجیب و غریب کھڑاس کی بنیاد ہے۔ وہ اپنی اس گفتگو سے چاہتا تھا کہ خدا کی حکمت کی بھی نفی کرے اور اس کے امر کو بھی (نہ خود بائبل) بے مآخذ و بے مددک شمار کرے اور اس کا یہ اعتراض اس کی انتہائی حماقت کی دلیل ہے، کیونکہ اگر وہ یہ کہتا کہ میری نفس مانع ہوئی ہے یا کبر و غور نے مجھے اجازت نہیں دی اور اسی طرح کا کوئی اور مذرتو اس نے صرف ایک گناہ کا اظہار کیا ہوتا، لیکن اب جبکہ اس نے اپنے عصیان کی توجیہ کے لیے پروردگار کی حکمت اور اس کے علم کی نفی کی، تو یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس نے کفر کے پست ترین مرحلے کی طرف سقوط کیا۔

علاوہ ازیں مخلوق اپنے خالق کے مقابلے میں اپنی طرف سے کوئی استقلال نہیں رکھتی، جو کچھ اس کے پاس ہے وہ سب اسی کی طرف سے ہے اور شیطان کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے لیے پروردگار کی ماکیت کے مقابلے میں ماکیت و استقلال کا قائل تھا، اور یہ کفر کا ایک اور مرتبہ ہے۔

ہر حال شیطان کی گمراہی کا عامل خود پرستی، غرور، جہل اور حسد کا مرکب تھا۔
یہ سب کی سب شیطانی صفات اٹھی ہوئیں اور اسے جو سال ہا سال سے ملائکہ کا ہم نشین بلکہ ان کا مسلم تھا اس بلندی اور افتخار سے پیشے کھینچ لائیں اور یہ بڑی صفات جہاں کہیں بھی پیدا ہو جائیں۔ کس قدر خطرناک ہیں؟

نبی البلاغہ کے ایک خطبہ میں علی علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق۔
اس نے ہزار ہا سال تک پروردگار کی عبادت کی تھی، لیکن گمراہی بھر کا نتیجہ اس سب کو جہنم کی طرف

کھینچ کر لے گیا اور سب کچھ برباد کر دیا۔

ہاں! ایک اہم اور عظیم عمارت کو تعمیر تو سال ہا سال میں کیا جاتا ہے لیکن اسے ایک طاقت ور ہم کے ساتھ ایک ہی لمحہ میں تباہ کیا جاسکتا ہے۔

یہی موقع تھا جبکہ اس پدید وجود کو ملائحتی اور عالم بالا کے فرشتوں کی صفوں سے نکال دیا جانا چاہیے تھا۔ لہذا خدا نے اسے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آسمان بریں سے فرشتوں کی صفوں سے نکل جا، کیونکہ تو میرا راندہ درگاہ ہے (قال فاخرج منها فانك رجیم)۔

”فاخرج منها“ میں ضمیر ممکن ہے صفوں ملائکہ یا عوالم بالا یا بہشت یا خدا کی رحمت کی طرف اشارہ ہو۔
ہاں اس نامحرم کو یہاں سے چلے جانا چاہیے، کیونکہ یہ اس جگہ کے لائق نہیں ہے۔ یہ تو پاکیزہ اور مقرب لوگوں کی جگہ ہے، یہ آلودہ سرکش اور تارک دلوں کی جگہ نہیں ہے۔

”رجیم“ ”رجسو“ کے مادہ کے سنگسار کرنے کے معنی میں ہے اور چونکہ اس کا لازم طرد دینا (نکالنا، بھگانا اور دھنکانا) ہے لہذا کبھی یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے، یقیناً میری لعنت تیا مت کے دن تک تجھ پر پڑتی ہے گی اور تو ہمیشہ میری رحمت سے دور رہے گا (وان عليك لعنتی الی یوم الدین)۔

اہم بات یہ ہے کہ جس وقت انسان اپنے اعمال بد کا جزا تجزیہ دیکھے تو بیدار ہو جائے اور اس کی تمنا ہی کی فکر کرے۔ لیکن اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز خطرناک نہیں ہے کہ وہ اس طرح سے غرور اور ہٹ دھرمی کے گھوڑے پر سوار رہے اور ہلاکت کے گڑھے کی طرف چلتا ہی چلا جائے، یہی وہ مقام ہے جبکہ اس کا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ صراطِ مستقیم سے بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہی وہ بدبختی تھی جس نے

سے امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

فاعتبروا بما كان من فعل الله يا بليس اذا حبط عمله الطويل وجهده الجهد وكان
قد عبد الله ستة الاف سنة عن كبر ساعة واحدة فمن ذا بعدا بليس يسلم
على الله بعثل معصيته

فراکے بندہ! عبرت حاصل کرو اس سے جو خدا نے ابیس کے بارے میں انجام دیا کہ اس کے طویل اعمال اور دلوں کو خشوں کو۔ جبکہ
اس نے سچے ہزار سال تک عبادت کی تھی۔ ایک گھڑی بھر کے تجسس سے برباد کر دیا تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص دی ابیس والا
کام انجام دے اور خدا کے غضب سے امان میں رہے (نبی البلاغہ خطبہ ۱۹۲ - خطبہ تاسعہ)

ابلیس کا دامن پکڑ لیا۔

یہ وہ مقام تھا جہاں "حمدا" کینہ میں بدل گیا، ایسا کینہ جو سخت اور جڑیں پیدا کر لینے والا تھا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے،
اس نے کہا: میرے پروردگار! مجھے قیامت کے دن تک جب انسان قبروں سے اٹھائے جائیں گے، ہمت سے (قال
سب فانظرونی الی یوم یبعثون)۔

کیا ایسی ہمت جس میں، میں اپنے ماضی پر اٹک کر حسرت و ندامت نہاؤں؟ کیا ایسی ہمت جس میں میں اپنے قبیح اور بڑے گنہگاروں
کی تلافی کروں؟ نہیں! نہیں! مجھے تو ایسی ہمت درکار ہے جس میں آدم کی اولاد سے انتقام لوں اور سب کو گمراہی کی طرف کھینچ کر
لے جاؤں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کی گمراہی، گناہ کا ایک نیا بھاری بوجھ میرے دوش پر رکھ دے گی اور مجھے کفر و عصیان کے مجھدار
میں زیادہ سے زیادہ پیچھے لے جائے گی۔ نئے انوس؛ وہ کون سی مصیبت ہے جو ہمت دھری، کبر و غرور اور حسد کے ہاتھوں لوگوں کے
سروں پر دارو نہیں ہوتی؟

حقیقت میں وہ یہ چاہتا تھا کہ آخری حد تک ممکن وقت تک آدم کی اولاد کو گمراہ کرتا رہے اور چونکہ قیامت کا دن ذمہ داری کے
ختم ہونے کا دن ہے اور اس کے بعد دوسرا اور انوکھا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس درخواست کے
ذریعے موت کو اپنے آپ سے دور کر دے اور قیامت تک زندہ رہے، اگرچہ ساری دنیا کے لوگ دینا سے چل رہے ہیں۔

یہاں مشیتِ الہی نے ان دلائل و وجوہ کی بنا پر۔ جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔ اقتضاء کیا کہ ابلیس کی بیخوش
پوری ہو جائے۔ لیکن مطلق طور پر نہیں بلکہ مشروط صورت میں جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: فرمایا۔ تجھے مہلت دی گئی
(قال فانك من المنظرین)۔

لیکن قیامت کے دن اور مخلوق کے سمورٹ ہونے اور قبروں سے اٹھنے کے دن تک نہیں بلکہ "ایک معین دن اور زمانے
تک کے لیے (الی یوم الوقت المعلوم)۔

اس بارے میں کہ "یوم الوقت المعلوم" کون سا دن ہے؟ معتبرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔
بعض تو اسے اس جہاں کا اختتام سمجھتے ہیں، کیونکہ اس دن تمام زندہ موجودات سرعاً ہی گئے اور صرف خدا کی ذات پاک باقی
رہ جائے گی۔ جیسا کہ سورۃ قصص کی آیت ۸۸ میں بیان ہوا ہے۔

کل شیء عھالك الا وجهہ

اور اس طرح سے ابلیس کی خواہش کا ایک حصہ منظور کیا گیا۔

بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے لیکن یہ احتمال نہ تو زیر بحث آیات کے ظاہری مفہوم کے
ساتھ ہم آہنگ ہے کیونکہ ان کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ اس کی تمام خواہش کے ساتھ موافقت نہیں ہوتی اور نہ ہی قرآن کی دوسری
آیات کے ساتھ جو اس جہاں کے اختتام پر تمام زندوں کی موت کی خبر دیتی ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت ایسے زمانے کی طرف اشارہ ہو جسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے لہذا ایک روایت میں جو تفسیر برہان میں امام صادق سے نقل ہوئی ہے، آیا ہے کہ ابلیس
نعرہ ادا اور دوزخ کے درمیانی سرے میں مرجھائے گا۔

یہ وہ منزل تھی جہاں ابلیس نے اپنے دل میں چھپی ہوئی ہمت کو ظاہر کر دیا اور عرجا و دانی کا تقاضا کرنے کے لیے اپنے اصلی مقصد کی
نشاندہی کر دی اور کہا: تیری عزت کی تم، میں ان سب کو گمراہ کروں گا (قال فہزتک لا غویینہم اجمعین)۔

"عزت" کی تم، قدرت پر بھروسہ اور توانائی کے اظہار کے لیے ہے اور یہ پے در پے تاکیدیں (قسم، لون تاکید تفتید اور جمعیں کا
لفظ) اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ اپنے عزم و ارادہ میں انتہائی ثبات و استقامت رکھتا تھا اور رکھتا ہے اور آخری سانس
تک وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔

لیکن وہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ خدا کے خاص بندوں کا ایک گروہ اس کے اثر و نفوذ سے باہر رہے گا اور اس کے دوسرے
میں نہیں آئے گا، لہذا مجبوراً انھیں اپنی اوپر والی گفتگو سے مستثنیٰ کرتے ہوئے کہتا ہے: "مگر ان میں سے جو تیرے مخلص بندے
ہوں گے (الاعبادک متہم المخلصین)۔

وہی لوگ جو تیری معرفت و بندگی کی راہ میں اخلاص اور صدق و صفا سے قدم بڑھائیں گے، جنہیں تو نے بھی قبول کر لیا ہے،
اور انھیں مخلص کیا ہے اور انھیں اپنی حفاظت میں لے لیا ہے، صرف ہی گروہ ہے جن تک میں کوئی دسترس نہیں رکھتا۔ درنہ باقی
سب کو اپنے فریب کے جال میں چھینا لوں گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ابلیس کا یہ اندازہ اور گمان درست نکلا اور ہر کوئی کسی نہ کسی طرح سے اس کے جال میں چھنس گیا۔
اور "مخلصین" کے علاوہ کوئی اس سے نہ بچا۔ جیسا کہ قرآن سورۃ سبأ کی آیت ۲۰ میں کہتا ہے:

ولقد صدق علیہم ابلیس ظنہ فاتبعوہ الا فریقاً من المؤمنین

ان کے بارے میں ابلیس کا گمان سچ نکلا اور مؤمنین کے ایک گروہ کے سوا سبھی نے اس
کی پیروی کی۔

چند اہم نکات

۱۔ شیطان کے وجود کا فلسفہ: زیر بحث آیات سے سلیس میں بہت سے مسائل سامنے آتے ہیں، ان میں سے کچھ
یہ ہیں: شیطان کی خلقت کا مسئلہ، فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرنے کی دیر، فرشتوں پر آدم کی برتری کی علت، اور یہ کہ شیطان
کس قسم کے لوگوں پر تسلط جاتا ہے اور کبر و غرور اور خود پرستی کا نتیجہ، سیاق و سباق میں "روح الہی سے مراد اور تکامل نزع کے مقابلے میں

آدم کی پیدائش اور اس کی مستقل خلقت کا سنہ اور اسی قسم کے دوسرے مسائل۔ ان کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں سورہ لہقہ کی آیہ ۲۳ کے ذیل میں، گیارہویں جلد میں سورہ حجر کی آیہ ۲۶ کے ذیل میں اور چھٹی جلد سورہ اعراف کی آیہ ۱۱ کے ذیل میں مفصل بحث کی ہے۔

جس چیز کی ہم یہاں سنے سرے سے یاد دہانی کروانا ضروری سمجھتے ہیں وہ اس سوال کے بارے میں ہے جو شیطان کی خلقت کے فلسفہ کے بارے میں کیا جاتا ہے۔

ہمت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر انسان تکمال و ارتقاء اور بندگی خدا کے ذریعے سعادت و نیک بختی کے حصول کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو پھر شیطان کے وجود کی کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ کہ جو تکمال و ارتقاء کے برخلاف ایک تباہ کن وجود ہے اور وہ بھی ایک ہوشیار کینہ پرور، مکار، پرفرب و ادب اور اپنے ارادے کا پکا۔

لیکن اگر ہم تھوڑا سا بھی غور و فکر کریں تو جان لیں گے کہ اس دشمن کا وجود بھی انسانوں کے تکمال و ارتقاء کے لیے ایک لگ ہے۔

ہم دور نہ جائیں، ہمیشہ سخت دشمنوں کے مقابلے میں جھنڈے اور ڈٹے رہنے والی طاقتیں ہی جاندار ہوتی ہیں اور وہی اپنی ارتقائی منزلوں کو طے کرتی ہیں۔

تجربہ کار اور طاقت ور کمانڈر اور میدان جنگ کے سپاہی وہی ہوتے ہیں جو بڑی بڑی جنگوں میں سخت ترین دشمنوں کے ساتھ جبراً آزار رہے ہوں۔

تجربہ کار اور طاقت ور سیاست دان وہی ہوتے ہیں جو سخت سیاسی بحرانوں میں طاقتور دشمنوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کیے ہوئے ہوں۔

کشتی کے عظیم بہر اور اور بڑے پہلوان وہی ہوتے ہیں جنہوں نے سخت طاقتور حریفوں کے ساتھ زور آزمائی کی ہو۔ اس بنا پر یہ تعجب کی کون سی بات ہے کہ خدا کے عظیم بندے شیطان کے مقابلے میں سسل اور پے در پے جہاد کرتے رہنے سے روز بروز زیادہ قوی ہوتے چلے جائیں۔

موجودہ زمانہ کے ماہرین، مزاحمت کرنے والے جراثیموں کے وجود کے فلسفہ کے بارے میں کہتے ہیں: اگر وہ (جراثیم) نہ ہوتے تو انسان کے بدن کے خلیے سست اور کابل ہو جاتے اور احتمال ہے کہ انسانوں کے بدن کی نشوونما ۱۰ منٹی میٹر سے زیادہ نہ ہوتی، سب کے سب بونے آدمیوں کی صورت میں ہوتے، اور اس طرح سے آج کے انسانوں نے مزاحمت کرنے والے جراثیموں کے ساتھ جسمانی مقابلے کی وجہ سے زیادہ طاقت اور نشوونما حاصل کی ہے۔

یہی (ارتقائی صورت) روح انسان کی شیطان اور ہولٹے نفس سے مقابلہ کرنے میں ہوتی ہے۔

لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ شیطان کی ذمہ داری ہے کہ وہ بندگان خدا کو گمراہ کرے۔ شیطان پہلے دن سے دوسرے موجودات کی طرح پاک و پاکیزہ خلقت رکھتا تھا۔ انحراف، بدبختی اور شیطنیت خود اس کے ارادے اور خواہش سے اسے ملی۔ اس بنا پر خدا نے شیطان کو پہلے دن سے شیطان پیدا نہیں کیا۔ اس نے خود چاہا کہ وہ شیطان ہو، لیکن اس کے

باوجود اس کی شیطنیت نہ صرف یہ کہ حق طلب بندوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی بلکہ ان کے لیے ترقی کا ذریعہ ہے۔ (غور کیجئے گا)

ابتنہ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ خدا نے اس کی زندگی کو برقرار رکھنے کی درخواست کو قبول کیوں کیا اور فوراً ہی اسے نابود کیوں نہ کر دیا؟

اس کا جواب وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کیا گیا ہے اور دوسرے لفظوں میں: عالم دنیا آزمائش اور امتحان کا میدان ہے (ایسی آزمائش جو انسانوں کی پرورش اور تکامل کا ذریعہ ہے) اور ہم جانتے ہیں کہ آزمائش سخت ترین دشمنوں، طوفانوں اور بحرانوں سے مقابلہ کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ابتنہ اگر شیطان نہ بھی ہوتا تو بھی ہوائے نفس اور نفسانی دوسے انسان کو آزمائش کی کٹھالی میں ڈالتے، لیکن شیطان کے ہونے سے آزمائش کا یہ تو زیادہ گرم ہو گیا، کیونکہ شیطان ایک بزدلی حامل ہے اور ہولٹے نفس مال اندوزی ہے۔

۲۔ آتش غرور سب کچھ جلا دیتی ہے: ان غیر معمولی حساس مسائل میں سے جو امرائیس اور اس کے مانند درگاہ خدا ہونے کے واسطے میں توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے، انسان کی تیرگی اور بدبختی میں خود غواہی اور غرور کے حامل کی تاثیر ہے۔ اس طرح سے کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انحراف کا اہم ترین اور خطرناک ترین عامل ہی ہے۔

یہی چیز بدبختی جو چھ ہزار سال کی عبادت کو ایک ہی لمحہ میں نابود کر گئی، اور یہی چیز بدبختی جس نے اس موجود کو جو آسمان کے عظیم فرشتوں کا ساتھی تھا بدبختی کے پست ترین گڑھے میں لاسجھیکھا اور اسے خدا کی ابدی لعنت کا مستحق بنا دیا۔

خود غواہی اور غرور انسان کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ حقیقت کے چہرے کو اس کے اٹلی روپ میں دیکھے۔ خود غواہی سرچشمہ احد ہے، اور حسد کینہ پروری کا سرچشمہ ہے اور کینہ پروری خوں ریزی اور دوسرے جرائم کا سبب بنتی ہے۔ خود غواہی انسان کو خطائیں اور غلطیاں جاری رکھنے پر ابھارتی ہے اور جب پیدا ہو جائے تو بیدار کرنے والے حوالے بے کار کر دیتی ہے۔

خود غواہی اور ہٹ دھرمی انسان کے ہاتھ سے توبہ اور تلافی کی مہلت چھین لیتی ہے اور نجات کے دروازے اس کے لیے بند کر دیتی ہے۔ فلاصہ یہ ہے کہ اس قیوم اور مذہب مہفت کے خطرناک ہونے کے سلسلے میں جو کچھ بھی کہا جائے بہت کم ہے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے:

فعدو الله امام المتعصبين، وسلف المستكبرين، الذي وزع اساس العصبية، ونازع الله رداء الجبرية وادرع لباس التعزز، وخلع قناع التذلل، الاترون كيف صقره الله بتكبره، ووضعه بترفعه، فجعله في الدنيا

مدحورًا واعدلہ فی الآخرۃ سعیرًا

یہ (شیطان) دشمن خدا، تنصیب کرنے والوں کا بیٹا اور سنگین کاسلف ہے۔ جس نے تنصیب و بگڑ اور خودخواہی کی بنیاد رکھی۔ اور خدا کے ساتھ اس کے مقام جبروتی کے خلاف نزاع کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے بڑا ہونے کا لباس اپنے بدن پر پہن لیا اور اگسا زار فروتنی کا لباس اتار دیا۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ خدا نے اسے اس کے بگڑ کی وجہ سے کیسا ذلیل کیا؟ اور اس کی بلند پروازی کی بنا پر اسے پست و حقیر بنا دیا؟ دنیا میں اسے راندہ درگاہ بنا دیا اور آخرت میں جلا ڈالنے والی آگ کے لیے تیار کر دی۔
(سبح السبائح، خطبہ ۱۹۲، خطبہ قاصع)

۸۴۔ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقُّ أَقُولُ ۝

۸۵۔ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ۝

۸۶۔ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ۝

۸۷۔ إِنَّ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝

۸۸۔ وَتَعْلَمَنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ۝

ترجمہ

۸۴۔ فرمایا، حق کی قسم! اور میں حق ہی کہتا ہوں۔

۸۵۔ میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھر دوں گا۔

۸۶۔ (اے پیغمبر!) کہہ دو، میں تم سے کوئی کسی قسم کا اجر طلب نہیں کرتا اور میں متکلفین میں سے نہیں ہوں۔

۸۷۔ یہ (قرآن) تمام عالمین کے لیے تذکر (اور یاد دہانی) کا ذریعہ ہے۔

۸۸۔ اور تم اس کی خبر ایک مدت کے بعد ضرور سن لو گے۔

تفسیر

ابلیس کے بارے میں آخری بات

یہ آیات جو سورہ ص کی آخری آیات ہیں، حقیقت میں اس سورہ کے سارے مضامین کا خلاصہ اور ان تمام مختلف بحثوں کا نتیجہ ہیں جو اس سورہ میں بیان ہوتی ہیں۔

پہلے تو ابلیس کے جواب میں جس نے یہ دیکھی وہی معنی کردہ مخلصین کے سوا سب انسانوں کو گمراہ کر کے رکھ دے گا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے: حق کی قسم! اور میں حق ہی کہتا ہوں (قال فالحق والحق اقول)۔

۱۔ اس جملہ کی ترکیب بارے میں بہت اختلاف ہے۔ ممکن ہے کہ "الحق" مبتدا ہو اور "تسمی" جو اس کی خبر ہے محذوف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی خبر "قولی" ہو "قولی" یا "ما انا الحق" ہو۔

کہ میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھروں گا (لا ملئن جہنم منک و ممن تبعک منہ اجمعین)۔

جو کچھ ابتداء سورہ سے یہاں تک بیان ہوا ہے وہ سب حق تھا اور جو کچھ ان عظیم پیغمبروں نے، جن کی زندگی کا ایک گوشہ سورہ میں آیا ہے۔ اس کے لیے جنگ و پیکار اور جہاد کیا، وہ حق تھا۔ قیامت اور سرکشوں کے دردناک عذاب اور جنات کی انواع و اقسام کی نعمتوں کی جو باتیں اس سورہ میں بیان ہوئی ہیں وہ سب حق تھیں۔ اس سورہ کا اختتام بھی حق ہے اور خدا حق کی تم کھاتا ہے اور حق کا کتاب ہے کہ جہنم کو شیطان اور اس کے پیروکاروں سے بھروں گا تاکہ انسانوں کو گمراہ کرنے کے بارے میں انہیں کی اس بات کا ایک قطعی ثبوت دے دوں کہ جو اب دیا جائے کہ جو اس نے قاطبیت کے طور پر بھی تھی۔ یہ اس لیے ہے تاکہ سب کی ذمہ داری واضح کر دی جائے۔ ہر حال یہ دونوں جملے بہت سی تاکیدات پر مشتمل ہیں: دو مرتبہ حق ہونے کی تاکید ہے اور تم کھائی گئی ہے اور "لا ملئن" بھی فون تاکید تفسیر کے ساتھ ہے اور ان سب پر "اجمعین" کی ایک اور تاکید ہے تاکہ کسی کو معمولی سا بھی شک و شبہ اس بارے میں نہ ہونے پائے کہ شیطان اور اس کے پیروکاروں کے لیے کوئی راہ نجات نہیں ہے اور ان کا اس راہ پر چلتے رہنا انہیں ہلاکت کے گھر تک پہنچا دے گا۔

اس کے بعد اس گفتگو کے آخر میں چارام مطالب کی طرف مختصر اور واضح عبارتوں کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: کہ دے کہ میں تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا (قل ما اسئدکم علیہ من اجر)۔

اس طرح سے بہانہ جوئی کرنے والوں کے بہانوں کو ختم کر دیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ میں تو صرف مختاری نجات اور سعادت کا خواہاں ہوں، نہ تو کوئی عداوت اور نہ ہی منہوی، نہ قدر دانی، نہ شکر گزاری، نہ مقام و منزلت اور نہ حکومت، کیونکہ میرا جو توحا کے ذمہ ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی دوسری آیات۔ مثلاً سورہ سبأ کی آیہ ۴۰ میں اس کی تصریح ہوئی ہے: ان اجری الا علی اللہ

یہ بات خود پیغمبر اکرم کی صداقت کی ایک دلیل ہے کیونکہ جھوٹے مدعی مختلف قسم کے لالچ کے سنے دعوے کرتے ہیں اور ان کا لالچ ان کی کئی باتوں سے بہر صورت واضح و آشکار ہوجاتا ہے۔

دوسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: میں تکلیفین میں سے نہیں ہوں بلکہ میری باتیں دلیل و منطق کے ساتھ ہوتی ہیں اور کسی قسم کا تکلیف ان میں نہیں ہے۔ میری عبارتیں واضح اور میری باتیں ہر قسم کے ابہام اور پیچیدگی سے خالی ہیں (وما انا من المعتکلفین)۔ حقیقت میں پہلا جملہ دعوت کرنے والے کے اوصاف کے بارے میں ہے اور دوسرا جملہ اس کے دعوے کے مطالب کی کیفیت کے متعلق اور واقفانہ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کا مصداق ہے۔

تیسرے مرحلے میں اس عظیم دعوت اور آسمانی کتاب کے نزول کا اصلی ہدف بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ قرآن سارے جہان والوں کے لیے صرف نصیحت، یاد دہانی اور بیداری کا ذریعہ ہے (ان هو الا ذکر للعالمین)۔ ہاں! اہم بات یہ ہے کہ لوگ غفلت سے باہر نکلیں اور غور و فکر کریں کیونکہ راستہ واضح ہے اور اس کی نشانیاں آشکار ہیں اور انسان

اندرا کی ایسی پاک و پاکیزہ فطرت ہے جو اس کی راہنمائی کرتی ہے اور راہ توحید و تقویٰ کی طرف کھینچتی ہے۔ اہم بات تو بیداری ہے اور پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کی اصلی ذمہ داری یہی ہے۔

یہ تفسیر جس کی نظیر قرآن مجید میں کم نہیں ہے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انبیاء کی دعوت کے مطالب تمام مراحل میں، خدا واد فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور یہ دونوں ایک ساتھ مل کر پیش رفت کرتے ہیں۔

چوتھے اور آخری مرحلے میں مخالفین کو مختصر اور معنی خیز عبارتوں کے ساتھ تہدید کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، تم اس کی خبر لیکر مدت کے بعد لوگے (و لتعلمن نبأہ بعد حین)۔

ممکن ہے تم ان باتوں کو تنبیہ کی سے ساتھ قبول نہ کرو، اور ان کے پاس سے بے اعتنائی کے ساتھ گزراؤ، لیکن بہت جلد میری گفتگو کی صداقت واضح ہوجائے گی۔ اس جہان میں بھی اسلام و کفر کی جنگ میں، اجتماعی اور فکری نفوذ کے مقام پر اور خدائی عذاب کے موقع پر اور دوسرے جہان میں بھی خدا کا دردناک عذاب دیکھ لوگے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ اپنے موقع پر اپنی آنکھ سے مشاہدہ کرو گے۔ مختصر یہ ہے کہ خدائی تازیانہ آمادہ ہے اور بہت جلد مستحکمین اور ظالموں پر برسے گا۔

متکلف کون ہے؟

زیر بحث آیت میں بیان ہوا ہے کہ رسول اکرم اپنے اقتدارات میں سے ایک یہ شکر کرتے ہیں کہ میں متکلفین میں سے نہیں ہوں۔ روایت میں بہت زیادہ مباحث "متکلفین" کی نشانیوں اور علامتوں کے بارے میں موجود ہیں۔

ایک حدیث میں جو "جوامع الجاح" میں پیغمبر اکرم سے نقل ہوئی ہے، یہ آیا ہے:

للمتکلف ثلاث علامات: ینازع من فوقہ، و یتعاطی مالاینال، و یقول مالایعلم

متکلف کی تین نشانیاں ہیں۔ ہمیشہ اپنے سے اوپر کے لوگوں سے نزاع اور پرخاش رکھتا ہے، ایسے امور کے پیچھے لگتا رہتا ہے جن تک کبھی نہیں پہنچ سکتا، اور ایسے مطالب کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جن سے آگاہی نہیں رکھتا سیکھ

یہی مضمون ایک دوسری عبارت کے ساتھ امام صادق علیہ السلام سے نعمان حکیم کے کلمات میں بھی آیا ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم کی علی علیہ السلام سے وصیتوں میں بیان ہوا ہے۔

للمتکلف ثلاث علامات: یتعلق اذا حضر، و یغتاب اذا غاب، و یشعت بالمصیبة

متکلف کی تین نشانیاں ہیں:

۱۔ سامنے پاؤں کرنا ہے۔

۲۔ پیٹھ پیچھے ٹیبت کرنا ہے۔

۳۔ اور مصیبت کے وقت شہادت کرنے لگتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے ایک اور حدیث میں منقول ہے۔

المتكلف مخطيء وان اصاب، و المتكلف لا يستجلب في عاقبة امره الا الهوان، وفي الوقت الا التعب و العناء والشقاء، و المتكلف ظاهره رياء و باطنه نفاق، و هما جناحان بهما يطير المتكلف، و ليس في الجملة من اخلاق الصالحين، و لا من شعار المتقين المتكلف في اى باب، كما قال الله تعالى لنبيه قال ما اسئلكم عليه من اجر و ما انا من المتكلفين

متكلف خطا کر ہے چاہے وہ ظاہر حقیقت تک پہنچ بھی جائے۔ متكلف کو آخر الامر سوائے ہستی اور خواری کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور آج بھی سوائے رنج و تکلیف اور زحمت و ناراہتی کے اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

متكلف کا ظاہر ریا اور اس کا باطن نفاق ہے اور وہ ہمیشہ ان ہی دونوں پروں کے ساتھ پرواز کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ متكلف صالحین کے اخلاق اور متقین کے شعار میں سے نہیں ہے چاہے وہ جس بات میں بھی ہو، جیسا کہ خدا اپنے پیغمبر سے فرماتا ہے: کہہ دے! میں تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا اور میں متكلفین میں سے نہیں ہوں۔

ان سب روایات سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ متكلفین وہ لوگ ہیں جو حق و عدالت اور راستی و درستگی کے راستے سے قدم باہر رکھتے ہوئے حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں، خیالات کے پیچھے چسے رہتے ہیں۔ ایسے امور کی جن کے بارے میں آگاہی نہیں رکھتے، خیر دیتے ہیں اور جن امور کو نہیں جانتے ان میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ ان کا ظاہر دباطن الگ الگ ہے۔ اور ان کا حضورؐ فیاب متقنا ہیں وہ خود کو رنج و زحمت میں ڈالتے ہیں اور سر پھیلانے اور بدبختی کے سوا کوئی نتیجہ انھیں نہیں ملتا اور پرہیزگار اور صلح لوگ اس "صفت" سے بالکل پاک اور منترہ ہیں۔

پروردگارا! ہمیں توفیق عنایت فرما کہ ہم تکلف، نفاق، مزہ اور سرکشی کے تمام آثار سے دور رہیں۔ خداوند! ہمیں غلصین کی صف میں قرار دے جن کی تو اپنی حمایت کے سایہ تلے حفاظت فرماتا ہے اور گمراہ کرنے والا شیطان سے مایوس ہے۔

بارالہ! ہمیں وہ بیداری اور سمجھ داری مرحمت فرما کہ ہم اس قرآن عظیم کے مطالب و معانی کو زندہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہیں۔ ہم ساری دنیا کے مسلمانوں کی طاقت و قوت کو اکٹھا کریں اور یک دل اور یک زبان ہو کر تیری راہ میں قدم بڑھائیں اور حق و حقیقت کی روشنیوں کا قلع قمع کر کے رکھ دیں۔

آمین یا رب العالمین

سورۃ صٰحٰل کی تفسیر کا اختتام بروز ہیرہ و شوال ۱۴۰۲ھ



ادارہ امانیہ قرأت گاہ

سٹرٹنگیٹ تصحیح

یہ تصحیح آئیڈیل پاکستان (تفسیر نمونہ جلد ۱۰) کے لئے تیار کی گئی ہے۔ تصحیح کو صرف بحون بنور پڑھائیں۔ تصدیق کے ساتھ ساتھ تصحیح کو اپنے ہاتھ سے تصحیح فرمائیے۔

ڈاکٹر اعلمہ انصاریہ
حافظ محمد طفیل (سٹالٹان نائل)

مدیر/منشی

امامیہ قرآت گاہ
اندرون مسجد روضہ - لاہور



اشاریہ سے پہلے

زیر نظر اشاریہ تفسیر نمونہ کے قارئین اور محققین کی سہولت کے لیے خود مصباح القرآن ٹرسٹ نے مرتب کروایا ہے۔

یاد رہے کہ فارسی کی اصل اشاعتوں میں اشاریہ موجود نہیں ہے۔ اس طرح مصباح القرآن ٹرسٹ کو اس سلسلے میں پہل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہو رہا ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ دیگر جلدوں کی اشاعتوں میں بھی اشاریہ شامل کر کے انہیں مفید تر بنایا جائے۔

اشاریوں کی عام روش سے ہٹ کر زیر نظر اشاریہ میں تفسیر میں موجود قرآنی نکت کے زیادہ وقت طلب الفاظ کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے مؤلف محترم نے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیلی فہرست بھی پیش کر دی گئی ہے۔

عالِم پیری میں یہ کٹھن اور بزرگانہ کام محترم سید شکیل حسین موسوی نے انجام دیا ہے۔ خدا تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ کرے اور انہیں خدمتِ اسلام اور قرآن کے لیے طولِ عمر سے نوازے۔

آپ کی آراء اور تنقید اس سلسلے کو بہتر اور موثر بنانے کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

انچارج

شعبہ تصنیف و ترتیب

مصباح القرآن ٹرسٹ

اشاریہ

تفسیر نمونہ جلد ۱

ترتیب و ترتیبیں ----- سید شکیل حسین موسوی
سید محمد حسین زیدی الباہروی

۴۰۳	مضامین ۱
۴۱۰	اصول و عقائد
"	احکام
۴۱۱	اخلاقیات
۴۱۲	اقوام گذشتہ
۴۲۳	شخصیات
۴۲۴	علماء و دانشور
"	کتب سماوی
۴۲۶	کتب تاریخ و تفسیر و سیر
۴۳۳	لغات قرآن
۴۲۶	متفرق موضوعات
	مقامات

یہیں اس ہستی کی پرستش کیوں نہ کرول جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔

۳۲۳

مردہ زمین بھی ایک نشانی ہے، اُسے زندہ کیا، فصلیں اُگائیں، کھجور اور انگور کے باغ اُگائے، زمین سے چٹنے نکالے۔

۳۳۲، ۳۳۰

ہم نے ہرگز اسے شکر نہیں سکھایا اور وہ اس کے لائق بھی نہیں۔

۳۹۵

ہم نے چوپائے پیدا کر کے ان کے قبضہ میں دے دیے، وہ ان پر سواری کرتے اور ان سے غذا حاصل کرتے ہیں، اور بھی فائدے ہیں پھر بھی شکر نہیں کرتے۔

۳۰۸ تا ۳۰۲

کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُسے بے وقعت لطف سے پیدا کیا، جب اُسے قوت و قدرت حاصل ہوئی تو جھگڑنے لگا۔

۳۰۹

وہی ذات ہے جس نے سبز درخت سے آگ پیدا کی جس سے تم جلاتے ہو۔

۳۱۳

وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ ان کی مانند اور پیدا کر دے، وہ خلاق و عظیم ہے۔

۳۱۹

جب وہ ارادہ کرے تو ہر شے ہوجاتی ہے۔ وہ پاک و پاکیزہ اور ہر چیز کا مالک ہے۔

۳۲۳

تمہارا معبود یقیناً کیا ہے۔ وہ زمین و آسمان ان کی درمیانی اشیاء اور مشرق و مغرب ہے۔

۳۵۰، ۳۴۹، ۳۴۴

ہم نے زمین، آسمانوں کو ستاروں سے

زینت بخشی اور اس کی شیطان سے

۳۵۳ تا ۳۵۱

حفاظت کی۔

ہم نے انہیں چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا

۳۵۷

ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔

۳۷۲

ہم کیسے اچھے دُعا قبول کرنے والے ہیں۔ ہم

۳۹۹

نیک لوگوں کو اسی طرح اجر دیتے ہیں۔

۵۲۲

ہم نے ابراہیم کو ایک بُر بار بیٹے کی بشارت دی

۵۲۳

ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں

۵۳۶

ہم نے اسحاق کو برکت دی

۵۳۶

ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا، کتاب

۵۳۷

دی، راہ ہدایت دی، ہم نیکو کاروں کو اسی

۵۳۷

طرح جزا دیا کرتے ہیں۔

۵۳۷

ہم نے نوح اور اس کے خاندان والوں کو

۵۵۰

نجات دی۔

۵۵۰

ہم نے یونس کو آخر ہانی بخشی

۵۵۲

ہم نے رسولوں سے وعدہ کر لیا ہے کہ ان کی

۵۵۳

مدد کی جائے گی۔

۵۵۳

ہم نے یونس کی دُعا قبول کی اور اسے نجات دی

۵۵۷

اللہ اس توصیف سے پاک و منزہ ہے جو

۵۷۱، ۵۶۷

گمراہ و مشرکین کرتے ہیں۔

۵۸۰

ہمارا شکر ہر میدان میں کامیاب ہوگا

تیرا پروردگار اس توصیف سے جو وہ کرتے ہیں

پاک و منزہ ہے۔ تمام حمد و ستائش اللہ کے

۵۸۶

لیے جو عالمین کا رب ہے۔

۵۹۲

ہم نے اس سے بیشتر کئی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے

۶۰۵ تا ۶۰۱

نئے نظریات کی بنا پر قریش کو حیرت تھی اسی

۶۰۵ تا ۶۰۱

وجہ سے انہیں انکار تھا۔

۶۰۵ تا ۶۰۱

ہم نے داؤد کے لیے پہاڑوں کو مسخر کر دیا،

۶۱۹، ۶۱۶

حکومت کو استحکام بخشا، حکمت و عدالت

۶۱۹، ۶۱۶

عطا فرمائی۔

۶۸۲، ۶۸۱

خدا نے یگانگہ سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زمین و

۶۸۲، ۶۸۱

آسمان کا پروردگار ہے۔ عزیز و مغفار ہے۔

عدل

جو ایمان لائیں، عمل صالح انجام دیں، اس کو

۳۳

اجر و ثواب عطا کریں۔

۳۳

ان کا خیال ہے کہ حساب و کتاب اور عدل و

۳۳

انصاف تو ہوگا ہی نہیں۔

۳۳

معاذ اللہ انکار اللہ کے عدل و حکمت کا انکار ہے

۲۸۱، ۲۸۰

توسنت الہی میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔

۳۳۱

ہم قیامت کے دن عدل کے تراژو قائم کریں گے

۳۳۱

قیامت کے دن ان کا عدل کے ساتھ فیصلہ

۳۳۱

ہوگا۔ ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

۳۷۲

یہ ہماری سنت ہے جو قانون عدل کی بنا پر ہے

جو اعمال بد تم انجام دیا کرتے تھے بدلہ تو تمہیں

۳۷۲

صرف انہی کا ملے گا۔

۶۲۳

ہم نے داؤد کو عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا سکھایا

نبوت

۱۰۸ تا ۱۰۴

تم تمام جہانوں کے لیے مبعوث کیے گئے ہو

۱۲۱ تا ۱۱۵

ہم نے جس لہجے میں نبی بھیجا وہاں کے مترفین

۱۲۱ تا ۱۱۵

نے اس کا انکار کیا۔

۱۸۲، ۱۸۱

اگر آپ کو جھٹلایا تو یہ کوئی نئی بات نہیں،

۱۸۲، ۱۸۱

آپ سے پہلے پیغمبر بھی جھٹلائے گئے سب

۱۸۲، ۱۸۱

کام اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔

۲۲۳

تم صرف ڈرانے والے ہو، وہ ایمان نہ لائیں

۲۲۳

گے، پریشان نہ ہو۔

۲۳۲

ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بشارت و نذرت

۲۳۲

کے لیے بھیجا۔ ان سے پہلے لوگ بھی انبیاء

۲۳۲

کی تکذیب کرتے رہے۔

۲۳۸

ہم نے کتاب میں جو کچھ آپ کو وحی کیا ہے

۲۳۸

وہ حق ہے اور پہلی کتاب سے ہم آہنگ ہے۔

۲۶۸

اے رسول! ان سے پوچھیے کہ تمہارے خداؤں

۲۶۸

نے کیا پیدا کیا۔

۳۵۷

تو ان کے انکار سے تعجب کرتا ہے۔ وہ تو

۳۵۷

ٹھٹھا کرتے ہیں۔

۳۷۲

وہ حق سے لے کر آیا ہے سابقہ انبیاء کی تصدیق کی ہے

ان کی ہٹ دھرمی پر توبہ نہ دے ۵۸۸، ۵۸۹

امامت

ہم نے ہر چیز کا احصاء امام مہین میں کر دیا ہے ۳۰۵
پیشوا اور پیکاروں کی گفتگو ۳۵۰
ولایت علی کا سوال ۳۶۸، ۳۶۸
پیشوا اور پیکار سب عذاب میں مبتلا ہوں گے ۳۷۳، ۳۷۳

قیامت

کافروں نے قیامت ہرگز ہمارے پاس نہیں آئے گی ۳۳
تکذیب آیات کرنے والے ہرگز احاطہ قدرت سے
باہر نہ نکل سکیں گے ۳۴
کیا انہوں نے اس کے پیچھے آسمان وزمین کے
متعلق چیزوں پر نظر نہیں کی ۳۶ تا ۳۶
ہمارا پروردگار ہم سب کو قیامت کے دن
جمع کرے گا ۹۸، ۹۲، ۹۱
یہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا؟ اس دن
ہوگا کہ ایک ساعت پہلے نہ تاخیر سے ۱۰۸ تا ۱۰۴
قیامت میں مستضعفین اور مستکبرین کی گفتگو
اللہ ان کو محسوس کرے گا۔ فرشتوں سے
پوچھے گا کیا یہ تمہاری عبادت کرتے تھے؟
اس آگ کا مزہ چکھو جس کی تکذیب کرتے
تھے ۱۳۰ تا ۱۲۵

جب وہ عذاب خدا میں گرفتار ہو جائیں

۱۵۸ گے تو بھاگ نہ سکیں گے۔

۱۸۲، ۱۸۱ اسے لوگو اللہ کا وعدہ حق ہے

۱۸۲، ۱۸۱ بادلوں کو بھیجتا ہے؛ بادش سے مُردہ زمین

۱۸۲، ۱۸۱ زندہ ہو جاتی ہے۔ پس قیامت بھی اسی

۱۹۲، ۱۸۸ طرح ہے۔

۲۲۲ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے

۲۲۲ گا۔ (ماں بیٹے کی مثال)

۲۲۳ اگر نیک و بد افراد اس جہان میں بدل نہ پائیں

۲۲۳ تو آخرت میں پائیں گے۔

۲۳۴ تم سب کے سب قیامت کے دن ہمارے

۲۳۴ پاس حاضر ہوں گے۔

۲۳۴ یہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا؟ انہیں

۲۳۴ ایک سچ کا انتظار ہے۔

۲۴۲ آج تم پر ظلم نہیں ہوگا، تمہارے عمل کی جزا

۲۴۲ دی جائے گی۔

۲۴۲ قیامت میں یہ آتش جہنم میں حاضر ہونے والا

۲۴۲ لشکر ہوں گے۔

۲۴۲ وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی بار پیدا کیا تھا

۲۴۲ وہ ہر مخلوق سے آگاہ ہے۔

۲۴۲ قیامت کے دن اللہ فیصلہ کر دے گا جس

۲۴۲ میں یہ اختلاف رکھتے تھے۔

۲۴۲ قرآن اور مسئلہ معاد۔ معاد جہانی پر تبصرہ ۲۳۹ تا ۲۳۲

ان کی خلقت (اور معاد) مشکل ہے یا فرشتوں

۲۵۷ اور زمین و آسمان کی خلقت۔

۲۵۷ کیا ہم مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد اٹھائے

۲۶۰ جائیں گے اور ہمارے باپ دادا بھی ایک چیخ

۲۶۰ سے زندہ کیے جائیں گے؟

۲۶۰ وائے سویم پر کیا یہ جزا کا دن ہے؟ ہاں فرشتے

۲۶۰ جہنم کی راہ پر لگا دیں گے۔

۲۶۵ ردو! ان سے پوچھا جائے گا

۲۶۱ گواہ، پیشوا اور پیکار سب عذاب میں مبتلا ہوں گے

۲۶۱ روز قیامت کی فراموشی ہمیشہ کی گمراہیوں کا

۲۶۵ سرچشمہ ہے۔

۲۶۲ پھر تم قیامت میں اپنے رب کے پاس بھگڑو گے

معجزہ

جب وہ معجزہ دیکھتے ہیں تو دوسروں کو ٹھٹھا

۲۵۷ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

۲۵۷ یونس کا مچھلی کے شکم میں زندہ رہنا معجزہ ہے

۲۵۷ قسم ہے اس قرآن کی جس میں ذکر ہے، یہ قرآن

۲۵۷ معجزہ ہے۔

جنت

(سابقہ بالجزات) جنت کے دائمی باغات سونے کے

۲۵۷ لنگن اور حریر کے لباس ہوں گے۔ وہ اللہ کی حمد و

۲۵۷ تائش کے جو مغفور و شکور ہے۔

بہشت والے اللہ کی نعمات میں مشغول ہوں

۳۶۴ گے، ان کی بیویاں محلوں میں، زیر سایہ اشجار

۳۶۴ تکبیر لگائے بیٹھے ہوں گے۔

۳۶۴ بہشت و دوزخ کی کیفیات پر ایک نظر ۳۲۹ تا ۳۲۷

۳۶۴ مخلص بندوں کے لیے خاص اور عین روزی

۳۶۴ ہے۔ پھل، باغات، شرابِ طہور، پاک

۳۶۴ بی بیال ہیں۔

۳۶۴ اہل جنت کی آپس میں گفتگو۔

۳۶۴ ایک مقام جنت میں ایسا ہے کہ وہاں انسان

۳۶۴ سخت ترین ابتلا سے گزر کر پہنچتا ہے۔

جہنم

یہ وہی دوزخ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا

۳۸۷ تھا اس میں داخل ہو جاؤ۔

۳۸۷ زقوم کے نفرت انگیز درخت کو ہم نے ظالموں

۳۸۷ کے لیے درود رنج کا سبب بنایا۔ یہ قعر جہنم

۳۸۷ سے آگاہ، شامیں شیطان کا سر میں، مجرم اس

۳۹۰ سے پیٹ بھریں گے، بدبودار پانی پئیں گے۔

شفاعت

اس کے پو، کسی کے لیے کوئی شفاعت

۹۲ فائدہ نہ دے گی۔ اسے جن کو شفاعت کا

۹۲ اختیار دیا گیا ہے۔

وہ ان لوگوں کی سفارش کریں گے جنہوں نے ان سے کوئی نیکی کی ہوگی، مگر اعمال کے باعث مستحق عذاب ہو گئے ہیں۔

۲۳۵

احکام

نماز

پہاڑوں اور پرندوں سے کہا کہ واؤد کے ساتھ اللہ کی تسبیح کرو۔

۳۷

حدیث ثناء اس ذات کے لیے مخصوص ہے جو آسمان وزمین کا خالق ہے۔

۱۶۸

اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ متقی کو اس کا اجر ملے گا۔

۲۱۷

کتاب خدا کی تلاوت کرتے اور نماز قائم کرتے ہیں۔

۲۳۲

زکوٰۃ یا انفاق

جو چیز اس کی راہ میں خرچ کرے وہ اس کی جگہ اور دے دے گا، وہ بہترین روزی دینے والا ہے۔

۱۲۵

جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے انفاق کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں نقصان نہیں۔

۲۳۲

۵

قوم سبا کے مفصل حالات ۸۳ تا ۷۹

قوم سبا کا عجیب و غریب واقعہ ۸۸ تا ۸۳

قوم سبا کے نتائج پر ایک نظر ۹۰ تا ۸۸

قوم نوح و عاد و ثمود و فرعون کے منہوس انجام کا مختصر ذکر۔

۲۸ تا ۲۷۹

انظاکیر (بستی والوں) کا ذکر۔ پیچ سے ان کا خاتمہ ۳۳۰ تا ۳۳۰

عاد

حضرت ہود کے خلاف قیام کیا، ہولناک

۶۰۹ تا ۶۰۸

انہی سے تباہی۔

فرعون و قارون کی قوم

قوم فرعون نے حضرت موسیٰ کے خلاف قیام

۶۱۱ تا ۶۱۰

کیا۔ غرق نیل ہوئی۔

حضرت لوط کی قوم

ہم نے لوط کے خاندان کو نجات دی سوائے

۵۵۲ تا ۵۵۰

ایک بڑھیا کے۔ قوم کو برباد کر دیا۔

قوم نے حضرت لوط کے خلاف قیام کیا پتھروں

۶۱۱ تا ۶۱۰

کی بارش سے ہلاک ہوئی۔

حضرت مود و ہارون کی قوم

ہم نے بنی اسرائیل کو جابر و نوح و نوح و فرعون سے

۵۴۱ تا ۵۴۰

نجات دی۔

اقوام سابقہ

حضرت ابراہیم کی قوم

حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکا ۵۲۱ تا ۵۰۵

حضرت الیاس کی قوم

الیاس نے اپنی قوم سے کہا تقویٰ اختیار کرو

۵۴۶ تا ۵۴۳

بل بٹ کی بیماری قوم۔

حضرت صالح کی قوم (ثمود)

حضرت صالح کے مقابلہ میں قیام کیا۔ آسمانی

۶۱۱ تا ۶۱۰

بھلی کا شکار ہوئے۔

حضرت شعیب کی قوم (اصحاب الایک)

حضرت شعیب کے خلاف قیام کیا۔ آسمان

۶۱۱ تا ۶۱۰

سے بھلی گری۔

سبا

قوم سبا کے لیے ان کی سکونت میں قدرت خدا

کی ایک نشانی تھی، بارخ اور فروداں پھیل تھے۔ وہ

اللہ سے روگرداں ہو گئے، سیلاب بھیج دیا، ہم

۷۸ تا ۷۷

ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

اخلاقیات

اخلاق حسنة

دلوں کی تسخیر کے لیے مباحث میں اخلاقی و

۱۰۲ تا ۱۰۱

نفسیاتی طرز استدلال۔

پیغمبر اسلام اور ائمہ اہل بیت کا طریق استدلال ۱۰۳ تا ۱۰۲

حبیب بنجار کا بستی والوں کی طرف آنا اور

۳۲۷ تا ۳۲۶

قوم کو تبلیغ۔

اس مرد مومن نے اپنی زندگی میں اپنی قوم

کی خیر خواہی کی اور مرنے کے بعد ان کی

۳۲۹ تا ۳۲۸

ہدایت کی آرزو کی۔

انکساری، تسلیم و رضا حقیقی اسلام یہی ہے ۳۷۴

اخلاق رذیلة

بداخلاق انظاکیر والے جنہوں نے رسولوں

۳۲۹ تا ۳۲۲

کی تکذیب کرنے کے علاوہ انہیں ڈر لایا دھمکایا

تکبر، وہ تکبر کی وجہ سے لا الہ الا اللہ

۳۷۴ تا ۳۷۳

نہیں کہتے تھے۔

گمراہی، مگر اسی کے سبب حق کو قبول نہ کیا ۳۶۹ تا ۳۶۶

ھٹ دھرمی، ابراہیم کے استدلال کے

۵۱۸

باد وجود آپ کی ہلاکت کا منصوبہ بنایا۔

حضرت نوح کی قوم

قوم نوح نے مرکشی کی غرق طوفان ہوئی ۵۰۴ تا ۳۹۹
نوح کی تکذیب کی، طوفان اور تباہ کن بارش
سے نابود ہوئی۔ ۶۱۱، ۶۱۰

حضرت یونس کی قوم

قوم یونس عذاب الہی کو دیکھتے ہی بیدار ہو گئی
عذاب سے محفوظ رہی۔ ۵۵۴

شخصیات

حضرت آدم علیہ السلام

مجھے فرشتوں کے بارے میں علم نہیں جب وہ
آدم کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ۶۸۲

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ابراہیم نوح کے پیروکاروں سے تھا ۵۰۵
وہ قلب سلیم کے ساتھ اپنے رب کی بارگاہ میں
ستاروں کی طرف دیکھتا اور اپنے آپ کو تیار تانا ۵۱۰ تا ۵۱۳
حضرت ابراہیم اور قلب سلیم ۵۱۵، ۵۱۴
حضرت ابراہیم کا مشرکین سے مکالمہ، ہلاکت کا
منصوبہ، سلامتی اور اولاد کی دعا۔ ۵۱۶ تا ۵۱۹

ہجرت ابراہیم

۵۲۱، ۵۲۰ بیٹے کی بشارت، بیٹے سے غراب کا ذکر،
بیٹے کی آمدگی، بیشانی کے بل لٹانا، آواز
دی تم نے غراب سچ کر دکھایا، عظیم بدلہ قرار دیا ۵۲۲ تا ۵۲۹
کیا ابراہیم فرزند کو قربان کرنے پر مامور تھے؟ ۵۳۱
حضرت ابراہیم کا خواب کس طرح حجت ہو
سکتا ہے۔ روح ابراہیم پر شیطانی دوسے
اثر انداز نہ ہوئے۔ ۵۳۲
جمہ اولیٰ و ثانی و عقبہ پر شیطان کو سات
سات پتھر مارنا۔ ۵۳۳
ابراہیم با ایمان بندوں میں سے تھا، ہم نے
اسحاق کی بشارت دی اور دونوں کو برکت دی۔ ۵۳۶
ابراہیم و اسحاق کو یقوت کو یاد کرو ۶۶۳

ابلیس ملعون

ابراہیم کو درغلا یا، حضرت ہاجرہ کو بہکایا، اسماعیل
کو بہکایا، صبر و رضا کا پیکر پایا۔ ۵۳۲، ۵۳۳
ابلیس نے سجدہ نہ کیا ۶۸۷
ابلیس کی ہزار سال کی عبادت کو گھڑی بھر کے
تکبر نے برباد کر دیا۔ (امیر المؤمنین) ۶۹۰
ابلیس نفخہ اول و دوم کے درمیان مرجا بیگا
(امام جعفر صادق) ۶۹۲
ابلیس کے لئے اللہ نے جو حکم دیا اس سے
ہجرت حاصل کرو۔ ۶۹۱

ابو ذرؓ

پیغمبر اکرمؐ کی آپٹ کو پانچ چیزوں کی وصیت جن میں
ایک "بڑھاپے سے پہلے جوانی کو غنیمت جانو" تھی۔ ۳۹۳

ابوسعید خدریؓ

رسول پاکؐ کی حدیث "امام مبین سے مراد علیؑ ابن
ابطالبؓ ہیں" کے راوی (دیگر راویان حدیث بھی) ۳۱۱

حضرت ابوطالبؓ ابن عبدالمطلبؓ

ابو جہل اور قریش سردار آنحضرتؐ کی شکایت
آپ کے پاس لائے (شان نزول سورہ ص) ۵۹۳
خدا کی قسم میں ہرگز تمہاری نصرت سے
دستبردار نہیں ہوں گا۔ ۶۰۱

ابوعبیدہ بن جراحؓ

انطاکیہ کو خلیفہ ثانی کے عہد میں فتح کیا ۳۳۱

ابوہریرہؓ

اہل حق کے خلاف سفیانی کا خروج، صحرا میں
گرفتار عذاب ہو کر زمین میں دفن جانے کی
حدیث بیان کی۔ ۱۵۹

ابی بن خلف

معاذ پر بطور اعتراض کہا: کس میں قدرت ہے کہ
اس بوسیدہ ہڈی کو دوبارہ زندہ کرے۔ ۴۱۲

حضرت اسحاق علیہ السلام

ہم نے اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دی ۵۲۹
کچھ لوگ حضرت اسحاق کو ذبح جانتے ہیں ۵۲۹
ابراہیم و اسحاق کو یقوت کو یاد کرو ۶۶۳

حضرت اسماعیل علیہ السلام

حضرت اسماعیل ذبح تھے ۵۲۹
شیطان نے بہکایا، صبر و رضا کا پیکر پایا ۵۳۳
اسماعیل، الیسع، ذی الکفل کو یاد کرو، یہ
نیک لوگوں سے تھے۔ ۶۶۳

حضرت الیاس علیہ السلام

بے شک الیاس ہمارے رسولوں سے تھے ۵۲۶ تا ۵۳۲
جناب الیاس کون تھے؟ تفصیل ۵۴۷، ۵۴۸

حضرت الیسع

اسماعیل، الیسع اور ذی الکفل کو یاد کرو،
یہ نیک لوگ تھے۔ ۶۶۳

حضرت اُم سلمہ (اُم المؤمنین)

اہل حق کے خلاف سفیانی کا خروج، صحرا میں گرفتار عذاب ہونا اور دھنسا بیان فرمایا۔ ۱۵۹

امیہ بن خلف

"کس میں قدرت ہے کہ اس بوسیدہ بڑی کو دوبارہ زندہ کرے" ۲۱۲

حضرت ایوب علیہ السلام

یاد کرو جب ایوب نے پکارا کہ مجھے شیطان نے اذیت دی ہے۔ ۶۵۸ تا ۶۵۳

داستان ایوب کے اہم درس ۶۵۹
ایوب قرآن و توریت میں ۶۶۱

برنایا

اصل نام یوسف، پولس اور مرقس کا صحابی برائے تبلیغ انطاکیہ بھیجے گئے۔ ۳۳۱

بیہوشی

حضرت بلالؓ کا آنحضرتؐ کی قبر مبارک سے مخاطب ہو کر دورانِ قحط و خشک سالی بارش کی دعا کرنا بیان کیا۔ ۲۱۵

پولس

ایک عیسائی مبلغ ۲۳۱

جابر ابن عبد اللہ انصاری

راوی حدیث رسولؐ "امام مہین سے مراد حضرت علیؓ ابن ابی طالب ہیں۔" ذہبت سے مفسرین کا اتفاق ۳۱۱

حضرت امام جعفر صادقؑ (امام ششم)

داؤد جب زبور تلاوت فرماتے تو تمام پہاڑ، پتھر، پرند، سب ان کے ساتھ بیچ کرتے تھے ۴۹
حضرت سلیمانؑ کے لیے بنائی جانے والی تمثال مردوں اور عورتوں کے مجھے نہ تھے، درختوں وغیرہ کی تصاویر تھیں۔ ۵۹

نعت کا شکر گناہوں سے پرہیز کرنا ہے ۷۱
کیا پروردگار کے شکر کی کوئی حد ہے؟ ۷۱
شکر کرنے کی توفیق بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے ۷۱

طویل حدیث قبولِ دعا کی شرائط کے بیان میں ۱۳۳، ۱۳۲
ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک رات کی عبادت سے بہتر ہے۔ ۱۳۹

جو شخص سورہ سبأ کی تلاوت کرے اللہ اپنی حمایت کے سایہ میں اس کی حفاظت فرمائے گا۔ ۱۶۷

فرشتے کھاتے پیتے ہیں نہ ازدواج کرتے ہیں

صرف نیم عرش سے زندگی بسر کرتے ہیں ۱۷۸
اللہ کے بعض فرشتے قیامت تک کے لیے رکوع میں ہیں اور بعض سجدہ میں ہیں۔ ۱۷۹

علماء سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے اعمال ان کے اقوال سے ہم آہنگ ہوں۔ ۲۳۱
ظالم کو مقدم رکھا کہ وہ رحمتِ خدا سے مایوس نہ ہو

سابق بالخیرات کو مؤخر کیا کہ وہ اپنے عمل پر غور نہ ہو ۲۵۳
"یس" رسولِ خدا کا نام ہے، دلیل یہ ہے کہ بعد میں فرمایا کہ تومیرے مُرسلین سے ہے اور

صراطِ مستقیم پر ہے۔ ۲۹۲
چھوٹے گناہ سے ڈرو، وہ جمع ہو کر بڑا گناہ بن جاتے ہیں۔ ۳۱۱، ۳۱۰

دن کو رات سے پہلے پیدا کیا ۳۵۷
خدا کی قسم انہوں (علماء اور اہل حق) نے یہود و نصاریٰ کو اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی۔ ۳۸۳

جس شخص نے پروردگار کی معصیت میں کسی شخص کی اطاعت کی تو اس نے اُسکی پریش کی۔ ۳۸۳
جو کوہِ صافات "تلاوت کرنے والے ہر بلا سے محفوظ ہیں۔ ۴۳۲

نیت صادق رکھنے والا صاحبِ قلب سلیم ہے ۵۰۸
تو یہ جھوٹ نہیں ہے۔ ۵۱۳
اسماعیل ذبح میں ۵۲۰

جب تم ان آیاتِ قرآن کی تلاوت کرتے ہو

تو گویا لوٹ کر تباہ بستی کے قریب سے گزرتے ہو ۵۵۲
قرع سے بڑھ کر عادلانہ فیصلہ اور کون سا ہو سکتا ہے! ۵۶۵، ۵۶۶

حضرت داؤدؑ کے قصہ میں آپ کے ارشادات ۶۲۹
ایوبؑ کھرانِ نعمت سے نہیں شکرِ نعمت سے گرفتار ہوا ہے۔ ۶۵۶، ۶۵۵

پیغمبرانِ خدا سب سے زیادہ سخت امتحانات سے گزرتے ہیں۔ ایک مقامِ جنت میں ایسا ہے کہ انسان وہاں سے سخت ترین ابتلا سے گزر کر پہنچتا ہے۔ ۶۶۰

اللہ نے مکتبِ اہل بیت کے پیروکاروں کو یاد کیا ہے۔ ۶۸۰
ابلیس نفعِ اول و دوم کے درمیان مرجعے گا ۶۹۳
مشکلف کی تین نشانیاں ہیں ۷۰۰، ۶۹۹

حلبیب

ایک بڑھا گڈریا بیٹریں چراہ تھا۔ پولس اور برنایا مبلغین نے اسے سلام کیا۔ ۳۳۱

حدیثِ رض

اہل حق کے خلاف سفیانی کا خروج، بتلائے عذاب ہونا اور زمین میں دھنسا بیان کیا۔ ۱۵۹

حضرت امام حسن (امام دوم)

- اگر تو چاہے کہ بغیر قبیلہ کے عزیز اور بغیر سلطنت پر بیعت رہے تو اللہ کی اطاعت میں آجا۔ ۱۹۵
- نیکو کاری اور پوشیدہ صدقہ دینا فقر و فاقہ سے نجات، عمر میں زیادتی اور شتر قسم کی بُری موت سے بچاؤ کا سبب ہے۔ ۲۰۷
- علم و عمل دو مخلص دوست ہیں۔ اللہ کو پہچان کر جو اس سے ڈرتا ہے، عمل صالح کرتا ہے۔ ۲۳۰
- حضرت امام حسین (امام سوم)
- دُعائے عرفین آپ نے اپنی خلقت و آفرینش کا ذکر فرمایا ہے۔ ۶۶۵

حضرت داؤد علیہ السلام

- ہم نے داؤد کو اپنے فضل سے ایک نعمتِ عظیم بخشی، پزندوں و پہاڑوں کو بہنوا بنایا۔ لوہے کو ان کے لیے نرم کر دیا۔ زرہیں بناؤ، ہم تمہارا عمل دیکھ رہے ہیں۔ دیگر فضائل۔ ۵۲ تا ۵۴
- پہاڑو پر بندے سخر کر دیے جو صبح و شام اس کے لیے تسبیح کرتے تھے۔ ۶۲۰ تا ۶۱۵
- حکومت کو استحکام، بنشأ، علم، عدالت، شجاعت عبارت حکمت جیسی اہم صفات عطا فرمائیں۔ ۶۲۰، ۶۱۹

- داؤد کو پیش آمدہ واقعہ کی حقیقت ۶۲۵
- اسلامی روایات اور قصہ داؤد ۶۲۹ تا ۶۳۱
- قصہ داؤد میں مفسرین کی توجیہات ۶۳۱، ۶۳۲
- داؤد تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا، پس برحق فیصلہ کرو۔ ۶۳۲ تا ۶۳۸
- ہم نے داؤد کو سلیمان جیسا بیٹا عطا فرمایا ۶۳۰
- حضرت ذوالکفل علیہ السلام
- اسماعیل، الیسع اور ذوالکفل کو یاد کرو۔ یہ نیک لوگ تھے۔ ۶۶۳

حضرت سلیمان علیہ السلام

- ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کیا، تاجیہ کا چشمہ جاری کیا، جنوں کو خدمت پر مامور کیا۔ ۵۲ تا ۶۲
- سلیمان کی عبرت انگیز زندگی کا ایک منظر ۶۲ تا ۶۳
- سلیمان کا سنت امتحان اور وسیع حکومت ۶۱۸ تا ۶۲۳
- ہم نے داؤد کو نیک اور خدا رسیدہ بیٹا سلیمان عطا فرمایا۔ ۶۳۰
- دانشان سلیمان سے حاصل ہونے والا درس ۶۳۶ تا ۶۵۱
- حضرت سلیمان قرآن اور توریت میں ۶۵۳

شمعون الصفا

- حضرت عیسیٰ کا تیسرا رسول سوار یوں کا بزرگ ۳۲۲

شیطان

- زندگانی دُنیا یا شیطان کہیں تمہیں مغرور نہ کرے یقیناً وہ تمہارا واضح دشمن ہے۔ ۱۸۱ تا ۱۸۷
- شیطانی افراد کے گروہ ۱۸۶
- کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ شیطان کی پیروی نہ کرنا، یہ تمہارا واضح دشمن ہے ۳۸۰ تا ۳۸۶
- شیطانیں فرشتوں کی باتیں نہیں سن پاتے، کوشش کرتے ہیں تو شہابِ ثاقب کی زد میں آتے ہیں۔ ۳۵۱
- شیطان دشمنانِ خدا مستکبرین کا پیشوا ہے جن نے تکبر و غرور خواہی کی بنیاد رکھی۔ (جناب امیر) ۶۹۵، ۶۹۶

عاص بن وائل

- آنحضرت سے چیخ کر کہا، کس میں یہ قدرت ہے کہ اس بوسیدہ ہڈی کو دوبارہ زندہ کرے۔ ۳۱۲

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (أم المؤمنین)

- راوی حدیث، سفیانی اہل حق کے خلاف خروج کرے گا۔ صحرا میں گرفتار عذاب ہوگا، زمین میں دھنس جائے گا۔ ۱۵۹

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما

- آسمانی کتاب پڑھتا تھا، نہ ہی کوئی دھویدار توبت تھا۔ ۲۹۸

- راوی حدیث، سفیانی اہل حق کے خلاف خروج کرے گا۔ گرفتار عذاب ہوگا، زمین میں دھنس جائے گا۔ ۱۵۹
- الیاسین سے مراد آلِ یسین ہیں جو آلِ محمد ہیں ۵۳۹
- زوجہ حضرت ایوب کے واقعہ کی تفصیلات ۴۵۸، ۴۵۹

حضرت علی ابن ابی طالب

- اگر کوئی عالم بشارت کی طرف کوئی سیر ہی پاتا یا موت کو دور کر سکتا تو وہ سلیمان تھے۔ ۶۶
- غور و فکر سرچشمہ عمل ہے، نیکی اور اس پر عمل کی دعوت دیتا ہے۔ ۱۳۹
- نعمتِ دنیا کو اپنے ہاتھ سے کھونے کی حسرتیں اور سکراتِ موت ان پر حملہ آور ہو جاتی ہیں وغیرہ فرشتوں میں شستی ہے نہ غفلت، نہ عصیان، نہ نیند نہ سہو نہ غلطی۔ ۱۷۳
- اللہ نے جناب موسیٰ سے فرمایا کہ چاروصایا کو یاد رکھنا (وصایا صفحہ ۱۸۵ پر درج ہیں) ۱۸۵
- تمہارے سر پایہِ مستی کی قیمت جنت ہے، اسے جنت کے علاوہ کسی قیمت پر مت بیچو۔ ۲۳۷
- چھوٹا بڑا، بھاری ہلکا، قوی وضعیف سب اس کی توانائی کے سامنے یکساں ہیں۔ ۲۷۵
- آنحضرت ایسے وقت مبعوث ہوئے جب نہ کوئی آسمانی کتاب پڑھتا تھا، نہ ہی کوئی دھویدار توبت تھا۔ ۲۹۸

۳۱۲ میں وہ امام مبین ہوں جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے
 اسے انسان کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو ایک پھوٹا
 سا جسم ہے، حالانکہ عالم کبیر تجھ میں سمودیا ہے۔ ۳۲۲
 قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ اور جہنم
 کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ ۳۲۴
 اسے لوگوں پر ایت کی راہ میں افراد کی کمی سے کبھی
 وحشت نہ کرو۔ ۳۲۳
 واپس لوٹنے کی راہ بند ہو چکی اور تلافی
 کا امکان نہیں رہا۔ ۳۲۹، ۳۳۸
 اگر میں گھڑی بھر کے لیے اس کے دیدار سے
 محجوب رہ جاؤں تو جان دے دوں۔ ۳۴۸
 بندگانِ خدا! اللہ کے اس دشمن (شیطان) سے
 ڈرتے رہو، وہ تمہیں غرور و تکبر میں مبتلا نہ کر دے۔ ۳۸۵
 قرآن کے بارے میں غرور و تکبر کرو، اس میں دلوں
 کو بجھنے والی بہار ہے (نیز دیگر اقوال) ۳۹۹
 وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کتا ہے، ہو جا
 پس وہ ہو جاتی ہے۔ ۴۲۲
 خدا کی قسم! مجھے موت سے اس سے کہیں زیادہ
 محبت ہے، جتنی بچہ کو ماں کے پستان سے ہوتی
 ہے۔ ربت کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ ۴۲۸
 گروہ صفت بستہ ہمیشہ تسبیح کرتے ہیں۔ ۴۳۸
 وہ جس نے اسماعیل کے لیے فدیہ قرار دیا
 حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں نو گھنٹے رہے ۵۸۲، ۵۸۳

اللہ نے عقول کو اپنی صفات اور حیثیت
 سے آگاہ کیا اور نہ ہی معرفت و شناخت
 سے باز رکھا۔ ۵۴۱
 بلند اوہام اور اندیشوں کے ہاتھ اس کے
 دام میں کبریائی تک نہیں پہنچ سکتے۔ ۵۴۲
 ہر مجلس کے اختتام پر کہو: سبحان ربک
 رب العزت عما یصفون۔ ۵۸۹
 حضرت داؤد کے قصہ میں آپ کے ارشادات
 تمہیں ہر ادب و ہوس اور لمبی آرزو میں گمراہ
 کر دیں گی۔ ۶۳۶، ۶۳۵
 جب سختیاں بلندی پر پہنچ جائیں تو فرج و
 کشائش نزدیک ہو جاتی ہے۔ ۶۶۰
 پرہیزگاروں کی روح مصیبت میں بھی لمبی
 ہی ہوتی ہے جیسی راحت و آرام میں۔ ۶۶۱
 ابلیس کی ہزار ہا سال کی عبادت کو گھڑی بھر
 کے تکبر نے برباد کر دیا۔ ۶۹۰
 ابلیس کے لیے اللہ نے جو انجام دیا اس سے
 عبرت حاصل کرو۔ ۶۹۱
 شیطان دشمن خدا مستکبرین کا پیشوا ہے جس
 نے تکبر و غرور خواہی کی بنیاد رکھی۔ ۶۹۵
 حضرت امام علی بن الحسین (امام چہارم)
 جو بنہ کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں ہے۔ ۷۰۲

میرے بڑے بڑے جرائم نے میرے دل کو مڑھ
 کر دیا ہے۔ ۴۰۰
 کوئی موجود اس سے پہلے اور اس کے بعد
 نہیں ہو سکتا۔ ۵۴۳، ۵۴۲
 حضرت امام علی ابن موسیٰ رضا (امام ہشتم)
 عبادت نماز روزہ کی کثرت میں نہیں بلکہ جہان
 آفرینش کے کاموں میں غور و فکر کرنا ہے۔ ۱۳۸
 ابو ذر کی زیادہ تر عبادت غور و فکر میں تھی
 دن، رات سے پہلے خلق ہوا
 حشر میں ولایت علی کا سوال ہو گا
 اگر کوئی جانور کونبہ سے بہتر ہوتا تو اللہ اسے
 اسماعیل کا فدیہ قرار دیتا۔ ۵۳۰
 حضرت داؤد کے قصہ میں آپ کے ارشادات ۶۳۱ تا ۶۲۹
 عمرو ابن لُحی (بُت پرستی کا بانی)
 شام کے سفر پر گیا، وہاں اسے بُت پرستی بہت
 پسند آئی۔ ایک بُت بطور سوغات حجاز لے آیا۔ ۱۲۸
 فرشتے
 دو دو، تین تین، چار چار پروں کے حامل ہیں،
 رسولوں، آسمانی کتابوں اور فرشتوں پر
 ایمان لانا ضروری ہے۔ ۱۴۰، ۱۴۶

فرشتوں کے مختلف کام جن پر اللہ تعالیٰ
 نے انہیں مامور کیا ہے۔ (دیگر خواص) ۱۸۰ تا ۱۷۷
 فرشتے نکھاتے پینتے نہ ازدواج کرتے ہیں ۱۷۸
 صف بانڈھ کر کھڑے ہونے والوں کی قسم
 سختی سے منع کرنے والوں اور تلاوت
 کرنے والوں کی قسم۔ ۳۳۳ تا ۳۳۸
 مجھے ملائے اعلیٰ کی گفتگو کی کچھ خبر نہیں ۶۸۳
 فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا۔ ۶۸۶، ۶۸۷
 کفر و کافر
 جنہوں نے راہ کفر اختیار کی ان کے لیے
 عذاب شدید ہے۔ ۱۸۱، ۱۸۴
 کافروں کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ عذاب
 میں کمی نہ ہوگی۔ وہ کہیں گے ہمیں نکال،
 پھر نیک عمل کریں گے۔ ۲۶۰
 اپنے آگے اور پیچھے عذاب الہی سے ڈرو،
 اللہ کی آیات کا انکار کیا، اس کے دیے
 ہونے مال سے خرچ کرو۔ ۳۶۲
 حضرت لوط علیہ السلام
 لوط ہمارے رسولوں سے تھا، اُس کے خاندان
 کو نجات دی، سوائے ایک بڑھیا کے باقی
 ساری قوم کو برباد کر دیا۔ ۵۵۰

حضرت امام محمد بن حسن العسکری (امام زمان)

کیا سلیمان کی سلطنت مہدی کی سلطنت سے بڑی ہے؟

۶۳۸

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اللہ عز و جل ہے جسے عزت مطلوب ہے وہ عزیز کی اطاعت کرے۔

۱۹۴

انفاق اور صلہ رحمی گھروں کی آبادی اور عمروں کی زیادتی کا سبب ہے۔

۲۰۶

جو شخص رزق میں فراوانی اور اجل میں تاخیر کا خواہش مند ہے وہ صلہ رحمی کرے۔

۲۰۶

زنا سے پرہیز کرو اس کے چھ برسے نتائج ہیں تین دنیا میں اور تین آخرت میں۔

۲۰۷، ۲۰۷

تم سے زیادہ عالم وہ ہے جس کا خوف خدا زیادہ ہے اپنے مال کو آگے بھیج دو تاکہ اپنے مال کے پاس پہنچنے کی آرزو اگلے جہان کا شوق بن جائے

۲۳۳

جسے خدا نے ساٹھ سال عمر دی اس کے لیے عمر کی راہ بند کر دی۔

۲۶۴

اسے آدم کے بیٹے! تو میرے ارادہ اور خشیت کے مطابق آزاد ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔

۲۸۷، ۲۸۶

بہیں ان لوگوں میں قرار دے جو موقع نکل جانے سے پہلے بیدار ہو جاتے ہیں۔

۲۸۹

ہر صحیح کا ایک دل ہوتا ہے۔ قرآن کا دل سورہ یسین ہے۔

۲۹۰

یسین اسم رسول پاک ہے، تو یقیناً اللہ کے رسولوں سے ہے۔

۲۹۳

اسے رسول انہیں بستی والوں کا قصہ سنا ذکر ہم نے ان کی طرف رسول بھیجے مگر انہیں جھٹکایا گیا۔

۳۱۳

اس مومن (حبیب بن ہار) نے اپنی زندگی میں بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور موت کے بعد ہدایت کی آرزو کی۔

۳۲۸، ۳۲۷

امتوں میں سب سے پہلے سبقت کرنے والے علی ابن ابی طالب، حبیب بن ہار، مزمل مومن

۳۳۶

اکل فرعون ہیں، علی ان میں سب سے افضل ہیں۔ لوگ کاروبار میں مشغول ہوں گے اور ایک

۳۳۶

بیخ کے ذریعہ قیامت پر پناہ پو جائے گی۔

۳۶۹

”سلا مہ قولاً من رب الحییم“ پر آپ کی حدیث اور تشریح۔

۳۷۸

آپ نے ابو ذرؓ کو وصیت فرمائی کہ بڑھاپے سے پہلے دو بھائیوں کو غنیمت جانو۔

۳۹۳

جو ان کو بڑھاپے سے، صحت کو بیماری سے، تو لگزی کو تقیری، فراغت کو مشغولیت، زندگی کو موت سے پہلے غنیمت جانو، ان کو ڈراؤ

۳۹۳

جو زندہ ہیں تاکہ کفار پر حجت ہو جائے اور حکم عذاب ان پر مسلّم ہو جائے۔

۳۹۵

”یا تیک من لہ تزود بالاخیار“ اور جملہ کو آگے پیچھے کر دیا۔

۳۹۷

ان کی باتوں سے غمگین نہ ہونا۔ ہم جانتے ہیں جو وہ پنہاں اور ظاہر میں رکھتے ہیں۔

۴۰۳

یہ بوسیدہ ٹہریاں زیادہ سے زیادہ مٹی ہو جائیں گی۔ کیا تو پہلے دن مٹی نہ تھا؟

۴۱۳، ۴۱۲

جو اب میں فرمایا میرے بھائی یونس کی سبزی ہے۔ (حدیث)

۵۰۷

بنی ہاشم! یہ نہ ہو کہ قیامت میں باقی لوگ تو میرے پاس اپنے اعمال کے ساتھ آئیں اور

۵۲۸

تم سب رشتہ کا تعلق جتاتے آؤ۔ (حدیث) تمام آسمانوں میں بالشت بھر جگہ ایسی نہیں

۵۳۸

جہاں کوئی فرشتہ رکوع یا سجدہ میں نہ ہو۔ مصروف عبادت نہ ہو۔

۵۷۷

آسمان نے بار سنگین پر فریاد کی اس لیے کہ ایک قدم رکھنے کی بھی جگہ نہیں جہاں کوئی فرشتہ

۵۷۸

رکوع یا سجدہ میں نہ ہو۔ ان سے منہ پھیر لے، ایک معین وقت تک

۵۸۶، ۵۸۳

کے لیے انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے۔ ہر مجلس کے آخر میں کو ”سبحان ربك رب العزّة عما یصفون“

۵۸۹

جو سورہ صں کی تلاوت کرے اس کا اجر اسے اس پہاڑ کے برابر ملے گا جو داؤد کے لیے مسخر کیا تھا۔

۵۹۳

اگر وہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں۔

۵۹۳

صبر کر اور توبہ کرنے والے داؤد کو یاد کر کیا تجھ تک شکایت کرنے والوں کی داستان

۶۱۵

پہنچی ہے؟ میں تمہارے بارے میں ہوا و ہوس اور

۶۲۱

طول امل سے ڈرتا ہوں۔ خیر اور جہلائی قیامت تک کے لیے گھوڑے

۶۳۶، ۶۳۵

کی پیشانی سے باندھ دی گئی ہے۔ اللہ نے سلیمان کو عظیم حکومت دی لیکن

۶۴۲

خشوع و خضوع اتنا کہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھتے۔

۶۵۲

میں تو ایک ڈرانے والا ہوں فرشتے کفارات و درجات کے بارے میں

۶۸۵، ۶۸۱

گفتگو کرتے ہیں۔ میں تم سے اجر طلب نہیں کرتا، مشکلفین میں سے

۶۸۳

نہیں ہوں۔ مشکلف کی تین نشانیاں (حدیث)

۶۹۸

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام (امام ہفتم)

۶۹۹

انفاق حلال و مشروع اموال سے ہو، اس کے سوا اللہ قبول نہیں فرماتا۔

۱۳۱

اپنے اجداد کے وسیلہ سے جناب امیر کے لیے فرمایا کہ یہی وہ امام ہے جس میں ہر چیز کے علم کا احصاء کر دیا ہے۔

۳۱۲، ۳۱۱

خدا نے بزرگ نے سورج کو چاند سے اور نور کو ظلمت سے پہلے خلق فرمایا۔

۳۵۷

خدا کی قسم علماء اور راہبوں نے یہود و نصاریٰ کو اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی۔

۳۸۲

جو بولنے والے کی باتوں کو قبول کرے تو اگر حکم خدا کا بیان تھا تو اللہ کی اور اگر شیطان کا بیان تھا تو اس نے شیطان کی عبادت کی۔

۳۸۲

اعضائے جسمانی مومن کے خلاف گواہی نہیں دیں گے بلکہ جس پر فرمان عذاب تم ہو چکا ہوگا۔

۳۹۱

حق نبوت، کتاب آسمانی اور ایمان کو نوح کی اولاد میں باقی رکھا۔

۵۰۳

ذبح اللہ اسماعیل میں ایک جواب میں فرمایا: "سبحان ربك رب العزة عما يصفون"

۵۳۰

شب جمعہ سورہ ص کی تلاوت پر ایسی برکت دی جائے گی جو رسولوں اور فرشتوں کو بھی نہیں دی گئی۔

۵۸۹

سورہ ص کی شان نزول پر کلینی نے آپ کی حدیث بیان کی ہے۔

۵۹۵

ہوائے نفس، بخل اور انسان کا اپنے آپ سے شوش ہونا بلا حاکم کا باعث ہیں۔

۵۹۶

۶۳۶

حضرت موسیٰ بن عمران

موسیٰ وہارون پر احسان کیا، انہیں اور ان کی قوم کو نجات بخشی، مدو کی، کتاب دی، ہدایت کی، ذکر کو باقی رکھا، ان پر سلام ہو، ہم یونہی بزدل تھے ہیں۔ وہ مومن بندے تھے۔

۵۳۹ تا ۵۳۲

حضرت امام موسیٰ کاظم (امام ہفتم)

علی بن یقین سے حضرت سلیمان کے واقعات پر آپ کے ارشادات۔

۶۳۸ تا ۶۳۹

مومن اور عمل صالح

جو ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیے

۱۸۱ تا ۱۸۷

ان کے لیے مغفرت عظیم ہے۔ ایک جماعت اذن خدا سے نیکوں میں سبقت لے گئی۔ اس کی یہ ایک بڑی فضیلت ہے۔

۳۳۷

حضرت نوح علیہ السلام

نوح نے پکارا۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اُسے اور اس کے اہل و عیال کو نجات دی۔

۲۹۹ تا ۲۹۳

۵۰۰

حضرت نوح کی دعائیں۔

۵۰۰

حضرت ہاجرہ

کیا تمہیں معلوم ہے ابراہیم نے کیا ارادہ کیا ہے (شیطان) ۵۲۲ اگر اللہ کا حکم ہے تو اسماعیل کو اطاعت کرنی چاہیے ۵۲۳

حضرت ہارون علیہ السلام

موسیٰ وہارون پر احسان کیا

۵۳۹ تا ۵۳۲

حضرت یعقوب علیہ السلام

ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور اس کے بعد یعقوب کے پیدا ہونے کی بشارت دی۔ ہمارے بندوں ابراہیم و اسحاق و یعقوب کو یاد کرو۔ وہ ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے۔

۵۲۹

۶۶۳

حضرت یونس علیہ السلام

یونس ہمارے رسولوں سے تھا۔ بوجھل کشتی میں سوار ہوا، دریا میں پھینکا گیا تو مچھلی نے نکل لیا۔ ربانی بخشی، ذہ بیمار تھا۔

۵۵۳ تا ۵۶۱

علماء و دانشور

اکوسی (مفسر روح المعانی)

۱۳۲ تا ۲۵۵، ۲۵۵ تا ۲۶۰

ابن حجر عسقلانی

۲۶۰

ابن منظور، صاحب لسان العرب

۳۷۶

ابو القاسم حسانی

۳۶۲

ابو نعیم اصفہانی

۳۴۲ تا ۴۰۰

بطلیموس - ایک سائنسدان

۳۵۴

ہیثمی - محدث

۲۱۵

راغب

۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۹، ۹۹، ۱۱۳، ۱۲۱، ۱۹۳

۲۰۳، ۲۱۱، ۲۲۱، ۲۲۵، ۲۳۳، ۲۴۰

۲۳۹، ۲۴۰

۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۹، ۲۶۶، ۲۷۰، ۲۷۳

۲۳۸، ۲۳۹

۳۵۳، ۳۵۹، ۳۶۹، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۶

۳۳۸، ۳۳۹

۳۷۶، ۳۸۶، ۳۹۳، ۴۰۱، ۴۰۶، ۴۰۹

۳۷۷، ۳۷۸

۵۰۱، ۵۲۳، ۵۳۵، ۵۴۳

۵۰۱، ۵۲۳

زمخشری - صاحب کشف

۲۲۶

سیمویل کینک (جامع شناس) ایمان بالقیات

۲۲۵

کا انسان پراثر۔

۲۲۵

سبط ابن جوزی

۲۷۰

شیخ صدوق

۳۱۲ تا ۵۲۹

صدر المتألمین شیرازی

۶۰۵

طباطبائی (علامہ)

۳۳۶

طبرسی (مفسر)

۴۲۷ تا ۵۵۸

فخر الدین رازی (مفسر)

۲۵۰ تا ۷۲

الرزاق حنبلی

۲۷۰

قطب (ستید)

۳۵۵

کاشف الغطا

۲۶۶

۱۰۳	توحید مفضل
۶۳۳	تفسیر سبہ الانبیاء
۱۶۷	ثواب الاعمال
۶۹۹	بوامع الجامع
۵۳۸	دائرة المعارف
۶۶۰، ۳۹۳، ۲۰۵، ۱۸۵، ۱۳۹	سفینة البحار
۳۶۶	شواہد التزیل
۲۲۸	صحیح بخاری
۳۱۱، ۲۳۰	صحیح مسلم
۵۷۱	صحیفہ سجادیہ
۴۷۰، ۳۶۶	صواعق محرقة
۶۲۹، ۳۶۶	عیون الاخبار
۸۶	فرہنگ قصص القرآن
۳۹۲، ۲۹۹	قطر المحيط
۲۲۹	کشف الارتیاب
۴۷۰	کشف الغمۃ
۳۷۷، ۳۷۶، ۱۲۱، ۱۱۷، ۱۱۳، ۷۷	لسان العرب
۳۹۲، ۳۹۲	مجمع البحرین
۳۹۱، ۲۹۹	معانی الاخبار
۵۳۹، ۳۱۲	مفردات
۲۲۵، ۲۲۱، ۲۱۱، ۲۰۳، ۱۹۳، ۱۲۱، ۱۱۳، ۹۹، ۵۸	
۳۳۸، ۳۳۰، ۲۹۹، ۲۶۶، ۲۵۰، ۲۳۹، ۲۳۰، ۲۲۳	
۳۷۹، ۳۷۱، ۳۶۳، ۳۵۵، ۳۷۱، ۳۶۱، ۳۶۹، ۳۵۹، ۳۵۳	
۶۳۶، ۶۲۲، ۵۹۷، ۵۳۵، ۵۲۳، ۵۰۱، ۴۹۱	

لغات قرآن

(ا)

۶۵۷، ۵۱۳	وسائل الشیعہ
۵۶۵	وسائل کتاب القضاء
۲۷۵، ۲۳۰، ۱۷۷، ۱۷۲، ۱۶۳، ۸۹، ۶۶	شیخ البلاغہ
۲۳۸، ۲۲۲، ۲۹۹، ۳۸۵، ۳۳۳، ۲۹۸	
۶۳۶، ۵۷۲، ۵۷۱، ۵۵۲، ۴۴۷، ۴۳۰	
۶۹۶، ۶۹۱، ۶۶۰	
	ابو: مادہ، ابا، غلام کا آقا کے پاس سے
۵۵۵	بجاگ جانا۔
۷۷	اشل: بروزن اصل، جھاڑ کے درخت
۲۱۳	اجاج: کڑوا پانی جس سے گلے میں جلن پیدا ہو
۳۷۱	اجداث: جدت، (بروزن قفس) کی جمع قبر
۲۱۱	اجل المستقی: وقت معین
	اجذحہ: جناح (بروزن جمال) کی جمع
۱۷۱	پزندول کے پر۔
۲۳۵	اجور: اجر کی جمع، مزدوری
۳۶۳	احشروا: مادہ، شہر میدان میں لانا
	اختلاق: مادہ، خلق، سابق کے بغیر
۶۰۳	انواع و اظہار۔
۲۳۵	اخذت: مادہ، اخذ گرفت میں لینا

۲۴۶	بروقہ: (بروزن بخیر) عرب کا ایک پودا
۲۳۸	بیض: بیض، کی جمع۔ سفید
۲۳۳	بینات: واضح و روشن دلائل و معجزات
	(ت)
	تالیات: مادہ، تلاوت، تالی کی جمع تلاوت
۳۳۶	کرنے والے۔
۳۳۱	تبور: مادہ، ہزار سخت گھانا، شدید نقصان
۶۲	تبینت: مادہ، تبین، آشکار و واضح ہونا
۳۸۵	تردین: مادہ، ارداء، بندھی سے گرنا
۶۲۲	تسوروا: مادہ، تسور، احاطہ مکان یا شہر
۶۲۳	تسطط: مادہ، شطط، زیادہ دُوری، مراد ظلم
۵۲۷	تلقہ: مادہ، تل، اونچی جگہ
۵۹	تعامیل: تامل کی جمع۔ بیل بوٹے، تصویریں
۱۶۱	تناوش: مادہ، نوش، (بروزن نوح) پکڑنا
	توقدون: مادہ، توقود، (بروزن تمور)
۴۱۸	آگ روشن کرنا۔
	(ث)
۳۵۴	ثاقب: نفوز یا سورج کے نئے والا
	(ج)
	جبیل: جماعت یا گروہ جو طاقت میں پہاڑ جیسا ہو
۲۵۱	ارث: جو چیز بغیر محنت کے حاصل ہو جائے
۶۵۷	ارکض: مادہ، رکض، زمین پر پاؤں مارنا
۳۷۶	ازواج: بہشتی بیویاں
۳۵۸	استفتہم: مادہ، استفتاح، نئی خبروں کا مطالبہ
۵۶	اسلنا: مادہ، سیلان، جاری ہونا
	اصفاد: صدف کی جمع۔ وسیلہ قید و بند
۲۵۱	ہتھکڑیاں، بیٹریاں۔
۳۹۱	اصلوا: مادہ، اصلی، آگ جلانا یا آگ میں جلانا
۳۳۳	اعناب: عنب کی جمع۔ انگور
۲۹۹	اغلال: غل کی جمع۔ ہاتھ یا گلے میں ڈالنے والا سلقہ
۴۷۱	اغوا: مادہ، غمی، جہالت
۵۰۹	افک: بڑا اور قبیح ترین جھوٹ
۷۷	اکل: بہتر قسم کا غذائی مادہ
۵۵۶	التقمصہ: مادہ، التقام، نکل جانا
	اناب: سلامتی کے ساتھ پلٹنا
۶۰۲	انطلق: مادہ، انطلاق، تیزی سے باہر نکلنا
	آواب: مادہ، اوب، اپنے اختیار سے کبھی شے
۶۱۷	کی طرف لوٹنا۔
۴۸	آؤبی، تائب۔ آواز کو گلے میں گھمانا پھرانا
۶۱۷	اید: ہاتھ۔ مراد قدرت، نعمت
۲۱۲	ایکھ: درخت
	(ب)
۵۳۸، ۵۳	بارکنا: برکہ۔ برکت اور اس کی تفصیل

- ججمیم : مادہ 'جمح' (بروزن فریہ) آگ بھڑکانا ۲۶۴
 جدد : جتہ (بروزن غذہ) کی جمع، جاوہ، راستہ۔ ۲۳۸
 جفان : جفنه (بروزن وزنہ) کی جمع، کھانے سے متعلقہ برتن۔ ۶۰
 جنتہ : مادہ 'جتن' (بروزن ظن) جنون، سترو پوشش۔ ۱۴۵
 جواب : جاہیر کی جمع۔ پانی کے حوض ۶۰
 جیاد : جواد کی جمع۔ تیز رفتار گھوڑے ۶۴۱
 خصم : نزاع، جھگڑا، جھگڑے کے طرفین ۶۲۲
 خصیمہ : خصومت اور جھگڑے کے درپے شخص۔ ۴۱۰
 خطفہ : کسی شخص کو جلدی اپک لینا ۴۵۴
 خلا : مادہ 'خلا' مکان یا جگہ جس میں کوئی چیز ڈھانپنے والی نہ ہو۔ ۲۲۳
 خلط : خلیط کی جمع۔ ایک دوسرے سے مخلوط اشخاص۔ ۶۲۴
 خمط : (بروزن عمد) کڑوی گھاس ۷۷

(ح)

- حور : (بروزن قبول) گرم و جلانے والی ہوا، گو ۲۲۵
 حزن : (بروزن عدم یا مزد) دونوں کے معنی راستہ کی ناہمواری۔ ۲۵۸
 حلیمہ : توانائی کے باوجود کام میں جلدی نہ کرنا احساسات پر قابو رکھنا۔ ۵۲۳
 حمور : احمور کی جمع، سُرخ ۲۳۸
 حمیمہ : کھولتا ہوا جلا ڈالنے والا پانی ۴۹۴
 حین : وقت ۳۶۱

(ح)

- حتر : مادہ 'حزیر' پانی کا آواز سے بلندی سے گرنا۔ آبشار ۶۲۴
 خشیت : خوف جس میں تنظیم کی آمیزش ہو ۲۴۰
 راسیات : راسیہ کی جمع، ایک جگہ گڑی ہوئی دیگ۔ ۶۰
 راح : مادہ 'روخ' بوسیدہ، توجہ، میلان ۵۱۱

- رجزا : (بروزن کذب) اضطراب و احتمال کا عدم قرار۔
 بروزن مرض مخصوص جنگی اشعار بدترین قسم کا عذاب۔ ۳۷
 رجل : اسم نکرہ۔ بطور حقارت اس لفظ سے آنحضرت کو پکارتے تھے۔ ۴۲
 رجیمہ : مادہ 'رجم' سنگسار کرنا، نکالنا، بھگانا ۶۹۱
 رمیمہ : مادہ 'رم' (بروزن زم) بوسیدہ و ناکارہ (بوسیدہ ہڈی) ۴۱۲
 روح : طرفِ غروب دن کا آخری نصف حصہ ۵۶

(م)

- زاجرات : مادہ 'زجر' بلند آواز سے ہانکنا، دھتکارنا، منع کرنا ۴۴۶
 زبر : زبور کی جمع، مستحکم کلمہ ہونی کتابیں ۲۳۴
 زججوة : مادہ 'زجر' دھتکارنا، بھگانا ۴۶۲
 زقوم : کڑوا، بد ذائقہ، بدبودار پودا ۴۴۱
 زلفی : مقام، بارگاہ الہی میں قرب ۵۷۰
 زلقی : منزل گاہ ۱۱۹
 زند : لائٹر۔ آگ جلانے والا مادہ ۴۱۸

(س)

- سابغات : سبغ کی جمع۔ کامل اور فراخ زرہ ۵۱
 سابع : خوشگوار پانی، آسانی سے پینے کے قابل ۲۰۴
 ساخہ : گھر کا صحن، اندر کی فضا ۵۸۵
 ساہمہ : مادہ 'سہم' تیر ۵۰۴
 سرد : زرہ جیسی سخت چیز کا بننا ۵۱
 سرور : سریر کی جمع۔ محفل نشاط کے تحت ۴۷۹
 سعوا : مادہ 'سعی' ہر کم کی سعی و کوشش ۳۷
 سوار : وسط، دریاں ۴۸۵
 سودا : سود کی جمع، سیاہ ۲۳۸
 سینات : عمل یا عقیدہ میں ہر طرح کی برائی ۱۹۷

(ش)

- شغل : (بروزن شتر) سرت آمیز یا غم انگیز (بروزن قفل) انسان کو پیش آنے والے حالات۔ ۳۷۶
 شقاق : مادہ 'شقی' شگافت ۵۴۵
 شکور : صیغہ مبالغہ، بہت زیادہ شکر کرنے والا۔ ۶۰
 شوب : وہ شے جو کسی دوسری شے سے مل جائے۔ ۴۹۴
 شہاب : شعلہ ۴۵۴

(ص)

- صافات : صاف کی جمع، صف بستہ گروہ ۴۴۶

صافنات : صافنے کی جمع، گھوڑے ۶۳۱
 صالحی : مادہ، صلی، آگ جلاتا، آگ میں داخل ہونا ۵۷۶
 صریح : مادہ، صراخ، فریاد رس ۳۶۱
 صبیحہ : کلوئی یا کپڑے کو چھانڈتے وقت نکلنے
 والی آواز، زور دار چیخ۔ ۳۷۹

(ض)

ضعف : کئی لگان ۱۲۰
 ضعف : (بروزن حرم) مٹھی بھر شافیں ۶۵۸

(ط)

طرف : آنکھ کی پلکیں، نگاہ ۶۷۱، ۴۶۱
 طلع : مادہ، طلوع، پہلا پھل، کھجور کا شگوفہ ۳۹۳
 طمستنا : مادہ، طمس، (بروزن شمس) کسی چیز
 کے آثار کا ختم ہو جانا۔ ۳۹۱

(ع)

عدن : (بروزن عدل) ثبات و استقرار ۳۵۷، ۶۷۰
 عذب : پاکیزہ و سرور پانی ۲۰۳
 عرجون : مادہ، انعراج، اعوجاج، ٹیڑھا پان
 جھکاؤ۔ مادہ، عرجن، شاخ کا نچلا حصہ ۳۵۱
 عرہ : عوامہ (بروزن علامہ) خشونت
 سختی۔ ۷۷

عزۃ : مادہ، عزاز، محکم، مضبوط، ناقابل

شکست، ناپذیر زمین۔ ۵۹۷، ۱۹۳
 عزنی : مادہ، عزت، غلبہ ۶۲۲
 عین : (بروزن عین) جمع عینا، بڑی آنکھوں
 والی عورت۔ ۳۸۱

(غ)

غابرو : مادہ، غبور، (بروزن عبور) کسی چیز کا
 باقی ماندہ حصہ، قافلہ سے رہ جانے والا
 شخص، باقی ماندہ خاک، غبار، پستان
 میں رہ جانے والا دودھ۔ غبیرۃ ۵۵۱
 غدو : (بروزن غل) طرف صبح۔ دن کا پہلا
 نصف حصہ۔ ۵۶

غدا بیب : غریب، (بروزن کبریت) کی
 جمع، گہرا سیاہ رنگ ۲۳۸
 غدفات : غزفہ کی جمع، بالا خانہ، اوپر کی منزل
 کا گروہ، اوپر لے جانا۔ ۱۲۰

غروور : (بروزن جور) مبالغہ کا صیغہ بہت
 زیادہ فریب کار۔ شیطان۔ ۱۸۳

غساق : مادہ، غسق، (بروزن رفق) تاریک رات ۶۷۵
 غلام : نوجوانی۔ بچپن اور بلوغت کا وسط
 قریب بلوغت۔ ۵۲۳

غول : (بروزن قول) فساد ۴۸۰

کافر : مادہ، کفت، ہتھیلی، مال جمع کرنا
 منع کرنا۔ ۱۰۵

کتاب منیر : کتاب موسیٰ کی طرف اشارہ ہے ۲۳۴
 کفور : کفر کا صیغہ مبالغہ، کافر سے زیادہ عمیق ۲۶۳
 کید : تدبیر ۵۱۸

(ل)

لاذب : لازم ۴۵۸
 لایحیق : مادہ، حاق، نازل نہیں ہوتا۔
 درست کو نہیں پہنچتا۔ ۲۷۹

لا یسمعون : لایسمعون کے معنی میں ہے ۴۵۳
 لانرجمتمکم : مادہ، ارجم، گالیاں دینا، ناسزا کہنا ۳۱۸
 لیعجزہ : مادہ، اعجاز، عاجز کرنا ۲۸۲

(م)

مارد : مادہ، مرو، (بروزن مرو) سبزہ سے خالی
 بلند زمین۔ ہر قسم کی خیر و برکت سے
 عاری مرو۔ ۴۵۱

متر فوها : مادہ، وترن، مترن کی جمع
 مرفز الحالی میں مست۔ ۱۱۷

مثقلہ : بھاری بوجھ
 محاریب : مادہ، حرب، محراب کی جمع، جائے
 عبادت، شیطان کے ساتھ جنگ کرنے
 کی جگہ۔ ۵۹۰، ۵۹۱

(ف)

فائن : مادہ، فقتہ، اسم فاعل فقتہ کر، گمراہ کرنے والا ۵۷۶
 فاستبقوا الصراط : مادہ، سبق، راستے سے

آگے نکل جانا، راستہ بھول جانا، گمراہ ہو جانا ۳۹۲
 فاطر : مادہ، بطور، شگافتہ کرنا، آفرینش ۱۶۹
 فاکھون : فاکہ کی جمع، مسرور و شاداب

خوش مزاج انسان۔ ۳۷۶
 فقتیہ : مادہ، انارہ، منتشر و پراگندہ کرنا۔ ۱۹۳

فجرنا : مادہ، انفجیر، شگافتہ، چشمہ ۳۴۳
 فرات : صاف ستھرا، ٹھنڈا میٹھا پانی ۲۰۴
 فواق : دو مرتبہ دودھ دوہنے کا درمیانی وقفہ ۶۱۳

(ق)

قدور : قدر (بروزن حشر) کی جمع، کھانا پکانے
 کے برتن۔ ۶۰

قدت : اکھاڑ کھینکنا ۱۶۱
 قویۃ : جہاں لوگ جمع ہوں، انسانوں کا مجموعہ ۳۱۵

قطا : (بروزن جن) قطع کرنا ۶۱۴
 قطر : تانبہ، بعض کانسی بھی کہتے ہیں ۵۶

قطمیر : کھجور کی گٹھلی کی پشت پر کی جھلی ۲۱۱

کاس : پینے کی چیز سے بھرا ہوا برتن ۴۷۹

۶۲۲	محراب، صدر مجلس، نمایاں مقام، معبد
۵۵۶	مدحض، مادہ، ادخاص، منقلب کرنا
۲۸۵	مدینون، مادہ، دین، جزا
	مرحبا، مادہ، رجب، وسعت مکان
۶۷۶	(مخوش آمدید)
	مستسلمون، مادہ، استسلام، سلامتی، تسلیم
۴۶۷	خم کرنا۔
۳۵۷	مشحون، سامان سے بھری ہوئی
۲۵۰	مصطفین، مصطفیٰ کی جمع، برگزیدہ
۳۸۰	مطلون، مادہ، اطلاع، سراوشیا کر کے متوجہ کرنا
۳۸	معاجزین، مادہ، معجزہ، عاجز کرنا
۱۴۰	معشار، مادہ، عشر، وسواں حصہ
۲۰۲	معمر، مادہ، عمر۔ یہ لفظ عارت سے لیا گیا ہے، طولانی عمر والا۔
	معین، مادہ، معین، (بروزن صحن) شراب بطور
۳۸۰، ۲۷۹	کے چشمے۔
۶۵۷	مقتسل، نہانے کا پانی
۶۷۶	مقتحم، مادہ، اتمام، سخت اور خوفناک
	کام میں داخل ہونا۔
	مقربین، مادہ، قرن، مقاربت، نزدیکی، ہاتھ
	پاؤں، گردن کو زنجیر میں جمع کرنے کے
۶۵۱	معنی میں ہے۔
۱۹۷	مکرو، ہر طرح کی چارہ جوئی، یہاں بنی برفساد

(۹)

۴۵۳ واصب، پرانی بیماریاں، دائم و مسلسل

۴۵۳	ملا، اعلیٰ، فرشتے
۲۰۳	ملج، شور پانی کے برعکس
۵۵۶	ملیس، مادہ، لوم، ملامت
۵۹۸	مناص، مادہ، نوص، پناہ گاہ، فریاد رس
۶۱	مسائتہ، مادہ، نساء، (بروزن نسخ) تاخیر
	(ن)
۳۳۳	نخیل، نخل کی جمع، کھجور کا درخت
۱۱۷	نذیر، خدا کے عذاب سے ڈرانے والا
	نسلخ، مادہ، سلخ، (بروزن بلخ) جانور کی کھال
	آوازنا، دن کی روشنی، سفید لباس جو
۲۳۸	رات کو پہنایا گیا، مہینہ کا اتمام
	نصب، (بروزن حسب)، بلا، مصیبت
۶۵۵، ۲۵۹	مشقت، زحمت
۲۰۲	نطفہ، تھوڑا سا پانی، صاف پانی
	نعبۃ، بھیر۔ جنگلی یا پہاڑی بھیر کو بھی
۶۲۳	کہتے ہیں۔
۳۷۱	نفع، چھوڑنا جانے کا۔
	ننکسہ، مادہ، تنگیس، آن کر دینا، پھیل
۳۹۳	حالت پر پلٹنا۔

۴۶۶	وقفوہم، مادہ، وقف، ٹھہرانا
	(ی)
۱۵۳	یبد، مادہ، ابداء، ایجاد کرنا
۱۹۷	یبور، مادہ، بوار، بوران، حد سے زیادہ کساد بازاری
۳۶۹	یخصمون، مادہ، خصومت، نزاع، جنگ
۲۷۷	یذعون، مادہ، وعاد، طلب کرنا، تمنا کرنا
	یذقون، مادہ، ذف، (بروزن کف)، شتر مرغ
۵۱۲	کاتیز دورژنا۔
	یسبحون، مادہ، سبحت، آسمانی کرؤں کی سرخ
۳۵۳	حرکت کی طرف اشارہ ہے۔
۳۶۰	یصطرخون، مادہ، صراخ، چیخ و پکار
۱۵۳	یعبیدہ، مادہ، اعادہ، تکرار
۲۵	یغرب، مادہ، غرب، گھر سے دور ہونا
۱۵۳	یقدف، مادہ، قدف، (بروزن خذف)
۳۵۳	یقذفون، دھڑ پھینکنا، تیر مارنا
	ینذفون، مادہ، نذف، (بروزن خذف)
۳۸۰	تدریجی صورت میں ختم کرنا۔
۳۷۱	ینسلون، مادہ، نسل، تیزی سے چلنا
۳۶۱	ینقدون، مادہ، انقاد، پکڑ لینا، شجاعت دینا
۴۹۵	یہرعون، مادہ، اہراج، تیزی سے دوڑنا

۴

متفرق موضوعات

آسمان و زمین کا قیام

وہ ذات پاک جس نے آسمان و زمین کو خلق فرمایا ہے ان پر نگران و محافظ بھی ہے۔

۲۷۲

آگے اور پیچھے دیواروں کا حامل ہونا

مشکوٰۃ کے آگے اور پیچھے دیواریں حامل ہیں۔
اوپر سے بھی ڈھانپ دیا ہے۔ پس وہ کھٹے سمجھے نہیں۔

۳۰۳، ۳۰۲

آلاتِ شناخت کا بیکار ہو جانا

باطنی آلات عقل و وجدان و فطرت اور ظاہری حواس آنکھ، کان وغیرہ حق بات کو قبول نہیں کرتے

۳۶، ۳۰۱

آیات الہی

مژدہ زمین جسے ہم نے زندہ کیا غذا آگاتی ہے جسے وہ کھاتے ہیں۔

۳۳۱

اسی زمین سے ہم نے کھجور و انگور کے باغات آگائے اور چشمے جاری کیے۔

۳۳۲

وہ ان پھلوں کو کھاتے ہیں جبکہ ان کی بیدل واریں ان کی کارگیری کا دخل نہیں۔ وہ شکر بھی نہیں کرتے۔

۳۳۳

رات دن کا الٹ پھیر بھی عظمتِ الہی کی بڑی نشانی ہے۔

۳۳۷

سورج، چاند اور زمین کی اپنے مداروں میں

باقاعدہ حرکات میں اللہ کی نشانیاں ہیں۔ ۳۳۹ تا ۳۵۷

کشتیوں کا دریاؤں میں چلنا بھی آیتِ الہی ہے ۳۵۸، ۳۵۹

اور ہم نے اس جیسی دوسری سواریاں بھی پیدا کیں ۳۶۰

سبز درخت (مرخ اور غفار کی لکڑیوں) سے آگ

پیدا کرنا بھی ایک نشانی ہے۔ ۳۱۵

آیاتِ الہی کو نظر انداز کرنے والے

آیاتِ الہی سے زخوف کھاتے ہیں انفاق

فی سبیل اللہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خدا اگر

چاہتا تو انہیں اتنا دیتا کہ وہ بھوکے نہ رہتے۔ ۳۶۲ تا ۳۶۶

آیات سے سوء استفادہ اور انحرافی تفسیر

بعض مسلمانوں کا پیغمبرِ اسلام اور ہادیانِ برحق

کی شفاعت و توسل کا انکار۔ ۲۱۲، ۲۱۵

آیہ مودۃ فی القرابی

یہ اجر جو میں نے مانگا ہے اس میں بھی تمہارا

ہی فائدہ ہے۔ ۱۵۰

ابراہیمؑ کی بُت شکنی کا منظر

بُتوں کی کھلی تحقیر: بابل کے بُت پرستوں

کا عید کے میلے میں جانا، آپ کی عذر خواہی

اور پھر بُت شکنی۔ ۱۵۰، ۱۵۱

ابراہیمؑ خدا کا مومن بندہ

ابراہیمؑ صاحبِ ایمان بندوں میں سے ہے

ایشاء، عشق اور فداکاری کے جذبات، اسحاق

نبی کی بشارت، دونوں کو ہم نے برکت دی۔ ۵۳۶، ۵۳۷

ابراہیمؑ قربانِ گاہ میں

بیٹے کی بشارت، ابراہیمؑ کا بیٹے سے خواب

بیان کرنا، بیٹے کی آناوگی، ذبح کی تیاری،

قبولیت، ذبحِ عظیم سے تبدیلی۔ ابراہیمؑ

پر سلام ہو۔ ۵۲۳ تا ۵۲۹

ابلیس نے تکبر کیا اور دھتکارا گیا

فرشتوں کو آدمؑ کے لیے سجدہ کا حکم، فرشتوں

کا سجدہ، ابلیس کا انکار، راندہ گیا، مہلت

ملی، ابدی پھٹکار۔ ۶۸۷ تا ۶۹۳

ابلیس کے بارے میں آخری اعلان

حق کی قسم اتنی ہی کتنا ہوں، تجھ سے اور تیرے

ساتھیوں سے جہنم کو بھر دوں گا۔ ۶۹۷، ۶۹۸

اچھے اور بُرے اعمال کا تقابل

جن کے اعمال قبیح شیطان نے ان کی نظر میں

پسندیدہ بنا دیے ہیں، کیا ان کے برابر ہو

سکتے ہیں جو اعمال کی حقیقت کو سمجھتے ہیں؟ ۱۸۹ تا ۱۹۴

استکبار اور سازشیں بدبختی کا سبب بن گئیں

ہدایت ان کے پاس آئی، ڈرانے والا آیا تو راہ

فرار اختیار کی، یہ سب کچھ تکبر کی دجھ سے ہوا۔ ۲۷۷، ۲۸۳

اسلام میں قرعہ اندازی کی مشروعیت

قرعہ سے بڑھ کر اور کوئی عادلانہ فیصلہ نہیں۔

(امام جعفر صادقؑ) ۵۹۳، ۵۹۵

الیاسؑ مشرکین کے مقابلہ میں

الیاسؑ اللہ کا رسول تھا، قوم کو تقویٰ کی تبلیغ کی،

بھٹلایا گیا، وہ سب عدالت میں حاضر ہوں گے،

الیاسؑ کا نام باقی رکھا، الیاسؑ پر سلام ہو۔ ۵۴۲ تا ۵۴۶

انطاکیہ کے رسولوں کے واقعات

پولس، برنابا اور شمعون رسولوں کی تبلیغ

اور واقعات۔ ۲۲۰ تا ۲۲۴

انطاکیہ والوں کی داستان کے ترویجی

اور اصلاحی نکات

تبلیغِ حق کے سلسلہ میں بہت سے نکات

بیان ہوئے ہیں۔ ۲۳۳، ۲۳۵

انفاق فی سبیل اللہ باعثِ برکت ہے

جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں دے دو گے اللہ اس

سے بہتر نعمات عطا فرمائے گا۔ ۱۳۰

انفاق کے مفہوم کی وسعت

ہر نیک کام کسی بھی شکل میں جو صدقہ ہے ۱۳۲، ۱۳۵

انسانی زندگی میں قیامت پر ایمان کا اثر

فائدہ و خوفِ افراد کی اصلاح، فدا کار و مجاہد

کی تشویق، حیات بعد از موت کا نظریہ،

سزاؤں سے کہیں بہتر ہے۔ ۳۲۵ تا ۳۲۷

ان کے لیے راہِ فرار نہ ہوگی

وہ عذابِ الہی سے بھاگ نہ سکیں گے،

ان کی خواہشات اور چاہتوں کے درمیان

جُدائی ڈال دی جائے گی۔ ۱۵۸ تا ۱۶۴

انقلاب فکری ہر انقلاب کی بنیاد ہے

غور و فکر پر متعدد احادیث - غور و فکر عظیم ترین عبادت ہے۔

۱۳۹ تا ۱۴۵

ان کی ہرٹ دھرجی پر توجہ نہ دو

ان کے کام کو دیکھو، ایک روز وہ اپنے انجام کو پہنچیں گے۔

۵۸۶

اہل بہشت روحانی و مادی نعمات سے بہرہ ور ہوں گے

جنتی اپنی بیویوں کے ساتھ جنتوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ انہیں ہر طرح کی نعمت حاصل ہو گی اور اللہ کی طرف سے سلام۔

۳۹۷ تا ۴۰۳

اہل جنت کی گفتگو

اہل جنت آپس میں گفتگو کریں گے، پھر ایک ساتھی کا خیال آئے گا جو جہنم میں ہے، اکتھا ہم نہیں مریں گے۔

۲۸۶ تا ۲۸۳

اہل جنت کا دوزخیوں سے ربط

بہشتی جو اوپر ہیں وہ اپنے سے نیچے کے جہنمیوں سے باتیں کریں گے۔

۳۸۶

ایک آسمانی صحیحہ کافی ہے

پہلی قوموں کی طرح جھٹلانے کا انجام عذاب ہے یا ایک آخری صحیحہ کہ پھر پلٹنے کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

۶۱۵ تا ۶۱۰

ایک ٹومن، مجاہد، جانناز

حبیب بنجار کا اپنی قوم کو تبلیغ کرنا، اللہ کے رسولوں کی تصدیق اور انجام کار۔

۳۲۹ تا ۳۲۲

ایمان و کفر کے آثار

قرآن میں نسلی، جزائیاتی اور طبقاتی درج بندی نہیں ہے سوائے کفر و ایمان کے، ایمان کو فوراً اور کفر کو ظلمت قرار دیا۔

۲۲۷

باطل سے کوئی کام نہیں ہوتا

میں نے جو اجر مانگا ہے وہ بھی تمہارے ہی لیے ہے، وہ ہر چیز پر شاہد و گواہ ہے۔

۱۵۶ تا ۱۵۱

بدلہ تو صرف انجام عمل کا ملے گا

اللہ انعام نہیں ہے کہ اپنے پیغمبر کا بدلہ لے، بلکہ سزا اعمال بد کی ملے گی۔

۳۷۵

بدلہ کے مقتولوں سے آنحضرت کا خطاب

کیا تم دے کسی حقیقت کو نہیں سمجھتے

۲۲۸

برزخ کی منزل و جزاء

برزخ میں بھی جنت و دوزخ ہے۔ شدید جنت میں اور بد نعمت جہنم کے گڑھے میں۔ اُمتوں میں سبقت کرنے والے علی، حبیب، سزقیل

۳۳۸ تا ۳۳۷

بروقہ ایک عربی ضرب المثل

بروقہ ایک عربی پودا جو صرف بادل کی آمد پر سبز ہو جاتا تھا، بطور شکر گزار مشہور ہو گیا۔

۲۳۶

بستی والوں کی سرگذشت و جہ جہرت

مشرکین مکہ کے لیے عبرت، پیغمبر اور مومنین کے لیے باعث اطمینان قلب ہے۔

۳۱۹ تا ۳۱۳

بہت سے خداؤں کی بجائے ایک خدا

نئے نظریات کی بنا پر قریش کو توحید پر حیرت تھی اسی وجہ سے انکار تھا۔

۶۰۵ تا ۶۰۱

پاک و صالح قول و عمل اللہ کی طرف

لے جاتے ہیں

جن کے بد اعمال ان کی نظروں میں پسندیدہ ہو گئے ہوں وہ کبھی حزب اللہ کے برابر نہیں ہو سکتے، اچھے اقوال و اعمال اللہ کی طرف لے جاتے ہیں۔

۱۹۵ تا ۱۸۹

پانی اور آگ اس کے قبضہ میں ہیں

نوح کو پانی طوفان اور ابراہیم کو آگ سے نجات دی۔

۵۱۹ تا ۵۱۸

پرہیزگاروں کے لیے وعدہ

عہدہ مقام، باغات بہشت، تکلیف دار نعمت قسم قسم کے پھل و مشروبات، پاکیزہ بیویاں دائمی رزق۔

۶۷۲ تا ۶۶۹

تعبیرات کا تنوع

اعلیٰ و بصیر، نخل و حرور، اجیاد و اموات، ظلمات و نور کی تشبیہات اور نکات پر بحث۔

۲۳۱ تا ۲۳۰

تقویٰ و فحور ایک دوسرے کی ضد ہیں

تقویٰ انسان کے افرادی کمال اور فحور انسان کے انفرادی تنزل کی طرف اشارہ ہے۔

۶۳۹ تا ۶۳۸

تمام عزت اللہ کے لیے ہے

عزت کا منبع اللہ کی ذات ہے، اس کی اطاعت میں ہی عزت ہے۔

۱۹۸ تا ۱۹۶

تنبیہ کون لوگ قبول کرتے ہیں

اسے رسول! تم اسی کو اللہ سے ڈرا سکتے ہو جو اس کے ذکر کی پیروی کرے۔

۲۰۹ تا ۲۰۵

جہان آخرت سے واپسی ناممکن ہے

زندگی بعد از موت مرحلہ تکامل و ارتقا ہے۔ وہاں سے بازگشت کوئی معقول بات نہیں۔

۲۶۶

جہان غم ہے نہ نکان

جنت میں ہر طرح کی نعمات تیسر ہوں گی۔ وہ مقام غم و تکلیف نہیں ہے۔

۲۵۹ تا ۲۵۶

جہنم میں مجرموں کی پذیرائی

کھانے کو بذائقہ و رخت (زقوم) اور پینے کو بدلہ دار پانی۔

۲۹۳ تا ۲۹۰

جھوٹے دعوائے

مشرکین کا کہنا کہ ہم پر کوئی کتاب نازل ہوئی تو ہم مخلصین میں سے ہوتے۔

جھوٹے معبود آواز تک نہیں سنتے

فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان نہ کسی طرح کی مالکیت رکھتے ہیں، قیامت میں تمہاری عبادت اور شرک کا انکار کر دیں گے۔

۲۱۰ تا ۲۱۳

چوپاؤں کے عظیم فوائد

سواری کرتے، غذا حاصل کرتے، کچھ اور فائدے بھی ہیں۔

۲۰۲، ۲۰۶

چھ عظیم پیغمبر

ابراہیم، اسحاق، یعقوب، علم و عمل میں کامل، اسماعیل، الیسع، ذوالکفل، نیک لوگوں سے تھے۔

۶۶۳ تا ۶۶۸

چھوٹا سا شکست خوردہ لشکر

انہیں میری وحی کا یقین نہیں۔ کیا قادر خدا کے خزانے ان کے پاس ہیں کہ جسے چاہیں دیں؟ آسمان پر چڑھ جائیں، نزول وحی کو روک دیں؟

۲۰۶ تا ۲۰۹

چیخ اور قیامت

پہلی چیخ پر کل مخلوقات کا فنا ہونا، دوسری پر میدانِ حشر میں جمع ہونا۔

۲۶۸ تا ۲۷۲

حج ایک انسان ساز اہم عبادت

یہ عبادت حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ و ہاجرہ کی جدوجہد اور جہاد کی گہری یاد سے وابستہ ہے۔

۵۳۳

حزب اللہ کامیاب ہے

اللہ نے سبط سے مستحکم وعدہ کر لیا ہے کہ رسولوں کی مدد فرمائے گا، اللہ کی فوج ہی کامیاب ہوگی۔

۵۸۰، ۵۸۵

حق کے مقابلہ میں باطل کی ناکامی

سوال جواب کی صورت میں بحث

۱۵۴ تا ۱۵۵

حق کیا ہے؟

تشریح حق، قرآن و عقائد وغیرہ

۲۲۹، ۲۵۰

خدا کے سامنے صغیر و کبیر برابر ہیں

وہ کبھی سورج جیسے بڑے گزرتے کی قسم کھاتا ہے، کبھی انجیر جیسے چھوٹے سے پھل کی۔

۲۷۵

خدا کے سوا بتوں کو خدا مان لیا

بت ان کی کیا مدد کریں گے وہ تو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے۔

۳۰۸

خدا ہر چیز کا خالق ہے

تم خدا کی مخلوق ہو اور ہر بت بھی جنہیں تم پرستتے ہو۔ (فرمان ابراہیمؑ)

۵۲۰

خدائی تجارت کی شرائط عجیب

سرمایہ سب اس کا دیا ہوا، خود خریدار جبکہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ متاعِ قلیل، قیمت بہت زیادہ۔ بہشت جو اس کی صحت و رضا ہے۔

خلقت انسانی کے مختلف مراحل

مٹی، نطفہ، ازدواج، حمل، وضع حمل اور اس کا علم۔

۲۰۰ تا ۲۰۱

دامی غفلت

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ظلم و کفر کی بنا پر پہلی امتوں کو ہلاک کر دیا۔

۲۳۷ تا ۲۳۹

داؤد سے متعلق موجودہ توریت میں

خرافاتِ داستان

اور یا متی کی بیوی پر عاشق ہونا اور اس کا حصول۔

۲۲۵ تا ۲۲۸

داؤد کی ایک آزمائش

شکایت کرنے والوں کا محراب کے اوپر سے آنا، شکایت، فیصلہ، توبہ و استغفار، قبولیت و مغفرت۔

۶۲۶ تا ۶۳۲

داؤد کی زندگی سے سبق حاصل کرو

اے رسول! مشرکین جو کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور داؤد کے واقعات پر نظر رکھو۔

۶۱۶

دلوں کو تسخیر کرنے کا طریقہ

گفتگو اس طرح ہو کہ سننے والا کہے "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"۔

۱۰۱ تا ۱۰۳

دوزخ میں گمراہ پیشواؤں اور پیروکاروں کی گفتگو

ایک دوسرے پر الزام تراشیوں کی تفصیل

۳۶۶ تا ۳۶۹

دوزخیوں کی دشمنی

گمراہ سردار جن اہل جنت کو دنیا میں اشارہ سمجھتے تھے انہیں دوزخ میں تلاش کریں گے اور نپا کر خود کو مجرم سمجھیں گے۔

۶۷۸ تا ۶۷۹

ذات الصدور کا مفہوم

بقول راغب یہ کلام عرب نہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ اللہ دلوں کے مالک و صاحب سے باخبر ہے۔

۲۶۶

ذبیح اللہ کون ہے

حضرت اسماعیل اور اسحاقؑ کی قربانی کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف کی تفصیل۔

۵۲۹ تا ۵۳۱

رسول شاعر نہیں

لوگوں کو عذاب خدا سے ڈرانے والا ہے۔ ہم نے اسے شعر نہیں سکھائے۔ (شعر اور دی کا تقابل)

۳۹۵ تا ۳۹۸

روز جزا کو بھول جانا گناہوں کا سرچشمہ ہے

جہنم کی آگ کا مزہ چکھو، تم نے آج کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا۔

۳۲۷

روز کی تنگی و کشادگی

روز کی تنگی اور کشادگی اللہ کے ہاتھ میں ہے جو چیز اس کی راہ میں خرچ کرو گے وہ اس کے بدلہ اور دے دے گا۔

۱۲۵ تا ۱۳۰

زبان خاموش کر دی جائے گی

اللہ زبان کو بند کر دے گا، ہاتھ پاؤں اعمال کی گواہی دیں گے۔

۳۸۸ تا ۴۰۳

ستاروں بھری رات کی خوبصورتی

ستاروں کا ٹٹمانا اور پلکیں بھینکا عشق الہی کے رازوں کو منکشف کرتا ہے۔

۳۵۲

سرکشوں کی سزا

گمراہوں اور ان کے پیروکاروں کا جہنم میں داخلہ کھولتا ہوا پانی، آگ کا بستر ہمیشہ کا ٹھکانا۔

۶۷۶ تا ۶۷۷

سلام جو اہل بہشت پر نچھاور کیے جائیں گے

بہشت دار السلام ہے، اللہ لوگوں کو دارالسلام سلامتی اور آرام کی دعوت دیتا ہے، فرشتے اہل بہشت کو سلام کریں گے۔

۳۷۹

حضرت سلیمانؑ اپنی فوجی قوت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں

اعلیٰ نسل کے گھوڑوں سے رغبت، دیکھ کر خوش ہونا اور ان پر ہاتھ پھیرنا۔

۶۳۰ تا ۶۳۳

سلیمانؑ کا سخت امتحان اور وسیع حکومت

ترک اولیٰ، استغفار وسیع حکومت، تسخیر ہوا، تسخیر خنات، پرندوں کی بولیاں سمجھنا، وغیرہ

۶۳۵ تا ۶۵۴

سمندروں کی برکات

خوراک، نقل و حمل، اہرباد و موسم، نباتات وغیرہ

۲۰۵

شہاب ثاقب کا شیاطین کو بھگانا

جب شیاطین خبریں سننے کو آسمان کے قریب ہوتے ہیں تو شہاب ان کا بچھا کرتے ہیں۔

۳۵۳

شیطان کی پرستش کیوں؟

گنہگاروں ایک طرف ہو جاؤ، تم سے عہد لیا تھا کہ شیطان کی پیروی نہ کرنا۔

۳۸۰ تا ۳۸۶

شیطان کی پیروی

کوئی بھی شیطان دوسلوں کی پیروی پر مجبور نہیں۔

۸۸ تا ۹۰

شیطان کے نفوذ سے آسمان کی حفاظت

شیاطین کا آسمان کی طرف سود کرنا اور فرشتوں کا شہاب کے ذریعہ پھینکا کرنا۔

۳۵۳

شیطان کے وجود کا فلسفہ

مکمل کے لیے مقابلہ و مجاہدہ بے حد ضروری ہے۔ اس مقابلہ سے ایمان بچتا رہتا ہے۔ ۶۹۳ تا ۶۹۵

صحابیان علم کا دعوتِ حق پر ایمان ہے

علماء آپ کی دعوت کو حق جانتے ہیں ۳۱، ۳۰

صبر الیوب

اپنے رب کو پکارا، مجھے شیطان نے اذیت دی ہے، ٹھنڈے پانی کا پشمہ، قسم کیلئے مٹھی بھرنا میں ۶۵۳ تا ۶۶۱

عذاب اکبر

آخرت کا عذاب شدید ہے اگر وہ جانتے ۶۶۱

عظیم پیغمبروں کی آداب کے لفظ سے توصیف

اپنے اللہ سے رجوع و بازگشت، آداب، صیغہ مبالغہ کے ساتھ سب سے بڑی توصیف ۶۶۲ تا ۶۶۳

غزوہ کی آگ سب کچھ جلا دیتی ہے

مکبر اور ہٹ دھرمی نے ہی شیطان کو تعزیرات میں پھینک دیا وہ شیطان نہیں پیدا کیا گیا تھا۔ ۶۹۵ تا ۶۹۶

غور و فکر

غور و فکر کے بارے میں اسلامی روایات۔ غور و فکر عظیم ترین عبادت ہے۔ ۱۳۹

قیح تمہتیں

نعموز باندا، فرشتے اللہ کی بیٹیاں اور جن شریک کاریں۔ ۵۶۶ تا ۵۷۳

قدروں کا تعین

مغز و دنیا پرست قدر و قیمت کو مال و منال، مادی وسائل اور افزائی وقت میں محدود کرتے ہیں۔ ۱۲۲ تا ۱۲۳

قسم کھانے والی اشیاء

جن کی قسم کھانی گئی۔ وجوہات قسم کی تشریح ۳۳۸

قلب سلیم

قلب سلیم کی تشریح ۵۰۷

قوم سبا کے حالات

قوم سبا کی پریش آبادیاں، باغات، ناشکری، تباہی و بربادی۔ قوم سبا کا عجیب و غریب ماہر۔ ایک تاریخی واقعہ اور عبرت۔ ۸۲ تا ۸۳

قوم لوط کی برباد سزائیں

ہم نے لوط کے خاندان کو سوائے ایک بڑھیا کے نجات دی۔ باقی سب قوم کو تباہ کر دیا۔ ۵۵۰ تا ۵۵۲

کتاب الہی کے پاسدار و محافظ

سابقہ بالخیرات کی مسؤلیت، عظمت اور فضیلت ۲۵۲

کفران نعمت

ایک درخشاں تمدن جو کفران نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ قوم سبا کے عبرت انگیز حالات۔ ۷۳ تا ۷۸

کلام طیب، عمل صالح

کلام طیب ایمان اور پاکیزہ عمل کی طرف اشارہ ہے۔ عمل صالح کو اللہ پذیرائی بخشتا اور دوام و بلندی عطا فرماتا ہے۔ ۱۹۸

کم عمری و طول عمری کے عوامل

اعتیاد علی تملیہ و خوراک، ورزش، ہیجانات سے دوری اور ذہنی پاکیزگی وغیرہ۔

کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا

ہر شخص اپنے عمل کا جواب دہ ہے۔ کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا دے گا۔

کیا روئے زمین کے سب افراد نوح کی اولاد ہیں

مؤرخین کے مطابق ساری دنیا کے لوگ نوح کے بیٹوں سام، حام اور یافث کی اولاد ہیں ۵۰۳ تا ۵۰۴

گذشتہ گمراہ لوگ

ان سے پہلے بہت لوگ گمراہ ہو گئے ۲۹۶

گلے کے طوق نے ٹھوڑیوں کو اوپر اٹھایا ہوا ہے

ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جو ٹھوڑیوں تک اٹے ہوئے ہیں۔ گردن اکڑی ہوئی، سر اٹھا ہوا ہے۔ ۲۹۹

گمراہ پیشوا اور پیروکار

جب ان سے کہتے کہ کو لا الہ الا اللہ، تو وہ تکبر کرتے تھے۔ ۳۷۲

مال و اولاد تقربِ خدا کی دلیل نہیں

مال و اولاد اور جاہ و ثروت پر بھروسہ کرنے والے الہی دعوت کے مخالف ہوتے۔ ۱۱۵ تا ۱۲۱

جنت، پھل، پربہار باغات، شرابِ طہور
حور العین۔

۳۸۲ تا ۳۷۷

مخلصین کا اجر و ثواب

مخلصین کا مقام عظمت، یوسف جیسے صدیق
افراد کا مقام، مخلص بندوں کے لیے خاص عین
روزی ہے اور دیگر نعمت جنت۔

۳۸۲ تا ۳۷۵

مخلصین و مومنین و صالحین

پروردگار کے مخصوص بندے جو عذاب سے محفوظ
رہیں گے۔

۳۷۲

جنت میں ایک دوسرے سے گفتگو کریں گے
جو ڈرائے گئے تھے (ہمارے مخلص بندوں کے سوا)

۳۸۹ تا ۳۸۳

ان کا کیا انجام ہوا۔

۳۹۷، ۳۹۶

ابراہیم ہمارے ایماندار بندوں سے تھا۔ ہم نے
اسے اسحاق کی بشارت دی جو صالحین میں سے تھا۔

۵۳۶

وہ دونوں ہمارے مخلص بندوں سے تھے۔

۵۳۹

وہ اللہ کی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے
سوائے مخلص بندوں کے۔

۵۴۳

ایسا ہمارے مومن بندوں سے تھا۔

۵۴۳

مگر خدا کے مخلص بندے

۵۶۷

اگر پہلے لوگوں کی طرح ہم پر کتاب نازل ہوتی تو
ہم خدا کے بندے ہوتے مگر تیرے مخلص بندے۔
(البتیس کی گفتگو)

۵۷۸ تا ۵۷۵

مردہ اور زندہ دل افراد

ماندنیات، مانند حیوانات، حیوانات
انسانی و روحانی۔

۳۰۱، ۳۹۸

مشرک ہرگز حق کو قبول نہیں کریں گے

ہم نے انہیں چکنے والی مٹی سے پیدا کیا۔
یہ ہرگز ایمان قبول نہیں کریں گے۔

۳۶۴ تا ۳۵۷

معاد کے عقلی دلائل

اس زندگی کو دوسرے جہان کی زندگی کے
بغیر تصور کرنا لغو ہے۔

۳۳۹ تا ۳۲۸

مفسرین کا اختلاف رائے

اس موضوع پر شیخ مفسرین و مؤرخین
کے اعتراضات۔

۳۷۰، ۳۶۹

ملائکہ اور قرآن مجید

فرشتوں کے خصائل و فضائل ان کی تسبیح و تحلیل

۱۸۰ تا ۱۷۴

موجودہ تورات

موجودہ تورات اور قرآن میں حضرت سلیمان
کا ذکر متضاد صورت میں ہے۔

۶۹ تا ۶۶

نافرمان قومیں

اتمام نوحت کے بعد کفار کو پکڑ لیا۔ ان پر
میرا عذاب کیسا تھا؟

۲۳۵ تا ۲۲۲

نعمتِ الہی حاصل کرنے کی کوشش

اپنی اس مختصر زندگی میں اللہ کی نعمتوں کی
رضا حاصل کریں۔

۳۷۱، ۳۷۰

نفع بخش تجارت

تلاوت قرآن، قیام صلوٰۃ اور انفاق راہِ خدا
پروردگار کے ساتھ نفع بخش تجارت ہے۔

۲۳۶ تا ۲۳۲

نور و ظلمت یکساں نہیں ہیں

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں، نہ ہی آرام بخش
سایہ اور مجلسا دینے والی ہوا برابر ہیں۔

۲۲۷ تا ۲۲۴

وجود کے درو دیوار پر نقوش قدرت

ہم نے آسمان سے پانی برس کر زمین سے
رنگارنگ پھل نکالے، پہاڑوں میں سُرخ و

سفید رنگ کے راستے بنائے۔ انسانوں
اور پتوں کے مختلف رنگ۔

۲۳۱ تا ۲۲۶

وقتِ نجات گزر چکا

انسان کی بد نعمتی کا اصل سبب غفلت ہے۔
اب دیر ہو چکی، نجات کا وقت گزر گیا۔

۵۹۸ تا ۵۹۳

ولایتِ علیؑ کے بارے میں سوال ہوگا

اس موضوع پر شیخ مفسرین و مؤرخین
کے اعتراضات

۳۷۰، ۳۶۹

وہ کتابیں جن میں اعمال لکھے جاتے ہیں

شخصی اعمال نامہ جس میں عمر بھر کے کارنامے
تلمبند ہوں گے۔ اسے افسوس کوئی چھوٹا یا

۳۱۲، ۳۰۹

بڑا گناہ ایسا نہیں جو اس میں درج نہ ہو۔

ہر کام کے آخر میں غور و فکر

ہر محفل و مجلس کے اختتام پر کہے سبحان
ربك رب العزّة عما یصفون

۵۹۰، ۵۸۹

اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرے۔

پہیں لوٹا دو تاکہ عمل صالح انجام دیں

جیسے، پشت ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے، اسی طرح
دوزخ بھی ہمیشہ کے لیے ہے۔ اب واپسی

۲۶۵، ۲۶۱

ناممکن ہے۔

حضرت یونس کی مختصر تاریخ

آپ کا لقب ذوالنون ہے۔ عراق کے علاقے
نینوا میں ایک قوم پر مبعوث ہوئے۔

۵۶۱

یہ آیات کس کے بارے میں ہیں

”الذین امنوا و عملوا الصالحات“

حضرت علیؑ اور ”مفسدین فی الارض“

ان کے دشمنوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

۶۳۹

مقامات

انطاکیہ

شامات کا ایک مشہور شہر، قدیم روم کا ایک
مشہور شہر۔

۳۱۵

انطاکیہ حلب سے تنو اور اسکندریہ سے ساٹھ
کلومیٹر پر واقع ہے۔

۳۳۰

بعلبک

بعل بعل یعنی بت اور بک بمعنی شہر یعنی بت والا

شہر شام کی سرحد پر واقع لبنان کا حصہ ہے۔

۵۴۴

سبا

موزن کے نزدیک سبا ایک قوم کا نام ہے

لیکن یہ ایک ملک و علاقہ کا نام بھی ہے۔

۷۵

زم زم

وہ چشمہ جو نوزائیدہ حضرت اسماعیلؑ کے پاؤں

کے نیچے سے پھوٹا تھا۔

۵۳۵

صفا و مروہ

مکہ کی دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جن کے درمیان

حاجی سعی کرتے ہیں۔

۵۳۵

منیٰ

نخشب جلاؤاٹنے والے پہاڑوں کے درمیان ایک جگہ

منیٰ میں تکبیرات کا فلسفہ

۵۳۳

فَطْبُوعَاتِ مَصْبَاحِ الْقُرْآنِ

قرآن پاک (معری) رنگین

قرآن پاک (معری) سفید کاغذ

قرآن پاک مترجم

تفسیر نمونہ (۲۷ جلدیں)

قرآن کا دائمی منشور

تفسیر پیام قرآن

ہمارے آئمہ (۱۲ کتابوں کا سیٹ)

ولایت فقیہ (جلد اول)

ولایت فقیہ (جلد دوم)

تفسیر فصل الخطاب (۷ جلدیں)

تحریر قرآن کی حقیقت

صلح اور جنگ

مذہب اور عقل

رہنمایان اسلام

اسوہ حسینی

اثباتِ پمدہ

معارج انسانیت

زندگی کا حکیمانہ تصور

آیت الکرسی

مذلل التفسیر

آیہ تطہیر

توضیح المسائل

مختصر الاحکام

گفتارِ انبیاء

از مولانا فروان علیؒ

ترجمہ مولانا سید صفدر حسین نقویؒ

" " " " " "

" " " " " "

" " " " " "

" " " " " "

" " " " " "

علامہ سید علی نقی نقویؒ

" " " " " "

" " " " " "

" " " " " "

" " " " " "

" " " " " "

" " " " " "

ترجمہ مولانا محمد تقی نقویؒ

" " " " " "

" " " " " "

آقائے گلپائیکانی رحمۃ اللہ علیہ

" " " " " "

آقائے ننگرودی

" " " " " "

" " " " " "

ہدیہ ۲۵۰ روپے

ہدیہ ۵۰ روپے

ہدیہ ۲۰۰ روپے

ہدیہ ۱۲۵ روپے (فی جلد)

ہدیہ ۱۲۵ روپے

ہدیہ ۱۲۵ روپے

ہدیہ ۲۴۰ روپے (فی سیٹ)

ہدیہ ۱۳۰ روپے

ہدیہ ۱۵۰ روپے

ہدیہ ۱۲۵ روپے (فی جلد)

ہدیہ ۲۵ روپے

ہدیہ ۱۰ روپے

ہدیہ ۲۰ روپے

ہدیہ ۳۰ روپے

ہدیہ ۲۵ روپے

ہدیہ ۲۰ روپے

ہدیہ ۱۵ روپے

ہدیہ ۲۵ روپے

ہدیہ ۷۰ روپے

ہدیہ ۵۰ روپے

ہدیہ ۳۰ روپے

ہدیہ ۶۵ روپے

ہدیہ ۳۰ روپے

ہدیہ ۴۰ روپے